نہیں رکھ سکتے۔ ایسے رومانی لوگ اپنی پسند اور ناپسند کے معاملہ میں انتہا پسند ہوتے ہیں۔ کیا "کمپنی کی حکومت" سے ایسی طبیعت آشکار ہے؟ ہاں! ہمارا یہی خیال ہے۔ اس دعوے کا ثبوت ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہو۔

"کالی کٹ کے راجہ زیمورن کو کیا خبر تھی کہ بدو کے
افسانوی اُشتر کی طرح پرتگیز بھی اُسے خیمے سے باہر
نکالنے کی فکر میں ہیں سنہ۱۵۰۰ء میں پرتگیزوں نے کالی کٹ
کے مقام پر ایک کارخانہ قائم کیا۔ تین سال بعد
کالی کٹ کے سینہ پر ایک پرتگیزی قلعہ نظر آیا۔
سنہ۱۵۱۰ء میں پرتگیزی علم گوا کی دیواروں پر لہرایا۔
سنہ۱۵۱۰ء میں کالی کٹ کے ان مہمانوں نے زیمورن
کے شاہی محلات کو نذر آتش کر دیا۔
میزبان کی خدمت میں مہمان کا ہدیۂ تشکر!"

طرز شاعرانہ ہے اور شاعری محض جذباتی۔ جس واقعہ کا ذکر ہے صحیح ہے اور تاریخ سے ثابت۔ لیکن یہ پارہ تاریخ کی کتاب میں شامل نہیں ہو سکتا۔ تاریخ کو سند کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر واقعہ کو سبب اور تدریجی نشو کی۔ اور ان چیزوں کی اس کتاب میں کمی ہے۔ اسی طرح:

"ولیم بنٹنگ جنگ سے گریز نہ کر سکا۔ اس کے عہدِ حکومت
میں کورگ کا وسیع علاقہ کمپنی کی مملکت میں شامل
کر لیا گیا۔ مدراس کی گورنری کے زمانہ میں ولیم
بنٹنگ کی آنکھ کورگ پر تھی۔ وہ کورگ کو ایک انگلیشی
نوآبادی بنانا چاہتا تھا۔ ولیم بنٹنگ نے کچھار کو
کو بھی کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا۔"

کیا یہ شریک کر لینا ایسا منہ کا نوالا تھا کہ جب جی چاہا کوئی علاقہ شامل کر لیا۔ گویا ہندوستان کا نقشہ لے کر جس علاقہ پر سرخ پنسل سے نشان لگا دیا وہ کمپنی کا ہو گیا۔؟

لیکن اس تنقید سے یہ مراد نہیں کہ یہ کتاب ایسی خامیوں سے بھری ہے یا اس کا اثر ایک صدائے صحرا ہی ہے۔ واقعہ تو یوں ہے کہ اس کتاب کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ باری نے ہند اور یورپ کے تاریخ بنانے والوں کو ان کے صحیح لباس و رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے نقطۂ نگاہ سے بعض اوقات اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ اس تباہی کے گلہ" میں" شائبہ خوبیٔ تقدیر" کا ذکر بھی ہوتا اور اس کا لحاظ بھی ہوتا کہ یورپی اقوام اس دور میں باوجود اپنی بہیمیت کے "شمشیر و سناں" سے زیادہ آشنا تھیں اور ہم "طاؤس و رباب" سے ...... اور اب؟ اب ہم کیا ہیں اور کیوں؟ یہی تو باری نے بتایا ہے۔

باری نے جو بارِ گراں اپنے ذمہ لیا ہے وہ "پردۂ زنگاری" کو علیحدہ کرکے "معشوقِ" حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔

قیصر

فردوس

ایڈیٹرز گردھاری لال آنند
لطیف اختری بی اے

ناشر۔ بزمِ اُردو جموں و کشمیر (جموں)

سالانہ چندہ چار روپیہ فی پرچہ ۶ / ششماہی [illegible]

بزمِ اردو جموں و کشمیر، ریاست کشمیر کی ایک پرانی بزمِ ادب ہے۔ جس کے مختلف مشاعروں میں سنہ۱۹۲۵ء سے شریک ہوتا رہا ہوں؛ اس کے دفتر سری نگر اور جموں، کشمیر کے دونوں صدر مقامات میں قائم ہیں؛ اس کے موجودہ صدر پنڈت وشوناتھ صاحب ماہ بی اے ہیں اور جوائنٹ سکریٹری جنابِ قیس شروانی۔ یہ اور ان کے دوسرے رفقاء حتی الامکان کشمیر میں اردو زبان اور اردو شعر و ادب کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں؛ اب بزمِ اُردو جموں و کشمیر نے اپنا "علمی و ادبی" رسالہ فردوس کے نام سے شائع کیا ہے جس کی اشاعت کی بڑی ذمہ داری بزمِ اُردو جموں و کشمیر پر عائد ہوتی ہے۔

میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کی اشاعت کے اصلی وجوہ و اسباب کیا ہیں لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ بزمِ اُردو جموں و کشمیر کوئی اتنی بڑی انجمن نہیں ہے جس کے لئے کسی آرگن کی اشاعت ضروری ہو جاتی؛ اتنا ضرور ہے کہ پورے کشمیر سے کوئی ایک ایسا ادبی علمی رسالہ شائع نہیں ہوتا جس کو

اُردو دنیا کی طرف سے ہندی سنسار کیلئے بہترین تحفہ

رس ساگر

بادۂ مشرق کا نیا رُوپ

ہندوستانی ادب میں یہ پہلی مکمل کوشش ہے، جس کی بنیاد میں لسانی اتحاد، قومی ملاپ اور ہندوستان کی ایک لنگوافرنکا وضع کرنے کے خیال کی طرف پورے وثوق کے ساتھ قدم اٹھایا گیا ہے۔ یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ساغر کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کی نظمیں اور نیا کلام ناگری حروف میں ایک مرتب مجموعہ کی شکل میں چھاپا گیا ہے اور حواشی میں ان تمام الفاظ کے معنی آسان زبان دیئے گئے ہیں جن کو ہندی دنیا بلا وجہ آسانی سے نہیں سمجھتی۔

کتاب کے لئے خاص طور پر پیلا اینٹک پیپر مل سے بنوایا گیا ہے اور چھپائی ہندوستان ٹائمز پریس دہلی میں۔ "رس ساگر" مجموعی طور پر نہایت حسین اور اعلیٰ سامانوں کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور اُردو دنیا کی طرف سے ہندی کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ آپ اپنے ہندی جاننے والے دوستوں کو نہایت فخر و مسرت کے ساتھ اس تحفہ کو دے سکتے

منیجر ادبی مرکز میرٹھ (یو۔پی)

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی ادبی ماہوار رسالہ

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ بہار

زیر سرپرستی ڈاکٹر سید محمود

ایڈیٹر

ساغر

اسسٹنٹ اڈیٹر

م ۔ ک ۔ م

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)

قیمت فی نمبر ۸ ؍ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)

ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

اُردو دنیا کی طرف سے ہندی سنسار کیلئے بہترین تحفہ

رس ساگر

بادۂ مشرق کا نیا رُوپ

ہندوستان کی ایک لنگوا فرانکا ہندوستانی ادب میں یہ پہلی مکمل کوشش ہے، جس کی بنیاد میں لسانی اتحاد، قومی ملاپ اور ہندوستان کی ایک لنگوا فرانکا وضع کرنے کے خیال کی طرف پورے وثوق کے ساتھ قدم اٹھایا گیا ہے۔ یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ساغر کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کی منتخب نظمیں اور نیا کلام ناگری حروف میں ایک مرتب مجموعہ کی شکل میں چھاپا گیا ہے اور حواشی میں ان تمام الفاظ کے معنی آسان زبان میں دیئے گئے ہیں جن کو ہندی دنیا بالوجوہ آسانی سے نہیں سمجھتی۔

کتاب کے لئے خاص طور پر سپلا اینٹک پیپر مل سے بنوایا گیا ہے اور چھپائی ہندوستان ٹائمز پریس دہلی میں "رس ساگر" مجموعی طور پر نہایت حسین اور اعلیٰ سامانوں کے ساتھ شائع ہوئی ہے اور اُردو دنیا کی طرف سے ہندی کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ آپ اپنے ہندی جاننے والے دوستوں کو نہایت فخر و مسرت کے ساتھ اس تحفہ کی نذر دے سکتے ہیں۔

منیجر ادبی مرکز میرٹھ (یو-پی)

فہرست مضامین ایشیا اگست سنہ ۱۹۴۲ء

جلد ۶ | اگست ۱۹۴۰ء | نمبر ۱

طوفان میں سفر

شکست نہیں نا خدا ہے خوفِ طوفان سے تو ہو

پردۂ ہر موج میں سو نا خدا رکھتا ہوں میں ——— !

——— ہولناک جنگ نے یورپ کو جہنم بنا رکھا ہے، تباہی اور بربادی کا خوفناک طوفان اُٹھ رہا ہے، مجبور و بے کس انسانیت ہے اور خون و آتش! بھوک اور فاقہ، خانماں بربادی کا منحوس راج ہے اور نازک و حسین انسانیت کساد بازاری کے جھکڑ ہیں ——— اور افلاس زدہ آدم کی اولاد! یہی نہیں، اپنے ہوں یا بیگانے، آزادی کی اُمنگیں کسی کو گوارا نہیں، زندگی کے راستہ میں مگر کانٹوں کے بجائے فلسفوں سے اَٹے ہوئے، سفر کے لئے راہ موجود ہے مگر پتھروں کے بجائے اصول پرستیوں سے پٹی ہوئی -!؟

راجا اور پرجا ہیں مگر دونوں لفظوں کے کھلاڑی، شیخ و برہمن کی کمی نہیں مگر دونوں بازیگر، ہندو ہوں کہ مسلمان دونوں کے دل ہیں چور ——— !

ادھر پاکستان کا ستائی آتش فشاں، ادھر آریہ ورت کے خیال کا نام نہاد جوالا مکھی یہ بھی ناری وہ بھی، اور ہر خاکی تخلیق سے عاری!؟

اک طرف اُردو زبان کی حفاظت اور اشاعت کا وہ . . . . . . ایسا شور، گویا اُردو کو واقعی فنا کر دیا جائیگا، دوسری طرف سنسکرت آمیز ہندی کے رواج کا وہ ڈھنڈورہ گویا ہر ہندوستانی زبردستی پنڈت بنا دیا جائیگا!؟

جو بازی گر جو مذہب پر قربان ہونے کا شعبدہ دکھا سکے، دھرم اور مذہب کا محافظ! ہر وہ سادہ لوح جو انسانیت اور نیکی کو فرضی حدود سے آزاد کرائے ملحد اور ناستک، ہر وہ ہندو جو مسلمان کے ساتھ صلح رہے ہندو کش، ہر وہ مسلمان جو ہندو کو بھائی خیال کرے، ایمان فروش!؟ کامیابی کے لئے فرقہ پرستی اسم اعظم، اور فرقہ پرستی کے سلسلے میں دل آزاری عین قوم پرستی!!

قدم قدم پر فرشتوں کے لکھے پر "قید و بند کا انتظار! نظر نظر میں زنجیر، نفس نفس میں نغمۂ سلاسل ——— !؟!

سادگی اور سادہ دلی گناہ، پریم اور محبت پاپ، بھائی چارہ اور ہمدردی جرم، غلامی پر ڈھٹائی کے ساتھ اعتقاد، اپنے پر فتح ہونے پر ہر فاختہ کو شاہین سمجھ کر زعم، الامان والحفیظ!!

یہ ہے وہ ہمت شکن طوفانی پس منظر مگر بیشک اُس لمحہ میں جو مطلق عرقابی کا نقیب ہے میں اپنی شکستہ کشتی کو موجوں کے سپرد کرتا ہوں ؎

زبان دی ہے سرمست موجوں کو میں نے

کہ طوفان میں بھی مسکراتا رہوں گا

اپنی طوفان شکار کشتی سیلاب کی نذر کرنے کا ارادہ کوئی نیا ارادہ نہ تھا، ۱۹۴۳ء میں جب پہلی بار ایشیا سہ ماہی شائع ہوا، اسی وقت سے میں منتظر تھا مگر معلوم ہوا کہ آگے بڑھنے کیلئے سکون کی فضا پیدا ہونا محال ہے، سفر مقصود ہے تو

راہ کی دشواریوں کا خیال کرنا بہادر مسافر کی شان نہیں۔

پیچیدہ گھاٹیوں سے گذر، کانٹوں میں دامن اُلجھا اور کبھی بچ کر بہرحال ایک مرکز پر میں نے سانس لی، سامنے موجیں مارتا ہوا سمندر تھا یہاں ساتھی کی ضرورت تھی، ایسے ساتھی کی جو طوفان سے کھیلنے کا عادی ہو۔ ڈوبنا اور اُبھرنا، مدّ و جزر، کشتی و دریا، سکون اور طوفان کی حیثیت جس کی نگاہوں میں بقدر یک نفس بھی نہو۔

—— مڑ کر دیکھا، میرا رفیق ہنس رہا تھا معتمد کامل اور محب رفیق، دل نے کہا اب کیا دیر ہے —— ؟

اعتماد، کمال اور محبت کی رفاقت میں طوفان کیا، آدمی کو جہنم میں کود پڑنا چاہیئے۔

اب کسی انتظام کی ضرورت نہ تھی، جو نہ ہونا تھا وہ ہو گیا، جو ہو گیا، وہ اٹل ہے، جو کچھ ہو گا وہ سچے ارادوں کے مطابق ہو گا، ضرور ہو گا۔

ماہنامہ ایشیا کا یہ پہلا نمبر ہے، جس کے معیار میں رتی بھر فرق نہیں ہوا، تاہم دل جو چاہتا ہے وہ حسن اور تکمیل ابھی اس میں پیدا نہیں ہوئی —— پھر بھی طوفان میں جو کچھ ہو سکتا ہے اس کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بتاؤ کچھ کم بھی نہیں ہے۔

گو یہ سفر کسی کے بھروسے پر نہیں کیا گیا مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس طوفان میں کون کون ساتھ دیتا ہے —— میں ڈوب کر بھی انسان کی پیدائشی تشنگی سے انکار نہیں کر سکتا، ہاتھ چپو پر ہیں اور نگاہیں یاران ساحل پر ! ؟

کوئی دعویٰ نہیں مگر میں نے جوانی اور اس کی سرشاریوں، زندگی اور اسکی طلبگاریوں کی بازی ادب کی بساط پر لگا دی ہے، شکست و فتح، کامیابی اور ناکامی کے خیال سے آزاد ہو کر میں نے پانسہ پھینکا ہے، نتیجہ کا انتظار اچھے قسم کے شاطر کب کرتے ہیں، میں صرف کھیلنا چاہتا ہوں، ہار پر سینہ کوب ہونا اور فتح پر اُچھلنا میرا مذہب نہیں ہے۔

اس وقت تک ایشیا کی بقا کی ضامن میری زندگی رہی، وہ زندگی جو مجاہدۂ حیات کی مشتاق ہے، متحرک، گھمبیر، نچہ، کش زندگی، چھین جھپٹ پر خوش ہونیوالی نقصان و فنا کو لازم جاننے والی زندگی، غم جس کی گرد راہ اور مسرت جس کی خاک پا ہے، "جو تنہا" ہے، حساس ہے، درد مند ہے، غم ناک ہے، عزیزوں اور دوستوں کی ماتمی ہے، اک آبگینہ ہے نازک ترین، اک ناسور ہے رستا ہوا، مگر ولولہ اور حوصلہ رکھتی ہے اور الحمدللہ جس کو مقابلے کی جرأت اور لیچہ ڈھونڈھ نکالنے کی بصارت حاصل ہے۔

کبھی تم نے سمندر میں قائم چٹان کو دیکھا ہے —— ! ؟

اسی طرح اٹل زندگی، ہر مصیبت کے لئے سینہ سپر، طوفان سے کھیلنے والی سیلاب افگن، گرداب آشنا، آمر اور اٹل !

کبھی تم نے طوفان کے تھپیڑوں کے خوفناک حملوں کو دیکھا ہے —— ؟

اسی طرح رواں دواں، پُر شور، بپھری ہوئی زندگی، میری یہ زندگی اکیلی میرے اُن کاموں کی ذمہ دار ہے، جو میری ذات سے شروع ہو کر آپ کی ملک بن گئے اور جن کو آپ نے قبول کر لیا۔

اُن کاموں کی نوعیت شروع ہی سے ایسی نہیں رہی جس کو خدانخواستہ روایتی کہا جا سکے۔ ایشیا نے زندگی، تبدیلی اور تعمیر، اک نئی دُنیا کی تعمیر کے بُنیادی سامانوں کو جمع کرنا چاہا! ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی طرح کامیاب نہ ہو سکا ہو لیکن اس کے مقاصد صرف ماضی کی چھان بین اعداد و شمار کا اعادہ، مومن و غالب اور میر و سودا کی ہڈیوں کو کھودنا اور ان کو سجا کر رکھ دینا ہرگز نہیں ہے۔

یہ ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ لیکن ایشیا مشرق ...... کی رگوں میں تازہ اور گرم خون پیدا کرنا چاہتا ہے۔ انسان کی ذہنی خود مختاریت قائم کرنا چاہتا ہے اور مُلکی آزادی سے پہلے ذہنی آزادی پیدا کرنا اس کا اولین مقصد ہے۔

وہ مشرقیوں خاصکر مسلمان اور ہندوؤں میں ایک تازہ دم اور رجحان قوم کی سی شکتی، اک آہنی خود اعتمادی اور ہندوستانیوں کو کیرکٹر رکھنے والی قوم دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ چاہتا ہے، ان غلاموں کو اپنی طاقت پر اعتبار ہو۔ وہ چاہتا ہے ان کرشن اور رام کے پجاریوں کو اپنے نفس کا عرفان ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ خالدؓ و عمرؓ کی اولاد مغالطوں اور جہل مرکب کی نیند سے بیدار ہو جائے۔ اک نئی دُنیا بنائے اور وہ چاہتا ہے کہ زندگی کے جسم میں انفعال کا ایک ذرّہ بھی باقی نہ رہے ایک پُر نشاط اور شاندار عملی کیفیت تینتیس کروڑ غلاموں کی آبادی جھوم جھوم اُٹھے۔

یہ اور بات ہے کہ ہو نہ سکے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ لوگ سرکار اور حضور کہنا چھوڑ دیں۔ غلامی کے خون کا آخری فاسد قطرہ بھی انسانی جسم سے نچوڑ لیا جائے۔ ایک باعظمت انفرادیت قائم ہو۔ جو ہمیں تاریخ میں اشرف اور اعظم کا لقب دلوا سکے۔

اور اگر اس چاہنے کی راہ میں ایشیا پر آسمان بھی ٹوٹ پڑیں تو وہ اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لے گا۔ اس کا عزم اہرام مصری کی طرح اٹل ہے۔

یہ عزم جس قدر جدوجہد چاہتا ہے اس جدوجہد اور بھاگ دوڑ سے میں نے کوئی تکلف نہیں کیا۔ لیکن اب وہ پہلی سی کیفیت کہاں! کوئی بڑی بات کہنا تو درکنار لوگ تازگی اور محض ہمت کے اعلان سے ڈرتے ہیں، بم کا کیا ذکر، محض قہقہوں کی صدائیں دل ہلا دیتی ہیں۔ ہر طرف ایک المناکی اور انفعالیت کا دور دورہ ہے، خاصکر مسلمانوں (کیونکہ ہندو قوم کا مجھے زیادہ تجربہ و مشاہدہ نہیں ہے) کی خواہش ہے کہ ان کی موجودہ زندگی میں رتی بھر تبدیلی نہ کی جائے۔

بریلی میں ایک مخصوص مسلمان نے مجھ سے کہا کہ "آپ کو پالیٹکس سے کیا تعلق؟ ۔۔۔۔ آپ ترنم کے ساتھ غزل سنائیے"۔ اس فقرہ سے آپ اس ہمت شکن طرزِ عمل کا اندازہ کر سکتے ہیں جس سے کارکن مزاجوں کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ امراء ہم سے مستقل ذہنی غلامی اور نگوں ساری چاہتے ہیں، عام ہندوستانیوں میں ان لوگوں کی کھپت ہے جو توموں کو اچھی طرح لڑا سکیں۔

یعنی کام کرنے کا میدان بدقسمتی سے خود ہی محدود ہو گیا ہے لیکن اسکے باوجود مجھے اندازہ ہے کہ تمام اردو داں طبقوں اور ایشیا کے مابین جو مشترک چیز ہے وہ اس کا خالص ادب ہے۔ اور محض اسی کی بنیادوں پر وہ اپنی دنیا بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔

آپ جانتے ہیں میں ایک متوکل مسافر ہوں۔ اور ہلکا پھلکا سامان سفر رکھتا ہوں۔ صرف اسقدر کہ جی سکوں اور ایشیا کو زندہ رکھ سکوں۔

چنانچہ ۹ سال سے نقصانات کے باوجود میں اس کو شائع کرتا رہا۔ اب ایشیا نے جو قدم اٹھایا ہے وہ طاقت چاہتا ہے، زادِ سفر چاہتا ہے اور آپ کی ہمدردی چاہتا ہے۔

مجھ سے جو کچھ چاہتا ہے وہ میں جانتا ہوں۔ ۔۔۔۔ جوانی کی بھی کبھی گھڑیاں، افسردگی کی خاک ہستی کی آخری تڑپ، وہ جو تو جام ایشیا آپ کو گواہ کر کے یہ متاع بھی اس کی نذر کرتا ہوں۔

میں سمجھتا تھا کہ ماہانہ کرنے کے بعد مجھے ملک بھر کا دورہ کرنا پڑے گا اور زیادہ سے زیادہ توسیع کر کے اس کی بنیادوں کو اور بھی محکم کر دینا ہوگا۔ ایک مدت آپ نے مجھے کسوٹی پر کسا، اب آپ کی پرکھ کا وقت آگیا ہے۔ اگر دوستوں، عزیزوں، عوام اور خواص کو میری ذات اور میرے کاموں کے ساتھ دلچسپی ہے تو وقت آگیا ہے کہ وہ اس دلچسپی کا ثبوت دیں۔ میں ہر جگہ آؤں گا ہر مقام پر پہنچوں گا۔ ایک ایک دروازہ پر صدا دوں گا۔ ایک ایک دل کی کنڈی کھٹکھٹاؤں گا محض اس لئے کہ میں اس پاکیزہ اور اہم مقصد میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہوں جو مجموعی طور پر تمام ہندو مسلمانوں کا قومی مقصد ہے جو شخص اس مقصد میں میری امداد کرے گا وہی میرا سچا دوست ہوگا اور وہی ادب کا سچا پجاری۔

میں یہ دورہ ۸ اگست ۱۹۴۰ء سے شروع کر دوں گا سب سے پہلی منزل بدایوں ہوگی اسکے بعد شاہ جہاں پور، بریلی، مراد آباد اور رامپور قیام کرنے کے بعد مسوری جاؤں گا، جہاں آخر اگست تک مصروف رہوں گا۔

چند دن بریلی اور بدایوں میں

تمام اردو پڑھنے والی دنیا سے ایشیا کے ۵۰ ہزار خریدار مہیا کرنے کی اسکیم کو بریلی اور بدایوں سے شروع کیا گیا۔ کامل ۷ سال کے بعد میں نے یہ تجربہ دوبارہ کیا تھا۔ ۲۴ و ۲۵ء میں شوق تھا اور شرمیلا پن۔ اب مقصد کے ساتھ جنون تھا اور بے باکی۔ بے باکی اور جنون کی دنیا میں سوائے کامیابی کے اور کسی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

نئی تحقیقات

بریلی اور بدایوں میں عجیب عجیب مشاہدات ہوئے۔ قدم قدم پر طرح طرح کے لہجے نت نئے سوال و جواب۔ کہیں مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں، کہیں نگاہِ ترش، کوئی یکسر خیر مقدم تھا کوئی سرتا پا گریز، لیکن مجھے ماننا پڑتا ہے، ملک کو میری الٹی سیدھی خدمات کا اعتراف ہے اور ہندو مسلمان دونوں میری .....

نت نہیں مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

جہاں تک ہندو بھائیوں کا تعلق ہے، مسلمانوں سے زیست ہی نہیں مل سکی مگر جس قدر حلقوں میں مجھے یاد کیا گیا، کوئی ایک شخص ایسا نہیں جس نے میری جد و جہد سے اتفاق نہ کیا ہو۔ نہ وہاں کم بحثی تھی، نہ گریز کی کوشش نہ اعتراضات تھے، نہ اتہامات ——— مگر مسلمانوں نے جن کے جسم کا میں ایک لازوال حصہ ہوں، لافانی جزو ہوں، بد اپنی آزادیٔ افکار کا پورا پورا ثبوت دیا۔ کسی نے شدید مصروفیت کا بہانہ کیا، کسی نے اُردو زبان سے عدم دلچسپی کا، کسی نے لٹریچر کو مدّ فاضل کہا، کوئی صبح و شام کا پروگرام بیان کرنے لگا۔ کسی کو کورٹ کی مصروفیتیں نکلیں۔ کسی نے پالیسی پر بحث کی، کسی نے ذاتی عقیدہ پر، کہیں کانگریس مسلم لیگ کی بحث ہوئی، کہیں سوشلزم اور کمیونزم کی! ؟ لیکن اس کے باوجود زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلمانوں نے ہی ایشیا کو خریدا، اور مجموعی طور پر ان دو چھوٹے شہروں کے نتیجہ کو کامیابی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کے اندر اہلیتیں تو سب موجود ہیں مگر غلط لیڈرشپ نے اس کو تن آسانی، نفرت اور گپ بازی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔

ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ اغیار اُردو زبان کے دشمن ہیں!؟

یہ مشاہدات تو کچھ اور ہی ثابت کرتے ہیں۔ میں نے تو یہ محسوس کیا کہ اپنے ہاتھ اپنے ہی گلے پر ہیں۔

کسی زبان کے ادب کو فرقہ پرستی طبقاتی پالیٹکس اور اسی قسم کی نزاعی باتوں سے کوئی تعلق نہیں، غالب کا دیوان اور اقبال کی بانگ درا انگریز، ہندو، مسلمان سب کے لئے ایک مشترک دولت ہے۔ سب مل جُل کر اُس سے لطف اندوز اور متمتع ہوتے ہیں۔

یہی نوعیت ایک اصول پرست آئیڈیل اور اعلیٰ درجہ کے آرگن کی ہے۔ ایشیا اُردو زبان کا رسالہ ہے لیکن اُس میں شائع ہونے والے مضامین کسی ایک قوم کے نقطۂ نگاہ سے نہیں لکھے جاتے بلکہ وہ ایک اصولی زاویۂ نگاہ کے ماتحت تحریر کئے جاتے ہیں، مسلمان، ہندو اور انگریزوں کو اُسے ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

لیکن بالکل نئی تحقیق ہے کہ لوگ ادبی رسائل کو تام نہاد روزنامہ و ہفتہ اور پمفلٹ کی حیثیت میں دیکھنا چاہتے ہیں!؟

اک اور نئی تحقیق ہے کہ لوگ ادب کو آئیڈیل ازم سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ ادبی رسالے کیلئے "واکینشن آرگن" ہونا بھی ضروری ہے!؟

ایشیا کی مشترک حیثیت ادبی حیثیت ہے، یہ کبھی فنا نہیں کی جا سکتی یہ باقی رہے گی اور ہر اُس شخص کو زندگی اور مسرت کا نیا پیغام پہنچا سکے گی جو اُردو زبان کو پڑھتا اور سمجھتا ہے۔!؟

یہ مشاہدات ہمیں اندیشے سہی، مگر میں مایوس نہیں، اندیشہ صرف یہ ہے کہیں اُردو زبان سے عدم دلچسپی کچھ اور نہ بڑھ جائے ——!؟

اگر ایسا ہوا تو اس تہذیب و تمدّن کا خدا حافظ ہے جو ہندو مسلمانوں نے صدیوں کی کوششوں کے بعد پیدا کیا ہے ——؟!

یہ کلمات نیک نہیں ہیں، جو ادب اور زبان کے سلسلے میں مسلمان اپنے گھروں پر بیٹھ کر کہتے ہیں، یہ اُن حویلیوں کی رسوائی ہے جن کے اندر وہ مسند نشیں ہو کر یہ الفاظ کہتے ہیں، یہ اُن لباسوں کی توہین ہے جن کو زیب تن کر کے وہ اُردو زبان سے بے تعلقی اور غیر دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں، یہ تمدّن، کلچر، تہذیب، اور علم و ادب تمام روایات کی فنا اور زوال پذیر ہونے کا اقرار کرنا ہے۔ لیکن بہر حال ——— میں پُر امید انسان ہوں، مجھ سے مایوسی اور ناکامی کے خیال کا کوئی رشتہ نہیں، میں اعتراف کرتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہوا وہ تصوّر سے زیادہ ہوا۔ بریلی بدایوں کے عوام و خواص نے میرے سفر کو کافی کامیاب بنایا۔ اس سلسلے میں بڑا جرم ہوگا اگر میں اپنے بریلی اور بدایوں کے میزبانوں

چودھری تعریف سنگھ ڈپٹی کلکٹر اور ڈاکٹر عبدالغنی اقبال انچارج نیشل ہاسپٹل، مسٹر علی مقصود بی۔اے ایڈووکیٹ، مسٹر شوکما ڈھنڈا ایڈووکیٹ کا شکریہ ادا نہ کروں گا جن کی محبت نے مجھے ان کا قیدی بنا لیا۔

بریلی میں مسٹر محمد صدیق ڈی۔ایس۔پی کے

خان صاحب معین خاں اور اکرام حسین بی۔اے بریلوی

مسٹر تیج بہادر سنہا بی۔اے۔

اور بدایوں میں رائے صاحب امیر چند جوہری ایڈووکیٹ و چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ اور علی مقصود ایڈووکیٹ نے مجھے طور پر اُس ادبی

مقصد میں کامیاب کیا جس کے لئے میں کمربستہ ہو کر نکلا ہوں۔
رسم کہتی ہے کہ مزید شکریہ ادا کروں، لیکن میرا خیال ہے دوستی سے زیادہ ان لوگوں کو ادب کی ترقی کا پاس تھا، اب فرد کا سوال نہیں، اُردو ادب ہندوستانی قوم کی فلاح اور ترقی کے لئے ان لوگوں نے میری امداد کی، اصل مقصد میں کامیاب ہونا میری اور ان حضرات کی اصلی مسرت ہے۔

"تبسم" اور "نذیرِ غالب"

یہ دو نظمیں ہیں اور دونوں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے مختلف تاریخوں میں براڈکاسٹ ہوئیں۔ ایک جنوری کے ایشیا میں شائع ہوئی اور آل انڈیا ریڈیو کا حوالہ نہ دیا جا سکا۔ دوسری اس نمبر میں آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہے۔ حوالہ نہ دینے کا مجھے افسوس ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اسسٹنٹ اڈیٹر خیال رکھیں گے۔

مسلسل مضامین

ایشیا کے مسلسل مضامین میں "برطانیہ عظمیٰ میں تحریک مزدور"
(۲) "جنگ کے جراثیم" دو مضمون اس نمبر میں نہیں جا سکے ہیں۔ جناب "ف" اور شانتی جی کچھ ایسی نئی مصروفیتوں میں ہیں کہ پُرانے خادموں کو دل سے بُھلا بیٹھے ہیں۔ بہرحال میں ایک کوشش ضرور کروں گا تاکہ یہ سلسلے جاری رہ سکیں۔

آسٹریلیا میں ہندوستانی مصوری

حال ہی میں مسٹر جان ڈی ویلیٹ وائس چیرمین انڈیا سوسائٹی لندن کے مشورے سے جنوبی آسٹریلیا کی نیشنل گیلری کے لئے ہندوستانی مصوری اور ڈرائنگ کی ۲۸ تصویریں حاصل کی گئی ہیں۔
برٹش میوزیم کے محکمہ کتب مشرقی کے نائب مہتمم مسٹر ولکنسن نے ان تصویروں کے متعلق حسب ذیل بیان دیا ہے۔

"ہندوستان کی قدیم مصوری کو گزشتہ چند سالوں سے ہی یورپ کی وہ توجہ حاصل ہوئی ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ موجودہ صدی میں خاص طور پر اس مصوری کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اسکے متعلق بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں اور خرید و فروخت کے مقامات پر ان کی جو بڑی بڑی قیمتیں (مغلیہ مصوری کی تصویروں کے بعض البم تو سو پونڈ بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت ہوئے ہیں) دی گئی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن مصوری کے قدرداں اس مصوری کے متعلق کیسے بلند خیالات رکھتے ہیں۔

ہندوستان میں مصوری کا فن بہت قدیم ہے اور بُدھ مت والے دیواروں پر جو تصویریں بناتے تھے جنکے نقوش اب بھی اجنتا اور باغ میں پائے جاتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی ہی میں یہ فن اس قدر مکمل ہو چکا تھا کہ ایشیا کے قدیم فنون کی صف اوّل میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس کے ایک ہزار سال بعد تک اس فن میں کوئی ایسی ترقی نہیں ہوئی جس کا ان قدیم شاہکاروں سے مقابلہ کیا جا سکتا۔ کہیں کہیں عوام کی مصوری کے دو چار دلچسپ نمونے ضرور سامنے آئے مگر اس سلسلہ میں کوئی کارنمایاں انجام نہیں پایا۔ قدیم مصوری اب ایک گمشدہ فن کی حیثیت سے رہ گئی تھی۔

عہدِ مغلیہ کے مصوروں کے ابتدائی کارنامے درحقیقت ایرانی مصوری کا پرتو تھے۔ ہمایوں پہلا بادشاہ تھا جس نے اس فن کے ماہر ایران سے بُلائے تھے۔ اس کے جانشیں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی ذاتی توجہات سے کتابوں پر نقاشی کا قدیم فن درجہ کمال تک پہنچ گیا۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس فن کو نظر انداز کیا گیا۔ اور چونکہ اسے شاہی سرپرستی میسر نہ آسکی اس لئے یہ فن رفتہ رفتہ تنزل پذیر ہونا شروع ہو گیا مگر اس سے فن معدوم نہیں ہوا۔ مصور صوبجاتی درباروں میں جانے لگے۔ اور اس طرح اُن کے فن کی عزت افزائی جو بعض صورتوں میں بہت دلچسپ ہوتی تھی مقامی ہو گئی۔ اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد کی بہت سی تصویریں نہایت قیمتی ہیں۔

مغل مصوری ایران اور ہندوستان کی مخلوط پیداوار ہے یعنی

دونوں ملکوں کے فنون مصوری کا مشترک مظاہرہ ہے۔ مغلیہ عہد کے
ابتدائی مصوروں کو ماڈل بنانا ایران نے سکھایا اور پھر ان خاکوں میں
جو رنگ آمیزی کی گئی اس میں ہندوستان کے مذہبی آرٹ کو بڑا دخل ہے
ہندوستان کے مذہبی آرٹ نے درباری مصوروں پر اپنا اثر بھی ڈالا
اور خود بھی اُن سے متاثر ہوا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ کی مصوری
پر ایک تیسرا اثر بھی ہوا اور وہ یوروپین مصوری کا تھا۔ اکبر اور
جہانگیر کے زمانوں میں جن عیسائیوں کو زیادہ باریابی حاصل تھی انہوں
نے ہندوستان میں مغربی مصوری کو متعارف کیا۔ وہاں کی مذہبی رعایا
مصوری کے ذریعہ سے اپنے اعتقادات کو جس طرح ظاہر کرتی تھی اس
سے روشناس کرایا۔ فضا۔ مقام۔ روشنی کے اثرات۔ پس منظر
ان تمام باتوں کے متعلق یورپ والوں کے جو احساسات تھے ان سے
ہندوستان کے مصوروں کو آگاہ کیا اور ان اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ
یہاں کی مصوری پر ایران کا جو اثر تھا وہ کم ہوگیا اور ہندوستانی
اور ایرانی مصوری میں نمایاں فرق ہوگیا اس کے علاوہ ہندوستانی
مصوری کا کچھ حصہ ایسا بھی تھا جس پر بیرونی فنون کا زیادہ اثر نہیں
تھا بلکہ وہ ایشیا کی قدیم مصوری کی خصوصیات کے حامل تھے۔

مغلیہ خاندان کے زمانہ میں جو مصوری ہوئی ہے اس کو
درحقیقت "درباری تاریخ" اور "فن تصویر کشی" سے زیادہ تعلق ہے
تصویریں بنانے کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ شاہانِ مغلیہ
شہزادگان اور مختلف النسل رؤسا، و امراء کی تصویریں پائی جاتی
ہیں۔ جانوروں کی تصویریں بنانے میں ہاتھیوں کی تصویریں خصوصیت
سے ملتی ہیں اور ان میں زندگی اور حرکت کے تمام آثار نمایاں
معلوم ہوتے ہیں۔

اگر سچ پوچھا جائے تو ہندوستانی مصوری زیادہ تر مذہبی
مصوروں کا کارنامہ ہے خصوصاً راجپوتی مصوری جس میں ہندوؤں
کی قومی یادگاریں ہیں یا مہاراج کرشن کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ ان میں مغل مصوری کے اثرات بہت پائے جاتے
ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ذرا مختلف کیفیت کا اظہار کرتے ہیں اور
اپنے نقوش میں ایک ایسا امتیاز رکھتے ہیں جو صرف انہیں کا حصہ
کہا جا سکتا ہے۔

تصاویر کا یہ مجموعہ جسے ہندوستانی مصوری کا مکمل مظاہرہ نہیں
کہا جا سکتا اپنے اندر ایک تنوع ضرور رکھتا ہے اور اپنے زمانہ کی مختلف
مصوری کے شاہکار رکھتا ہے۔ اس بات کا تھوڑا سا افسوس ہے کہ
ان میں سے زیادہ قدیم زمانہ کی جو تصویریں ہیں وہ کہیں کہیں سے خراب
ہوگئی ہیں مگر وہ اپنی خصوصیات کو صاف طور پر ظاہر کرتی ہیں۔ یہ
مجموعہ تصویروں کے لحاظ سے تو قیمتی ہے ہی مگر اس لحاظ سے بھی
قیمتی ہے کہ اس میں قدیم کے ساتھ ساتھ کچھ جدید مصوری کے
شاہکار بھی پائے جاتے ہیں۔

موت کا شاہکار

کس دل سے میاں شبیر احمد، انکی بیگم، محترمہ بیگم شاہ نواز
اور ان کے خاندان عزیزوں اور دوستوں سے
اصغر شبیر کی مرگِ ناگہاں پر تعزیت کی جائے ——— !؟
الفاظ میں جان نہیں، قلم میں طاقت ——— میں جب اس وقت کو یاد کرتا ہوں
جس وقت شبیر نے اپنی آٹوگراف بک پر مسکرا کر شعر لکھنے کی فرمائش کی تھی میرے
ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ قلم گر جاتا ہے "آہ کیا وہی شبیر مرگیا جسکے تبسم میں تازہ
کلیوں کا سارس تھا جس کے ہونٹوں میں ارجن کی کمان تھی جسکی آنکھیں ہیرے
کی طرح روشن تھیں، جس کی بھویں اٹھتی ہوئی جوانی کا پاکیزہ پرچم، تعین وقار، اور
ذہانت کا نشان، جمال اور سعادت کی نمود، انسانیت اور اخلاق کا مجسمہ تھے"
کون اندازہ کرسکتا ہے اُس ہوک کا ——— جو اسکی ماں کا کلیجہ بٹھائے دیتی ہوگی۔
کون معلوم کرسکتا ہے اس کسک کو جو میاں شبیر احمد کے دل میں رہ رہ کر اٹھتی ہوگی۔
۱۲ سال کا جوانِ رعنا، خاندانِ ہمایوں کی مجسم بشارت، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا، دلوں
کی ٹھنڈک، وہ سراجِ عظیم جس سے متعلقین کی روحوں کے ایوان اور جھونپڑے سب جگمگا رہے تھے،
آکسفورڈ کی پیاری کی گود میں بہنے والی ندی کی موجو! تم نے بنات البحر کیلئے نوجوان
ہندوستان کا سب سے بہتر جوان چُن کر ترقی کے سینہ کا ہیرہ توڑ لیا ——— !؟
آہ! وہ گھڑی کتنی منحوس تھی جب مشرق کی روشنی مغرب کی ایک چھوٹی سی
ندی میں ایسی ڈوبی کہ پھر نہ اُبھری! ؟ ——— ہمدردی ——— دُعائیں ———
جوار رحمت ——— صبر ——— تسکین ——— ہر لفظ دُنیا سازی کا پُرفریب پرتو۔ جو ہونا تھا ہو
بیت گئی اُس کا کوئی علاج نہیں جو ہو گیا وہ دیوانہ بنانے کیلئے بہت زیادہ ہے!
اصغر شبیر وہ اس تصویر کدۂ آدم کا ایسا شاہکار تھا کہ ظالم موت بھی آسے دیکھ کر ٹھٹک گیا ہو
ساحر

نئی صبح

ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

موجودہ جنگ میں بحری بیڑے کا کام

حامد علی صاحب کا یہ مضمون جنگ کے زمانے میں معلومات کے نقطۂ نگاہ سے مفید اور ضروری ہے۔ لیکن آپ کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس مضمون کے سلسلے میں جس برطانوی مصنف (Admiral Sir H. Richmond) کی تصنیف سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے وہ وطنی مفاد کا قدرتی طور پر پاسدار ہوگا۔ کس نے سمندروں میں کیا طوفان مچا رکھا ہے، اسکی گہرائی کو نہ حامد علی صاحب جانتے ہیں نہ میں اور نہ آپ اسلئے کسی عیب و ثواب کے متعلق ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے؛ ایک سچے مقالہ نگار کو ہمیشہ محتاط اور حق پرست ہونا چاہیئے۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے میں جانتا ہوں کہ آپ حقائق تک پہونچنے کے عادی ہیں، اور اہلِ دماغ ناظرین کو صرف مضمون کی معلوماتی روح ہی سے زیادہ تعلق ہوتا بھی ہے۔ سو مجھے یقین ہے کہ اس مضمون سے بھی آپ اسی طرح نتیجہ نکالیں گے۔ جس طرح آپ مضامین سے نتیجہ نکالنے کے عادی ہیں۔

ساغر

ہر دور اور ہر زمانے میں مختلف آلاتِ جنگ و جدل حملہ اور بچاؤ کرنے کیلئے کام میں لائے گئے ہیں۔ پہلے پہل یہ بہت سادہ اور معمولی تھے۔ پتھر کے زمانے میں ([illegible]) انسان پتھروں کے تراشے ہوئے ہتھیاروں سے لڑتا تھا۔ زمانے کی ترقی کیساتھ ساتھ یہ بھی بدلے۔ پتھر کے بعد ہتھیار لوہے فولاد، تانبے پیتل وغیرہ کے بنائے جانے لگے۔ بارود کی معلومات اور استعمال کے بعد تیغ و تبر کا زمانہ بیت چکا تھا۔ دست بدست جنگ کا دور ختم ہوا اور پرانے زمانہ کی قلعہ بندیاں حرفِ مہمل ہو کر رہ گئیں۔ سائنس نے ترقی کی۔ آبادی کی زیادتی اور نوآبادیات کی ضرورت نے محاذِ جنگ بدل دیا۔ اہلِ یورپ جغرافیائی معلومات رکھنے لگے۔ نوآبادیات قائم کرنیکے خواہاں تھے۔ تاکہ ان سے اجناس خام حاصل کی جا سکیں۔ خود ساختہ اشیا وہاں برآمد کی جا سکیں اور ضرورت سے زیادہ آبادی کو بھی وہاں بھیجا جا سکے۔ نوآبادیات قائم کرنے کیلئے بری فوج قلعہ بندیاں وغیرہ چنداں نہیں تھیں۔ نوآبادیات کیلئے بحری قوت نہایت ضروری تھی۔ اور جس ملک کو یہ قدرت حاصل تھی اس نے سمندر پر اپنا سکہ جمایا اور نئی دریافت کی ہوئی زمین کے حصوں پر اپنے ملک و ملت اور فرمانروا کے نام کا پرچم لہرایا۔ تاریخ یورپ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پاپائے روم کے ۱۴۹۳ء کے حکم کے مطابق اسوقت تک معلوم کی ہوئی دنیا کو ہسپانیہ اور پرتگال میں اس طرح تقسیم کیا گیا۔ کہ ہسپانیہ کو نصف شمالی کرۂ ارض دیا گیا۔ اور پرتگال کو نصف جنوبی۔

جب تک تمام یورپ پر پاپائے روم کا اقتدار قائم رہا۔ دوسری حکومتوں کے لئے یہ نئی دنیا ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ مگر جب تجدید مسیحیت (Reformation) نے پاپائے روم کے اثر پر ضرب کاری لگائی تو یورپ کی (Protestant) حکومتیں پاپائے روم کے ۱۴۹۳ء والے فرمان کی کھلم کھلا نافرمانی کرنے لگیں۔ اور ہسپانیہ اور پرتگال سے برسرِ پیکار ہونے لگیں۔ ہالینڈ والوں نے اقتدار حاصل کر کے روئے زمین پر اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ فرانس اور انگلستان بھی بعد میں نوآبادیات کی اس مہم دوڑ میں شریک ہوئے۔ ۱۵۸۸ء میں ہسپانوی بحری بیڑے (Spanish Armada) کی شکست کے بعد انگلستان کا اقتدار بڑھنے لگا۔ اس نے پہلے ہالینڈ اور بعد میں فرانس سے جھڑپ ہوئی۔ مگر سب کو منہ کی کھانی پڑی۔ انگلستان کی قوت کا انحصار بھی بحری قوت پر ہے۔ (Napoleon) نپولین جیسے فاتح اعظم کو بھی اسی وجہ سے شکست کھانی پڑی کہ اس کی بحری طاقت انگلستان والوں

۱؎ اس مضمون کی تیاری میں (Admiral Sir H. Richmond) کی تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے۔

نسبت بہت کم تھی۔ گزشتہ جنگ عظیم میں برطانیہ اور اس کے شرکار جنگ ہ فتح کا سبب بھی یہی تھا۔ کہ انگلستان سمندروں کا ملکہ تھی۔ اور اب بھی ہے۔ منی کی بحری طاقت ابھی ابتدائی مدارج طے کر رہی تھی۔ جنگ (Jutland) نے ثابت کر دیا تھا کہ جرمنی انگلستان کے جنگی بیڑے کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ جب جرمنی کو سمندر سے بھگا دیا گیا اور اس کی بحری آمد و رفت کو بالکل ختم کر دیا اور اس طریقہ پر کامیاب ناکہ بندی کر دی گئی۔ تو جرمنی ان کی تاب نہ لا کر ہار گیا۔ گزشتہ جنگ عظیم سے اب تک بحری طاقت میں جو تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں اور بحری بیڑے موجودہ جنگ میں کیا کیا فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ آیئے یہ ہم آپ کو بتائیں۔

موجودہ بحری جنگ کے مسئلے کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے جنگ کے فوری اور نہائی مقاصد دوسرے وہ ذریعے اور وسیلے جن کی بدولت ان مقاصد کو حاصل کرنا ہے۔ تیسرے وہ فرائض اور پابندیاں جو بین الاقوامی معاہدوں کی وجہ سے ان ذرائع اور وسائل کو عمل میں لانے پر عائد ہوتی ہیں۔ جنگ میں بحری قوت کا مقصد اولیٰ "بحری قبضہ" حاصل کرنا ہے۔ "بحری قبضہ" کے معنی سمندر کو تجارت اور افواج کی نقل و حرکت کیلئے بالکل محفوظ بنانا۔ اور دشمن کو اس کے استعمال سے محروم کر دینا ہے۔ بحری قبضہ حاصل کرنے کیلئے بحری طاقت کے تمام عناصر کا بخوبی اپنے فرائض کو انجام دینا نہایت ضروری ہے۔ بحری بیڑے کے جہاز جو حملہ کرنے یا مدافعت کے کام میں لائے جا سکتے ہیں ان کا یکجا ہو کر مخصوص علاقوں میں پہرہ دینا۔ پہرہ دیتے وقت اس امر کا خیال رکھنا کہ جو مقام بیڑے نے پہرہ دینے کیلئے مقرر کیا ہے ہر طرح سے ان کے لئے محفوظ اور دشمن کے تباہ کرنے کیلئے نہایت کارگر ثابت ہو۔ اس سلسلے میں ایک ایسا تجارتی بیڑہ نہایت ضروری ہے جو ملک کی تمام ضروریات کو کما حقہٗ پورا کرنے کے علاوہ اس فوج کی جو جنگ کے مختلف محاذوں پر لڑ رہی ہے۔ ضروریات کا بھی خیال رکھ سکے۔

اس قسم کے تجارتی بیڑے کیلئے ایک ایسی عظیم الشان فیکٹری کی ضرورت ہے جو تباہ شدہ جہازوں کی جگہ نہایت سرعت کے ساتھ نئے جہاز بناتے اور جہازوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت بھی ایک معین وقت میں جلدی سے کر سکے۔

بحری بیڑہ دو کام انجام دے سکتا ہے۔ ایک تنہا اور دوسرا فوج کے ساتھ مل کر۔ تنہا یہ صرف دشمن کی بحری رسد کا سلسلہ منقطع کر سکتا ہے۔ اور سمندر پر اس کی نقل و حرکت بند کر سکتا ہے۔ چنانچہ برطانیہ نے بحیرۂ شمالی میں سرنگوں اور گشتی جہازوں کو تعینات کر کے سمندر کو جرمنی کیلئے تنگ کر دیا ہے۔ بری فوج کے ساتھ مل کر یہ دشمن کے ممالک پر حملہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ جرمنی کے ناروے پر حملہ کے بعد کے واقعات اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ فریقین نے اپنی اپنی بحری قوت سے کس حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔ دشمن کی بحری تجارت اور سلسلہ نقل و حمل کو منقطع کرنے کے لئے دو طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ پہلا ناکہ بندی (Blockade) اور دوسرا جنگی مال و متاع (ممنوعاتِ جنگ Contra band goods) پر قبضہ کرنا خواہ یہ مال غیر جانب دار ممالک کے جہازوں ہی میں کیوں نہ اپنی منزل مقصود تک جا رہے ہوں۔ یہ دو طریقے عام تھے۔ مگر جب دشمن کی سرگرمیاں حد سے تجاوز کر گئیں اور اس کی بربریت کی کوئی انتہا نہ رہی تو برطانیہ عظمیٰ نے ۲۷ نومبر ۱۹۳۹ء کو (Order in Council) کے ذریعہ جرمنی کی ان وحشیانہ حرکات کے بدلے میں جو جرمنی آبدوز کشتیوں نے ۱۹۳۶ء کے بحری معاہدے (Submarine Convention) کو ٹھکرا کر اور ۱۹۰۷ء کے معاہدہ ہیگ (Hague Treaty) کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سرانجام دیں۔ بجائیں تو یہ انتقامی اقدام کیا کہ دشمن کے مال کی برآمد فوراً بند کر دی۔ یہ حق دنیا میں ہر زمانہ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ دشمن کا مال و متاع ہاتھ لگنے پر اپنا ہوتا ہے۔ اور ہر ملک نے اس رسم کو لبیک کہتے ہوئے دشمن کے مال پر قبضہ کیا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ نے جنگی بیڑے سے دو کام لئے ہیں۔ اوّل اس کا جنگی بیڑہ دشمن کی افواج کو اتحادیوں کے ملک یا سلطنت کے کسی حصہ پر نہ اترنے دے۔ دوسرے ان کی تجارت کے راستے بند نہ ہونے دے۔ ان پر کاربند ہونے کے اصول ہمیشہ سے ایک رہے ہیں۔ مگر طریقے وقت کی ضروریات اور سائنس کی نئی معلومات و ایجادات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ دخانی جہازوں کے استعمال سے ان کے علاوہ فائدے ہیں جو بالکل ظاہر ہیں۔ چند پابندیاں بھی عائد ہو گئی ہیں۔

دخانی جہازوں کے استعمال سے پیشتر صرف ہوا ہی جہازوں کیلئے ایندھن کا کام دیتی تھی۔ اور جہاز ہوا کی مخالفت اور موافقت

رحم وکرم پہ ہوتا تھا۔ دخانی جہاز کیلئے کوئلہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک کوئلہ نہ ہو جہاز نہیں چل سکتا۔ اسلئے جہاز کی سمندر میں رہنے کی اہلیت کوئلہ کی مقدار پر مبنی ہے۔ آبدوز کشتیوں اور سرنگوں نے بحری بیڑے کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ساحل کے قریب حفاظت سے رہے جہاں اسکو کوئلہ وغیرہ افراط سے مل سکے۔ مگر ہر وقت حرکت میں آنے کیلئے مستعد رہے۔ اور اپنی گشتی جہازوں کی مدد سے دشمن کی نقل وحرکت سے باخبر رہے۔ آبدوز کشتیوں کے حملے سے ساحل اور بندرگاہوں کو چوب روک، بند سطح سے نیچے سرنگوں کا جال بچھا کر توپیں لگا کر محفوظ کرتے ہیں ہوائی جہازوں کے جنگی مقاصد کیلئے استعمال نے ایک نئی الجھن پیدا کردی ہے۔ اور مندرجہ بالا مدافعتی اقدام ہوائی حملوں کے خلاف بیکار ہوگئے اس لئے دوسری تدابیر پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ فضائی حملہ کے خلاف غباروں کا داہ (Balloon Barrage) جنگی ہوائی جہازوں کا دشمن کے ہوائی جہازوں سے مقابلے کیلئے ہر وقت مستعد رہنا۔ اور طیارہ شکن توپوں کا استعمال عمل میں لایا ہے۔ مقناطیسی سرنگوں کا استعمال اب اتنا خطرناک نہیں رہا جتنا جنگ کے شروع میں معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی وثوق کیساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بہتی ہوئی سرنگیں جن کے بچھانے کے ۲۴ گھنٹے بعد پتہ چلانا مشکل ہے کیونکہ وہ سمندر کی لہروں کیساتھ بہتی رہتی ہیں۔ برطانیہ کیلئے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں گی۔ یا پورس کے ہاتھیوں کی طرح جرمنی ہی کے جہازوں کو غرق کریں گی۔

جنگ وجدل میں بحری تجارت پر پوری طرح قبضہ قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ آج کل تین طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ بحری گشت بحری قافلہ (Convoy) اور دشمن کو ان ذرائع سے محروم کرنا جن سے وہ اپنی رسد اور خوردنی اشیاء حاصل کرتا ہے۔

بحری گشت کے معنی ان علاقوں میں جہاں دشمن کے بار بار حملوں کا امکان ہو جنگی جہاز یا طیاروں کا قیام کرنا ہے۔ اس بحری گشت نے مقابلہ سلیبز رگاہو اور تنگ آبنائے وغیرہ میں تمام گذشتہ جنگوں میں تجارت پر حملہ کرنے والے جہازوں نے جو خواہ بڑے مسلح تجارتی جہاز ہوں خواہ آبدوز کشتیاں ہوں دشمن کی تجارت کو تباہ کرنے کی سخت کوشش کی ہے۔ ایسے تجارتی جہازوں کی حفاظت کیلئے ایسے جنگی قسم کے جہازوں کا پہرا دینا جو دشمن کے حملہ آور جہازوں کی زندگی تلخ کردیں عام طور پر مروج ہے اور آج کل آبدوز کشتیاں اور ہوائی جہاز حملہ کرنے اور مدافعت کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ گذشتہ جنگ اور موجودہ جنگ کا تجربہ بتاتا ہے کہ بہت سے ہوائی جہاز اگر ان کو آبدوز کشتی نظر آجائے تو اس کے غرق کرنے میں بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

بحری قافلہ کا مقصد تجارات کی حفاظت ہے۔ تجارتی جہاز جنگی جہازوں اور طیاروں کی نگرانی میں اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ جنگی جہاز تجارتی جہازوں کے آگے پیچھے ٹیڑھی ترچھی لائن میں چلتے رہتے ہیں۔ تاکہ ضرورت کے وقت ہر جہاز کی مدد کو پہونچ سکیں۔

ہوائی جہاز اوپر سے آبدوز کشتیوں کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں جیسے ہی ایک دفعہ آبدوز دکھائی دے جاتی ہے۔ تو ہوائی جہاز اسے اپنی نظر سے اوجھل ہونے نہیں دیتے۔ اور "سمندری گولوں" کی مدد سے غرق کر دیتے ہیں۔ قافلے کے جہازوں کا رنگ بالکل وہی ہوتا ہے۔ جو آفتاب کی کرنیں پڑنے کے بعد سمندر کے پانی کا ہوتا ہے۔ بحری قافلہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ تجارتی جہاز اپنے تمام سفر میں حفاظت سے جاتے ہیں۔ لیکن "ہر جا گل است خار است" بحری قافلہ کے کچھ نقائص بھی ہیں۔ تجارت کے لین دین میں بہت دیر لگتی ہے۔ اور زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایک ایسے قافلے کی جو پوری طرح مسلح نہ ہو دشمن کے اپنے سے زیادہ طاقتور بیڑے سے مٹ بھیڑ ہو جائے تو ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

انگلستان اور فرانس جرمنی کے خلاف قانون پسند ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے معاہدہ واشنگٹن (Treaty of Washington 1922) اور معاہدہ لنڈن (Treaty of London 1930) کی پابندیوں کا خیال رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ غلطی سے اپنے آپ دشمن کی بعض بحری حرکات کا جواب دینے کے ناقابل ہوگیا۔ کیونکہ وہ معاہدہ کے ماتحت کافی تعداد میں ایسے تیز رفتار (Cruisers) نہیں بنا سکا۔ جو دشمن کے مسلح (Cruisers) کا جواب دے سکیں۔ معاہدۂ واشنگٹن کا منظور شدہ دس ہزار ٹن کا جہاز جس میں ۸ لمبی نال والی توپ رکھنے کی اجازت تھی۔ ۱۱ نال والے مسلح جرمنی (Deutschland) کے مقابلے میں ناکارہ ثابت ہوگیا۔ تیسرا طریقہ تجارت پر حملہ کرنیوالے

سامانوں کی رسد کو بند کرتا ہے۔ ایسے جہاز سامان رسد اپنے ملک یا اپنی نوآبادیات
غیر جانب دار ممالک یا دشمن کے اُن جہازوں سے جن کو وہ نشانہ بناسکتے ہیں
حاصل کرتے ہیں۔ جرمنی کو اپنی نوآبادیات کی ضرورت کسی اقتصادی بنا پر
نہیں بلکہ جنگ کے موقع پر سامان رسد حاصل کرنے کیلئے نہایت ضروری ہے۔
کیونکہ گزشتہ جنگ میں جرمنی یہ سامان اپنی نوآبادیات سے حاصل کرسکتا
تھا۔ مگر اس جنگ میں صرف وہ جہاز جو جرمنی کے قریب ہیں وہ تو جرمنی سے سامان
حاصل کرسکتے ہیں۔ جو دور ہیں وہ غیر جانبدار ممالک سے حاصل کرسکتے ہیں۔ جرمنی
اپنے جہازوں میں سامانِ رسد ان جہازوں اور آبدوز کشتیوں کو بھیجتا ہے
جو دور دراز کے سمندروں میں گشت لگا رہے ہوں۔ شمالی سمندر میں اتحادیوں
کی ناکہ بندی کرنے والے بیڑے کا کام ایسے جہازوں کو پکڑنا ہے۔ لیکن بعض جہاز
جو پیچدار اور بعید الفہم راستہ اختیار کرتے ہیں وہ بچ کر نکل آتے ہیں۔ کیونکہ
ناکہ بندی کے راستے ناقابل عبور نہیں دوسرا طریقہ غیر جانب دار ملکوں سے سامان
رسد حاصل کرنا ہے۔

گزشتہ جنگ میں ایمڈن، ([illegible]) اور دوسرے
جرمنی جہازوں نے اپنا سامانِ جنگ و رسد غیر جانب دار ملکوں کی بندرگاہوں
سے حاصل کیا تھا۔ اور آج کل بھی ان جرمنی جہازوں نے جو جنوبی سمندروں میں
پناہ گزیں ہیں۔ غیر جانب دار ملکوں سے اپنا سامانِ رسد حاصل کر رہے ہیں۔
بین الاقوامی قوانین کے ماتحت یہ بالکل درست ہے کہ غیر جانبدار ملک ان جہازوں
کو جو تجارتی ہوں پناہ دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ بین الاقوامی قانون کے منافی
ہے کہ غیر جانب دار ممالک کی بندرگاہیں لڑنے والی حکومتوں کے مقامات
جنگ بن جائیں۔ چنانچہ ان غیر جانبدار ملکوں کو یہ لازم ہے کہ وہ ممکن طور پر
مسلح جہازوں یا ان جہازوں کو جو مسلح جہازوں تک سامانِ رسد لے جائیں
اپنی بندرگاہ میں نہ گھسنے دیں۔ اور ان کو کسی قسم کا سامانِ رسد ہرگز نہ دیں۔ انکی
کسی طرح بھی مدد نہ کریں۔ سامانِ رسد لیجانے کے متعلق "معاہدہ ہیگ"
کی تیرھویں دفعہ کے ۱۰۔ آرٹیکل کی رو سے غیر جانب دار لڑنے والی حکومتوں کو
جنگی جہازوں کو سامانِ رسد دینے یا ان کو اپنے اسلحہ جات کے بڑھانے کی مخالفت
کرتا ہے۔ خواہ یہ رسد ساحل سے آئے خواہ سامان لیجانے والے جہازوں
کے ذریعہ سے۔

اگر لڑنے والے ملک کا بیڑا غیر جانبدار ممالک کی سمندری حد کے باہر
گشت لگا رہا ہو تو اس غیر جانبدار ملک پر واجب ہے کہ وہ اپنے ملک کے جہازوں
کو روکے کہ وہ اس بیڑے تک کوئلہ۔ اسلحہ جات گولے بارود اور سامان خوراک
وغیرہ نہ لیجائیں۔ ورنہ وہ لڑنے والے ملکوں کے جنگی بیڑے کو بحری جنگ کیلئے
اپنے ذرائع استعمال کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔

مندرجہ بالا تین طریقوں کے علاوہ ایک اور طریقہ بھی ہے۔ جو
نہایت کارگر اور عام ہے۔ یعنی تجارتی جہازوں کو مسلح کرنا۔ یہ رسم بہت
دیرینہ اور سہل العمل ہے۔ اور اس پر کسی ملک اور قوم کو کوئی اعتراض نہیں
ہوسکتا۔

بسا اوقات جرمنی بغیر اطلاع دیئے ہوئے تجارتی جہاز ڈبو دیتا ہے
اس کی وجہ جرمنی یہ بیان کرتا ہے۔ کہ جرمنی آبدوز کشتیاں اس قدر کمزور ہیں
وہ اپنے آپ کو سمندر کی سطح پر ظاہر کرنے کا خطرہ برداشت نہیں کرسکتیں۔
کیونکہ ایک دفعہ سطح پر آنے کے بعد آبدوز کشتی کو آسانی سے قابو میں لایا
جاسکتا ہے۔ ۱۹۳۶ کے معاہدہ بحری نے غرق کرنیوالی آبدوز کشتی
کیلئے سطحی بحری جہاز والی شرائط منظور کیں۔ جہازوں کے ڈبونے
کی اجازت تو دیدی مگر اس کے ساتھ یہ شرط لگادی کہ مسافر اور ملاحوں
کو جہاز غرق کرنے سے پہلے امن و حفاظت کی جگہ چھوڑ دیا جائے اور صاف
طور سے یہ واضح کردیا کہ ایک کھلی ہوئی کشتی طوفانی سمندر میں یا ساحل سے
بہت دور امن و امان کی جگہ قرار نہیں دی جاسکتی۔ باوجود ان معاہدوں
کے موجودہ جنگ میں بہت سے انگریزی اور دوسرے ملکوں کے جہازوں کو
بغیر کسی اطلاع کے ساحل سے بہت دور اور طوفانی سمندر میں غرق کردیا۔
([illegible] Conn[illegible]) کا ڈبویا جانا بہت سی مثالوں میں سے
ایک ہے۔ جو بہت خراب موسمی حالات میں ساحل سے ۹۰ میل دور بغیر
کسی اطلاع کے سمندر کی تہ میں پہونچا دیا گیا۔ جہاز کے ملاحوں نے چار دن
کھلی کشتی میں پہاڑی اور طوفانی سمندروں میں گذارے۔ کڑکڑاتا جاڑا
پڑ رہا تھا۔ بہت سے ملاح پالے کی وجہ سے مرگئے اور بہت سوں کا پتہ
ابھی تک نہیں چلا۔ جرمنی نے گزشتہ جنگ میں بربریت کا انتہائی ثبوت
ہسپتالی جہازوں (Hospital Ships) کو ڈبونے سے دیا تھا۔
دنیا کی ہر مہذب قوم ہسپتالی جہازوں کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ لیکن
جرمنی نے باوجود اس کے کہ وہ جہاز بالکل نمایاں نظر آتے تھے۔ ۱۴ جہاز

غرق کر دیے تھے۔ اور اپنی طرف سے یہ صفائی پیش کی۔ کہ جہاز معاہدۂ ہیگ
کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فوجی خدمات انجام دے رہے تھے۔

گزشتہ جنگ میں بحری سرنگیں پہلی مرتبہ استعمال میں آئیں۔ ۱۹۰۷ء میں
ہیگ کانفرنس میں یہ کوشش کی گئی تھی۔ کہ سرنگیں اس طرح بچھائی جائیں کہ غیر
جانبدار ممالک کی تجارت پر اس کا اثر نہ پڑے۔ اس کانفرنس میں برطانیہ کے نمائندے
نے یہ کوشش کی تھی کہ (Unanchored automatic mines) اور ایسی
سرنگیں جب وہ اپنے (Mooring) سے علیحدہ ہو جانے پر بھی
ضرر رساں رہیں۔ استعمال نہ کی جائیں۔ لیکن یہ تجویز جرمنی کے نمائندے کی کوشش
کی وجہ سے منظور نہ ہو سکی منظور شدہ معاہدہ کی دو آرٹیکل یہ ہیں۔

پہلا (Automatic Contact mine) کو دشمن
کے ساحل اور بندرگاہ کے قریب صرف اس کی تجارت کو نقصان پہنچانے اور
بند کرنے کی غرض سے نہ بچھایا جائے۔ دوسرا جب (Anchored
mines) استعمال کی جائیں تو ہر ممکن طریقے سے یہ اطمینان کر لیا جائے
کہ اس سے غیر جانبدار ممالک کی تجارت کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور دستخط
کنندگان نے اس بات کو بھی منظور کیا تھا۔ کہ ہر ممکن کوشش اس امر کی جائے
کہ یہ سرنگیں ایک مقررہ وقت کے اندر بیکار ہو جائیں۔ اور موقع ملنے پر یہ
مالکانِ جہاز کو بذریعہ نوٹس مطلع کریں کہ فلاں فلاں علاقے خطرناک ہیں۔

چنانچہ گزشتہ جنگ میں برطانیہ نے غیر جانبداروں کو تمام اطلاعات بہم
پہنچائیں۔ اور ان راستوں کے نقشے بھی فراہم کئے جن پر بلا خوف و خطر سفر
کر سکتے تھے۔ لیکن جرمنی نے اس قسم کی کوئی اطلاع غیر جانبداروں کو نہیں
دی اور اس جنگ میں بہت سے غیر جانبداروں کے جہاز ڈبو دیے۔

سرنگوں کو بیکار کرنے کیلئے مختلف طریقے عمل میں لائے گئے ہیں
سرنگیں ہٹانے والے جہاز بڑی تعداد میں سرنگیں ہٹانے کے لئے استعمال
کئے جاتے ہیں۔ چھوٹے بحری اور ہوائی جہازوں کے دشمن کی سرنگیں بچھانے
والے جہازوں کو تباہ کرنے کیلئے گشت پر مقرر کرنا۔ یہ طریقے چھوٹے سمندروں
میں سرنگیں بند کرنے (Moored mines) کے لئے کارگر ہیں
جن کے (Mooring) جہازوں میں الجھ سکتے ہیں اور یہ عمل
متناطیسی سرنگوں کیلئے جو سمندر کی تہ میں پڑی رہتی ہیں کارگر نہیں ہو سکتا۔
لیکن اب اس کا بھی توڑ دریافت کر لیا گیا ہے۔ بہتی ہوئی سرنگیں جو معاہدہ
ہیگ کی دفعہ کے خلاف ہے مشکل سے قابو میں آتی ہیں۔ یہ سمندر میں ہر جگہ
بچھائی جا سکتی ہیں۔ رات کو بالکل نہیں دکھائی دیتیں اور دن کو بھی مشکل سے
نظر آتی ہیں۔ سمندر کی لہروں کیساتھ بہتی رہتی ہیں۔

بچھانے کے ۲۴ گھنٹے بعد ان کا پتہ لگانا ممکن ہے۔ ابھی تک وثوق
کیساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سرنگیں بچھانے کے ایک معین وقت کے اندر
بیکار ہو جاتی ہیں یا نہیں۔

جرمنی نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ ماہی گیر جہازوں کا ڈبونا اور ان کے
ملاحوں کو جب ان کا جہاز ڈوب رہا ہو گولیوں کا نشانہ بنانا۔ ان مرنے والوں
کو یہ بتانا کہ وہ برطانوی جنگی بیڑے کے امدادی حصے پر فتح حاصل کر رہے ہیں۔ یہ
محض ایک دھوکا ہے کیونکہ کسی کو یہ شبہ تک بھی نہیں ہو سکتا کہ جہاز مچھلی
پکڑنے کے علاوہ سرنگیں ہٹا رہے ہیں۔ اگر جرمنی مچھلی پکڑنے والے تمام بیڑے
کو شمالی سمندر سے ہٹا دے تب بھی جرمنی کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا
برطانیہ کے صرف تھوڑے سے تجربے کار ملاح کام میں آئیں گے۔ مگر ملاحوں کے
فرقے کا جذبۂ انتقام جرمنی کے خلاف بھڑک اٹھے گا اور وہ برطانیہ کیلئے ہر
قربانی اور ایثار کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیں گے۔

آئندہ کسی اور مضمون میں بحری بیڑے کے مختلف عناصر جہازوں
آبدوز کشتیوں اور سرنگوں کی قسمیں ان کی مشینری اور عمل کے متعلق
کچھ بتایا جائے گا۔

ایم حامد علی
ایم۔ اے

"سترہویں صدی کا ایک گجراتی طنز گو شاعر"

یورپ کے قرونِ وسطی کے باطنی شعرا کی طرح، ہندوستان میں بھی میرا بائی
کبیر، چیتنیہ، تکارام اور دیگر "بھگتی" شعراء تھے۔ مذہبی خیالات و رجحانات صدیوں
سے ہندوستانی ادب پر چھائے رہے۔ پندرہویں صدی کا گجراتی شاعر نرسنہا مہتا
جس کے مذہبی گیتوں اور بھجنوں کی عظمت کا تمام ہندوستان اعتراف کرتا ہے۔ یہ
مہاتما گاندھی اور اس کی آشرم بھجن والی کی کد و کاوش کا نتیجہ ہے۔ سترہویں صدی
کے ابتدائی دور کا سب سے اولوالعزم شاعر بہت پرانا مانا جاتا ہے۔

اس دور کی شاعری دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس وقت کے مذہبی اداروں
کے خلاف ایک شاعر بھی صدائے احتجاج بلند کرنے والا نہیں تھا۔ برخلاف اس کے
انگلستان میں اس کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ جب "مذہب" کا ادب پر کافی دخل ہو گیا
تو چاسر اور لانگ لینڈ جیسی انقلاب پسند ہستیوں سے نہ رہا گیا۔ چنانچہ چاسر نے
کنٹربری کی کہانیوں کے افتتاحیہ میں اور لانگ لینڈ نے (Long
land) اپنی جمہوریت پسند سنجیدہ شاعری میں اس کا اظہار کیا۔ نرسنہا مہتا کی
شاعری میں کسی قدر "اچھوت ادھار" کی روح پائی جاتی ہے۔ ایک مستند آدمی
"کا جانا" یہ ظاہر کرتا ہے کہ مہتا کے طنز نگار قلم میں بھی وہ زور اور اثر تھا جس کے
لئے سوئفٹ (Swift) انگلستان میں حیاتِ ابدی پا چکا ہے اور اسی لئے
نرسنہا مہتا کے اندازِ طنز کو (Swiftean Irony) کہا جاتا ہے۔
پرمانند کی نرسنہا مہتا کی طنزیات زندگی کی شبیہ پسندانہ تصویروں اور اس کا معتقد
دنیا کے رسومات سے ناگزیر تصادم کی لطیف جھلکیوں سے رنگا ہوا ہے۔ اور
پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ:۔

ننھے ننھے نکیلے کانٹوں کا ایک گچھا نگل گیا ہوں میں

لیکن زمانہ کی بے راہ روی اور رسمی شاعری کے خلاف باغیانہ آواز بلند
کرنے والوں میں اکھا کا کوئی دوسرا ثانی نہیں ——— وہ اس رنگ میں
سترہویں صدی کا واحد شاعر ہے۔ جو نکتہ رس لوگوں کی نظروں میں حقیقی فلسفیانہ
نظموں (اکھا گیتا) کا مصنف ہونے کی حیثیت سے گھر کئے ہوئے ہے اور دنیا
اسکو ایک بیباک طنز گو اور "اکھا کے تازیانے" کا مصنف خیال کر کے قدر و منزلت
کرتی ہے۔ اکھا، میرا بائی اور نرسنہا مہتا کے برخلاف ایک فلسفی تھا اور اسے
مذہبی موضوعات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی تمام زندگی "آتم گیان" حاصل
کرنے میں صرف ہوئی جس کا ویدوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی بیشتر شاعری
ویدانتی لہر میں لکھی گئی ہے۔

مذہبی اداروں، خانقاہوں، مہنتوں اور سادھوؤں کی اکھا کی نظروں
میں کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور ان سے انتہائی
روکھا پن برتتا تھا۔ اسلئے اپنی نفرت کا اظہار قطعی غیر مبہم پیرایہ میں کیا ہے اسکی
طنزیات اسکی کھلی ہوئی شہادت ہیں۔

"گوکل ناتھ کو اپنا گرو، بنا کر مجھے احساس ہوا کہ میں ایک
پرانے بچار کا حلقہ بگوش ہو گیا کہ جس نے ایک شخص سے
اس کی دولت چھین لی لیکن مذہب کو ہاتھ نہیں لگایا
کیا بھلائی کر سکتا ہے، ایسا گرو...؟"

اس کے ردعمل کیلئے وہ وشنو آس کا پجاری، ایک بہت بڑے رئیس
موروثی سجادہ نشین سے ملا۔ وہ عبادت کی غرض سے گیا تھا۔ لیکن وہاں کا
برتاؤ دیکھ کر اُسے سخت صدمہ ہوا۔ اور واپس آکر اس نے وہاں کی تہذیب
کا مضحکہ اڑانا شروع کیا۔

"پجاری نے میری طرف دیکھا، لیکن کوئی پرواہ نہ کی۔
اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا اور اکھا کو پہچان لیا۔ لیکن
چونکہ اکھا اب وہ موٹی اسامی نہ تھا جو پہلے تھا اسلئے
وہ وہاں سے نکال دیا گیا جہاں پہلے خوش آمدید کیا
گیا تھا اور دعوت دی گئی تھی یہاں تک کہ عبادت نے

اُس سے صاف کہہ دیا "اَکھا تو ایک رئیس سیٹھ تھا تم وہ
کیسے ہو سکتے ہو؟"

بیشتر شہروں میں، جہاں وہ گیان حاصل کرنے کی غرض سے گیا، اُسے
بے حقیقت، خودنما اور جاہل سادھوؤں اور سنیاسیوں سے دوچار ہونا پڑا
جو "دولت کے اندھے اور عورت کے بھوکے تھے" بیشتر ایسے تھے جو اپنے آپ
کو گرُو کہلواتے تھے۔ لیکن پھر بھی لاعلمی اور نکبت کی گہرائیوں میں پڑے غوطے
کھا رہے تھے۔

"وہ اپنے آپ کو گرُو سمجھتا ہے،
لیکن ایک شخص اپنی گردن میں، ایک بھاری پتھر باندھ کر
کیسے تیر سکتا ہے؟
اور ایسا گرُو، دوسروں کو کس طرح بچا سکتا ہے!"

اُس کے خیال میں مذہبی رسومات، فرقہ پرستی اور مذہبی ادارے
"گیان" حاصل کرنے میں معاون و مدد ہونے کے برخلاف مزاحم کار ثابت ہوتے
ہیں۔ یہ اُس کے نزدیک آہنی بیڑیاں ہیں جو انسان کے پاؤں "گیان" اور
"بھگتی" کی طرف اُٹھنے سے روکتی ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ گیان حاصل کرے
لیکن یہ بڑھ کر اُس کا پیر پکڑ لیتی ہیں اور بہت جلد اُسے گمراہ کر کے تاریکی اور
ادبار کی خوفناک پستیوں میں ڈال دیتی ہیں۔

"کسی زمانہ میں ایک بیوقوف ہر پتھر کو خدا سمجھ کر سجدہ
کرتا تھا۔ اس کے کان کتھا سُنتے سُنتے بہرے ہو گئے،
لیکن پھر بھی اُسے گیان کا عارفانہ نور نہ مل سکا!"

اُس کا عقیدہ تھا کہ جھوٹے خداؤں اور فرضی دیوتاؤں کو سجدہ کرنے
اور پوجنے سے نجات نہیں ملتی۔ اگر انسان کو واقعی خدا کی تلاش اور "گیان"
کی خواہش ہے تو خدا کو پہچاننے سے پہلے اُسے اپنی عظمتوں سے آگاہ ہونا چاہیئے۔
اپنی خودی کو بلند کرنا چاہیئے۔ اپنی ہستی کو سمجھنا چاہیئے یہاں اَکھا اقبال کے فلسفۂ
"خودی" کا ہمنوا نظر آتا ہے۔

"صدہا برس گذر گئے، "تلک" لگاتے ہوئے، "تسبیح" گھِس کے
خستہ حال ہو گئی۔ پیر یاتراؤں کو جاتے جاتے تھک گئے۔
لیکن ایشور پھر بھی قریب نہیں!"

اُس کی شاعری اُس کے ذاتی احساسات اور واردات کا عکس ہے

"تلاش حق" کی مسلسل کاہش و کاوش نے اُسے زندگی کی تلخ کامیوں سے روشناس
کرایا اور یہی وجہ ہے کہ وہ طنز گوئی کی طرف مائل ہوا۔ پیدائش اور پیشہ کے
لحاظ سے ایک سُنار ہوتے ہوئے وہ دنیا کے مکر و فریب کا مقابلہ نہ کر سکا اور کمسنی
ہی میں سب کچھ چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گیا۔ بہن کی موت کا زخم ہنوز بدستور
تھا۔ لہٰذا سادھو اور رشی لوگوں کی آغوش میں پناہ گزیں ہوا جن میں سے
بیشتر بے حقیقت، لاف زن، جاہل، بدکار، حریص اور طامع ثابت ہوئے۔
اس طرح کے مسلسل تجربوں نے اُسے اس جھوٹی دنیا سے اٹھا کر حقیقت اور سچائی
کی دُنیا میں لا کھڑا کیا اور بہت جلد وہ اس جھوٹا دُنیا کی زبوں حالی اور مکاری کو
حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

ایک عورت نے جس کو وہ اپنی بہن سے بھی زیادہ سمجھتا تھا، اس پر
جھوٹ اور سات دگڑات کا شبہ ظاہر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسی وجہ سے
جیل کی ہمت شکن تکلیفوں سے روشناس ہوا۔ اور یہی وہ آخری مصیبت
تھی جس نے اُسے طنز گوئی پر مجبور کر دیا۔ اب اُس کے دل سے شعلے اٹھتے تھے
جو سماج اور سوسائٹی کو فنا کر دینا چاہتے تھے۔ نغموں سے آگ برستی تھی
جو عیاشی، دغا، فریب، بدکاری اور مکاری کے تار و پود کو جلا کر مٹا دینے
کی طاقت رکھتے تھے۔ اُس نے اپنے آتشیں راگوں میں اپنے دل کی آگ بھر دی اور
اپنی آتش نوائی سے سینکڑوں کی آنکھیں کھول دیں۔ —————— انھیں
سید ھا راستہ دکھا کر انسان بنا دیا۔

اَکھا کی طنزیہ شاعری، لانگ لینڈ کی طرح ناتراشیدہ، صاف، واضح
پُر زور اور سادہ ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی شاعری کا انحصار ذاتی
احساسات اور زندگی کے انقلابات پر ہے اور اسی کو وہ پُر زور طریقہ پر اپنے
خاص شاعرانہ انداز میں عوام تک پہونچاتا ہے۔ عوام کو دنیا کے انقلابات سے
آگاہ کر دینا —————— بس یہی اُس کا مسلک ہے اور یہی اس کی شاعری!
لیکن پھر بھی کہیں کہیں اس کے کلام میں بھاؤ ڈھنگ کا اغلاق اور ابہام آجاتا
ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری میں وہ اُن دقیق مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے
جن میں خود بالیدگی اور پختگی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس کی طنزیات
کی مقبولیت سے اُس کی حقیقی شاعری اور فنی قابلیت کا پتہ چلتا ہے یہی
وجہ ہے کہ اُس کے اکثر شعر زبانِ زد خاص و عام ہی نہیں بلکہ دیہاتیوں
کے بول پر بھی نغمۂ الہام بن کر مُسکراتے ہیں۔ اور اس مقبولیت اور شہرت کو

ہم دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شاعر اپنی شاعری کے موضوعات خود اپنی زندگی سے حاصل کرے کہ عوام ہی کو اپنا
سبق دے تو خود دنیا اُس کی طرف کھنچ آئیگی۔ اُس کے حیات افروز نغمہ پر لبیک کہے گی اور اُس کے وقت آشنا قدموں کے ساتھ بام ترقی کی طرف مائل پرواز ہوگی۔ ا۔ح پروانہ بریلوی

روس کا نظامِ تعلیم

(انقلاب کے بعد)

جنگِ عظیم یا جنگِ شہنشاہیت (جیسا کہ روس کے متعدد عوامی حکومت میں موسوم ہے) نے روس کی معاشرتی زندگی اور اقتصادی حالت میں سخت انتشار پیدا کر دیا۔ انقلاب اول سے بہت پہلے بیچارے ننگے اور بھوکے کسان اپنی قسمت کی سزا بھگت رہے تھے۔ انقلاب خانہ جنگی کی شکل میں تمام ملک میں رونما ہوا اور رفتہ رفتہ اس قحط سالی کی وجہ سے جس نے ۱۹۲۱-۲۲ء کو گھیر لیا تھا خود بخود ختم ہو گیا۔ انقلاب کے چار پانچ سال بعد تک انقلابیوں میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنی ملکی، تعلیمی اور سیاسی حالت کو سدھار سکیں۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ انھوں نے ان مسائل کی طرف خصوصاً تعلیم کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ سب سے پہلا کام جو انھوں نے برسرِ اقتدار ہوتے ہی کیا وہ یہ تھا کہ تعلیم سارے ملک میں مفت دی جانے لگی۔ ذات، پات یا اسی قسم کی دوسری فضولیات کا اس سلسلے میں قطعی خیال نہ کیا جاتا تھا۔ تعلیم کا حاصل کرنا ہر شخص کیلئے ضروری قرار دیا گیا۔ تمام کلب اور مذہبی تعلیم گاہیں بند کر دی گئیں۔ نیز مذہبی تعلیم کو کسی صورت سے حاصل کرنا ممنوع قرار پایا۔ یکجائی تعلیم کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔

لینن کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ طبقۂ اشتراکی کیلئے دو چیزیں شرائطِ اولین میں سے ہیں ——— اعلیٰ درجہ کی نسل اور بہترین تہذیب و تمدن ——— انھیں دو باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر اس نے اپنا عملی نظام شروع کیا۔

ملکی بہتری کیلئے تعلیم ہی سب سے بڑا ذریعہ سوچا گیا۔ کیونکہ کسی ملک کی بہتری کا دارومدار اس کے باشندوں کے زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ ہونے پر ہے۔ بہرحال اساتذہ کی اکثریت نے انقلابی حکومت کے زیرِ تحت کام کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور جن لوگوں نے کام کرنا شروع کیا انھوں نے حکومت کے خلاف طلباء میں تبلیغ کرنی شروع کی۔ مدرسوں کی حالت بالکل تباہ کن ہو گئی۔ اب ان کا کام لے دے کر یہ رہ گیا تھا کہ اپنی پرانی عمارتوں کی مرمت کریں یا نئی عمارتوں کی تعمیر میں دن رات سرگرداں رہیں۔ مدرسوں کے ساز و سامان تقریباً ناپید تھے۔ تمام مدرسوں میں ہر اس چیز کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ جو مدرسوں کیلئے ضروری ہیں — مثلاً کتابیں، کاپیاں، کاغذ، پنسل، قلم، دوات، روشنائی، چاک، جھاڑن وغیرہ۔

اور سب سے دقت طلب بات تو یہ تھی کہ ایسے کارخانے بھی نہ تھے جو ان تمام چیزوں کو کافی تعداد میں سارے ملک کیلئے مہیا کر سکیں۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اول اول تعلیمی دور کم امید افزا تھا لیکن ان تمام مشکلات کا حل ایک شخص شیولجن (Shulgin) نامی نے تجویز کیا۔ وہ اس تعلیمی نظام سے سخت برہم تھا۔ اس نے ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ "تم بچوں کو تعلیم کیوں دیتے ہو؟ کیا شاہراہ انھیں تعلیم نہیں دیتی؟ جماعتیں انھیں تعلیم نہیں دیتیں؟ کارخانے انھیں تعلیم نہیں دیتے؟ پھر بتاؤ کہ مدرسوں کی آخر کیا ضرورت ہے؟" لیکن شیولجن کے اس نظریہ کا امید افزا خیر مقدم نہیں کیا گیا۔ خصوصاً جو لوگ پرانے نظامِ تعلیم کو پسند کرتے تھے انھوں نے اس نئے نظریہ کو انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھا اور اسے قطعاً ناپسند کیا۔ اسی دوران میں ایک تحریک شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ گھر بچوں کیلئے ایک ناقص اور [illegible] چیز ہے۔ اسلئے تمام ملک میں دارالصبیان قائم کئے گئے اور تمام بچوں کو اپنے گھروں سے نکال کر ان جدید اداروں میں بھیج دیا گیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اس قسم کی تحریکیں ملک کیلئے کوئی خاص فائدہ نہیں رکھتیں اس لئے ختم کر دی جائیں۔ آخر کچھ عرصہ کے بعد اس قسم کی تمام تحریکوں کو

ختم کر دیا گیا۔ اور اُن تمام بچّوں کو جہاں حد بیاد اروں میں داخل تھے ان کے والدین کے پاس واپس پہنچا دیا گیا:

شروع کے یہ ایام جس طرح کہ زندگی کی دوسری باتوں کیلئے بہت آرام دہ تھے اُسی طرح تعلیم کیلئے بھی بہت آرام دہ تھے۔ تعلیمی تجربات اب حوصلہ افزائی کی حد سے آگے بڑھ چکے تھے اور اسی وجہ سے تعلیم کو اب ضروری قرار دیا گیا تھا۔ جو شخص نئے تعلیمی تجربات کے مسائل پیش کرتا تھا اس کی بے حد حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور اُسے اپنی جماعت کا بہت ہی وفادار رکن سمجھا جاتا تھا اور جو شخص نئے تعلیمی اصولوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اُس سے انتہائی سوئے ظن برتا جاتا تھا۔ غرض تعلیمی دوران میں روس ہر قسم کی تعلیمی سرگرمیوں کا "مکہ" نظر آتا تھا۔ بچّوں کی آزادی ملکی آزادی و ترقی اور حکومت خود اختیاری ہر شخص کا تکیہ کلام ہو رہا تھا۔ اس چیز سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بجائے صرف سوچ بچار کرنے کے لوگوں میں عملی تجربات حاصل کرنیکا جذبہ پیدا ہوا۔ یہی نہیں بلکہ تعلیم اور سیاست کے روابط ظاہر ہوئے اور ان سے یہ بھی عیاں ہو گیا تھا کہ اب تک صرف چند اشتالی اساتذہ پیدا کئے جا سکے ہیں۔ ان کے علاوہ جو غیر اشتالی اساتذہ تھے۔ اُن سے حکومت کو بجائے کچھ فائدہ کے برابر نقصان ہی نقصان ہوتا رہتا تھا۔ ان سب حالتوں کو دیکھ کر یہ طے پایا کہ ابھی بچّوں کو صرف اشتالی اصولوں کی تعلیم دی جائے۔ لیکن اسکے لئے سب سے بڑی دقت یہ درپیش تھی کہ آخر اس کا کیسے جائزہ لیا جا سکے گا۔ اُن کو اس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے یا نہیں کیونکہ اسوقت تک حکومت کے پاس کوئی اشتالی ناظر تعلیم نہ تھا۔ آخر چند ماہرانِ تعلیم کی رائے کے بموجب یہ طے پایا کہ بچّوں اور طالب علموں کو خود انہیں کی ذمہ داری پر جامعہ اور مدرسوں میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی جامعہ اور مدرسوں کو اشتالی اصول پر چلائیں۔ ماہرانِ تعلیم کی اس رائے پر کافی عرصہ تک عمل کیا گیا۔ اور اس کا کچھ اُمید بخش نتیجہ ظاہر ہوا۔ ہر جماعت کے طلبا و بچّے متحدہ طور پر نیا نصاب تعلیم اور نظام الاوقات مرتب کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ہر چیز میں متحدہ دلچسپی لیتے تھے۔ اساتذہ کو بچّوں یا طلبا کی معمولی شکایت پر برطرف کر دیا جاتا تھا۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں کے ماہرانِ تعلیم یقیناً بچّوں کو اس قدر تعلیمی آزادی دینے پر سخت معترض ہوں گے۔ اُن کا اعتراض بجا، مگر انہیں یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ اشتالی تعلیم کے ایام اولیں میں جبکہ اشتالی اساتذہ بہت مشکل سے بچّوں کی تعلیم کیلئے ملتے تھے۔ حکومت اور ماہرانِ تعلیم کے

پاس سوائے اس کے اور چارہ ہی کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ طریقہ عمل دچاہے ہمارے ملک کے ماہرانِ تعلیم کچھ بھی کہیں) تمام تجربوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بچّوں کو مکمل تعلیمی آزادی حاصل تھی۔ بلکہ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً ایسے اساتذہ بہت مشکل سے ملتے تھے جو آزادانہ اور اشتالی اصول پر تعلیمی کام کر سکیں۔ وہ بچّوں کی نفسیات سے بہت کم واقف تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ صرف وہی لوگ بچّے کی نفسیات سے واقف تھے جو نئے طور پر تعلیمی تجربات رکھتے تھے، جن تجربات اور چھان بین نے انقلاب سے پہلے عملی جامہ پہنا تھا وہ کسی حد تک اچھے تو تھے مگر نہایت ہی معمولی پیمانہ پر اور اُن کا اثر بھی کسی حد تک ضرور تھا مگر نہایت ہی کم۔

صرف چند ایسی ہستیاں تھیں جو یہ سمجھ سکتی تھیں کہ بچّوں کو کس قدر آزادی کی ضرورت تھی اور کتنی پابندیاں اُن پر عائد کرنی چاہیئے کہ وہ ان تجربات اور چھان بین کو سمجھ سکیں۔ پھر ایک اور بات ہے کہ اس قدر کم عرصہ میں کسی سخت سوچ بچار کا موقع ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جلد بازی کیوجہ سے تعلیمی ابتری کا بھی دور دورہ تمام اطرافِ ملک میں جاری تھا۔ اب آہستہ آہستہ ناپید ہو رہا تھا۔ اور پھر یہ بھی بات ہے کہ اب ماہرانِ تعلیم اس نتیجہ پر پہونچے کہ اشتالی اصولوں کیساتھ تمام دنیا کے تعلیمی اصولوں میں سے صرف مندرجہ ذیل طریق تعلیم چل سکیں گے۔

(ا) ڈالٹن کا نظامِ تعلیم (Dallon plan)

(ب) اختراعی طریقہ (Project Method)

بالآخر ماہرانِ تعلیم نے اس کا عملی تجربہ کیا اور انھیں مفید پایا۔ ان پر عملی تجربہ کرنے میں یہ بھی آسانی تھی کہ چند اشتالی اساتذہ ان طریقوں سے واقف تھے اور بقول اُن کے کہ یہ طریق تعلیم تمام دنیا کے تعلیمی اصولوں سے آسان ہیں۔ اور ان پر عمل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ لیکن ان سب کے علاوہ جو بڑی بات ان طریق تعلیم کے پسند کرنے میں تھی وہ یہ تھی کہ اساتذہ اور ماہرانِ تعلیم کو کچھ دنوں کیلئے آئے دن کے تعلیمی تجربوں سے نجات مل گئی۔ اختراعی طریق تعلیم کا نفاذ اس کی اصلی شکل میں ہوا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد چند ایسی مشکلات درپیش ہوئیں جس نے اشتالی ماہرانِ تعلیم کو محسوس کرایا کہ اس طریق تعلیم میں بھی کچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے آخر کچھ دن کے سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ اس کو نفسیاتی طریق تعلیم (Conn… Method) کی شکل میں پیش کیا جائے اور اس جدید طریق تعلیم کو ۸ سال کی عمر سے لیکر ۱۲ سال کی عمر تک کے بچّوں کیلئے ہونا چاہیئے۔

بالآخر اس جدید طریق تعلیم کا نفاذ اسی شکل میں ہوگیا جس کیلئے ماہران تعلیم نے سفارش کی تھی اور (Dalton plan) کا نفاذ ۱۲ سال سے زیادہ عمر والے طالبعلموں کیلئے ہوا لیکن اس طریقہ میں بھی کچھ عرصہ کے بعد چند تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ جیساکہ ہیلن پارکھرسٹ (Helen Parkhurst) ذاتی غور و فکر کے ذریعہ اور اُن تجربات کی بنا پر جنھیں امریکہ میں عملی جامہ پہنایا گیا تھا۔ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ "یہ طریق تعلیم ایک اشتراکی ملک کیلئے بالکل انفرادی حیثیت رکھتا ہے" اس جدید طریقے پر انفرادی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ منظم جماعتوں کے ذریعہ ۸ سال سے ۹ سال تک کی عمر کے بچّوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ اسکولوں کی یہ زندگی اشتمالی تعلیمی دور کی ایک زرّیں یادگار ہوتی تھی۔ اس زندگی کی امتیازی خصوصیتوں کو دیکھتے ہوئے اگر ہر اُس تعلیم گاہ کو جہاں یہ تعلیم ہوتی تھی دارالتجربہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ دراصل ہر ایسی درسگاہ دارالتجربہ ہی تھی۔ ہر ایسے دارالتجربہ کے اراکین کا انتخاب کس طرح عمل میں لایا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں کافی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ —

یہاں اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ انتخاب کے وقت اسکا خیال رکھا جاتا تھا کہ بچے یا تو ایک ہی استعداد کے ہوں یا ان میں چند صلاحیتیں مشترک ہوں لیکن دارالتجربہ میں انھیں داخل ہی کچھ اس طریقہ سے کیا جاتا تھا کہ اُن میں خود بھی ان اصولی نظریوں کی جانب بیں دلچسپی لینے کا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ طریق تعلیم بھی اس وقت تک کام دے سکا جب تک کہ نئی نسل تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ بہرحال ان تمام تجربات سے یہ تو ضرور فائدہ ہوا کہ اب اساتذہ بھی اشتمالی اصولوں کے ماتحت تعلیم دینے کے طریقوں سے واقف ہو گئے تھے۔ اور ان میں زندگی پائی جاتی تھی۔

دارالتجربہ کا طریقہ جامعہ میں بھی جاری کیا گیا۔ جہاں آئے دن طلباء کی شکایتوں کی وجہ سے تقریباً تمام اساتذہ نکالے جاچکے تھے۔ اب جامعہ میں ایسی جماعتیں بھی قائم کی گئیں جہاں جامعہ کے طلباء اپنے اساتذہ کی نگرانی میں تحقیقاتی کام کرسکیں۔ ایسی جماعتوں میں طلباء کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس یا تیس ہوتی تھی۔ یہ جماعتیں مختلف حصّوں میں منقسم تھیں۔ جس طرح کہ ہمارے یہاں کی تعلیم گاہوں میں جماعتیں منقسم ہوتی ہیں۔ اپنی جماعتوں کے زیادہ تر کام یہی کرتی تھیں۔ جماعت کے سب سے زیادہ استعداد رکھنے والے سے یہ امید رکھی جاتی تھی کہ وہ کمزور طلباء کی مشکلات حل کرے گا۔ یہ مختلف جماعتیں جو کام انجام دیتی تھیں اس کی تحریری روئداد اپنے سرداروں کو پیش کردیتی تھیں۔ پھر ہر سردار اپنی جماعت کے متعلق روئدادوں کو پڑھ کر اپنے نگراں سے تبادلۂ خیالات کرتا تھا مگر ان سب باتوں کے باوجود بہت کم ایسے اساتذہ تھے جو ان طریقوں کو اصلی حالت میں یا کمی و بیشی کیساتھ عمل میں لاسکیں۔ وہ اپنے دماغ سے ان کے دماغوں پر یہ خیال مسلط کرتا تھا کہ ہر نئے طریقے پر عمل کرنے سے انسان خود استاد ہو جاتا ہے؟ —— حالانکہ کسی نئے طریقہ پر عمل کرنے کیلئے استاد کو اپنے دماغ کو اسی طرف مائل کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت کم ایسے اساتذہ تھے جو بخوشی ان طریقوں پر عمل کرتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی نئی اصول کے ماتحت پر دل لگا کر کام نہ کرے تو اس کا نتیجہ خراب ہی رہیگا۔ یہی حال اس ابتدائی تعلیمی دور میں روس کا ہوا۔

اس تمام زمانہ میں تعلیم کے طریقے معلوم کرنے اور علمی تحقیقات کرنیکا اور چھان بین کا کام محکمہ علم التحقیق (Research Department) ادارہ علم التعلیم (Institute of Pedagogy) اور مستقر التحقیق (Research Stations) کے تحت ہوتا تھا۔ ان اداروں کے نتائج کے مطابق تعلیمی سرگرمیوں میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی تھیں پنج سالہ نظام تعلیم ۱۹۳۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ یہ نظام صرف صنعتی اور اقتصادی ہی نہیں تھا بلکہ اسمیں تمدن کی بہتری کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ کیونکہ اقتصادیات اور صنعت کیساتھ تمدن کی ترقی بھی ضروری تھی۔ سب سے زیادہ ضرورت اُن کام کرنیوالوں کی تھی جو کارخانوں اور مربوطہ آراضیات میں کام کرسکیں۔ روسی ماہرین کو اس سلسلہ میں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ تعلیم نے ملک کی اس ضرورت کو بھی جلد ہی پورا کردیا۔ اب کثیر الفنون مدارس (Polytechnic-ization) کی سخت ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ بالغوں کی تعلیم کیلئے شہری اور دیہی مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ ابتدائی تعلیم۔ دینے والے تعلیمی ادارے قائم کئے گئے اور ان کی تعداد میں جلد اضافہ بھی کردیا گیا۔ اسی دوران میں ننھے بچّوں کی تعلیم کو بھی ضروری قرار دے دیا گیا۔ عورتیں صنعت و حرفت پر قابض ہوئیں۔ مدارس اطفال اور شیر خوار بچوں کی پرورش گاہوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ موجودہ محکمہ تعلیم نے ان سب سے زیادہ نمایاں کام کیا۔ مانٹسوری (Montessori) فاروبل (Froebel) جو کام نہ کرسکے وہ اس محکمہ تعلیم کے ذریعہ سے ہوا۔ اسی محکمہ تعلیم کا یہ کرم بھی تھا کہ اشتمالی سیاست کو اس سے کافی فائدہ پہونچا لیکن یہ سب تقریباً مکمل پرورش گاہ

(Macmillan Tomery School) اور کثیر الفنون مدارس کے کام سے مطابقت
کرتا تھا۔

پنج سالہ نظام ۱۹۳۲ء میں تقریباً پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ تہذیبی اور
صنعتی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسوقت تک کی تمام چیزیں اطمینان بخش تھیں
لیکن جس وقت تمام تعلیمی جزئیات سامنے آئے اور نظریۂ تعلیم پر غور و خوض کیا جانے
لگا تو یہ پتہ چلا کہ اس سلسلہ میں اسوقت تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے
ابھی کافی کام کرنا باقی ہے۔ جسقدر کامیابی سے یہ تو ہوا کہ وہ اشیا جو اسوقت نہیں
ملتی تھیں ملنے لگیں لیکن اس میں بھی ابھی ترقی و بہتری کی ضرورت تھی۔ وقت اب
آگیا تھا کہ مدرسے اپنی تمام ضروریات کی اشیاء یکے بعد دیگرے طلب کرنے لگے تھے
اس کا سبب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مدرسوں کی تعداد، ضروریات کی اشیاء، تعلیمی
سرگرمیوں (ان میں بہت سی چیزیں اب تک عملی تجربہ کی حد تک نہ پہونچی تھیں)
میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشتمالی اساتذہ کی تعداد کافی ہو گئی تھی اور انکی
تعلیمی کوششوں سے نئے تربیت یافتہ اشتمالی اساتذہ کی تعداد میں روز بروز اضافہ
ہوتا رہتا تھا۔ اور یہ لوگ بھی روسی حکومت کے خیر خواہوں میں سے تھے۔ یہ دیکھ کر
حکومت نے اب اس اصول کو ختم کر دیا تھا کہ طلبا اساتذہ کے نگراں ہوں۔ بلکہ اب
معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اب نوجوانوں کی کافی تعداد
اشتمالیت کو سمجھنے لگی تھی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ماہرانِ تعلیم نے اب یہ طے
کیا کہ ماسکی نقطۂ نگاہ (Focal points) کے اصولوں میں کچھ
تبدیلیاں کی جائیں۔ آخر ۱۹۳۱ء میں تعلیمی اصولوں میں تبدیلیاں کرنے اور نئے
طریقِ تعلیم کے چھان بین کیلئے اختراعی طریقۂ تعلیم کو ختم کر دیا گیا۔ اور اسے تمام
ماہرینِ تعلیم نے مکمل طور پر ناکام تسلیم کرلیا۔ بہت سے ماہرینِ تعلیم نے جنھیں
خصوصیت کیساتھ رد کر دیا گیا۔ (Krupskaya) اور لینن
کی بیوی بھی شامل ہیں۔ اس چیز کو صاف طور پر مانا ہے کہ جس قدر بھی اس
سلسلے میں ناکامیاں ہوئیں اسی قدر اساتذہ میں صحیح تعلیمی تربیت اور تجربات حاصل
کرنیکا جوش پیدا ہوا۔ لیکن اس کے برعکس نائب کمشنر تعلیمات (Vice Comm-
issioner of Edu.) ایپاشٹین (Epstein) اپنے ایک بیان میں لکھتا ہے
"میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ یہ طریقۂ تعلیم ایک متوسط طبقہ کے لئے مناسب ہو مگر ایک
ایسے ملک کیلئے جس کے پیش نظر اشتمالیت کے عظیم الشان قصر کی تعمیر ہو۔ یہ مناسب
نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں اسے میں مانتا ہوں کہ اس طریقہ سے بچوں کو بہت سی عملی
باتوں کا تو ضرور پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا بہت سا وقت بیکار قسم
کی سیر و تفریح میں بھی ضائع ہوتا ہے۔ بچے اپنے شہر کی ریل گاڑیوں اور صنعت کے
کام سے تو ضرور واقف ہو جاتے ہیں اور ان کے متعلق کچھ باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ مگر مجھے
بتاؤ کہ کیا وہ ایک جملہ بھی صحیح طور پر لکھ سکتے ہیں اور کیا وہ ایک سوال بھی صحیح طور پر
حل کر سکتے ہیں؟ یقین مانو کہ ہمارے اس طریق سے بچوں کی حساب دانی اور
لکھائی پڑھائی بالکل سادہ ورق کی مانند ہے"۔ ۱۹۳۲ء میں دو سال بعد شاٹسکی
(Shatsky) جس کے اختراعی طریقہ پر مدارس جاری تھے) سے تبادلہ
خیالات کیا گیا۔ اُس نے اس طریقہ کی حمایت کی اور ان لوگوں کو بتایا جو اس سے
تبادلہ خیالات کرتے تھے کہ یہ طریقہ تعلیم اُس کے مدرسوں میں نہایت کامیاب رہا،
ہاں! ساتھ ہی اُس نے یہ بھی ان لوگوں کو بتایا کہ یہ طریقہ تعلیم صرف ذاتی مدارس
میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ چاہیں کہ اسے حکومت جمہوریہ روسیہ کے
عام اشتمالی مدارس میں کامیاب بنائیں تو این خیال است و محال است و جنوں
کے مصداق ہوگا۔ کیونکہ عوامی مدارس میں ہر قسم اور ہر ذہنیت کے بچوں سے سابقہ
پڑتا ہے۔ اس لئے یہ طریقہ ایسے مدارس میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ڈالٹن
کا نظام تعلیم اس اختراعی طریقہ تعلیم سے کچھ دن زیادہ چلا ——— ۱۹۳۲ء میں
اس کو بھی ختم کر دیا گیا۔ اس کے ختم کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسے ممالک اشتراکیہ
جمہوریہ روسیہ کیلئے مناسب نہ سمجھا گیا۔

دو[1] فرمانوں کے ذریعہ مسئلہ تعلیم کو کچھ عرصہ کیلئے پھر طے کیا گیا۔ اول ۲۵ اگست
۱۹۳۲ء میں مجلس مرکزیہ کے حکم سے جس کا تعلق ابتدائی و ثانوی تعلیمات سے تھا اور
دوسرا اسی سال کے ماہ ستمبر میں مجلس انتظامیہ مرکزیہ کے حکم سے جس کا تعلق
اعلیٰ تعلیمات سے تھا۔ ان دو فرمانوں نے جمہوریہ اشتراکیہ کے آئے دن کی تعلیمی
تجرباتی تبدیلیوں کو ختم کر دیا۔ انہی احکامات کے ذریعہ تعلیمی دار التجربوں کے
طریقے بھی ختم کر دئے گئے اور انفرادی طریقِ تعلیم جاری کیا گیا۔ مدرسوں میں
نہایت عمدہ طریقے سے تیار ہو کر اسباق کا دیا جانا اساسی طریقہ پر رائج ہوا۔ اسکے
علاوہ کارخانوں، عجائب خانوں کی تعلیمی سیر و تفریح بھی جاری رکھی گئی۔

دار التجربات میں کام کرنے کے انفرادی طریقے رائج ہوئے کتابی تعلیم
بھی ختم نہ کی گئی۔ جامعہ میں خطبات پھر سے جاری ہوئے۔ اُن کے انتظامات

---

[1] جنوری ۱۹۳۳ء کا "جدید روس و برطانیہ" ملاحظہ فرمائیے۔

مکمل طور پر یا تو مدرسوں سے متعلق کئے گئے یا ناظرِ جامعہ کے سپرد کئے گئے یا حکومت خود اختیاری کے کام خصوصاً جن کا تعلق طلبا سے ہوتا تھا محدود کر دئے گئے۔ (اس کے باوجود موجودہ حالت میں اب بھی دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ ان کا تعلق اس سے ہے) اب اس کے برعکس تعلیمی سیاسی اور مذہب نظریات کے پیشِ نظر مسئلہ تعلیم کو ملک کی فلاح و بہبود کیلئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ پیمانہ پر اسکا حاصل کرنا ہر انسان کیلئے ضروری ہو گیا تھا۔ اور ہر شخص کی یہ تمنی کہ ان اعلیٰ مقاصد کو پیشِ نظر رکھکر تعلیم کا حاصل کرنا ایک اشتمالی حکومت کیلئے ضروری چیز ہے۔

مروجہ درسیات وغیرہ میں بعد کے فرمانوں کے ذریعہ کچھ اور تبدیلیاں اور اصلاحات عمل میں آئیں۔ نئی نئی چیزوں کا تعارف طلبا اور اساتذہ سے کرایا گیا جنہیں خصوصیت کیساتھ میعادی امتحانات اور ان کی روئداد کا طریقہ عالم وجود میں آیا سب سے زیادہ اور ضروری تبدیلی جو ان فرمانوں کے ذریعہ ہوئی وہ یہ تھی کہ اب بجائے ہفت سالہ مدارس کے دہم سالہ مدارس قائم کئے جائیں گے۔ اور اس طریقہ میں تبدیلی اس وقت ہوگی جب نیا پنج سالہ پروگرام عالم وجود میں آئے گا۔

۱۹۳۴ء میں دو فرمان وزیرِ اعظم مالوتوف (Molotov) اور اشتمالی جماعت کے معتمد اسٹالین (Stalin) کے دستخطوں سے جاری ہوئے۔ فرمانِ دوم کے ذریعہ تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم رائج کی گئی۔ ان دونوں میں سے وہ باتیں جن سے بچے کو اس کی زندگی میں کبھی بھی سابقہ نہیں پڑتا نکال دی گئیں۔ استعام (Generalisations) اور اصولی مسائل (Theorising) حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی تعلیم بالکل اسی طور پر دی جاتی ہے جیسے کہ آج ہمارے ملک کے مدارس میں دی جاتی ہے آج روسی مدارس کی حالت ان کے ۱۹۲۱ء-۲۲ء کے مدارس سے بالکل مختلف ہے اُن کی حالت اپنی ملک کی اقتصادی اور سماجی حالت کے دوش بدوش دن رات بہتر ہوتی جاتی ہے اور ملک کی اقتصادی اور سماجی حالت کی بہتری ان کی تعلیمی ترقی کا باعث ہے۔ اس لئے یقیناً باشندگانِ اشتمالیہ روسیہ کا یہ دعویٰ کہ ہمارے ملک کی بہتری کا آلہ صرف تعلیم ہے۔ بالچون و چرا ہم کو ماننا پڑتا ہے۔ کاش ہم سمجھ سکتے کہ ہماری بہتری کا بھی یہی ذریعہ ہے۔ خیر بعض روسی تعلیمی حلقوں میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جب طریقہ تعلیم کے متعلق ہمارے تجربے اپنی اصلی شکل میں دیگر ممالکِ عالم میں بھی جاری ہوں گے۔ روس میں اب تک جو تعلیمی تبدیلیاں ہو چکی ہیں یا ابھی ہونیوالی ہیں اُن کی حقیقت انقلاباتِ زندگی سے زیادہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ روس کے موجودہ دور کا سنگِ بنیاد اُسی کو سمجھنا چاہیئے جو اُس کے شہنشاہی دور میں رکھا گیا۔ اور اسوقت جو طریقہ رائج ہے اُسے اسی سنگِ بنیاد پر ایک عالیشان قصر کی تعمیر سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ عالیشان قصر اسوقت تک نہیں ڈھایا جائے گا جب تک کہ ملک کو کسی دوسرے بہتر سیاسی انقلاب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ خیر چھوڑئے ان قصوں کو اب آئیے یہ دیکھیں کہ اشتمالی تعلیم کے اصول کیا ہیں ——— ؟

سعدی جعفری

فکرِ ناتمام

[illegible]

(نجم الاسلام)

خوشبو بھی ہے تو شعلہ رنگ فنا سی ہے!

[illegible]

جرمنی اور فرانس کا انقلاب ۱۸۴۸ء

(دوسری قسط)

(سلسلہ کیلئے ملاحظہ کیجئے ایشیا مارچ ۱۹۴۰ء)

شہنشاہیت پرست (جو ناجائز ذریعوں سے پلنے اور زیادہ دولت فراہم کرنے کی کوشش کر رہے تھے) ملک کے کارخانوں کو کچھ اس طرح کام میں لا رہے تھے کہ اس سے عام بےچینی بہت بڑھ گئی تھی۔ یہاں تک کہ صنعت سے متعلق بورژوا طبقہ بھی کافی حد تک امرار کے خلاف ہو گیا تھا۔ ان کی مخالفت آئینی تھی۔ وہ شہنشاہیت کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ رائے دہندگی کے طریقوں میں اصلاح کے خواہاں تھے۔ ۱۸۴۷-۴۸ء کے اقتصادی جمود نے بڑی حد تک معاملات کو یکجا کر دیا۔ اس جمود سے فرانسیسی اقتصادیات کا نظام بگڑ گیا۔ اگر ان دو سالوں میں فرانس کی تجارتی آمد اور پیرس کی پیداوار کا مقابلہ کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

	فرانس میں درآمد	پیرس میں صنعتی پیداوار
۱۸۴۷	۱۲۹۰ ملین فرنک	۱۴۶۳ ملین فرنک
۱۸۴۸	۷۰۸ "	۶۷۷ "

صنعت کے اس زبردست تنزل کیساتھ ساتھ بیکاروں کی تعداد میں بھی غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ تقریباً ۱۸۶۰۰۰ مزدور کام سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ طبقاتی کشمکش کافی بڑھ گئی تھی۔ رائے دہندگی کی اصلاح کیلئے جو جد و جہد ایک کشمکش کی صورت میں جاری ہوئی تھی۔ بڑھ کر انقلاب کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ۲۴ فروری ۱۸۴۸ء کو لوئس فلپ فرانس سے فرار ہو چکا تھا۔ شہنشاہیت پرستی کا خاتمہ ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

فروری ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی صحیح نوعیت اور پرولتاریوں کی کارروائیاں

اگر صحیح حالات کا جائزہ لیا جائے تو فروری ۱۸۴۸ء کا انقلاب بورژوا جمہوری انقلابات کی زنجیر کی ایک ضروری کڑی تھا۔ ملک میں بورژوا طبقہ کی تبدیلی ہیئت اور شہنشاہیت کی جگہ جمہوریت کا قیام۔ بورژوں کے زیادہ افراد میں سیاسی اقتدار کو وسیع کرنا اور یورپ میں جہاں جہاں نیم جاگیردارانہ شہنشاہیتیں موجود تھیں اور بورژوا انقلابی تحریکیں ترقی پا رہی تھیں۔ وہاں بورژوا تبدیلی ہیئت کو زیادہ جوش میں لانا اس کا مقصد تھا۔

مگر فروری ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی تکمیل پرولتاریوں کے ہاتھوں سے ہوئی کیونکہ بورژوا افراد کی تمام جد و جہد پارلیمنٹری مخالفت تک محدود رہی جولائی ۱۸۳۰ء کے انقلاب میں بھی فیصلہ کن کام مزدوروں نے ہی کیا۔ حالانکہ وہ اس سے بھی واقف نہ تھے کہ کامیابی سے فائدہ کیسے اٹھانا چاہیئے اور جمہوریت کو کامیابی کیساتھ قائم کیسے کرنا چاہیئے۔ اس انقلاب کے بعد اٹھارہ سال تک پرولتاریوں کی تعداد بڑھتی رہی ان کی ذہنی قوتیں ترقی کرتی رہیں اور انھوں نے کامیابی سے صحیح فائدہ اٹھانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اگر عارضی حکومت نے مختلف بہانے نکالے اور سیاسی حکومت کو قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے کوئی فیصلہ کن کام نہ کر سکی اور ملتوی ہو گئی۔ لیکن پیرس کے پرولتاریوں نے اب تک ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اور انھوں نے زبردستی جمہوریت کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن وہ صرف سیاسی تبدیلی پر ہی قانع رہنا نہیں چاہتے

تھے ۔ وہ مزدوری کی شرائط میں ایک بنیادی سوشلسٹ تبدیلی کے خواہشمند تھے ۔ اس زمانہ میں سب سے پہلی مرتبہ فرانس کے پرولتاریوں نے اپنے مطالبات خود پیش کئے ۔ یہ مطالبے " مزدوروں کی تنظیم " " کام کرنے کے حقوق کا اعلان " وغیرہ پر مشتمل تھے اور ان مطالبات کو اثر انداز بنانے کیلئے مزدوروں کی ایک منسٹری کے قیام کا بھی مطالبہ تھا ۔ پرولتاریوں نے عارضی حکومت (جس میں بورژواؤں کی اکثریت تھی) پر زور ڈالا کہ وہ ممبران حکومت میں چھوٹے بورژوا جمہوریتوں کے نمائندوں کو بھی شامل کریں ۔ ان نمائندوں میں لیڈرو رولن Ledru - Rollin ، فلوکن لوئس بلنک Flocon Louis Blanc ، جس نے مزدوروں کی تنظیم کے ذریعہ سماج میں پُرامن تبدیلی ہیئت کی تجویز مرتب کی تھی اور کارکن البرٹ (Albert) کے نام تھے ۔ پرولتاریوں نے جب اسلحہ کی قوت سے جمہوریت کو حاصل کرلیا تو نئے نظام پر اپنی جماعت کی مہر لگا دی اور سوشلسٹ جمہوریت کا اعلان کردیا ۔ اس طرح جدید انقلابات کی عام خصوصیت ظاہر ہونے لگی ۔ وہ خصوصیت جس کا اس معاملہ میں اس تمام کارروائی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے ۔ جس کو موجودہ سامان کی موجودگی میں فوری طور پر قابل عمل سمجھا جاتا تھا ۔ (Marx The Eighteenth Brumaire of Louis Bonaparte P.30)

ایک ایسے ملک میں جہاں صنعتی سرمایہ داری کو ابھی تک نمایاں پوزیشن حاصل نہیں ہوئی تھی ۔ جہاں بڑے پیمانہ کی صنعت کافی تنزل پذیر ہوچکی تھی ۔ سوشلزم کی کامیابی تقریباً ناممکن تھی اور سرمایہ داری کا آگے بڑھنا ضروری تھا ۔ لیکن پرولتاریوں نے جو اپنی قوت کا اظہار کرچکے تھے اور جو شہنشاہیت کو ختم کرنے اور انقلاب کو جاری رکھنے کے خواہشمند تھے ۔ اپنی تجاویز کو حکومت کے سامنے پیش کردیا ۔ اگرچہ کام کرنے کے حق کا مطالبہ اٹوپین (Utopian) تھا اور وہ فوراً ہی پیداوار پر قابو پاتے ہی سے حاصل ہوسکتا تھا لیکن پرولتاریہ کی کارروائیاں بورژوؤں سے حاصل کئے ہوئے بعض فائدوں کو تباہ کرنیوالی تھیں ۔ پرولتاریوں کے آزاد عمل نے ایک ہی ضرب سے ملک کی مختلف قوتوں کے درمیانی رشتوں میں کافی تبدیلی کردی ۔ فروری سے پیشتر اقتصادی آمریت کے خلاف ایک متحدہ محاذ موجود تھا ۔ باوجودیکہ مختلف جماعتوں میں متضاد باتیں بھی پائی جاتی تھیں اس کے بعد پرولتاریوں نے بورژوؤں کو اپنا مخالف بنالیا ۔ انقلابی تحریک سے انھیں الگ کردیا اور انھیں " سُرخ جمہوریت " (Anti Republican) کا دشمن بنادیا ۔

اگر تاریخ پر غور کیا جائے تو ۱۸۴۸ء کے تجربات بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انھیں تجربات سے سب سے پہلی مرتبہ بورژوؤں کی وہ تمام کارروائیاں صاف طور پر سمجھ میں آئیں جو انھوں نے جمہوری انقلاب کے سلسلہ میں کیں اور پرولتاریوں کی ترقی اور آزاد طاقت کا اظہار ہوا ۔ اس کے ساتھ ہی ۱۸۴۸ء کے فرانسیسی انقلاب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب ایک مرتبہ پرولتاری آزادی کے ساتھ آگے بڑھے تو چھوٹے چھوٹے بورژوؤں نے کیا کیا عملی کارروائیاں کیں ۔ پرولتاریوں کیلئے صرف یہ کام رہ گیا تھا کہ وہ اپنے مطالبوں کو پیش کردیں اور چھوٹے چھوٹے بورژوا (حالانکہ انقلاب سے ان کے بھی بہت سے فوری مطالبوں کا پورا ہونا متعلق تھا) انقلاب کی مخالفت کرنیوالوں کی صف میں شامل ہوگئے تھے ۔

فروری کا مہینہ گذرتے ہی جب پارسیی (Parisian) مزدوروں کا پہلا مظاہرہ ہوا تو فرانس کے بورژوؤں اور متوسط طبقہ والوں نے صرف ایک جماعت کو اپنا دشمن پایا اور وہ پرولتاری تھے ۔ اسی وجہ سے ان کی تمام جدوجہد یہ ہوگئی کہ شہری اور دیہی علاقوں کے چھوٹے چھوٹے بورژوؤں پر فتح حاصل کرکے انھیں بورژوؤں کے لوئس بلنک اور اس کے خیالات کے متحدہ محاذ میں لے آیا جائے ۔

پرولتاری اس سے قطعی ناواقف تھا کہ اُسے جو پوزیشن حاصل ہوگئی ہے اس کو فوراً کام میں کیسے لایا جائے ۔ مستقل انقلابی اجزاء (بلنکی کی رہنمائی میں) کم پائے جاتے تھے ۔ لوگوں کی زیادہ تعداد لوئس بلنک پر اعتماد رکھتی تھی ۔ لوئس بلنک دوسرے چھوٹے بورژوا ٹوپی سوشلسٹوں کی طرح یہ یقین رکھتا تھا کہ سوشلزم تک پہونچنا پُرامن ذرائع اور تقریباً تمام جماعتوں کے اتحاد سے بھی ممکن ہے ۔

بلنک لکھتا ہے ـــ ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے چاہے وہ کسی پوزیشن مرتبہ اور ماحول کا ہو جو نئے سماجی نظام سے بیگانگی اختیار کرے گا ۔ اور یہ انقلاب بہت آسانی کیا تھ پُرامن ذرائع سے ہوسکتا ہے ؟ ان خیالات کے ماتحت لوئس بلنک نے پیرس کے مزدوروں کے گرم مزاجوں کو اعتدال پہ لانے کی کوشش کی اور انھیں ترغیب دی کہ وہ عارضی گورنمنٹ پر

اعتماد رکھیں۔ اس نے یہ بھی ترغیب دی کہ وہ عارضی گورنمنٹ کمیشن (یعنی لکسمبرگ کمیشن [illegible]) جس کا یہ نام اس وجہ سے رکھا گیا تھا کہ اس کے جلسے لکسمبرگ پیلس میں ہوتے تھے، کے تقرر پر رضامندی کا اظہار کریں۔ یہ کمیشن سوشل مطالبوں کا نقشہ تیار کرنے کیلئے مقرر کیا گیا تھا اور اس میں مزدوروں اور دیگر کارکنوں کے نمائندے کو مساوی حقوق کیساتھ شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ جب کہ بلنکی انقلابی انجمنوں سے متاثر مزدوران پیرس نے حکومت پر بے اعتمادی کا اظہار کیا اور عارضی گورنمنٹ کی اصلاح کرانے اور نیشنل اسمبلی کے انتخاب کو ملتوی کرانے (کیونکہ مزدوروں کو یہ اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ دئے ہوئے تھوڑے سے وقت میں وہ مختلف صوبوں میں سرخ جمہوریت" کا پروپگنڈا کامیابی کیساتھ نہ کر سکیں گے) کا مطالبہ کرنے کیلئے ایک مظاہرہ کا انتظام کر رہے تھے۔ اسی وقت لوئی بلنک اس مظاہرہ کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں بلنک نے اس عزت و اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھایا جو مزدوروں کو اس کی ذات سے اسوقت تھا جب وہ ۱۷ مارچ کو دو لاکھ انسانوں پر مشتمل بڑے مظاہرے کو ایک ایسے مظاہرے میں تبدیل کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا جس میں گورنمنٹ کے چھوٹے چھوٹے بورژوا ممبروں (مثلاً لیڈرو رولن [illegible] [illegible]) پر اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ گورنمنٹ نے التوا کے مطالبہ کو منظور کر لیا اور یہ اعلان ہو گیا کہ انتخاب دو ہفتے بعد عمل میں آئیں گے۔ مزدوروں کے نمائندوں نے لکسمبرگ کمیشن (جس کا صدر لوئی بلنک تھا) میں وقت ضائع کیا اور بورژروں نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کر لیا۔ لینن ([illegible]) ۱۸۴۸ء کے تجربات کو یاد دلا رہا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں اس نے مزدوروں کو آگاہ کیا کہ وہ "لوئی بلنک کے معاملہ" جس کو منشویکس [illegible] اور دوسرے انقلابی تیار کر رہے تھے) کا اعادہ کبھی نہ کریں۔

اسی زمانہ میں عارضی حکومت کی پالیسی پرولتاریوں کے خلاف متحدہ محاذ کو قوت پہنچا رہی تھی۔ حالانکہ جولائی میں شہنشاہیت کے ماتحت کافی خسارہ ہوا تھا مگر پھر بھی حکومت بڑے بڑے سرمایہ داروں پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتی تھی۔ جاگیردارانہ دستاویزات کے سلسلے میں سود قبل تاریخ مقررہ بھی لے لیا جاتا تھا لیکن اس کے برخلاف سیونگ بینکوں کو سو فرانک سے زیادہ رقم ادا کرنے کی اجازت نہیں تھی اور سب سے بدتر بات یہ تھی کہ ایسے بنکوں پر ۴۵ فیصدی اضافہ کر دیا تھا جن کا بار براہ راست کسانوں پر پڑتا تھا۔ اس طرح کسان کو مجبور ہو کر جمہوریت (جس کے خاص ہمدرد پیرس کے انقلابی تھے) کا مخالف ہونا پڑا۔

مارچ ۱۸۴۸ء کے شروع میں حکومت کے دایاں بازو کی تجویز پر بیکاروں کے لئے قومی کارخانے کھولے گئے۔ ان کارخانوں میں پیداوار کے کام کی بجائے بیکار کام زیادہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ عارضی حکومت سے بیکاروں کا ایک تعلق ضرور ہو گیا تھا مگر انھیں کارخانوں کے ذریعہ حکومت کا مقصد پبلک میں سوشل کارروائیوں کو غیر مفید ثابت کرنا تھا۔ چونکہ بیکاری بڑھ رہی تھی۔ اس لئے مئی کے شروع ہی میں نیشنل کارخانوں میں ایک لاکھ آدمی کام کر رہے تھے جو امیدوں کے قطعی خلاف انقلاب کے بالکل مخالف نہ تھے۔ اسی وجہ سے حکومت کے دائیں بازو والوں نے انقلاب کی مخالفت میں ایجی ٹیشن جاری رکھنے کیلئے ان نیشنل کارخانوں کو مخصوص کر رکھا تھا۔

ایک لاکھ بیکار آدمی فرانس کے خرچ پر رہتے تھے۔ یہ سب اُن سوشلسٹوں کی کارگزاری کا نتیجہ تھا جو ملکیت کو ختم کر کے ہر چیز کو تقسیم کر دینا چاہتے تھے۔ اتنے بیکاروں کو غذا فراہم کرنے کیلئے (اس کا بھی امکان تھا کہ ان میں ایک لاکھ انسانوں کا اور اضافہ ہو جائے) گورنمنٹ کو ٹیکسوں میں اضافہ کرنا پڑا۔ مشہور و معروف گیت" ان سب کا خاتمہ" اور جاگیروں کی تقسیم کی مخالفت کرو۔ سرخ جمہوریت کی مخالفت کرو" پرولتاریوں کے خلاف متحدہ محاذ کو قوت پہنچانے کیلئے بنائے گئے تھے۔ ان حالات میں جب نیشنل اسمبلی کے انتخابات (۲۳ اپریل) ہوئے تو اس سے انقلاب کی مخالفت میں بہت ترقی ہوئی۔ پیرس کے مزدوروں نے عوام کی حمیٰ تنظیم کی اور یہ مطالبہ کیا کہ نیشنل اسمبلی کو آزادی پولینڈ کی حفاظت کا بیڑا اٹھانا چاہئے اور یورپ میں انقلابی تحریک کو تقویت پہونچانی چاہیئے۔ ۱۵ مئی کو یہ لوگ اسمبلی ہال میں ایک دم گھس گئے اور جلسہ کو درہم برہم کر دینا چاہا۔ انقلاب کے مخالفوں نے اب ارادہ کر لیا کہ وہ پیرس کے پرولتاریوں کو کچل دینگے۔ دارالسلطنت میں فوجیں جمع کر لی گئیں اور ان کو استعمال کرنے کیلئے ایک بہترین موقعہ بھی ڈھونڈ لیا گیا۔

۲۱ جون کو حکومت نے نیشنل کارخانوں کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا اٹھارہ سال اور پچیس سال کی درمیانی عمر والے غیر شادی شدہ لوگوں

کو فوج میں بھرتی کر لیا گیا اور باقی لوگوں کو صوبوں میں واپس کر دیا گیا۔ ایک لاکھ انسانوں کو روٹی سے محروم کرنے کی کوشش کا جواب پیرس کے مزدوروں نے مسلح بغاوت سے دیا۔ ۲۳ جون سے ۲۶ جون تک یعنی چار روز تک وہ بارکوں پر حملے کرتے رہے اور اس بری طرح لڑے کہ رجعت پسندوں کے ایک لیڈر تھیرس (Thiers) نے تو یہاں تک تجویز کیا کہ پیرس کو عارضی طور پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ لیکن بالآخر فوج اور نیشنل گارڈ نے جو جنرل کیوینگ کے زیر کمان تھے بغاوت کو بہت خوفناک کشت و خون کے بعد فرو کر دیا۔

جون کی جنگ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس جنگ میں سب سے پہلی مرتبہ پرولتاری بورژوا لوگوں کی تمام جماعتوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ پیرس کے باغی صاف طور پر سوشلسٹ مقاصد رکھتے تھے۔

انھوں نے ایک اپیل میں یہ بھی لکھا تھا "پبلک کی مدافعت سے ہم جاگیروں کی حفاظت بھی کر رہے ہیں" حکومت کی تشکیل کیلئے انھوں نے جو تجویز پیش کی اس میں بورژوا جمہوری لوگوں کے نام اور بلنکی بلنک اور اسکے ساتھ لوئس نپولین کے نام بھی پیش کئے۔ اسوقت باغیوں کے چند گروہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ نیشنل کارخانوں کو جاری رکھا جائے۔ کام کرنے کے حق اور انجمن کی آزادی کے متعلق ایک فیصلہ کا اعلان کیا جائے اور نیشنل اسمبلی کو ختم کر دیا جائے۔ گرفتار شدگان اور عدالت میں حاضر ہونیوالوں کی فہرست کو دیکھا جائے تو باغیوں میں سے تین چوتھائی سے زیادہ مزدور تھے اور تعلیم یافتہ اور طالبعلموں کی تعداد بہت کم تھی قدرتی طور پر بغاوت شروع ہو گئی۔ عوام نے خود بارکیں بنائیں۔ اس وقت کوئی ایسا مرکز نہ تھا جہاں سے رہنمائی کی جا سکے۔ مختلف محلوں سے بہت سے لیڈر سامنے آ گئے ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو پچھلی تحریکوں میں حصہ لے چکے تھے۔ مثلاً بلنکی کے پیرو۔ مزدور۔ اشتراکی۔ جمہوری۔ جاکوبی Jacobin، وغیرہ۔

صرف جون کی بغاوت ہی ۱۸۴۸ء کے واقعات میں سب سے زیادہ نمایاں واقعہ نہیں تھا بلکہ ۱۸۴۸ء کے بعد پرولتاریوں کی جس قدر بھی کشمکش ظہور میں آئیں ان میں وہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی دلچسپ ہے کہ پیرس کی تحریک سے پہلے صنعتی صوبجاتی مرکزوں کی بہت سی بغاوتیں ظہور میں آ چکی تھیں۔ یہ بغاوتیں عام بدحالی۔ شرحوں کی کمی اور فرودی کی بغاوت میں کام کرنیکا وقت دس گھنٹے روزانہ جو مقرر ہوا تھا اس میں کام لینے والے اضافہ کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں سب واقعات کا نتیجہ تھیں۔ جون کی بغاوت عوام کی رضامندانہ تحریک تھی۔ جس میں چھوٹے بورژوا لوگوں سے چھوٹے ہوئے اور خود اپنی طاقت پہ اعتماد کرنے والے پرولتاری سرمایہ دارانہ سماج کی متحدہ قوتوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

بوناپارٹزم ۔ جون کے بعد بورژوا جمہوریتوں نے اپنی ڈکٹیٹری قائم کر لی۔ لیکن جب ۱۰ دسمبر ۱۸۴۸ء کو شہنشاہ اول کے بھانجہ لوئس بوناپارٹ کو صدر جمہوریت کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تو یہ ڈکٹیٹری ختم ہو گئی۔ جون کی بغاوت میں کام کرنے والے باغیوں کے قاتل کیونگ (Cavaignac) کو پانچ لاکھ ایک ووٹ جبکہ بوناپارٹ کو اسکے مقابلہ میں پانچ لاکھ پانچ ووٹ ملے۔ دسمبر کے انتخاب کی خصوصیت کا اظہار سب سے پہلے مارکس نے کیا تھا۔ اس انتخاب میں چھوٹے چھوٹے کسانوں کی پیرس کے ان کام کرنیوالوں کے خلاف جدوجہد ظاہر ہوئی۔ جن کے متعلق یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ وہ زمینوں پر قبضہ کر لیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس سے اس پرانی بے اطمینانی کا بھی اظہار ہوا جو مالی جمہوریت کیخلاف عرصہ سے چلی آ رہی تھی۔ اول نپولین نے کسانوں میں بہت ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس کی فتوحات نے بغاوت کے زمانے میں حاصل کی ہوئی زمینوں کو ان کے پاس رہنے دی تھی۔ یہی بات نپولین کے بھانجہ کو بھی حاصل ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے قابعض بوناپارٹیوں کو کسانوں کی برادری میں سے سمجھتے تھے۔ دسمبر کے انتخاب نے چھوٹے زمینداروں اور بڑے بورژوا لوگوں کے درمیانی فرق کو زیادہ واضح کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بوناپارٹ کی فتح نے اس فوج کے ایک حصہ کے جذبات کو بھی ظاہر کیا جو خاص طور پر اونچے درجہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اور جسے جون کی بغاوت میں اقتدار حاصل ہوا تھا۔ اسی زمانے میں روس کے ایک سپاہی نے سینٹ پیٹرسبرگ کو اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔

"فوج ایک تبدیلی کی خواہشمند ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک فیصلہ کن وزن رکھتی ہے۔ کیونکہ فوج کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا وہ کسانوں کی طاقت کو پسند نہیں کرتی ہے۔ لیکن اگر کوئی قابل انسان مل جائے تو یہی فوج اپنی تمام طاقت سماج کے ایک مضبوط نظام کو دوبارہ قائم کرنے

دُکھ سُکھ

ایشیا

دوسراباب

فسانے و ڈرامے

ماہ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

میرے ارادے

کائنات کی ہر چیز مسکرا رہی تھی۔ تمام فضا اپنی پوری دلفریبیوں کیساتھ نگاہوں سے گذر کر دل میں گھر کئے ہوئے تھی۔ چپے چپے میں جاذبیت اور ذرّے ذرّے میں دلکشی کے ساماں مہیا نظر آ رہے تھے۔ دل کی لطیف گہرائیوں میں سے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"یہ تمام منظر کتنا حسین ہے" اس آواز کیساتھ ہی۔ دل کی دنیا میں تخیلات کا ایک طوفان اور تصورات کا محشر برپا ہو گیا۔ ہاں۔ یہ میرا پہلا ارادہ تھا۔ بہت معصوم۔ بہت بلند۔ بہت دلفریب مگر بہت مشکل۔ میں نے تہیہ کیا۔ کہ صناعِ ازل کے شاہکار کو صفحۂ قرطاس پر کھینچوں۔ اور پھر ان مٹ جانے والے نقوش سے سامانِ تسکین فراہم کردں۔ میرے ذہن و دماغ کی ساری توجہات فنِ مصوّری سیکھنے کیطرف مبذول ہو گئیں۔ موقلم کو جنبش دی گئی۔ رنگ آمیزی کی گئی۔ دیکھنے والوں نے کہا سبحان اللہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہر خط اصل کا مظہر اور ہر رنگ اپنا خود منظر ہے!؟

اس کے باوجود میری روح مضطرب تھی۔ میرے کمالِ مصوّری میں رنگ تھے۔ مناظر تھے۔ دلفریبی تھی۔ نقل حدِّ اصل تک پہنچ چکی تھی۔ تصور حقیقت ہو چکا تھا۔ میری زندگی کا یہ پہلو صرف مناظرِ قدرت کی لطف اندوزی تک محدود تھا۔ میری نگاہوں میں سبزہ تھا پھول تھے۔ درخت تھے۔ شفق کی ہلکی ہلکی سُرخی تھی۔ ستارے تھے۔ چاند تھا تابناک سورج تھا۔ بارش کے بعد قوسِ قزح کی ہفت رنگی تھی۔ یہ تھا میرا گرد و پیش جس نے مجھے بظاہر مسحور کر رکھا تھا۔ مگر سب کچھ بے جان، مگر سب کچھ تازگی سے محروم،

اب نگاہوں نے یکایک ایک اور منظر دیکھا۔ درد انگیز۔ روح فرسا وحشت ناک۔ کڑکتی سردی پڑ رہی تھی۔ تند و تیز ہوا خون کو رگوں میں منجمد کر رہی تھی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ خدا کی ایک کثیر مخلوق مفلوک الحال انسانوں کی بستی اس وسیع سڑک کے کنارے جس پر ہر وقت تانگے اور امیروں کی موٹر کاریں دوڑتی رہتی تھیں۔ بے خبری پڑی نقصان سے غافل تھی۔ سنگین زمین ان کا بچھونا تھی اور ستاروں بھرا آسمان ان کے مکان کی چھت،

مفلسوں کی یہ آبادی پڑی سو رہی تھی۔ میں سوتے ہوئے اس افلاس اور بھوک کے شہر سے گذر رہی تھی۔ یکایک ایک گوشہ سے رونے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ ایک بچہ کو نمونیہ ہوا اور مر گیا۔ مفلسی اور سردی کے پہلے کارنامے نے میرا دل ہلا دیا۔ اسی حادثہ نے میری توجہ مناظرِ قدرت اور مصوّری سے ہٹا کر انسانوں کی ہمدردی اور اقتصادی حالت کے مطالعہ کیطرف مرکوز کر دیا۔ ایک درخت تھا۔ سڑک کے بالکل قریب جس کے سائے میں ایک بہت بوڑھی بھکارن نے اپنا ڈیرہ ڈال رکھا تھا وہ بالکل اپاہج تھی۔ چلنے پھرنے کے ناقابل۔ سامنے چلنے والے لوگ شاید اس کو پیسے دو پیسے دیدیتے ہوں گے۔ جس سے وہ اپنا پیٹ بھر لیتی ہو گی۔ سردی ہو کر گرمی۔ بارش ہو یا دھوپ اس کی یہ نشست مستقل اور نہ بدلنے والی تھی۔ بیشمار پیوندوں والی ایک بوسیدہ چادر تھی۔ جو تنہا اسکو سردی سے بچاتی۔ ایک روز صبح سویرے ایک نوجوان تیزی کیساتھ اپنی موٹر کار بھگائے چلا آ رہا تھا۔ سامنے سے یکایک تانگہ آگیا۔ تانگہ کو بچانے کیلئے اس نے موٹر کو ذرا بائیں طرف ہٹایا۔ موٹر پورے زور سے چل رہی تھی۔ وہ اسی زور میں سڑک چھوڑ کر پٹری کے اوپر چڑھ گئی جو صرف پیدل چلنے والوں کیلئے وقف تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس درخت کے نیچے پہنچ گئی۔ جہاں وہ بڑھیا اپنی المناک اور تباہ زندگی کے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ اور پھر میری آنکھوں نے صرف یہ دیکھا کہ موٹر پوری برق رفتاری کیساتھ گذر چکی تھی اور اڑتی ہوئی گرد کی آغوش میں بڑھیا کا سر چکنا چور ہو گیا۔ سڑک پر خون بہہ رہا تھا۔ اور وہ دم توڑ چکی تھی۔

اس سانحہ نے میری دنیائے تخیل میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ دل میں سوالات پیدا ہوئے۔ یہ کیوں ہے؟ سوسائٹی کا یہ کیا نظام ہے؟ انسانوں کے ایک طبقہ کیلئے محل ہیں۔ عالیشان مکانات ہیں۔ موٹریں۔ تانگے۔ ہاتھی ہیں۔ گھوڑے ہیں۔ غرض کہ زندگی کو بہترین طور پر گذارنے کی ہر صورت میسر ہے۔ دوسری طرف انسانیت کا ایک انبوہ ہے۔ جس کے پاس رہنے کیلئے مکان ہیں نہ پہننے کیلئے کپڑے اور نہ کھانے کیلئے روٹی۔ اس تہذیب و تمدن کے دور میں ان کا معیار

زندگی ان بار برداری کے حیوانوں سے بلند نہیں۔ جو انسانوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ جب چاہیں ان پر بوجھ لادیں۔ جب چاہیں ان کا گوشت کھا کر ان کو قید زیست سے آزاد کریں۔ آخر یہ کیوں؟ دولت کی یہ غیر مساوی تقسیم کیوں ہے؟ ان سوالات نے میرا سکون برباد کر دیا۔ میرے شب و روز انہیں سوالات کے حل کرنے کی فکر میں گذرنے لگے۔ اور آخر کار میں نے ارادہ کیا۔ کہ تمدن و معاشرت کے اس گھناؤنے قصر عظیم کو برباد کر دینا چاہیئے۔ اس انسانیت سوز نظام کو مٹانے کیلئے مجھے اپنی زندگی وقف کر دینا چاہیئے۔ پورے غور و خوض کے بعد میں نے اپنا تمام وقت اور سرمایہ خدمت حق کیلئے وقف کر دیا۔ اس تمام غیر مساوی تقسیم دولت کا راز ایک ہی حقیقت میں پنہاں تھا۔ اور وہ حقیقت تھی سرمایہ دارانہ نظام جب تک اس نظام میں بنیادی اور موثر تبدیلی نہیں ہوگی۔ افلاس و فاقوں میں کوئی کمی نہیں آئیگی۔

لہذا میں نے مختلف ممالک کے نظاموں کا مطالعہ کیا۔ مختلف اقوام کی گذشتہ تاریخ پر نظر دوڑائی۔ معلوم ہوا کہ جب تک عوام الناس میں سیاسی بیداری اور اپنے حقوق کو تسلیم کرانیکا احساس پیدا نہ ہوگا۔ اس بے زبان طبقۂ انسانی کا برسر اقتدار جماعت اسی طرح ناجائز استعمال کرتی رہیگی۔ میں نے اپنا دماغ۔ وقت اور قلیل ذرائع اس احساس کو جگانے کیلئے وقف کر دیئے۔ قلم سے اور زبان سے لوگوں کو بتایا کہ وہ قعر مذلت سے نکلیں۔ حکومت کو توجہ دلائی کہ وہ رعایا کے راحت و آرام کے اسباب مہیا کرے بہت دوڑ دھوپ کی۔ ایک عرصہ جلاوطنی میں گذرا دشت نوردی کی پیروں کو آبلوں کا خیر مقدم کرنے کیلئے تیار کیا۔ قید خانوں میں شب و روز گذارے۔ کانوں نے مشین گنوں اور بندوقوں کی آوازیں سنیں۔ محبان وطن کو موت سے کھیلتے دیکھا لیکن اس نظام استبدادیت کی مضبوط زنجیریں مضبوط تر ہوتی گئیں۔ قوم فروشوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ خود غرض میدان میں تیزی سے آنے لگے۔

حقوق مانگنے والے شہری غدار کہلانے لگے۔ اور دشمنان ملک و ملت رہنمایان قوم سمجھے جانے لگے۔ یہ نظارا میرے لئے بڑا ہمت شکن تھا اور وہ روح فرسا سکون طلب دل اور بھی زیادہ مضطرب تھا۔ احباب نے کہا: تم پاگل ہو۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا۔ زمانہ ہمیشہ اسی طرح چلا آیا ہے۔ مفلسوں کے نام پر انقلاب برپا کیا گیا۔ پھر جب قوت و اختیار کا زمانہ آیا۔ وہی غریبوں کی چھینے والی جماعت ان کا خون چوسنے کیلئے تیار ہو گئی۔

مخلص راہنما تختۂ دار پر لٹکا دیئے گئے۔ جان نثار کارکن گولیوں کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ اور لوٹ کھسوٹ کیلئے پھر راستہ صاف اور محفوظ کر لیا گیا۔ میں نے جو غور کیا تو حقیقت کی روشنی میں بالکل یہی نقشہ دیکھا۔ یہ نقشہ دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ پیہم دل پر اوس پڑ گئی۔ آرزوئیں یاس و بیم میں تبدیل ہو گئیں پریشانی میں اضافہ ہوا۔ تلاش سکون میں نکلے تھے۔ مگر اضطراب و بے چینی خرید لی۔ دل اکتا گیا۔ تنگ آکر دل نے فیصلہ کیا کہ اس کمینی اور ذلیل دنیا پر لعنت بھیج۔

تو مصلح قوم نہیں۔ ہادی نہیں۔ پیمبر نہیں۔ مجھے کیوں غم ہے مجھکو کی صرف ایک ہی راہ نظر آئی۔ یہ کہ اپنے پیٹ بھرنے کیلئے دیانت دارانہ مشقت کی جائے۔ مادی دنیا سے تمام امیدیں اور اپنے علائق قطع کر لئے جائیں۔ جبیں کو بارگاہ ربوبیت میں جھکانے کیلئے زیادہ سے زیادہ وقت نکالا جائے کیونکہ یہی ابدی سکون و راحت کا سر چشمہ ہے۔ اس راہ پر چل کر مجھے محسوس ہوا کہ ایک عجیب فرحت بخش سکون و راحت کی بارش میرے قلب و روح پر ہو رہی ہے۔ جس سے میری زندگی کا ہر لمحہ فردوس بداماں ہو گیا ہے۔ بیشک یہ میرا بہت عجیب خواب ہے۔ مگر موجودہ زمانے کی شکست خوردگی کی حقیقت اس خواب میں پائی جاتی ہے۔

(مس) تسنیم حفیظ

ڈپٹی

پہلے میں آپ کو ڈپٹی کے معنی بتا دوں۔ یہ لفظ ایک ایجاد بندہ، اصطلاح ہے۔ اور اس سے مراد وہ نسل ہے جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہماری قوم میں پیدا ہوئی۔ اور پچھلے اسی سال میں ہماری قومی زندگی پر چھا گئی۔ یعنی انگریزی حکومت کے ہندوستانی نوکر جن کے مزاج میں پنشن پانے کے بعد بھی اپنے "حاکم" ہونے کا احساس غالب رہتا ہے!

اب چونکہ قومی جد و جہد کے طفیل میں یہ "نسل" غائب ہوتی نظر آتی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کا ایک ریکارڈ باقی رہ جائے۔ لیکن میں آپ کو شروع ہی میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس "قوم ڈپٹی" سے میں بہت بدعقیدہ ہوں اس ریکارڈ میں اگر آپ کو قومی عز و وقار کی حزینہ جھلکتی دکھائی دے تو میں آپ کو جھٹلاؤں گا بھی نہیں۔

میں "ایں قدر داں قدر" کم و بیش درجن بھر ڈپٹیوں سے واقف ہوں، عادتاً دیر آشنا ہونے کے باوجود ہوں۔ لیکن آپ جرمانہ بھی چاہیں اور شہر میں وبا آ جائے تو آپ کر بھی کیا سکتے ہیں! میرے تعارف کو اس پر سے قیاس کر لیجئے۔

آپ اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ ہم نے قومی طور پر سرکاری نوکری کو سب سے بڑی عزت شمار کر کے "ڈپٹی" کے لقب میں وہ اعزاز پیدا کر دیا کہ اب ٹیکا لگانے والے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ویکسی نیشن اپنے آپ کو "ڈپٹی صاحب" ہی لکھواتے ہیں۔ ہاں، تو جب کبھی میں اس "نسل" کے آدمی سے ملتا ہوں تو ہمیشہ یہ اثر لیکے اٹھتا ہوں کہ ایسے دقیانوسی لوگ "حاکمی" کا کام کس طرح چلا سکے! بھپھوندی چڑھے دماغ قانونی نزاکتوں کی قدر کیسے کر سکتے ہیں جن ذہنوں پر مکڑی نے جالے پرو رکھے ہوں۔ جن کے اندر روشنی نہ پہنچتی ہو۔ ہوا کا گزر نہ ہو۔ وہ دماغ حکومت کا کام کس طرح چلا سکتے ہیں! لیکن دیکھ یہ رہا ہوں کہ تیس سال کی طویل مدت نیک نامی سے بسر کر کے لوگ پنشن پا رہے ہیں!

میری اس الجھن کو میرے بعض دوستوں نے یہ بتا کر دور کرنا چاہا کہ فضول

کا سارا انتظام ایسے بندھے ٹکے قاعدے قانون کے تحت انجام پاتا ہے کہ چند مہینے کے اندر ہر کس و ناکس فیصلہ دینے کے قابل ہو جاتا اور مشین کی طرح ترقی پاتے پاتے نیک نامی سے پنشن حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس سے میری تسلی نہ ہوئی۔ میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھایا کہ انگریز چھٹا ہوا زیرک مانا گیا ہے۔ یہ جو اس نے پچپن سال کی قید لگائی ہے۔ سوچ سمجھ کر ہی لگائی ہوگی! پنشن پانے تک یہ لوگ ضرور فہم و فراست سے کام لے سکتے ہوں! لیکن جب دماغ کھوکھلے ہونے لگے ہیں تو مادر مشفقہ حکومت نان نفقہ کی فکر کر کے گھر میں بٹھا دیتی ہے!

مگر اس خیال نے ایک دوسری قومی حزینہ پیش کر دی۔ دنیا کی قوموں میں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ پختہ سال ہو کر ہی لوگ پختہ عقل ہوتے ہیں۔ اور اپنی قوم و ملک کی یادگار خدمت کرتے ہیں۔ ہر پانچویں برس ایک بوڑھا انگریز چالیس کروڑ جانوں کا مختار بنا کر بھیج دیا جاتا ہے! خیر ڈپٹی آفتاب علی کی مدت ملازمت کا یہ خاکہ میری اس کرید کا نتیجہ ہے۔

ہمارے خواجہ حسن نظامی کو شکایت ہے کہ گورنمنٹ کے بعض محکموں میں دہلی والوں کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ مجھے اپنے محکمے کے متعلق حکومت سے یہ شکایت نہیں اور یہ احسان ہے ڈپٹی آفتاب علی کے خاندان کا ان لوگوں کی پامردی اور فنکاری کی بدولت میرے شہر والوں کی حق تلفی ہونا ممکن ہی نہ رہا۔ اب غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آفتاب علی کا خاندان ڈپٹیوں کا خاندان ہے۔

قیاس چاہتا ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے اور گھر والوں نے آفتاب علی نام رکھا تو لوگوں نے ایک نہایت خوبصورت نام سمجھا ہوگا۔ پھر آپ کو یا مجھے کیا حق ہے کہ اس کو غیر حسین اور امتیاز سے عاری نام سمجھیں؟ اور اتنا تو مجبوراً ماننا پڑے گا کہ اس نام کو اپنے مسمیٰ سے مناسبت ضرور ہے! اگر آپ کو اس حقیقت کا علم کیا؟ کہ آفتاب علی کے اندر حصول مقصد کی سرگرمی تھی اور ان کی مطلب برآری کی امید ہمیشہ روشن رہتی تھی!

اسکول اور کالج میں آفتاب علی کی ماسٹر پروفیسر ہمیشہ خوش رہے کہ وہ اس کے دیئے ہوئے سبق اور لکچر بڑے غور سے سنتا اور یاد رکھتا تھا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پچھلی نسل کے پڑھانے والے بھی کچھ یونہی ہوتے تھے۔ یا شاید یہ بات ہو کہ اس وقت تک علم النفس اس قدر معلن و مکمل نہ ہوا تھا؛ ورنہ سمجھا جا سکتا تھا کہ جس شخص میں "شخصیت" مفقود ہوتی ہے۔ اسکی خصوصیت "نقل کرنا" اور "حکم برداری" ہو جاتی ہے! اور چونکہ آفتاب علی کی ذات کسی شخصیت سے داغی نہ تھی اسلئے وہ بچپن سے رٹنے اور پروفیسروں کے ... کو یاد رکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور جب نوکری مل گئی تو ان کی توفیق ... اس پر صرف ہونے لگیں کہ اپنے افسر مجاز کی پسند و ناپسند کو سمجھ کر اس کی مرضی اور حکم کے خلاف کوئی بات نہ ہونے پائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پوری ملازمت کے دوران میں آفتاب علی چند ہی موقعوں پر کسی اضطراری حرکت کے مرتکب ہوئے ہوں گے۔ مجھے تو ایسے ایک ہی واقعے کا علم ہے، جو ... مین صاحب کلکٹر کیساتھ پیش آیا۔ اس کا ذکر اپنے موقعے پر آئیگا۔

آفتاب علی نے بی اے پاس کر لیا تو عمدہ چال چلن اور قابلیت کے سرٹیفکٹوں کا ایک دو ورقہ چھپوا یا گیا۔ یہ ایک جدت تھی اور ہر درخواست کیساتھ نتھی کیا جانے لگا۔ میں آپ کو تعلیمیافتہ فرض کر کے باور کئے لیتا ہوں کہ آپ ان سرٹیفکٹوں کے مضمون سے واقف ہیں۔ تعلیمیافتہ ہونے کے معنی ہی کیا ہوئے مگر آپنے نوکری نہیں ڈھونڈی، درخواستیں نہیں بھیجیں، اور سرٹیفکٹ نتھی نہیں کئے! لیکن پڑھے لکھے ہونے کے باوجود آپ یہ نہ جانتے ہوں گے کہ ان سرٹیفکٹوں میں کچھ نہیں لکھا ہوتا ہے! بایں ہمہ آفتاب علی کے سرٹیفکٹوں میں ایک ایسا بھی تھا جس میں کچھ لکھا بھی تھا۔ یہ بوڑھے پروفیسر جان ہل کا سرٹیفکٹ تھا۔ جس کے اندر یہ فقرہ بھی تھا کہ "میری خواہش تھی کہ وہ (آفتاب علی) اپنے اندر شعور ذات پیدا کرتے!"

اب میں آپ ہی سے سوال کرتا ہوں کہ کیا یہ فقرہ ایک سرٹیفکٹ کی عبارت بن سکتا ہے؟ سرٹیفکٹ کی ایجاد تو اس اصول پر ہوئی تھی کہ اس کے اندر کوئی بات بیان نہ ہونے پائے۔ مگر ایک پروفیسر اور پھر بوڑھا! نیم چڑھا کریلا ہوتا ہی تھا —— لکھ گیا ایک بے تکا فقرہ!

یہ سننے کے بعد میرے ساتھ آپ بھی بوڑھے پروفیسر کی قابلیت پر شک کرنے لگے ہوں گے! لیکن میری آپ کی دونوں کی ذہانت بیکار گئی! اسنئے

آفتاب علی اور ان کے گھر والوں نے اس فقرے کو ایک بے مثال سفارش سمجھا۔ اور اس کی یہ تعبیر کی کہ آفتاب علی کام کرنے میں اپنی ذات کو بھلا دیتا ہے، اسمیں انتہا درجے کا ایثار و فرمانبرداری ہے۔

اگر آفتاب علی کے خاندان کے متعلق چند اشارے نہ کئے جائیں تو آپ آفتاب علی کے کردار کا پوری طرح اندازہ نہ کر سکیں گے۔

ان کا خاندان کوئی چھوٹا موٹا کنبہ نہ تھا۔ قبیلے کے منعمت بہتر کو چھوڑ کر اور مستقبل کے "ڈپٹیوں" کا شمار نہ کر کے بھی دو درجن "ڈپٹی" تھے! ضلع کے سارے دفتروں میں —— مویشی خانے کی کلرکی سے لیکر ڈپٹی کلکٹر تک —— ایک نہ ایک "آفتاب علی" موجود تھا! اس خاندان میں "خاں صاحب" بھی تھے اور جو "خاں صاحب" نہ ہو سکے تھے "حاجی صاحب" بن گئے تھے۔

اس برگشتی آرمی کے کمانڈر یعنی سردار قبیلہ منشی مختار علی تھے۔ منشی صاحب بہت پرانے میونسپل کمشنر تھے اور برابر بنے چلے آ رہے تھے۔ وہ شہر والے جو باہر بہت کم نکلتے بیٹھتے ہیں، منشی مختار علی صاحب کی فٹن جو لارڈ کلائیو کے وقت سے ادھر کی نہ تھی۔ صبح سے لیکر دوپہر تک شہر کے مختلف حصوں میں بار بار دیکھ سکتے تھے۔ اتوار کے روز فوجداری اور دیوانی کے حکام اعلیٰ کی کوٹھیوں سے لیکر منعرم کے مکان اور قرق امین کے چبوترے پر بھی منشی صاحب سے ملاقات ہو سکتی تھی۔

منشی مختار علی کی خصوصیات یقیناً بہت ہوں گی۔ مگر مجھے صرف دو معلوم ہیں۔ ایک تو ان کا وہ رب گراب گرا گھوڑا اور دوسری ان کی بے پھندنے اور بے بونڈی کی ترکی ٹوپی! گھوڑے کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر وقت گر پڑنے کا ارادہ رکھنے کے باوجود کبھی نہ گرا، اور ٹوپی کی خصوصیت یہ تھی کہ اسلامی ہونے کے باوجود شدھی ہو گئی تھی! مگر یہ جداگانہ انتخاب سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اگر کہیں منشی صاحب اپنی ترکی ٹوپی پہنے آج نمودار ہو جائیں تو قیامت کا سامنا ہو۔ ہندو فوراً اعتراض کرینگے کہ تشہیر کی نیت سے ہماری مذہبی چیز شوہنڈی کی نقل بنا کے سر پر اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں لازمی طور سے مسلمان کہیں گے کہ ترکی ٹوپی پہننا ہمارا اسلامی فرض ہے، اور اس کی وضع پر اعتراض کرنا ہمارے اسلامی کلچر کو مٹانے کی کوشش ہے۔ اس پر ناممکن ہے کہ مہاسبھا چپکی بیٹھی رہے۔ وہ ایک آل انڈیا ستیہ گرہ کر دیگی یا اس اعتراض اور اعتراض کے نتیجے میں ایک فرسٹ کلاس بلوہ رونما ہوگا۔

اور اس بلوے کے نتیجے میں جناح صاحب پکارنا شروع کر دینگے کہ اقلیت پر مظالم ہو رہے ہیں —— ہماری ترکی ٹوپی کو ہر وقت ہر وضع اختیار کرنے کا حق حاصل ہے! مگر چونکہ اس پر اعتراض ہوتا ہے اسلئے ہمارا ایک "پاکستانی" وطن ہوگا، اور تمام صوبوں کی اسلامی اقلیتیں ہماری "سوڈیٹن لینڈ" ہونگی اس پر ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوگا۔

اور بالآخر شاید اس کی نوبت آجائے کہ پاکستان اور ہندوستان کیساتھ لا مذہبستان کو تسلیم کرنا ضروری ہوجائے۔ شاید ایک زنانستان بھی!

اس کے بعد یقیناً اور بہت سے "ستان" ضروری قرار پا جائینگے یہاں تک کہ ہر گھر کے مختلف افراد جداگانہ آزاد صوبے بنائیں گے اور اس کی گھر کی ایک فیڈریشن "سورن اسٹیٹ" کا درجہ رکھیگی۔ اس کے بعد سول وار کا زمانہ آجائیگا —— اور پھر قیامت!

خیر تھا تو یہ جملہ معترضہ، لیکن آپ اسے بالکل غیر متعلق بات بھی نہیں کہہ سکتے: ہمارا مقصد منشی صاحب کی رواداری کی اسپرٹ اور بے تعصبی کو اجاگر کرنا بھی تھا۔

منشی صاحب کے پاس اسوقت کے رواج کے مطابق، ایک جزدان تھا۔ اس جزدان میں خاندانی سرٹیفکٹ اور سندیں رکھی رہتی تھیں... وقتاً فوقتاً جب جزدان کھلتا تو اہل قبیلہ خاندانی عظمت کا قصیدہ دہراتے، بزرگوں کی سر بلندی اور عظمت کے قصے یاد کئے جاتے، اور اس بستے کو احترام و عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا۔ کیونکہ وہ ایک بے بہا خاندانی سرمایہ تھا!

اس بستے کے اندر ایک اسم اعظم ایسا تھا جو اپنی ہوا سے سلطنت برطانیہ کے طلسم کرم کو کھولدیتا تھا۔ ایک کرنیل کی چٹھی تھی جس پر اس نے اپنے خون سے دستخط کرکے اس خاندان کی وفا شعاری کی تصدیق کی تھی۔ اسکے ساتھ ایک دوسری باضابطہ سند تھی جو اس خوشنودی کا اظہار کرتی تھی کہ منشی صاحب کے والد نے کرنیل صاحب کو قاتلوں کے ہاتھ سے چھڑایا اور ڈیڑھ سو باغیوں کی سراغ رسی کرکے انہیں کیفر کردار کو پہنچانے میں گورنمنٹ کی قابل تعریف مدد کی۔

خاندان کا ہر فرد اس کو موقعہ بموقعہ دہراتا جسے سُن کر لوگوں پر اس خاندان کی عظمت اور بڑائی کا اثر گہرا ہوجاتا اور ڈیڑھ سو بیگناہوں کے پھانسی پاجانے کا کسی کو احساس و خیال بھی نہ ہوتا۔

مختصر یہ کہ منشی صاحب کے خاندان کی عظمت اس "قوم پرستی" اور "اظہار اخوت" کے صدقے میں تھی۔ منشی صاحب بے شک عزت دار آدمی تھے! وہ حقیقت میں قرن اول کے مسلمانوں کی زندہ مثال تھے! ان کا سارا کنبہ ہی نہیں بلکہ دور و نزدیک کے رشتہ دار بھی سرکاری نوکریاں پا چکے یعنی "ڈپٹی" بن چکے تھے۔ اور آفتاب علی بھی لفٹنٹ گورنر کے حکم سے براہ راست ڈپٹی کلکٹر بنادیئے گئے تھے۔

اس کو ایک حسن اتفاق سمجھئے کہ جہاں آفتاب علی کی پہلی تعیناتی ہوئی وہاں کا کلکٹر پنشن کے دن گننے کی حد میں داخل ہوچکا تھا، اور اٹھائیس سال کی مدت میں اس کی طبیعت پر ہندوستانی آب و ہوا کا کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ اسلئے چلتے چلاتے وہ کسی کے برائی لینا نہ چاہتا تھا۔ اور ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اس میونسپلٹی کا سرکاری چیرمین رہ چکا تھا جس کے ایک نامزد ممبر منشی مختار علی تھے۔ اور منشی صاحب چوبیس گھنٹے میں جتنی بار "خداوند"، "ولی نعمت" اور "غریب پرور" کہنے کے عادی تھے اتنی سانسیں نہ لیتے تھے۔ اور جب منشی صاحب کے قماش کا آدمی ان لفظوں کو بولتا ہے تو ان کے معنی بہت وسیع ہوجاتے ہیں۔ یعنی سرکار والا مدار نے جو ارشاد فرمایا وہی انسب و اولیٰ ہے! اور بھلا اس خانہ زاد کو مجال دم زدن ہو سکتی ہے! وغیرہ۔

اس کے جانے کے بعد جو دوسرا کلکٹر آیا اُسے کتوں کا بڑا شوق تھا۔ ڈپٹی آفتاب علی رات بھر میں کتوں کے ایسے شیدائی بنگئے کہ اگر آپ اُن کے شوق و شغف کو دیکھتے تو آنکھ بند کرکے تناسخ کے قائل ہوجاتے۔ ڈپٹی صاحب کچہری سے اُٹھتے، سیدھے صاحب کی کوٹھی پر پہنچتے، سلام بجالاتے۔ کتوں کی تندرستی کی تعریف کرتے، مہتر سے ان کے کھانے کے متعلق سوال کرتے اور اجابت کے متعلق بھی کبھی کبھی معائنہ کرلیتے۔ پھر چند ہدایتیں دیکر مطمئن ہوجاتے کہ خوشنودی مزاج کا بیمہ کرالیا اور تنخواہ حلال ہوگئی۔

آج کا رنگ تو دوسرا ہے، لیکن کچھ دن پہلے تک ڈالی افسروں اور حکام کا حق قرار پاگئی تھی۔ اگر کسی نے ڈالی پیش نہ کی تو ایک افسر اس بات کو اپنی اہانت تو ہین سمجھ سکتا تھا کہ وہ بے حقیقت خیال کیا گیا۔ بڑا دن آیا تو ڈپٹی صاحب نے بھی ڈالی لگائی اور کیک، مٹھائی، میوے، پھل پھلاری کے علاوہ ایک چھوٹی دار خوان کتے کے بسکٹوں کی سجایا اور دوسرے میں کتوں کے نہلانے کا صابن رکھا۔ یہ ایک ایسا تحفہ تھا کہ صاحب کلکٹر خوش ہوئے بغیر

رہ ہی نہ سکتے تھے۔

"ویل، ڈپٹی صاحب آپ اتنا تکلیف کیوں کیا۔ —— یہ تو سچ ہے! آپ کو ہمارا کتا لوگ سے ریل لو ہے —— تھینک یو ویری مچ!"

ڈپٹی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگے۔

"غریب پرور، خانہ زاد کا بچا بچا بھی گیا تھا۔ وہ جانتا ہے کہ غلام کو حضور کے کتوں سے بہت لو ہے۔ وہ یہ چیزیں لیتا آیا۔ حضور کے کتے بڑے وفادار ہیں —— اور آقائے نعمت وفاداری تو کتے اور انسان سبھی کا جوہر ہے۔"

"آپ سچ بولتا ہے، ڈپٹی صاحب۔ وائٹی از اے گریٹ تھینگ!"

صاحب بہادر چھٹی پر ولایت جانے لگے۔ ڈپٹی صاحب کی "سگ پرستی" "قوم پرستی" کے وزن پر) کے معاوضے میں ان کو اپنے کتوں کا ولی بنا گئے۔ آفتاب علی نے کتوں کی خیریت کا تار دیا جو صاحب کو اس وقت ملا جب وہ جہاز پر سوار ہونیوالے تھے۔ صاحب کلکٹر نے شکریے کی چٹھی بھیجی تو وہ آفتاب علی کی عالی مرتبتی کا سب سے بڑا پروانہ ثابت ہوئی۔ چٹھی پڑھ کر پھولے نہ سمائے۔ خوشی خوشی گھر پہنچے، اور تائی ڈیرہ کے القاب کی اہمیت گھر کی عورتوں کے ذہن نشین کرنے میں پورے ڈھائی گھنٹہ صرف کر دئے۔ دوسرے دن محلے بھر میں خبر تھا کہ ڈپٹی صاحب کو صاحب کلکٹر نے "میرے پیارے" لکھا ہے۔ بعض بوڑھے اس پر چونکتا ہوئے اور ڈپٹی صاحب سے بدگمان بھی مگر وہ تھے ہی اگلے وقتوں کے لوگ!

"ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" ایک ایسی حقیقت ہے جس کے دائرے سے یہ انگریز حکام بھی خارج نہیں۔ ہر صاحب بہادر کسی نہ کسی خبط میں مبتلا اور کسی نہ کسی دھن کا دھنی ہوتا ہے۔ چنانچہ آفتاب علی کو جتنے حکام سے پالا پڑا، تقریباً سب ہی میں تھوڑی بہت سنک تھی۔ ایک صاحب بہادر کو ہندوستانی گیت جمع کرنیکا شوق تھا۔ ان کیلئے ڈپٹی صاحب برسوں سے ڈھولا اور رسیا لکھتے پھرتے تھے۔ دوسرے کو پرانے ریکارڈ کی چھان بین کا خبط تھا۔ اس کے لئے ڈپٹی صاحب محافظ خانے کی گرد سے اٹے رہتے تھے۔ ایک اور آیا تو اسے پرانی کتابیں جمع کرنیکا خبط تھا ——

آفتاب علی نے گھر کی دو چار کتابیں لیجا کر پیش کر دیں اور اپنے اسلاف کی علم دوستی کی عزت بڑھائی۔ اور پھر خطابوں اور آنریری مجسٹریٹی کے پاگلوں سے بڑی بڑی رشوتیں لیکر کتابیں نذر کر کے بامراد کرایا۔

آفتاب علی تبدیل ہوکر ایک ضلع میں پہنچے تو اس کلکٹر کو شکار کی کھالیں جمع کر کے ولایت بھیجنے کی دھن تھی۔ اب جب دیکھو ڈپٹی صاحب موچیوں کے دروازے پر بیٹھے ہیں۔

لیکن ایک آدھ ایسا حاکم بھی ملا جسے اس قسم کا کوئی خبط نہ تھا۔ جس میں آفتاب علی کی عقل و فراست اس کے کام آسکتی، تو ڈپٹی صاحب نے اس کے گھوڑوں کے اصطبل اور مرغی خانے کی صفائی کو اپنا فرض منصبی بنا لیا۔

مختصر یہ کہ ڈپٹی صاحب انگریز حکام کو شیشے میں اتار لینے کے فن میں مشاق ہو گئے تھے۔ لیکن جب کسی نئے حاکم سے سابقہ پڑتا تو ڈپٹی صاحب کو تھوڑی سی دقت ضرور پڑتی تھی۔ اور آپ جانئے تبادلہ ہونے اور موت کے آنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ اس لئے وہ وقت بہت سخت ہوتا تھا جب ڈپٹی صاحب ایک انگریز کی کمزوری کا پتا چلا ہی پاتے ہوں کہ اس کے تبادلے کا حکم آجائے! ہونا بھی چاہیئے کہ جب آپ پتا مار کر ایک حاکم کے مزاج داں بنے ہوں۔ عین اسی وقت ایک دوسرے کو سمجھنے کی الف بے تے شروع کر دینا پڑے۔ یہ صورت اگرچہ نہایت ہمت شکن ہوتی تھی، مگر بل بے آفتاب علی کہ کبھی ہمت نہ ہارے، اور واہ رے آفتاب علی کی قسمت کہ کبھی ناکام نہ رہے!

مگر جب مسٹر بین صاحب سے واسطہ پڑا تو ڈپٹی صاحب کے بھی حوصلے پست ہو گئے۔ مسٹر بین نہایت کھرے مزاج کا انگریز تھا۔ منصبی کاموں میں اسکے لئے ہر کام اہم اور دلچسپ تھا۔ ابکاری کا کام اتنا ہی ضروری تھا جتنا پنچایتی سسٹم کو زندہ کرنا۔ امداد باہمی کے حساب کی دیکھ بھال اتنی ہی اہم تھی جتنی ہندو مسلم فسادات کی روک تھام۔ اس کے اندر یہ بات نہ تھی کہ کسی ایک کام سے دلچسپی ہو اور باقی نظر انداز ہو جائیں۔ وہ صحیح الفکر آدمی تھا اور قوم شناس بھی۔ باتونی اور خوشامدی انسانوں سے طبعاً نفرت کرتا تھا۔ وہ ہندوستانی اتوار کے دن کلکٹر و کمشنر کے سلام کو اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا جمعہ کو، اس قابل تو ہوتے نہیں کہ کوئی سنجیدہ گفتگو کر سکیں۔ مگر چونکہ کچھ نہ کچھ کرنا پڑتی ہے۔ اسلئے وہ اپنے ہی بھائیوں کی غیبت ہو سکتی ہے یا پھر کسی چھوٹے اہلکار کو احسان مند بنانے کے لئے ان کی تعریف۔ مسٹر بین ایسے لوگوں کو ڈانٹ جھڑک دیتا تھا۔ غرض وہ ایک ایسا حاکم تھا کہ خوشامد اسکے پا(س)

بہت کم مراد پاتا تھا۔ اور ایسا کوئی ہندوستانی اس سے مطلب براری نہ کرسکا
جو شستہ انگریزی، وفاداری کا سند یافتہ ہو!

ہم اگر فی بین کو بھی خبطی داروں کے زمرے میں رکھنا چاہتے ہیں تو
وہ انگریز پرست ہندوستانیوں سے نفرت کرنا اس کی جبلت تھا۔ اس کا عقیدہ تھا
کہ جو شخص اپنے ساتھ سچا نہیں، وہی اپنے ملک و قوم سے غداری کرسکتا ہے اور جو
اپنے ملک و قوم کا غدار ہوسکتا ہے وہ دنیا میں کسی کا دوست نہیں ہوسکتا۔ اس
ذیل میں وہ برطانیہ کی غدار نواز پالیسی سے بھی بیزار تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ عام یا خاص
کسی نہ کسی وقت جاگیں گے۔ اسوقت یہ غدار گورنمنٹ کے ہرگز کام نہ آسکیں گے۔

ڈپٹی صاحب، فی بین کی عادت و مزاج کو دیکھ لینے کے بعد بھی اپنی
کوششوں سے باز نہ آئے۔ اور سرکاری و غیر سرکاری حیلے بہانے کوٹھی کے
چکر کاٹ ہی لیا کرتے تھے۔ صاحب نے پہلے تو نرمی و اخلاق سے، پھر بیزاری دکھا کر
اور آخر میں دھتکار کر روکنا چاہا مگر غیرت آفتاب علی کے مسلک میں اسی طرح
معدوم تھی جس طرح افلاطون کی ریپبلک میں شاعری مفقود ہے۔

کلکٹر فی بین ڈپٹی صاحب سے بدگمان تو ہو ہی گیا تھا، اس نے ان کے
دفتر کا معائنہ کیا۔

آپ آفتاب علی کے متعلق جو رائے قائم کرچکے ہیں اس کے بعد یہ بتانا
ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ جس کا نوکری کرنیکا ڈھب آفتاب علی کا سا ہو، وہ
آدمی اپنے کام پر کیا خاک حاوی ہوسکتا ہے! یہ بات بھی ظاہر ہے کہ آپ کا جو
رویہ اپنے افسر کیساتھ ہوگا وہی آپکے ماتحتوں کا آپکے ساتھ ہوگا۔ آفتاب علی کے
ماتحت سرکاری کام کی پروا کم کرتے تھے اور ڈپٹی صاحب کو خوش کرنیکی زیادہ۔
اس سے آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ فی بین صاحب کے معائنے کا کیا نتیجہ ہوسکتا تھا
کلکٹر صاحب نے معائنہ ختم کرکے ڈپٹی صاحب سے کہا۔

"مسٹر آفتاب علی، آپ ایک یونگ فراڈ [illegible]،
ہے، لکھو شامد کے سوا کچھ کام نہیں جانتا! ہم اپنا رپورٹ میں آپ کا پروموشن
روکنے کا سفارش کریگا!"

ڈپٹی صاحب نے اسے اپنی بدقسمتی سے تعبیر کیا کہ ان کے سیکھے ہوئے داؤں
اس انگریز پر نہ چل سکے اور ٹھیک اس وقت جب وہ "خانصاحبی" کی فکر
میں تھے اور پنشن کا زمانہ بھی قریب آرہا تھا ایک اُلو انگریز پلے پڑ گیا! جیسے
ہی صاحب کے منہ سے یہ لفظ نکلے، ڈپٹی صاحب کی اسلامی ٹوپی اس کے بوٹوں
میں پڑی تھی اور وہ گھٹنے ٹیکے اسلامی ڈاڑھی کو آنسوؤں سے تر کرتے ہوئے
گڑگڑا رہے تھے۔

"خداوند مرجاؤں گا، میرا آخری وقت ہے، چھوٹے چھوٹے بابا
لوگ ہیں، میری ڈاڑھی کی عزت حضور کے ہات ہے! حضور مائی باپ ہیں۔
خدا حضور کو لاٹ کرے!"

فی بین کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا، مگر چونکہ سنجیدہ آدمی تھی ضبط کیا اور
کہنے لگا۔

"مسٹر آفتاب علی آپ کو شرم آنا چاہیئے! آپ پرانا ڈپٹی کلکٹر ہے! آپکو
سیلف رسپیکٹ ہونا چاہیئے! آپ کھاندانی جنٹلمین ہے! آپ کو مین لی نیس
(manliness) دکھانا چاہیئے! کام ٹھیک ہوگا تو دوسرا
معائنے کا رپورٹ اف کورس اچھا ہوگا!"

اس دلشکن جواب کو سن کر آفتاب علی کو چچا مرحوم بہت یاد آئے کہ وہ آج
ہوتے تو فی بین کا منہ ہی بند ہوجاتا۔ اُس دن سے آفتاب علی انگریزوں کی پوری
قوم کو طوطا چشم یقین کرنے لگے تھے۔ اس واقعے کا ذکر انہوں نے گھر میں بھی کسی سے
نہیں کیا۔ پنکھا قلی نے اگر نہ دیکھ لیا ہوتا تو ہم بھی آپ کو یہ قصہ نہ سنا سکتے۔

کلکٹر صاحب نے آفتاب علی کے کام کی سخت نگرانی شروع کردی تو ڈپٹی صاحب نے
بیماری کی چھٹی سے لیکر دو سال گزار دیے۔ اور پھر بھی فی بین کا تبادلہ نہ ہوا تو
فرلو کیساتھ پنشن کی درخواست دیدی۔

آجکل وہ اپنے چچا مرحوم کی گدی سنبھالے ہوئے ہیں اور دیکھئے مطالعے کا
دلچسپ موضوع ہیں!

ل۔ احمد (اکبرآبادی)

ناول نویس

مرزا قلندر بیگ رحمانی آئینہ کے سامنے کھڑے ڈاڑھی میں کنگھی کر رہے تھے۔ انہیں ذرا دیر ہو گئی۔ سو ہیں بیگم نے آڑے ہاتھوں لیا۔ "ملے سے ابھی تک ختم ہی نہ ہوا نگوڑا سنگھار۔ بس پڑ چکی پوری۔ روپیہ کا نام منہ کا نوالہ پھیر کر اٹھایا اور دھر لیا۔ آخر پرائی ملازمت ہے۔ وہ نہ پوچھیں گے۔ کیوں حضرت اتنی دیر کہاں رہے؟ پھر کیا کہو گے؟

تمہارا کیا ہے کہہ دو گے۔ گھر میں بیمار تھیں۔ ہیضہ ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کون بتائے کہ حضرت کنگھی چوٹی میں مصروف تھے۔ میں کہتی ہوں تم ڈاڑھی منڈا ہی کیوں نہیں ڈالتے کہ روز روز کے جھنجھٹ سے نجات مل جائے اور پھر یہ تو آج کل کا فیشن بھی ہے"

مرزا قلندر بیگ نے بیوی کی طرف دیکھا اور مسکرا دئے۔ بولے: "تم تو ناحق بگڑ رہی ہو بیگم۔ ابھی تو نو بھی نہیں بجے۔ ہم تو ہر روز ٹھیک وقت پر دفتر پہونچ جاتے ہیں"

بیگم بولیں: "آج روپے ضرور مانگنا۔ سن لیا نا! خالی ہاتھ آئے تو میں کنڈی نہیں کھولنے کی۔ پڑے باہر سر پٹکتے رہنا۔ آخر تمہیں روپے مانگنے میں شرم ہی کس بات کی ہے۔ خیرات تھوڑا ہی مانگ رہے ہو۔ تم نے مہینہ بھر لہو پانی ایک نہیں کیا۔ اُن سے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ دیکھئے ہاروں صاحب ناول تو لکھتا ہوں میں اور وہ چھپتا ہے آپکے نام سے۔ شہرت آپ کی ہوتی ہے اور مجھے کوئی جانتا بھی نہیں کہ کس کھیت کا بتھوا ہے۔ پھر آپ کم از کم اتنا تو کیا کیجئے کہ میری تنخواہ وقت پر دیدیا کیجئے"

مرزا بولے "اجی تم دیکھو تو ہم آج کیسی کھری کھری سناتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو روپیہ لیکر ہی آئیں گے"

بیگم لمحہ بھر تک خاموش رہیں پھر آہ بھر کر بولیں: "وہ تو خدا بخشے ابا میاں کو وہ تین جھونپڑے چھوڑ گئے ہیں جن کے کرائے پر بھلی بُری گذر ہو جاتی ہے ورنہ تمہارے ہاتھوں اللہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔"

مرزا نے کچھ جواب نہ دیا۔ چپکے چپکے کپڑے بدل ڈالے۔ اور پھر جلد جلد قدم اٹھا گھر سے نکل گئے۔ شہر کے دروازے کے باہر پہنچ کر سواریوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گئے۔ اور گھر سے دور ایک غیر مقام پر اُتر پڑے۔ ذرا دیر اِدھر اُدھر سیر گشت کی اور پھر راہ چلتوں کی نظر بچا ایک تکئے میں جا گھسے۔ وہاں ایک پرانی چٹائی پر شطرنج کی بساط بچھی تھی۔ اور اس کے گرد چار پانچ کھلاڑی بیٹھے چالیں سوچنے میں منہمک تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا۔ جیسے ہی ان لوگوں نے مرزا قلندر بیگ کی صورت دیکھی بھانت بھانت کی آوازوں سے ان کی آؤ بھگت شروع کی۔

"آئیے مرزا صاحب قبلہ مزاج اقدس"

"کیوں بے بیٹے اب نکلا ہے گھر سے۔ یہاں تو راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں ہی پتھرا گئیں"

"اجی مرزا صاحب بیگم صاحب کا مزاج تو بخیر ہے؟"

"کیوں مرزا سبزی گھوٹیں"

مرزا صاحب نے آخری بات کو قابل التفات سمجھا۔ فوراً بول اٹھے "بھئی کمال کرتے ہو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ابھی اور اسی وقت"

اتنے میں ان کی نظر شطرنج کے مہروں پر پڑی۔ اب بھلا ان سے کہاں رہا جائے۔ "ہیں ہیں کیا کرتا ہے بے منوے کے بچے۔ وزیر کو بڑھایا تو مات ہو جائے گی۔ فیل کو چل یوں"

اگر کہیں اس وقت بیگم انہیں دیکھ لیں تو مزہ ہی آجائے۔ وہ بیچاری تو یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ اس وقت تک ان کے مصیبت کے مارے میاں نہ جانے کتنے صفحے تصنیف کر چکے ہوں گے۔ اور یہ ہیں کہ اپنے جاننے پہچاننے والوں سے دور۔ ایک گمنام تکئے میں اپنے دوستوں کے ساتھ مزے مزے سے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ اور خرافات بک رہے ہیں۔ کیا پُر لطف سماں بندھا ہے۔ پاس ہی سبزی گھوٹی جا رہی ہے۔ اس کی کھٹا کھٹ کانوں کو کیا بھلی معلوم

ہورہی ہے۔ ایک طرف درخت میں تیتر کا پنجرا لٹکا ہے۔ تیتر کا رورہ کے نئے نئے ڈھنگ سے "سبحان تیری قدرت" کی رٹ لگانا۔ دل کو یا داہنی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر مرزا صاحب کا شطرنج کھیلنا۔ ہر دفعہ کی چال چلنے میں ایسی دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ دیکھنے والوں کے منہ سے بے اختیار واہ نکل جاتی ہے یہاں تک کہ تکئے کا کتا "ٹیگر" بھی ان کے کھیل کو دلچسپی سے دیکھتا معلوم ہوتا ہے۔

مرزا قلندر بیگ رحمانی شاعر بھی تھے اور ناول نویس بھی۔ مگر انہیں لکھنے پڑھنے سے سخت نفرت تھی۔ بھلا یہ سن اور پہروں کاغذ پر جھکے رہنا۔ اور لکھتے چلے جانا۔ دوبارہ سہ بارہ نقل کرنا۔ لاحول ولا قوۃ وہ سے اپنی شان کے شایاں نہ سمجھتے تھے۔ اور اس کام سے انھیں کبھی خوشی نہ ہوتی تھی۔

الغرض مرزا قلندر بیگ رحمانی ہر روز دس سے چار بجے تک اپنی تکئے میں رہتے۔ اور شطرنج گنجفہ وغیرہ کھیلا کرتے چونکہ بیوی کی مختصر سی جائداد کی آمدنی ضروریات کیلئے ناکافی تھی۔ یہ اس میں اس طریق سے اضافہ کرتے تھے۔ کہ انھوں نے اپنے شہر کے مشہور اور خوش حال ناول نویسوں۔ ادیبوں اور شاعروں کی ایک فہرست بنا رکھی تھی۔ اور ان سے باقاعدہ مالی امداد لیا کرتے تھے۔ حقیقت میں ان کی کاشنایت ادب ان کے گدایانہ خطوط تک ہی محدود تھی۔ وہ اس فن کے استاد کامل تھے۔ اپنے خطوں میں ایسے ایسے پیچ دار فقرے۔ ایسی ایسی تشبیہیں اور استعارے اور وہ وہ محاورے استعمال کرتے۔ کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی۔ اور اپنی بے مائگی اور خستہ حالی کو ایسے موثر اور انداز میں بیان کرتے۔ کہ پتھر سے پتھر دل بھی موم ہو جاتا ہے اور سب شاعر اور ادیب اپنے اس کم نصیب بھائی کی امداد پر آمادہ ہو جاتے۔ جب یہ مصنف پرانے ہو جاتے تو مرزا نئے نئے شکار تلاش کرتے اور گدائی کا یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہ آتا۔

ادھر گھر میں انھوں نے بیگم صاحب سے کہہ رکھا تھا۔ کہ ملک میں جتنے بھی ناول نویس اور شاعر ہیں۔ خود تو کچھ کرتے ورتے نہیں۔ البتہ دوسروں سے اُجرت پر لکھوا لکھوا کر اپنے نام سے شائع کر دیتے ہیں۔ بیگم اس بات پر تعجب کیا کرتیں کہ ان کے لائق شوہر خود شہرت حاصل کرنے کیلئے اپنے نام سے کوئی چیز کیوں نہیں لکھتے۔ ایسے موقع پر مرزا متین صورت بنا کر کہا کرتے "الحمد اللہ کہ ادنیٰ درجے کے مصنفوں کی طرح ہمیں شہرت کی مطلق پروا نہیں ہے۔ ہمارا دل غنی ہے اور ہم اسی حال میں مست ہیں۔ شہرت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مصیبت نہیں۔"

غرض مرزا قلندر بیگ تہری زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر میں ایک ادیب بے بدل اور شاعر نکتہ سنج۔ تکئے میں قمار باز۔ اور ادیبوں اور شاعروں کے در پر بھکاری۔

ظہر کے وقت مرزا صاحب نے تکئے کے متولی سے قلم دوات مانگی اور ذیل کی عرضداشت لکھی!

"بلبلِ داستان سرائے گلشن معانی۔ رنگ انوری و خاقانی۔ ادیب العصر فطرت نگار مخدومی جناب مولانا الیاس ہارون دام اقبالہ،

یہ بندۂ عاصی۔ ذرۂ بے مقدار۔ خاکسار۔ آب و گل بنیاد بے حد نادم ہے کہ بار بار جناب کے درِ دولت پر حاضر ہونا اور جناب کیلئے باعثِ زحمت ثابت ہوتا ہوں اے کاش آپ میری بے مائگی اور غربت کا اندازہ کر سکتے۔ جو مجھے بار بار آپ کے کاشانۂ رحمت اور سرچشمۂ فیض سے مستفید ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ کی ذاتِ گرامی ہم ایسے بے مایہ اور نادار مگر خدمتِ زبان کا شوق اور درد رکھنے والے ادیبوں کیلئے ایسی ہی ہے جیسا ابرِ کرم فصل کیلئے۔ اخباروں میں آپ کی نسبت کی خبر پڑھ کر دل نے گوارا نہ کیا کہ میں اپنے محسن کو اس ساعتِ سعید پر مبارک باد دینے سے باز رہوں لیکن افسوس ہے کہ میں بجز اس سہرے کے جو میں شادی کے روز پیش کروں گا۔ اور کوئی تحفہ اس موقع پر پیش نہیں کر سکتا۔ آہ استبدادِ زمانہ اور گردشِ لیل و نہار نے اس درجہ پیش کر رکھا ہے۔ کہ مجھے اور میرے اہل و عیال کو دو دو وقت پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اب ہمیں صرف موت کا سہارا ہے کہ یہ آئے تو ہمیں چین نصیب ہو۔ فقط

تم سلامت رہو ہزار برس - دعاگو

دستخط کئے۔ پتہ لکھا اور خط کو تہہ کر کے لفافے میں بند کیا۔ اس کے بعد مشہور ناول نویس الیاس ہارون کے عالیشان بنگلے پر جا پہنچے۔ کوٹ سے گرد جھاڑی پگڑی کو درست کیا۔ اور نوکر کو بلا کر پر اعتماد لہجے میں کہا "لو میاں یہ خط صاحب کو دیدو۔ میں مخل ہونا نہیں چاہتا۔ باہر ہی جواب کا انتظار کرتا ہوں۔"

نوکر تو خط لے کر اندر گیا۔ اور مرزا صاحب خیالی پلاؤ پکانے شروع کئے۔ دیکھیں آج کیا ملتا ہے۔ بیس نہ سہی پندرہ تو مل ہی رہیں گے۔ کیا عجب مہربان ہو کر پچاس ہی دیدے۔

خادم خالی ہاتھ لوٹ آیا "سرکار نے کہلا بھیجا ہے کہ اگر آپ نے اپنی منحوس صورت دکھائی تو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"دل لگی کرتے ہو"

نہیں صاحب بھلا دل لگی کا کیا موقع! جو انھوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کر دیا!

نہایت شکستہ دل کیساتھ وہاں سے لوٹ آئے۔ بیگم کو سنانے کیلئے ایک قصہ تراشا اور کسی قدر مطمئن ہو گئے۔ اپنی ناکامی کا الزام ناول نویس کی بخیلی اور کم ظرفی پر نہیں دھرا۔ بلکہ اُسے اپنی عرضی کی ناموزونیت پر محمول کیا۔ کہ صحیح طریق پر استدعا نہیں کی گئی۔ تجربہ کار کھلاڑی تھے۔ جانتے تھے اگر تیر نشانہ پر نہ بیٹھے تو اسمیں شکاری کا کیا قصور!

اب سنئے ادھر الیاس ہارون اپنی منسوبہ جمیلہ طلعت کی دلدہی میں معروف تھے۔ جو اپنے بھائی کے ہمراہ اپنے ہونیوالے شوہر کے دار المطالعہ کا معائنہ کرنے آگئی تھی۔ اُس نے بھائی کو تو ایک آرام کرسی پر بٹھایا اور خود کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ الماری سے کتابیں نکال نکال کر فرش پہ ڈھیر کر دیں۔ پھر مسودات کو تہ و بالا کرنے لگی۔ زیر تصنیف ناول کے اس حصے پر رائے زنی کی جو اچانک اس کے وہاں آجانے سے ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ ایک حسین الھڑ امیر زادی تھی۔ جس سے ہر شخص نہایت ملائمت اور شفقت سے پیش آتا تھا۔ جب وہ کاغذات کی دیکھ بھال میں معروف تھی۔ تو اتفاق سے مرزا قلندر بیگ رحمانی کا نوشتہ اس کے ہاتھ آگیا۔ کھول کر پڑھنے لگی۔ پڑھ چکی۔ تو ٹھنڈا سانس لیکر بولی۔

ہے ہے بیچارا مصیبت مارا۔

تم نے اُسے کیا دیا؟

• مگر —— •

• تم نے اُسے کچھ دیا بھی؟

• سنو تو —— •

نہیں میں کچھ نہیں سنوں گی۔ چلو ابھی اٹھکر اس کے ہاں چلیں۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ پچیس تم دو پچیس میں۔ بس ابھی اٹھ بیٹھو۔ آہ کیا معلوم بے چارے نے اسوقت تک خودکشی ہی کرلی ہو۔ اٹھو بھی۔ نہیں تو مارے ہول کے رات بھر مجھے نیند نہیں آنے کی۔

تھوڑی دیر میں دونوں موٹر میں بیٹھ کر مرزا قلندر بیگ کے لکھے ہوئے پتے کے مطابق اُن کے گھر پہ پہنچ گئے۔ الیاس ہارون نے کاغذ کے ایک پرزے پر اپنا نام لکھ کر ایک چھوٹی لڑکی کے ہاتھ جو باہر کھیل رہی تھی اوپر بھجوایا۔ تھوڑی دیر میں لڑکی نے آکر بیان کیا کہ مرزا صاحب خود تو گھر پہ نہیں ہیں۔ لیکن بیگم صاحبہ کہتی ہیں۔ کہ آپ اوپر تشریف لے آئیے۔"

جس وقت دونوں اوپر مردانے میں پہنچ گئے۔ تو مرزا قلندر بیگ کی بیوی پردے کے پیچھے یوں گویا ہوئیں۔

"اچھا آپ ہی ہیں مولانا الیاس ہارون صاحب۔ شکر ہے۔ خدا نے میری ایک آرزو پوری تو کردی۔ میں ہمیشہ یہ دعا مانگا کرتی تھی کہ الٰہی ان لوگوں سے جو میرے شوہر کا خون چوس چوس کر بڑے ناول نویس بنے پھرتے ہیں۔ کبھی منہ در منہ باتیں کرنا ——

"بیگم صاحب...."

"بس چپ رہیئے۔ میری بات سنئے۔ مجھے اس میں کچھ اعتراض نہیں کہ میرا شوہر آپ کو ناول لکھ کر دیتا ہے جنھیں آپ اپنے نام سے چھاپ لیتے ہیں کیونکہ یہ تو آج کل کے ناول نویسوں کا دستور ہے۔

"بیگم —— "

"رونا تو اس بات کا ہے کہ آپ مہینوں اُس غریب کی مزدوری بھی دبا رکھتے ہیں۔ اور پھر اللہ رے آپکے جھوٹے وعدے۔

آج نگوڑا بنک بند ہے۔ کل ڈاکخانے میں تعطیل۔ پرسوں منی آرڈر نہیں آیا اترسوں چیک بک گم ہو گئی۔ آخر میں پوچھتی ہوں۔ آپ لوگ اپنا کاروبار بھی چلاتے ہیں کہ نہیں۔ ہائے خدا اسی طرح ہماری ضرورتوں کا بھی خیال کر لیا کرو اور پھر مجھے تم سے ایک شکایت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ تم اُسے شام کے سات سات آٹھ آٹھ بجے تک ٹھیرائے رکھتے ہو۔ آخر یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا —— لو وہ مرزا صاحب بھی آگئے۔

مرزا قلندر بیگ رحمانی کے چہرے پر انتہا درجے کی وحشت برس رہی تھی عجب گو مگو کا عالم تھا۔ صاف صاف کہدیں تو یہ ڈر کہ بیگم سُن پائیں گی تو جیتا چھوڑیں گی۔ اور کہے بغیر چارہ نہیں۔ آخر انھوں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے ہاتھ سے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ بڑی بی کا چل گیا ہے۔ اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگے!

"الیاس ہارون نے چلا کر کہا۔ تم ایک ہی چھٹے ہوئے بدمعاش ہو۔ میں تم سے سمجھوں گا!"

جب موٹر گھر کو لوٹ رہی تھی تو الیاس ہارون نے کہا۔

"جمیلہ میں قسمیہ کہتا ہوں —— "

غلام عباس

قانون!؟

سلطانہ قاضیہ

وہ کوڑے پر بیٹھی کھیل رہی تھی۔ سگرٹ کی پنی پالینا اور اس سے کھیلنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا ـــ وہ کھیلتی رہی دن چڑھا۔ مگر اس کا کھیل کچھ پھیکا پڑنے لگا۔ حالانکہ آج اس کو دو تین سگرٹ کی خالی ڈبیوں میں سے چاندی مل گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کا دل اچاٹ سا ہوتا جا رہا تھا!!

وہ وہاں سے اٹھی۔ اُسے پیٹ میں ہلکا ہلکا سا درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسکی عادی تھی۔ بغیر دھیان دئے وہ پائی ہوئی چیزیں سمیٹ کر ایک طرف کو روانہ ہو گئی! ـــ اور شہر کے کنارے تویلے کے پاس ایک چھوٹی سی کٹیا میں داخل ہو گئی اُس کٹیا میں جسے کٹیا کہنا بھی ظلم ہے۔ اس نے ٹوٹے ہوئے گھڑے میں سے پانی پیا۔ جو کٹیا کی ساری کائنات تھا۔ اور پھر اُس نے اپنی "چاندی" اس ٹوٹے ہوئے چولہے کے اندر رکھ دی۔ جس میں آگ برسوں سے نہیں جلی تھی اور نہ جلنے کی امید تھی۔

سورج سر پر آگیا۔ دو پہر ہو گئی۔ وہ بیتاب ہو کر ادھر اُدھر پھرنے لگی۔ نہ معلوم اس نے کتنے چکر اس پھونس کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے باہر لگائے۔ جنہیں کبھی دروازہ لگا ہوگا۔ یا لگانے کا خیال ہوگا۔ وہ سڑک پر گھوم گھوم کر واپس آگئی۔ تم کب آؤگے بابا ـــ؟ .... انسان کی بہت سی آرزوؤں اور امیدوں کی طرح اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔

سورج بھی ڈھلنا شروع ہو گیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ چولہے میں سے جمع کی ہوئی چیزیں۔ مثلاً پنی۔ سگرٹوں کے ڈبے۔ رنگ برنگ کے چیتھڑے۔ ٹین کے چمکدار ڈھکنے ـــ یہ اس کی جمع کردہ پونجی تھی۔ اس نے سب کو نکال دیکھا۔ وہ چونکی! ـــ باہر کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی۔ وہ بھاگی۔ باہر آئی ـــ کچھ بھی نہ تھا!! ـــ ایک خوانچے والا پاس سے گزر گیا۔ اس کی پیٹ کی آگ اور بڑھ گئی ـــ وہ اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پیسے تھوڑی ہی تھے۔ جو خوانچے والا پوچھتا: بی بی کیا چاہیئے!

وہ واپس آئی۔ انتظار بڑھ گیا۔ اُس نے ایک ایک چیز چولہے میں دوبارہ سجا کر رکھ دی۔ مگر باپو کا پتہ نہ تھا! ـــ سورج بھی معلوم ہوتا تھا کہ تھک کر سونے کو جا رہا ہے۔ وہ بھی وہاں زمین پر اپنی جمع کی ہوئی محبوب چیزوں کے پاس لیٹ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے! وہ کچھ سوچنے لگی۔ وہ ہی خوانچہ جو اس نے ابھی دیکھا تھا بلوا آئے گا۔ وہ ہی خوانچہ لائیگا! مٹھائی!! اور وہ گول گول لال لال کیا اس کا نام ہوتا ہے؟ ـــ؟ اُس کے علم نے جواب دیدیا! البتہ تصور کی آنکھیں وہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ جو پیٹ بھروں نے صرف اپنے لئے رکھا ہے!

"باپو ـــ باپو" وہ رونے لگی۔ سو گئی یا غافل پڑی تھی۔ کون جانا؟ ـــ

"باپو۔ باپو ـــ روٹی ـــ روٹی باپو" ـــ وہ پھر رونے لگی۔ دنیا بھی اُسے دیکھ کر غم سے کالی ہو چکی تھی۔ وہ روتے روتے تھک کر غافل ہو گئی اور سو گئی نہ معلوم کتنی دفعہ اٹھی۔ باپو کو پکارا۔ روئی اور پھر غفلت کی گود میں گر گئی۔

"کیوں رے بدمعاش" یہ ہے تیرا گھر؟ اور یہ کون ......"

"منی ......منی!! اس نے آنکھیں کھولیں۔

"باپو تم آگئے؟ باپو۔ روٹی باپو .... روٹی لائے؟"

وہ کوشش کر کے اٹھی۔ جوش میں آکر اپنے باپ سے لپٹ گئی۔ جو سپاہیوں کی گرفت

میں گھڑا تھا۔

"منی!!

"بابو! — روٹی دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ ..... تم کہہ کر گئے تھے کہ مٹھائی لاؤ گے۔ لاؤ مٹھائی .... !؟"

سپاہیوں کی خونخوار نگاہوں نے اسکو اسکی رنگین دنیا کے اظہار کا موقع بھی نہ دیا۔ وہ پھر باپ سے لپٹ گئی۔

"تلاشی لو، بے ایمان کی۔ نہ معلوم کیا کیا چرا رکھا ہوگا۔"

دو سپاہی بڑھے۔ وہاں انھوں نے فدوی، کی کارگذاری دکھانے کے لئے ٹوٹے ہوئے دو تین مٹی کے برتنوں کو اور بھی توڑ ڈالا —— چولہے میں سے پتا چمکا!! وہ بڑھے۔ گویا کسی ڈاکے کا سُراغ لگانے جا رہے ہیں۔ ایک جھکا کر دیکھے اسمیں کیا ہے ——— مگر یہ سب کچھ وہ بھی تو دیکھ رہی تھی! باپ کی گود میں سے مچل کر اتر ی۔

"اس کو مت چھو بابو جی! —— بابو جی! —— اسمیں میری 'چاندی' ہے۔ بابو جی ...."

اس نے چولہے کو اپنی سوکھی اور چھوٹی چھوٹی باہوں میں لیلیا۔ وہ اس پر لپٹ گئی۔

"ہٹ پرے"۔ ایک سپاہی نے ڈانٹ کر کہا۔ دوسرے سپاہی بھی اپنے قانون کے حامی ساتھی کی مدد کو بڑھے۔ "ہٹاؤ پرے' ...... دیکھو اسمیں کیا ہے'...... یہ کوئی کسی ڈپٹی صاحب کی بیٹی تھوڑے ہی تھی۔ جس کے نخرے سپاہی اٹھاتے!

"ابی سرکار! اسمیں بچی نے اپنا کھیل کا گوڑ بھر رکھا ہے۔ بھلا ایک فقیر کے پاس ہو ہی کیا سکتا ہے؟"

وہ کہتا رہا۔ ایک سپاہی نے اس کمزور، فاقہ زدہ لڑکی کو اٹھا کر پھینک دیا!! باپ کی التجا اور اس کی ہچیوں کے کمزور ہنگامے میں وہ چیزیں نکلیں جن کو لوگوں نے بیکار سمجھ کر اپنے گھروں سے پھینکدیا تھا!

"اسمیں تو کوئی خاص چیز نہیں نکلی؟"

"ارے بتا، تو چوری کا مال کہاں رکھتا ہے؟"

"حضور میں نے آج سے پہلے چوری .... کوڑے کی سختی نے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔

"اسکو تھانے لے چلو"

"میری منی، حضور اسکو بھی لیچلو۔ نہیں تو یہ مرجائے گی۔ اس کو بھی میرے ساتھ جیل میں بند کردینا۔"

"پاگل تو نے چوری کیا ہے یا اس نے؟ .... قانون بے گناہوں کو قید نہیں کرتا!"

سپاہی اسکو تھانے کی طرف لیچلے۔ وہ دور تک اس کے رونے اور چیخنے کی آواز سنتا رہا۔ جو رفتہ رفتہ غائب ہوگئی۔

وہ پڑی رہی نہ معلوم کب تک ——— اس کے دماغ میں دو الفاظ گونج رہے تھے۔ چوری!! اور جیل!" باپ نے چوری کی وہ جیل گیا ——— باپ نے چوری کی تو جیل گیا —— جیل"

بازار بھرا ہوا تھا۔ کہ نان بائی چیخا۔ "ارے پکڑنا، پکڑنا یہ دن دھاڑے چوری ——"

دو تین بہادر نان بائی کی مدد کو دوڑے۔ تندرست نوجوان نے جھپٹ چور کو پکڑلیا......... وہ جلدی جلدی روٹی کھانے لگی۔ مگر یہ روٹی چرائی ہوئی تھی۔ اس نے قانونی نقطہ نگاہ سے اسکو نہیں کھانا چاہیئے۔ جبھی تو ایک نوجوان نے اس کا وہ ہاتھ جسمیں روٹی تھی مضبوطی سے پکڑا کہ وہ چوری کی روٹی نہ کھاسکے۔

"تجھے شرم نہیں آتی روٹی چرا کر کھاتی ہے!؟"

وہ حیران سب کا منہ دیکھ رہی تھی۔ چاروں طرف بھیڑ جمع ہوگئی۔

"ارے کیا ہوا؟"

"اتنی سی لڑکی نے چوری کی! ——— یہ خراب تربیت کا نتیجہ ہے" ماسٹر صاحب نے چھڑی گھماتے ہوئے کہا۔

"اتنی بڑی لڑکی اور ننگی؟۔ اف توبہ، ذرا شرم و لحاظ نہیں رہا —— ہمارے حضور کو کس قدر ستر پوشی کا خیال تھا! —— اور یہ ——— لاحول ولاقوۃ!!" مولوی صاحب نے نفرت سے اس پر جماتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوڑو بھی۔ بچی ہے۔ بھوکی ہوگی! کوئی بوا۔

"بس صاحب، بس ایسے ہی لوگوں نے تو سب کو خراب کر دیا۔ اگر آج اس لڑکی کو تنبیہ نہ کی گئی، تو بس یہ سمجھ لو کہ چوری کی عادت پڑ گئی۔

"صاحب کیا معلوم پہلے کیا کیا چرا ......"

"نہیں چھوڑنا نہیں چاہیئے"۔

امن وامان قائم رکھنے والی پولیس بھی آگئی۔

"کیا ہے کیا ہے؟"

سب نے امن کے دعوے داروں کو حال سنایا۔ کیا کیا جائے، سب سوچ رہے تھے۔

وہ بولی "جیل بھیجدو" کیا یہ جلا بھی کوئی بم کا گولہ تھا۔؟۔

"ذرا اس لڑکی کا ڈھیٹ پنا تو دیکھو!"

"ذرا سی لڑکی گز بھر کی زبان"

"حضرت، میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ نہ معلوم کتنے گھاٹ کا پانی پی آئی ہوگی!"

"یہ تو ہم کو بھی جلا کر رکھدے"، مولوی صاحب بولے۔

"میں تو پہلے ہی کہتا ہوں کہ اسکو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ رعایت کر کرکے تو اسکو اتنا نڈر بنا دیا ہے۔"

"بھیجدو جیل۔ جیل جائیں گی اپنی نانی کے گھر تھوڑے ہی!؟"

"اتنی چھوٹی لڑکی جیل میں قید نہیں کی جاسکتی"؛ تھانیدار صاحب نے رحم کرتے ہوئے فرمایا۔ "اور پھر جرم بھی پہلا ہے"

"حضور، پتہ تو آج ہی چلا ہے۔ مگر نہ معلوم کتنی......"

اندر سے نوکر نے آکر تھانیدار صاحب کو کھانے کیلئے بلایا۔ تھانیدار صاحب ایک حقیر لڑکی کیلئے اپنی بھوک کو نہیں روک سکتے تھے۔ وہ حویلی میں کھانا کھانے چلے گئے۔ جیسیں رشوت کا گھی پڑنا لازمی عنصر ہے۔ جاتے ہوئے وہ سپاہیوں سے کہہ گئے۔ "پانچ بیت مار کر چھوڑ دو"

کیسے ——— !؟ یہ تو وہ ہی جانے !!!

وہ زمین پر مُردوں کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ قانون انصاف کرتا ہے! اسکو اس کے کئے کی سزا ملی تھی!!

"چل یہاں سے کبھی اور سہی!!"

"مجھے جیل بابا کے پاس کب بھجواؤ گے ——— جیل!"

نہیں قانون ناانصافی نہیں کرتا! بچی کو جیل نہیں بھیجا جاسکتا۔ مگر اسکو ٹھوکریں کھانے کیلئے سڑکوں پر چھوڑ دیتا ہے!—

۷۱

ایک نہایت ضروری اعلان

ماہنامہ ایشیا کے انتظامات کے سلسلہ میں اپریل، مئی، جون سنہ ۱۹۴۰ء نمبر (سہ ماہی) شائع نہیں کیا گیا۔ اسلئے جن اصحاب کا زرِ خریداری مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں ختم اور اپریل سنہ ۱۹۴۰ء میں شروع ہوتا ہے انکا سالِ خریداری

جولائی سنہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہو کر ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء میں ختم ہوگا

اور جن کا سالِ خریداری جنوری سنہ ۱۹۴۰ء یعنی آخری سہ ماہی نمبر سے شروع ہوتا ہے ان کی میعادِ خریداری

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء سے شروع ہو کر جون سنہ ۱۹۴۱ء میں ختم ہوگی

یعنی ان دونوں میعادوں میں تین ماہ بڑھا دئے گئے ہیں، اور سال ۱۲ ماہ کے بجائے ۱۵ مہینوں کا محسوب کیا گیا ہے۔ خریدار حضرات اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آئندہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

منیجر

یہ ہے دنیا!؟

افراد

۱۔ ولایت :۔ —— بھٹہ کا چوکیدار۔ عمر چالیس سے زائد معلوم ہوتی ہے۔ دو ایک دانت گر چکے ہیں۔

۲۔ ارشاد :۔ —— بھٹہ کا مالک

۳۔ شاہد :۔ —— ارشاد کا لڑکا

۴۔ بیگم :۔ —— ولایت کی نوعمر بیوی

۵۔ عظمت :۔ —— بھٹہ کا مستری۔ نوجوان، تندرست اور خوبصورت

—— زمانہ یہی ——

پہلا منظر

(بارہ کا عمل۔ شاہد اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا پڑھ رہا ہے۔ دو چار کتابیں بستر پر بے ترتیبی سے کھلی پڑی ہیں، خود میز پر بیٹھا ہوا ہے۔)

شاہد :۔ —— شیکسپیئر..... ملٹن ...... اقتصادیات ...

.... تھک گیا میں تو۔

کیا دنیا میں اسی کی ضرورت ہے؟ یہی سب کچھ ہے؟

(کتابیں بند کر دیتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر برابر رکھی ہوئی الماری میں سے ایک کتاب نکالتا ہے)

شاہد :۔ —— (کھولتے ہوئے) ہنری کاسٹنڈ!

(خاموشی سے پڑھتا ہے)

شاہد :۔ —— (غصہ میں) کتاب ہے کہ شیطان کی آنت! کیسے ختم ہوگی؟ یونیورسٹی کے اجارہ داروں نے تو ہمارے دماغوں کو گھوڑے کی پیٹھ کی طرح مضبوط سمجھ لیا ہے۔

خدا بھلا کرے اُن کا! پھر لطف یہ کہ "پاس" کرنے کی ذمہ داری بھی کل ہمارے سر۔ کیا کیا جائے، ہمارا ہی قصور ہے!

(کتاب بند کر کے رکھتا ہے۔ اندر سے آواز آتی ہے)

آواز —— شاہد۔ شاہد

شاہد —— جی

آواز —— کھانا کھا لو

شاہد —— آیا

آواز —— "آیا، آیا" خاک پڑے تمہاری اس آیا پہ۔ دن بھر سے پکارتے پکارتے یہ وقت ہو گیا۔ مگر صاحبزادے صاحب ہیں کہ سر جھکائے کتابوں پر اڑے ہوئے ہیں۔ نہ کھانے کی فکر، نہ کپڑے کی پرواہ۔ ایسا بھی کیا پڑھنا کہ گال پچک کر ہڈیاں اُبھر آئیں (پردے کے پاس آکر)، آؤ، اندر آؤ بیٹا!

شاہد —— آتا ہوں، اماں!

(ہنستا ہے۔ اٹھنا چاہتا ہے کہ ولایت آتا ہے)

ولایت —— سرکار سلام

شاہد —— سلام

آواز —— شاہد میں تمہاری چچا کے ہاں جا رہی ہوں۔ بہن سے کھانا نکلوا کر کھا لینا۔

شاہد —— بہت اچھا

(کسی کے روٹھنے کی آواز)

شاہد ———— (ہنسکر) کہو ولایت میاں، تمہاری ننھی بیگم کا کیا حال ہے؟

ولایت ———— سرکار، تنگ کر رکھا ہے۔ اِدھر اُدھر آزاد پھرتی ہے۔ کچھ کہتا ہوں تو آنکھیں دکھاتی ہے۔

شاہد ———— شادی کر ہی کیوں لی؟

ولایت ———— سوچا تھا، (رُک کر) آرام سے گا بگر۔

شاہد ———— اُس کا بھی خیال کیا؟

ولایت ———— اُس کا کیا خیال؟

شاہد ———— جوان ہے!

ولایت ———— میں بھی تو کوئی ایسا بوڑھا نہیں سرکار!

شاہد ———— ہاں، دنیا میں .... ،

(ارشاد، باہر سے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ شاہد خاموش ہو کر اندر چلا جاتا ہے)

ولایت :- سلام سرکار

ارشاد :- سلام

ارشاد :- (ولایت کو دیکھ کر) کیا ہے؟

ولایت :- بازار جا رہا ہوں۔

ارشاد :- کیوں؟

ولایت :- سودا لینے سرکار۔

ارشاد :- تو جاؤ

ولایت :- ابھی، ابھی، بٹیوہ نے بتایا نہیں۔

(ارشاد، شاہد کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

ارشاد :- پھنکائی شروع ہو گئی؟

ولایت :- نہیں سرکار۔

ارشاد :- کیوں؟

ولایت :- مستری کہاں آیا ہے!

ارشاد :- کب تک آئے گا!

ولایت :- کل تک۔

ارشاد :- بھٹے پر کون ہے؟

ولایت :- بابو جی۔

ارشاد :- چمنی کھڑی کرا دی؟

ولایت :- جی۔

ارشاد :- پتھر ہو رہی ہے؟

ولایت :- جی۔

ارشاد :- کتنے پھڑ چل رہے ہیں؟

ولایت :- چار۔ ایک پھڑ پر دو سانچے کم کر دینے ہیں۔

ارشاد :- کیوں؟

ولایت :- اینٹ کافی تیار ہو گئی ہے۔

ارشاد :- ہوں۔ (رُک کر) بھرائی شروع ہو گئی؟

ولایت :- جی۔

ارشاد :- کتنے گدھے کام کر رہے ہیں؟

ولایت :- دس

ارشاد :- کمرے بھر دئے؟

ولایت :- جی۔

ارشاد :- اور گولائی؟

ولایت :- شام تک بھر جائے گی۔

ارشاد :- کل پھنکائی لگ جانا چاہیئے۔

ولایت :- کل ضرور لگ جائے گی۔

ارشاد :- ٹھیک اور شالی بھی بھرا دی۔

ولایت :- جی سرکار۔

ارشاد :- اور سب ٹھیک ہے۔

ولایت :- جی، بالکل

(ارشاد جیب میں سے روپیہ نکالکر ولایت کو دیتا ہے)

ارشاد :- (روپیہ دیکر) آدھ سیر گوشت۔ ایک آنے کے ٹماٹر۔ دو پیسے کے آلو۔ دو آنے کے پان اور چار پیسے کی سفید الائچیاں لیتے آنا۔ گوشت اچھا اور تازہ لانا۔ ٹماٹر دیکھ کر لینا، کل کی طرح سڑے سڑے نہ اٹھا لانا۔ سودا ذرا دیکھ کر لایا کرو۔ جاؤ۔ سودا اور پیسے بٹیوہ کو واپس کر جانا۔

(ارشاد اندر چلا جاتا ہے)

ولایت:۔ (دہراتا ہے) آدھ سیر گوشت۔ ایک آنے کے ٹماٹر دو پیسے کے آلو۔ دو آنے کے پان اور چار پیسے کی سفید الائچیاں۔

(ولایت جاتا ہے۔ پردہ)

دوسرا منظر

(بھٹہ۔ بھٹکائی لگ چکی ہے چمنیوں میں سے دھواں نکل نکل کر تمام فضا کو مکدر کر رہا ہے۔ ہر طرف کچی اینٹوں کے چٹے لگے ہوئے ہیں۔ دو بھٹے چل رہے ہیں۔ اور بچے سانچوں سے نکلی ہوئی کچی اینٹیں لے لے کر دھوپ میں قاعدے سے لگا رہے ہیں۔ سامنے چھپر کی بارگوں میں سے کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ولایت بارگ میں سے بیڑی پیتا ہوا نکلتا ہے اور دفتر کی طرف جاتا ہے)

ولایت:۔ اری کہاں گئی؟

بیگم:۔ کاٹنے کے کان کھائے ہیں۔

ولایت:۔ اری ہم کان کھا رہے ہیں

بیگم:۔ (کوٹھری سے باہر آکر، آنکھیں دکھاتے ہوئے، اکڑتے) کس بل پر ہو؟

ولایت:۔ تم تو ناراض ہو گئیں۔ ذرا سنو تو سہی۔

بیگم:۔ سنوں کیا خاک!

ولایت:۔ تو ناراض ہو بیٹا۔ میں جاتا ہوں۔

بیگم:۔ مرو بھی کہیں۔

ولایت:۔ مر جاؤں گا تو معلوم ہوگا!

بیگم:۔ کیا معلوم ہوگا؟

ولایت:۔ کچھ نہیں۔

(جاتا ہے)

ولایت:۔ باہر آکر پکار کے، عظمت اے او عظمت!

عظمت:۔ کیا ہے؟

ولایت:۔ میں مالک کے گھر جا رہا ہوں۔ ذرا بھٹے کا خیال رکھنا۔ بابو جی آج نہیں آئیں گے۔

عظمت:۔ (بھٹے سے اتر کر قریب آکر) کیوں؟

ولایت:۔ کسی کام سے کچہری گئے ہیں

عظمت:۔ اچھا۔

(ولایت جاتا ہے۔ عظمت بھی بھٹے کا رخ کرتا ہے۔ بیگم باہر نکلتی ہے ولایت کو دیکھتی ہے)

بیگم:۔ دور نکل گیا۔ (پکارتی ہے) عظمت عظمت!

عظمت:۔ (مڑ کر دیکھتے ہوئے) کیا ہے؟

بیگم:۔ ذرا دو لکڑی کے ٹکڑے دیجاؤ۔

عظمت:۔ اچھا۔

(بیگم اپنی کوٹھری میں چلی جاتی ہے)

بیگم:۔ (تھوڑی دیر بعد) آیا نہیں۔

عظمت:۔ (دروازے سے) لکڑی لو۔

بیگم:۔ اندر چلے آؤ۔

عظمت:۔ (ہنسکر) کیوں؟

بیگم:۔ ہاں رہنے دو۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ کہیں مہندی نہ چھوٹ

عظمت:۔ مہندی ابھی لگی ہی کہاں ہے!

بیگم:۔ تو لگ جائے گی۔

عظمت (اندر آکر) دو سال تو ہو گئے۔ اس طرح

بیگم:۔ بڑی جلدی ہے؟

عظمت:۔ ہاں۔ دنیا میں ـــ

بیگم:۔ رہنے دو، میں سمجھ گئی۔ بیٹھ جاؤ۔

عظمت:۔ کیا بیٹھوں؟ ـــ ایسے!

بیگم:۔ پھر کیسے بیٹھنا چاہتے ہو؟

عظمت:۔ بے خوف ہو کر!

بیگم:۔ تم نہیں بیٹھ سکتے۔

عظمت:۔ کیوں؟

بیگم:۔ تم مرد نہیں!

عظمت:۔ (غصہ میں) کیسے؟

بیگم:۔ تم بوجھ رہے ہو، یہ! یاد کرو!!

عظمت :۔ سمجھ لیا۔

بیگم :۔ تو پھر کر ڈالو۔

عظمت :۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

بیگم :۔ بڑی آسانی سے۔

عظمت :۔ تمہیں افسوس تو نہیں ہوگا؟

بیگم :۔ بالکل نہیں!

عظمت :۔ یہ کیسے مان لیا جائے؟

بیگم :۔ دنیا کے ماں باپ، روپیہ کیلئے اپنی جوان لڑکی کا بیاہ ایک بوڑھے سے کر دیتے ہیں۔ انھیں افسوس ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں! تو کیا ایک جوان عورت، اپنی زندگی، اور جوانی کی خوشیوں کے لئے اپنے بوڑھے مرد کو مرتے نہیں دیکھ سکتی؟ (بھوکی شیرنی کی طرح)

ـــــ! دنیا میں انسان نفع چاہتا ہے۔ میرے ماں باپ نے اپنے نفع کیلئے میری شادی کر دی۔ اس ایک مٹی کے پتلے کے ساتھ، جو زندگی کی گرم ہوائیں کھاتے کھاتے جھلس کر خشک ہو گیا ہے! سوکھ چکا ہے! جس سے مجھے کوئی نفع نہیں۔ دنیا میں کھالینا اور کپڑا پہن لینا ہی سب کچھ نہیں ـــ میں نفع ..... اور خوشی ..... زندگی میں نفع اور خوشی چاہتی ہوں! ـــ پورا نفع! ـــ پوری خوشی!!

عظمت :۔ میں تیار ہوں!

بیگم :۔ (خوش ہو کر) اچھا تو میں تمہیں ایسی ترکیب بتاتی ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے! سنو.....

(عظمت کے کان میں کچھ کہتی ہے)

عظمت :۔ (خوش ہو کر) ہوں۔ ٹھیک ہے!

بیگم :۔ تو سب ٹھیک کر لو۔

عظمت :۔ بے فکر رہو۔

(جاتا ہے)

بیگم :۔ (سوچ کر) عورتیں ایسا نہیں کرتیں۔ پاگل ـــ بیوقوف ہیں وہ! مجھے ایسا کرنا ہے۔ میں ضرور ایسا کروں گی۔ مجھے دنیا میں ..... دنیا میں زندہ رہ کر، دنیا والوں کی آنکھیں کھولنا ہیں!

(چولہا روشن کرتی ہے۔ پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(رات کے دس بجے ہیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ دور سے گیدڑوں کے چلّانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ولایت اور بیگم اپنی کوٹھری میں بند لحاف میں سمٹے سمٹائے پڑے ہیں۔ مٹی کا دیا تاریک کوٹھری کو روشن کر رہا ہے۔ بیگم اٹھتی ہے۔)

بیگم :۔ کیا سو گئے؟

ولایت :۔ کیا ہے؟

بیگم :۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔

ولایت :۔ تو میں کیا کروں؟

بیگم :۔ ذرا آگ جلا دو۔

ولایت :۔ کیوں؟

بیگم :۔ چائے بناؤں گی۔

ولایت :۔ چولہے میں آگ بھی چھوڑی تھی؟

بیگم :۔ ہاں دبا تو دی تھی۔

(اٹھ کر چولہے کے پاس جاتا ہے۔ آگ کرید کرید کر دیکھتا ہے)

ولایت :۔ اس میں تو کچھ بھی نہیں۔ دیا سلائی ہے؟

بیگم :۔ دیا سلائی تو نہیں ہے۔

ولایت :۔ پھر آگ کیسے جلے؟

بیگم :۔ دیا سلائی لے آؤ۔

ولایت :۔ اسوقت

بیگم :۔ کیا ہوا؟ عظمت سے لے آؤ۔ اس کے پاس ہوگی۔

ولایت :۔ اچھا ذرا اپنی چادر دیدو۔

بیگم :۔ لو۔

ولایت :۔ آج تو بڑی مہربانی ہوئی۔

بیگم :۔ میں تو جان .....

ولایت :۔ (خوش ہو کر) بس زیادہ خوشامد نہ کرو۔ یہ کافی ہے، میں جاتا ہوں۔

(جاتا ہے)

بیگم :- جاؤ، دُور دُور نکل جانے پر واپس نہ آنا!

(ولایت دفتر سے نکل کر بھٹے کے اوپر آتا ہے۔ عظمت اپنی جھونپڑی میں سے پکارتا ہے)

عظمت :- کون؟

ولایت :- میں ہوں عظمت!

عظمت :- ولایت —

ولایت :- ہاں۔

عظمت :- ذرا سامنے والی مہری میں کوئلہ ڈال دینا۔ میں جا ہی رہا تھا۔ تم اچھے آگئے۔

ولایت :- اچھا۔

(ولایت "موہری" کے پاس جاتا ہے۔ ڈھلیا سے کود کر آگے بڑھتے ہی دھڑام سے "موہری" میں گرتا ہے)

ولایت :- (گرتے ہوئے بڑے زور سے) بچاؤ، بچاؤ، میں جلا!

(رات کی خاموشی میں آواز کی گونج کیساتھ "موہری" سے شعلے بلند ہو کر غائب ہو جاتے ہیں۔ گیدڑوں کی آوازیں خاموش فضا کا سینہ چیرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔ بیگم دفتر سے نکل کر بھٹے کے اوپر آتی ہے، عظمت باہر آتا ہے)

عظمت :- تم آگئیں

بیگم :- ہاں۔ کام ہوگیا؟

عظمت :- (ٹھنڈی سانس بھر کے) ہاں۔

بیگم :- افسوس ہے؟

عظمت :- نہیں دنیا میں اور ہوتا ہی کیا ہے!

(دونوں چپ چاپ جھونپڑی میں چلے جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

ا۔ ح۔ پروانہ بریلوی

وداعِ آخر

مترجمہ:- محمد جمیل احمد، بی اے، بریلوی

اسٹیفان زویگ کا یہ مشہور و معروف ادبی کارنامہ جس کی پہلی قسط ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہے۔ ایشیا میں مسلسل شائع کیا جائے گا۔ کارکنانِ ادبی مرکز کا یہ بھی ارادہ ہے کہ ایشیا میں شائع ہو چکنے کے بعد اس لازوال سرمایۂ ادب کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائیگا۔

(ایڈیٹر)

(وداعِ آخر جرمنی کے ایک زبردست ناول نگار اسٹیفان زویگ (Stefan Zweig) کے ایک افسانوی شاہکار کا ترجمہ ہے جو ایک غیر معروف خاتون نے محبوب کے نام مکتوب ہے۔ مکتوب جو زندگی کے آخری لمحات میں لکھا گیا ہے۔ جب لا اکلوتا بچہ، اس کی زندگی کا آخری تنہا سہارا، تنہا امید، اس کے سامنے مردہ ہے، یہ ایک کارنامہ ہے افسانوی نثر کا، ادبی حسن تخلیق کا، تحلیل نفسیاتی کا۔ جذبات ستغفار کا، ایک جاں سوز، غم نصیب، نامراد جذبۂ عشق میں ——— ہاں فانی، پرشوکت۔ ابدی جذبۂ امید میں، یہ ایک مثال ہے اس امر کی کہ عشق ان کو کیا بنا دیتا ہے ۔ نیک یا بد؟ اشرف یا ارذل؟ اعلیٰ یا ادنیٰ؟ فرشتہ یا انسان؟ شاید دونوں، ہاں دونوں سے بھی کچھ برتر اور بلند تر، ہاں شاید عشق ان کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے، اس افسانہ کی ہیروئن ——— وہ نہ بھولی، نہ محو کی جا سکنے والی غیر معروف اجنبی خاتون ——— اپنی تا اپنی زندگی، اپنی ہستی ——— اور شاید اپنی روح بھی ——— ب کچھ ایک حیات سوز جذبہ میں گم کر چکی ہے۔ کھو چکی ہے۔ اسکی ہستی سرود محبت کے توب ——— اپنے محبوب کے نام، شراب کی طرح جب مگر دو سرشار، رفیقِ عشرت انگیز و نشاط آور، خمار بادہ کی طرح چھا جانیوالے وفا ناآشنا ب کے نام یہ مکتوب"، یہ اولاد آخری مکتوب اس سرود کا پہلا و آخری جانسوز نغمہ، رگ و ریشہ میں پیوست ہو جانیوالا، رگ و ریشہ پر چھا جانیوالا نغمہ- مایوس، غمگین، محزون، محبت کے بغیر وہ کچھ بھی نہیں۔ اور محبت کے بعد وہ پروا نہیں کرتی کہ کیا ہے، ملحد، مرتد، کافر؟ آوارہ، بے عصمت، زن عشوہ فروش؟ محبت کے بعد وہ پروا نہیں کرتی کہ کیا ہے، اخلاق، عزت نفس، مذہب، وہ کسی کی بھی معتقد نہیں ہے، وہ کسی سے بھی واقف نہیں ہے، ہر چیز، ہر جذبہ، ہر احساس عشق میں فنا ہو چکا ہے، جذب ہو چکا ہے، وہ جذبات، ہاں خوں گشتہ جذبات کا ایک مایوس مجسمہ ہے، احساس و شاعری کی ایک حسین مگر الم ناک ہیکل ہے، دکھے ہوئے قلب و جگر کی پکار ہے، شکست دل کی آواز ہے! عشق اس کی زندگی کا آغاز و انجام ہے، وہ خود عشق ہے، انسانی جامہ میں عشق محض! ۔ بدبخت، بدنصیب، غمگین، ناشاد ——— اور شاید، شاید اسی لئے لا یموت، لافانی، لازوال۔)

جمیل

وداعِ آخر

مشہور ناول نگار رحیق[1] ایک مختصر تعطیل میں پہاڑ گیا ہوا تھا۔ علی الصبح واپس آتا ہو نگا اس نے اسٹیشن سے ایک اخبار خریدا اور جب اس کی نظر تاریخ پر پڑی تو

---

[1] اصل کتاب میں ہیرو کا نام (R.) ہے۔ میں نے اسکا رحیق کر دیا ہے اور اس نام میں کردار سے مناسبت بھی مد نظر ہے۔ ج۔ا

اسکو یاد آیا کہ یہ اس کی سالگرہ کا دن ہے،

اکتالیسویں ۔۔۔۔۔ بجلی کی طرح یہ خیال اس کے دماغ میں آیا۔ مگر اس بات پر نہ اس کو کوئی خوشی ہوئی نہ غم۔ اس نے ایک گاڑی والے کو بلایا اور اسمیں سوار ہو کر گھر کو روانہ ہو گیا۔ اس کے ملازم نے اسکو بتایا کہ اس کی غیر موجودگی میں چند ملاقاتی آئے تھے اور اکثر اشخاص نے ٹیلیفون بھی کئے تھے۔ علاوہ ازیں خطوط کا ایک پلندہ بھی اس کے انتظار میں پڑا تھا۔ اس نے ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور وہ چار خطوط جن کے بھیجنے والوں سے اسے دلچسپی تھی۔ کھولے مگر ایک بھاری لفافہ جو ایک غیر معروف رسم الخط میں لکھا ہے اسوقت بغیر کھولے ہوئے الگ رکھ دیا۔ آرام کرسی پر بیٹھ کر اس نے صبح کی چا پی، اخبار دیکھا۔ کچھ سرکلر پڑھے اور پھر بقیہ خط کی طرف متوجہ ہوا،

اس پر بہ نسبت خط کے مسودہ کا زیادہ گمان ہوتا تھا جو نسوانی رسم الخط میں تیزی سے لکھے ہوئے چند درجن صفحات پر مشتمل تھا۔ اس نے غیر اختیاری طور پر لفافہ پر پھر نظر ڈالی۔ کہ شاید اس کے جاننے والے کا کوئی خط یا پرچہ اس میں شامل ہو جو اس کی نظر سے محو ہو گیا ہو، مگر اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی، نہ دستخط تھے اور نہ لفافہ پر نہ خط میں کہیں بھیجنے والے کا پتہ۔ "عجیب بات" اسے خیال ہوا۔ جب اس نے خط پڑھنا شروع کیا۔ شروع میں یہ الفاظ تحریر تھے "آپ کو جنہوں نے مجھے کبھی نہیں پہچانا" وہ پریشان سا ہوا۔ کیا خط اس کو لکھا گیا تھا یا کسی فرضی ہستی کو؟ ان باتوں سے اس کو خط میں ایک دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس نے پڑھنا شروع کیا۔"

میرا لڑکا کل مر گیا۔ اس کمزور و نحیف زندگی کیلئے میں تین دن اور تین رات موت سے جنگ آزما رہی ہوں۔ متواتر چالیس گھنٹوں تک جبکہ اس کا جلتا ہوا کمزور جسم انفلوئنزا کے بخار سے دہک رہا تھا میں اس کے بستر کے قریب بیٹھی رہی۔ میں دن اور رات، رات اور دن اسکے سر پر ٹھنڈے پھاہے رکھتی رہی میں نے اس کے چھوٹے چھوٹے کانپتے ہوئے ہاتھ پکڑ لئے تھے۔ تیسری شام کو میری طاقت نے جواب دیا۔ میری لاعلمی میں میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ اور میں اسٹول پر تین چار گھنٹے سوئی ہوں گی۔ اس درمیان میں موت اسکو مجھ سے چھین کر لے گئی۔ میرا پیارا بچہ اپنی تنگ چارپائی پر وہ لیٹا ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ مرا تھا صرف اس کی آنکھیں بند ہو گئی ہیں، سنجیدہ گہری آنکھیں۔ اور اس کے ہاتھ اس کے سینے پر رکھے ہیں۔ چار شمعیں جل رہی ہیں۔ بستر کے ہر کنارے پر ایک۔

میں دیکھ نہیں سکتی، میں ہل نہیں سکتی چونکہ جب ان شمعوں کی لو ہلتی ہے اس کے چہرے اور بند ہونٹوں پر سائے ایک دوسرے کے تعقب میں تیزی سے دوڑتے ہیں، معلوم ہوتا ہے اس کے اعضا متحرک ہیں اور مجھے دھوکا ہونے لگتا ہے کہ اس سب کے بعد بھی وہ مرا نہیں ہے۔ وہ جاگ اٹھے گا اور اپنی صاف آواز میں کوئی طفلانہ محبت آمیز بات کہے گا۔ مگر میں جانتی ہوں کہ وہ مر چکا ہے۔ میں اسے پھر نہیں دیکھوں گی، ایک دفعہ پھر امید پیدا کرنے کیلئے ایک دفعہ پھر مایوس ہو جانے کے لئے۔ میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں میرا بچہ کل مر گیا۔ اور اب دنیا میں میرے صرف آپ ہی ایک باقی رہ گئے ہیں۔ آپ جو بغیر کسی خیال کے آدمیوں اور چیزوں سے کھیل کر عشرت میں اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔

میں نے ایک پانچویں شمع جلائی ہے اور میز پر بیٹھی ہوئی آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ میں تنہا اپنے مردہ بچے کے پاس کسی دوسرے سے اپنے دل کا حال کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور اس منحوس ساعت میں یہ آپ کے سوا اور کس سے کہہ سکتی ہوں، آپ جو میرے لئے سب کچھ رہے ہیں اور ہیں۔ شاید میں آپ پر اپنا مطلب اچھی طرح واضح نہ کر سکوں، میرے سر میں بہت گرانی ہے۔ میری کنپٹیاں دکھ رہی ہیں، میرے اعضا میں درد ہے، میرا خیال ہے کہ میں بھی بخار میں مبتلا ہو جاؤں گی۔ انفلوئنزا اس حصہ میں پھیلا ہوا ہے اور غالباً مجھے شروع ہو گیا مجھے غم نہیں ہوگا اگر اس طرح زندگی گذارنے کی بجائے میں اس طریقہ سے اپنے بچے سے جا کر مل سکوں۔ کبھی کبھی میری آنکھوں کے سامنے بالکل تاریکی چھا جاتی اور شاید میں اس خط کو ختم کرنے کے قابل نہ رہ سکوں۔ مگر میں اپنی تمام طاقت کے ساتھ یہ کوشش کروں گی کہ اسوقت اور صرف اس وقت اپنا حال بیان کروں میرے محبوب آپ سے، جو مجھے نہیں جانتے۔

میں صرف آپ سے مخاطب ہونا چاہتی ہوں تاکہ آپ کو پہلی دفعہ سب کچھ کہہ سکوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ میری پوری زندگی سے واقف ہو جائیں۔ میری زندگی سے جو ہمیشہ آپ کی رہی اور جس کی بابت آپ کچھ نہیں جانتے۔ مگر آپ پر میرا راز اسوقت ظاہر ہوگا جب میں مر چکی ہوں گی، جب اس دنیا میں وہ نہ ہو گی جسے آپ کو جواب دینا ہے، آپ اسے صرف جان سکیں گے وہ اس میں کہ وہ شے جو میرے اعضا کو حرارت اور برودت سے ہلا رہی ہے رہی واقعی میری موت ثابت ہو۔ اگر مجھے زندہ رہنا پڑا تو میں یہ مکتوب پھاڑ کر پھینک دوں گی اور خاموش رہوں گی۔ جیسے کہ میں ہمیشہ خاموش رہی ہوں۔ اگر کبھی یہ خط

ہاتھ میں پہونچے تو آپ سمجھ لیں کہ ایک مردہ عورت آپکو اپنا فسانۂ حیات سنا رہی ہے، اس حیات کا فسانہ جو شروع سے ہوش کے آخری لمحہ تک صرف آپکی تھی۔ آپ کو میرے الفاظ سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ ایک مری ہوئی عورت کچھ نہیں چاہتی۔ تلطف، نہ تراحم، نہ تسلّی، میری صرف آپ سے ایک التجا ہے کہ آپ اس بیان کا ایک ایک لفظ سچا تسلیم کریں جس کا انکشاف دردِ دل کے ہاتھوں میں آپ سے کر رہی ہوں میرے لفظوں کا یقین کیجئے کیونکہ اب میں آپ سے اور کچھ نہیں چاہتی۔ ایک ماں اپنے اکلوتے بچے کے جنازے پر بیٹھ کر جھوٹ نہیں بولے گی۔

میں آپ کو اپنی پوری روئداد حیات سنانا چاہتی ہوں، وہ روئداد حیات جو در اصل اس دن سے پہلے جب میں نے آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا شروع ہی نہیں ہوتی، اس دن سے پیشتر کا تصور ایک پریشان اور دھندلا سا تصور ہے۔ ایک ایسے کمرے کی سی یاد جو خاک و دھول سے اٹا ہوا ہو جہاں کی چیزوں اور لوگوں پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہو، ——— ایک ایسی جگہ جس سے میرے دل کو کوئی تعلق نہیں۔ جب آپ میری زندگی میں آئے میں تیرہ برس کی تھی۔ اور میں اس عمارت میں رہتی تھی جس میں آج آپ رہتے ہیں۔ اسی عمارت میں جسمیں آپ اسوقت یہ خط پڑھ رہے ہیں جو میری زندگی کا آخری سانس ہے۔ میں اسی منزل میں رہتی تھی۔ چونکہ میرے گھر کا دروازہ آپکے گھر کے سامنے تھا۔ آپ ہم لوگوں کو یقیناً بھول چکے ہوں گے۔ آپ عرصے اکاؤنٹنٹ کی مغموم بیوہ اور چھوٹی کمزور لڑکی کو فراموش کر چکے ہوں گے۔ ہم لوگ ہمیشہ سے الگ خاموش زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم پُرتکلف شرافت کا نمونہ بن گئے تھے۔ شاید ہی آپنے کبھی ہمارا نام سنا ہو۔ چونکہ مکان کے سامنے کے دروازہ پر کوئی پلیٹ نہ تھی اور نہ کوئی ہم سے ملنے کو آتا تھا اسکے علاوہ اس بات کو بہت عرصہ گذر چکا ہے۔ تقریباً پندرہ، سولہ برس ناممکن ہے کہ آپ کو باتیں یہ یاد ہوں۔ مگر مجھے ہر ہر بات کس قدر صاف یاد ہے وہ دن، وہ ساعت جب میں نے پہلی مرتبہ آپ کو دیکھا مجھے اس طرح یاد ہے گویا یہ سب کچھ ابھی ہوا ہے، اس کے خلاف ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ خصوصاً جب مجھے اس بات کا احساس ہو کہ دنیا میرے لئے اُسوقت سے شروع ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے اور مجھے شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دینے دیجئے۔ تھوڑی دیر آپ ان حالات کو سننے سے نہ تھکیں۔ چونکہ میں زندگی بھر آپ کو محبت کرنے سے نہیں تھکی ہوں۔

آپکے آنے سے پیشتر جو لوگ آپکے حصۂ مکان میں رہتے تھے وہ قابلِ نفرت لوگ تھے۔ وہ ہر وقت رہتے۔ رہتے تھے۔ اگرچہ وہ خود حد درجہ غریب تھے مگر وہ ہم سے ہماری غربت کی وجہ سے نفرت کرتے تھے۔ چونکہ ہم ان سے علیحدہ رہتے تھے۔ وہ شخص شراب پیتا تھا اور اپنی بیوی کو مارتا تھا۔ اکثر رات کو ہم لوگ کرسیوں کے گرنے اور رکابیوں کے ٹوٹنے کی آواز سے جاگ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ جب اس نے اپنی بیوی کو اتنا مارا کہ خون بہنے لگا اور وہ سیاہ کھلے ہوئے پریشان بالوں کے ساتھ بھاگ کر باہر آئی اور اس کا شوہر شراب کے نشہ میں اسکو برا بھلا کہتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا تو تمام لوگ زینہ کے آس پاس جمع ہو گئے اور پولیس کو بلانے کی دھمکی دی میری والدہ ان لوگوں سے کچھ تعلق نہ رکھتی تھی۔ اُس نے مجھے ان بچوں کیساتھ کھیلنے سے منع کیا تھا اور وہ بچے ہمیشہ مجھے بُرا بھلا کہتے جب میں ان کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیتی۔ جب وہ سڑک پر ملتے تو مجھے گالیاں دیتے اور ایک دفعہ انھوں نے برف کی ایک گیند بنا کر میرے کھینچ کر ماری جو اتنی سخت تھی کہ میرے ماتھے کی کھال پھٹ گئی۔ گھر میں ہر شخص ان سے متنفر تھا اور ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا جب کسی خاص وجہ سے اُن لوگوں کو وہ مکان چھوڑنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ وہ شخص چوری کا میں پکڑا گیا تھا۔ کچھ عرصہ تک مکان کے خاص دروازہ پر کرایہ کیلئے خالی ہے، کا نوٹس لگا رہا پھر وہ اتار لیا گیا۔ اور منتظم نے ہمیں بتایا کہ مکان ایک مصنف نے جو غیر شادی شدہ ہے کرایہ پر لیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ امیر ہے۔ وہ دوسروں کے لئے باعث تکلیف نہ ہوگا۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے آپکا نام سنا۔ چند دنوں کے بعد کمرے اچھی طرح سے صاف کئے گئے اور رنگ کرنیوالے اور سجانیوالے آئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے بہت شور مچایا مگر میری ماں خوش تھی کیونکہ اُس نے کہا کہ اب ہمارا پڑوسی گھر میں شور نہیں مچایا کرے گا۔ نقل و حرکت کے اس دوران میں میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ آرائش اور سامان کی ترتیب کا کام آپکے ملازم کی نگرانی میں پورا ہوا۔ جس کے چھوٹے سفید بال تھے۔ برتاؤ نہایت سنجیدہ تھا اور جو ظاہراً عمدہ گھرانوں میں ملازم رہ چکا تھا۔ وہ نہایت قاعدے سے ہر چیز کو ترتیب دے رہا تھا اور اس نے ہم کو بہت متاثر کیا۔ شہر کے نواح میں واقع شدہ ہمارے مکانوں میں ایسے اعلیٰ نجی ملازم کی موجودگی ایک غیر معمولی بات تھی۔ علاوہ ازیں وہ بہت زیادہ شائستہ تھا اور وہ دوسرے ملازموں سے ملکر اپنا وقت بیکار نہیں گذارتا تھا۔ وہ شروع ہی سے میری والدہ کیساتھ ادب سے پیش آیا اور وہ ہمیشہ چھوٹے بچوں تک کیساتھ مہربانی سے پیش آتا تھا۔ وہ جب کبھی آپ کا نام لیتا تو اس طرح کہ معلوم ہوتا کہ اس کے جذبات آپ کے متعلق ایسے ہیں گویا آپ ہی

خاندان کے مربی ہیں۔ میں اس بنا پر مسٹر جان سے محبت کرنے لگی۔ حالانکہ ساتھ ہی
ساتھ میں اس سے مذاق بھی کرتی تھی۔ چونکہ اس کو میری بہ نسبت یہ حق حاصل تھا کہ وہ
ہر وقت آپ کو دیکھے اور آپ کی خدمت کرے۔ آپ جانتے ہیں میں آپ کو یہ معمولی
معمولی باتیں کیوں بتا رہی ہوں؟ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ کس طرح شروع ہی سے
آپ کی شخصیت کا مجھ پر اس قدر اثر چھا گیا جب کہ میں محض ایک چھوٹی شرمیلی لڑکی تھی
اس سے پہلے کہ میں نے آپ کو واقعی دیکھا۔ میرے تصور میں آپ کے چہرے کے چاروں
طرف ایک نورانی حلقہ تھا۔ آپ دولت، حیرت و اسرار کے ماحول میں چھپے ہوئے
تھے۔ لوگ جن کی زندگیاں تنگ ہوتی ہیں۔ کسی نئی تبدیلی کے خواہشمند ہوتے ہیں
اور نواح شہر کے اس مکان میں ہم آپ کا بیقراری سے انتظار کر رہے تھے۔ جہاں تک
میرا تعلق ہے۔ میرا شوق انتظار نقطۂ حرارت تک پہنچ گیا تھا۔ سہ پہر کو اسکول سے
واپس آ کر میں نے فرنیچر کی گاڑی کو آپ کے دروازے پر کھڑا پایا۔ تمام وزنی چیزیں
اوپر پہنچا دی گئی تھیں۔ اور فرنیچر اٹھانے والے اب چھوٹی چھوٹی چیزیں پہنچا رہے تھے
میں دروازہ پر کھڑی ہوئی دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں تعریف کرتی رہی۔ چونکہ
ہر وہ چیز جس کا آپ سے تعلق تھا کچھ ان چیزوں سے مختلف تھی جن کی میں عادی
تھی۔ انہیں پتھر کے تراشیدہ ہندوستانی مجسمے تھے، اٹلی کے تراشیدہ بت تھے
اور بڑی چمکدار رنگین تصویریں تھیں۔ سب سے آخر میں کتابیں آئیں۔ عمدہ کتابیں اور
میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ دروازہ کے قریب ان کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ ملازم ہر ایک
ستھری سے کھڑا ہوا کتابوں کی گرد جھاڑ رہا ہے۔ میں حریص نگاہوں سے کتابوں
کی ڈھیر کو دیکھ رہی تھی جو برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ آپ کے ملازم نے مجھے وہاں سے نہیں
ہٹایا۔ مگر اس نے میری حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔ اس لئے میں ان کتابوں کے
چھونے سے جھجک رہی تھی۔ حالانکہ میں ان کی نرم چرمی جلد پر ہاتھ پھیرنے کی خواہشمند
تھی۔ میں نے جھکتے ہوئے کچھ کتابوں کے نام دیکھے۔ ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی
اور فرانسیسی زبان میں تھیں۔ اور کچھ اور دوسری زبانوں میں تھیں جن کا میں ایک لفظ
بھی نہیں جانتی تھی۔ میں وہاں گھنٹوں کھڑی دیکھتی رہتی مگر میری ماں نے مجھے آواز دی
اور مجھے اندر جانا پڑا۔ اس دن شام کو میں آپ کا خیال کرتی رہی حالانکہ ابھی تک میں نے
آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ میرے پاس صرف تقریباً ایک درجن سستی کتابیں تھیں۔ جن پر دفتی
کی جلد تھی۔ مجھے دنیا میں ہر چیز سے زیادہ ان کی محبت تھی۔ اور میں ان کو اکثر دو دو دفعہ
پڑھتی۔ مجھے تعجب تھا کہ آخر وہ کیسا آدمی ہوگا جس کے پاس اس قدر زیادہ کتابیں ہیں
جس نے اتنا کچھ پڑھا ہے۔ جو اتنی زبانیں جانتا ہے جو دولتمند اور ساتھ ہی ساتھ

اس قدر قابل ہے۔ ان کتابوں کے خیال نے میرے دل میں آپ کی ایک بے پایاں اور
مافوق الفطرت محبت پیدا کر دی۔ میں نے اپنے دماغ میں آپ کا تصور قائم کرنا چاہا۔ آپ
ایک بوڑھے آدمی ہوں گے۔ اور ہمارے جغرافیہ کے استاد کی طرح عینک لگاتے
ہوں گے اور آپ کے بھی سفید داڑھی ہوگی۔ مگر ان سے بہت زیادہ رحمدل، زیادہ نفاست
پسند اور زیادہ مہربان ہوں گے۔ نہ معلوم کیوں مجھے یقین تھا کہ آپ خوبصورت ہوں گے۔
چونکہ میرا خیال تھا کہ آپ ایک معمر آدمی ہوں گے۔ اسی رات کو میں نے پہلی
مرتبہ آپ کو خواب میں دیکھا۔ دوسرے دن آپ مکان میں اٹھ آئے لیکن باوجودیکہ
آپ کی منتظر تھی۔ میں آپ کے چہرے کی جھلک نہ دیکھ سکی اور اس ناکامی نے میری
آتش شوق کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ آخر کار تیسرے دن میں نے آپ کو دیکھا مگر میں
کس قدر متعجب ہوئی جب میں نے آپ کو اپنے طفلانہ تصور کے قائم کردہ ایک بوڑھے
دینی باپ سے بالکل مختلف پایا۔ ایک عینک لگائے ہوا بوڑھا نیک طینت شخص تھا
——— یہ تھا وہ آدمی جس کی میں متوقع تھی۔ اور آپ تھے اس شکل و
شباہت کے ساتھ جیسے کہ آپ اب بھی ہیں۔ چونکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر
امتداد زمانہ کا اثر نہیں ہوتا۔ ہلکے بھورے چار خانے کا ایک خوبصورت سوٹ
آپ پہنے ہوئے تھے۔ اور لڑکوں کی سی صورت اور تیزی کے ساتھ جو آپ کی تمام
حرکات میں نمایاں ہے ایک ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ آپ کے
ہاتھ میں ہیٹ تھا اس لئے میں ایک غیر قابل بیان جذبۂ تحیر و ستائش کے ساتھ
آپ کا درخشندہ و شگفتہ چہرہ اور نوخیز بال دیکھ سکتی تھی۔ آپ کی خوبصورت دُبلی
پتلی خوش وضع شبیہ میرے تصورات کے حق میں ایک صریحی تصادم تھی۔ یہ کس قدر
تعجب انگیز بات تھی۔ کہ اس لمحہ اولین میں میں نے وہ بات اچھی طرح پہچان لی تھی
جو ہمیشہ میرے اور تمام دوسرے لوگوں کیلئے باعث تعجب رہی ہے۔ میں نے
محسوس کیا کہ آپ کی ہستی میں دو ہستیاں پیوست ہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ ایک
پرجوش خوش طبع جوان ہیں۔ جنکا شغلہ ہنسی مذاق کھیل کود و خطرات ہیں اور ساتھ
ساتھ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنے آرٹ میں آپ اعلیٰ قابلیت اور گہرے مطالعہ
کے ایک نہایت سنجیدہ شخص ہیں۔ جنہیں ذمہ داری کا ایک شدید احساس موجود ہے
غیر ارادی طور پر میں نے دیکھا جیسا کہ ہر اس شخص نے بھی دیکھا جو آپ کو جانتا ہے
کہ آپ دو زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک زندگی سے سب واقف تھے۔
یہ وہ زندگی تھی جو تمام دنیا پر ظاہر تھی، دوسری زندگی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ
تھی اور صرف آپ ہی پر اچھی طرح واضح تھی۔ میں نے، تیرہ برس کی ایک لڑکی نے،

جو آپ کی کشش کے سحر میں گھری ہوئی تھی۔ آپ کی ہستی کا یہ راز آپ کی دو زندگیوں کا یہ عمیق اختلاف پہلی ہی نظر میں دریافت کر لیا تھا۔

کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ مجھے ایک بچی کو کس قدر ایک معجزہ ایک غیر قابل عمل مگر جاذب نظر معمہ معلوم ہوئے ہوں گے۔ آپ وہ شخص تھے جن کی بابت ہر شخص عزت کے کلمات ادا کرتا تھا۔ چونکہ آپ کتابوں کے مصنف تھے اور چونکہ آپ اس وسیع دنیا میں مشہور تھے۔ یکایک آپ نے اپنے آپ کو ایک پچیس سالہ خوش طبع نوجوان کی صورت میں مجھ پر منکشف کر دیا تھا! مجھے غالباً یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اسوقت سے میری چھوٹی سی محدود دنیا میں صرف آپ ہی میری دلچسپی کا باعث تھے۔ میری زندگی آپ کی حیات کا طواف اس وفاداری کیساتھ کر رہی تھی جو ایک تیرہ برس کی لڑکی کے شایاں ہے۔

میں نے آپ کو دیکھا، آپ کی عادتوں کو دیکھا۔ ان لوگوں کو دیکھا جو مجھ سے ملنے آتے تھے ——— اور ان باتوں نے آپ کی شخصیت میں بجائے میری دلچسپی کو کم کرنے کے اور بڑھا دیا۔ چونکہ آپ کی فطرت کے یہ دونوں پہلو آپ کے ملاقاتیوں کے فرق مراتب میں نمایاں تھے۔ ان میں سے کچھ نوجوان تھے۔ کچھ آپ کے ہم عمر ساتھی اور کچھ بے احتیاطی سے لباس پہنے ہوئے طالب علم تھے۔ جن کے ساتھ آپ ہنستے اور رنگ رلیاں کرتے۔ ان میں کچھ عورتیں بھی تھیں جو موٹروں میں آتیں ایک مرتبہ تھیٹر کا مہتمم ——— وہ بڑا آدمی جس کو اس سے پیشتر میں نے صرف دور ہی سے دیکھا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی لئے ہوئے آپ سے ملنے آیا۔ آپ کے ملاقاتیوں میں کچھ لڑکیاں تھیں، نوجوان لڑکیاں جو ہنوز کمرشیل اسکولوں میں تعلیم پا رہی تھیں اور جو شرمیلے انداز سے دروازہ میں داخل ہوتی تھیں۔ آپ کے یہاں آنیوالوں میں بہت زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ میں نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا۔ اسوقت بھی نہیں جبکہ ایک صبح جیسے ہی میں اسکول جا رہی تھی میں نے ایک برقع پوش خاتون کو آپ کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا۔ میں صرف تیرہ برس کی تھی اور اپنے بچپن کے اس زمانہ میں میں اچھی طرح اس امر کو نہیں سمجھ سکی کہ وہ گہرا جذبۂ شوق جس کے ساتھ میں آپ کے افعال کا جائزہ لے رہی تھی وہ اصل محبت تھی!

مگر میں اس دن اور اس ساعت کو بھی اچھی طرح جانتی ہوں جب میں نے جان بوجھ کر ارادی طور پر آپ کے حضور میں اپنا ہدیۂ دل پیش کیا۔ میں ایک ہمدرس لڑکی کے ہمراہ ٹہلنے گئی تھی اور ہم دونوں دروازہ پر کھڑے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ ایک موٹر آیا۔ ایک بے چین انداز میں، جو میرے لئے ہمیشہ دلآویز رہا ہے۔ آپ باہر کود کر اور اندر جانے کو ہوئے۔ ایک فطری اندرونی جذبہ کی بنا پر میں نے بڑھ کر آپ کے لئے دروازہ کھول دیا اور اس طرح میں آپ کے راستہ میں آگئی اور قریب تھا کہ تصادم ہو گیا، آپ نے میری طرف ایک پرتپاک، شفقت آمیز نظر سے دیکھا جو میری ساری ہستی پر چھاتی ہوئی معلوم ہوئی، جو بالکل ایک محبت آمیز تھپکی کے مانند تھی آپ خوش مزاجی سے میری طرف دیکھ کر مسکرائے ——— ہاں خوش مزاجی سے اور نرمی، نہیں بلکہ عقیدت کے ساتھ کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

صرف اتنا واقعہ تھا مگر اس لمحہ سے، اس وقت سے جب آپ نے مجھے اس قدر لطف، اسقدر مہربانی سے دیکھا میں آپ کی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ تمام عورتوں کو دیکھنے کا آپ کا یہی طریقہ تھا۔ جن کا آپ سے کوئی تعلق ہوتا۔ وہ پرتپاک و دلکش نگاہ تھی۔ جو بیک وقت بغلگیر ہوتی، عریاں کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گویا وہ ایک پیدائشی معشوق کی نگاہ تھی۔ غیر ارادی طور پر آپ کے لئے دروازہ کھولتی۔ یہ بات نہیں تھی کہ آپ جان بوجھ کر ان سب عورتوں پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ دوسری صنف سے متعلق آپ کے جذبات، آپ کی نظروں کو جب کبھی وہ کسی عورت پر پڑتیں حرارت اور روح میں تبدیل کر دیتے۔ تیرہ برس کی عمر میں مجھے اس بات کا کوئی خیال نہ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا میں آگ کے شعلوں میں نہا رہی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ یہ تلطف و مہربانی میرے لئے تھی۔ صرف میرے لئے۔ اس ایک لمحہ میں نابالغ لڑکی میں عورت جاگ اٹھی تھی۔ عورت جو ہمیشہ کیلئے صرف آپ ہی کی تھی۔

"وہ کون تھا؟" میری ہمدرس رفیقہ نے مجھ سے سوال کیا۔ پہلے میں جواب نہ دے سکی۔ میرے لئے آپ کا نام ادا کرنا ناممکن تھا۔ وہ میرے لئے دفعتاً ایک متبرک چیز ہو گیا تھا۔ وہ میرا راز تھا۔ میں نے غیر شائستہ طور سے جواب دیا "وہ یوں ہی ایک شخص ہے جو اس مکان میں رہتا ہے۔" "مگر جب اس نے تمہیں دیکھا تو تمہارے چہرے پر شرم سے آتشیں سرخی کیوں دوڑ گئی تھی؟" میری ہمدرس نے ایک متجسس اور راز جو بچے کی بدظنی کیساتھ سوال کیا، میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا مضحکہ اڑا رہی ہے اور میرے راز کو پا چکی ہے اور اس احساس نے پہلے سے بھی زیادہ میرے چہرے کو سرخ کر دیا۔ میں دانستہ طور پر اس سے غیر شائستہ برتاؤ کر رہی تھی "بیوقوف، پاگل" میں نے غصہ میں کہا، ——— اسوقت میں چاہتی تھی کہ اس کا گلا گھونٹ دوں۔ وہ تمسخر انگیز انداز میں ہنسی یہاں تک کہ غصہ کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور میں دروازہ پر اسے چھوڑ کر زینہ پر دوڑ گئی۔

اسوقت سے مجھے آپ سے محبت ہے، میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ عورتوں سے یہ بات سننے کے عادی ہو چکے ہیں کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ کسی اور عورت نے کبھی آپ سے اسقدر غلامانہ محبت، اسقدر کتے کی سی وفاداری، اتنی انسیت نہیں کی جتنی میں نے کی اور کرتی ہوں۔ ایک بچی کی غیر محسوس محبت کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کر سکتی، وہ مایوس اور خوشامدانہ ہوتی ہے۔ وہ متحمل اور پرجوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جس کا مقابلہ بالغ عورت کی ہوسناک محبت جو غیر شعوری طور پر عشرت جسمانی کی طالب ہے نہیں کر سکتی۔ صرف اکیلے بچے ہی ایسے جذبہ کے حامل ہو سکتے ہیں، دوسرے لوگ اوروں کی معیت میں ان جذبات کا بیجا اصراف کر دیتے ہیں۔ رازدارانہ گفتگوؤں میں ان کو منتشر کر دیتے ہیں۔ انھوں نے محبت کی بابت بہت کچھ پڑھا اور سنا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ محبت سب ہی کو ہوتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ ایک کھلونے کی طرح کھیلتے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ اترا تے ہیں جیسے کہ بچہ اپنے پہلے سگرٹ کیساتھ۔ مگر میرا کوئی رازدار نہ تھا۔ مجھے نہ کسی نے کچھ سکھایا تھا نہ کچھ آگاہ کیا تھا میں سادہ اور غیر تجربہ کار تھی۔ میں اپنی قسمت سے ملنے کیلئے دوڑی۔ ہر وہ شے جو مجھ میں متحرک تھی وہ سب کچھ جو مجھ پہ گذرتا تھا معلوم ہوتا تھا اس سب کا مرکز شغل آپ ہیں، میرے ذہن میں آپ کے تصورات! میرے والد کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا، میری والدہ سوائے اپنی مصیبتوں کے اور کسی بات کا خیال بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سوائے اپنی مشکلات کے جو اس کو اپنی قلیل پنشن کے ساتھ تمام اخراجات خانہ داری کو پورا کرنے میں برداشت کرنا ہوتی تھیں۔ اسلئے اس کے اور ایک بڑھتی ہوئی لڑکی کے جذبات میں بمشکل کوئی قدر مشترک تھا۔ میری ہمدرس لڑکیاں جو نیم آگاہ، نیم آوارہ تھیں میری ہمدرد نہ تھیں۔ چونکہ ان کا نظریہ اسکے متعلق لغو تھا جو میرے نزدیک سب سے اعلیٰ جذبہ ہے، اس کا حاصل یہ تھا کہ وہ جو میرے اندر ابھر رہا تھا اور جو میری عمر کی دوسری لڑکیوں میں منتشر ہو جاتا ہے، ان سب کا مرکز ماسکہ آپ ہی بن گئے تھے، آپ میرے لئے ایسے ہو گئے تھے جیسے —— کون سی تشبیہ میرے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکتی ہے؟ آپ میرے لئے میری تمام زندگی بن گئے تھے۔ میرے لئے کسی بات میں کوئی مفہوم نہ تھا جب تک کہ وہ آپ سے متعلق نہ ہو، آپ نے میرے لئے ہر شے کو بدل دیا تھا۔ اب تک میں اسکول میں لاپرواہ اور غیر ممتاز تھی۔ اب یکا یک میں اول تھی۔ میں بہت دیر تک رات کو یکے بعد دیگرے کتابیں پڑھتی رہتی۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ آپ کتابوں کے شائق ہیں۔ میں نے اپنی ماں کی حیرت کے باوجود

پیانو کی مشق شدت کیساتھ کرنا شروع کی چونکہ میں نے خیال کیا کہ آپ کو موسیقی سے رغبت ہے۔ میں نے اپنے کپڑوں کو سیا اور درست کیا تاکہ وہ آپ کو دیکھنے میں اچھے معلوم ہوں مجھے اس امر سے سخت تکلیف تھی کہ میری اسکول کی پوشاک میں (جو میری ماں کی ایک بیرونی پوشاک سے کاٹ کر بنائی گئی تھی) ایک گول چھید ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں اس سوراخ کو نہ دیکھ لیں اور مجھ سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ اس لئے میں اسے اپنے بستہ سے چھپا لیتی تھی۔ جب میں زینہ پر ہوتی تھی تو مجھے خوف تھا کہ کہیں آپ کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔ میں کس قدر بیوقوف تھی آپ نے شاید ہی کبھی کا ہے کو میری طرف نظر کی ہو۔

تاہم میرے دن آپ کے انتظار میں آپکی راہ دیکھنے میں گذر جاتے تھے۔ سامنے کے دروازہ میں ایک روزن تھا اور اسمیں سے آپ کا دروازہ دکھائی دیتا تھا۔ میرے محبوب مجھ پر نہ ہنسئے۔ آج بھی میں ان ساعتوں کے تصور سے منفعل نہیں، جو میں نے اس پوشیدہ روزن پر بیٹھ کر صرف کیں۔ کمرہ برف کی طرح سرد تھا۔ اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری والدہ کے شبہات برانگیختہ نہ ہوں مگر سپہر کی طویل ساعتوں میں ان مہینوں اور سالوں کے دوران میں میں وہاں کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھی جھانکتی رہتی ستار کے تار کی طرح جوش سے پُر اور تنی ہوئی بیٹھی رہتی اور آپ کے قرب کے ہر لمس سے اسی تار کی طرح مرتعش ہو جاتی لرز اٹھتی۔ میں ہمیشہ آپ کے قریب تھی اور ہمیشہ پرجوش جذبات سے پُر۔ مگر آپ مجھ سے اپنی جیب کی اُس گھڑی کی کمانی سے زیادہ واقف نہ تھے جو ہر وقت آپ کیلئے صحیح وقت دیتی آپ کے ہر ہر قدم کا ساتھ اپنی غیر مسموع آواز سے دیتی اور جس پر لاکھوں سینکڑوں میں سے صرف کسی ایک سکنڈ کیلئے آپ کی نظر پڑ جاتی۔ میں آپ کی بابت سب کچھ جانتی تھی، آپ کی عادتیں، آپ کی نکٹائیاں جو آپ پہنتے تھے۔ میں آپ کے ہر ہر سوٹ سے واقف تھی۔ جلد ہی میں آپ کے مستقل ملاقاتیوں سے واقف ہو گئی۔ ان میں کچھ کو میں پسند کرتی تھی اور کچھ کو ناپسند، تیرہ برس کی عمر سے سولہ برس تک میری پرستش آپکی تھی۔ کونسی حماقتیں میں نے نہیں کیں؟ میں نے دروازہ کے دستے کو بوسہ دیا چونکہ آپ نے اُسے چھوا تھا۔ میں نے سگرٹ کا وہ ٹکڑا اٹھا لیا جو آپ نے پھینک دیا تھا وہ میرے لئے متبرک ہو گیا۔ چونکہ آپکے لب اس سے لگے تھے، شام کو میں سینکڑوں مرتبہ کسی نہ کسی بہانے سے بھاگ کر سڑک پر یہ دیکھنے کیلئے جاتی کہ آپکے کون سے کمرے میں روشنی جل رہی ہے تاکہ میں آپکی غیر مرئی موجودگی کا پوری طرح شعور کر سکوں اُن کے دوران میں جب آپ گئے ہوئے تھے، جب کبھی میں جان کر آپ کا سامان:

انتہائی بےکلی، بدمزاجی اور پریشانی کے عالم میں یہ جانتے ہوئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے میں گھومتی پھرتی اور مجھے احتیاط برتنا پڑتی کہ کہیں میری آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں والدہ پر نہ!

انّا کریسنیا

تلافی مافات

ٹالسٹائی کا مشہور شاہکار اُردو میں

(بہ سلسلہ ایشیا مارچ سنہ ۱۹۴۰ء)

سہ پہر کو تقریباً چار بجے "لیون" نے باغ کے دروازہ پر اپنی موٹر کو چھوڑا اور دھڑکتے ہوئے دل کیساتھ وہ راستہ طے کیا جو اسکیٹنگ رنک (،کو جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کٹی، وہاں ہو گی کیونکہ اس نے سربسکی خاندان کی گاڑی باہر کھڑی ہوئی دیکھ لی تھی۔

مطلع گرد آلود ہونے کے باوجود صاف اور روشن تھا۔ دروازہ کے قریب موٹریں۔ گاڑیاں وغیرہ انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے لکڑی کے مکانوں کے درمیان سے جو صاف ستھرے راستے جا رہے تھے۔ اُن پر بہت سے آدمی خوشنما لباس پہنے ہوئے خوشگوار دھوپ میں اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ پرانے کے بڑا درختوں کی برف سے ڈھکی ہوئی شاخیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کو کسی کامیابی کی تقریب کے سلسلہ میں سجایا گیا ہے۔ 'لیون'، راستے سے گذرتے وقت اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا۔ "سکون سے رہو...... ایسی کیا گھبراہٹ ہے...... مجھے کیا ہو گیا ہے"، پھر اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو مخاطب کیا۔ "خاموش رہو۔ نادان کہیں کے"۔ مگر وہ اپنے آپ کو سکون دینے کی جس قدر کوشش کرتا تھا اتنی ہی گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ گذرتے وقت ایک جاننے والے نے آواز دی مگر اُسے خبر بھی نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ وہ اس پہاڑی کے قریب پہونچتا جا رہا تھا جہاں لوگ برف پر پھسلنے کا کھیل کھیل رہے تھے۔ مسرت خیز آوازیں جن کیساتھ برف پر چلنے والی گاڑیوں کا شور بھی شامل تھا آ رہی تھیں۔

چند قدم آگے بڑھ کر تمام برف کا میدان سامنے آ گیا۔ بہت سے اسکیٹنگ کرنے والوں میں 'لیون' نے فوراً 'کٹی' کو پہچان لیا۔ کٹی کے موجود ہونیکا احساس ہوتے وقت اس کا دل خوف اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے لبریز تھا۔ وہ میدان کی دوسری طرف کھڑی ہوئی کسی خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے لباس وغیرہ میں کوئی خاص بات نہیں تھی مگر 'لیون' کو وہ تمام مجمع میں ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کانٹوں میں گلاب کا پھول۔ اس کا پیکرِ لطیف اپنے تمام ماحول کو جگمگا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی تجلی تھی جو تمام فضا میں مسرت کی لہریں دوڑا رہی تھی۔

"کیا میں واقعی برف کی دوسری طرف اس کے پاس جا سکتا ہوں" لیون نے سوچا۔ وہ جگہ جہاں وہ کھڑی ہوئی تھی اس کے لئے ایسی مقدس تھی کہ وہاں تک وہ پہونچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ واپس جانے کیلئے تیار ہو گیا لیکن اس نے کوشش کر کے اپنے اوپر قابو پا لیا اور اپنے آپ کو یہ یقین دلایا کہ وہ بھی اس کی قربت کا ایسا ہی حق رکھتا ہے جیسا کہ اور لوگ۔

وہ برف کے میدان کے دوسری طرف پہونچ گیا۔ نگاہوں کو 'کٹی' سے اس طرح بچاتے ہوئے گویا وہ ایک ایسا سورج تھی، جس کی دید پیغامِ حیرت ہوتی پھر بھی اس کی نگاہ 'کٹی' پر پڑ ہی گئی اگرچہ حقیقت میں اس نے اُسے نہیں دیکھا۔

اس دن برف کے میدان میں تمام آدمی ایسے تھے جو ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ان میں اسکیٹنگ کے ماہر بھی تھے جو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آئے تھے۔ وہ مبتدی بھی تھے جو کرسیوں کو آگے دھکیل دھکیل کر اسکیٹنگ سیکھ رہے تھے۔ ان میں بڈھے بھی تھے جوان بھی جو اپنی تندرستی کی بہتری کیلئے وہاں آئے تھے

لیون کو وہ بنام بے تمام خوش قسمت معلوم ہو رہے تھے۔ کیونکہ وہ 'کٹی' کے پاس تھے۔ مگر وہ سب کٹی کی موجودگی سے بے نیاز سے تھے۔ وہ اس کے پاس سے خاموشی کیساتھ گذر جاتے تھے۔ اس سے کوئی بات بھی کہدیتے تھے۔ مگر اس کی ذات پر اُن کی مسرتوں کا انحصار نہیں تھا۔ وہ تو صرف برف کے نظارے اور خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

کٹی کا بھائی 'نکولی شربسکی' ایک چھوٹا سا جاکٹ اور چست پاجامہ پیروں میں اسکیٹس (اسکیٹنگ کھیلنے کے پہیے) پہنے ہوئے ایک سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اسکی نظر لیون پر پڑی۔

"میں کہتا ہوں" اس نے لیون کو آواز دی "کیا تم یہاں بہت دیر سے ہو؟ جلدی سے اسکیٹس (اسکیٹنگ کھیلنے کے پہیے) پہن لو برف بہت عمدہ ہے۔ تم تو روس میں سب سے بہتر اسکیٹنگ کھیلنے والے ہو"

"میرے پاس میرے اسکیٹس نہیں ہیں" لیون نے جواب دیا۔ اسے تعجب تھا 'کٹی' کے سامنے اس سے اس طرح بے تکلفی کیساتھ باتیں کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ وہ اگرچہ 'کٹی' کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر اس کی صورت اسکے سامنے سے ایک منٹ کو نہیں ہٹی۔ اس نے اپنے اوپر سورج کی شعاعیں محسوس کیں۔

'کٹی' ایک گوشہ سے چکر کاٹ کر آ رہی تھی، وہ بظاہر مطمئن نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ایک نوجوان جو روسی لباس پہنے ہوئے تھا اپنے ہاتھ بے پروائی سے ہلاتا ہوا جلدی سے اس کے پاس سے گذرا۔ اس نے اپنے لبادہ کی جیب سے دونوں ہاتھ نکالے اور انہیں اس انداز میں رکھا گویا وہ راستے میں چلنے والی ہر چیز کا ان سے استقبال کرنیکو تیار ہے۔ جب اس کی نظر لیون پر پڑی تو وہ مسکرائی اور سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے بھائی کے قریب پہونچ گئی اور اس کا بازو تھام لیا۔ لیون کیلئے وہ اسوقت اسکی تصور 'کٹی' سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

جب کبھی لیون نے کٹی کا خیال کیا اسکے تصور میں کٹی کا حسین سنہری بال والا سر، اسکے ابھرے ہوئے شانے۔ اس کی معصوم دوشیزہ صورت بےحد دلکشی لئے ہوئے سامنے آجاتی تھی۔ لیکن اس کو سب سے زیادہ متاثر کرنیوالی اسکی جادو بھری آنکھیں تھیں اور اُن سے بھی زیادہ اس کا وہ تبسم تھا۔ جو اُسے نہ جانے کس طلسماتی عالم میں پہونچا دیتا تھا اور جو اسے بچپن کے مسرت خیز و نایاب دنوں سے یاد آ رہا تھا۔

"کیا تم یہاں بہت دیر سے ہو" 'کٹی' نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا

'لیون' نے کٹی کا رومال جو اس کی جیب سے گیا تھا زمین سے اٹھا کر اُسے دیا۔ جس پر کٹی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"میں؟ میں کل آیا تھا..... مطلب یہ ہے کہ آج ..." اس نے جواب دیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ "میں حاضر ہونیوالا تھا"۔ اس نے مزید کہا۔ لیکن خیال آتے ہی کہ وہ کس مقصد کے ماتحت اس سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا اور اس کے چہرہ پر ایک گہری سُرخی دوڑ گئی "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اسکیٹنگ بھی کر لیتی ہو اور اسقدر عمدہ طریقہ پر"

'کٹی' نے اُسے قریب سے دیکھا گویا وہ اس کی گھبراہٹ کی وجہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔

"یہ تمہارا حسن ظن ہے کہ تم ایسا کہہ رہے ہو خصوصاً اس وقت جب کہ میں سُن رہی ہوں کہ تم خود اسکیٹنگ کے ماہر ہو" اس نے دستانے پہنے ہوئے ہاتھوں سے اپنے کوٹ سے جمی ہوئی شبنم صاف کرتے ہوئے کہا

"ہاں میں ایک زمانہ میں اسکیٹنگ کا جنون کی حد تک شائق تھا اور میری دلی خواہش تھی کہ میں اس فن کا ماہر ہو جاؤں"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہر بات جنون کی حد تک کرتے ہو" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "اپنے اسکیٹس (اسکیٹنگ کے پہیے) پہن لو۔ ہم دونوں کوشش کر کے دیکھیں"

"دونوں اسکیٹنگ کرینگے!" اس نے خیال کیا "کیا یہ ممکن ہے؟"

"ابھی ایک لمحہ میں" اس نے جواب دیا اور جلدی سے وہ پہننے کے لئے اسکیٹس تلاش کرنے لگا۔

"بہت عرصہ کے بعد آپ یہاں نظر آ رہے ہیں" ملازم نے "لیون" کو اسکیٹس پہناتے ہوئے کہا "اس زمانہ میں آپ سے بہتر کوئی اسکیٹنگ نہیں کھیل سکتا۔ ٹھیک ہے نا؟" ملازم نے بند باندھتے ہوئے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے جلدی کرو" لیون نے اس خوشی کی لہر کو جو اس کے چہرے پر دوڑ گئی تھی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"زندگی یہی ہے" اس نے خیال کیا "یہی مسرت ہے" "دونوں" اس نے کہا تھا "ہم دونوں کوشش کر کے دیکھیں"۔ کیا میں اس سے ابھی کہدوں؟ ابھی نہیں۔ میں کس قدر مسرور ہوں بسرور۔ امید کیساتھ ..... اور اس کے بعد..... لیکن مجھے اس سے کہدینا چاہیئے۔ یقیناً... یقیناً...

میں کمزوری کا اظہار نہیں کروں گا۔"

"لیون" کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنا کوٹ اُتارا۔ برف کی ناہموار سطح پر جھونپڑے سے گھر کے چاروں طرف اس نے ایک چکر کاٹا۔ پھر وہ بغیر کسی کوشش کے برف کی ہموار سطح پر آگیا اور سیدھا "کٹی" کے پاس جا پہونچا۔

"کٹی" کے تبسم نے اظہار اعتماد کیا۔

"میں تمہارے ساتھ بہت جلد سیکھ جاؤں گی۔" اس نے کہا "مجھے بہرحال تم پر اعتماد ہے۔"

"تم میری طرف جھکو گی تو مجھے خود اپنے اوپر اعتماد ہو جائیگا۔" اس نے جواب دیا مگر اسے حیرت ہوئی کہ اس نے کیا کہہ دیا اور اس خیال سے اس پر سُرخی دوڑ گئی۔ حقیقتاً جیسے ہی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے "کٹی" کے چہرے سے مہر آمیز رنگ اس طرح اڑ گیا جیسے سورج بادلوں میں چھپ جائے اور اس کی بجائے اس کی شفاف پیشانی پر درشتی کے آثار پیدا ہو گئے۔

"کیا کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف ہو گئی؟ مگر نہیں مجھے یہ دریافت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے" اس نے جلدی سے کہا

"کیوں حق کیوں نہیں ہے مگر کوئی بات میرے خلاف نہیں ہوئی" اسکے سرد مہری سے جواب دیا "کیا تم مل لینن سے ملے ہو؟" اس نے موضوع کو بدلنے کیلئے کہا

"ابھی نہیں!"

"اس کے پاس ضرور جاؤ۔ وہ تم سے ملنے کی بہت مشتاق ہے۔"

"لیون" جب بھورے بالوں والی بوڑھی فرنچ گورنس کے پاس جو پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ جانے لگا تو اسے خیال آیا "کیا بات ہو گئی؟ میں نے اس سے یقیناً کوئی سخت بات کہہ دی ہو گی۔ خدایا میری مدد کر۔"

فرنچ گورنس اس طرح مسکرائی کہ اس کے تمام مصنوعی دانت ظاہر ہوگئے اس نے "لیون" کا ایک پُرانے دوست کی طرح استقبال کیا

"تم دیکھتے ہو ہم کتنے بڑے ہو گئے" اس نے "کٹی" پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا" اور ہم بوڑھے بھی ہوتے جا رہے ہیں۔ چھوٹی ریچھنی (ریچھ کی مادہ) اب کتنی بڑی ہو گئی ہے" بوڑھی گورنس نے سلسلہ کلام جاری رکھا اس نے یہ کہہ کر وہ زمانہ یاد دلایا جب "لیون" مذاق میں تینوں جوان خواتین "کٹی" اور اسکی بہنیں، کو انگریزی کے ایک تخیلی قصہ کی ریچھنیوں سے تشبیہ دیا کرتا تھا "تمہیں یاد ہے تم انہیں کیا کہا کرتے تھے؟"

لیون اس بات کو بالکل بھول چکا تھا مگر بہت قد بوڑھی گورنس اس مذاق پر پچھلے دس سال سے ہنستی چلی آئی تھی۔

"تم اب اسکیٹنگ کیلئے جا سکتے ہو۔ کیا ہماری کٹی اخوب اسکیٹنگ نہیں کرتی ہے؟"

جب لیون پھر "کٹی" کے پاس پہونچا تو "کٹی" کے چہرے سے سختی کے آثار جا چکے تھے۔ اس نے لیون کو پھر اسی بے تکلفی اور نرمی سے دیکھا لیکن اس کی اس مہربانی میں کوئی بات غیر فطری شامل تھی جو لیون کو تکلیف دے رہی تھی۔ اپنی بوڑھی گورنس کے متعلق دو چار فقرے کہہ کر وہ لیون کی زندگی کے متعلق گفتگو کرنے لگی۔

"کیا تم جاڑوں میں گاؤں سے اکتاتے نہیں ہو" اس نے پوچھا "نہیں میں بہت مصروف رہتا ہوں" اس نے "کٹی" کے یگانہ دار لہجہ سے متاثر ہو کر جواب دیا۔ اس وقت اس کا بالکل آغاز سرما کا سا حال تھا

"کیا تم یہاں زیادہ دنوں قیام کرو گے؟" کٹی نے پوچھا

"مجھے معلوم نہیں" اس نے بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے جواب دیا۔ اس کے لئے یہ خیال کہ پھر اسی طرح دوستانہ گفتگو ہوگی اور وہ بغیر اصل بات کئے چلا جائیگا ناقابل برداشت تھا۔

"تمہیں کیوں نہیں معلوم"

"میں حقیقتاً کہہ نہیں سکتا۔ یہ تمہارے اوپر منحصر ہے" اس نے خود اپنے الفاظ سے ڈرتے ہوئے کہا

"کٹی" نے یا تو اس کی بات سنی نہیں یا اَن سنی کر دی۔ اس کے قدموں کو لغزش سی ہوئی اور وہ جلدی سے "لیون" کے پاس سے مل لینن کے پاس چلی گئی۔ بوڑھی گورنس سے دو ایک باتیں کر کے وہ سیدھی لاج کی طرف چلی گئی جہاں اس نے اپنے اسکیٹس اتار دیے۔ "الٰہی میں نے کیا کیا۔ خدایا میری مدد کر، مجھے بتا کر میں کیا کروں۔" لیون نے دل ہی دل میں دُعا مانگی۔ اور شدید ورزش کی ضرورت محسوس کر کے اس نے برف پر کئی چکر لگا ڈالے۔

اسی وقت ایک نوجوان جو نوجوانوں میں سب سے بہتر اسکیٹنگ کرتا تھا چھوٹے کیفے (Cafe) سے منہ میں سگریٹ دبائے ہوئے نکلا اور اسکیٹس پہنے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ وہ تمام راستے جھومتا ہوا گیا تھا۔ اسے

بازوؤں کی آرام دہ حالت کو بدلے بغیر وہ برف پر دوڑتا چلا گیا۔

"یہ نئی ترکیب ہے" لیون نے کہا۔ اور خود بھی اسی طرح چلنے کی کوشش کرنے لگا۔

اتنے میں نکولی سرگئی نے اسے آواز دی: "دیکھنا کہیں اپنے آپ کو مار نہ ڈالنا۔ اس کھیل کیلئے تمہیں پہلے سے مشق ہونی چاہیئے"۔

لیون اوپر کی طرف ہو چکر سیڑھیوں سے کافی دور چلا گیا تاکہ نیچے آنے کیلئے کافی فاصلہ مل جائے۔ وہ پھر تیزی کیساتھ اپنے دونوں بازوؤں کے توازن سے اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا دوڑا۔ آخر میں اس کے پاؤں میں کوئی چیز آگئی جس سے وہ گرنے کے قریب ہو گیا۔ مگر اس نے بہت کوشش کرکے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور ہنستا ہوا برف پر آگے بڑھ گیا۔

"کیا خوب! وہ کتنا پیارا آدمی ہے" کٹی نے خیال کیا۔ اتفاق وقت سے اسی وقت مادینن کے ساتھ ایک چھوٹے فارج سے نکلی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے کسی عزیز بھائی کو دیکھ کر مسکراتی۔ اس کے خیالات کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ "کیا یہ میری غلطی ہے۔ کیا میں نے کوئی بُری بات کی۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں شادی کے معاملہ میں دھوکہ باز واقع ہوئی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس کے ساتھ بھی رہنا چاہتی ہوں۔ وہ کیسا اچھا ہے۔ نہ معلوم وہ کس بات سے متاثر ہو کر ایسا کہہ رہا تھا۔۔۔"

اتنے میں کٹی کی ماں آگئی۔ جب لیون نے دیکھا کہ کٹی اپنی ماں کے ساتھ جارہی ہے تو اس نے جلدی سے اپنے اسکیٹس اتارے اور ان کی طرف روانہ ہو گیا۔

"تمہیں دیکھ کر مسرت ہوئی" شہزادی (کٹی کی ماں) نے کہا "ہم ہر جمعرات کو میزبانی کرتے ہیں۔"

"کیا میں آج بھی آسکتا ہوں؟"

"ہمیں تمہارے آنے سے خوشی ہوگی" شہزادی نے بیدلی سے جواب دیا۔

کٹی کو اپنی ماں کی بے اعتنائی سے سخت تکلیف پہونچی اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس سلوک کی تلافی کردے۔

"خدا حافظ" کٹی نے لیون سے ایک شیریں مسکراہٹ کیساتھ کہا۔

اسی وقت اسٹیپن ارکیڈی وچ سر پر ایک طرف کو جھکا ہوا ہیٹ لگائے ہوئے بہت مسرور باغ میں داخل ہوا۔ اپنی ساس کو دیکھتے ہی اس کے چہرہ پر ایک قسم کی افسردگی آگئی۔ اس کی ساس نے اس سے "ڈالی کی صحت کے متعلق جو کچھ پوچھا۔ اس نے سب کا جواب دیا۔ اور لیون کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اچھا! تو کیا ہمیں چلنا چاہیئے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم یہاں آگئے" اس نے ایک مخصوص انداز سے لیون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"اچھا آؤ!" لیون نے مسرور ہو کر کہا اسے "خدا حافظ" یاد آیا اور ساتھ ہی وہ تبسم جو ہونٹوں پر ان الفاظ کیساتھ آیا تھا۔

"انگلش ہوٹل چلو گے یا ہرمیٹیج؟"

"جہاں کہیں چلو"

"تو پھر ہم انگلش ہوٹل چلیں گے" اسٹیفن ارکیڈی وچ نے کہا۔ اس نے انگلش ہوٹل کو اس لئے پسند کیا کہ اس ہوٹل کا اسے روپیہ دینا تھا اور وہ اس پر اپنا احسان کرنا چاہتا تھا۔ "کیا تمہارے ساتھ گاڑی ہے؟"

"یہ اچھا ہوا کیونکہ میں نے اپنی گاڑی بھیجدی ہے"

انھوں نے راستہ میں ایک دوسرے سے کوئی گفتگو نہ کی۔ لیون برابر کٹی کا خیال کرتا رہا اور اس کے رویہ کی تبدیلی پر غور کرتا رہا۔ پہلے اس نے یہ یقین کیا کہ معاملہ امید افزا ہے۔ اور دوسرے لمحہ اسے ناکامی کے تصور نے گھیر لیا۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ کٹی کی مسکراہٹ کے بعد سے وہ اپنے آپ کو بالکل دوسرا انسان خیال کررہا تھا۔

اسٹیفن آرکیڈی وچ اس درمیان میں برابر کھانوں کی فہرست تیار کرتا رہا۔

"کیا تم بڑی مچھلی کھانا پسند کرو گے؟" اس نے لیون سے اسٹارنٹ میں داخل ہوتے وقت پوچھا

"کیا؟" لیون نے کہا "بڑی مچھلی؟ ہاں میں اسے بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔"

(باقی)

ہم اور وہ

(مسلسل)

خواجہ محمد شفیع دہلوی

بڑے میاں دل میں تو بہت سٹ پٹائے گئے پر اظہارِ ندامت سے گریز پا معلوم ہوتے تھے۔ سکوت اعترافِ جرم کے مترادف اور کچھ کہنے کو منہ نہ پڑتا تھا۔

آنکھوں میں تجسس تھا۔ دماغ میں کاوش لیکن بات کچھ ایسی بگڑی تھی کہ بنائے نہ بنتی تھی۔ تاہم یہ سال خوردہ و باراں دیدہ اس دور کی پیداوار تھے جبکہ تاویل حسنِ بیان اور دروغ گوئی معراج تھی۔ حقیقت پہ پردہ ڈالنا فنِ لطیف تصور کیا جاتا اور سخن سازی کمالِ سخن۔

یہ بزرگوار ٹھنڈے پیٹوں آسانی سے قابو میں آنے والے تھے نہیں دل میں چور تھا آنکھ نہ ملا سکے نوجوان پر دزدیدہ نگاہ ڈالی اور کہا

پڑھے لکھے ہزار ہو بابا! ابھی ناکردہ کار ہو بابا

میاں صاحبزادہ ادب کو اخلاقی معیار میں تولنا۔ بادرا بگز بیہودن ہے نقدِ سخن کی میزان اور ہوتی ہے۔

ادب میں اخلاقیات کی آمیزش شراب میں نمک گھولنا ہے۔ تم بچے ہو دیوانے ہوئے ہو۔ جواہرات کے صندوقچہ میں گندم تلاش کرتے ہو۔ مشک کی ڈبیا میں ہینگ کے طلبگار ہو۔ ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد۔ عقل سے کام لو۔ سماع واعظ بجا نغمۂ رباب بجا۔ تم کہاں آئے ہو اور کیا تلاش کر رہے ہو؟ در خرابات میز کہ ہشیار بجا ست۔ یہ بزمِ ادب ہے محفلِ وعظ نہیں۔ یہاں ذکرِ حور و قصور نہیں قصور معاف یہاں حور و قصور ہے۔ یہاں سلسبیلِ لب گل رنگ اہلِ بزم کو سرخ رو کرتی ہے۔ یہاں وعدۂ سلسبیل نہیں۔ اس محفل میں درد مند شیرازۂ حیات منقطع کرتے ہیں۔ اشیاء سے رکھے ہوئے موتیوں کے بیان نہیں ہوتے۔ یہاں شباب پیمانہ بدوش پھرتا ہے حور سال خوردہ واعظ کرم خوردہ کو مبارک۔

یہ محفلِ شعر و سخن ہے۔ شگفتہ کلام و بیان

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ ✦ یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

اس عالم میں قادر البیان پیرِ فلک کا سینہ چاک کر خونِ شفق نکلتے ہیں کہکشاں سے جوئے شیر لاتے ہیں۔ بلند پرواز آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں زہرہ اور مشتری کو زینتِ محفلِ رندانہ بناتے ہیں۔

یہاں کج البیان شمع کی مانند روتے ہیں۔ رلاتے ہیں۔ پروانہ کی طرح جلتے ہیں جلاتے ہیں۔ سینہ فگارانِ چمن کی مانند زخمِ دل دکھاتے سینہ کو چمن بناتے ہنستے ہنساتے گذر جاتے ہیں۔

یہ محفلِ شعر و سخن ہے۔ یہاں وعظ و نصیحت پند و تلقین کی گنجائش نہیں۔ دیر میں خدا پرست کی تلاش اور کعبہ میں کافر ڈھونڈنا سعی لاحاصل ہے یا در تلاش ناپیدا۔ فکرِ معقول سفرما۔

نوجوان نے بڑے میاں کی طرف تبسم نگاہ ڈالی اور کہا۔ گستاخی معاف اگر جناب کے صاحبزادہ شراب لائیں اور فرمائیں اس کے رنگ و بو کی طرف توجہ فرمایئے۔ اس کی بوتل کو دیکھئے۔ اس فن پر غور کیجئے جس نے پانی میں آگ بند کی ہے۔ اور اگر جناب کے فرزندِ ارجمند ایک بازاری عورت لے آئیں اور فرمائیں کہ اس کو نسائی حسن کے معیار سے جانچئے۔ اس کے بدن کو دیکھئے۔ ہر ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہے۔ آواز کا ترنم۔ نگاہوں کی شوخی۔ اداؤں کی بے ساختگی دیکھئے اور اگر جناب کے خاندان کے چشم و چراغ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ساری جمع پونجی کے بدلے کوئی بہترین مرقع خرید فرمائیں اور فرمائیں کہ اس کی رنگ آمیزی کو دیکھئے۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ پر غور فرمایئے۔ معلوم ہوتا ہے منہ سے بولنے کو ہے۔ چوکٹھے سے باہر قدم رکھنے کو ہے۔ اُن ماہرِ فن انگلیوں کا خیال کیجئے جنہوں نے بے جان رنگوں میں جان ڈال دی۔ ایک کاغذ کے پرزہ میں روح پھونک دی۔ تو سینہ پہ ہاتھ رکھ کر ایمان سے فرمایئے کہ جناب والا کے اس وقت کیا جذبات ہوں گے۔ کیا آپ بیٹے کی ان حرکات کو مناسب تصور کریں گے۔ کیا

جناب صاحبزادہ کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ کیا حضور اپنے چشم و چراغ کی چرب زبانی پر آمنا و صدقنا فرمائیں گے۔ یا سر پکڑ کر بیٹھیں گے اور اپنی بپتا آنیوالوں کو سنائیں گے۔ تاکہ ان کے کان ہوں اور اپنی اولاد کی احتیاط کریں۔

پھر ذرا یہ تصور فرمائیے کہ صاحبزادہ کی ان غلط کاریوں کا اثر آپکے پوتوں اور پڑپوتوں نے قبول کیا۔ آپ کی نسل ہمیشہ ہمیشہ کو برباد ہوگئی۔ جن کے آپ کو آسرا تھا۔ وہ نونہال اجڑ گئے۔ آپکے امید پر بادخزاں چل گئی۔ آپکے نام لیوا اور پانی دیوا شرابی ہوگئے۔ بوالہوس ہوگئے۔ مرقع پرست ہوگئے۔ اب فرمائیے کہ اس بربادی کو دیکھتے ہوئے آپ کیا کہیں گے۔ آپ اس لڑکے پر ناز کریں گے یا اس دن پر افسوس جب وہ ناخلف پیدا ہوا تھا۔

یہ ایک خاندان کا برباد ہونا تھا۔ ایک چھوٹے سے گھرانے کی تباہی تھی جس کا نقشہ آپکے سامنے پیش کیا گیا۔ تصور کیجئے اس قوم کا جس پر یہ بپتا پڑی ہو خیال کیجئے اُن بدنصیب آنیوالی نسلوں کا جو بڑوں کی غلط کاریوں کی وجہ سے دنیا کے سیلاب میں پا بجولاں لائی گئی ہوں۔

آپ کا لڑکا خاندانی گھر فروخت کردیتا ہے اور پھر آپ کا پوتا اس ہی گھر میں غلاموں کی طرح کام کرتا ہے۔ جہاں اسکے بزرگ رہتے بستے اور نوکروں پر حکم چلاتے تھے۔ خیال کیجئے اس بدنصیب پوتے کے جذبات کا جب کہ اُس کو اسد و جزر کا احساس ہوگیا ہو۔

اب کہئے کیسی لگی۔ اس تصور سے آنکھیں کیوں ڈبڈبا آئیں۔ اس خیال سے دل میں ایک ہوک سی کیوں اٹھی۔ یہ اپنے گھر کا ذکر تھا..... ہم میں اور آپ میں صرف فرق اتنا ہے کہ آپ قوم کے گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتے تھے اور ہم اس راز کو جانتے ہیں کہ جماعت کی عزت میں ہے سب کی عزت۔ آپ کو قوم پرستی اور جماعت کا تخیل چھو نہیں گیا تھا اور ہم کچھ کھو کر سیکھتے ہیں۔ آپ اس وقت پیدا ہوئے تھے جبکہ دنیا آپکے قدموں میں تھی۔ اور ہم نے اسوقت آنکھ کھولی جب زمانہ ہم سے آنکھیں پھیر چکا تھا۔ روزگار بر سر پیکار رہتا۔ ہم کو ایک دوسرے کا سہارا درکار رہتا۔ باد مخالف چل رہی تھی۔ ساحل دور تھا اور کشتی ڈوبنے کو۔ مصیبت مصیبت زدوں میں اکثر یگانگت پیدا کردیتی ہے۔ ہم سب ایک کشتی میں تھے اس کا ڈوبنا ہم سب کا غرق آب ہونا تھا۔ ہم میں متفقہ نقصان اور فائدہ کا احساس پیدا ہوا اور سانحہ کے ساتھ یک جہتی۔

آپ عیش و عشرت میں پیدا ہوئے۔ آرام و راحت میں پلے بڑھے پروان چڑھے حکومت آپکے ہاتھ میں تھی دولت آپکے قدموں میں۔ مصیبت سے بیگانہ تلخ کامی سے نا آشنا۔ لاڈلی اولاد تھے۔ ناز نازیبا کے عادی۔ بڑوں کا ترکہ دمڑی دمڑی لٹا رہے تھے۔ مزے اڑا رہے تھے۔ شراب عیش میں بمست آنکھیں بند کئے تباہی کے گڑھے کی طرف غزلخواں چلے جا رہے تھے۔

اور ہم اسوقت پیدا ہوئے جب کہ جناب کی عیش پرستوں کی بدولت گھر میں سوائے رنج و آلام کے اور کچھ نہ بچا تھا۔

اگر غور سے دیکھئے تو کسی زمانہ کے اُدبا اور شعرا کو ملعون کرنا بھی حق بجانب نہیں۔ ہر دور کا ادب اس زمانہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی جس جگہ رہتی ہو وہیں کے گردو نواح سے شہد اخذ کرتی ہے۔ دریا جن گھاٹیوں۔ پہاڑوں اور وادیوں میں سے ہو کر آتا ہے وہاں کے سنگ ریزے رنگ اور نشانات ساتھ لاتا ہے۔ یہی کیفیت ایک ادیب کی ہے۔ جس ماحول میں پیدا ہوتا اور زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے اثرات قبول کرتا اور اپنے ہر ہر لفظ میں اس دور کی معاشرت طبیعت اور ذہنیت کی مکمل تصویریں چھوڑ جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جب اردو ادب پیدا ہوا تو ہماری اخلاقی۔ معاشرتی اور سیاسی حالت کیا تھی۔ ہمارے شاعروں کا گردو پیش کیا تھا اور ہمارے سماج کی کیا کیفیت تھی۔

سلطنت مغلیہ کا زوال شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ بہادر شاہ شاہ اورنگ زیب کا سال خوردہ ہمت شکستہ لڑکا زیب اورنگ ہوا۔ شاید یہ سلسلۂ تیموری کا بے بہا دُر ثابت ہوتا لیکن حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ نوبت پنج روزہ گذار پنج سالہ حکومت کے بعد جہان گذراں سے گذر گیا۔

اب نام کا جہاں دار شاہ مالک تاج و تخت ہوا۔ جہاں گیری تو در کنار نام کی لاج بھی نہ رکھ سکا۔ ایک سال کے اندر قتل کیا گیا اور جہاں دار دار البقا کو سدھارا۔

اس کے بعد فرخ سیر سر یر آرائے سلطنت ہوا۔ چھ سال بعد قتل کیا گیا۔ اسی ایک سال کے اندر دو اور وارث تخت نشیں ہوئے اور تہ خاک پہنچا دئے گئے۔

اب دور محمد شاہی شروع ہوتا ہے۔ آج رنگ ہے۔ رنگیلے پیا زیب اورنگ یہ رنگ ڈھنگ حکومت کے نہیں۔ متانت با جی مگ پایا۔ نادر شاہ درانی عذاب ناگہانی کی طرح آیا۔ دلی میں قتل عام ہوا۔ نظام الملک پیر نود سالہ خوردہ سال

جھکوسے کی طرح آنسو بہاتا نادر شاہ کے روبرو آیا اور دست بستہ عرض کی۔

کسے نہ ماند کہ دیگر تیغ ناز کشی ✤ مگر کہ زندہ کنی باد باز کشی

اس کے بعد آنیوالے شاہان شطرنج کی حکومت۔ حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم سے بیش نہ رہی جس کا اختتام ۱۸۰۶ء میں ہو گیا۔

اس دور میں راجہ پرجا۔ شاہ و رعایا سب رنگ تعیش میں رنگے تھے۔ امرا شیر قالین تھے۔ شعرا ان شیروں کے مدح سرا۔ وزیرے چنیں شہر یارے چناں۔

افسرانِ فوج خیمے سے پالکیوں میں چڑھ کر رن سر کرنے جاتے تھے۔

امرا تخت و تاج کے دشمن۔ جذبۂ وفا شعاری مفقود ہو چکا تھا۔ غداری اور ریاکاری کی گرم بازاری تھی۔ ظاہری منہ دیکھے کی محبت رہ گئی تھی۔ صداقت رخت سفر باندھ چکی تھی۔ تصنع اور بناوٹ کا دور دورہ تھا۔ شاعری بھی اسی رنگ کی آئینہ دار حقیقت سے دور تصنع سے معمور۔

یہ کیفیت تھی سیاست اور حکومت کی مذہب نے بھی اس سرزمین میں نئے گل کھلائے۔ روحِ اسلام ختم ہو چکی تھی جسدِ اسلام رہ گیا تھا۔ جذبۂ مسلمانی مفقود شرع مسلماں موجود۔ اور اس نے بھی کچھ ایسا روپ بدلا تھا کہ پہچاننا مشکل ہوتا جاتا تھا۔ حقیقت تصنع سے بدل رہی تھی۔ صفائی رنگ آمیزی سے۔ عرب کا استوار کھجور کا درخت اس سرزمین کے اثر سے گلاب کی خانہ دار جھاڑی بنتا جاتا تھا۔

رسم و رواج اصل مذہب پر چھا گئے تھے۔ لباس نے جسم کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا۔

فلسفۂ یوگ کی جنم بھوم میں تصوف کی بیل پھول پھلی پروان چڑھی۔ اسلام جیسا سیدھا سادھا مذہب گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔

یہ رنگ عالمگیر تھا۔ جب مذہب اس کے چھینٹوں سے نہ بچ سکا تو ادب کیا دامن بچا کر جا سکتا تھا۔

وہ سیاست تھی یہ مذہب اب معاشرت اور معیشت کا اندازہ آپ خود لگا لیجیے۔ خیال کن ز گلستانِ من بہار مرا۔

ہمارے شعرا کے دل و دماغ پر غلامی کے خول چڑھے تھے۔ پیٹ بری بلا ہے۔ یہ امیر غریب عالم جاہل سب کے ساتھ لگا ہے۔ اس دوزخ کو بھرنا ہی پڑتا ہے۔ اس دور کے شعرا کسی نہ کسی صاحب ثروت کے دست نگر ہوتے اور اپنے ممدوح کی   و عطا پر گذر کرتے۔ آقا کی مرضی کے مطابق اپنی طبیعت کے خلاف پابندیوں کے تحت شعر کہتے تھے۔

دولتِ دنیا تے دوں سفلہ پرور جاہل نواز ہے۔ اکثر امرا اسی زمرہ میں سے تھے۔ اور شعرا کو ان کی سے پالا پڑتا۔ کسی آدمی سے آپ ایک خاص عرصہ میں خواہ باغ گوا لیں خواہ اجاڑ دلوا لیں۔ یہی کیفیت دماغی کام کی ہے۔ ایک ادیب سے ایک فرصت میں خواہ بے معنی زٹل قافیہ کہلوا لیں خواہ پر مغز با معنی دریائے معنی حاصل کر لیں۔

اس حقیقت کی بہترین مثال ہم کو انشاء اللہ خاں انشا میں ملتی ہے۔ نواب نے ایک مصرع کہدیا ان کو غزل پوری کرنی پڑی۔ ملاحظہ ہو۔

پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیسی کی ٹوپی ۔ یاں وقتِ سلام اترے ہے ابلیس کی ٹوپی

ممدوح ان داتا کو غصہ آگیا۔ مردِ میدانِ سخن کو اوڑھنی اوڑھنی پڑی۔

انشاء اللہ خاں حکیم شحیم ست نٹے مردِ معقول ناک پر انگلی دھرے فرما رہے ہیں۔

میں ترے صدقہ نہ رکھ لے مری پیاری روزہ

بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

تخت نشیں ممدوح۔ لونڈی بچہ کمینہ خصال چھپر کھٹ پر بیٹھا پھولوں کا گجرا اچھال رہا ہے اور انشاء اللہ خاں کھڑے فرما رہے ہیں ؎

لگا چھپر کھٹ میں جا کے جو اچھالا تو نے جو لے کے گجرا

تو موجِ دریائے چاندنی میں وہ ایسا جاتا ہے جیسے بجرا

یہی انشاء اللہ خاں جب معتوب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بسان نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں

نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

پہلے دور میں دولت انشار کے قدموں میں تھی لیکن اقلیمِ سخن ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ دوسرے دور میں یہ شیر نیستانِ سخن خاک نشین تھا لیکن طائر سدرہ نشیں اس کا شکار۔ یہ شاہِ سخن راکھ کے ڈھیر پر بیٹھا نقدِ سخن لٹا رہا تھا۔ آنیوالی نسلوں کے لیے جواہر ریزہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔

سچ یہ ہے کہ اس عہد میں سیمرغ خاکروبوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اور ان سے کوڑا سمٹوایا جا رہا تھا۔

قصیدہ گوئی کا زور تھا شاعروں نے گداگری اختیار کر لی۔ کلام فقیر کی صدا بن گیا اور شاعر کی بیاض کشکولِ گدائی۔ جو شمع بزم جہاں منور کرنے پیدا کی گئی تھی۔

اس سے تنورگرم کیا جانے لگا۔

جس طاقت کا کام سوتوں کو جگانا تھا وہ خود کلیم گدائی اوڑھ کر سو گئی۔ جو ہما بجل شاہی تھا شہباز آز کا شکار ہوا۔

اندھیر تھا شمع ادب پر فانوس شکم ڈھکا تھا۔ غذائے روح نان شبینہ کے لئے دریوزہ گر۔

قصیدہ نان جویں کیلئے کہا جاتا اور غزل خراج تحسین کیلئے۔ غزل کی خصوصیت ہے کہ ایک شعر دوسرے شعر سے معنی میں مختلف ہوتا ہے۔ تصوف۔ معاملہ بندی۔ رندانہ روی۔ وصل و فراق۔ ادا بندی۔ اخلاقیات غرضکہ ہر قسم کے تخیلات کا اُبل بے جوڑ مجموعہ پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔ خیالات میں تسلسل کا نہ ہونا کلام کو اثر سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ چند سے لطف محفل رہتا ہے اور بس۔

معنی میں اس درجہ آزادی لیکن بحر ردیف اور قافیہ کی سخت پابندی لازم حقیقت یہ ہے کہ ہم حقیقت اور معنی سے دور جا پڑے تھے۔ لیکن فروعات اور ظاہری پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ رنگ ہمہ گیر تھا۔ صرف شاعری سے مخصوص نہیں۔

یہ سمجھنا کہ ہندوستان میں امن و عافیت کی کمی ہمارے ادب کو پستی کی طرف لیجا رہی تھی حقیقت پر پردہ ڈالنا ہوگا۔ جب کہ عرب زمانۂ جاہلیت کا ادب تیار کر رہا تھا۔ حنظلہ وفا اور خودداری کا پیغام پہنچا رہا تھا۔ جرأت اور بہادری کا سبق دے رہا تھا۔ اسوقت صحرائے عرب میں امن و امان نام کو نہ تھا۔

حقیقت یہ تھا کہ پُر خطر زندگی اندیشہ ناک معیشت جوہر انسانی کو سطح پر لاتی ہے اور متمدن مامون زندگی۔ فراوانیٔ عیش و نشاط کا باعث ہوتی اور خیالات کو ابتذال کی طرف لیجاتی ہے۔ برخلاف اس کے خطرہ اندیشہ اور مصائب انسانی ہمدردی اخوت اور یگانگت کے جذبہ کو ابھارتے اکساتے اور منظر عام پر لاتے ہیں۔

داغ کی رندانہ روی۔ عاشقانہ گوئی اور رنگ تغزل ملاحظہ ہوا اور ساتھ کے ساتھ اسی شاعر کا شہر آشوب دیکھیے۔ زمین آسمان کا فرق ہے ایک طرف درد اور ہمدردی کی تصویر نظر آ رہی ہے دوسری طرف پستی اپنا رنگ جما رہی ہیں۔ وہی شاعر ہے وہی دماغ ہے۔ مصائب روزگار دیکھ کر پھٹ پڑا یہ نکلا سینہ کی بیتابیاں دھوتا۔ ایک طرف محفل عیش سے مینا و بوش کے چھینٹے اڑاتا مست بناتا چلا جا رہا ہے دوسری طرف بربادیٔ جہان آباد سے دل میں کسک سی پیدا ہو گئی ہے۔ شعر آفرینی خس و خاشاک بہاتا چلا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ صاحب کمال ہر حال میں اپنا کمال دکھا جاتے اور منوا جاتے ہیں۔ اور جن میں جوہر ذاتی کی کمی ہوتی ہے ۔ وہ متمدن زمانہ کی امداد کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔

جس طرح سچا ہیرا تہِ خاک بھی چمک دے جاتا ہے اور ایٹیشن خوشنما کیسی خوبصورت جڑائی ہو زبجلی کی روشنی کا محتاج رہتا ہے اور اس فضا کے باہر اسکی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ حقیقت کھلا جاتی ہے۔ اسی طرح مصنوعی ادیب متمدن زمانہ کے دست نگر ہوتے ہیں جبکہ محض جوہر ذاتی بر سر مقابلہ نہیں آتا بلکہ تمدن کے دوسرے آلۂ کار بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً دولت اپنا اثر دکھاتی ہے ۔ غدر سے پہلے جو واہ واہ شہزادوں کے لچر پوچ اور بے معنی اشعار پر ہوتی بڑے سے بڑے شاعر اس تحسین و آفریں سے محروم نظر آتے تھے۔ آج بھی آپ کے ہاں ایک مثل اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے۔ کلام الملوک ملوک الکلام

اس قسم کے مصنوعی جواہر متمدن زمانہ میں امن و امان کے زیر سایہ دولت و ثروت کے پرتو میں اپنی جھوٹی چمک دمک دکھا تاریخ ادب میں جگہ پالیتے ہیں۔ لیکن جب وہ فضا ختم ہو جاتی ہے۔ زمانہ رنگ بدلتا اور ان جواہرات کو تنقید کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے تو یہ مصنوعی سنگ ریزہ شیشہ کے ٹکڑے سارے تاریخ کی قدر و قیمت گھٹا دیتے اور اس تو اہل نظر کی نظروں سے گرا دیتے ہیں۔

یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔ مالک تاج و نگیں اپنے رنگ میں تھے۔ اہل دربار کے رگ و پے میں نمک حرامی اور غداری سرایت کر گئی تھی۔ امرائے مرد افگن عیش و نشاط کا شکار۔ شاعر بھی اسی محفل رنگ و بو میں تھے۔ خم کے خم لنڈھاتے جام پر جام چڑھاتے ۔ رونق بزم رندانہ تھے۔ اپنے سماج کا نقشہ کھینچ گئے اور آنیوالی نسلوں کیلئے مسموم فضا چھوڑ مرے۔ بڑے میاں سر جھکائے بیٹھے تھے کہ نوجوان نے ایک اور ورق الٹا

نیا راگ

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

ماہ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

مطربہ! جب ساز پر زخمہ لگا دیتی ہے تو
کل فضا میں سیلِ موسیقی بہا دیتی ہے تو

بام و در پر دوڑتا ہے ایک کیفِ بے خودی
خرمنِ ادراک پر بجلی گرا دیتی ہے تو

مستیاں پھرتی ہیں اتراتی ہوا کے دوش پر
بربطِ عشرت کا وہ نغمہ سنا دیتی ہے تو

مضطرب ہوتے ہیں منظر رقص کرنے کیلئے
خواب سے ہر ایک ذرہ کو جگا دیتی ہے تو

جھومتی ہے محفلِ انجم، بساطِ چرخ پر
وجد ساماں، ماہِ تاباں کو بنا دیتی ہے تو

موجزن ہوتا ہے ہر ذرہ میں دریائے نشاط
صفحۂ ہستی سے نقشِ غم مٹا دیتی ہے تو

گھاٹیوں میں ڈھلکی گرتے ہیں سُریلے آبشار
گلشنِ احساس میں کلیاں کھلا دیتی ہے تو

کروٹیں لیتی ہے دلمیں اک بہشتِ رنگ و بو
کل جہاں کو اسقدر رنگیں بنا دیتی ہے تو

کیا کہوں میں زمزمے تیری ہیں کتنے پُر اثر؟
زہرہ و پروین کو نظروں سے گرا دیتی ہے تو!

یہ گماں ہوتا ہے رہ رہ کر بہا جاتا ہوں میں
زمزموں کی زد میں ہر شئے کو بہا دیتی ہے تو

کھلنے لگتے ہیں یکایک مجھ پہ اسرارِ حیات
جو حجاباتِ نظر ہیں سب ہٹا دیتی ہے تو

راگنی کی آنچ چھو لیتی ہے میری روح کو
ولولے سوئے ہوئے، دلمیں جگا دیتی ہے تو

ختم کر چکتی ہے لیکن جب سرودِ سرمدی
دیکھ کر اسوقت مجھ کو مسکرا دیتی ہے تو

جذب کر دیتی ہے مجھ میں اُن بہاروں کا اثر
قلب میں جن سے نئے غنچے کھلا دیتی ہے تو

حسن یحییٰ عندلیب۔ ایم اے

تم مجھے بھول جاؤ گے!

چاہ بہت جتاؤ گے — دیدہ و دل پہ چھاؤ گے!
سر کی قسم بھی کھاؤ گے — پہلے تو یوں لبھاؤ گے!
آنکھ نہ پھر ملاؤ گے!
تم مجھے بھول جاؤ گے!

جور پہ جور اٹھاؤں گی — چوٹ پہ چوٹ کھاؤں گی!
اُف نہ زباں پہ لاؤں گی — شانِ وفا دکھاؤں گی!
دیکھوں گی جو دکھاؤ گے!
تم مجھے بھول جاؤ گے!

میں نے یہ مانا بستی بھی — رات برہ کی دکھ بھری!
ٹھنڈی ہوائیں صبح کی — آنکھ اگر جھپک گئی!
سپنے میں بھی نہ آؤ گے!
تم مجھے بھول جاؤ گے!

فصلِ بہار آئے گی — غم کا پیام لائے گی!
زخمِ جگر کھلائے گی — دل کو جنوں سکھائے گی!
ہوش مرے اڑاؤ گے!
تم مجھے بھول جاؤ گے!

کوکیں گی کوئلیں ادھر — یا پی پیہا بھی ادھر!
"پی کہاں"، چیخ چیخ کر — توڑے گا دل میں نیشتر!
خون مجھے رلاؤ گے!
تم مجھے بھول جاؤ گے!

اوس کی ننھی بوندیاں — مے کی بھری کٹوریاں!
چاندنی رات کا سماں — دل پہ گرینگی بجلیاں!
تم نہ لگی بجھاؤ گے!
تم مجھے بھول جاؤ گے!

چاند چکور، اور چھور — مورنی پاس ایک مور!
میری دکھے گی پور پور — دھڑکے گا دل بھی زور زور!
تم نہ درس دکھاؤ گے!
تم مجھے بھول جاؤ گے!

جب مری روح بے دیار — ہوگی عدم میں بیقرار
ڈھونڈیگی تمکو بار بار — ٹھوکریں کھائیگی ہزار
پھر بھی ترس نہ کھاؤ گے!!!
تم مجھے بھول جاؤ گے!!!

سروش عسکری طباطبائی

رقص

اے مری ہم رقص مجھکو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گھر کے چور دروازے سے آکر زندگی
ڈھونڈھ لے مجھ کو نشاں پالے مرا
اور جرم عیش کرتے دیکھ لے!
اے مری ہم رقص مجھکو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے!
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی میرے لئے

ایک خونی بھیڑیے سے کم نہیں
اے حسین و اجنبی عورت اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لحہ لحہ اور بھی تیرے قریب!
جانتا ہوں تو مری جاں بھی نہیں
تجھسے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک!
عہد پارینہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں
جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں
اسلئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

م۔ ن۔ راشد ایم اے

زمینِ وطن

زمینِ وطن ! اے زمینِ وطن !
ازل میں جہاں سب سے پہلے حیات
لئے اپنے آغوش میں کائنات
جلاتی ہوئی شمعِ ذات و صفات
حجابِ عدم سے ہوئی جلوہ زن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

جہاں بسترِ برف سے مستِ خواب
اٹھا آنکھ ملتا ہوا آفتاب
لٹاتی ہوئی جلوۂ بے نقاب
جہاں آئی پہلی سنہری کرن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

جہاں پہلے تخلیقِ انساں ہوئی
تری رحمت اُس کی نگہباں ہوئی
خرد اس کی گہوارہ جنباں ہوئی
بشر نے تمدن کے سیکھے چلن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

جہاں ابنِ آدم بلا گو دیوں
جہاں نسلِ انساں چلی گھٹنیوں
جہاں چشمِ حیرت کے کیا، اور کیوں؟
لبِ طفل تک آئے بنکر سخن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

جہاں خیر و شر میں ہوا امتیاز
بنی زیست مجموعۂ سوز و ساز
کھلا رازِ ایمان سے ہستی کا راز
تراشے گئے ایزد و اہرمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

وہ انساں کا بڑھتا ہوا اعتقاد
بنے دیوتا آتش و آب و باد
پرستش پہ دار و مدارِ مراد
وہ ویدوں کے میٹھے سریلے بھجن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

جہاں اک کنول پر بہ صد دلبری
اُٹھی چشمۂ شیر سے لکشمی
قدمِ شو کے شانوں پہ دھرتی ہوئی
اُتر آئی گنگا جہاں خندہ زن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

جہاں تیرے جلوے ہویدا ہوئے
جہاں اہلِ دل آن پہ شیدا ہوئے
جہاں گوتم اور کرشن پیدا ہوئے
جہانِ سازِ فطرت ہوا نغمہ زن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

گئے چھوڑ کر اپنے اپنے نشاں
ہوئے باری باری جہاں کامراں
جہاں آکے اُترا ہر اک کارواں
مغل۔ آریہ۔ ترک۔ تاتار۔ ہُن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

لئے غیر ملکوں نے تجھ سے سبق
تری داستاں کے اڑائے ورق
ترے خوشہ چیں از شفق تا شفق
عرب۔ مصر۔ یونان۔ چین اور ختن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

شبستانِ ایران کا سامان و ساز
ترقی بازارِ وینس کا راز
وہ خود اہلِ روما کو تھا جن پہ ناز
ترے دستکار اور ترے اہلِ فن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

کہاں ہیں ترے سورما صف شکن؟
ترے اہلِ دانش! ترے اہلِ فن؟
کہاں ہے ترا اقتدارِ کہن؟
ترے رام لچھمن۔ بھرت شترگن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

کسے آج آئے گا اس کا یقین
اشوک اور بھارت کی اے سرزمیں
ترے در پہ گھستی تھی دنیا جبیں
کبھی تو ہی تھی سجدہ گاہِ زمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

ترے کوہ و دریا جمال آفریں
تری وادیاں رشکِ خلدِ بریں
کسی نے تجھے یوں بنایا حسیں
کہ جیسے سنواری گئی ہو دلہن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

نہیں کوئی تیرے لئے پُر خروش
تری راہ میں عازم و سخت کوش
نہ نادر کا جذبہ نہ غزنی کا جوش
نہ وہ بندۂ زر نہ وہ بُت شکن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

کوئی اب تری سمت آتا نہیں
تجھے کوئی اپنا بناتا نہیں
نظر تیری جانب اٹھاتا نہیں
کہ جیسے کوئی لاش ہو بے کفن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

مٹا کر تری گرم بازاریاں

بنیں اہلِ یورپ کی زرداریاں
تری خوں کی سینچی ہوئی کیاریاں
یہ مغرب کے سب لہلہاتے چمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

نہیں کون آلودۂ خون و خاک ؟
ہوا ہو نہ جو اس فضا میں ہلاک ؟
جسے کہہ سکیں ہم غلامی سے پاک ؟
نہ سنگِ ہمالہ نہ آبِ جمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

ترے دورِ ماضی کے آئینہ دار
تری شانِ اسلاف کی یادگار
کہیں کچھ کھنڈر ہیں کہیں کچھ مزار
نہ وہ اہلِ محفل نہ وہ انجمن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

یہ دہلی کے نقش و نگارِ خموش
یہ چتوڑ کی خاکِ لالہ فروش
یہ کیلاش کی چوٹیاں برف پوش
تجھے ڈھونڈتی ہے عروجِ کہن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

یہ معصوم بچے ترے شیر خوار
امیدیں لئے شوق سے ہم کنار
گلے ان کے ہوں اور غلامی کے ہار
اور آئے نہ تیری جبیں پر شکن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

یہ دوشیزگانِ وطن سبز فام
رہیں یوں کنیزیں - جنیں یوں غلام
تری تیغِ غیرت نہ ہو بے نیام
ہوا ہے سفید آہ خونِ وطن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

تجھے صولتِ اکبری کی قسم
تجھے عصمتِ پدمنی کی قسم
تجھے خاکِ پانی پتی کی قسم
پھر اک بار دکھلا جلالِ کہن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

بدلنے کو ہے موسمِ روزگار
ہواؤں میں ہے ایک کیفِ خمار
تری سمت پھر آ رہی ہے بہار
لئے پھر گل و لالہ و نسترن
زمینِ وطن اے زمینِ وطن

پھر آنے کو ہیں سوئے گلشن اسیر
برسنے کو ہے پھر گھٹاؤں سے نیر
چٹانوں میں ہے مضطرب جوئے شیر
کہاں ہے کہاں تیشۂ کوہکن !
زمینِ وطن اسے زمینِ وطن ،

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے
مساواتِ انساں کا پھر نام لے
روایاتِ ماضی سے پھر کام لے
وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمیں وطن اے زمینِ وطن!

آنند نرائن ملا ایم اے

نذرِ غالب

(جو ساغر نے ۱۶ر فروری کو ۹ بجکر ۵ منٹ پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براڈ کاسٹ کی)

بنامِ غالبِ سدرہ نشیں پلا ساقی / کہ تشنہ لب ہے بہت روحِ ارتقا ساقی
بلیچ دوش پہ مستی کی جیا گھٹیں لے کر / وہ آیا دیکھ گھٹاؤں کا قافلہ ساقی

"بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے"

نگاہِ کم یہ مگر روحِ ساغرِ جم ہے
کہیں نہ فاش ہوں اسرارِ میکدہ ساقی

(۲)

کہاں کا بربط و مضراب اور کہاں کا رباب / نظر سے آج تو ہے کارِ زمزمہ ساقی
بکمیرِ غالبِ آشفتہ سر کی یاد میں زلف / کہ مدتوں سے تخیل ہے نارسا ساقی

"زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے"

زباں نے وجد کیا عشرتِ بیاں کیلئے
لبوں نے بحرِ ترنم بہا دیا ساقی

(۳)

ابد کی نیند سے حافظ کو آج کر بیدار / عدم کے خواب سے خیام کو جگا ساقی
سرورِ میکشِ[1] السانوی نہیں کامل / ہے جس پہ مُہر آسودہ اُسے پلا ساقی
مے عجم سے یہ رندِ عرب ہے کیوں محروم / ابو نواس کے مرقد پہ بھی بہا ساقی
اور اس کے بعد جو کچھ بچ رہے تو انکو بھی / کھڑے ہیں دیر سے روح الامیں یہاں ساقی

"یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے!
کہ غیرِ جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں"

تصورات کی چشم و نظر میں خاک نہیں
تمام عالمِ امکاں ہے گلکدہ ساقی

(۴)

جو کفر وجد میں آئے تو مست ہو ایماں / نشانہ آج نہ جائے کوئی خطا ساقی

"خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں"

[1] گوئٹے

تری نظر میں گہر ہے، گہر میں خاک نہیں
ترے وجود سے روشن ہے میکدہ ساقی

جو تو نے جام نظر میں چھپا کے رکھا ہے
وہ ایک جرعۂ باقی بھی مجھے پلا ساقی

ترے کرم کے میں صدقے مری طلب بھی دیکھ
تجھی کو مانگتا ہوں تجھ سے بر ملا ساقی

لرز رہی ہے ہر اک موجِ بادہ ساغر میں
چھلک کے جام یہ مستی میں کیا کہا ساقی

"نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ"

نیامِ خطِ پیالہ سے اٹھ کے خنجر کھینچ
یہ دل، یہ سر ہے، یہ جان اب ہے دیر کیا ساقی

صدائے پردۂ الہام گونج تھی جسکی
ترے نثار وہی نغمہ گنگنا ساقی

نہ دیکھ بزم میں جھک جھک کے دُردِ غالبؔ کو
ہر ایک بوند ہے اسکی فلک نما ساقی

اسدؔ کے نام پہ کیا حل کیا یہ ساغر میں
گلاب و بادہ ہے یا شعر و فلسفہ ساقی

"ہوئی ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے"

یہ میکدہ تری ہستی کا عکسِ رنگیں ہے
ہر ایک ذرہ ہے مستی کا آئینا ساقی

زبانِ غالبؔ اعظم کو دے نویدِ حیات
بعید تجھ سے نہیں کچھ یہ معجزہ ساقی

مزہ تو جب ہے کہ ذوقِ ظفرؔ بھی مست ہو آج
کمالِ جادوئے ساقی گری دکھا ساقی

"علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں"

تعینات پہ رندوں کو اعتقاد نہیں
جہاں سے قیدِ زمان و مکاں اٹھا ساقی

"ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے"

نگینہ چاہیئے اس خاتمِ جہاں کے لیئے
فلک سے کوئی ستارہ ہی توڑ لا ساقی

ساغرؔ نظامی

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

۱۵ اگست سنہ ۱۹۲۰ء

اب تک آن کے حالاتِ زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے وہ اس کا نصف حصہ بھی نہیں معلوم ہوتا جو مولانا کی زندگی اپنے مختلف مراحل: مطالعہ کر چکی ہے "حیات آزاد" اپنے اختصار اور جامعیت

فہم قران

از محمد سعید احمد ایم اے۔ (فاضل دیوبند)

قیمت مجلد ۔ غیر مجلد

ندوۃ المصنفین۔ قرول باغ۔ نئی دہلی

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی کتب یا الہامی کتابیں عام طور پر تمام عالم انسانیت کیلئے ہدایات کا خزانہ لاتی ہیں۔ مگر یہ کہنا کسی طرح بھی صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا کہ ان کتابوں کی تمام عبارتوں کو ہر شخص (خواہ وہ کتنا ہی کم پڑھا لکھا ہو) آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ عام لوگ دنیا کے بہترین فلسفیوں، حکیموں اور ادیبوں کے کلام کو بغیر تشریحات کے نہیں سمجھتے تو کیسے ممکن ہے کہ "آسمانی کتابوں" کو بغیر کسی "اصول تشریح" یا "طریقہ تفسیر" کے سمجھ لیں گے۔ یہ معاملہ عوام کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ اکثر خواص بھی اس راہ میں ڈگمگاتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی کتابوں کی بعض عبارتوں کے مفہوم مختلف لوگوں کے خیال میں مختلف ہیں۔ یہ اختلاف بعض جگہ اسقدر شدید ہو گیا ہے کہ اسی بنیاد پر ایک ایک مذہب کے کئی کئی فرقے ہو گئے ہیں اور ہر فرقے کے رہنما اپنے "ذاتی علم" اور "خود آگاہی" پر کامل یقین رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانہ بہت "ہنگامہ خیز" اور "آزاد" زمانہ ہے بخصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں "مذاہب" کے لئے شدید مرحلہ پیدا ہو گیا ہے۔ انسانوں کے غور و فکر کرنے کے طریقے بدل گئے ہیں۔ انھوں نے حیات انسانی پر سوچنے کے چند ٹھوس اور عملی اصول وضع کر لئے ہیں اور وہ اب مذہب کو بھی اپنی بنائی ہوئی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ علم برداران مذاہب نے زمانہ کی اس تبدیلی اور انسانی خیالات کے انقلاب کو محسوس کر کے یہ طریقہ اختیار کرنا شروع کر دیا ہے کہ ہر موقع کے لحاظ سے اپنی مذہبی کتاب کی عبارتوں کا مفہوم توڑ مروڑ کر بتاتے تھے جو عام انسانوں یا معترضین کے خیالات سے مطابق ہو جاتا ہے۔

انہیں باتوں کا خیال کر کے محمد سعید احمد ایم۔ اے (فاضل دیوبند) نے "فہم قرآن" تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآن پاک کے سمجھنے کے طریقے تحریر فرمائے ہیں۔

مولوی قطب الدین صاحب دہلوی مہاجر مکی نے اپنی کتاب "جامع التفاسیر" میں لکھا ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر اور ترجمے کے لئے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ تینوں باتیں نہ ہونگی تو تفسیر کے سلسلے میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہوگی۔

۱۔ جن اصحاب کرام کے سامنے تنزیل ہوئی ہو اور جو گواہان وحی ہوں ان کی تفسیرات سے جدا کوئی تشریح اخذ نہ کی جائے۔

۲۔ عربی الفاظ کے مروجہ معنی لئے جائیں۔

۳۔ سیاق عبارت کے خلاف تعبیر الفاظ نہ کی جائے۔

سعید صاحب نے بھی تقریباً انہیں اصولوں کو بہت عام فہم الفاظ اور دلچسپ پیرایہ بیان میں ظاہر فرمایا ہے۔ مختلف دلائل سے آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ محض زبان داں ہونے کی وجہ سے کوئی شخص مفسر یا مترجم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تفسیر و ترجمہ کا کام کرنے کے لئے ذوق سخن سنجی۔ واقعات و حالات عرب سے واقفیت اور وہاں کے رہنے والوں کی معاشرت، تمدن اور عربی زبان کے قواعد و ضوابط سب پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ کہیں کہیں اس طرف بھی لطیف اشارا کر دیا ہے کہ مفسر اور مترجم کو علم روح و اذواق روح کا بھی حامل ہونا چاہئے۔

ہمیں ایک جگہ سعید صاحب سے تھوڑا سا اختلاف بھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"قرآن پاک کی کوئی ایک آیۃ بھی ایسی نہیں ہے جس پر مطلقاً عمل کرنا ناجائز ہو"

اور آیۃ جہاد کی مثال دیکر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ

"کسی ایک حکم کو دوسرے حکم کے اعتبار سے منسوخ زمانہ یعنی ہنگامی طور پر منسوخ کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح طبیب ایک نسخہ کو ملتوی کر کے دوسرا نسخہ لکھتا ہے"

آگے چل کر سعید صاحب نے یہ مسئلہ بالکل ہی صاف کر دیا ہے:۔

"خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی آیۃ کو کسی آیۃ کیلئے ناسخ کہنے سے مراد یہ ہے کہ منسوخ آیۃ کا حکم بالکل زائل ہو چکا اور اب اس پر عمل کرنا قطعی طور پر ممنوع قرار دیدیا گیا ہے تو جیسا ابھی عرض کیا گیا اس معنی کے اعتبار سے کوئی آیۃ منسوخ نہیں ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ تنسیخ کی وجوہ یہ بھی ہیں جو مؤلف نے بیان کی ہیں کہ واقعات پیش آمدہ کی وجہ سے احکامات تبدیل فرمائے گئے ہیں مگر تمام منسوخ آیات کے متعلق یہ نتیجہ صحیح نہیں معلوم ہوتا طبیب کی مثال بھی یہاں صادق نہیں آتی ہے۔ طبیب کی تجویز اکثر حاکمانہ نہیں ہوتی۔ وہ مرض کی اصل وجہ تلاش کرنے میں سرگرداں رہتا ہے۔ اکثر اوقات اُسے پہلا نسخہ اپنی تشخیص کی تائید حاصل کرنے کے لئے بھی دینا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ عموماً ہر نسخہ سے مرض کا علاج نہیں ہوتا۔ تجویز الٰہی اس سے قطعی جداگانہ ہے۔ اسے مرض کو معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس کے نسخہ میں جو کچھ تحریر ہوتا ہے وہ اس مرض کا قطعی علاج ہوتا ہے جس کے لئے وہ نسخہ تجویز ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے چند آیات قرآنی بھی موجود ہیں۔

دوسرے پارہ کی تیسری آیت مبارک کا جزو ـــــ فول وجوہك شطر المسجد الحرام ـــــ اس آیۃ سے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا منسوخ ہوگیا۔ تو کیا مؤلف کے اصول کے مطابق وقتِ ضرورت بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا جائز ہو سکتا ہے۔!؟

چوتھے پارہ کے تیرھویں رکوع کی پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت بدکاری میں مبتلا ہو جائے اور چار مردوں کی گواہیاں بھی ہو جائیں تو اس عورت کو عمر بھر کے لئے محبوس کر دینا چاہئے۔ یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ مقرر کردے ـــــ جب سورۂ نور میں حد زنا ظاہر فرمادی گئی تو اب محبوس کرنے کا سوال ہی نہیں رہا۔ ورنہ حدود شرعیہ کا التوا لازم آتا ہے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آیۃ مذکور کا حکم بھی بحالہ قائم ہے۔

اٹھائیسویں پارہ کے دوسرے رکوع کی چھٹی آیۃ میں منافقین کے بیکار سوالات سے بچانے کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ جب نبی کریم سے باتیں کرنا چاہو تو کچھ نذر پیش کیا کرو ـــــ پھر یہی حکم اسی رکوع کی

ـــــ ما ننسخ من آیتہ ... (آیۃ قرآن پاک) ـــــ کی ظاہر میں بھی تاویل کرکے ادیان سابقہ کی تنسیخ مراد لینا چاہی ہے۔ مگر کلام پاک خود بھی اپنے ارشادات کی تشریح فرما دیتا ہے چنانچہ ـــــ واذا بدلنا آیتہ مکان آیتہ .... (آیۃ قرآن پاک) ـــــ میں خود تفسیر فرمادی گئی ہے۔ کہ جب ہم کوئی آیۃ بدلتے ہیں تو اے رسول آپ کو مشرکین مفتری کہنے لگتے ہیں ـــــ "انما انت مفتر" نے ثابت کر دیا کہ قرآن پاک کی آیات کی تبدیلی مراد ہے اور لفظ تبدیل خود ظاہر کرتا ہے کہ تبدیل شدہ حکم ناقابلِ عمل ہو گیا۔

بہرحال قرآن پاک کے مطالعہ سے پہلے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے اور جو لوگ تفسیر قرآنی اور تشریح کلام ربانی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔

حیات آزاد

از عظمت اللہ ملیح آبادی

قیمت ۴ر۔ مکتبۂ برہان۔ قرول باغ۔ نئی دہلی

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت مولنٰا ابوالکلام آزاد صدر آل انڈیا کانگریس کے سوانح حیات مختصر طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ مولنٰا کی زندگی اپنے مختصر مگر نادر حالات کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اسے ہزار مرتبہ اور ہزار طریقوں سے بیان کیا جائے۔ مولنٰا کے بلند اخلاق اور پاکیزہ سیرت کا سکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ممالک میں بیٹھا ہوا ہے۔ مولنٰا ہندوستان میں صرف مسلمانوں کے واحد رہنمائے اعظم نہیں ہیں بلکہ وہ ہندوستان کی ہر قوم اور ہر ملت کی رہنمائی بحیثیت صدر آل انڈیا کانگریس فرما رہے ہیں۔ آپ کی صلح جو مخلص وہمدرد فطرت کا چرچا آج ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ہے۔ اس لئے عظمت اللہ صاحب نے مولنٰا کی سوانح حیات مرتب فرما کر یقیناً ایک بہتر کام انجام دیا ہے۔ کسی زمانے میں خود مولنٰا ممدوح نے بھی اپنے حالات زندگی اپنے قلم سے مرتب کرنے شروع کئے تھے مگر وہ آپ کی بیحد مشغولیت کی وجہ سے نامکمل رہ گئے۔ کاش وہ مکمل ہو سکتے۔ کیونکہ

تک اُن کے حالاتِ زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے وہ
کا نصف حصّہ بھی نہیں معلوم ہوتا جو مولانا کی زندگی اپنے مختلف
وار میں ظاہر کر چکی ہے۔ "حیاتِ آزاد" اپنے اختصار اور جامعیت
اعتبار سے قابلِ مطالعہ کتاب ہے اور ہر سیاسی ذوق رکھنے والے
پاس اس کا ہونا ضروری ہے۔

خیال آفریں دماغ

از عرش تیموری۔ قیمت ۶/
حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر۔ دہلی

جودہ زمانہ تمام عالمِ انسانی کے لئے انتہائی کرب اور بے چینی کا زمانہ
ہے۔ دُنیا کا کوئی ملک بھی اس عالمگیر المناکی سے محفوظ نہیں ہے۔ مصائب
نوعیت جگہ جگہ مختلف ہے۔ کہیں اقتصادی حالات خراب ہیں کہیں
یاسی۔ کہیں اندرونی واقعات کی بنا پر ملک ایک انقلاب سے گذر
رہا ہے کہیں بیرونی طاقتوں کے ہولناک حملوں کی وجہ سے۔ ایک
عجیب قسم کا انتشار ہے جو تمام دُنیا کے انسانوں کی زندگیوں کو مجروح
لئے دے رہا ہے۔ بعض ممالک کے انسانوں پر بالکل جانکنی کا سا
عالم طاری ہے۔ ان کے اقتصادی حالات بھی خراب ہیں سیاسی بھی
اندرونی اختلافات کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے بیرونی طاقتوں کے
سیاسی دباؤ کا بھی۔ زندگی ہر طرف سے مختلف قسم کے شکنجوں میں
جکڑی ہوئی ہے۔ بدترین حالات سامنے آ رہے ہیں۔ مظلوموں اور
بیچاروں کی دردناک فریادیں۔ بیکسی و لاچاری کے اندوہناک
واقعات۔ بیکاری و محکومی کے غمگین نظارے سب ایک محسوس
کرنے والے دل کو زخمی کرتے ہوئے گذرتے چلے جاتے ہیں مگر
دماغ باوجود انتہائی کوشش کے ان تمام آلام کا صحیح علاج تلاش
کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

یہی نقشہ ہمارے ہندوستان کا ہے۔ یہاں آئے دن کے روح فرسا
واقعات نے انسانی زندگی کو نہ صرف ارزاں بلکہ غیر اہم بنا دیا ہے۔ تمام
ملک مختلف "مداریوں" کی تماشا گاہ بنا ہوا ہے۔ ایسے مداریوں کی جن کے
ہر "کھیل" کا مقصد اپنے فن کا مظاہرہ کرنا اور اس مظاہرے سے ذاتی
منفعت حاصل کرنا ہے اور کچھ نہیں۔

یہاں پستی بھی ہے بیچارگی بھی۔ سیاسی انتشار بھی ہے۔ غیر سیاسی
اضطرار بھی۔ فلاکت بھی ہے ہلاکت بھی۔ بیکاری بھی ہے جمود بھی۔ اضطراری
خیال بھی ہے اختلاط عمل بھی۔ زندگیوں سے بیزاری بھی ہے۔ موت کا
خوف بھی۔ یہاں کے رہنے والوں کی قوتِ ارادی۔ قوتِ فیصلہ۔ قوت
عمل سب مفلوج بھی ہیں" غلام بھی۔ دماغوں اور دلوں میں امنگ
احساسِ ترقی اور ذوقِ عظمت کی بجائے سمندروں کا سا مدوجزر ہے
اور وہ بھی لاحاصل!

عرش تیموری صاحب کی مختصر تصنیف "خیال آفریں دماغ" انہیں
ہولناک تصویروں کا ایک بہت مختصر مگر جامع مرقع ہے۔ یہ ایک تجزیاتی
و تحلیلی تمثیل ہے۔ اس تمثیل کا چھوٹا سا پلاٹ ہے۔ تنویر ہمارے ملک
کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ شاعر ادیب اور مفکر مگر بیکار۔ مفلس اور
پریشاں حال۔ وہ گرد و پیش کے حالات کو دیکھتا ہے۔ محسوس بھی کرتا
ہے۔ اُن کو بہتر بنانے کی تدابیر بھی سوچنا چاہتا ہے مگر مجبور ہے بے بس
ہے۔ یہاں تک مجبور ہے کہ ماحول کے بدترین حالات کو سنوارنا تو درکنار
خود جس کمرے میں رہتا ہے اس کا کرایہ تک ادا نہیں کر سکتا۔ اس کا دماغ
اپنے اور ماحول کے مختلف اندوہناک حالات کے تصوّرات میں
مصروف رہتا ہے مگر اس طرح کہ وہ ایک مصیبت کا علاج بھی نہیں کر سکتا
وہ اگر کچھ کر سکتا ہے تو صرف اتنا کہ پاگلوں کی طرح دیکھے۔ دیوانوں کی طرح
محسوس کرے اور مجبوروں کی طرح گذر جائے۔ تنویر اسی طرح اور انہیں حالات میں جی رہا ہے۔ پریشان خیالات
کا ایک سلسلہ اس کے تقریباً ماؤف دماغ سے گذر رہا ہے یہ سلسلہ گذرتا
رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی روح دنیوی مصائب و آلام سے قطعی آزاد
ہو جاتی ہے۔ اسی وقت مالک مکان احسن خوش و خرم اس کے کمرے
میں داخل ہوتا ہے اور یہ دردناک منظر دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ یہ ہے
کل پلاٹ!

عرش تیموری صاحب نے تنویر کی دماغی حالت کا خاکہ پیش کرتے ہوئے
اس کے غمگین حالاتِ زندگی اور مضطرب احساسات پر جس طرح روشنی
ڈالی ہے وہ حالات کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ بھی ہے اور غور و فکر
کی ایک دعوت بھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرش صاحب نے جس مقصد کو پیش نظر
رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے وہ اس مختصر پلاٹ سے بھی پورا ہو جاتا ہے

مگر ہماری رائے میں اگر پلاٹ اس قدر مختصر نہ ہوتا تو تمثیل میں زیادہ دلکشی پیدا ہو جاتی۔

لکھائی چھپائی خاصی ہے۔ اور قیمت بھی کتاب کی اہمیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام

قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

ملنے کا پتہ:- ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی۔

اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ درج ہیں:-

"جس میں مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہر آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے مقابلہ میں اسلام کے پُرسکون اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متصوفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی دیباچہ میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

"ساتھ ہی یہ بھی دکھلایا گیا ہے کہ امت اسلامیہ اور امت نصرانیہ میں باہمی نسبت اور کاروباری توازن کیا ہے اور ان دونوں میں سے حقیقی ترقی کس نے کی۔"

"اسی ذیل میں اس پر بھی بحث کی گئی ہے کہ نصرانی تمدن کا حقیقی تقابل صرف اسلامی تمدن سے ہے اور یہ کہ آج کی تمدنی فکریات اور سائنٹفک ایجادات کو اسلام کے اخلاقی نظام سے کیا نسبت ہے۔"

اس کے آگے ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:-

"ان مباحث کو سامنے رکھ کر اس کتاب کو فلسفۂ ذہنیت اقوام کے عنوان سے تعبیر کیا جائے تو بے محل نہیں۔"

یہ اور اس قسم کے اور جملوں کو پڑھ کر ہر انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جو اہلِ قلم مذکورہ بالا خصوصیات رکھنے والی کتاب لکھ رہا ہے اس کو مغربی تہذیب و تمدن کی ہنگامہ خیزیوں۔ امت نصرانیہ کا پورا نظامِ عمل جس سے ان کی کاروباری حقیقت بھی سامنے آجائے۔ یورپ کی موجودہ ترقی اور اس کے اسباب۔ حقیقی ترقی کا صحیح مفہوم اور مناسب استعمال موجودہ ترقی یافتہ دنیا کی تمدنی فکریات اور وہ تمام سائنٹفک ایجادات جن کے ذریعہ آج نظامِ انسانی کو کہیں سے کہیں پہنچایا جا رہا ہے اور اسکے ساتھ ہی دنیا کی مختلف طاقتوں کا وہ نظام جس نے انہیں اپنے کمالات کا شدید ترین مظاہرہ کرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ ان سب سے بذات خود مکمل طور پر آگاہ ہونا چاہئے۔ ان تمام واقفیتوں اور آگاہیوں کیلئے دنیا کے تمام جدید ترقی یافتہ علم و ادب پر عبور درکار ہے۔ سوشلزم کیسے وجود میں آیا اس کا نظامِ عمل انسانی زندگی کی کون کون سی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے گذشتہ تھوڑے سے عرصہ میں سوشلزم میں کیا کیا تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئی ہیں نازی ازم اور فیسزم نے کاروبارِ حیات کی ترتیب و تنظیم کے لئے کیا اصول قائم کئے ہیں۔ وہ کن کن اصولوں پر دنیا کو بامِ ترقی تک پہنچانا چاہتے ہیں اُن کے سائنٹفک رجحانات کا گذشتہ زمانہ میں زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی پذیر ہونا کن اسباب کی بنا پر ہے۔ ان کی سائنٹفک ترقی سے دنیا کی سیاست، معاشرت، تمدن کس کس طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ سیاست میں پارلیمینٹری جمہوریت کا اب کیا درجہ ہے اور وہ کہاں تک کامیاب ہے۔ وغیرہ۔ یہ سب باتیں مصنف کے حافظے میں محفوظ ہونا چاہئیں۔

اس کتاب کے مصنف الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہیں جن کی مذہبی عظمت اسلام اور اس کے تمام متعلقات کے متعلق علم و وقوف مسلم ہے۔ وہ ایک ایسے دارالعلوم کے مہتمم ہیں جو اسلامی تعلیم کی تدریس میں ایک خاص شہرت کا مالک ہے۔ مگر یہ بات کہ مولانا مغربی طاقتور قوموں کے مختلف رجحانات۔ عملی سرگرمیوں اور ان کے وجود و اسباب کے متعلق کامل علم رکھتے ہیں اس وقت تک درجہ یقین تک نہیں پہنچ سکتی جبتک کہ ہمیں یہ نہ معلوم ہو جائے کہ مولانا نے کن ذرائع سے وہ واقفیتیں اور آگاہیاں حاصل کی ہیں۔

بہرکیف ہمیں بغیر کسی بدگمانی کے مولانا کی تصنیف کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے ممکن ہے آپ نے اپنی فکریات کو کچھ اس انداز سے ظاہر فرمایا ہو کہ ...... ہر بات سمجھ میں آجائے کسی کی تشریح کی ضرورت نہ رہے۔

اس کتاب کے نصف سے زیادہ حصہ میں اسلامی اصولوں، اسلامی روایات، اسلامی تمدن و معاشرت اور اسلامی ہدایات و احکامات اور نصرانی ہدایات و احکامات کے تطابق کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ تطابق بڑی حد تک قرآن پاک اور انجیل کے بتائے ہوئے اصولوں سے کیا گیا ہے۔ اور اس میں دونوں مذاہب کی تعلیمات اور ان کے متعلقات سے بحث کی گئی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا

ہے کہ مولانا کا مطالعہ اسلامیات کے متعلق ہی کافی وسیع اور قابلِ قدر نہیں ہے بلکہ وہ انجیل کی تعلیمات سے بھی آگاہی رکھتے ہیں۔ مولانا نے ان آسمانی کتابوں سے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ عیسائیوں کی ترقیاں مسلمانوں کے اصولوں کو اختیار کر لینے سے ہوئی ہیں اور اصولِ ایجاد کو بھی شرعی اور الٰہی ثابت کیا ہے۔ مولانا کی اس کاوش میں آسمانی کتب کے مطالعہ کی زیادہ امداد شامل ہے اور دُنیا کے موجودہ حالات اور ان کے اسباب سے ان ابواب میں زیادہ بحث نہیں کی گئی ہے۔ ہاں ایک جگہ مولانا نے ایک ایسے موضوع پر جس کے متعلق ابھی تک علماء اور فقہا کا متفقہ طور پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہے کچھ اس طرح اظہار فرمایا ہے کہ ان کی حیثیت بجائے ایک متبحر عالم کے ایک سرشار عقیدت صوفی کی سی ہو گئی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق بالتفصیل ذکر کرتے ہوئے مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ خود پیغمبرِ اسلام صلعم کی ذاتِ اقدس کو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تکوین و تولید میں والد کی حیثیت سے دخل تھا اس کے جو دلائل مولانا نے پیش کئے ہیں ان کو مختصر طور پر یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ قرآنِ پاک میں اس واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ فرمایا گیا ہے کہ جب مریم علیہا السلام اپنے گھر والوں سے علیحدہ ایک ایسے مکان میں جو مشرق کی جانب تھا غسل کے لئے گئیں اور انہوں نے اُن لوگوں کے سامنے سے پردا ڈال لیا تو خداوند کریم نے اُن کے پاس اپنے فرشتہ جبریل کو بھیجا اور وہ اُن کے سامنے پورے آدمی کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ مریم علیہا السلام نے کہا کہ میں تجھ سے اپنے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھے خدا کا خوف ہے تو یہاں سے چلا جائیگا مگر جبریل نے ان سے کہا کہ میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ پھر اس صورت نے جو مریم کے سامنے جلوہ افروز تھی اُن کے گریبان میں پھونک ماری جو بمنزلہ القاءِ نطفہ کے تھی جس سے وہ حاملہ ہو گئیں۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک میں جہاں اُس صورتِ پاک کا ذکر فرمایا ہے جو مریم کے سامنے تھی وہاں الفاظ بَشَرًا سَوِيًّا فرمائے گئے ہیں اور بشرِ سوی عربی میں اس انسان کو کہتے ہیں جو انتہائی خوبصورت ہو یعنی ہر ممکن حسنِ صورت اس میں موجود ہو۔

۲۔ کائنات میں پیغامبرِ اسلام صلعم سے زیادہ حسین صورت کبھی ظہور میں نہ آئی اور نہ آئے۔

۳۔ جس شریعت نے تخلیقِ عیسوی کے واقعہ کا اظہار فرمایا ہے اسی نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس شبیہ مبارک کا قرآن پاک میں ذکر ہے وہ خود حضرت پیغمبرِ اسلام صلعم کی تھی اور اس طرح آپ کی شبیہ مقدس کو مریمؑ کے لئے بمنزلہ زوج قرار دیا۔

۴۔ حضرت پیغمبرِ اسلامؐ نے خود بھی ایک تنبیہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں حضرت مریم بنت عمران کو میری زوجہ بنایا ہے۔

۵۔ حضرت شیخ عبدالغنی نابلسی نے انجیل کی اُس آیت کی کہ "شروع باپ کے نام سے اور بیٹے کے اور روح القدس کے" یہ تفسیر فرمائی ہے کہ باپ سے مراد ہے اس روح کی طرف جو اللہ کی سب سے پہلی مخلوق ہے جیسا کہ احادیث میں خبر دی گئی اور اسی کا نام کہیں عقل کہیں قلم اور کہیں حقیقت محمدیہ ہے اور روح القدس سے بھی اسی روح کی طرف اشارہ ہے لیکن بلحاظ اس کے ظہور کے بشرِ سوی کی صورت میں اور بیٹے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ اس روح کے پھونک مارنے سے ان کی پیدائش ظہور میں آئی۔

ان تمام واقعات و دلائل پر نظر ڈالنے کے بعد مسلمانوں اور خصوصاً صوفیائے اسلام کو کافی مسرت ہوگی کہ مولانا نے ایک ایسی تحقیق فرمائی ہے جو ابھی تک فیصلہ طلب تھی اور جس سے حقیقتِ عیسوی کو حقیقتِ محمدی کا ایک پرتو ہی نہیں بلکہ سببِ تخلیق قرار دیا جا سکتا ہے مگر اس فیصلہ کے بعد کیسی عجیب و غریب بحث کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یہ بھی قابلِ غور ہے کہ دوسری قوموں کے سامنے اگر اس واقعہ کو اس نوعیت سے پیش کیا جائے تو ان لوگوں کے ذہن میں جو تصوف کی گہرائیوں سے قطعی ناواقف ہوں گے اس واقعہ کی کیا حقیقت ہو گی۔ یعنی پیغمبرِ اسلام ایک وقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد بھی ہیں اور اس کے متعدد سال کے بعد حضرت عبداللہ کے بیٹے بھی۔

بہر حال .... فیصلہ کرنے سے بہتر یہ تھا کہ اس معاملہ کو اسی صورت میں چھوڑ دیا جاتا جس صورت میں کہ قرآن پاک میں موجود ہے اور جس میں کسی قسم کی غلط فہمی یا تشکیک کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی ہے۔

اس کتاب کے آخری حصوں میں یورپ کی اخلاقی حالات کی خرابی دکھائی گئی

ہے جو بڑی حد تک درست ہے مگر جو خرابیاں مثلاً زناکاری بے حیائی بے حجابی بداخلاقی مولانا نے مغربی ممالک میں ظاہر فرمائی ہیں ان کے متعلق ہم تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسیحی تعلیمات کا نتیجہ ہیں مسلمانوں میں بھی ہزاروں اس قسم کی خرابیاں عام ہیں مگر ان کو اسلامی تعلیم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ان خرابیوں کے متعلق بھی ہمیں صحیح طور پر یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ علاتیں دُنیا میں کب اور کیوں پیدا ہوتی ہیں اور ان کو کم کرنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان کا مذاہب سے کیا تعلق ہوتا ہے۔

انسان نے جس وقت سے زندگی اور اس کے لوازمات کے متعلق سوچنا شروع کیا ہے وہ بزعم خود بُرائیوں کو دور کرنے اور نیکیوں کو ترقی دینے کے لئے مختلف اصولوں کا پیرو رہا ہے۔ زندگی کی جدوجہد جبتک جاری ہے یہی ہوتا رہیگا۔ اختلاف خیال تو ذہن انسانی کی ترقی کی دلیل ہے اسی لئے تو آجتک دُنیا کے تمام انسان اجتماعی حیثیت سے اپنے اعتقادات اور اصولوں کے متعلق کوئی ایک مستقل فیصلہ نہ کر سکے اور نہ غالباً کبھی کر سکیں گے۔

ہم تمام کتاب براشتیاق میں پڑھتے چلے گئے کہ مولانا نے یورپ کی جدید سائنٹفک ترقی کے متعلق کن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اور اُن سے کس قسم کا نتیجہ نکالنے کی کوشش فرمائی ہے مگر جن ابواب کو دیکھنے کی زیادہ تمنا تھی اُن میں ہمارے لئے سوائے حیرت کے اور کوئی سامان تسکین نہیں ہے۔

وہی لباس اور فیشن پر تبصرہ۔ وہی ڈاڑھی اور مونچھ کا ذکر۔ وہی جنگ کے سود کا قضیہ۔ وہی بے حیائی و بے غیرتی کے افسانے۔ وہی عورتوں کی بے پردگی اور اُن کے بالوں کے کٹنے پر طعن و تشنیع اور ان تمام اذکار کے ساتھ ان کو روکنے کیلئے علماء کی احسن جدوجہد اور مستحسن مساعی کا تذکرہ! انتہا یہ ہے کہ سائنس کی جدید تحقیقات و معلومات کا ذکر بھی اس طرح کیا گیا ہے۔

"تمدن جدید کی یہ نئی نئی اختراعات۔ گیس و برق کی کرشمہ سازیاں اور اسٹیم و پٹرول کے موالید آیا فی الحقیقت یہ وہی تسخیر کائنات ہے جو منشار قرآنی اور اس کا ایک مستقل موضوع بحث یعنی عین منشار خداوندی ہے؟"

اور اس کا جواب بھی سُن لیجئے:۔

"اور بھی کچھ نہیں تو جہاں اللہ کے رسول نے تمام مشروع اخلاق و اعمال کے عملی نمونے قائم فرمائے تھے وہیں اگر صاحب اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم کم ازکم ایک انجن یا ایک دُخانی جہاز یا ایک سینا کی مشینری جس سے مقصود تبلیغ ہو سکتی یا ٹیلیفون جس سے دینی احکام جلد سے جلد دور تک پہنچائے جا[سکتے] یا سب کچھ چھوڑ کر صرف لاوڈ اسپیکر اور ریڈیو جس کے ذریعہ اس رسول[اللہ] کے خطبات ہی کم ازکم سارا عالم بیک وقت سُن سکتا اپنے دست مبارک ایجاد فرما کر امت کے لئے ایک نمونۂ عمل قائم فرما دیتے تو کم ازکم تنگ دا[ماں پر] حجت تو قائم ہو سکتی ...... لیکن وہاں تو صحابہ اور ان کے اس [فکر میں] لگ گئے کہ اس دور کی دو عظیم الشان متمدن سلطنتوں فارس و روم [کے] تمدنی تکلفات مٹا کر انہیں بھی اپنے ہی جیسا بدوی بنالیں۔"

کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ مولانا یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانو[ں کو] سائنس کی ایجادات سے اجتناب رکھنا چاہئیے چنانچہ مسلمانوں کے [زوال] کے اسباب یہ ظاہر کئے گئے ہیں۔

"ہمارا اسراف بیجا۔ ہماری نااتفاقی۔ ہماری بدمعاملگی۔ ہماری بے ا[نتظامی] ہمارا ظلم و جور۔ ہماری بے ہمتی۔ ہماری بے فکری و بے غیرتی اور ہماری [جہالت] فی الحقیقت ہماری غلامی کا سبب بنی ہوئی ہے جس نے قوت و شوکت [کو ہم سے] جدا کیا اور اسی قوت کو یورپ نے آج کل کر ان پر فتح پالی۔"

اب آپ غور کیجئے کہ مولانا نے جو خرابیاں مسلمانان ہند میں ظاہر کی ہیں اور اس سے کہیں زیادہ خرابیاں مغربی ممالک کے رہنے والوں میں نہیں پائی جاتی ہیں خود مولانا نے ہی مغربی ممالک کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے [ظاہر] ہوتا ہے کہ دُنیا کی کوئی ایسی اخلاقی خرابی نہیں ہے جو مغرب والوں میں پائی جاتی ہو پھر بھی وہ ساری دُنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ موجودہ زمانہ میں اسلامی ممالک یا مسلمانان ہند اگر سائنس اور اس کی ایجادات سے بے تعلقی کا اظہار کریں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ [ان کا] حشر کیا ہوگا۔ آج ترکی اور ایران وغیرہ نے جو ترقی (جس کو مولانا کے الفاظ میں) سے بہت قابل مذمت قرار دیا جانا چاہئیے) کی ہے اگر وہ اسے ترک کر دیں اور سائنس کی جن ایجادات سے کہ وہ مسلسل فائدہ اُٹھا رہے ہیں اُن کو خیرباد کہہ دیں تو اُن کی بقا کی تدابیر غالباً مولانا ہی بتا سکیں گے۔!؟

اگر ان خیالات کے ماتحت جن کا اظہار مولانا نے فرمایا ہے اور جن کے متعلق (بقول مولانا) اسلام اور متبعین اسلام نے کسی عملی پیدائش کا نہیں فرمایا ہے یہی بہتر سمجھا جائے کہ انہیں شیطانی آلات سمجھ کر ترک کر دیا جائے تو پھر ہمارا نظام زندگی کیا ہو جائیگا اسپر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ے بار [illegible]

طرح [illegible] کہ جب اس کا [illegible] پھر خود فرماتے [illegible]

پیچھے [illegible]

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام ترقیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں۔ اس کی
ضرورت تھی کہ قیامت تک ایجاد ہونے والی چیزوں کی ایک فہرست قرآن
میں درج ہوتی اور سب کے متعلق جواز کا حکم ہوتا۔ اس سلسلہ میں بہت سی
[illegible] موجود ہیں جو خود مولانا کی نظر سے بھی گزری ہونگی جن میں موجودہ ترقیوں
کے متعلق قرآن پاک کے ارشادات عالیہ بتلائے گئے ہیں۔

رہا اسوۂ حسنہ تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جب لڑائی تلوار کی تھی
تلوار اٹھانے کا حکم تھا۔ اب اگر مخالف بموں اور زہریلی گیسوں کا استعمال
کرتا ہے تو اس کا جواب بھی انہیں چیزوں سے دیا جائیگا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ
جب گولیاں اور بم برس رہے ہوں تو مسلمان نیچے اونٹوں کی قطاریں کھڑی
کر کے تلوار کا فن دکھائیں۔ آجکل تو اپنی بقا اور مدافعت کے لئے بھی
سائنس کی ایجادات قطعی ضروری ہیں اور پھر مسلمان ان سے فائدہ کیوں نہ
اٹھائیں جبکہ قرآن پاک نے ان کو استعمال کرنے کی کوئی ممانعت نہیں کی ہے
بلکہ انسانی ترقی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

بہرحال اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ مولانا نے اس کتاب کو بہت محنت
سے مرتب فرمایا ہے۔ اسلامی اور مسیحی تعلیمات کی مطابقت ان کا اختلاف
ان کے مختلف اصول اور پیروؤں کے اعمال سے ان کی جانچ پڑتال کرنے
میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس قسم کی
کتابوں کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ ان سے اسلامی علم و عمل کی تلقین بھی ہوتی ہے
اور موجودہ پستی و ذلت سے نکلنے کے لئے دل میں تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ کتابت
طباعت عمدہ ہے کاغذ بھی نفیس ہے۔ قیمت غالباً درج ہونے سے رہ گئی ہے۔

چمنستان
مدیر: آغا امیر خوش قزلباش
نائب مدیر: گوردھن داس ایم۔ اے۔
چندہ سالانہ [illegible] — فی پرچہ ۳ ر
قصر شاعر۔ نکلسن روڈ۔ دہلی

موجودہ زمانہ کی [illegible] احتیاجات کے ہر شعبہ پر چھایا ہوا ہے [illegible] شاعری کی
[illegible]

[illegible] نظر آتی ہیں۔ آندھیاں چل رہی ہیں
جاری ہیں اور [illegible] کا سیلاب ہے کہ کسی حد پر رکنے کا نام نہیں لیتا۔ اس
کساد بازاری کے زمانہ میں کسی ادبی رسالہ کا اجراء کرنا بقول ایک معاصر ادیب
کے "خودکشی کا ارادہ کرنا" ہے اور بقول ایک شاعر "جوئے شیر لانے سے
کم نہیں ہے" مگر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسانی عظمت و قوت کے
جوہر بھی حقیقت میں اسی وقت کھلتے ہیں جب انسانوں کے لئے دائرۂ حیات
تنگ ہونے لگتا ہے۔ کسی طوفانی سمندر کی مہیب خوفناک موجوں کے درمیان
اپنی کشتی کو لیجانے والا جس طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے مقابلہ میں
پر سکون سطح آب پر کشتی کھینے والے کو نصف قوت کا بھی استعمال نہیں کرنا پڑتا
ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ باد صرصر کے تند جھونکے جب دم گھونٹنے لگتے ہیں
تو سانس لینے کی طاقت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے ان احباب ادب کی
ہمتیں یقیناً قابل مبارکباد ہیں جو موجودہ زمانہ کی سختی کو خوب اچھی طرح محسوس
کرتے ہوئے بھی ادبی خدمت کو جاری رکھنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔

آغا امیر خوش قزلباش جو آغا شاعر قزلباش مرحوم (آہ انہیں مرحوم لکھتے
ہوئے دل کو کیسی تکلیف ہوتی ہے) کے صاحبزادے ہیں ہندوستان کی
ادبی دنیا میں "چمنستان" کی دو اشاعتیں پیش کر چکے ہیں۔ دونوں اشاعتیں
پیش نظر ہیں ترتیب سے خوش سلیقگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بہت
سے مشہور و معروف ادیب و شعراء کے فکر پارے اس پرچہ کو زینت دے
رہے ہیں۔ آغا شاعر قزلباش مرحوم کی ہستی ہماری ادبی دنیا میں کافی معروف
تھی ان کے احباب کا سلسلہ بھی کافی وسیع تھا۔ اس لئے کیا تعجب ہے اگر
چمنستان کی "ہمت افزائی" کے لئے چاروں طرف سے ہمت افزا
صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

مسٹر گوردھن داس ایم۔ اے اس سال کے نائب مدیر ہیں۔ اس سے
اتحاد قومی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ اگر "چمنستان" کے "مالکوں" نے ہمت،
استقلال اور مسلسل جد و جہد سے کام لیا تو یہ رسالہ اپنی صوری و معنوی
خوبیوں کے لحاظ سے جلد ترقی کر جائیگا۔ لکھائی چھپائی اور ضخامت کے
متعلق ہم کچھ لکھنا چاہتے تھے مگر سالانہ چندہ نے خاموش کر دیا۔ ظاہر ہے
کہ ۱۲ روپیہ سالانہ میں "چمنستان" موجودہ صورت میں کافی غنیمت ہے۔

Registered No. A

l. 4 AUGUST 1940. No[illegible]4.

THE ASIA

The Hindustani ~~Quarterly~~ Monthly Journal

of

The Adabi Markaz Meerut (India)

Edited by

S. Y. K. SAGHAR NIZAMI.

Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)

ایشیا

(۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ بہار

زیر سرپرستی:- ڈاکٹر سید محمود

اڈیٹر

ساغر

اسسٹنٹ اڈیٹر

م - ک - م

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان)
قیمت فی نمبر ۸ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (بیرونی ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست مضامین ایشیا اکتوبر و نومبر ۱۹۴۰ء

ایشیا

جلد ۶	اکتوبر و نومبر ۱۹۴۰ء	نمبر ۳ و ۴

حدیثِ جنگ و ستیاگرہ

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری!؟

اعلیٰ ترین علمی اعزاز

ایشیا اس مسرت میں کہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر طبیعیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی بی۔ اے (عثمانیہ) ایم۔ اے (کیمبرج) پی ایچ ڈی (لائپزگ) کو اس سال طبیعیات کا نوبل پرائز ملنے والا ہے۔ رسمی طور پر شریک نہیں بلکہ ادارۂ ادبی مرکز کو وہ حقیقی افتخار اور خوشی حاصل ہوئی ہے جس کے پس منظر میں تمام ہندوستان کا فخر و مباہات کارفرما ہے۔

ڈاکٹر رضی کی تصنیف "کوانٹم ( )" کو جو گذشتہ سال جامعہ عثمانیہ کی طرف سے شائع ہوئی، یورپ کے علما نے خاص درجہ دیا اور اس محققانہ تصنیف نے اس درجہ متاثر کیا کہ نوبل پرائز کی کمیشن تحقیقات نے ڈاکٹر رضی کو نوبل پرائز پیش کرنے کی سفارش کی۔

ڈاکٹر رضی "کوانٹم" پر تصنیف لکھنے سے پہلے بھی اپنی علمی تحقیقات کے سلسلے میں مشہور اور معزز ہو چکے ہیں، اس مرتبہ اُن کو وقت نے اعلیٰ ترین نیا علمی اعزاز عطا فرمایا ہے، جس کے سلسلے میں تمام ہندوستانی قوم اُن کی ذات پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

یقیناً یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب ماہرِ ریاضیات ہی نہیں، ادب سے بھی ذوق رکھتے ہیں، شعر و سخن سے بھی لگاؤ ہے (کاش اس موقع پر آپ ہمارے دوسرے ماہرِ ریاضی کو نہ بھولے ہوں!؟) اُن کا اسلوبِ نگارش علمی مضامین کو ادا کرنے میں کامیاب ہے۔ اُن کی کتاب ابھی انجمن ترقی اردو نے "اضافیت" کے عنوان پر شائع کی ہے جس کے متعلق نقادوں کی رائے ہے کہ انگریزی زبان میں بھی

اس موضوع پر اتنی سلیس اور عام فہم کتاب نہیں ہے۔

ڈاکٹر رضی حیدرآباد میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۲۰ء میں منشی اور مولوی کے امتحانات میں اوّل درجہ کی کامیابی حاصل کی ۱۹۲۵ء میں جامعہ عثمانیہ سے ریاضی میں بی۔اے کی ڈگری لی، یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ ریاست حیدرآباد کا یوروپین اسکالرشپ حاصل کیا ۱۹۲۶ء میں کیمبرج جاکر ۱۹۲۸ء میں علم حساب کا اعلیٰ نصاب کامیابی کے ساتھ ختم کیا، ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک برلن، کانچن اور لائبزگ میں ریاضیات پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں لائبزگ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ۱۹۳۰-۳۱ء میں پیرس یونیورسٹی میں ریاضیات پر تحقیقی کام کرتے رہے، ۱۹۳۱ء میں وطن واپس آئے اور اب جامعہ عثمانیہ میں ریاضیات کے پروفیسر ہیں۔ خالص ریاضیات پر بھی آپنے کئی کتابیں لکھی ہیں اور بھی کئی علمی فضیلتیں ان سے تعلق رکھتی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

یہ تو ہیں وہ محاسنِ علمی جو ڈاکٹر رضی کی ذات سے بلند ہوکر ہمیں ان کے مطالعہ اور تعارف کا ذوق پیدا کرتے ہیں، لیکن وہ محاسنِ علمی کے ساتھ ساتھ ذاتی و اخلاقی خوبصورتیوں کے بھی حامل ہیں، انسان جب ملک، قوم بلکہ دنیا میں ایک ممتاز شخصیت حاصل کر لیتا ہے تو قدرتی طور پر ہم اُس کی ذاتیات کی طرف بھی نظر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سُنا ہے کہ بحیثیت انسان بھی وہ ایک اچھے انسان ہیں اور اُن کے دوستوں کو اُن سے مل کر مایوسی نہیں ہوتی۔

اس وقت تک ہندوستان میں صرف سر رابندر ناتھ ٹیگور اور سر سی۔ وی رامن کو نوبل پرائز ملا تھا لیکن ان دونوں بزرگوں کو یہ خصوصیت اُس وقت حاصل ہوئی جب عمر کی تلخی انعام کی شیرینی کو دبا دیا کرتی ہے، مگر ڈاکٹر رضی کو یہ خصوصیت اور علیٰ ترین علمی اعزاز اس وقت حاصل ہوا ہے کہ نوجوانی نے اُن کی دوستی سے انکار نہیں کیا ہے، اور عطیۂ مغرب کے صحیح پرتو پڑنے کا کامل امکان ہے۔

قصاص

محبت کتنی بے ــــــــــــــ

حواس ہے !؟ مولانا احسن مارہروی کی موت کی خبر شبیر صاحب مارہروی نے مارہرہ اور ایٹہ کے راستے میں سنائی جب کہ وہ میرے ہم سفر تھے اور ڈاکٹر ضیائے عباس صاحب ہاشمی (حیّ و قائم) کے متعلق موت کی روح فرسا دل گداز افواہ بدایوں میں سنی، میں غم سے بے تاب ہوگیا اور ایک مختصر سا نوٹ ایٹہ ہی سے مرکز کو روانہ کردیا تاکہ ستمبر نمبر میں شائع کر دیا جائے۔ مرکز پہ آیا تو گوالیار کا ایک خط ملا جس سے اس خبر بد کی تردید ہوگئی۔ نوٹ چھپ چکا تھا، براہِ راست تصدیق کا موقع نکل چکا تھا ایک اندوہ ناک یقین کے سوا چارہ کیا تھا !؟

اس کے بعد میں کشمیر چلا گیا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ضیائی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ دلچسپ خط وصول ہوا جس کو ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔ ضیائی صاحب کے دوستوں اور دنیائے ادب کے لئے اس سے زیادہ خوش خبری اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ خبرِ بد محض افواہ تھی جو ضیائی صاحب کے چھوٹے بھائی ابنِ عباس صاحب مرحوم کی روح فرسا موت کے واقع ہو جانے سے ایک غلط فہمی بن کر بدایوں اور میرٹھ تک پہونچی۔

ابنِ عباس صاحب بھنڈر (گوالیار) کے کلکٹر تھے، ادیب و ادب پرست، شعر و ادب سے بدرجۂ کمال ذوق تھا، ہر وقت دیوان غالب ساتھ رہتا تھا سوتے تھے تو تکیہ کے نیچے رکھ کر سوتے تھے، مرنجاں مرنج، متواضع اور دوست پرست، یہ اُن کی ذاتی اور ادبی خصوصیتیں تھیں، لیکن اس سے بھی بلند ان کی ایک اور بھی اشرف خصوصیت ان کی قوم پرستی تھی وہ لفظاً اور عملاً ایک سچّے قوم پرست تھے ـ زندگی اور ہندوستان کی سیاسیات کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ قطعی National تھا ایک ایسی شخصیت کا ہم میں سے اُٹھ جانا سوسائٹی اور قوم کا کم نقصان نہیں ہے۔ خاصکر ایسی حالت میں کہ لوگوں کے دماغی سانچے فرقہ پرستی کی ضربوں نے ہلا دیے ہیں اور ملک میں نفاق اور جانبداری کی تند و تیز آندھیاں چل رہی ہیں۔

یہ محض ایک رسمی بات ہی کہ ڈاکٹر ضیائی کی خدمت میں اُن کے محبوب بھائی کی روح فرسا موت پر اظہارِ غم کیا جائے مگر یہ سنگدلی بنی نوعِ انسان کی تقدیر ہے۔ !؟

آیئے اب آپ کو وہ دلچسپ خط سنائیں جو ڈاکٹر ضیائی نے اپنی موت کی تردید میں اپنے قلم سے لکھا ہے:

مکتوب ضیائی

موتی محل گوالیار
۱۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء

عزیز مکرّم سلمہ اللہ تعالےٰ۔

ستمبر ۱۹۴۰ء کا "ایشیا" نیّرِ ضیا بیگم کے پاس پہونچا۔ اُس سے اُس حادثہ کا علم ہوا کہ ضیائی کی موت سے اُس کے احباب کے قلب پر گذرا۔

عزیزی ساغر! مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ ادبی

حلقہ میں میری موت کا ایسا حسین ماتم کیا جائے گا
مجھے آپ کے ایسے پُرخلوص اظہارِ غم پر واقعی ناز رہے گا
اور اِس غلط خبر کا مجھ پر تا حیات احسان رہے گا
کہ اُس نے مجھے "ساغر" کے پُرخلوص جذبات پر آگاہ
کر دیا۔ ہزار ہا برس گذرے جب ایک شعر کہا تھا، یہ
اُس وقت کی بات ہے جب آپ آگرہ میں تھے ؎

مرے مرنے کا سنتا ہوں کہ اُن کے گھر میں ماتم ہے
خوشا حالِ تباہِ عشق، چشمِ حسن پُرنم ہے

بھائی واقعہ اِس قدر ہے کہ گذشتہ ماہ جون میں میرے
عزیز بھائی ابن عباس عباسی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم
حقیقی بھائی تھے مجھ سے چھوٹے تھے، ریاست گوالیار میں
وہ بھی صوبہ تھے اور میرے ہم شکل تھے، اکثر لوگوں کو
ہم بھائیوں پر ایک کا دوسرے پر مغالطہ ہو جایا کرتا تھا۔ اسی
وجہ سے کسی نے تمھیں بھی لکھ دیا ہوگا یا اُس کا مقصد
ابنِ عباس لکھنے کا ہوگا اور وہ ضیائی عباس لکھ گیا ہوگا
مجھے ندامت ہے کہ عرصہ سے میں کوئی خط نہ لکھ
سکا۔ مگر میں اس زمانہ میں اس قدر پریشان رہا ہوں کہ
بیان نہیں کر سکتا۔ میرے ابتلا کا اندازہ اسی سے کر لو کہ
جس دن سے "ایشیا" ملا ہے، نیّر بیگم روزانہ تقاضا
کرتی ہیں کہ تردید کے واسطے ساغر کو خط لکھ دو، مگر مجھے
چار سطریں لکھنے کی فرصت نہ ملی۔

میں مارچ ۱۹۳۷ء میں صوبہ مقرر ہوا اور ضلع
سردارپور میں متعین ہوا، آج تک وہیں ہوں۔ البتہ تقریباً
گیارہ مہینے سے ایک خاص کام کے واسطے یہاں طلب کر لیا
گیا ہوں اور لشکر میں ہوں، غالباً ایک آدھ مہینے اور یہاں
قیام رہے گا اس کے بعد اپنے ضلع کو واپس جاؤں گا۔
اپنی مفصل خیریت لشکر۔ دانا اوُلی کے پتہ سے لکھو۔
زیادہ شوق

ساغر کا ضیائی (کھو مرحوم)

(نہیں، زندہ رہتا بندہ و پائندہ باد)

ضیائی صاحب یا اُن کے متعلقین خاص کر اُن کی بیگم نیّر صاحبہ سے "اپنی محبت انگیز جواں بانگی" کی معافی کا امکان مکتوب ضیائی کے بعد قطعی غیر آئینی ہو گیا کہ ایشیا کے صفحات پر مار ڈالنے کا انتقام ضیائی صاحب نے جن الفاظ میں
مجھ سے لیا ہے

——— !؟ آپ ہی خدا لگتی کہئے کیا کم "قصاص" ہے۔ !؟

بھائی جان!

غور کیجئے تو کہاں تک کیجئے! ابن آدم کی بے چارگی اور ظرف لامحدود ہے۔ بے چارگی تو اس لئے کہ بے چارگی ہے، اور ظرف اس لئے کہ یہی تو اک شے انسان کے پاس ہے جو اس کی زندگی کا پیمانہ ہے۔ دیکھنے کی قوت کے ساتھ بے بصری، احساس کے ساتھ نفرت و محبت، مسرت کے ساتھ غم اور زندگی کے ساتھ موت، قدرت نے مقدر کر دی ہے۔ دوسری دنیا پر تو جب غور ہوگا، ہوگا، ہماری دنیا کی یہ عریاں حقیقتیں بجائے خود اک دعوتِ فکر ہیں۔

آپ کہیں گے جبرِ قدرت، رسمی مذہب پرست کہیں گے انسانی بے چارگی میں کہوں گا یہ ابنِ آدم کا خلقی ظرف ہے۔ ورنہ کلیجہ دیکھو اِن ہڈیوں اور گوشت کے چلتے پھرتے ڈھانچے کا کہ باپ جوان بیٹے کو، بیٹا محبت کرنے والے باپ کو، عاشق محبوبہ کو، محبوبہ عاشق کو، ماں جگر گوشہ کو، اور بچہ ماں کو اپنی آنکھوں سے دم توڑتا دیکھے۔ اور زندہ رہے !؟

یہ تو وہ تعلقات ہیں "جو حادثاتی" ہیں لیکن "دماغی اتحاد" جو کہ یکساں تقاضوں کی بنیاد پر متحد کرتا ہے اور دل لگا دُکو بھی اپنا تابع کر لیتا ہے، اپنی آنکھوں آج دیکھتا ہے اور اُس دوست کو ابدی طور پر کھو دیتا ہے جس کے دماغ میں داخل ہو کر وہ دل کی مملکت پر چھا گیا تھا ——— !؟

اِس گم شدگی کے بعد بھی وہ چلتا ہے، دوڑتا ہے اور زندہ رہتا ہے کیا یہ کم ظرف ہے کہ "بھائی جان" اس دنیا سے اُٹھ جائیں اور اُن سے محبت کرنے والے زندہ رہنے پر مجبور ہوں۔

بھائی جان ٹونک کے رہنے والے تھے ان کی عمر، برس کی تھی دُبلے پتلے، ایک ٹانگ میں خفیف سا لنگ، سادہ قدیم وضع کا لباس، شرعی پاجامہ کرتا، کپڑے کی ٹوپی، بڑی بڑی مستی سے جھکی ہوئی آنکھیں، تل چاولی ڈاڑھی سفید

ہوئی ہستی، تنہا شخص ہو کر ہزاروں انسانوں کے دل میں بستے تھے۔ پورا نام احمد سعید خاں صاحب عاشق، ریاست ٹونک کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ مولانا حالی اور ظہیر دہلوی سے عام طور پر اور مرزا داغ دہلوی سے خاص طور پر شرف تلمذ حاصل تھا، علوم مشرقی کے ماہر تھے، ہندی ادب میں کامل وقوف حاصل تھا وہ پرانے ماحول کی ایک ایسی شمع تھے جو بجلی کے عہد میں بھی اپنی جوت جگاتی رہی، عیش رفتہ کی خاکستر پر شعر و موسیقی میں تمام عمر گذار دی، پرانی محفلوں سے اکھڑ گئے تھے، نئی بزم والوں کی گرمی کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتے تھے آنکھیں کنول اور دل زعفران کے پھول کی طرح شگفتہ، مسلمانوں کی بربادی اور اپنے شاندار ماضی کی تباہی کو قہقہوں اور بذلہ سنجیوں میں اڑاتے تھے، غم نے بھائی جان کو سرتاپا محبت بنا دیا تھا۔

بھائی جان مرزا داغ دہلوی کے سچے مقلد تھے، انھوں نے اپنی شاعری کو لفاظی اور غلط و مہمل فلسفہ نگاری سے بالکل ملوث نہیں ہونے دیا۔

رسمی غزل کی انفرادیت محفوظ رکھی، اُن کے تغزل کے عناصر سلاستِ زبان اور معاملہ نگاری دو بڑے عناصر گھلے ملے پائے جاتے ہیں۔

سنہ ۲۶-۱۹۲۵ء میں مولانا سیماب اور میری آمد و رفت نے ٹونک کی شاعری کو کہیں غلط اور کہیں صحیح طور پر متغیر کر دیا۔ اکثر شعراء نے نیا رنگ اختیار کر لیا لیکن (و) بھائی جان نے اپنی غزل کو آنچ نہ آنے دی۔ نئی آگ اُن کے تغزل کے خس خانے سے دُور دُور ہی بھڑکتی رہی!

ظاہر ہے کہ ٹونک ریاست ہے، اور اس کے کچھ تقاضے ہیں، اِن تقاضات کی رو سے وہ دربار ٹونک میں محترم ہستی تھے!

مرنے والے کے ساتھ زندوں کا تعلق کوئی وقعت کی چیز نہیں، ہاں مرنے والے کو جو میری ذات سے لگاؤ تھا اس کو سوچتا ہوں تو زمانے کے آلام سے پگھل پگھل کر ڈھیٹ ہو جانے والا دل بھی بے چین ہو جاتا ہے، اک دھواں سا روح میں اٹھتا اور دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ مگر اس دھوئیں کے باوجود مجھے زندہ اور روشن رہنا ہے۔

مجرمانہ تاخیر۔ اکتوبر و نومبر نمبر مجرمانہ تاخیر کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، اخلاقی طور پر اس جرم کی سزا سخت سے سخت ہونی چاہئے اور اصولی طور پر یہ طریقہ نہایت بددلی پیدا کرنے والا ہے، یہ صرف بددلی بلکہ کسی رسالے کے تاریک مستقبل کا خود ہی اعلان ہے۔

میں جانتا ہوں کہ معافی یا وعدہ اس مجرمانہ تاخیر کی ہرگز تلافی نہیں، اس کی تلافی تو صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ مشاعرہ منعقد کرنے والے عوام و خواص اور خود میں اپنے اخلاق کو درست کریں!؟

آپ حیران ہوں گے کہ وہ کونسی بد اخلاقی ہے کہ جس کے سلسلے میں میں قوم کی قوم اور اپنی ذات کو مجرم کہہ رہا ہوں، آئیے اس کی کہانی سنئے:۔

کشمیر کی بزم ادب نے ایک ہفتہ کے لئے مجھے یاد فرمایا لیکن ٹھیک ایک ماہ میں آزاد کیا۔ ہرچند کہ بزم ادب سرینگر اور اہالیانِ کشمیر کی محبت و اخلاص کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن سوال تو اُن فرائض کا ہے جو آپ نے مجھ سے متعلق کر دیئے ہیں، اُن فرائض کا غیر مشروط طور پر ادا ہونا میری درستگیٔ اخلاق ہے ورنہ مجھ سے زیادہ بداعمال شخص کوئی نہیں ہو سکتا۔!؟

اگر شاعر اور غیر شاعر میں کوئی امتیازی فرق ہے اور شاعر خود "بے شعور" سہی لیکن دوسروں میں شعور پیدا کرنے کا مدعی ضرور ہے تو اوّل الذکر (یعنی ادبی مجالس کے کرتا دھرتا) کی درستگیٔ اخلاق کا نہ صرف سوال اٹھ جاتا ہے بلکہ شاعر پر ایک مزید جرم عائد ہوتا ہے کہ وہ خود صالح اخلاق کا نمونہ کیوں نہیں بنتا یعنی ضرورت ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں اپنی اصلاح کروں اور مجرم ایک ہی ہے اور وہ میں ہوں جس کی وجہ سے ایک پبلک ادارہ کو ایسی سخت اصولی تجارتی شرمندگی اٹھانی پڑی جو ثقاہت کے سخت خلاف ہے اور بدنظمی اور کم احساسی کی چغلی کھاتی ہے۔

یہ تو تھی وہ حقیقت، جسے میرے دل نے محسوس کیا اور آپ سے صاف صاف بیان کر دیا لیکن کشمیر جانے سے قبل میں جو انتظامات مرکز ادب پریس میں کر گیا تھا۔ کم صاحب کی شدید علالت نے اُن اہتمامات کو باقی نہیں رکھا۔ پھر بھی میں انھیں ذمہ دار قرار نہیں دیتا اور سمجھتا ہوں کہ جو کچھ فروگذاشت ہے وہ میری ہی ہے یقین کیجئے کہ اس تاخیر کے سلسلے میں میرے ضمیر نے مجھے سرزنش کی ہے وہ اتنی بڑی سزا ہے کہ کوئی جابر اتنی سخت سزا مجھے نہیں دے سکتا۔ اب آپ کا معاف کرنا یا معاف نہ کرنا آپ ہی کے رحم و جبر پر موقوف ہے!؟

رہی معاملاتی صورت، اس کے متعلق ادارۂ ایشیا وعدہ کرتا ہے کہ دسمبر نمبر سو صفحات کا اور جنوری نمبر دو سو صفحات کا شائع کیا جائیگا۔ اس طرح نومبر نمبر کے سو صفحات آپ کو جنوری ہی میں ادا ہو جائیں گے۔ اگر اکتوبر نومبر مشترک نمبر نہ بنتا تو یہ اور بھی نقصان دہ بات تھی۔ اس لئے اس نمبر کو "اکتوبر نومبر" کے نام سے شائع کیا جاتا ہے۔ تاکہ دسمبر نمبر ٹھیک ۲۰ دسمبر کو آپ کی خدمت میں پہونچ جائے۔ یعنی اب نومبر نمبر کا آپ انتظار نہ فرمائیں۔

احساسِ برتری

مسٹر آئی۔ اسٹیفنس تین سال تک دہلی میں پبلک انفرمیشن بورڈ Public Information Board کے ڈائرکٹر رہے۔ اُنھوں نے میعاد سے قبل ہی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا تھا وہ آجکل اخبار اسٹیٹسمین کلکتہ کے عملہ میں ہیں ملازمت ترک کرنے سے قبل اُنھوں نے ایک مضمون دہلی کے اخبار نیشنل کال مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء میں لکھا تھا جس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے تاریخ میں اعلیٰ قابلیت کا امتحان پاس کیا ہے اور ممالک متحدہ صوبہ آگرہ اودھ کے سابق گورنر کی بیوی کے عزیزوں میں سے ہیں۔

انگلستان میں جب کوئی شخص ہندوستان سے رخصت یا پنشن لے کر واپس آتا ہے تو بعض لوگ اُس کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اور اکثر لوگ اُس کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، تا وقتیکہ اس امر کے خلاف کوئی قوی ثبوت نہو اُس سے مختلف باتیں منسوب کی جاتی ہیں خصوصًا جب کہ وہ کسی اعلیٰ ملازمت کا فرد رہا ہو، یا فوجی افسر ہو، اور ادھیڑ عمر کا ہو، مثلاً یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ یقینًا وہ مغرور ہے، اپنے درجے کا اُس کو خیال ہے، اور وہ قدامت پرست ہے۔ کوئی چیز ساڑھے سات بجے شام کے بعد سوائے ڈنر کے نہیں کھا سکتا، صبح کو چار پیٹے بغیر پلنگ سے اُٹھ نہیں سکتا اور ریلوے اسٹیشن پر اپنا سوٹ کیس نہیں لے جا سکتا۔ شراب بہت پینے والا ہے جس کا اثر اُس پر کچھ نہیں ہوتا، اور بڑے جانوروں کو ذبح کرنے کا بیحد شائق ہے، اور اگر اُس کی حیثیت اتنی نہیں ہے تو چھوٹے پرندوں کا شکار کھلنے والا ہے، سمجھدار لوگ اُس سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے وبا سے کیونکہ کوئی بھی یہ یقین نہیں رکھتا کہ وہ کسی نئے خیال کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے اُس پر سنجیدگی سے بحث کرنے کا تو ذکر ہی کیا، نوکرانیاں اُس کے دروازے پر جانا پسند نہیں کرتیں کیونکہ وہ اُس کی عادات غیر معمولی اور اُس کے طریقوں کو مذموم پاتی ہیں جنسے اُن کو کبھی سابقہ نہیں ہوا تھا۔

یہ بدنصیب شخص ایک مرتبہ پھر معمولی انگریزی زندگی کے بہتے دریا سے غالبًا نکلنے کی فکر میں لیکن اپنے بے پروا ماحول کو جو مخالفانہ نہ بھی اپنے خیالات اور اپنے کارناموں کے خلاف پا کر آخر کار اپنی جنس کے آدمیوں میں پناہ گزین ہوتا ہے مثلاً چیلٹنہم یا ڈلیٹش میں، جو ہندوستانی سرکاری افسروں کے لئے خاص مقامات ہیں۔ اگر اُس کو پھر مشرق کی طرف جانا نہیں ہے تو وہ وہاں آباد ہو جاتا ہے اور اپنے ہمسایوں سے پچھلے کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔ گورنمنٹ کی کمزوریوں پر خفا ہوتا ہے اور اپنے ماتحتوں کی گستاخیوں پر غصہ ظاہر کرتا ہے اور اپنی موجودہ حالت کا رونا روتا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اُس کو اُس سے کہیں زیادہ پنشن ملتی ہے جو وہ کسی دوسرے ملک سے لے کر آتا۔

اس افسوسناک حالت کے باعث ہندوستان اور ہندوستانی ہیں بیشک اس شخص کو آب و ہوا سے بھی کچھ نقصان پہونچتا ہے، دل و دماغ کی طاقت کو گرمی اور ایشیائی آفتاب کی بھون دینے والی کرنیں نقصان پہونچاتی ہیں اور وہ گرم ممالک کے ایک یا دو مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن خاص مصیبت علم الانسان کی وجہ سے ہے، ہندوستان میں آنے کے بعد یہ مریض شروع ہی سے خوشامد اور چاپلوسی میں محصور ہو جاتا ہے اور اس کو ایسے ذمّہ داری کے کام کرنے کی جرأت دلائی جاتی ہے اور وہ احکام جاری کرائے جاتے ہیں جو اپنے ملک میں وہ کبھی نہ کر سکتا تھا یا جب تک کہ وہ ادھیڑ عمر کو نہ پہونچ جاتا۔ یہ بات خصوصًا اُس وقت زیادہ ہوتی ہے جب وہ اپنے آگے خدا کے فضل سے حروف آئی، سی، ایس I.C.S. لکھ سکتا ہو، اس خاص سرکاری ملازمت کے لئے نہایت ہوشیار گریجویٹ لئے جاتے ہیں جو برطانیہ کی یونیورسٹیوں سے ہر سال نکلتے رہتے ہیں اور اگرچہ علمی معیار اب پہلے سے کم ہو گیا ہے لیکن داخلہ کا امتحان یا نامزدگی کا معیار بہت سخت ہوتا ہے۔

یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام آدمی ہر وقت ملاقات دلچسپ ہوں گے

لیکن عام طور پر (چند بظاہر اور خوشگوار مستثنیات کو چھوڑ کر) سمجھدار لوگوں کے حلقوں میں یہ اگر ۲۵ برس سے گذر گئے ہوں تو خود اپنے ملک میں کم قابل التفات ہوتے ہیں۔ بے شک ہندوستانی فوج کے افسروں یا دیگر سرکاری ملازمتوں کے آدمیوں جیسے ہندوستانی جنگلات کے ملازم یا انجنیئر وغیرہ سے یہ اور بھی کم قابل التفات ہوتے ہیں۔ ان میں اُس وقت تک کوئی نہ کوئی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ کی تیزی و براقی جس کی بدولت اُنھوں نے یونیورسٹیوں میں امتیازات حاصل کئے اور ان کو ہندوستان میں معزز عہدے ملے اگر بالکل نہیں جاتی رہتی تو کم از کم خراب ضرور ہو جاتی ہے۔ وجہ صاف ہے، علم الانسان کا یہ معمولی مسئلہ ہے کہ تقریباً مطلق العنان طاقت کی ستعمال زیادہ کوئی چیز دل و دماغ کی عمدہ قابلیتوں اور انسان کے چال چلن کے لئے مہلک یا نقصان دہ نہیں ہے۔

مجھے خوب یاد ہے جب سات سال پہلے میں نے بمبئی میں پہلے ہی دن اپنے ایک انگریز ملاقاتی کے مطلق العنان اختیارات اور اُس کی شان و شوکت پر حیرت محسوس کی۔ میں کبھی پہلے یورپ سے باہر نہیں گیا تھا۔ میرا ہندوستان آنا زیادہ تر خلاف توقع ہو گیا۔ مجھ کو تیاری کے لئے بہت کم وقت دیا گیا اگرچہ میں نے وہ ابتدائی تعلیم جو سرکاری ملازمتوں کے ایک باقاعدہ امیدوار کو دی جاتی ہے حاصل کر لی تھی۔ میں ۲۷ سال کا تھا میرا خاندان معزز لیکن غیر ممتاز تھا۔ البتہ اوسط درجے کے کسی برطانوی خاندان سے مافوق تھا۔ کیمبرج میں ایک ذہین نوجوان کی طرح میرے خیالات میں کسی قدر مخالفت کا پہلو ضرور رہتا تھا اور میں تعطیلات کے دن تو سختی سے بسر کرتا تھا۔ پیدل چلتا تھا یا سائیکل پر جاتا تھا، خشک گھاس پر سو جاتا تھا وغیرہ یا پہاڑی جھونپڑیوں میں بسیرا لیتا تھا۔ بمبئی پر جب کہ میں جہاز سے اُترنے والا تھا ایک سُرخ سنہری پگڑی باندھے ہوئے شخص نے بڑی عزت سے میرے ایک دوست کی چٹھی (جو گورنمنٹ ہاؤس میں ملازم تھا) میرے حوالے کی اور مجھ سے کہا کہ آپ کا سامان کسٹم ہاؤس سے آپ کی موجودگی کے بغیر نکال دیا جائے گا، یہاں آپ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور آپ کار میں بیٹھ کر ناشتہ کے لئے تشریف لے جائیں۔ اگلے روز وردیاں، سلامیاں اور جھنڈے نہایت ادب و احترام کے ساتھ دیکھ کر حیرت ہوئی، خاموش رفتار ملازموں کا ایک جھنڈ تھا جو بڑے بڑے کمروں میں مودب آتا جاتا تھا۔ یہ دراصل اُسی شان و شوکت اور عظمت کا مظاہرہ تھا جو بکنگھم کے شاہی محل میں پایا جاتا ہے اگرچہ میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ اکثر باادب حوالوں سے جو "ایچ۔ ای" کے الفاظ کے ساتھ ہوتے تھے۔ میں حیران ہو گیا۔ آخر کار مجھے معلوم ہوا کہ ان الفاظ کا اشارہ گورنر کی طرف ہے جس سے میں نے چند سال پہلے ہاتھ ملایا تھا جب کہ وہ ایک کمپنی کا ڈائرکٹر تھا اور مجھے اس بات کا کچھ خیال بھی نہ رہا تھا۔ ہر شخص بجید مہمان نواز، راحت رساں اور خوش مزاج تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ریل میں بیٹھا جو جانب شمال جا رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ ہر اُس شخص کے لئے جو عرصہ تک اس قسم کے ماحول میں رہے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی روح کو تمکنت کی آلودگی سے بچا سکے خصوصاً جبکہ ہر ہندوستانی جس سے اس کو ملنے کا موقع ملتا ہے بظاہر اُس کے اندر یہ بُرا مادہ پہونچانے کی کوشش میں نظر آتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی روایات و تاریخ اور خصوصاً ذات پات کے جھگڑے اس ملک کو دنیا بھر میں سب سے زیادہ نفرت انگیز بنائے ہوئے ہیں اور اس کے غیر جمہوری رجحانات اُن آدمیوں کے دماغوں پر جو انگریزی اعلیٰ متوسط طبقہ یا چھوٹے امرا کے طبقہ سے لئے جاتے ہیں جیسا کہ زیادہ تر ہندوستان میں سفید کھال کے ملازمین ہیں اثر انداز ہوتے اور اُن کے پوشیدہ جذبات کو اُبھارتے ہیں

تقریباً ہر انگریز اپنے اندر اکڑفوں کا مادہ رکھتا ہے۔ ادنیٰ متوسط طبقہ اعلیٰ متوسط طبقہ سے اور بھی زیادہ۔ صرف واقعی امرا، ذہین و فہیم اشخاص اور مزدوروں کے طبقے اس سے آزاد ہیں، ہندوستان کو ان آخرالذکر طبقوں سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے اور چونکہ یہ ملک ہر اُس چیز کا جو خلاف جمہوریت ہو مادی مسکن ہے صرف کچھ کسانوں اور قوم پرستوں کو مستثنیٰ کر دیجئے۔ لہٰذا جس قسم کے انگریزوں سے اس ملک کو واسطہ پڑتا ہے ان کے اندر اس مادّہ کو اُبھرنے اور گرم ملک میں پھیلنے کے لئے کچھ بھی دقت نہیں ہوتی۔

ایشیا
پہلا باب
ادبیات و سیاسیات

مرزا غالب کے چند غیر مطبوعہ اشعار

تبرکاتِ غالب

مختار الدین احمد آرزو

میرزا غالب ہزار اپنے دیوان کو "دیوانِ بے رنگ" کہا کریں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو شہرت اور مقبولیت دیوانِ اردو نے حاصل کی فارسی کو نصیب نہیں۔ ابھی حال میں دیوانِ غالب کے دو قدیم مطبوعہ نسخے ہماری نظر سے گذرے ایک مفید خلائق آگرہ میں ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا اور دوسرا دہلی سے ۱۸۹۱ء میں۔ ممکن ہے اس سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہوں۔ اس مدت سے آج تک بیسیوں اڈیشن شائع ہوئے جس میں وہ اڈیشن بھی شامل ہے جو بڑے بڑے کاغذ پر ۱۲ر کی قیمت کو ملتا تھا اور مطبوعہ جرمنی اور مرقع چغتائی بھی جس کی قیمت سینکڑوں روپے تھی۔ ایک مدت کے بعد نسخۂ حمیدیہ بھی شائع ہوا جس میں مرزا کے وہ اشعار بھی ہیں جو کسی متداول نسخے میں نہیں ملتے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اشعار مندرجۂ دیوان کے علاوہ ان کے اور اشعار نہیں ہیں۔ اگر تفحص اور تلاش جاری رکھی جائے تو اب بھی سینکڑوں اشعار مل سکتے ہیں۔

ہم ناظرین کی ضیافت کے لئے ایک نادر الوجود مخطوطہ "عمدۃ المنتخبہ" مرتبۂ سرور سے مرزا کے بعض اشعار درج کرتے ہیں۔ جو دیوان کے کسی نسخے میں نہیں۔

اعظم الدولہ سرور دہلی کے عمائدین سے تھے۔ تذکرۂ سرور ۱۲۱۶ھ یا ۱۲۱۷ھ میں لکھنا شروع کیا اور ۱۲۲۶ھ یا ۱۲۲۷ھ میں تمام کیا۔ لیکن اس کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ اضافے کرتے رہے۔ ورنہ غالب کا ذکر اس میں نہ ملتا کہ غالب کا سالِ ولادت ۱۲۱۲ھ ہے اور ۱۲۲۶ھ یا ۱۲۲۷ھ میں وہ ۱۴ یا زیادہ سے زیادہ ۱۵ برس کے ہوں گے۔ اس مختصر سی عمر میں ان کی شاعری نے اس قدر ترقی نہ کی ہوگی کہ سرور جیسا شخص ان کے بارے میں "در فنِ سخن سنجی تتبع محاورات میرزا بیدل در ریختہ و محاورات فارسی موزوں می کند بالجملہ موجدِ طرز خود است" اور "رو بہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد" لکھتے۔

دوسری بات یہ کہ غالب کے سرور کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔ جیسا کہ خود سرور کے الفاظ "و با راقم رابطہ یک جہتی مستحکم دارد" سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ بالکل بعید ہے کہ اعظم الدولہ سرور ایک ۱۴ برس کے بچے کے ساتھ گہرے دوستانہ تعلقات رکھتے۔

"پنج آہنگ" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور غالب سے ملنے آیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا اور احمد بیگ تپاں مقیم کلکتہ کا حال اور کلام بھی ان تذکرے کے لئے دیا تھا۔ غالب کا حال اور کلام تو تذکرۂ سرور میں درج ہے لیکن معلوم نہیں کہ تپاں کا حال کیوں نہ درج ہو سکا۔

عمدۃ المنتخبہ ایک نادر اور کمیاب تذکرہ ہے۔ یورپ میں اس کے بہت کم نسخے نظر آتے ہیں۔ ہمیں ہندوستان کے قابلِ فخر محقق جناب قاضی عبدالودود صاحب بی۔اے کنٹیب بیرسٹر کا ممنون ہونا چاہئے جو وہاں سے بعض نادر تذکروں کی نقلیں یا اقتباسات لائے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں سنگِ بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

اب ذیل میں تذکرۂ سرور سے غالب کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

"اسد اللہ خاں اسد الموف مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش اکبرآباد، جوان قابل یار باش، دردمند، ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ، ذوقِ ریختہ گوئی در خاطر شکن، فہمائے عشقِ مجاز، تربیت یافتۂ نکدۂ نیاز، در فنِ سخن سنجی تتبع محاورات مرزا بیدل در ریختہ و در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجدِ طرزِ خود است۔ و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔ اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ مضامین موزوں کردہ، رو بہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد۔"

ایران باستان

قدیم مشرق کے شمالی باشندے

یہ ملتیں ایشیائے صغیر میں رہتی تھیں۔ توریت اور مصری آثار
پر یہ لوگ مردم ہیت سمجھے جاتے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ سب لوگ
رو نسل سے ہیں۔ ہیرودوت نے ان کو ہر جگہ ارآرت اور آلارودکھا ہے
مرنیجی کتبوں سے ظاہر ہے کہ وہاں اور لوگ بھی تھے جو ایشیائے صغیر میں
تے تھے۔ بین النہرین میں میتانی تھے اور وان میں خالدی۔ بعضوں
بیہ دریائے سیکیہ کے بسنے والے، لیدی، اروسک، توبال، موسکو کو موہ
شمار کیا ہے۔ جو سات آٹھ سو سال قبل میلاد تھے۔ بعض تو اور بھی
ج تصور پر پہنچ کر یونانی بومیوں کو اسی نژاد کے گل بوٹے سمجھتے ہیں
ن کے جزئیات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تین ہزار قبل مسیح فراعنہ مصر سے
روشن تھے۔

ہیتی ارشاد اور میتانی کے آثار میخی خطوط سے ملتے ہیں۔ خالدی
اسوری خط میں لکھے گئے تھے۔ ہیتوں کے آثار تل العامرنہ مصری اور
گلی سے بھی ملتے ہیں جو پچھلی راجدھانی تھی اور پادوکیہ میں واقع تھی۔
ان کے آخری آثار راکدتی دفتروں میں محفوظ ہیں۔

ھمرل کا خیال ہے کہ ہیتی زبان کے کچھ نقش ونگار گرجی زبان
میں بھی ملتے ہیں۔ مار کہتا ہے ارمن زبان میں بھی اس زبان کے بعض اثرات
ملتے ہیں۔ ایشیائے صغیر میں بعض ایسی تحریریں جو نقشی تھیں اور خیال
ہے کہ میخی خط سے پہلے یہ خط رائج تھا۔ گندروپائی روہیتوں کا اصلی
وطن پادوکیہ کو سمجھتے ہیں۔ الوگ اور غازمیں بہت سے کشف ہوئے ہیں
ہیتی دفتر بھی وہیں سے ہاتھ آئے ہیں۔ اس دفتر میں ہزاروں سند ہیں
ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے میتانیوں نے ہجرت کی اور دکھن اور

پورب کی طرف پھیلتے ہوئے بین النہرین تک پہونچ گئے۔ قرن دو
میں اخش نے حرکت شروع کی۔ اس کے بعد گیارھویں قرن میں
ہوئیں جن میں بعض آریہ دستے بھی تھے۔ یہ ایسی طوفانی تحریکیں تھیں جو
مصر تک پہونچ گئیں۔

غرض میلاد سے ایک ہزار برس پہلے تک ایشیائے صغیر
اور نوسلطنتیں تھیں۔ مشرق میں وان سلطنت کا دور دورہ تھا
اور یورپ میں نے ختم کردیا۔

5

آریہ۔ ہندی اور یورپین قوموں میں آریہ ایک بڑی شاخ ہیں
اصلی وطن کی تحقیق نہیں ہوسکی۔ نہ یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوسکی کہ
کہاں سے ہندوستان اور ایشیائے صغیر میں وارد ہوئے۔ یہ بڑی
قدیم مشرق پر ان کے بڑے بڑے احسانات ہیں۔ دولت ہخامنشی
بعض نادر چیزوں کو ایک جا کرکے ایک منظم سلطنت کی تعمیر کی۔
ان کے تمدن کا سرچشمہ کافی خشک ہوچکا ہے۔ گو یہ امر ... زیادہ تو
اور پارسیوں نے آبی اسوری و عیلامی تہذیبوں کو ہموار کرکے ...
جذب کرلیا ہے۔

بعض کے نزدیک ۱۶ قرن میلادی میں اور بعض کے نزدیک میلاد سے
دو ہزار سال پہلے آریہ ایشیائے غربی میں آئے اور جستہ جستہ ... ایشیائے صغیر
اور سوریہ میں، ہندی قبل میلاد میں بھی بعض آثار ملتے ہیں۔ ھمرل Hommel
ورا ... کہ فلسطین کے جنوبی گوشوں کے بعض آثار
میں آریائی خدوخال کی جھلک پائی جاتی ہے ... کی تحریریں
کاسی عناصر سے ہیں جنھوں نے بابل کو فتح کرکے چھ سو سال وہاں ... سے لیکر

۶۰۰، اتک ق۔م) سلطنت کی تھی۔ مگر اب یہ نظریۂ منسوخ ہو چکا ہے۔

دین کلر نے ۱۹۰۶ء میں ہتیوں کے قدیم پایۂ تخت بوغاز کوئی میں حفریات کے سلسلے میں کچھ ایسے دفترِ اکدی پائے ہیں جن سے ہتانیوں پر روشنی پڑتی ہے جو بین النہرین کے شمالی گوشے میں رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہتانی رؤسا نے آریہ دیوتاؤں کی قسمیں کھائی ہیں۔ اندر وارون ناسائی ہی متہ کا نام کثرت سے آیا ہے۔ اڈورڈ میر نے اسی حیثیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہتانی روسا آریہ تھے اور ان کی تاریخ چودہ اور پندرہ قرن قبل میلاد سے شروع ہوئی ہے مگر ۱۹۱۹ء کے حفریات نے آئینہ کر دیا کہ بوغاز کوئی کی کتبوں میں آٹھ مستقل زبانیں مستعمل ہوئی ہیں اور یہ کتبے ایسی زبان میں ہیں جو کئی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہیں۔ قدیم مشرق کی تاریخ تورایف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

بہرکیف آریوں کی حرکت اور راستوں کا مسئلہ اب بھی زیر بحث ہے۔ ہے مل کے نزدیک مشرقی یورپ اور دریائے خزر کو راستہ مقرر کرتے ہیں۔

سکاہوں کو یونانی سکیٹ کہتے تھے۔ فرانس نے سیت کہا مگر دار یوشی کتبوں میں ایرانیوں نے ان کا نام سک اور سکا رکھا تھا اور بعض جغرافیائیوں نے ان لوگوں کو جو ایران کے شمال و مشرق میں آئے تھے، ساک (Sakaka) کہا ہے لہذا ہم بھی سکا کہتے تھے۔ سکا سک سے بہتر ہے اس پر سگ کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

سکائی میلوں کی حرکت کیمریون (Cimmeriens) کی ایشیائے غربی کی طرف والی حرکت تھی۔ اس تاخت و تاز نے ایشیائے صغیر میں تہلکہ ڈال دیئے ہتیوں میں آریہ عنصر بڑھا۔ یونانیوں نے سکاہوں کا ذکر کیا ہے سترلس کی جنگ جو مصریوں اور فرعون میں ہوئی بھلائی نہیں جا سکتی۔

گوشوارہ پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حفریات کی بنا پر قدیم مشرق کے باشندے چھ حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔

(۱) سومری
(۲) سامی — سامیوں نے جنوب سے چلکر سوریہ بین النہرین اور شمالی افریقہ کو اپنا وطن بنایا۔
(۳) حامی
(۴) عیلامی
(۵) ہتی — ہتیوں نے مقابل کے راستوں سے آکر سوریہ میں ان سے میدانِ جنگ گرم کیا
(۶) آریہ

ان لوگوں نے اس کے بعد سومریوں اور عیلامیوں سے مشرق میں چھڑ گئی۔ سومریوں نے بابلی تمدن کو اپنا کر قدیم مشرق کے شرقی حصوں میں پھیلایا۔ آریہ شمال سے جستہ جستہ کر کے مشرق میں آئے اور بابلی تمدن کے زیر نگیں ہو گئے اور جب انہوں نے غربی ایشیا میں قوتیں پکڑیں تو تمام قدیم مشرق مادیوں اور پارسیوں کی مدد سے ایک دولتِ واحد میں تبدیل ہو گیا۔ اسی لئے ہخامنشی سلطنت قدیم مشرق کا آخری چراغ تھی۔ بعض لوگوں کو بھی اس تمدن میں تھوڑا سا حصہ ملا تھا۔ جیسے نوبی (Nubians) کی دولت ناپاتا اور حبشہ کی دولت مرا۔

سیّد طالب علی ایم۔ اے الہ آبادی

دو شرابی

مری زود خواہی تری دیریابی
محبت میں دونوں ہیں وجہِ خرابی

نگاہیں ملیں یوں نگاہوں سے گویا
ہوئے آمنے سامنے دو شرابی

محبت میں ہر جیت ہے اک ہزیمت
محبت میں ہر زک ہے اک کامیابی

مرے ذوقِ رندی کے رستے میں حائل
تمہاری نگاہوں کی عفت مآبی

حریمِ محبت کے پردے اٹھا دو
کہ فطرت کو ہے حسرتِ جلوہ یابی

فطرت
(راولپنڈی)

جنوبی ہند کے مرہٹی شعراء

جنوبی ہند میں مرہٹی زبان کی ترویج و اشاعت کی داد و تحسین کا واحد حقدار رام داس ہے در اصل یہ اُسی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج مرہٹی زبان جنوبی ہند میں جاری و ساری ہے۔ رام داس نے مرہٹی زبان کی حمایت اس طرح کی ہے۔

"مرہٹہ تی تکا، میلا وا وا
مہاراشٹر دھرم وادھا والو"

یعنی "مرہٹوں کو ایک ہو کر مرہٹہ تہذیب اور تمدن کو پھیلانا چاہئے"

توسیع زبان اور اتحاد قومیت کے اصولوں نے مرہٹوں کے دل میں اخوت اور ملی تڑپ پیدا کر دی یہی وجہ تھی کہ شیواجی کے انتقال کے بعد بھی وہ خرم و شاداں رہے۔ حالانکہ وقت نہایت سخت تھا اور دنیا کا نظام درہم و برہم ہو رہا تھا۔

شاہ جی، شیواجی کے والد کے دور سے مرہٹوں نے جنوبی ہند کی طرف جانا شروع کر دیا تھا اور آج بھی تنجور کے علاقہ میں بہت سے ایسے مرہٹہ خاندان موجود ہیں جو شاہ جی کے زمانے میں وہاں سکونت گزیں ہو چکے تھے جب شیواجی تنجور گیا۔ رام داس سوامی، اُن علاقوں میں اپنے مذہبی عقائد اور ملی اصولوں کی تبلیغ کے لئے اپنے چیلے روانہ کر چکا تھا۔ جن میں بھیم سوامی، اننت موتی اور رگھو سوامی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس تبلیغی جماعت نے رام داس کے مسلک اور مذہبی عقائد کو پھیلایا۔ ضمناً مرہٹی زبان کی ترویج و توسیع بھی عمل میں آگئی۔

بھیم سوامی کی داستان بڑا دلچسپ ہے۔ وہ شاہ پور کے کلاجی پنتھ کا پوتا تھا۔ اُس کی دادی، گنگا بائی رام داس کی مرید تھی۔ رام داس اس سے ملاقات کی غرض سے گیا اور بھیم کی ذکاوت و ذہانت سے بہت زیادہ متاثر ہوا بھیم کی عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ رام داس نے اس سے پوچھا:-

"کیا تم ہمارا مسلک قبول کرو گے؟ اثبات میں جواب پاکر رام داس نے کہا "مگر تمھیں ہر حالت میں ہمارے احکام پر سختی سے عمل کرنا پڑے گا"۔ "تو کیا ہوا؟ نوجوان عقیدت کیش نے کہا۔ قریب کے ایک کنوئیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رام داس نے کہا "اس میں کود پڑو"۔ فوراً بھیم کود پڑا۔ رام داس اس کی وفاداری اور عقیدت کیشی سے بہت زیادہ خوش ہوا اور مرید بنا کر اپنی سرپرستی میں اُس کی تعلیم شروع کرائی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ شاہ پور کے مٹھ کا مہنت مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ شیواجی کے ساتھ تنجور چلا گیا وہاں شیواجی کے بھائی ویانکو جی نے اس کے لئے ایک مٹھ بنوایا اس کے ماننے والے وہاں ابتک پائے جاتے ہیں۔ اُس نے بہت سے گیت (بھجن) اور رام داس کی کتاب زندگی لکھی۔

رام داس کے دو اور مرید جو اُسی زمانے میں تنجور گئے، آننت اور رگھو تھے، آج بھی اُن کے مٹھ تنجور میں موجود ہیں۔ میرو سوامی، آننت جی کے مرید نے متعدد کتب لکھیں۔ یہ کتابیں انھیں زندگی کی تقدیس بار روح سے معمور ہیں۔ مادھو، رگھو کا مرید، ایک پُر نویس مصنف تھا۔ اُس نے رامائن بحر اور وزن کے علاوہ اشعار منثورہ میں بھی لکھی ہے۔ اُس نے مہابھارت بھی لکھی، جو اٹھارہ حصص پر مشتمل ہے۔ اس کام میں اُس کی زندگی کے کم از کم چار سال صرف ہوئے، یہ نو سو چوبیس ابواب پر منقسم ہے اور جیسا کہ خود مصنف کہتا ہے۔ یہ دریائے کاویری کے کنارے گوری ماتر[1] میں لکھی گئی ہے۔ یہ مرہٹی زبان کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے لیکن شعری، اور زبان و بیان کی خوبیوں کے لحاظ سے کتاب کی ادبیت ذرا کم ہو جاتی ہے۔

کاویری کے قرب و جوار میں دوسرے شاعر بھی ہوئے جن میں رنگا نائیک کو کافی شہرت ہوئی۔ اس کی نظم "کاویری" نہایت خوب ہے۔ درد، اثر، سادگی اور حب الوطنی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے رنگا نے اساطیری

[1] ایک شہر کا نام

موضوعات پر بھی اکثر نظمیں لکھی ہیں۔ رنگناتھ کے علاوہ کاویری کے
ساحل سے اور بھی بہت شاعر رہتے تھے۔ جن میں وشنو داس، بھگونت راؤ اور
ویدیا ناتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام شعرا نے مذہب کی مقدس زندگی کو موضوع
شاعری قرار دیا اور اسی لئے ان کی شاعری مذہبی زندگی کے نمونوں سے
بھری ہوئی ہے حالانکہ ان میں شعری صداقت (Poetic Truth)
اور ادبی لطافت کا کم و بیش فقدان ہے۔

ان علاقوں کے مرہٹی ادب میں ایک صنف امتیازی حیثیت رکھتی
ہے۔ یہ صنف ڈرامے (ناٹک) کی ہے۔ بادشاہ ساہو نے بے مثل ڈرامے لکھ کر
مرہٹی زبان کو بہت وسعت بخشی۔ ڈرامہ نویس خود بادشاہ ہے یا کوئی درباری
شاعر۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔

ڈرامے بہت زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی اس زمانے کے اسٹیج
(stage) اور ڈرامائی اصولوں (Dramatic Tradition)
پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اس دور کے اکثر مصنف سنسکرت پراکرت (زبان)
جانتے تھے۔ لیکن کسی نے بھی کالیداس اور بھوبھوتی کے ڈراموں کا ترجمہ کرنے
کا خیال بھی نہ کیا۔ قدیم زمانے کے مرہٹی ادب میں ناٹک کے ساتھ اس بے اعتنائی
سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ ناٹک دیکھنے اور اداکاری میں لطف اٹھانے
اور ڈرامائی آرٹ کے حسن و قبح کی تمیز سے بے بہرہ تھے۔ یا انہیں ..... زندگی
کے لئے وقت نہ تھا۔ اس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عام طور
سے تنگ دست تھے۔ زندگی کی اہم ترین ضروریات کے بعد اگر ان کے لئے کوئی باعثِ
تفریح شغل تھا تو وہ زندگی کے حکیمانہ اقوال اور روحانی حقائق کا تجزیہ۔ اس دور
ادب کو ناٹک سے کچھ یونہی سا لگاؤ تھا۔ گردورِ عقیدت کے شعرا نے یہ ضرورت کم و
کیف پوری کردی۔

آنند تنیہ رام داس کا مرید جو پہلے ضلع ستارہ میں رہتا تھا۔ بعد کو ونگ آباد
کے مٹھ کا مہنت ہوگیا۔ رام داس کا مرید ہونے کے علاوہ اسے وٹھل دیوتا اور کرشن
مذہب سے خاص عقیدت تھی۔ اس نے رامائن کے موضوعات کو عنوانِ شاعری قرار
دیا ہے۔ ایک اور شاعر آنند تنیہ (آنند کا بیٹا) بھی انتخابِ موضوع، زبان اور بیان
میں آنند سے ملتا جلتا ہے۔ یہ دونوں شاعر سنسکرت اور ہندی جانتے تھے علمِ نجوم
سے بھی انہیں کافی دلچسپی تھی۔ اس کی نظمیں سہل اور سادہ ہیں اور جیسا کہ علامہ عبدالحق
نے کہا ہے "درد اور اثر سادگی کے سایہ میں پلتے ہیں" ان کی نظموں میں درد اور اثر

بھی موجود ہے۔ اُن میں ایک ڈرامائی کیفیت ہے جس کی وجہ سے بچوں، عورتوں
میں وہ خاص دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ اُن کی یہ نظمیں خوش الحان اخلاقی
خطیبوں نے بکثرت استعمال کیں۔ دونوں شاعروں میں سہ حرفی صنعت ....
(Alliteration) کی وجہ سے الفاظ کی جبری ترتیب ....
(Forced arrangement of words) کا اظہار ہوجاتا ہے اور اس کی
وجہ سے دونوں کا کلام معمولی اغلاط سے کسی قدر گنجلک اور خراب ہوگیا ہے (ہمارے
شاعر، شاعر نظامی کو بھی سہ حرفی صنعت کے استعمال میں یدطولیٰ حاصل ہے مگر ان کے
اشعار سے الفاظ کی جبری ترتیب کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ شعر میں زور، جوش، لطافت
اور غنائیت پیدا ہوجاتی ہے) لیکن آنند تنیہ، بلاشبہ شعری جدت، فطری
قابلیت، غیر معمولی ذہانت اور اختراعی قوت کے لحاظ سے آنند سے بہتر ہے
وہ ایک نئی بحر "ڈنڈی" کا موجد مانا جاتا ہے۔
اس بحر کو جھنجھناتی ہوئی غنائیت Ringing music
کی وجہ سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی شاعری نغمۂ موسیقی سے لبریز ہے،
"سیتا سوئمبر" اس کی نہایت مشہور تصنیف ہے اس کے پڑھنے کے دوران میں
ایک لطیف جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہ غنائی کیفیت تمام نظم میں موجود ہے
اور الفاظ کی ہم آہنگی سے نکلی ہوئی یہ جھنجھناہٹ نقرئی گھنٹیوں کی آواز سے
بہت مشابہ اور مماثل ہے۔ اس کے اشعار میں ایک خواب آلود ترنم ہے جو تار
دل کے کنول پر اتنی آہستگی سے گزرتا ہے جیسے ہماری تھکی ہوئی آنکھوں پر ہماری
تھکی ہوئی پلکیں۔ پھر سب سے زیادہ قابلِ قدر بات یہ ہے کہ آنند تنیہ کی [illegible]
آورد نام کو نہیں۔ اساطیری موضوعات کے علاوہ اس نے بھگونت (کرشن) کی
زندگی اور راماین کے رزمیہ (Epic) سے اکثر موضوعات لے کر ان پر طبع
آزمائی کی ہے۔ اس نے کم و بیش ایک سو پچاس گیت لکھے جن میں نرم، [illegible] لطیف
سوز پنہاں ہے۔ اُس کے موضوعاتِ شاعرانہ اور فن [illegible]
دو کرناٹک کے ایک مقام ارنی کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصلی نام گوپال تھا وفن [illegible]
سے کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے خود اپنے آپ کو اپنی ایک نظم میں ارنی کے
سپاہی کے نام سے خطاب کیا ہے۔
عام خیال ہے کہ آنند تنیہ کے لڑکے کی شادی رگھوناتھ پنڈت کی
لڑکی کے ساتھ ہوئی تھی۔ رگھوناتھ مرہٹی زبان کا بہت بڑا شاعر تھا۔ اُس کا شمار
مرہٹی ادب کے کامیاب اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اس کی نظم "نل اور دمینتی کی شادی"

فن کارانہ نظموں میں بے مثل ہے۔ یہ نظم سنسکرت زبان کے اصول شاعری کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ مگر اس کی نظمیں آورد آگیں، صنعت کارانہ اور مختلف صنائع، بدائع سے پُر ہیں۔ اُس نے بہترین الفاظ کا انتخاب کر کے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انھیں استعمال کیا ہے وہ ایک جیّد عالم تھا اور ادبی مضامین اس کی گُہر باریوں سے چمک اُٹھتے تھے، اُس نے اپنے شاہکار "نل اور دمنتی" کی شادی میں کردار نگاری کا اعلیٰ ثبوت دیا ہے۔ "راج ہنس" کا قصّہ اور اُس کا قیل کے ہاتھوں میں پہنچنا، اس حسن و خوبی سے کبھی بیان نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ بیان کرنے والا خود ایک چابک دست اور فن کا مصوّر نہ ہو۔
رگھوناتھ پنڈت کی رنگین اور پرنمو لطیف اور مدہوش کن نظمیں پڑھ کر کیٹس (Keats) یاد آجاتا ہے۔ محاکات اور واقعات کی تفصیل بیان کرنے میں رگھوناتھ کا حریف اور مماثل انگلستان کے مشہور شاعر کیٹس (Keats) کے سوا اور کوئی نہیں۔ مناظرِ فطرت کی مُوکشی میں اُسے یدِ طولیٰ حاصل تھا اور اسی وجہ سے ہم اُسے (Pre - Raphaelite School) کا ایک فرد خیال کرنے لگتے ہیں۔ اُس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات عسرت اور تنگ دستی کی حالت میں بسر کئے جس کا اُس نے نہایت موثر الفاظ میں تجزیہ کیا ہے۔ اُس نے "گنجا تدر موکش" اور "رام داس" پر بھی نظمیں لکھیں لیکن وہ زیادہ مشہور نہیں ہوئیں۔

اکرام حسین بی، اے (بریلوی)

دردِ جانکاہ

کوئی نہ ہوگا فطرت سے آگاہ — اس رہگذر میں رہبر بھی گمراہ
تیرے لئے ہے ذرّوں میں دنیا — میری نظر میں دنیا پرِ کاہ
ڈوبا ہوا ہوں کیفیتوں میں — جی بھر کے پی ہے الحمدللہ
فکرِ مداوا کیا زندگی میں — خود زندگی ہے اک دردِ جانکاہ
تابِ تماشا لائیں کہاں سے — اک برق بھی ہے جلووں کے ہمراہ
روتا ہوں گل کی مجبوریوں پر — دل ہے مآلِ گلشن سے آگاہ
کانٹوں کو بخشی وہ عمرِ باقی — گل کو عطا کی یہ مرگِ ناگاہ

اس کشمکش سے تاباں کو مطلب
وہ، اور توبہ استغفراللہ

تاباں دہلوی، ایم اے

مشرق میں عورت کا مرتبہ

(از شفیق بانو بیگم)

اس مضمون میں محترمہ شفیق بانو بیگم صاحبہ نے مشرق کے بڑے بڑے ملکوں کی قدیم و جدید عورتوں پر ایک معلوماتی روشنی ڈالی ہے لیکن خود اپنے ملک کی بہنوں پر لکھتے ہوئے وہ جذبات کی رو میں بہ گئی ہیں اور وسیع النظری سے کام نہیں لیا گیا، مشرق میں ہندوستان خود اتنا بڑا ملک ہے جس میں مختلف مقامات کی عورتوں کی فطرت، تہذیب، رہن سہن اور سماجی زندگی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ اور ہر قوم کی عورت کی زندگی، رسم رواج، معاشرت اور تعلیمی معیار بجائے خود ایک موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا سکتا ہے۔

"ہندوستان کی عورتیں" کے ضمن میں شفیق صاحبہ نے محض مسلمانوں کے اعلیٰ، متوسط اور نیچے طبقہ کی مسلمان عورتوں کی زندگی دکھائی ہے۔ اور وہ ان تینوں طبقوں کی "حالت زار" پر بہت ناراض ہوئی ہیں۔ حالانکہ ناراض ہونے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ اُن حالات سے بحث کرتیں جو عورتوں کی موجودہ زندگی کے اصل سبب ہیں۔

عورتوں کا کیا ذکر ——— سوال یہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کا مرد بھی کوئی سانچہ اختیار کر سکا ہے!؟ مغربی تعلیم و تمدن اور مغربی معاشرت نے مردوں کو جس طرح ایک عجوبہ مخلوق بنا دیا ہے، ظاہر ہے کہ عورتوں پر بھی وہ اسی طرح اثر انداز ہو رہا ہے لیکن میں جدت پسند اور قدامت پسند دقیانوسی خیال کا انسان نہیں ہوں اس لئے میرے نزدیک یہ کہنا کہ مغربی تعلیم و تمدن اور معاشرت و نظام نے ہم کو گمراہ کر دیا ہے، کلی طور پر صحیح نہیں۔ میری رائے میں ہم نے ان چیزوں کا مصرف غلط اور بھونڈے پن سے کیا ہے۔ یعنی ہم نے کلی طور پر نسخہ کو استعمال ہی نہیں کیا ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق آپ پوری خوراک استعمال نہیں کیجئے تو کیونکر صحت یاب ہوں گے۔ میں خیال کرتا ہوں ہندوستانیوں نے صرف معاشرتی اور لباسی تقلید میں تو ضرور ایک نقص انگیز کمال دکھایا ہے۔ مگر یہ ذہنی، دماغی اور ایجادی عناصر سے قطعی متاثر نہیں ہوئے۔ اگر مغرب کی اصول پرستی اور عملی اسپرٹ سے ہم لوگ متاثر ہوتے تو عورت کو اتنی آزادی ضرور دے دیتے جتنی آزادی کی مساوی طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے اُس کو ضرورت ہے۔

وہ لوگ بھی جو انگریزی تعلیم و تمدن کے دلدادہ ہیں، عورتوں کی طرف سے دل میں "چور" رکھتے ہیں اور ہرگز وسیع الخیال اور نئے نظام کے قائل معلوم نہیں ہوتے وہ ابھی تک روحانی اور دماغی طور پر قدیم استبدادی تصور کے عادی ہیں۔

خیر، یہ رونا کب تک رہے گا۔ انتظار کیجئے ایک سیلاب ایسا بھی آئے گا جس میں بقیہ خس و خاشاک بھی بہ جائیں گے۔ لیکن بہر حال میں تجویز کروں گا کہ دوسرا سلسلہ شفیق بانو اور لکھیں جس میں ٹھنڈے دل سے صوبہ وار ہندوستانی عورتوں کی زندگی کے حالات سے واضح بحث کی جائے۔

آخر میں اس سلسلے میں "برماکی عورتیں" ادارہ کی طرف سے منسلک کی جاتی ہیں۔ اس مضمون سے شفیق صاحبہ کو کافی اندازہ ہو جائے گا کہ ایشیا خواتین کے متعلق کس قسم کے معلوماتی مضامین شائع کرنا چاہتا ہے۔

ساغر

ایرانی عورتیں

پہلی قسط

ایران کی پرانی تاریخ آج تک تاریکی میں رہی اس کی وجہ یہ ہے
اس ملک کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ پرانی کتابوں سے صرف
اتنا پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ ایران کی عورتوں کے خیالات بہت پاکیزہ
تھے۔ خدا کی بھی قائل تھیں۔ عورتوں کو اپنے گھروں پر پورا پورا اختیار تھا
اور اپنے خانگی معاملات میں پوری پوری آزادی میسر تھی۔ عورتوں کی
طرف مرد بھی بلند اعتقادات رکھتے تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی
پیدائش سے تقریباً تیرہ سو (۱۳۰۰) برس پہلے کلدانیوں نے ایران کو اپنے قبضے میں
کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے ایرانی مرد عورتوں میں کوکب پرستی شروع
ہوگئی۔ اس کے بعد کلدانیوں کے اثر سے ایرانی عورتوں کی حالت پست ہوگئی
ان کو جو حقوق حاصل تھے وہ ضبط ہوگئے۔ حرم سرا میں قید ہوگئیں جہاں
صرف مردوں کی تفریح تصور کی جانے لگیں۔ گھر سے کچھ لگاؤ نہ رہا۔ خانہ داری
کے کام خواجہ سرا کرتے رہے۔ غرضیکہ کلدانیوں کی فتح کے بعد کئی سو برس
تک ایرانی عورتوں کی وہی حالت رہی۔ جو آشوری، بابلی اور کلدانی عورتوں
کی تھی۔

جب کلدانیوں کا زوال ہوا تو ایران میں خود مختار سلطنت قائم ہوئی
اس کا بانی قورش تھا۔ لیکن عورت کی زندگی بدستور رہی۔

جب ایران میں پارتھیا کے حکمرانوں کو عروج حاصل ہوا تو ایرانی
عورتوں کی حالت زیادہ پست ہوگئی۔ گھر کی ملکہ اور لونڈی میں کوئی فرق
نہ رہا۔ اسلام پہنچنے سے تقریباً دو سو سال پہلے ایرانی عورتوں کی حالت پھر
غنیمت ہوگئی وہ گھریلو زندگی اور معاملات میں آزاد ہوگئیں۔ اور سوسائٹی نے
ان کے حقوق کو تسلیم کرلیا۔

فردوسی نے شاہنامہ میں ایرانی عورتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس
سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف گھر کی مالک تھیں بلکہ سیاسی کارناموں میں
بھی شوہروں کے ساتھ تھیں اور قومی کاموں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتی
تھیں۔ مصوری، کشیدہ کاری، سنگ تراشی اور دیگر فنون میں کافی ماہر تھیں
کھانا پکانا، سینا پرونا اور بچوں کی تربیت سے بخوبی واقف تھیں۔

ایرانی عورتوں کی یہ بات خاص کر قابل ذکر ہے کہ یہ ہمیشہ دو طبقوں
میں منقسم رہیں۔ ایک طبقہ جو شہری زندگی بسر کرتا رہا۔ یہ عام طور سے حرم سرا
میں زندگی گزارنے کی عادی تھیں۔ دوسرا طبقہ خانہ بدوش ایرانی عورتوں
کا رہا۔ جن کے قافلے مستقل طور پر کہیں قیام نہیں کرتے۔ پرانے زمانوں سے
اب تک ان خانہ بدوشوں کی یہی کیفیت ہے۔ یہ عورتیں پردہ نہیں کرتیں کھلی
ہوا میں زندگی بسر کرنے کی عادی ہیں سب کے سامنے آتی ہیں اس لئے بغیر
کسی جھجک کے سب مردوں سے گفتگو کرتی ہیں اور مردوں کے دوش بدوش
کام کرکے کاروباری معاملات میں مدد کرتی ہیں۔ ان خانہ بدوش عورتوں کی اب
تک یہی زندگی ہے اس نے شکل و صورت، صحت اور جسمانی حیثیت سے شہر
کی ایرانی عورتوں سے بہت بہتر ہوتی ہیں۔ چنانچہ عہد قدیم سے آج تک ان عورتوں
کی دستکاری قابل تعریف ہے اور بہت مشہور، گھر کے کاموں کے علاوہ اون
کے گرم کپڑے، بھیڑ کے روئیں سے قالین تیار کرتی ہیں اور چیزوں کو فروخت کرنے
میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔

موجودہ ایرانی عورتیں اس دور میں بہت ترقی کر گئی ہیں اور
پردہ کو ترک کرکے بالکل آزاد ہیں۔

گھریلو کاموں میں ملکہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دستکاریوں
صنعتوں اور دوسرے کاموں میں کافی مہارت پیدا کرچکی ہیں اور نہایت
محنتی ہیں۔

عرب عورتیں

ایام جاہلیت میں عرب عورتوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ عرب میں
عورت کو جو کچھ عزت اور اقتدار حاصل ہوا وہ پیغمبر اسلام رسول فطرت کے
زمانے میں ــــ آپ نے لڑکی زندہ دفن کرنے کی سختی سے مخالفت کی اور بیٹیوں کی

محبت اُن کے خاندان والوں کے دل میں پیدا کر دی۔

ایک عرب کا افسانہ میں نے پڑھا تھا۔ دو بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی کے ہاں خلاف توقع لڑکی پیدا ہوئی۔ وہ بہت غصّہ میں اپنی بیوی سے کہنے لگا "تم نے مجھے ذلیل کر دیا۔ اب میں بڑے بھائی کے سامنے سر اونچا نہیں کر سکتا۔ تم نے مجھے ایک لڑکی کا باپ بنا دیا۔ خیر اب اس لڑکی کو دفن کرنے کے بجائے تم راز میں رکھو اور لڑکوں کا لباس پہنا کر پرورش کرو۔ چنانچہ بیوی نے سولہ سال تک اس بچی کو لڑکوں کے بھیس میں پرورش کیا۔ تمام ہنر، گھوڑے کی سواری، تیر اندازی، شیر کا شکار وغیرہ اُس نے سکھائے۔ دنیا کو پتہ نہ چل سکا۔ ایک دن اُس کا چچازاد بھائی اس لڑکی کو لڑکا سمجھتے ہوئے مقابلہ پر آ گیا اور تلوار سے اُس کے ساتھ کھیلنے لگا۔ کھیلتے کھیلتے اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اُس کے سینے ... سے چھو گیا اور ایسا معلوم ہوا گویا بجلی نے ہاتھ کو بیکار کر دیا۔ چند منٹ بعد یہ راز راز نہ رہا۔ اور سب کو معلوم ہو گیا کہ لڑکے کے بھیس میں حسین لڑکی تھی۔

عرب میں عورتیں جرأت اور ہمت والی ہوتی تھیں۔ حضرت نائلہ کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ وہ بہت حسین تھیں۔ نمونۂ آنکھیں دلفریب چہرہ۔ ارقم بن شعیب عرب کا مشہور شاعر تھا۔ اُس نے نائلہ کی غائبانہ تعریف سنی اور لگا بھری محفل میں اشعار کہنے۔ کیونکہ اُس زمانے میں عرب شعراء کا یہ عام قاعدہ تھا کہ اپنی محبوبہ کا نام لے کر محفلوں میں شعر خوانی کیا کرتے تھے۔ ارقم نے جب اپنے اشعار میں نائلہ کے حسن و جمال کی تعریفیں نظم کیں اور رعنائیوں کا تذکرہ کرنے لگا تو حضرت نائلہ کو بھی اس کی خبر ہوئی۔ آپ بہت رنجیدہ ہوئیں اور قسم کھا کر بیان کیا کہ میں نے کبھی ارقم کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کون ہے۔ ناحق میرا تذکرہ کر کے مجھے رسوا کر رہا ہے۔ اِدھر یہ بے چاری اپنی پاکبازی کا ثبوت دے رہی تھیں اور اُدھر ارقم اپنے اشعار میں اُن کی ملاقاتوں کو فخریہ بیان کر رہا تھا اور اپنی غزلیں عام محفلوں میں سنا رہا تھا کہ کس طرح کب میں نے دیکھا تھا اور کب عاشق ہوا اور کس وقت نگاہ کا گھائل ہوا وغیرہ وغیرہ۔

نائلہ جب عاجز آ گئیں تو انھوں نے ارقم سے انتقام لینا چاہا۔ اس فیصلہ کے بعد ایک دن جب کہ ارقم عظیم الشان مجلس میں اپنے اشعار سنا رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ نائلہ مجھ پر فریفتہ ہے اور اُس نے فلاں وقت مجھ سے ملاقات کی اور فلاں وقت پھر ملنے کا وعدہ کیا تو نائلہ نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر ارقم سے کہا "بھائی جو تم نے مجھ سے بکری خریدی تھی اُس کے دام اب تک ادا نہیں کئے۔ آجکل میں غریب پریشان ہوں لہٰذا میری رقم خدا کے لئے دیدو"۔ ارقم نے کہا "میں نے تم سے کبھی کوئی چیز نہیں خریدی تم غلط کہتی ہو"۔ نائلہ نے کہا افسوس تم غریب سمجھ کر مجھے اس طرح کہتے ہو۔ لیکن میں تم سے اپنی رقم وصول کر کے رہوں گی۔ اس کے بعد نائلہ نے ایک تحریر پیش کر کے کہا کہ حاضرین یہ اس شخص کی تحریر ہے۔ لیکن آج یہ انکار کر رہا ہے۔ تحریر دیکھ کر ارقم نے کہا یہ میری تحریر نہیں ہے۔ یہ عورت قطعی فریب کار اور جعلساز ہے جو مجھ سے زبردستی روپیہ وصول کرنا چاہتی ہے۔ الفاظ سنتے ہی نائلہ نے رونا شروع کر دیا۔ اور اہل مجلس سے کہا کہ حاضرین خدا کے لئے مجھ غریب کی مدد کیجیے یہ شخص میرے ساتھ بے ایمانی کرنا چاہتا ہے۔ یہ الفاظ سن کر حاضرین کو نائلہ سے ہمدردی ہو گئی اور ارقم سے کہا کہ تمھیں ایک عورت پر اس قدر ظلم نہ کرنا چاہئے۔ اس کا جو کچھ مطالبہ ہو دیدو۔ ارقم نے کہا کہ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اس عورت سے بالکل واقف نہیں ہوں۔ یہ سن کر نائلہ نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور فرمایا۔ تم نے اپنے وعدے سے انکار کیا۔ اپنی تحریر سے بھی۔ اب کیا میری صورت سے بھی انکار کر دگے؟ ارقم نے کہا آج پہلی مرتبہ میں نے صورت دیکھی ہے۔ آج سے پہلے کبھی خواب میں بھی تمھیں نہیں دیکھا۔ نائلہ نے کہا اچھا تم قرآن اٹھاؤ کہ تم نے آج سے پہلے مجھے نہیں دیکھا تو میں اپنی رقم چھوڑ دوں گی۔ ارقم نے فوراً قرآن شریف اٹھا کر کہا میں خدا اور اُس کے مقدس کلام اور دین کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے آج سے پہلے اس عورت کو نہیں دیکھا۔

حلف اٹھاتے ہی حضرت نائلہ نے ارقم کے چہرے پر تھوک دیا اور حاضرین سے کہا، محترم بھائیو! یہ ابھی قسم کھا چکا ہے کہ اس نے آج سے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔ سنو میں تم کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں نائلہ بنت عامر ہوں جس کے عشق کی داستان یہ اپنے اشعار میں لکھتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ فلاں فلاں مقام پر میری ملاقاتیں ہوئیں اور مجھ پر فریفتہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے کوئی بکری فروخت نہیں کی اور نہ میری رقم چاہئے مگر اس کے حلف اٹھانے سے آپ سب کو یہ معلوم ہو گیا کہ کس قدر بے حیا اور جھوٹا یہ مکار ہے اور ناحق مجھے بدنام کرتا ہے۔ اس کے بعد نائلہ چلی گئیں اور اس حیرت انگیز واقعہ پر حاضرین سراپا حیرت بن گئے۔ ارقم نے شرم و ندامت سے سر جھکا لیا۔

ایشیا

۱۰ر اکتوبر ۶۲۵ء کو حضرت نائلہ کا نکاح حضرت عثمان غنی رض سے ہوگیا۔ وہ اپنے شوہر کی بے انتہا محبت شعار تھیں اور تمام گھر کا کام خود ہی کرتی تھیں اور ہر لحظہ شوہر کی خوشی کا خیال رکھتی تھیں ۔۔۔ نائلہ بہت بہادر تھیں۔ جب اہلِ مصر نے حضرت عثمان پر قاتلانہ حملے کئے تو حضرت نائلہ نے تلوار اٹھالی اور باغیوں میں گھس کر ایسی بے جگری سے تلوار چلائی کہ دشمنوں کے خون کی ندیاں بہادیں۔

جب محمد بن ابو بکر نے اور عبدالرحمٰن نے حضرت عثمان پر تلوار سے حملہ کیا تو حضرت نائلہ نے فوراً بڑھ کر تلوار کو ہاتھ سے روکا۔ اُن کی انگلیاں کٹ کر الگ جا پڑیں اور بیہوش ہوگئیں۔

اس واقعہ کو لکھنے سے میرا مقصد عرب عورتوں کی مثال دینی تھی کہ قدیم زمانے میں عرب کی عورتیں کتنی بہادر اور صاحبِ سیر تھیں عرب کی عورتیں جن میں تصویر ہوتی ہیں۔ لباس شرعی پاجامہ اور لانبا کرتا اور سر پر ایک خاص قسم کا رومال جیسے "کسابا" رکھتی ہیں۔ بازار سے تمام سودا لین دین، ضرورت کے کام خود ہی انجام دیتی ہیں۔ پردہ کسی کام میں حارج نہیں اور وہ پردہ ایسا ہوتا بھی نہیں جیسا کہ ہندوستان میں ہے۔

جاپان کی عورتیں

جاپانی عورتیں وہم میں ہر ملک سے آگے ہیں اور رسم و رواج کی زبردست حامی۔ جاپان میں جب عورت حاملہ ہوتی ہے اُس وقت اس بات کا یقین کرتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں شوہر کی بیوی بن چکی ہے۔

وہاں کی بدھ خواتین ہونے والی اولاد کے لئے کافی دور دراز کے سفر کر کے مختلف مندروں میں منت مانگتی ہیں اور بہت زبردست عقیدت کے ساتھ پانچویں مہینہ بچہ کا باپ ایک جلسہ کرتا ہے جس میں سب رشتہ داروں کا آنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ پھر سب کو یہ خوشخبری سنائی جاتی ہے اس کے بعد رسموں کا ہر ہر قدم پر استقبال ہوتا رہتا ہے۔

جاپانی عورتیں زچگی کی حالت میں بھی آخر تک کام کرتی رہتی ہیں اور بڑی جفاکش ہوتی ہیں۔ اگر بچہ کا باپ دولت مند ہوتا ہے تو دایہ کا پانچویں مہینے سے انتظام کر دیتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں دایہ صرف وقت پر آجاتی ہے۔ یہ کچھ فلکیات، علمِ نجوم، اور چاند کے تغیرات و امواج کے مدوجزر سے بھی واقف ہوتی ہیں اور جانتی ہیں کہ بچہ کی پیدائش کے اوقات کیا ہو سکتے ہیں۔ یعنی دریا چڑھاؤ پر ہو۔ صبح جس وقت جانور چرنے جاتے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ

جاپانی عورتیں زچگی کو کچھ بہت مصیبت خیال نہیں کرتیں۔ شاید یہ اس جسمانی ورزش کا سبب ہے۔ اگر پہلا بچہ لڑکا ہو تو عورت کو بہت زیادہ مبارکباد دی جاتی ہے اور اگر لڑکی ہو تو بہت افسردہ ہو کر تسلی دیتے ہیں کیونکہ لڑکی خاندان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ بچہ کی آنول صحن کے دروازہ کے قریب ایک مٹی کی ہنڈیا میں بند کر کے گاڑ دی جاتی ہے اور بچی کی آنول دروازہ سے باہر گاڑتے ہیں۔ اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ لڑکا گھر کا مالک گھر میں رہتا ہے اور لڑکی بڑی ہو کر باہر جانے والی ہے۔ جاپانی عورتیں زچگی کے بعد اکیس روز تک بستر پر آرام کرتی ہیں۔ بچوں کے نام چھ روز کے بعد رکھتی ہیں اور سب سے پہلے بچہ کو کسی مزار یا مندر میں اپنے اپنے مذہبی اصول کے مطابق بچہ کی دادی وغیرہ لے جاتی ہے زچہ سے سب چھوت مانتے ہیں۔ جاپانی عورتوں کے بچے کو جب رشتہ دار تحائف دیتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ایک سفید کتا جس کی آنکھیں چمکدار اور دم مڑی ہوئی ہو اور کان بڑے بڑے ہوں تحفہ میں دیں۔ وہ یہ وہم یا عقیدت رکھتے ہیں کہ کتا راتوں کو بچہ کی حفاظت کرے گا۔ اسی خیال سے وہ اُس کتے کو سرہانے رکھتے ہیں کہ جو کوئی جن، بھوت، پری یا ڈراؤنے خواب آتے ہیں، کتا اُن کو نگل جاتا ہے۔ جاپانی عورتیں سال بھر تک اپنے بچے کو چلنے نہیں دیتیں۔ اگر بچہ کوشش کرے تو روکتی ہیں تو . . . . . . یہاں تک کہ باندھ دیتی ہیں اور بچہ جب تک "فش" یعنی مچھلی کا لفظ اپنی زبان سے نہ کہہ سکے جب تک اُس کو مچھلی نہیں کھلاتیں۔ بچوں کے کپڑے آسمان کے نیچے نہیں سکھلاتیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ فضا میں اُن عورتوں کے بھوت پرندوں کی شکل میں ہوتے ہیں جو زچگی کی حالت میں مر چکی ہیں۔ اگر وہ غلطی سے کوئی کپڑا باہر سکھا لیں تو اس پر چند قطرے خون کے چھڑکنے کے بعد استعمال کرتی ہیں۔ وہ بچہ کو ہاتھوں پر نہیں لیتیں بلکہ پیٹ سے باندھ کر کام کرتی رہتی ہیں۔ اس سے اُن کو کام کرنے میں آزادی رہتی ہے۔ جاپانی عورتوں کے توہم اور بے بنیاد عقائد کی فہرست لکھنے کے بعد ضروری ہے کہ کچھ تعلیمی حالت بھی لکھوں:-

جاپانی عورتوں میں اب تعلیم عام ہوگئی ہے۔ جاپان کے ہر ایک کے گاؤں میں بھی پڑھنے لکھنے کا کافی ذوق و شوق ہے۔ مارچ ۱۹۳۳ء میں جاپان

میں ۴۷۹۳ تعلیمی ادارے تھے اور طلبا کی کل تعداد ۱۴۴۰۸۹۷
تھی۔ بچوں کی تعلیمی عمر چھ اور چودہ سال کے درمیان مقرر ہے۔ وہ بچے
جو دماغی یا جسمانی کمزوری کی وجہ سے معذور ہیں تعلیم سے مستثنیٰ ہیں۔
۱۹۱۰ء تعلیم پانے کے بچوں کی مدرسہ میں شرکت ۹۸ فی صدی اوسط
[illegible] تھی۔ ان میں [illegible] لڑکے تھے اور [illegible] لڑکیاں
[illegible] حاصل نہیں
[illegible] حصہ دیا
[illegible] ترقی کی دریا
[illegible] لڑکیوں کو تمام گھر کے
[illegible] ادارے
[illegible] دستکاری
[illegible]
اسکولوں میں خاص [illegible]
دیتی ہیں "کنڈر گارڈن" میں بچیوں کی اور بچوں کی عمریں چار اور چھ سال

کے درمیان ہوتی ہیں۔

اسکولوں کی تمام لڑکیاں ایک قسم کا لباس پہنتی ہیں اور اُن کا لباس انگریزی وضع کا ہوتا ہے اور بال کٹے ہوئے ہوتے ہیں

جاپان کا نسوانی مدرسہ ۱۹۰۱ء میں پہلے پہل قائم ہوا تھا اس کی پریسیڈنٹ اب مسز ہامیڈا نیو ہیں۔ گزشتہ تیس سال میں اس مدرسہ سے پانچ ہزار طالبات نے تعلیم سے فراغت پائی ہے

جاپانی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تعلیم کو امکان کی حد تک عام کر دیا جائے تاکہ لڑکیاں پیچھے نہ رہیں۔ یہاں تک کہ اندھی بہری گونگی اور ایسی تمام معذور لڑکیوں کے لئے درس گاہیں قائم ہیں

حسن و معصومیت میں بھی جاپانی عورتیں کم نہیں ہیں۔ بھولپن کی تو تنہا مالک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے جاپانی عورتوں کا سڈول جسم اور بھولا سا چہرہ بہت ہی پسند ہے۔ مسکراہٹ، سادگی اور بھولپن پر قربان ہوتی رہتی ہوں۔

۱۴

سروش

کرن اُمید کی نایاب ہوئی جاتی ہے
ہر سحر شام سے بیتاب ہوئی جاتی ہے

خوابِ الفت کی جو تعبیر نظر آتی تھی
اب وہ تعبیر بھی اک خواب ہوئی جاتی ہے

قلزمِ عشق کی اللہ رے طوفاں خیزی
زندگی چشمۂ پایاب ہوئی جاتی ہے

اُف، وہ طوفان کہ اُمڈا ہی چلا آتا ہے
اُف، وہ کشتی کہ تہِ آب ہوئی جاتی ہے

ڈوبی جاتی ہے مجھے مرے دل کی اُمنگ
یہ ہے وہ موج کہ گرداب ہوئی جاتی ہے

ہنس دیا کون اُلٹ کر رخِ رنگیں سے نقاب
پانی پانی جو مئے ناب ہوئی جاتی ہے

عسکری طباطبائی بی۔ اے
ایشیا

ہندوستان کی اہمیت

اب تک ہم یا دوسرے لوگ ہندوستان کو نظر انداز کرتے رہے ہیں تو خیر، یہ ہماری بے بصری اور دوسروں کا عدم تدبر ہے لیکن وقت کی رفتار یہ ثابت کردے گی کہ آج ہندوستان کی اہمیت کو سمجھنا کس قدر ضروری ہے ——!؟

قانونِ قدرت کے مطابق جس درجہ پر آج ہندوستان پہونچ گیا ہے اور وہ جس حل (Evolution) کا نتیجہ ہے ہمیں اُسے یعنی ہندوستان کی اصل روح کو سمجھنا ہے۔

اصل نکتہ یہ ہے کہ جس حل کے ماتحت وہ وضع و ترتیب ہوا ہے اور جس کے نتیجہ کے طور پر وہ آج ثابت و قائم ہے اور ہندوستان کی جو پوزیشن ہے اس کی وجہ سے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے حد درجہ اہمیت رکھتا ہے

آیئے ہندوستان کے اس حل، اس پوزیشن اور اس نوعیت کو ذرا وضاحت سے آپ کو بتائیں

دنیا بظاہر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ بری اور بحری، اس تقسیم بری اور بحری کے بعد میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ تمام بری اور بحری دنیا کے تعلقات تخت دہلی (ہند) کے ساتھ کیا ہیں:-

مذاہب

بری { ہندوؤں کا مرکز مذہبی - برج متھرا اس کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ
مسلمانوں کا مکہ مدینہ اس کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ

بحری { انگریزوں کا مرکز مذہبی بیت المقدس اس کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ

مذہبی مرکزوں کی طرح بری و بحری حکومتوں کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

حکومتیں

بری { پہلا راج، ہندو قوموں کا تسلط اور اس کا ربط تخت دہلی ہند کے ساتھ
دوئم فاتح: قوام مسلمان اور ان کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ

بحری { قابض حال تخت دہلی عیسائی قوم اور اس کا تعلق تخت دہلی ہند کے ساتھ تھا

اس تفصیل سے آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ہندوستان کو تمام دنیا کا میدانِ عمل مقرر کیا گیا۔ گھر گھرست میں ہندو قومیں سب سے اوّل تھیں اور تمام دنیا کا تعلق انھیں سے کرایا گیا۔ ہندو قوموں نے اپنا گھر نہیں چھوڑا۔ ہندو یہاں کے باسی، مسلمان فاتح اور عیسائی قابض ہیں۔ یعنی تمام دنیا کا مارک سینٹر (نشانِ مرکز) دہلی ہند کے ساتھ ہے۔

جزئیات سے قطع نظر یہ تسلیم کر لینا پڑے گا کہ جملہ تحقیقات جو دنیا میں ہوئیں وہ ہندوستان میں جذب ہو کر اس کا جزو لاینفک بن گئیں اور "ہم" اس کے حل ہی کا نتیجہ ہیں۔

بری مشرق، ہندو قوموں کی اخلاقی، سیاسی، سماجی اور ادبی عالمانہ و حکیمانہ تحقیقات، مسلمانوں کی تمام تحقیقات اور انگریزوں کی تمام سائنٹفک تحقیقات کے پھیلاؤ کا میدان ہندوستان بنا ہے۔ یعنی مشرق و مغرب کی صدیوں کی علمی و تمدنی جد و جہد کے عناصر ہندوستان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہیں۔ دوسری اقوام مشرق کے علاوہ انگریزوں کی حکومت میں ایک دورِ عقل ہندوستان میں شروع ہوا اور اس نے ترقی کی۔

ہندوستان کی اہمیت اور تقدیس نہ پوچھئے۔ یہ جملہ ایشیائی مذاہب کا مرکز ہے۔ یورپ نے ایک نیا اصولِ سائنس ہندوستان کو ودیعت کیا اور اہلِ یورپ بھی اس کی آغوش میں آگئے۔

اہلِ ہند کا تعلق پہلے مسلمانوں سے ہوا جو اپنا مذہب، اپنا کچھ اور ایرانی و عربی مخلوط تمدن لے کر ہندوستان کی سرزمین جنت نشان میں داخل ہوتے۔ اس زمانے سے بحری اقوام کی آمد بھی شروع ہوئی تجارتی تعلقات اور اختلاط تمدن نے ایک دوسرے کو مربوط کر دیا۔

اور ایک شاندار وسیع المرتبت برِّ اعظم میں اُن تمام خصوصیتوں کا اجتماع ہو گیا جو دنیا کے مختلف گوشوں میں الگ بکھری ہوئی پڑی تھیں

تو ثابت ہوا کہ آج ہندوستان تمام برّی اور بحری دنیا کے تعلقات کو امیز و حامل ہے، مشرق و مغرب سے اثر پذیر ہے اور مشرق و مغرب کی تہذیب و تمدن ہندوستان کی تہذیب و تمدن میں حل ہو چکی ہے۔

یہ حل ایک عظیم الشان تمدن کے وضع و ترتیب کی خوش آئندہ اساس ہے اور نوید ہے اُس شاندار مستقبل کی جو قدرت اور ہندوستان کی طرف سے ہندوستان کو ودیعت ہونے والا ہے۔

آج ایک ہندوستان، کس قدر مکمل، کس قدر بہتر اور لاثانی عقل و خرد کا نمونہ ہے

ہندوستان بحری اور برّی دنیا ہے اور خود برّی اور بحری دنیا کا نتیجہ اس طرح تمام ہندوستان تمام دنیا کے حل کا نتیجہ ہے۔ اور اس لئے پردۂ عالم پر ہندوستان ہی ایک ایسا مکمل ملک ہے جس کو آئیڈیل مکمل ملک کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان والے غیر شعوری طور پر ہمہ داں بنے رہے۔ ہر تحقیق کی شاخ، تہذیب و تمدن، میل جول، اور ہر قسم کے بیرونی تعلقات ان کی زندگی کا نہ فنا ہونے والا جزو ہو گئے اور وہ مکمل ہوتے رہے۔ اور آج وہ زمانہ ہے کہ ہم تمام اقوامِ عالم سے مکمل ہو گئے۔

قانونِ قدرت کا عمل ہی اس طرح ہوا ہے کہ حل ہوتے ہوتے آج برّی اور بحری ایک جگہ جمع ہو گئے اور ہندوستان بہرحال مکمل ہو گیا۔

آج اہلِ ہند ہر طرح سے مکمل ہیں اور اُن کی صفات تکمیل شدہ حُسن رکھتی ہیں۔

ہندوستان کو غلط سمجھا گیا ——!!

آج اگر (انگریز) ہندوستانیوں کو اس نگاہ سے دیکھتے ہیں یہ ہمارے موجودہ ماحول کا ردِّ عمل (   ) اور اثر ہے اور یہی اثر ہمارے خیالات کے سمجھنے اور قبول کرنے میں بھی غیر شعوری جھجک پیدا کرتا ہے۔

ہندوؤں کے تعلقات، مسلمانوں کا اثر، اور انگریزوں کی تعلیم، ان سب کا نتیجہ ہم ہیں۔ ہندوستان تمام دنیا کا مرکز ہے اور تمام دنیا کی جدوجہد کا اسٹیج بھی رہ چکا ہے۔ کون ہے جو ان حقائق سے انکار کرنے کی جرأت کرے!؟

کیا ہندوؤں کا تعلق ان کی تمام ازلی خصوصیاتِ حکیمانہ کے ساتھ اس سرزمین عرفان سے نہیں ہے۔ کیا بحری قومیں اس کے ساحل پر نہیں اُتریں، اور کیا برّی اقوام نے بھی اس کی آغوش میں پناہ نہیں لی!؟

اور کیا ان سب کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہوا —— !؟

ہوا اور ضرور ہوا۔ آج نتیجہ میں ہمارا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

کیونکہ ہم برّی اور بحری اقوام کے تعلقات کا نتیجہ ہیں۔ رہے دوسرے، وہ صرف ایک خط، ایک قسم کی تہذیب اور تحقیقات کی صرف ایک شاخ کے سانچے میں ڈھلے ہیں لیکن ہم —— ہم، ہمہ گیر، اور عالمگیر تعلقات کے حل کے سانچے میں ڈھلے ہیں، اور اس سے ہماری زبردست اہمیت مصدق ہے۔

جس حل کے ماتحت ہندوستان سفر کرتا رہا ہے وہ ایسا ہے کہ ہر تہذیب و تمدن تحقیقات کی ہر شاخ، اہم مذاہب، حکومتوں اور قوموں کا سایہ اُس پر پڑتا رہا ہے اور وہ ہندوستان میں جذب ہو کر ایک یادگار تشکیل اختیار کر گیا ہے۔

اچھا کیا تمام مذاہب کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہے؟

اور کیا برّی و بحری حکومتوں کا تعلق اس سے نہیں ہوتا رہا ہے اور تحقیقات کی ہر شاخ یہاں پہنچ کر ہم میں حل ہو گئی ہے۔ ہندو، مسلمان، انگریز تینوں کی تحقیقات کے میدان ہندوستان کے وسیع دامنِ عرفان میں جذب ہو گئے۔

ہم کس سے اثر پذیر نہیں ہوئے۔ ہماری تہذیب میں کونسا خام پہلو ہے، !؟

انگریزوں میں صرف ایک تہذیب کا پہلو ہے، اسی طرح دوسروں کی تہذیب کا بھی صرف ایک پہلو ——!؟

لیکن آج ہم ہر ایک اہم پہلو کے حل کا نتیجہ ہیں ہم تمام اہم پہلوؤں کو جذب کر چکے ہیں۔ ہندو، مسلمان اور عیسائیوں کی تحقیقات اور تہذیب کے پہلو، ان سب سے مل کر ہم بنے ہیں۔ کوئی کس طرح ہمارے درجہ پر آ سکتا ہے

کیا ترک، یا انگریز، یا چینی، یا جاپانی !؟

کوئی نہیں —— ہم "کُل" کی حیثیت رکھتے ہیں اور انگریز جزو کی، وہ صرف

علمی میدان کا نتیجہ ہیں اور ہم روحانی امانتوں کے امین ہیں۔

ہم انگریزوں کا اہم سرمایہ جذب کرچکے ہیں اور اس طرح انگریز ایک جزو ہیں اور ہم میں جذب ہوچکے ہیں وہ ہمارے پایہ پر کس طرح آسکتے ہیں۔ اس طرح ترک صرف ایک جزو کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم مسلمانوں کو جذب کرچکے ہیں غلط دعویٰ نہیں، ہم کل کی حیثیت رکھتے ہیں ہمارے مقابلے میں کوئی تکمیل کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

آج ہر ہندوستانی کل دنیا کا مکمل باشندہ ہے۔ غیر شعوری طور پر ہندوستان ہر بے پایاں ہے، ہمہ گیر ہے، عالمگیر ہے، اور مکمل صلاحیتوں کا حامل ہے۔

آج قانونِ قدرت نے ہندوستان کو عمل کرتے کرتے دنیا کا مکمل بنا دیا ہے۔

یعنی تمام دنیا میں ہندوستان ہی مکمل ملک ہے۔

یہ ہے قانونِ قدرت کے عمل کا نتیجہ

یہ حقیقت ہے اور حقیقت کو ہمیشہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں کی طرح قانونِ قدرت کے عمل کے مطابق جس درجہ پر آج ہندوستان پہنچ گیا ہے وہ دنیا اور تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

مرزا ارشاد احمد بیگ چغتائی

عندلیب کا پیام

(از ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی - ایم اے - پی - ایچ - ڈی)

مائی ڈیر ساغر! کل شام ایشیا ملا۔ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ صورت بھی اچھی، سیرت بھی اچھی، اس میں آنکھوں کے لئے راحت اور دل کے لئے سکون ہے، اور میرے لئے اس سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ آپ کی دل نوازی تھی تو اپنے ساتھ لایا ہے۔ خدا اسے رہتی دنیا تک زندہ رکھے، خوشحالی اور کامرانی کے ساتھ۔

"تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام" پر آپ کا تبصرہ دیکھا۔ بڑے سلیقہ سے آپ نے انتقاد کیا ہے اور بڑے مزے مزے کی چٹکیاں لی ہیں۔ پڑھ کر لطف آگیا۔ مولانا کی یہ جدت واقعی قابل داد ہے کہ حضرت عیسیٰ، رسول صلعم کے صاحبزادے ہیں ع۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

کیوں صاحب پٹنہ سے واپسی پر ملاقات کا وعدہ تو خوب وفا کیا۔ ہم آخر وقت تک راہ ہی دیکھتے رہے۔ اچھا اب اکتوبر میں یہ دین مع سود آپ کو ادا کرنا ہوگا۔

ہاں یہ .... کون ہیں؟ کیا .... سچ مچ انہیں کا لکھا ہوا ہے جیسا بیت میں تو کوئی ندرت نہیں مگر عبارت کی پختگی غمازی کر رہی ہے، اچھا خدا حافظ۔ کیف صاحب کو میرا اسلام پہونچے اور یہ شعر ؎

کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب، ایسا ہی منظر تھا
نہ پوچھو آہ کیا یاد آگیا تاروں کی جھلمل سے

(ممنونِ التفات) **عندلیب شادانی**

ایشیا

فلک پیما کی رسائیاں

خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب "فلک پیما" بار ایٹ لا کا مکتوب

ڈیئر ساغر صاحب۔ تسلیم

منادی، مورخہ ۲۴ اپریل میں آپ کی نظم "سرورِ عالم" کے ایک مصرع نے بہت لطف دیا " پیکرِ خاکی میں داخل ہو گیا نورِ ازل"

ایک نکتہ چیں (اہلِ ہنود میں سے) مجھ سے کسی موقع پر خواہ مخواہ اُلجھ گئے۔ اقبالؔ کا شعر ؎ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں، پڑھ کر فرمانے لگے کہ اقبالؔ ہی تو (Incarnation) کے آرزومند تھے، جو یہ آرزو نہ ہوتی تو کیوں یہ شعر لکھتے۔ خدائے نادیدہ کے لیے تو اُن کے پاس گنتی کے چند سجدے تھے۔ مگر جو خدائے نادیدہ کہیں لباسِ مجاز میں نظر آجاتا تو حضرت اقبالؔ ہزاروں سجدے پیش کر دیتے، پیش کیا سجدے موجود تھے خدا موجود نہ تھا۔ یا کم از کم ایسی صورت میں موجود نہ تھا کہ تڑپنے والے (رسمی شرعی سجدے سے) سجدوں سے اُس کی پرستش ہوتی۔ ان نکتہ چیں حضرت کو آپ کے مصرع سے (Incarnation) کا پورا ثبوت بھی مل جائیگا۔ کرشن کے اوتار ہونے میں اب کوئی مسلمان کس منہ سے اعتراض کرے گا؟ قادیان کے مرزا نے تو کرشن جی کو صرف نبوّت کے لگ بھگ رتبہ دیا تھا۔ مگر جو خدا اوتاروں سے کام لیتا ہے تو کیا ہند کیا عرب سبھی جگہ اوتار ہوں گے (Incarnation) میں تو ضرور ہی ہوں گے یا نہ ہوں گے۔ اسی نورِ ازل کو نظم کے خاتمہ پر آپ نے ایک زبردست دعوت بھی دے دی۔ چاہے جس صورت میں آ، اور چاہے جس پیکر میں آ، آ خدا کے واسطے اس ظلم کے محشر میں آ، یعنی اوتار ہوں، اوتاروں کا تواتر ہو، اوتاروں کا ظہور اگر جاہلیت اور ظلم کے زمانوں کے لئے مخصوص ہے تو ظالم اور جاہلوں کا خدا پر بڑا احسان ہے کہ اسے لباسِ مجاز میں نظر آنے کا موقع دیتے ہیں۔ خوش عقیدہ مسلمان جب حضرت اقبالؔ کا یہ شعر لہرا لہرا کر گاتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی ہے مگر اب آپ کی سند اُن کو مل گئی تو میری ہنسی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

اعتراض ہرگز نہیں کر رہا۔ وہ احساسِ خودی جسے آپ روحِ زندگی سمجھ کر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چند لفظ لکھوانے پر مجبور کر رہا ہے۔

"فلک پیما"

مکرر یہ کہ تناسخ کے متعلق تو اہلِ ہنود کے پاس مولانا رومی کی سند پہلے سے موجود ہے۔ یعنی ؎ ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم۔ ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ایم۔ صرف اوتاروں کے متعلق تیج پنتی کیا کرتے تھے۔ سو اقبالؔ اور ساغرؔ دو مفتی موجود ہو گئے۔ اہلِ ہنود کا خدا ضرور بہروپیا سا تھا۔ یعنی برہم اور شو اور کیا اور کیا۔ اب مسلمانوں کا خدا بھی کایا پلٹ ہونے لگا تو بے انتہا ترقی کی گنجائش ہے۔ میں وہابی نہیں ہوں۔ شرک سے نہیں ڈرتا۔ مگر خدا کو خاک آلودہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

غنائی شاعری اور مصحفی

شعر ارسطو کے نزدیک منشائے خیال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ سوانح اور تاریخ کسی ایک فرد کا کیرکٹر اور اصلی واقعہ پیش کرتی ہے۔ شعر مناظر فطرت اور مقاصد حیات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ لیکن اس میں ادراکات کی توضیح تخیل اور تصور کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ راستی اور سچائی گو سوانح اور تاریخ کا جزو لاینفک ہیں۔ تو "حسن و عشق" شاعری کی جان ہے۔ بکین ———— نے یوں کہا ہے

ایک فلسفی کا مقولہ ہے۔ کہ "شاعری انسان کی اُس فطری خواہش کا نتیجہ ہے، کہ چیزوں کو وہ دیکھے یا سنے اُن کو اپنے طور پر پیش کرے یا جو خیالات اور جذبات اس کے دل میں موجزن ہوں، ان کو ظاہر کرے۔"

مذکورہ بالا خیال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے علماء نے شاعری کی دو بڑی قسمیں بتائی ہیں۔ پہلی قسم کی شاعری "خارجی" کہلاتی ہے۔ اور دوسری قسم کو "داخلی" کہتے ہیں۔

پہلی قسم شاعری کی وہ ہے۔ جس میں شاعر اپنے موضوعات اور الہامات کی تلاش خود اپنی ذات یعنی اپنے تجربات، خیالات اور جذبات کی اندر کرتا ہے۔ ایسی شاعری شخصی، ذاتی یا داخلی کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس میں شعری تحریکات شاعر کو اپنے ہی اندر دستیاب ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں شاعر اپنی ذات سے ہٹ کر اپنے اطراف کی وسیع کائنات پر نظر ڈالتا ہے۔ اور اپنے کلام میں ذاتی احساسات اور جذبات کو بہت کم داخل کرتا ہے۔ یہاں ہمیں شاعری کی دوسری قسم سے بحث ہے۔

شاعری کی اس نوع (داخلی شاعری) کو انگریزی میں "لی رک" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جو عموماً موسیقی اور رقص کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر حسن و عشق کے جذبات اور قلبی واردات کا بیان ہوتا ہے۔

عبدالقادر صاحب سروری "لی رک" کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:-

"لی ریکل شاعری عموماً زیادہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ پُرجوش جذبات اس کے ماخذ ہیں۔ اسی لئے یہ فطرتِ انسانی کے جذباتی پہلو سے زیادہ واسطہ رکھتی ہے، استدلال اور تفکر کو متاثر کرنا اس طرح کی شاعری کا کام نہیں۔"

لی ریکل شاعری — گیت — جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے رقص و سرود کی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔ شاعر رقص و نغمہ کو "لی رک" کے لوازمات نہ سمجھ کر بھی اشعار لکھے۔ مگر جب تک اس میں سچے جذبات، سادگی اور رنگینی موجود ہے۔ وہ ہر طرح سے موسیقیانہ شاعری کہلانے کی مستحق ہے۔ ایک اچھا نغمہ نگار جو ساز کے تاروں کے ساتھ نہ گونجے اور خاموشی ہی میں پڑھا جائے، پڑھنے والے کے دماغ اور تصور میں ناچتا اور گاتا ہے۔

پالگریو ———— نے "لی رک" کی یوں تعریف کی ہے:-

"ایک خیال کا ایک جذبہ کے ماتحت کسی ایک موقع یا محل پر سلاست اور روانی کے ساتھ بیان کر دینا۔"

چونکہ تاثر اور جذبہ کی کیفیت شاعر پر زیادہ عرصہ تک طاری نہیں رہتی، اس لئے "لی رک" عام طور سے مختصر اور چھوٹی ہوتی ہیں۔ "لی رک" کے موضوعات عام طور پر ایسے ہوتے ہیں۔ جو فوراً دل و دماغ پر ایک کیف اور بیخودی کی حالت طاری کر دیں، لہٰذا اس میں عموماً عشق و محبت، شراب، مستی و مدہوشی، مذہب اور ہجر کی کارفرمائیاں پیش کی جاتی ہیں۔ "وفورِ شوق، جوشِ غم" اور "عشق و موت" سے موسیقیانہ شاعری مملو ہے۔ ایک اردو شاعر نے ان تمام موضوعات کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے

ہوائیں رقص کرتی ہیں گھٹائیں دھویں کا سر پہ یا دل چھا رہا ہے

پرندے چہچہاتے ہیں کچھ۔ ایسے کہ سننے والوں کو وجد آ رہا ہے
وہ حالت ہے کہ ہر ذرہ پہ ہر دم سرور جاودانی چھا رہا ہے
مگر غمگیں ہوں میں سینے سے میں مرے سینے میں دل گھبرا رہا ہے
بہت بے چین ہے میری طبیعت کوئی رہ رہ کے پھر یاد آ رہا ہے

الٰہی وہ بھی میرے پاس ہوتا
مجھے غم جس کا کھائے جا رہا ہے

اردو میں "لی رک" کے لئے کوئی خاص صنف نہیں۔ صرف غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جو کسی حد تک "لی رک" کے موضوعات اور لوازمات کی حامل کہی جا سکتی ہے۔ غزل ابتدائے آفرینش سے اب تک رقص و سرود کی محفلوں کی دولہن بنی رہی ہے۔ چنانچہ قدما میں میر، سودا، درد، مصحفی، آتش، نسیم اور متاخرین میں ذوق، غالب، مومن، شیفتہ، داغ اور دور حاضر میں فانی، اصغر، جگر، حسرت، سیماب ساغر وغیرہ کی غزلیں نغمات سرمدی بن بنکر بلند ہوتی ہیں۔ غزل گوئی "لی رک" کہلائے جانے کی مستحق ہے مگر خارجی واقعات کو داخل کر لینے سے یہ بات جاتی رہتی ہے۔ لیکن پھر بھی غزل کو "لی رک" کہنا بے جا نہیں، جہاں تک اس کا تعلق شاعرانہ جذبات، صداقت شعاری، حسن و صفائی، بیان درد، اثر، جوش اور سوز و گداز سے ہے۔

بدلہ ہوا دور شاعری نے شاعری کے دامن کو اور وسیع کر دیا ہے؟ اور اب غزل ان تمام آلودگیوں سے پاک صاف نظر آتی ہے۔ فی زمانہ اس میں خارجی واقعات مفقود نظر آتے ہیں۔ اور غزل اب تمام و کمال داخلی جذبات اور واردات قلبی کا جھلکتا ہوا آئینہ بن رہی ہے۔ علاوہ اس کے سانیٹ اور چھوٹی چھوٹی موسیقیانہ نظمیں بھی لکھی جانے لگی ہیں۔ جو شخصی اور ذاتی جذبات کا آئینہ ہونے کی وجہ سے تیر و سناں بنکر قلب و روح کو برما رہی ہیں۔ خیر یہ تو تھا جملۂ معترضہ، کیونکہ ہمیں ثابت یہ کرنا ہے۔ کہ مصحفی نے موسیقیانہ .... شاعری کے ان اصولوں کو کہاں تک نبھایا ہے۔

مصحفی نے خود کہا ہے کہ "والحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش یاد می رود"۔ مل کے نزدیک شاعری "عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ تھا"۔ لیکن میں کہونگا۔ کہ شاعری میں خصوصاً موسیقیانہ شاعری "عزلت گزینی اور گوشہ نشینی کا نتیجہ ہے"۔ کیونکہ شاعری کی یہ صنف ذاتی محسوسات، جذبات اور قلبی واردات سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جو تنہائی اور خاموشی ہی میں کچھ طرح محسوس ہوتی ہیں۔ اور صاحب جس کے دل و دماغ پر مدہوشی اور کیف بنکر چھا جاتی ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے۔ کہ ایک سچا اور حقیقی شاعر کبھی دنیا اور دنیا والوں میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایسی دنیا کی سیر کرتا ہے۔ جہاں سکوت ہو، جہاں فردوس میں فطرت انگڑائیاں لے رہی ہو۔ جہاں نرگس اور گلاب کے شگفتہ پھولوں کی نازک پتیاں سبزا ور مخملی گھاس پر اتنی آہستگی سے گرتی ہوں، جیسے روح پر نغمے کی مستی۔ ایک حقیقی شاعر کی دنیا اتنی رنگین ہوتی ہے ؎

مری دنیا شراب شعر سے مدہوش دنیا ہے
جوانی کے بہارستان میں آوارہ پھرتا ہوں
میں اس خلد طرب میں مے کش نظارہ رہتا ہوں
مری دنیا بہار و کیف سے گل پوش دنیا ہے
مری دنیا میں عیش سرمدی کے پھول کھلتے ہیں
مرا ہر پھول رشک جنت کشمیر ہے گویا
مرا ہر باغ، باغ خلد کی تصویر ہے گویا
جہاں رنگینیوں کی گود میں دن رات پلتے ہیں
فرشتوں کی طرح میں کھیلتا رہتا ہوں پھولوں سے
مجھے دن رات حوریں سحر زا نغمے سناتی ہیں
میں سوتا ہوں تو اپنی گود میں مجھکو سلاتی ہیں
میں جھولے جھولتا ہوں رات دن خوابوں کے جھولوں میں!
کبھی تم کو بھی اس دنیائے عشرت میں بلاؤں گا
تمھیں بھی ان گلستانوں کا نظارہ کراؤں گا

مصحفی صرف شعر کہنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی شعر و شاعری میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔ نواب شاہ نجف کے زمانے میں دلی قیام تھا۔ فارغ البالی تھی، خودداری تھی۔ لہذا اشعار اثر اور جوش میں ڈوبے ہوئے نکلتے تھے۔ آخر دلی تباہ ہوئی اور مصحفی جیسا صاحب کمال ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوا مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوا۔ کاہش و کاوش کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی۔ چند روز بعد ان کے مسلم الثبوت استاد ہونے کا چرچا ہر خاص و عام میں ہونے لگا۔ حکیم سید عبدالحی صاحب گل رعنا میں فرماتے ہیں:۔
ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی، ان

کلام میں کہیں میر کا درد ہے۔ کہیں سودا کا انداز، کہیں سوز کی سادگی، اور جہاں کہیں ان کی کہنہ مشقی اور اُستادی اپنے پیشرو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے تو وہ اُردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی کی رائے ہے کہ "میر اور مرزا کے بعد کوئی اُستاد ان کے مقابلے میں نہیں پہنچتا، اور یہ اپنے ہمعصروں میں سب سے برتر اور فائق نظر آتے ہیں۔" مولانا آزاد نے بھی آبحیات میں اسکو تسلیم کیا ہے کہ:۔

"یہ اُصول فن سے بال برابر بھی نہ سرکتے تھے، کلام پر قدرت کامل پائی تھی۔ الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس دروبست سے شعر میں کھپاتے تھے، کہ جو حق اُستادی کا ہے ادا ہو جاتا ہے۔ ساتھ اس کے اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، ایسے موقع پر کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے، جہاں سادگی ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں۔"

میر، درد اور اثر کی شاعری ہر طرح سے موسیقیانہ اور "لی ریکل" ہے شروع شروع میں مصحفی نے بھی انھیں شعراء کا اتباع کیا، مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ شاعری فقراء و صوفیہ کی خانقاہوں سے نکلکر عام طور پر امراء و سلاطین کے درباروں میں آگئی تھی، اور اس انقلاب نے اُردو شاعری پر گراں اثرات ڈالے، اخلاق خراب ہو گئے، شاعری میں تصنع اور بناوٹ شامل ہو گئی۔ اور شاعری صرف اُمراء اور نوابین کی خوشامد کا ذریعہ ہو کر رہ گئی۔ مصحفی کے کلام میں بھی تغیر رونما ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال ہے کہ:۔

"جو شاعر دربار شاہی میں قدم رکھتا ہے۔ اس کو لازمی طور پر حقیقی اور ذاتی شاعری کے اوصاف سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے ان کی شاعری درد، اثر، جوش اور سوز و گداز سے تہی دامن ہو جاتی ہے۔"

مصحفی بھی اب ایک درباری شاعر تھے۔ انشا سے برابر نوک جھوک اور شاعرانہ مناظرے جاری تھے، لہٰذا ذاتیات میں پڑ کر شاعری کی وہ رُوح جو موسیقیانہ شاعری کی جان ہے۔ ان میں باطل مفقود ہو گئی تھی۔ اس اثنا میں انکی تنخواہ میں تخفیف ہو گئی۔ اور وہ دل برداشتہ ہو کر عزلت گزیں ہو گئے۔ یہی زمانہ ان کی شاعری کے شباب اور ترقی کلام کا تھا۔ ان کا کلام سوز و ساز کی بولتی تصویر، درد و جوش کی شاندار آگینی ہوتی تھی، سادگی شریفانہ، ذاتی احساسات حسن و عشق کی داستان، اور جوش جو موسیقیانہ شاعری کی جان ہیں۔ سب کچھ ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری وہی صحیح اور غیر فانی ہوتی ہے۔ جو درد بھری ہو۔ چونکہ اب مصحفی دل برداشتہ اور دل گرفتہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا ان کے دل کے تاروں سے درد بھرے نغمات ہی نکلتے تھے اور تاثرات اور سادگی میں ڈوبے ہوتے تھے، اس زمانے میں رنج و غم، گریہ و ماتم مصحفی کی شاعری کے خاص موضوعات تھے، اور جن کو وہ گونا گوں رنگوں میں ادا کرتے تھے، یہ اشعار صرف ظاہری نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ان میں ان کے آنسوؤں کی سُرخی اور خون جگر کی گرمی بھی شامل ہوتی تھی۔ اور یہی وہ باتیں ہیں۔ جو انھیں ایک امتیازی "لی ریکل" شاعر بناتی ہیں۔ اس طرح کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شام ہی سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہے گویا چراغ مفلس کا
درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط — یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا
افتادگانِ وادیٔ غربت کی سرگذشت — کرتا ہے خود بیاں لبِ غارِ دش نقش پا
فلک گر ہنستا تا ہے مجھ پر کسی کو — میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں
غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی — کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی
کُنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر — فصلِ بہار باغ میں دھوم مچا گئی
ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی — کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی
پڑا ہوں شاخ سے گر کر میں برگ زرد کی صورت — خدا جانے کہاں لے جائے اب باد خزاں مجھکو

پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اشعار ایک بڑھتی ہوئی لہر ہیں۔ جو ہمارے جذبات سے مس ہو کر ہمارے چہرے پر شادی و غم کے آثار نمایاں کر دیتے ہیں۔ دل کے تاروں میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے۔ شعر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خود سوہنی کے مدھم سروں میں اشعار گنگنا رہا ہے۔ گو حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

میرے نزدیک شاعر، خواہ وہ کسی مرتبہ کا بھی ہو، اس وقت تک ایک سچا اور حقیقی "لی ریکل" شاعر نہیں کہا جا سکتا، جبتک اسکے کلام کے اندر اُسکے خونِ دل کی سُرخی نہ جھلکتی ہو، اور اسکے الفاظ سے اس کے پوشیدہ دلی جذبات اور احساسات نمایاں نظر آتے ہوں، حسب ذیل اشعار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے ؎

نہ وہ راتیں، نہ وہ باتیں، نہ وہ قصہ کہانی ہے
سر بستر فقط ہم یا ہماری ناتوانی ہے

مختصر سے شعر میں جوانی اور ایام گذشتہ کی باتوں کو نہایت خوبی اور
خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ یقیناً شعر ایک مکمل داستان ہے۔ یاس و ناامیدی
کی ایک کہانی ہے۔ حسرت و ارمان سے مملو۔

دو گیا کوئی عدم کو دل شاداں لیکر — جو گیا یاں سے گیا حسرت و ارماں لیکر
کس قدر شاد ہوا کرتی ہے جی ہی جی میں — تیری آنکھوں کی بلائیں تری مژگاں لیکر
باغ وہ دشت جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے — لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لیکر

مصحفی گوشۂ عزلت کو سمجھ تخت شہی
کیا کرے گا تو عبث ملک سلیماں لیکر

ہجر کے مضامین کو اس حسن و خوبی سے نظم کیا ہے ؎

نالہ جاتا ہے تا بہ عرش بریں — دو شب ہجر کی یہی معراج
کیا پوچھتے ہو ہمدم احوال مصحفی کا — راتیں اندھیریاں اور اختر شماریاں ہیں

مصحفی کے "حسن و عشق" کے جذبات کا دریا اس طرح موجیں
مارتا ہے ؎

کہتے ہیں کہ عاشق کو آتی ہے اجل جلدی — کس طرح کا آنا ہے نے صبح و نہ شام آئے
اٹھنے لگے جو وہ مری بالیں سے وقت نزع — نکلا یہی زباں سے آہستہ کیا چلے!؟
ساعت عیسویاں ہے کہ مرا دل جس میں — خود بخود ٹوٹ گئی خود بخود آواز ہوئی

جمال و منظر کی موکشی اس طرح کی ہے :-

کون آیا ہے نہانے لطف بدن کس کے — لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے

یہ میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مصحفی کی شاعری جہاں تک "لی ریکل"
شاعری سے تعلق ہے، جذبات اور قلبی واردات کا صحیح نمونہ ہے۔ اس نے بیساختہ
عشقیہ غزلیات لکھیں۔ مگر سوز و ساز کا احترام مدنظر رکھتے ہوئے وہ ہمیشہ سجدہ
نظر آتا ہے۔ اس کے اشعار نے وہ جذبات ظاہر کر دیئے ہیں۔ جو وہ خود کسی اور طرح
ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے احساسات سکون پرور ہیں اور یہ بات اس کے
مختلف اشعار سے ظاہر ہے ؎

میں تھا ہمدرد اس کا پاس جنوں کے ہی لیتا — اگر لیلیٰ کے ناقہ کا بتائے سارباں مجھ کو
نگاہوں میں بہار گل کو میں تو لوٹ لیتا ہوں — بھلا کیا رخصت سیر چمن آئے باغباں مجھکو
مت سمجھ رنگ زرد کا چرچا کر کر یا — رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

مصحفی ایک باکمال شاعر تھے، اور ان کی شاعری حقیقی معنی میں لیریکل
کہی جا سکتی ہے :-

اس تمام بحث سے ظاہر ہے۔ کہ مصحفی کا کلام ان کی طبیعت اور مزاج
کی ہو بہو تصویر ہے، یہ صرف قیاسی یا فرضی بات نہیں ہے، پڑھنے کے بعد اس
بات کا یقین ہو جاتا ہے۔ کہ ان کا ہر شعر ان کے درد دل کی تصویر ہے مصحفی کا
نہایت سادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اثر اور جوش ہے۔ در اصل
یہ ان شعرا میں نہیں جنھوں نے موزونی طبع کی وجہ سے، یا اپنا دل بہلانے کی خاطر
یا دوسروں سے تحسین سننے کیلئے شعر کہے ہیں۔ بلکہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں۔ جو ہمہ
تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے، اور جنھوں نے اپنے کمال سے موسیقیانہ شاعری کو
چمکا دیا اور زبان کو زندہ رکھا۔ شاعری مصحفی کی زندگی کا جزو تھی۔ گویا فطرت نے
انھیں اسی سانچے میں ڈھالا تھا۔ ان کا احسان اردو زبان پر تا قیامت رہے
مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری میں فرماتے ہیں۔

"یہ بات یاد رکھنی چاہئے۔ کہ دنیا میں جتنے شاعر استاد مانے گئے ہیں
جن کو استاد ماننا چاہئے۔ ان میں ایک بھی ایسا نہ نکلے گا۔ جس کا تمام کلام اول
سے آخر تک حسن و لطافت حقیقی جذبات و احساسات، موسیقیت اور ترنم کے اعلیٰ
درجہ پر واقع ہوا ہو۔ کیوں کہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہو سکتی ہے
شاعر کا معراج کمال یہ ہے کہ اس کا عام کلام ..... اور اصول کے موافق ہو اور
کہیں کہیں اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے۔ جس سے شاعری کا کمال خاص و عام
کے دلوں پر نقش ہو جائے۔ البتہ اتنی بات ہے کہ اس کے عام اشعار بھی خاص خاص
اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں، جیسا کہ اس کا
خاص کلام ہر شخص کے دل میں ہر حالت میں اثر کرتا ہے۔ اور یہ بات اسی شاعر کے کلام
میں پائی جا سکتی ہے۔ جس کا کلام سادہ اور نیچرل ہو۔"

حسب بالا سطور کو حقیقت کی نظروں سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر
مصحفی میں کچھ خامیاں تھیں تو وہ اس کی غنائی لطافت
پر کبھی پانی نہیں پھیر سکتیں

پروانہ

روس کا نظامِ تعلیم

(اشتمالی[1] تعلیم کے اصول محض علمی سیاست کے نقطۂ نگاہ سے)

"مدرسوں کو اگر سیاسیات اور زندگی کے فلسفے سے الگ کردیا جائے تو ان کی حیثیت مکاری اور ریاکاری کی تعلیم گاہوں سے زیادہ نہیں۔ لینن"

کسی ملک کا طریقۂ تعلیم اس زمانہ کے حالات اور واقعات کا نتیجہ ہوتا ہے اور زمانہ کے تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ اس میں انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ آج اسی اصول کی بنا پر ہمیں اشتراکی و اشتمالی طریقۂ تعلیم کی جانچ پڑتال کرنی ہے۔ روسی معاشیاتی طریقہ ذرا مشکل ہی سے سیاسیات سے الگ کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ نتیجہ ہے دنیا کے ان عظیم ترین اور بزرگ فلسفیوں مثلاً مارکس، اینجل (Engels) لینن اور اسٹیلن کی غور و فکر کا جن کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "ہر ایک انسان قدرتی طور پر اپنی ضروریات اور ذہن کی رسائی کے لحاظ سے علم کے حاصل کرنے کا ذوق و شوق اپنے دل میں پنہاں رکھتا ہے۔" اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کا ہر فرد اپنی آزادی حاصل کرنے کیلئے اور ملکی ترقی کیلئے اپنے ملک کے ہر فرد کو زیورِ علم سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ مارکس کے فلسفۂ مادیت کی منطق تک پہنچنے کی اسی وجہ سے (U.S.S.R) کو کافی امیدیں ہیں۔ گو اس وقت اسکے فلسفۂ منطق تک پہنچنے کی کافی منازل طے کی جاچکی ہیں اور اس کی حدِ آخری پر پہنچنے کے لئے ہر طرح کی جد و جہد جاری و ساری ہے۔

مادی منطق فلسفۂ حیات کا ایک اہم ترین عنصر ہے۔ اس سے حیاتِ انسانی کی تمام زندگی وابستہ ہے۔ اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ مثلاً سیاسیات، معاشیات، تعلیمات، آرٹ، سائنس وغیرہ، ان سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ انسانی زندگی میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ انسان بھی اپنا رنگ بدلتا جاتا ہے۔ مارکس کے خیال کے بموجب ہر اجتماعی حالت کی ترقی کے ساتھ اس کا تنزل بھی ہے اور عمرانی جد و جہد کی ترقیات میں اس کا رد بھی مضمر ہے کیونکہ انسان جب سے اس جد و جہد کے دور میں شامل ہوا ہے اس نے اپنا ماحول خود تیار کیا ہے اور اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات پر نظر ڈالکر زمانہ کی جد و جہد میں پڑا ہے۔ انسانی زندگی کے اسی نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اشتمالی اور اشتمالیت انسان کو زندگی کی اس بلند منزل پر پہنچانا چاہتے ہیں جہاں وہ غارت گری، سفاکی اور لٹیرے پن کو چھوڑ کر امن و امان کا دیوتا اعلیٰ تہذیب و تمدن کا خواہاں اجتماعی زندگی بین الاقوامیت اور انسانی مساوات اور میل ملاپ کا دلدادہ نظر آئے۔ معاشیاتی خاکہ جو اشتمالیوں کے پیش نظر ہے اس سے انہیں انسان کے مادی اور ذہنی ارتقار کی کافی امیدیں ہیں اور یہی وہ عملی نقشہ ہے جس سے ہم آج (U.S.S.R) کے تعلیماتی، معاشیاتی، اور سیاسی زندگی کے ہر دروازہ کو کھلا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص اشتمالی تعلیمات بالا میں سے کسی ایک کو علیحدہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سارا نظام منتشر ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اشتمالی تعلیمات کے ساتھ ان تینوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ اشتمالی تعلیمات اور روسی زندگی کا جزوِ عظیم بن گئے ہیں اس صورت میں ان کا علیحدہ ہونا ناممکن سی بات ہے۔ یہی نہیں بلکہ جمہوریۂ اشتراکیہ (U.S.S.R) کے کسی رُخ پر نظر ڈالئے آپ کو

[1] Communistic Education.

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

مجموعی طور پر بمقابلہ دیگر ممالک زندگی کے ہر رخ میں زمین آسمان کا فرق عظیم نظر آئے گا۔ چاہے وہ کھیل کود کا میدان ہو یا سنگتراشی کی جگہ، مقامِ صحت ہو یا تمثیل گاہ، غرض ہر شے میں آپ کو معاشیات اور انسانی سیاسیات کے فلسفہ کا ایک اکمل نمونہ نظر آئے گا۔

جمہوریۂ اشتراکیہ کے بچوں کے سامنے جو نظریات آئے دن پیش کئے جاتے ہیں اُن میں اور اُن نظریات میں جو سرمایہ دار بچوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ مجھے یہ کہیں کہ میں غیر اشتراکی اشیا میں تعصب سے کام لیتا ہوں، مگر یقین مانئے کہ اگر کسی حقیقت کے اظہار کو آپ تعصب سے تعبیر کرتے ہیں تو میں ایسا متعصب بننے کو تیار ہوں ——— دیکھئے نا! ہمارے مدارس کے بچے جب اپنی جماعتوں میں بیٹھے ہوتے ہیں اُس وقت اُن کے سامنے جن خیالات کا اعادہ کیا جاتا ہے اور جس جس طرح سے اُستاد اُن خیالات کو اُن کے سامنے پیش کرتا ہے جو نصاب تعلیم رات دن اُن کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے آپ خود ہی بتائیے کہ اس سے اُن کی مستقبل کی زندگی میں سوائے ایک زیادہ سے زیادہ چالیس روپیہ کا کلرک بننے کے اور کیا فائدہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اُستاد تو یہاں تک ستم ڈھاتے ہیں کہ بچوں کے دلوں میں شروع سے یہ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اعلیٰ گھرانوں میں پیدائش شرافت اور پاک دامنی کی دلیل ہے اور وہ بچے جو اعلیٰ گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں اُن بچوں سے جو معمولی گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں بہت افضل ہیں۔ بھلا آپ خود ہی بتائیے کہ جہاں بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے ایسے سرمایہ دارانہ خیالات بھرے جاتے ہوں وہاں سوائے کلرکوں کی پیدائش کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ لیکن اسی سلسلہ میں انگلستان کے ایک موسیقی کے مدرسہ کا واقعہ اور سُن لیجئے۔ یہ مدرسہ انگلستان کا ایک بہترین موسیقی کا مدرسہ سمجھا جاتا ہے اور اس میں موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے دور دور سے طلبا آتے ہیں۔ اسکے اساتذہ انگلستان کے مانے ہوئے بہترین موسیقار رہ چکے ہیں اور ہیں۔ خیر۔ تو اسی مدرسہ کا ایک جلسہ ہو رہا تھا آٹھ نو سو کا مجمع تھا جس میں طلبا بھی شریک تھے۔ امیر مدرسہ کے حکم سے ایک اُستاد کو تقریر کرنے کا حکم ہوا۔ اُستاد مذکور نے طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر یوں شروع کی "ایک شخص جو زبردست موسیقار تھا لیکن اسکے باوجود اپنے کام سے مطمئن نہ تھا ایک بار اُس نے "خدائے بزرگ و برتر" سے درخواست کی اُسے ایک چڑیا بنا دیا جائے جسکے نغمے کی صدا سُن کر تمام دُنیا پر ایک کیف کا عالم طاری ہو جایا کرے۔ خدا نے اُس کی دُعا کو قبول فرمایا۔ وہ ایک ہی چڑیا بن گیا۔ جس کا حُسن دیدہ زیب اور جس کی آواز دلفریب تھی، اُسے سنتے تو مست ہو جاتے تھے۔ لیکن اُس بندۂ خدا کو اپنی اس کیف آفریں آواز پر بھی اطمینان نہ ہوا۔ بالآخر اُس نے خدا سے پھر درخواست کی کہ صاحب مجھے اپنی اصلی ہی شکل میں دوبارہ واپس کر دیجئے۔ میں اس سے بھر پایا۔ خدا نے اُس کی دُعا پھر قبول کی اور وہ حضرت پھر ایک انسان ہو گئے۔ اپنی موسیقی سے پھر دل گدگدانے لگے۔" اُستاد نے تقریر کو یہاں تک جاری رکھنے کے بعد سامعین اور طلبا پر ایک نفسیاتی نظر ڈالی، اُس نے محسوس کیا کہ بچے اور خود سامعین اُس کی تقریر سے مسحور ہو رہے ہیں تو اُس نے یہاں سے اپنے مضمون کو پلٹا دیا اور اب یہاں سے اُس نے "اطمینانی حالت اور غیر اطمینانی حالت" کے فوائد و نقصانات پر روشنی ڈالنی شروع کی اور کہا کہ "دیکھو اُس کی اسی غیر اطمینانی حالت نے اُس کو لکھ پتی بنا دیا۔ اُس میں جد و جہد کا جذبہ پیدا کر دیا اور بالآخر کچھ عرصہ بعد وہ دولت و ثروت میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ اس لئے تم کو بھی چاہیئے کہ دولت و ثروت حاصل کرنے کے لئے اسی طرح سے جد و جہد کرو اپنی زندگیوں کو کامیابی کا درجہ عطا کرو۔ اور کامیاب ہو"

ہوسکتا ہے کہ آپ کو اُستاد کے ان خیالات سے اتفاق ہو لیکن مجھے یہاں پر یہ دکھانا تھا کہ ہمارے مدارس میں کس طرح سے من گھڑت قصّے اور کہانیاں بچوں کے دلوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ جد و جہد کی تعلیم دینا نہ جمہوریۂ اشتراکیہ میں بُرا سمجھا جاتا ہے نہ غالباً دُنیا میں کہیں۔ لیکن میرا اعتراض تو اس پر ہے کہ ایسے مہمل طریقے کو کیوں قبول کیا جائے جس سے طالب علم کو سراسر اُس کی شروع ہی کی زندگی سے ہم غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ تو آپ نے ایک انگلستانی مدرسہ کا قصہ سنا اب آئیے ایک روسی مدرسہ کا واقعہ بھی سُناتا چلوں اور یہ آپ کو دکھاؤں کہ جب اشتراکی اُستاد اپنے بچوں کو کوئی کہانی یا واقعہ سُناتا ہے اور اُس پر بچے سے سوال کرتا ہے تو بچہ کیا جواب دیتا ہے۔ ایک اشتراکی

مدرسہ میں حساب کا گھنٹہ ہو رہا تھا۔ ماسٹر نے بچّوں سے سوال کیا کہ "اگر ایک شخص سیبوں کا ایک ٹوکرا تیس روبل .... میں خرید کر ستر روبل (روسی سکّہ) میں بیچ دے تو بتاؤ اُس تاجر کو کیا ملے گا؟" اُستاد سوال ختم کرتا ہے۔ ایک بچّہ اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے اُستاد سے اجازت لیکر فوراً یہ جواب دیتا ہے کہ "تین ماہ کی قید سخت۔" آپ سمجھے کہ اُس نے یہ جواب کیوں دیا۔ آپ شاید اسے ایک لطیفہ سمجھے ہونگے۔ لیکن نہیں اُس نے ایسا جواب صرف اس وجہ سے دیا کہ اُس کے دل میں شروع سے یہ ڈالا گیا ہے کہ نفع کمانے والا سماج اور جمہور کا دشمن ہے، اس لئے جب کسی ایسے شخص کو دیکھو جو نفع کما رہا ہو تو متعلقہ افسران سے فوراً شکایت کرو تاکہ ایسے اشخاص کو عبرتناک سزائیں دی جاسکیں تاکہ وہ جمہور کو، ملک کو حکومت کو اپنے ایک فعل سے نقصان نہ پہنچا سکے۔ آپ نے دیکھا کہ بچّہ کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوگیا۔ کیونکہ اُس کو شروع سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اشتمالی معاشیاتی طریق نے انسان کی ہر اُس راہ کو جس سے فردِ واحد دولت عظیم اکٹھا کر سکے، نفع کما سکے تنگ کر دیا ہے، ایسی شاہراہ کو کھود ڈالا ہے۔ بند کر دیا ہے، اشتمالی بچّوں کے دلوں میں یہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے کہ وہ انسان سماج اور حکومت نیز جمہور کا دشمن ہے جس کی شروع کی زندگی تنگی سے گزری لیکن آخر میں وہ کروڑپتی ہوگیا ایسے اشخاص کو فنا کردو کیونکہ ایسے اشخاص دولت کو جمع کر کے جمہور، حکومت اور سماج کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہی نہیں کہ یہ خیالات صرف بچّوں کے دلوں میں بھر دئے گئے ہوں بلکہ ان کو عملی جامہ بھی پہنایا گیا۔ جمہوریۂ اشتراکیہ میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا۔ عوام کے مطالبہ نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ ایسے طبقہ کی جائدادیں اور ملکیت ضبط کر لی جائے اور اُن کی یہ جائدادیں اور ملکیتیں چیلکین (chelyrkin) کے کارخانے کی مہم کو سر کرنے والے مزدوروں اور اُن لوگوں میں جن کی یہ جائدادیں اور ملکیتیں تھیں برابر تقسیم کر دی گئیں۔ اور اس مسئلہ کا حل اس منصفانہ طریقہ سے عمل میں لایا گیا۔

جمہوریۂ اشتراکیہ کے نزدیک شرافت اور بلندی کی نشانی نہ دولت ہے اور نہ لمبے چوڑے خطابات بلکہ جمہور اور اشتراکی حکومت سے وفاداری اُسکی ترقی اور اُس کی عمارت کو مضبوط بنانے کی کوشش کرنے والے کی عزّت تمام جمہوریۂ اشتراکیہ میں کی جاتی ہے اور اُسے بہ نگاہِ عزّت دیکھا جاتا ہے۔ انفرادیت کا دور دورہ گو آج کل سارے ملک میں ہے لیکن اسکے باوجود میل ملاپ اور اتحاد میں سارا ملک ایک مستحکم اور مضبوط دیوار کی طرح سے ہے جس کا توڑنا ناممکن ہے کچھ عرصہ کی بات ہے کہ اس انفرادیت کو ملک کے لئے نقصان دہ سمجھا جانے لگا تھا اور لوگوں کے دلوں میں یہ ڈر پیدا ہوگیا تھا کہ انفرادیت کہیں آگے چلکر ملک کی مستحکم عمارت کو گرا نہ دے۔ کافی چھان بین کے بعد یہ طے پایا کہ لوگوں کا یہ محض وہم و گمان ہے۔ ایسا ہونا ناممکن سا ہے کیونکہ سوسائٹی کا نظریہ نہایت اعلیٰ ہے اور اس اشتمالی سوسائٹی میں ہر شخص اپنے کو انفرادی طور پر بلند کرنے کی اور اپنی حالت کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہر شخص اپنی اور اپنے ملک کی حالت اُسی وقت بہتر بنا سکتا ہے جبکہ اُس میں انفرادی طور پر اپنی حالت کے سُدھارنے کا جذبہ نہ پیدا ہوجائے۔ انفرادیت ہی ایک ایسی شے ہے جو انسان کو بلندی کے اُن اعلیٰ مدارج پر پہنچاتی ہے جس کا ہر انسان مستحق ہوتا ہے۔ یہ اشتمالی سوسائٹی ہی کی برکتوں کا نتیجہ ہے کہ جمہوریۂ اشتراکیہ میں ہر شخص کیلئے معاشی ضمانت، بچّوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نے طریق تعلیم میں نرمی پیدا کردی جس سے تمام روسی طریقوں کے اُن جراثیم کو جو اُن میں پائے جاتے تھے شدید تبدیلیاں ہوگئیں اور شروع کی ترقیوں میں اہل ملک کی اسقدر حوصلہ افزائی کی گئی کہ اُن میں انفرادی حیثیت سے ایک عجیب جذبۂ عمل اور جذبۂ علم پیدا ہوگیا۔ ہر اشتمالی باشندہ اس کا خواہاں نظر آنے لگا کہ وہ زیورِ علم سے جلد از جلد آراستہ ہوکر ملکی تعمیر میں اپنے پڑھے لکھے ساتھیوں کے دوش بدوش چل سکے۔ یہ لہر کسی خاص صوبہ یا کسی خاص طبقے کے اشخاص کی خواہشوں کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ سارے ملک میں یہ لہر بجلی کی طرح سے دوڑ رہی تھی، بڑا ہو یا بوڑھا، بچّہ ہو یا جوان، عورت ہو یا مرد غرض ہر فرد جماعت کے دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی کہ کس طرح جلد سے جلد تعلیم حاصل کر لی جائے اور یہ نتیجہ تھا اُس اشتمالی تعلیمی تبلیغ کا جو سارے ملک میں بے پناہ طور سے جاری

۵

کیا گیا تھا۔ اور ہر شخص پر اُس کی فہم کے مطابق اپنا اثر جما رہا تھا۔ یہ اثر رفتہ رفتہ اتنا بڑھ گیا کہ اس نے ایک عام مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔ جمہوری حکومت تو یہ چاہتی ہی تھی کہ کسی طرح عوام میں خود علم کے حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اشتمالی تعلیمی تبلیغ کی کامیابی کو دیکھ کر حکومت نے اس تبلیغی کام کو اور زیادہ زور و شور سے جاری کرنے کے احکامات نافذ کئے اور دوسری طرف یہ کیا کہ تعلیم کے حاصل کرنے کے لئے بے انتہا آسانیاں مہیا کی جانے لگیں، ہر پڑھے لکھے کی حوصلہ افزائی کی جانے لگی، ایسے مدارس قائم کئے گئے جن میں لوگ مفت تعلیم حاصل کر سکیں۔ مصوری، گانا بجانا، ڈرامہ، سینما، لکھنے پڑھنے غرض مدرسے اور طرح طرح کے شعبے قائم کئے گئے تاکہ لوگ لکھنے پڑھنے کی تعلیم کے ساتھ اپنی دلچسپیوں میں بھی ماہر ہو سکیں۔ اس قسم کے مدارس یہی نہیں صرف مرکز پر قائم کئے گئے ہوں بلکہ شمالی پاکستک (north yakustk) اور تاڈجیکستان (Jodjhikistan) جیسے مقامات پر بھی جو مرکز سے کافی فاصلے پر واقع ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قائم کئے گئے اور اشتمالی تعلیمی تبلیغ زور و شور کے ساتھ جاری کی گئی۔ یہاں پر یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہو گا کہ اشتمالیوں کا یہ دعویٰ کہ دُنیا کے کسی مدرسہ میں بچّہ کی پسند کی اتنی چیزیں نہ ملیں گی جتنی کہ اُن کی درسگاہوں میں پائی جاتی بالکل بجا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم میں اس قدر دلچسپی لیتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں میں برابر کا ہاتھ بٹاتے ہیں

اشتمالی رہبروں کو سارے ملک میں اسی وجہ سے بہت جلد کامیابیاں ہوئیں اور شب و روز ہو رہی ہیں کہ اُن کے چھوٹوں نے جد و جہد میں برابر کا ہاتھ بٹایا اور اُن کی مدد کی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ اشتراکی نسل (جو اشتمالی طریق بود و باش کی تربیت پا رہی ہے) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس میں اور اُن بچّوں میں جو دوسرے ممالک کے بچّے ہیں اور اشتراکیت و اشتمالیت سے قطعی بے بہرہ ہیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بچّوں کو تو خیر چھوڑئے اُن کے بڑوں ہی کو لے لیجئے آپ دیکھیں گے کہ غیر اشتراکیوں میں کس طرح سے آئے دن سیاسی اختلافات اور ہر شخص کے نئے نظریات پر مذاہب کے جھگڑوں اور اختلافات پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سر پھٹول ہوتی رہتی ہے لیکن اسکے برعکس اشتراکیوں کی زندگی پر اگر آپ ایک نظر ڈالیں گے تو آپ کو بہ آسانی یہ پتا چل جائے گا کہ اُن کا ایک مقصدِ حیات، ایک نظریہ، ایک سیاسی اصول، غرض اُن کی ہر شے میں اگر ایک طرف شانِ وحدت نمایاں ہے تو دوسری طرف جلوۂ اتحاد و مساواتِ انسانی بھی اپنی شعاعوں سے اور اپنے نور سے اشتمالی محفل کے بیٹھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔ آج یہی وہ شے ہے، یہی وہ روشنی ہے اور یہی وہ تحریک ہے کہ جو شخص اس کا دامن پکڑتا ہے وہ ایک زبردست بھائی چارہ اور بین الاقوامی زنجیر میں ایک مضبوط حلقہ بن جاتا ہے اور اس کا شیدائی نظر آنے لگتا ہے اور چاہتا ہے کہ کاش یہ اصول حیات چہار دانگِ عالم میں پھیل جائے اور ہم جو آئے دن اپنی کم علمیوں کی بنا پر ایک آدم کی اولاد ہوتے ہوئے انسانی خون کی ہولی کھیلتے ہیں وہ ختم ہو جائے۔ لیکن یہ خون کی ہولی اُس وقت تک نہیں بند ہو سکتی جبتک ہم میں یہ سمجھ نہ پیدا ہو جائے کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں۔ آئیے میں آپ کو چند سطروں میں اس کا سبب بھی بتاؤں گو یہاں اس کا تذکرہ بالکل غیر متعلق ہو گا مگر میں اس مسئلہ پر اس وقت روشنی ڈالنے میں کوئی ہرج بھی نہیں سمجھتا۔ یاد رکھئے کہ ہم آج جو آئے دن انسانی خون کی ہولی کھیلتے رہتے ہیں اُس کا سبب صرف ——— ہماری جہالت ——— غلط قسم کا طریقۂ تعلیم ——— اور اقتصادی و معاشی بھوک ہے ——— !؟ جو آج دُنیا کے تمام غیر اشتراکی خطّوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

سیاسی تعلیم

اشتمالی نظریّہ کے مطابق تعلیم کا تعلق سیاست اور معاشیات سے اُسی طرح ہے جس طرح کہ معاشیات یا سیاسیات کا تعلق ایک دوسرے سے ہے۔ اس نظریّہ کی اکثر و بیشتر روسی ماہرین تعلیم تشریح کر چکے ہیں اور بارہا اس پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہو بہو لفظ تعلیم اور نظریّۂ تعلیم کو جمہوریّت اشتراکیہ میں انہیں معنوں میں سمجھا جاتا ہے۔ اور جب تعلیمی ترقیاں یا تعلیمات کے مسئلوں پر سوچ و چار کیا جاتا ہے تو انہیں نظریوں کو پیشِ نظر رکھا جاتا

ہے۔ جمہوریۂ اشتراکیہ کے پیشِ نظر تعلیم کے یہ مقاصد نہیں جو میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ کلرکوں کا اضافہ کیا جائے بلکہ اُس کا مقصد متمدّن اور قابل ہستیوں کی پیداوار ہے جن سے جمہور اور ملک دونوں کو فائدہ پہنچے۔ "تمدّن" کا لفظ جمہوریۂ اشتراکیہ میں ایک ایسا وسیع المعنی لفظ ہے، جس کو وہ ہر معنی میں بطور اصطلاح کے استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ سے وہ صرف لغت کے چند معنی نہیں لیتے بلکہ اس سے اُن کی مراد آرٹ اور سائنس، سیاسیات اور معاشیات، کھیل کود، کام کاج، طور و طریق اور معاملی بود و باش غرض شعبۂ زندگی کی ہر شے کو اس میں دخل ہے۔ سینما گھر ہال میں دیر سے پہنچنا وہاں انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے اشخاص کو انتہائی غیر مہذب اور غیر متمدّن سمجھا جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کو بسا اوقات سزائیں بھی دی جاتی ہیں اور ایسی سزائیں یہ ہوتی ہیں کہ ایسے اشخاص کو تہذیب و شائستگی سکھانے والے مدارس میں داخل کیا جاتا ہے اور جبتک افسران مدارس افسران متعلقہ کو یقین دلادیں کہ اب یہ لوگ مہذب ہوگئے ہیں ان مدارس سے چھٹکارا حاصل کرنا سخت مشکل ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جمہوریۂ اشتراکیہ میں بغیر موزوں کے چلنا پھرنا، نیکر پہنکر سوائے کھیل کود کے میدان کے گھومنا یا کسی ایسی چیز کو پہنکر شاہرہ عام یا سینما وغیرہ میں گھومنا جس سے انسان کی ٹانگیں یا جسم کا کوئی حصہ کھلا ہوا نظر آئے اور تہذیب و تمدّن انسانی کے منافی ہو بد تہذیبی ہے، ایسے اشخاص کو متذکرہ بالا مدارس میں بلا کسی عذر و حجت کے داخل کردیا جاتا ہے۔ اور جبتک اس کی ذات سے اس بدتمیزی اور بدتہذیبی کا دھبہ نہیں مٹ جاتا اُسے تہذیبی مدارس میں اپنی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ہمارے آج کے نوجوان جمہوریۂ اشتراکیہ کی موجودہ سختیوں اور پابندیوں کو بیہودہ اور فضول کہیں۔ لیکن ایسے نونہالوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اشتراکیت کے معنی اُس غلط قسم کی آزادی کے نہیں ہیں جس کو وہ آج سمجھے ہوئے ہیں بلکہ اشتراکیت اور اشتمالیت نام ہے اُس فلسفۂ حیات اور اصولِ حیات کا جو حیاتِ انسانی کے شکستہ اور زنگ خوردہ ڈھانچہ کو جو آئے دن کے حادثات عالم کے وجود میں آنے سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے جوڑ کر زندگی کی نئی بجلی دوڑا دیتا ہے اور انسان

کے رگ و ریشہ میں پھر اُس کی بھرپور جوانی عود کر آئے۔ آج کہنے والے کچھ ہی کہیں مگر کون ایسا بدبخت ہوگا جو اشتمالیوں کے اس نظریّہ سے اختلاف کرے گا کہ تہذیب و تمدّن تعلیم کا ایک زبردست ترین حصہ ہے۔ اشتمالی حکومت کا مقصد اور مدارس کے مقاصد ایک ہیں۔ سیاسی اور معاشی مدارس کی منزلِ مقصود ایک ہے، اُن کی حیات اور بقا کا سوال اُن کے پنج سالہ نظامِ تعلیم کی کامیابی اور ناکامیابی پر ہے۔ اسی نظریۂ تعلیم کو پیشِ نظر رکھ کر سیاسیات کو تعلیم میں بڑا دخل دے دیا گیا ہے سینما، تھیٹر، عجائب خانے غرض ہر چیز میں سیاسیات اور تعلیم کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور یہ تمام چیزیں کمشنر تعلیمات کے زیر تحت کردی گئی ہیں۔ حکومت اشتمالی کے محکمۂ تعلیمات میں ایسے لوگ خاص طور پر رکھے گئے ہیں جو اشتمالی عوام کو اکثر بتاتے رہتے ہیں کہ ان اشیاء سے اہلِ ملک کس طرح فائدہ اُٹھائیں۔ اور یہ تربیت عوام کو اُسی وقت سے دی جانے لگتی ہے جبکہ وہ ابھی دارالصبیان (creche) ہی میں تعلیم پاتے ہوتے ہیں۔ اور یہ تعلیم اُس وقت تک دی جاتی ہے جبتک کہ وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کرلیں۔ اسکے علاوہ تعلیمی معلوماتی جلسے طلب کئے جاتے ہیں، جن میں لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ اعلیٰ تہذیب و تمدّن کسی آزاد اور اشتراکی ملک کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ غرض اُن کے دل و دماغ میں اعلیٰ تہذیب و تمدّن کا لفظ اس نوعیت سے جذب کردیا جاتا ہے اور شروع ہی سے انہیں اعلیٰ تہذیب و تمدّن کی تربیت اس طرح دی جاتی ہے کہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں رہیں مگر اپنی اعلیٰ تہذیب اور اپنے اعلیٰ تمدّن کو کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑتے۔ ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ ہے اُن کی اوّلین تربیت کا۔ کیونکہ یہ فلسفۂ نفسیات کا اصول ہے بچہ کو شروع میں جس طرح کی تربیت مل جائے گی اپنے مرتے دم تک وہ اسی سانچے میں ڈھلا رہے گا۔

تمام سیاسی برسیاں، معاشیاتی جانفشانیاں مثلاً قحط کے قرضے یا فصل کے کاٹنے یا بونے کی مہم سرانجام دینا، جس میں آج مدرسے اور تفریح گاہوں کی زندگی کا جزو بن گئی ہیں۔ اشتمالی اسکے عادی ہوگئے ہیں کہ ایسی مہموں کو سرانجام دینے کیلئے فوراً تقریری جلسے کریں، مقابلاتی مضمون دئے جائیں اور پھر رائے شماری کی جائے اسکے بعد جو کچھ متحدہ طور پر

طے ہو اُس کو اُسی طریقے پر جس طرح کہ آپس میں طے ہو سرانجام دیں۔ مدرسوں
کی پرورش گاہوں میں معمولی سے معمولی باتوں کیلئے تقریری مقابلے طلب
کیے جاتے ہیں اور اسکے بعد کام کو سرانجام دیا جاتا ہے۔ کاغذ پنسل
موقلم، ناچ گانا، غرض ایسی تمام چیزوں کا جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں
سیاسی تعلیمات سے گہرا تعلق ہے "طبیعاتِ اجتماعی" جسے اشتمالی سیاست
بھی کہہ سکتے ہیں ـــــ ہر بچے کے لئے اس کی تربیت [illegible]
کرنا ضروری ہے ـــــ اور ہر مدرسہ کے نظام الاوقات میں ۱۹۳۲ء
تک اسے برتا گیا۔ اُسی سال [illegible]
کو نظام الاوقات سے نکال کر الگ نصاب کی شکل دی گئی جو بارہ
سال سے کم عمر کے طلبا کیلئے ضروری قرار دیدیا گیا اور اس جگہ پہلے
نظام الاوقات میں [illegible] کر دی گئی ۱۹۳۲ء [illegible] طرح سیاست
کا گہرا رنگ ہر شعبۂ حکومت پر چھایا ہوا تھا۔ مدرسائی پرورش گاہوں میں
بڑے بڑے رنگین سیاسی اشتہارات، جوشیلے اور انقلابی اشعار [illegible]
کتنے فوجی سپاہیوں اور جبری طیاروں کی تصاویر آویزاں رہتی تھیں ہر
گیت اور ہر نغمہ میں پنج سالہ نظام اور اشتمالی انقلاب کی خوبیوں [illegible]
کا تذکرہ ضرور ہوتا تھا۔ غیر ملکوں کے بچوں کی بابت اشتمالی بچوں کو جو
معلومات دی جاتی تھیں وہ ضرورت سے زیادہ ہوتی تھیں ـــــ
ـــــ یہ کہنا کہ غالباً صرف اُسی قسم کی معلومات دی جاتی ہونگی
جن میں یکسانیت پائی جاتی ہوگی ـــــ غلط ہے اور قطعی غلط۔ انقلاب
کے بعد کے ہر رُخ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انقلاب سے
پہلے کی ایسی ہی شاید کوئی چیز ہو جس کی قدر کی جاتی ہو یا جس کو قدر و
منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ جہاں تک میں نے معلوم کرنے کی کوشش
کی ہے مجھے پتا چلا ہے کہ آجتک جمہوریۂ اشتراکیہ میں انقلاب سے
پہلے کی کسی شے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

دو سال کے عرصہ میں تمام تبدیلیاں جو اشتمالی حکومت کے
رہبروں کے پیش نظر تھیں تقریباً سب عمل میں آگئیں۔ انقلاب سے
پہلے اور انقلاب کے کچھ سال بعد تک مدارس میں انقلابی تصاویر، انقلابی
کتبے وغیرہ آویزاں تھے آج انہیں مدارس میں آپ جاکر دیکھئے تو آپ
کو اُن میں [illegible] اور کمیاب تصاویر اور کتبے ملیں گے
جن کی قیمت آج دُنیائے مصوری میں لاکھوں اور کروڑوں سے کم نہیں
آج روسی اشتمالی بچے انقلابی اور خونی نغموں کے بجائے دوسرے
ممالک کی طرح خوبصورت اور مدھر گیتوں سے اپنے مدرسوں کے در و
دیوار کو مسحور کر رہے ہیں۔ وہ اپنے امن انگیز پیام سے دُنیا کو بیدار
کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے معصوم اور بھولے بھالے نغموں سے گمراہ دنیا کو
راہ پر لگا کر اُس کی اندھی آنکھوں میں روشنی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ روسی
مائیں آج اپنے بچوں کو [illegible] کے قصوں کے بجائے
نئی انقلاب کی کہانیاں سناتی ہیں۔ ملکی تعمیر کے طریقے شروع سے
اُن کے کانوں میں ڈالتی ہیں۔ غرض ہر فرد بچہ کو ایسی تربیت دینے
کی کوشش کرتا ہے اور رہتا ہے کہ بچہ بڑا ہو کر مکمل "انسان بن جائے۔
تاریخ اور جغرافیہ دوسرے ممالک کے بچوں کی طرح اشتمالی بچے بھی
پڑھتے ہیں اُن کی تاریخ و جغرافیہ کا نصاب تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا
کسی سرمایہ دار ملک میں ہوتا ہے۔ یہاں میں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا
ہوں کہ [illegible] ہے کہ آپ کو میرے اوپر کے بیانات سے یقینی غلط
فہمی ہو [illegible] لئے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ
اشتمالی تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ بچہ کے دل و دماغ میں
بچپن ہی سے سیاست کوٹ کوٹ کر بھر دی جائے۔ نہیں بلکہ اُن کا مقصد
یہ ہے کہ بچہ جو آنے والی نسل کا ایک فرد ہوتا ہے شروع سے یہ سوچ
سکے اور سمجھ سکے کہ اُسے کس رنگ میں ڈھلنا چاہئے تاکہ اس کا مستقبل
کامیاب ہو۔ بقول ناظر مجلس علمی جو مارکس کے فلسفۂ حیات کے نظریہ
کے بموجب طلبا کو نظم و نسق، صنعت و حرفت وغیرہ کی تعلیم دیتا ہے کہ
"تاریخ اور جغرافیہ کی ایسی باتیں بچوں کو نہیں پڑھانی چاہئیں جن کا
نہ کوئی سر ہو نہ پیر۔ جو ایک ملک کے بچوں میں جو ہماری آنے والی نسلیں
اور قومیں ہونگی شروع ہی سے بغض و کینہ تعصب و فساد کی بنیاد
رکھدیں۔" بالکل اسی قسم کے خیالات کا اظہار نائب کمشنر تعلیمات
نے آج سے چند سال پہلے کیا تھا۔ اُنہوں نے فرمایا تھا کہ "تعلیم
سیاست کے تابع ہونی چاہئے"۔ اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے نہایت
زوردار الفاظ میں اُنہوں نے کہا تھا کہ "اشتمالیت جب تمام سرمایہ دار
دُنیا پر چھا جائیگی اُس وقت اسکی سیاسی تبلیغ سے ہم سرمایہ دار ملکوں کا

اُسی طرح مقابلہ کرسکینگے جس طرح وہ آج ہماری تحریک کی راہ میں اپنے سرمایہ کے زور کی بناپر روڑے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب ہم تحریک اشتمالیت کے ساتھ ساتھ تمام عالم میں تحریک تعلیم بھی جاری کردیں۔ کیونکہ جاہل عوام اوّل تو ہماری تحریک قبول ہی نہ کرینگے اور اگر اُنھوں نے قبول کر بھی لی تو خود ہمارے لئے اُن کا ہماری جماعت میں شریک ہونا مضرت رساں ہوگا اور پھر شاید ہمارا بھی وہی حال ہو جو اکثر دُنیا کی بہترین تحریکوں کا عوام کی جہالت سے ہوا۔"

۱۹۳۴ء تک اشتمالیت کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی وجہ صاف ظاہر ہے۔ دُنیا کے اشتمالی رہبروں نے بھی اسے محسوس کیا اور ناظر مجلس علمی کی پیشین گوئی پر اب زور شور سے عملدرآمد شروع ہوا۔ ملک کے کونے کونے میں تحریک علم جاری کردی گئی ....

....

...... یہ اس زور وشور سے جاری ہوئی کہ سرمایہ دار ملکوں کی آنکھیں کھل گئیں اور مجبوراً تحریک علم کو اُنہیں بھی اپنے ملکوں میں جاری کرنا پڑا۔ لیکن دونوں کی تحریکوں میں اگر ہم معمولی چھان بین ہی کریں تو نمایاں فرق نظر آجائیگا اگر ایک کی تحریک کا مقصد یہ ہے تو دوسرے کی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ بین الاقوامی بھائی چارہ ساری دُنیا میں قائم ہوجائے۔ لوگ اپنی علمیت سے آرٹ اور سائنس کو دُنیا میں زیادہ سے زیادہ پھیلا سکیں۔ اگر ایک طرف بچوں کو پٹ، ڈسرلی، بالڈون، چرچل، چیمبرلین اور میکڈانلڈ جیسے رہبرانِ ملک کے حالات سے آگاہ کیا جاتا ہے تو دوسری طرف رہبرانِ انسانیت مارکس، اینجل، لینن، گورکی، ٹراٹسکی، اسٹیلن کی زندگی اور ان کے فلسفۂ حیات سے واقف کرایا جاتا ہے۔ اگر ایک طرف بچوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ اور نئی تاریخ کے ساتھ چلو تو دوسری طرف بچوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ کی تقلید نہ کرو کیونکہ زمانہ غلط راہ پر جارہا ہے۔ اگر ایک طرف بچوں کو انسانِ کامل بنانے کے لئے پنج سالہ نظام کی کامیابی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اُن کی حساب دانی اور علمیت کی ترقی کی کوششیں کی جاتی ہیں تو دوسری طرف بچہ کو "سود در سود اور نفع ونقصان" کے اصول رٹائے جاتے ہیں اور ان کی قابلیت کی ترقی اسی رٹائی میں سمجھی جاتی ہے۔ کہنے والے جو کچھ بھی کہیں لیکن آج جو روسی ماہرین پنج سالہ نظام یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے ملک کے بچے جو آئندہ اپنی قوم و ملک کی باگ سنبھالیں گے اس طرح سے منظم و مرتب ہوجائیں کہ دُنیا کا کوئی شخص بھی انگلیاں نہ اٹھا سکے۔ انکی اخلاقی اور دماغی و ذہنی حالت اسقدر بلند ہوجائے کہ دُنیا کی کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہ کرسکے تو اس میں مجھے بتائیے کیا برائی ہے۔؟!

X

سعدی جعفری

زعفران زار میں ایک رات

ساقی ساغر میں زعفرانی بھر دے
دُنیا ہے صرف اک کہانی بھر دے
یہ چاندنی رات اور یہ زعفران زار
ماہ وشبِ ماہ کی جوانی بھر دے

ساغر

کشمیر ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۰ء

رامائن اور مہابھارت کے زمانے پر ایک نئی روشنی

(تاریخ ہند کے متعلق چند غلط فہمیاں)

ہمارے دوست تیج بہادر سنہا بی۔ اے بریلوی نے انگریزی میں ایک بسیط مضمون (A new light on The Epic age) تحریر کیا ہے اس نمبر میں اس کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔

مسئلہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے مگر جو باتیں سنہا صاحب نے تحریر کی ہیں، وہ مضبوط تاریخی دلائل رکھتی ہیں۔
(ساغر)

یہ بات ذرا عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن ہے بالکل ٹھیک کہ جو تاریخی کتب ہمیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں وہ چند غلط قیاسات پر مبنی ہیں اس لئے قریب قریب غلط ہیں۔ اگر ہم ان بنیادی غلطیوں کو ٹھیک کر لیں تو ہندوستان کی قدیمی تاریخ سمجھنے میں زبردست مدد مل سکتی ہے۔

ان غلط قیاسات میں سب سے پہلے عیسائیوں کا یہ عقیدہ آتا ہے کہ دنیا کی تخلیق کو کوئی دس ہزار سال گزرے ہونگے اور ۶ ہزار سال پہلے حضرت انسان کا وجود ہی نہ تھا۔ اس عقیدے کے زیر اثر تاریخ ہند کے غیر ملکی محققین کیلئے یہ سمجھ لینا بالکل غیر ممکن تھا کہ عین اس وقت جبکہ عیسائی دنیا عالم وجود میں آئی تھی ہندوستان کی تہذیب معراج کمال کو پہنچ چکی تھی یقینا قدیم یونانی سفیر میگستھنیز کی واقفیت ان لوگوں سے کہیں زیادہ تھی وہ لکھتا ہے "اہل ہند ڈایونی سس (Dionysus) سے سنڈروکوٹس (Sandrokottas) تک ۱۵۳ بادشاہوں کا ہونا بتاتے ہیں جن کا مجموعی عرصہ حکومت ۶۰۴۲ سال کا ہے اس عرصے میں تین مرتبہ جمہوری سلطنتیں بھی قائم ہو چکی ہیں۔ وہ لوگ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ڈایونی سس ہراکلیس سے پندرہ پشت پیشتر ہو چکا ہے"۔

بدقسمتی سے ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا جا سکا ہے کہ یہ ڈایونی سس قدیمی راجہ کا نام تھا میگستھنیز نے ہر ایک نام یونانی لہجے میں لکھا ہے گو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آخری بادشاہ سنڈروکوٹس یعنی چندرگپت ۳۲۲ق۔م کے قریب تخت نشین ہوا ہے جس کے حساب سے ڈایونی سس کے زمانے کو ۶ ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔

اسپر بھی لطف یہ ہے کہ میگستھنیز نے یہ نہیں لکھا ہے کہ ڈایونی سس ہندوستان کا پہلا بادشاہ تھا۔ درا‌صل ہندوستان کی قدیمی تاریخ کا تعلق اس قدیم زمانے سے ہے جب کہ زمانۂ حال کے غیر ملکی مورخوں کے نزدیک حضرت انسان کا پتہ نہ تھا۔

انہی غیر ملکی کرمفرماؤں نے ایک اور عجیب و غریب عقیدے کو جنم دیا۔ میکس مولر نے قدیمی آریہ تہذیب سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آریہ لوگ ایک خاص نسل سے تعلق رکھتے تھے اور لگ بھگ ہزار سال پہلے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ہونگے۔ انہوں نے ہندوستان کے قدیمی اور اصلی باشندوں کو دکن اور وسط ہند کے جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس نظریے کو لیکر اس آریہ نسل کے اصلی وطن کی تلاش

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء

شروع کردی گئی۔ کسی نے وسط ایشیا کسی نے خطۂ آرکٹک اور بعض منچلوں نے وسطی یورپ کو آریوں کا اصلی وطن قرار دیا۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میکس مولر کو اپنی زندگی میں ہی اپنی اس زبردست غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بعد کی تحریروں میں یہ بھی لکھا کہ لفظ آریہ نسل سے اس کی مراد کسی خاص قسم کی جسمانی بناوٹ والے لوگوں سے نہیں ہے مگر اس کے اہلِ وطن جرمنی والے اس خیال کو پہلے ہی لے اُڑے تھے اُنہوں نے اس نظریے کو لیکر یہاں تک تحقیقات کر ڈالی کہ اہلِ جرمنی آریہ نسل سے ہیں اور جرمنی آریہ نسل کا اصلی وطن تھا۔ دراصل اس غلط نظریے میں ہی جرمنی کے نئے جارحانہ فلسفے کی خونریز داستان مخفی ہے۔

دراصل ہندوستان پر ہزارہا سال سے غیر ملکی نسلوں کے حملے ہوتے رہے ہوں گے لیکن بہت جلد یہ ضرورت محسوس کر لی گئی ہو گی کہ سب لوگ مل جلکر رہیں اور آئندہ غیر ملکیوں کو ملک میں نہ آنے دیں۔ اس طرح ارتباطِ باہمی سے ایک مشترکہ تمدن کی بُنیاد پڑی جو ملک کی ضروریات کے عین موافق تھا اور اس تمدن کو ہم آریہ تہذیب کے نام سے پکارتے ہیں اس تہذیب کا کسی خاص قسم کے نسلی امتیازوں سے تعلق نہ تھا اس میں طویل قامت اور پستہ قامت گورے اور کالے سبھی شامل تھے۔ دراصل لفظ آریہ کے معنی ہیں اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والا۔ اور یہ لفظ ان تمام لوگوں پر عائد ہوتا ہے جنہوں نے ایک خاص معیارِ زندگی اختیار کر لیا تھا۔

جس طرح آجکل اہلِ وطن کے روبرو ایک مشترکہ ہندوستانی قوم بنانے کا مسئلہ ہے اسی طرح قدیمی محبانِ وطن کو اس مشترکہ آریہ تمدن کے بنانے میں مشکلات پیش آئی ہونگی اور یہ سمجھ لینا دشوار نہیں ہے کہ اس مشترکہ تہذیب کے ارتقا میں ہزاروں سال لگ گئے ہونگے۔

اس آریہ تمدن نے ایک زبردست آریہ قوم کی بنا ڈالی جس نے رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں اپنا اقتدار جما لیا اور آریہ جاتی کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کو وہی پوزیشن حاصل ہو گئی جو آج کل دُنیا کے نقشے میں یورپ کو ہے اُس وقت دُنیا کے دیگر حصے اس درجہ مہذّب نہ تھے اور بیشتر ممالک ہندوستان کے تابع تھے دراصل رامائن اور مہابھارت کا زمانہ اسی آریہ قوم کے عروج اور زوال کی کہانی ہے۔

آج کل وادیِ انڈس کی تہذیب نے مورّخوں کو بہت پریشان کر رکھا ہے وہ لوگ نسلی جھگڑوں میں مبتلا ہو کر ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ موہن جو ڈارو ہڑپا کی یہ تہذیب یافتہ قوم کس نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے خیال میں اگر ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زمانۂ قدیم میں ہندوستان میں بہت سی تہذیب یافتہ نسلیں تھیں جن میں سے کچھ نے مشترکہ آریہ تمدن کی بنا ڈالی تو بہت سی اُلجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

تیسری غلط فہمی کے لئے صرف غیر مُلکی مورخین کو ہی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وید نہایت قدیمی زمانہ میں مختلف اوقات میں تصنیف کئے گئے تھے اور ان سے اس زمانہ کی تاریخ اور رسم و رواج کا پتہ چلتا ہے بعض مورّخوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ویدوں میں جنگ مہابھارت کے واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے اسی طرح رامائن کے واقعات بھی ویدوں سے ہی اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ہیم چندر رائے چودھری نے مہابھارت سے شیش ناگ خاندان ([illegible]) تک کی تاریخ کی تلاش کی ہے ان کا یہ خیال ہے کہ ویدوں میں پریکشت کی تخت نشینی کا سال موجود ہے۔ اور جنگ مہابھارت پیدائش مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہوئی ہو گی۔ اس لحاظ سے ویدوں کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح ہوا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ نظریہ نہ صرف غلط ہے بلکہ انتہائی شر آمیز بھی ہے اگر ویدوں کو تاریخی نظر سے دیکھا جائے تو ان کا تاریخی مواد نہایت بے ربط معلوم ہو گا۔ بائبل کے تاریخی واقعات میں جو تسلسل معلوم ہوتا ہے اس کا یہاں پتہ بھی نہ ملے گا۔ تو کیا حقیقت یہی ہے کہ وہ کتاب جسے آریہ جاتی کے زبردست رشی مُنی الہامی مانتے رہے ہیں محض بے معنی کہانیوں کا مجموعہ ہے؟

دراصل ویدوں کے اندر کسی قسم کا تاریخی مواد نہیں ہے گذشتہ صدی میں رشی دیانند نے پہلی مرتبہ یہ دکھایا کہ ویدوں کے ترجمے عموماً غلط کئے گئے ہیں۔ آج کل ہر مورّخ جانتا ہے کہ موجودہ سنسکرت چوتھی صدی عیسوی میں مکمل ہو پائی ہے لہذا ویدوں کا ترجمہ کرتے وقت موجودہ سنسکرت کے قواعد سے مدد نہیں مل سکتی۔ کیونکہ وید اس سے

ہزاروں سال پہلے بن چکے تھے۔ اس ترجمے کی خرابی کی ایک آدھ
مثال دیدینا کافی ہے۔ رگ وید۔ منڈل ۴۔ سوکت ۱۵۔ منتر ۷ کا
ترجمہ میکس مولر نے یہ کیا ہے" جب سہدیو کے لڑکے راجکمار نے دو
لال گھوڑے دینے کے خیال سے مجھے یاد کیا تو میں اس شخص کی طرح
کھڑا ہوگیا جو بلایا گیا ہو"

اس منتر کا اصلی مطلب یہ ہے۔

" برہمچاری اپنے اُستاد سے درخواست کرے" اے اُستاد میں
طالب علموں کا ساتھی برہمچاری ہوں میں جن باتوں کو اچھی طرح سے
نہیں جانتا انہیں اچھی طرح سمجھا دیجئے گا تاکہ میں گھوڑوں کی مدد سے
تیز چلنے والے آدمیوں کی طرح مشق اور مطالعہ کی مدد سے عالم بن جاؤں۔

آج کل ہر ایک انگریزی داں سمجھتا ہے کہ چاسر کے زمانہ کی انگریزی
انگریزی سے مختلف ہے۔ حالانکہ چاسر کو صرف سات سو سال
کا زمانہ گزرا ہے تو کیا یہ امر قابلِ قیاس نہیں کہ ویدوں کی زبان اس سنسکرت
سے قطعی مختلف ہوسکتی ہے جس کی تکمیل صرف چوتھی صدی میں ہوئی تھی
اگر ویدوں کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح بھی مان لیا جائے تو بھی کم و بیش
۱۵ سو سال کا فرق ہے جو ایک زبان کی نشو و نما اور ارتقاء کے نقطۂ نظر
سے نہایت اہم فرق ہے۔

اگر ویدوں کے صحیح مطالب سمجھ لئے جائیں تو ہماری تاریخ
کی بہت سی بنیادی غلطیاں دور ہو جائیں گی۔

تاریخ ہند کے متعلق چوتھی غلط فہمی کا میرے نفس مضمون سے
براہِ راست تعلق ہے۔ ڈاکٹر اسمتھ کو یقین ہے کہ رامائن صحیح تاریخی روایات
کی حامل نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہ بات بھی ان کے قیاس میں نہیں آتی
کہ دور دراز کے ممالک جن کا مہابھارت میں حوالہ دیا گیا ہے انہیں کورو
اور پانڈووں کے ان مقامی جھگڑوں میں دلچسپی ہوسکتی تھی جو دہلی
اور اسکے گرد و نواح کے تھوڑے سے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے
اس اعتبار سے دیکھا جائے تو موجودہ جنگ بھی دور دراز کے پولینڈ
میں صرف ذرا سی کوریڈر (Corridor) کے باعث شروع ہوگئی
تھی اور اس میں ہندوستان کو چھ ہزار میل کے فاصلہ سے شریک کر لیا
گیا۔ ممکن ہے اب سے پانچ چھ ہزار سال بعد لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے
کہ پولینڈ کے معاملات سے ہندوستان کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی
لیکن واقعات اپنی جگہ پر قائم رہینگے۔

مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ رامائن اور مہابھارت
اصلی واقعات کے بہت دنوں بعد لکھی گئی ہیں اور ان کے اندر
زمانہ کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں پھر بھی ان کو پڑھ کر
ہمیں اس زمانے کی آریہ تہذیب کی کچھ کچھ جھلک مل جاتی ہے۔

دراصل رامائن اور مہابھارت میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے
وہ بلحاظ وقت ایک دوسرے سے دوری پر ہیں۔ عام طور پر ہندوؤں
کا عقیدہ ہے کہ رامائن کو بالمیک رشی نے اصلی واقعات سے ...
سال پہلے تصنیف کیا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقت اس کے بالکل
برعکس ہے۔ غالباً بالمیک رامائن اصلی واقعات کے کوئی دس گیارہ
ہزار سال بعد لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان سے صاف پتا چلتی ہے کہ وہ دو یا تین
صدی قبل مسیح میں لکھی گئی ہوگی۔ اصل واقعات حضرت مسیح سے
تقریباً دس گیارہ ہزار سال پہلے وقوع پذیر ہوئے ہونگے۔

اسی طرح مہابھارت کی کتاب نے نویں صدی عیسوی میں اپنی
آخری شکل اختیار کی ہے لیکن اصل واقعات حضرت مسیح سے تقریباً
تین ہزار سال پہلے واقع ہوئے ہیں جیسا کہ ہم کو ویدھشٹر کے سمت ۵۰۴
سے پتہ چلتا ہے۔

اس طرح رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں تقریباً ۷ ہزار سال
کا فرق معلوم ہوتا ہے اس عرصے میں بیسیوں انقلابات ہوئے ہوں گے
لیکن رام چندر جی اور کرشن جی سے ہندوؤں کی عقیدت قائم رہی۔ آج
اس زمانہ کی تو تاریخ نہیں ملتی لیکن کسی ہندو کے دل سے رامائن اور
مہابھارت کے واقعات نہیں مٹائے جا سکتے۔

مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہے کہ موجودہ رامائن
اور مہابھارت میں شاعرانہ تخیل کا بہت کچھ دخل ہے لیکن اس
تخیل کی تہ میں آریہ جاتی کے عروج و زوال کی کہانی مضمر ہے۔ گو یہ
کتابیں اصل واقعات سے بعد کو لکھی گئی ہیں لیکن ان میں وہ تمام روایات
ملتی ہیں جو زمانۂ قدیم سے ملک میں مروج تھیں۔

مجھے افسوس ہے کہ رامائن اور مہابھارت پر اعتراض کرنیوالے

یورپین محقق بائبل کے ذرا ذرا سے واقعات کو بروئے تاریخ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ٹرائے (Troy) کا بارہ سالہ محاصرہ اصلی نظر آتا ہے باوجودیکہ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ محاصرے کے اصل واقعات ہومر سے تقریباً سات سو سال پہلے واقع ہوئے ہونگے۔ ہومر کی داستان ناممکن باتوں سے بھری پڑی ہے لیکن اسکے واقعات کو فرضی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مگر یہی لوگ تواریخ ہند کے متعلق ہر چیز کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

تیج بہادر سنہا بی۔ اے

حمدِ ساقی

(نظم کیا ہے مستی کا ایک ابدی ساز ہے ـــــ اگر اس کی ضمانت کیا ہے کہ اپنے ساقی سے ماہر صاحب کے یہ مطالبات واقعی سچے ہیں ـ ؟! ـــــ شاید صداقت کی طرح منافقت بھی اک حقیقت ہے)۔ !؟ ساغر

پھر بہار آئی مئے ہوشربا دے ساقی
عقل و دانش کی کشاکش سے چھڑا دے ساقی

دے نہ سادہ سے مجھے بادۂ گلرنگ کے جام
اس میں کچھ مست نگاہوں سے ملا دے ساقی

کوئی باقی نہ رہے شرم و تکلف کا حجاب
تجھ سے ممکن ہو تو ہونٹوں سے پلا دے ساقی

اور بھڑکا مرے سینہ میں دہکتی ہوئی آگ
کون کہتا ہے لگی دل کی بجھا دے ساقی

پردۂ نشہ و مستی بھی رہے کیوں حائل
آج تو سارے حجابات اٹھا دے ساقی

تشنگی ہی سبب شکوہ و فریاد ہوئی
دل سے گذری ہوئی باتوں کو بھلا دے ساقی

مست آنکھوں سے پلا کر مجھے الفت کی شراب
بادۂ ناب کے بھی ہوش اڑا دے ساقی

تو نے کس عالم مستی میں مجھے چھوڑ دیا
میں کہاں ہوں! مجھے اتنا تو بتا دے ساقی

تشنۂ جنبش مضراب ہے سازِ ہستی
پھر وہی نغمۂ فردوس سنا دے ساقی

ماہر القادری

قدیم مشرق کے نژاد اور ملل

بنی سام و بنی حام

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ توریت ہی ایک ایسی اکیلی تاریخی سند ہے جس نے نژاد شناسی کے زاویہ سے یہود کی ہمسایہ ملتوں کو تقسیم کیا۔ یہ نہیں معلوم کہ طرزِ تقسیم کی معیاری بنیادیں کیا تھیں مگر بہرکیف توریت میں وہ تمام ملتیں جو بنی اسرائیل کی تعریف میں آتی ہیں ان کی تقسیم اس شان سے ہوئی ہے۔ حضرت نوح کے تین بیٹے تھے سام۔ حام اور یافث۔ بابلی سمجھتے ہیں کہ توریت نسل حام پر نازل ہوئی۔ کنعانی جو زبان کی حیثیت سے یہودیوں سے بہت نزدیک تھے، فینیقیوں کو اور آسوریوں کو بھی اسی نژاد میں گنا گیا ہے مگر عیلامیوں کو جن کی زبان یہودی زبان سے دور کا رشتہ بھی نہیں رکھتی۔ پسرانِ سام کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نسلوں کی تشخیص میں توریت کی نظر انتخاب قرابت زبان ایسے نازک مسئلے پر نہ تھی بلکہ سیاسی جذبات کا دخل تھا مگر اب نژاد شناسی کے علم نے اپنا دامن سیاست وغیرہ سے پاک کر کے دوسرے سرچشموں کی طرف نظر ڈالنی شروع کر دی ہے تاکہ نسلوں کے جدا کرنے اور تقسیم میں سہولت ہو۔

اس مسئلہ میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ زبان کی اہمیت بہت بڑھی چڑھی ہوئی ہے مگر تجربہ اور تحقیق نے بتا دیا ہے کہ تنہا یہ منبع بھی بیداغ اور بالکل صحیح نہیں ہے جیسے قبطی عربی زبان میں بات چیت کرتے ہیں حالانکہ وہ بنی سام نہیں۔ مختلف ملکوں میں بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کی بول چال بومی زبان میں ہے حالانکہ دراصل ان کے نژاد جداگانہ ہیں۔

جسمے اور خطوط کے زاویے بھی مناطِ کامل نہیں بن سکتے، انسانی اخلاق و عادات بھی بے کلفت منبع قرار نہیں پا سکتا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ طائفے اور قبیلے جن کا مرکز ملتِ واحدہ ہو ان کے اخلاق اور ان کی عادتیں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ بھی مسلّم ہے کہ جغرافیائی ساخت اور تاریخی وحدت ان آدمیوں کے عادات و اخلاق کو یکساں بنا دیتی ہے جو مختلف نژاد سے متعلق ہوں اسی لئے کوئی محکم پایہ کوئی صحیح مقیاس جو ہر پہلو سے معتبر ہو اس کا وجود نژاد شناسی میں نہیں ہے۔ ان تمام فرضی سرچشموں میں زبان نسبتاً زیادہ صحیح ہے اور خاص کر عہدِ قدیم کے لئے بہت مفید ہے۔

نئے نئے اکتشافات کی بنا پر زبان شناسوں نے توریت کے لفظوں کی تاویلیں اور تفسیریں کی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمام وہ ملتیں جن کے لغت کے ریشے عربی لغت کے ریشے ہیں وہ سفید پوست بنی سام کی شاخ سے ہیں جیسے بابلی، آسوری، فینیقی، کنعانی، آرامی، کلدانی، یہود، آدم، اعراب اور وہ اعراب جو حبش میں بس گئے ہیں۔

بنی حام کے متعلق زبان شناسوں میں پورا اتفاق نہیں مگر ذیل کی فہرست پر قریب قریب سب موافق ہیں۔ قدیم مصری اور افریقہ کے وہ لوگ جو سفید پوستوں سے زیادہ نزدیک ہیں جیسے بربر، فیبل، لیبیا، کے رہنے والے ان لوگوں کی زبان کی رشتہ داری بھی مخصوص ہوتی ہے مگر اتنی نہیں جتنی سامی نژاد ملتوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ قبطیوں کو چھوڑ کر بنی حام کی ملتوں کی کوئی ادبی زبان نہ تھی اور دوسری دقت یہ ہے کہ قرابت زبان ہمیں ان لغات سے معین کرنی پڑتی ہے جو آجکل استعمال میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے افریقہ کے برّاعظم میں بود و باش اختیار کر لی اپنے تمدن کو بلند نہیں کر سکے۔ حامی زبانیں نحو، صرف اور قاموس کی حیثیت سے سامی زبانوں کے چند نقطوں سے ہمیشگی رکھتی ہیں اسی سے لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا ہے کہ بنی سام و بنی حام کا اصلی وطن ایک ہی تھا۔ اور بعض تو کہہ اُٹھتے ہیں کہ تمام زبانیں ایک ہی اصلی زبان سے نکلی ہیں۔

مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان دو گروہوں کا اصلی وطن آجتک نہ معلوم ہو سکا۔ انسانی تاریخ کو یاد ہو یا نہ ہو عربستان میں ان کے علاوہ اور بھی ملتیں تھیں۔ اور غیر عربستان میں سامیت (Samitism) کی بستی تھی۔

سوچا گیا ہے کہ بنی سام و بنی حام کا مسقط الرّاس عربستان ہے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ جب کبھی عربستان میں آبادی بڑھ جاتی تھی تو یہاں کے رہنے والے حاصل خیز ملکوں کی طرف توجہ کرتے تھے اور اسی راستے سے سامی عنصر بھی عربستان کے پڑوسی ملکوں سے شمال و مغرب میں داخل ہوتا تھا۔ ونکلر (winckler) کا خیال ہے کہ عربستان کے رہنے والوں نے چار دفعہ ہجرت کی ہے۔

پہلی: ۔ بابلی اور اسوری نہضت جو تاریخی ابتدائی عہدوں میں دو ہزار پانچسو برس قبل میلاد ہوئی ہے۔

دوسری: ۔ کنعانی سوریہ اور دوسرے ملکوں کو قریب قریب ڈھائی ہزار برس قبل میلاد گئے ہیں۔

تیسری: ۔ آرامی اور کلدانیوں کی مہاجرت جو ہزار سال بعد ہوئی ہے۔

چوتھی: ۔ کلدہ اور سوریہ کی طرف عربوں کی ہجرت جو اسلامی پھریرے کے سایہ میں ہوئی اور جس نے قدیم مشرق کے خط و خال بالکل بدل دئے اسی واسطے عالم سامی کی دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔

(۱) شمالی: ۔ بابلی، اسوری، کنعانی، فینقی، یہودی، اسرائیلی اور کلدانی،

(۲) جس میں اعراب اور عربستان کی جنوبی اقوام شامل ہیں جیسے سبا۔ مینا اور حبشہ کے رہنے والے۔

اس جگہ ایک نیا شگوفہ پھوٹتا ہے اور یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا بنی سام نے پہلے پہل بابل و سوریہ کو نوازا تھا یا وہ پہلے آدمی تھے جنہوں نے ایشائے عربی میں ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس مسئلہ میں چھان بین ابتک ہو رہی ہے اور علماء کے دو گروہ ہو گئے ہینکس اپر اور راولنسن کا خیال ہے کہ منجی خطوط سے لیئے گئے ہیں اور سامی زبانوں کے واسطے اوّل اوّل ان کی ترتیب نہیں دی گئی تھی اس لئے کہ وہ صدائیں اور وہ صرف و نحو جو اس خط کے ایجاد کا باعث ہیں وہ سامی زبان کے قواعد سے بالکل نہیں ملتے جلتے۔ اس معاملہ میں بھی بڑی حجت حکایت تھی مگر حسن قسمت سے ایک عمدہ سند ہاتھ لگ گئی جس سے صاف پتہ چل گیا دو کھمبے ملے ایک پر ایڈوگرافی یا مفہوم نویسی تھی اور اسی کے آمنے سامنے غیر سامی ہجا منجی قرأت لکھی ہوئی تھی اور دوسرے کتبے بھی ملے جن پر متن غیر سامی ہے اور جس کا ترجمہ سامی زبانوں میں ہے اس موقع ایک خاص چیز جاذب توجہ ہوتی ہے۔

بابلی تمدن کے آخری دنوں تک سامی زبان صرف مصنوعی انداز سے لوگوں کی زبان پر اور سینوں میں محفوظ تھی اور صرف مطالب ان میں بیان کئے جاتے تھے۔ (جیسا کہ قرون وسطیٰ میں لاطین زبان جو بالکل مردہ ہو چکی تھی، کتبوں اور مذہبی کتابوں لکھنے میں صرف کی جاتی تھی)۔

اس لئے بعضوں کا خیال ہے کہ منجی خطوط اور بابلی تمدن کے بعض دوسرے عناصر سامی منشار کے موافق نہ تھے۔ پھر ان کا

منشا رکیا تھا؟ ابھی تک اس بات کا جواب تعین کے ساتھ نہیں دیا
جاسکتا مگر یہ نکتہ نگاہ میں رکھنا چاہئے کہ بابلی اور اسور کے بادشاہ اپنے
آپ کو سومر اور اکد کے بادشاہ کہتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لقب
اُور اور سومر بادشاہوں نے فیاضی سے استعمال کیا ہے جن کے بعد
حمورابی نے جس نے اک وسیع مملکت پر قبضہ کر لیا تھا۔ پہلے پہل اس
لقب کا ذکر کیا ہے۔ بابلی مملکت کے اتری حصّہ کو اکد اور دکنی حصّہ
کو سومر کہتے تھے۔ بابلی آثار سے آج بھی آئینہ ہے کہ خود سامی سومری
زبان کو غیروں کی زبان یعنی قدیم مذہبی زبان جانتے تھے سلسلۂ اوّل
کے ایک سامی بادشاہ نے اک فرمان جاری کیا تھا۔ اس کے مطالعہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ اکدی ترجمہ سامی نہیں اور سومری حاشیہ ہے مگر
یہ بات بھی یقینی طور سے نہیں کہی جاسکتی کہ سومریوں نے میخی خط ایجاد
کیا ہے اور یہ بھی تحقیق نہیں ہو سکی ہے کہ سومریوں کا اصلی نژاد کیا تھا
سومری زبان کی تحقیق سے گمان ہوتا ہے کہ یہ ملتصق زبان ہے اور اسی
لئے زبان شناسوں نے اس کا شمار اورال اور التائی زبانوں میں کیا ہے
مگر ان کے اس خیال کو جوہر قبولیت حاصل نہیں ہوا۔

یوسلی کے ذریعہ سے جو حفرائی کام ہوا ہے کہ آثار محفوظ سومری
ایشیا سے مشابہ ہیں اور عیلامی شان رکھتے ہیں۔ اسی واسطے ان کو مغالطہ
ہوا ہے شمالی ایران کی پہاڑیوں میں سومری اور عیلامی قدیم زمانے میں
رہتے تھے اور بعد کو ہجرت کر کے مغرب اور کنارِ فرات تک رہتے تھے
اور بعد کو ہجرت کر کے مغرب اور کنارِ فرات تک پہنچ گئے۔ اس دھوکے
کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سومریوں کا مرکز لیپور شہر تھا اور یہ شہر قلات
ایران اور بابلی جلگہ کی سرحد پر تھا مگر سامیوں کا مرکز سیپار اور اکدہ
تھا ان دونوں میں سے کون یہاں پہلے پہنچا معلوم نہیں مگر اس خیال
میں ذرا زیادہ قوت ہے کہ سامیوں کے آنے سے پہلے ہی سومری پہنچ
چکے تھے۔ یہاں کے آثار بھی دو حصوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں۔ ایک
میں سامی شان ہے یعنی بال بہت کم ناک نازک اور دوسری علامتوں
سے معلوم ہوتا ہے کہ سامی نہیں۔ تاریخ مشرق کے معروف عالم
اڈورڈ میئر (Ed. meyer) نے اس خیال کو پھیلایا ہے حالانکہ آوری
(Holoy) جو مشہور آسور شناس ہے شدید طور پر مخالفت
کرتا ہے اور اس نے ثابت کیا ہے کہ بابل میں دو نژادی (Duality)
نہ تھی بلکہ سب کے سب سامی تھے اور میخی خط سامیوں کی ایجاد ہے۔
اب لوگوں نے اس کی تردید بھی شروع کر دی ہے مگر ایسے لوگ
کم ہیں اور ان کی کثرت ہے جو (Duality) کے قائل ہیں اور نزاع
یہ ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سومر سے مراد وہی قطعہ ہے جسے توراۃ
نے شنعار کے نام سے یاد کیا ہے۔

مصر کی طرف بنی سام کی ہجرت

تاریخ سے پہلے کے زمانے میں بابلی ہجرت کے قبل ہی سام کے
بعض قبیلے سمندر کے راستہ سے مصر گئے تھے۔ سامی اور مصری زبانوں
کا ربط ضبط دونوں کے ریشوں اور لفظوں سے ظاہر ہے۔ نحوی اور
صرفی ترکیبیں ملتی جلتی ہیں۔ ریشے تین حرف کے ہوتے ہیں ساکن حرف
ساکن حرف متحرک سے زیادہ اہم ہیں اسی وجہ سے اک زمانہ تک لوگ
مغالطہ میں رہے۔ ان کا رہنا سہنا ایک سا تھا اور بابل اور مصر قدیم کے
مذہبی اعتقادات یکساں تھے۔ بنی سام ایشیا سے مصر کی طرف گئے
دلیل یہ ہے کہ مصری جڑی بوٹیاں اور چوپائے ایشیائی حیوانات اور
نباتات سے ایک خاص ارتباط رکھتے ہیں جیسے (سی گ مر) جو مصریوں
کا ایک قدیم اور پاکیزہ درخت ہے اس کی قلم عرب سے وہاں پہنچی تھی
انگور، گیہوں، ذرت، گاؤ نر، بھیڑ اور بکریاں بھی ایشیا سے مصر
میں پہنچی تھیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ قدیم مصری آبادی مختلف قبیلوں کے اختلاط
کا نتیجہ تھی اس کا اندازہ قدیم مصری مجسمے اور نقاشیوں سے ملتا ہے
مصر میں چند قسم کے انسان پائے جاتے تھے۔ تدریج زمانہ سے سب
گھل مل گئے ہیں اور ایک ملّت وجود میں آئی۔ اس ملّت میں حامی اور
سامی عنصر غالب تھے۔

یہ خلط ملط اور ملّتِ واحد کا آغاز تاریخ کے پہلے کی باتیں ہیں
اور اتنے پہلے کی ہیں کہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ سنہ میلادی سے
کئی ہزار سال پہلے یہ امتزاج ہوا تھا اسی لئے دو قسم کے قیاس اصلی
مصری باشندوں کے متعلق کئے جاسکتے ہیں۔

ایشیا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

۱- یہ کہ مصری لیبیا کے حامیوں کی ایک شاخ تھے جو مغرب سے مصر کو گئے اور وہاں سامیوں میں مل جل گئے۔

۲- یہ کہ مصری ایشیائی حامیوں میں سے تھے۔ ایشیا سے مصر میں گئے اور حامی اور سامی ایک ہی نژاد سے ہیں۔ دوسرے قیاس کی تصدیق سامی اور حامی زبانوں کی یک رنگی سے ہوتی ہے۔ حقیقتاً سامی کس راستہ سے ہجرت کر کے مصر پہنچے کسی کو معلوم نہیں مگر یہ ضرور ہے کہ یہ ہجرت اُتر کی طرف سے نہ تھی۔ معرفت الارض والے جانتے ہیں کہ دریائے نیل کا بہاؤ قابلِ اعتبار نہیں۔ دریائے احمر کی طرف سے سمالی لینڈ (Sumaliland) پونٹ (Pont) راستہ نکل سکتا تھا۔ آثار بھی اسی اٹکل کو دہراتے ہیں ایشیا والوں نے مصر کی طرف ایک ساتھ گھار کر کے ہجرت نہیں کی بلکہ دستہ دستہ کر کے گئے ہیں۔ سمندر کا سفر اس زمانے میں بہت دشوار تھا اور مُعبر بھی تنگ تھے۔ یہ ہجرت بھی اسی ہجرت کی طرح ہے جیسے میلاد سے پانچ سو برس پہلے عربستان سے لوگ حبشہ گئے تھے۔

عیلام کی طرف بنی سام کی ہجرت

شوش کے حفریات بتاتے ہیں کہ سامی عنصر عیلام میں زیادہ تھا، خود لفظ عیلام بھی سامی ہے۔ اس لئے کہ عیلام کے لوگ اپنی مملکت کو اپنے بحثوں میں 'حاتام ی' یا 'پرتی' لکھتے تھے۔

قدیم اعلامی شاہزادوں نے ایسے کتبے لکھے ہیں جن کا خط منجی ہے اور زبان سامی ہے بومی زبان کی سندیں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں جس کا دارو مدار نقوش پر ہے یہ خط منجی خط کے دوش بدوش بھی کچھ دنوں چلا ہے تقریباً میلاد سے دو ہزار آٹھ سو برس پہلے (رباش ایں شوشناک) کو منجی خط سے الگ کیا گیا ہے اور ہجائی سمجھا گیا ہے۔

میلاد سے پانچسو سال قبل عیلامی تھی۔ عیلامی زبان کے متعلق شیل، یسباق، ہرنگ اور ہرک نے کام کیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اس کے لہجے مختلف تھے اور قفقازی زبانوں سے ملتے جلتے تھے۔ مار عیلانی زبان کو گرجی اور بومی زبانوں کے خاندان سے شمار کرتا ہے جو قدیم ارمنستانی تھی یعنی ان لوگوں کی زبان تھی جو ارمنوں کے آنے سے پہلے ارمنستان میں بولی جاتی تھی۔ یہ زبانیں سامی زبانوں سے اتنی نزدیک ہیں کہ ان کے اندر کا تمدن بابلی اور سامی تمدن ہے۔ عیلامی سامیوں کی نسبت ویسے ہی ہے جیسے بابلیوں کی نسبت سومریوں سے ہے (دیکھئے تورائف جلد ۱۔ صفحہ ۲۷)

سید طالب علی الہ آبادی ایم۔اے

پیمان

جہنم زارِ عالم کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
نہیں تو مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

یتیموں کی نگاہِ یاس سے معصومیاں لیکر
میں قندیلِ دلِ مفلس فروزاں کر کے چھوڑوں گا

قسم بیوہ سہاگن کے تمنا سوز آنسو کی
میں ہر روتے ہوئے چہرے کو خنداں کر کے چھوڑوں گا

قسم ٹیپو کے خونِ پاک کی پیارے وطن اک دن
جوانی کو تری ہستی پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

گھنیری زلف کی سوگند اے مہتابِ نورانی
میں ہر ظلمتکدہ میں اک چراغاں کر کے چھوڑوں گا

رنجور عظیم آبادی

مذہب، حکومت، قدروں[1] کا معیار اور موجودہ نظام کی حقیقت

(ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ۔ ساغر)

مذہب، حکومت، سماج، قدروں کے معیار اور موجودہ نظام کی
حیثیت زندگی میں کیا ہے ——!؟
وہ ان بنیادی مسائل کے متعلق گھنٹوں سوچتا اور محسوس کرتا کہ:-
ان اخلاقی اور سیاسی اداروں کی حیثیت زندگی میں تماشائیوں
کی سی ہے مدد کرنے والوں کی سی نہیں۔ یہ زندگی کے حالات پر طعن و تشنیع
تو کر سکتے ہیں لیکن کوئی علاج پیش نہیں کر سکتے۔
یہ زندگی کی بوتلوں پر لیبلوں کے مماثل ہیں۔ جو دواؤں کے
نام تو رکھ سکتے ہیں۔ لیکن جن بوتلوں پر چسپاں ہیں ان کی ادویات کو
بہتر نہیں بنا سکتے۔
وہ غور و فکر کی گہرائیوں میں اُتر جاتا اور کہتا کہ:—
یہ محض انسانی زندگی کے تماشبین ہیں اسکے ہمدرد یا ہمدم نہیں،
آج مذہب کسی کو گناہگار، اور کسی کو کافر بنا سکتا ہے لیکن ایک
داخلی طاقت کی طرح انسانی زندگی کو دُکھ سے بچا کر مسرت اور شانتی
نہیں بخش سکتا۔ اس کا کام انسانیت پر فتویٰ لگانا تو ہے لیکن تباہی
اور دُکھ سے بچانا اسے نہیں آتا۔
مگر اب یہ تمام تباہی کے قریب ہیں اور ان میں کوئی ایسی طاقت
نہیں ہے جو ان کو قائم و ثابت رکھ سکے،

وہ ان افکار کی وجہ سے ایک اینٹھن سی محسوس کرتا اور کہتا:-
یہ محض تماشبین ہی نہیں ہیں، موجودہ دور میں ان کی ہستی انسانی
زندگی کے لئے اک عذاب ہے۔ یہ انسانی زندگی کا دائرہ تنگ سے
تنگ کرتے چلے جا رہے ہیں جس طرح ایک مفتوح خود اپنے مقبوضات
کو آگ لگاتا ہوا بھاگ رہا ہو،
موجودہ زندگی میں ان کے افادی اعمال سے قطعی برعکس نتائج
مترتب ہو رہے ہیں۔
زندگی یہ برعکس نتیجے دیکھ کر ان سب کو دور پھینک رہی ہے اور
یہ چکنا چور ہو رہے ہیں۔
مذہب میں کوئی فطری طاقت نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں
داخل ہو سکے اور نہ کوئی خارجی فائدہ ہے۔ یہ اس وقت بھی جب جہالت
کی بنا پر حکومت کی طاقت و پُشت پناہی کی وجہ سے زندگی میں اس کو
اہمیت دی جاتی تھی زندگی کو دوامی معراج عطا نہ کر سکا——!؟
حکومت کے جاتے ہی اور سائنس کا دور شروع ہوتے ہی مذہب
اپنی "قدر" کھو بیٹھا۔ ایک اس کی کفیل تھی اور اس کو بلند کرتی تھی
اور دوسری کی موجودگی اسکی ساکھ کا باعث تھی۔

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء

[1] قدر (Values)

وہ اور بھی تفکر کی گہرائیوں میں اُترجاتا اور محسوس کرتا کہ:۔
آج ہم حکومتوں سے کیا توقع کر سکتے ہیں ——! ؟ کیا یہ
راشن کارڈ جاری کر سکتی ہیں ——! ؟ !
ان حکومتوں سے انسانیت کا یہ توقع کرنا کہ یہ اس کا پیٹ بھر
دینگی ہوا میں قلعہ بنانے کے مترادف ہے۔
"موجودہ نظام" کی بُنیاد "حُب الوطنی" ہے۔ اس سے ہمیں کیا
ملا ؟ ... جنگیں، خونریزیاں، مصائب و آلام، بھوک پیاس
اور دیوالیہ ہونا۔
اور یہ حُبّ الوطنی کے نشہ سے سرشار فرمانروا سلطنتیں
(Sovereign States) جو دُنیا کو اپنے درمیان تقسیم
کئے ہوئے ہیں، ہمیں کیا دے سکتی ہیں ——! ؟
اشتمالیت، فسطائیت، شہنشاہیت، اشتراکیت اور نازیت
نیشنل سوشلزم ایک بدبختی ہے اور سوشلزم حماقت۔
آج حکومتیں، جنگ اور اسلحہ سازی کے متعلق خود دیوالیہ
ہو رہی ہیں، وہ بھوکی جانوں کو روٹی کیونکر دے سکتی ہیں۔ البتہ وہ
تم سے ٹیکس وصول کر سکتی ہیں اور تمہارے فائدہ کو محدود کر سکتی
ہیں۔ تمہاری خوراک کی افراط کو قلت میں تبدیل کر سکتی ہیں اور تمہارے
نفع کو زیادہ کرنے کے بجائے کم، یہ تمہاری تفریح میں آسانی کے بجائے
مشکلیں پیدا کر سکتی ہیں اور تم سے کہہ سکتی ہیں کہ:۔
بڑھو! بڑھو! قومی جلال و عظمت حاصل کرنے کے لئے بڑھے
چلو! اُٹھو! مادرِ وطن کے تحفظ کے لئے،
ایک مرتبہ پھر مادرِ وطن کی عزت کیلئے آگے کی طرف قدم بڑھاؤ۔
اور یہ حکومتیں یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ حکومت کے مفاد کے لئے اپنا
سب کچھ ہمیں سونپ دو۔

اور موجودہ قدروں کا معیار تمہیں بدکار اور بداخلاق تو کہہ سکتا ہے
لیکن احسن طور پر تمہاری خواہشات کی تکمیل کے اسباب پیدا نہیں کر سکتا۔
جب تم اپنی مجبوریوں کی بنا پر پست ہو جاتے ہو تو وہ تمہیں نفرت
اور طنز کی نگاہ سے دیکھ کر تمہارے زخموں کی تُرشی میں اضافہ کر دیتا ہے
لیکن ہائے پستی کے غار سے اُٹھا کر زندگی کی معراج یا کم از کم شکم سیری
کی معراج پر پہنچانے کیلئے ہاتھ نہیں بڑھاتا۔
وہ محسوس کرتے ہی کرتے چیخ اُٹھتا:۔
جو کچھ ہے، یہ ہے۔! ؟
مرزا ارشاد احمد بیگ چغتائی

عشق کی نزاکتیں

حُسن اگر بہ نازِ خود عشق کو دیکھتا نہیں — عشق بھی ہے بزعمِ خود اس کو بھی اعتنا نہیں
پہلے یہ ربط و ضبط تھا اب ہے یہ بے تعلقی — حسن کو جیسے عشق سے دور کا واسطا نہیں
ان کی نگاہ پڑتے ہی شیشۂ دل بکھر گیا — اُف رے مری نزاکتیں بارِ نظر اُٹھا نہیں

کیئے تو حُسن کے اس کا حال آپ ہیں مضطرب سے کیوں
جالب خستہ سے اگر آپ کو واسطا نہیں !؟

جالب مرادآبادی

ہندوستان میں صنعتی جدوجہد

(ایک ماہرِ فن کے قلم سے)

ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کو اپنی اہم اور ناگہانی ضروریات کا بندوبست کرنا چاہئے۔ اس کام میں مدد کرنے کے لئے روجر کمیشن وارد ہوا ہے لیکن اجنبی لوگ اپنے فن میں کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں پھر بھی اجنبی کی حیثیت سے وہ اس مقصد کو کس طرح پورا کرینگے ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہر ہندوستانی مسئلہ جس سے ہندوستانی بخوبی واقف ہوتے ہیں نئے لوگوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس کا از سرِ نو مطالعہ کریں اور ان لوگوں کو وقت کے تقاضوں کے خلاف نتائج پر پہنچنا پڑتا ہے۔

میں جرأت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اجنبیوں کے ایسے کمیشنوں کے مقابلہ میں وہ سول سروس زیادہ اچھی طرح مسائل حل کر سکتی ہے جو لکڑی کی طرح غبی واقع ہوئی ہے۔ سول سروس والے باوجودیکہ وہ ظاہری ٹیپ ٹاپ، مسودات، رپورٹوں، حکموں اور ہر اُس چیز کے عادی ہوتے ہیں جسے لکیر کا فقیر ہونا کہا جاتا ہے۔ تاہم وہ بھی فیصلوں تک پہنچنے میں عجلت اور عظیم کاموں کو اختیار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ سول سروس کی یہ خاصیت اسکی مضبوطی بھی کہی جا سکتی ہے اور اس کی کمزوری پر بھی اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ سول سروس کسی چیز کو قائم تو رکھ سکتی ہے لیکن نئی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتی۔

موجودہ صورتِ حال کا مطالبہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو منظرِ عام پر لایا جائے جو فکرِ سلیم سے مالا مال ہوں اور جو ظاہری شکل و صورت کی پرستاری اور پرانی ڈگر سے کم وابستگی رکھتے ہوں۔ یہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جنہیں پیداوار اور اُسے منظم کرنے کا کافی تجربہ ہو اور جو اپنے اپنے کاموں کو عملی طور پر جاری کر دینے کا سچا میلان بھی رکھتے ہوں لیکن اگر سول سروس اس کام کے لئے موزوں نہیں تو روجر مشن تو اس سے بھی کم تجربہ رکھتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسی جماعت جو ہندوستانیوں پر مشتمل نہ ہو جسے ہندوستان کا ذرہ برابر تجربہ بھی نہ ہو، جو ہندوستانیوں کا اعتماد بھی حاصل نہ کر سکے، اور جسے یہ طاقت بھی حاصل نہ ہو کہ وہ ہندوستانیوں کا تعاون ہی حاصل کر سکے وہ ہندوستان میں یہاں کی گاڑی کے پہیوں کو کیونکر حرکت میں لا سکتی ہے۔

انگریز ہر چیز کے بارے میں اپنا مخصوص تصور رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھتا ہے کہ دُنیا بھر کے مقابلہ میں صرف اسی کا تصور صحیح اور درست ہے نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی جبلت سے کسی جگہ بھی کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ حتّٰی کہ شہروں اور قصبوں کے ناموں کے متعلق گو کہ وہ ان کا صحیح تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہے لیکن اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جو تلفظ وہ کرتا ہے وہ غلط ہے چنانچہ اس نے بڑی سفاکی سے 'دلّی' کی بجائے (ڈلہی)، 'کالی کتہ' کی بجائے (کلکٹہ) اور 'ممبائی' کی بجائے (بمبے) نام زبردستی ہم پر منڈھ دئے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دیدہ دلیری اور حیرت انگیز خود اعتمادی کے ساتھ اس نے اپنے اقتصادی تصورات اور نظریوں کو ہندوستان کے سر پر اور زیادہ سفاکی کے ساتھ چپکا رکھا ہے۔ انگریز کی ناقابلِ اصلاح ہٹ کا یہ عالم ہے کہ وہ ہندوستانی اقتصادیات کے سلسلہ میں اپنی بنائی ہوئی اسکیم کے علاوہ کسی دوسری اسکیم کو ماننے کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اسکیم یہ بھی کہ ہندوستان زراعتی ملک ہے اور اُسے ہمیشہ زراعتی ملک رہنا چاہئے اس لئے اس کی مالیات کی پالیسی غیر محدود آزاد تجارت پر مبنی ہونی چاہئے۔ تاکہ ہر ملک اسے اپنا دساور بنا کر خوب خوب مال فروخت کرتا رہے اور ہندوستان کی دیسی مصنوعات جہنم میں جائیں۔

ہندوستان نے اس پالیسی کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

ہندوستانی خوب جانتے تھے کہ ہندوستانی اقتصادیات کیلئے اس غیر محدود آزاد تجارت کے کیا معنی ہیں۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ محض زمین پر انحصار کرکے معیارِ زندگی اونچا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس امر سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ زراعت کی مدد کیلئے ملک کو واقعی طور پر صنعتی بنانا ایک اہم اور ضروری خواہش ہے۔ ہندوستان میں افلاس کا جو عالم تھا اس کی نظیر دُنیا کے کسی اور مہذب ملک میں موجود نہ تھی۔ اس افلاس کو دور کرنے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے انگریز کے پاس کوئی اسکیم نہ تھی برخلاف اسکے ہندوستانی کے ذہن میں ایک اسکیم تھی لیکن اُسے جاری کرنے کے لئے جو طاقت درکار ہوتی ہے اس پر اُسے قابو حاصل نہ تھا لیکن انگریز نے کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا، کہ اپنے مفاد کے متعلق انگریز کے مقابلہ میں خود ہندوستانی بہتر علم رکھتا ہے۔ لہذا بڑی بے رحمی کے ساتھ اس نے اپنی رائے پر عمل درآمد کرنا شروع کردیا۔ یہ عمل درآمد بڑے قاعدے اور سلیقہ کے ساتھ کیا گیا۔ سائنٹفک انداز میں کیا گیا اور انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ اس طرح آزاد تجارت کو اس حد تک آگے ڈھکیلا گیا کہ جب آمدنی کے لئے درآمد کے مال پر ۳ ½ فی صدی محصول لگایا گیا تو اس کے اثرات کو برابر کرنے کی غرض سے حکومت ہند نے فوراً وہائٹ ہال کے حکم کے ماتحت ہندوستانی روئی کے کارخانوں کی پیداوار پر اکسائز محصول بشرح ۳ ½ فی صدی عائد کردیا۔

ابتدائی مرحلہ میں، روئی، لوہے، شکر اور بہت سی دوسری صنعتوں کو اسی قسم کی آزمائشوں میں سے ہوکر گزرنا پڑا ہے۔ لیکن گذشتہ جنگ عظیم نے ہندوستان کی صنعتی توسیع کو ایک اور پلٹا دیا اور اس سے جو حالات پیدا ہوئے انہوں نے ہندوستانی صنعت سازی کو اور اُبھارا جو چیز ایک اسکیم کے ماتحت ہونی چاہئے تھی وہ قدرتی جذبہ کے ماتحت ظہور میں آئی۔ ہندوستانیوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس طرح سرکاری ہمت شکنی کے باوجود صناعت نے ہندوستان میں نیا قدم جما لیا۔

جنگ عظیم کے بعد گورنمنٹ نے تھوڑا بہت محسوس کرنا شروع کردیا کہ آزاد تجارت کے معاملہ میں وہ حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہ دور جو جنگ کے بعد آیا اس کے دوران میں آزاد تجارت کے تصور کے متعلق خود انگلستان تک میں ایک نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ ہوا یہ کہ یورپ کے دوسرے ممالک نے تجارت کے میدان میں زبردست مقابلہ شروع کردیا۔ جرمنی نے جیسے تاوانِ جنگ کی اسکیم کے ماتحت انگلستان کو زبردست سالانہ رقمیں دینی ہوتی تھیں۔ خاص طور پر تجارتی مقابلہ کی ٹھان لی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں انگلستان کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ آزاد تجارت کی حمایت سے دستبردار ہو جائے۔ اس لئے مابعد جنگ کے دوران میں ایک نئی پالیسی ڈھالی گئی جس نے ایک حد تک ہندوستان کی بھی معاونت کی۔ جنگ کے بعد تحفظاتی پالیسی کی نوعیت دودھ اور پانی کی تھی۔ اس پالیسی کا نام "امتیازی تحفظ" رکھا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ کی گورنمنٹ نے ایک مالی کمیشن مقرر کیا کہ وہ حکومت ہند کی مالیات کی پالیسی کے متعلق مشورہ دے۔ اس کمیشن نے لمبے چوڑے دورے کئے اور سخت محنت اور کاوش کے بعد دو رپورٹیں مرتب کیں۔ ایک رپورٹ میں خالص ہندوستانیوں کی رائے کو ظاہر کیا گیا تھا اور دوسری رپورٹ، ملی جلی نوعیت رکھتی تھی جسے برطانی و ہندوستانی رائے کہا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری ہی رپورٹ تھی جس نے "امتیازی تحفظ" کی اصطلاح کو گھڑا تھا۔ اور گورنمنٹ سے سفارش کی تھی کہ مالی معاملات میں اس کی پالیسی آئندہ اسی اصول کے مطابق ہونی چاہئے۔ حکومت ہند نے اس مؤخرالذکر رپورٹ ہی کو بالآخر منظور کیا۔ اس واقعہ نے ہندوستانیوں کے دلوں میں کوئی شبہ نہ رکھا کہ گورنمنٹ ہند ہندوستانی صنعتوں کو آگے بڑھانے کیلئے بالکل آمادہ نہیں۔ اس کے بعد ہندوستانیوں کی تجارتی جد و جہد سے سامراجی ترجیح سروں پر منڈلانے لگی۔ اب اس بات کے سمجھنے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ملک معظم کی حکومت کی اسکیم یہ تھی کہ ہندوستان میں صرف وہ صنعتیں فروغ پائیں جو برطانی اشیاء درآمد کے مقابلہ میں نہ آسکیں۔ مختصراً یہ کہ جنگِ عظیم کے بعد "تجارتی تحفظ" کا قانون عملاً صرف غیر برطانی اشیائے درآمد کے خلاف تھا۔ ظاہر ہے کہ صنعتی ترقی اس سے رک گئی۔ تاہم اگر سرکاری پالیسی بیدلی اور کنجوسی کے ساتھ چلائی جا رہی تھی تو کیا تھا

قدرت اپنے طریقہ پر وقتاً فوقتاً اڑچن لگاتی رہتی تھی، ہندوستانی صنعت ساز بھی ایسے موقعوں کو فوراً لپک لینے میں سستی نہ کرتے تھے۔ ایسا دور اس وقت تھا جب سر جارج شسٹر حکومت ہند کے ممبر مال تھے۔ جب ہندوستان کو زیادہ آمدنی کی ضرورت پڑی تو دباؤ کے ماتحت محصولات درآمد میں اضافہ کرنا پڑا۔ ہندوستانی صنعت کو اس سے فائدہ پہنچا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ سر جارج شسٹر ایک صاحب تخیل انسان تھا۔ حتی الامکان ہندوستان کو منصفانہ طور پر مواقع بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کے جانشین سر جیمیس گرگ نے بالکل برعکس پالیسی اختیار کی اور ہندوستانی صنعتی ترقی اور توسیع سے اپنی مخاصمت کو کبھی نہیں چھپایا۔ اسکے بعد موجودہ جنگ شروع ہوگئی۔ یہ ہے مختصر داستان ہندوستانی صنعتوں کی تاریخ اور جدوجہد کی۔

پچھلی تاریخ دہرانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہندوستانی صنعت سازی کو اپنے جنم سے لیکر اب تک کتنی زبردست قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ پیدائش کے وقت بچہ کو حفاظت کے لئے ماں کی نگرانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوستانی صنعت کی پیدائش کے وقت یہ پناہ بالکل مفقود تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ بچہ کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنے کی باقاعدہ تدابیر کی جاتی تھیں۔ ایسی ناموافق فضا میں ہندوستانی صناعت کی نشو و نما ہوئی اور اس درجہ پر پہنچی جو اس وقت سب کے سامنے موجود ہے۔

اگر آج کوئی صاحب ہندوستان کو اس بات کے لئے تیار نہیں پاتے کہ وہ اپنی دفاع یا برطانیہ کی امداد کے لئے کافی سامان پیدا کر سکے تو اس کا الزام کس پر عائد ہوتا ہے۔ "نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن"۔ اگست نے بجا طور پر لکھا ہے:-

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے کبھی یہ پسند ہی نہ کیا کہ ہندوستان کے لامحدود ذرائع کو پورے پورے طور پر ترقی دیں۔ گذشتہ صدی کی کل مدت میں ذاتی مفاد کی تنگ خیالی نے ایک ایسی اقتصادی پالیسی کو مسلط کرایا جو ہندوستان کو محض خام اشیا مہیا کرنیکا سرچشمہ سمجھتی تھی اور جس کی بنا پر ہندوستان میں جدید صناعتی ترقی کو یا تو نظر انداز کیا گیا اور یا اس کی ہمت شکنی کی گئی۔

راستہ میں کیا چیز حائل ہوئی؟ جزوی طور پر کم نظر بنیا پن جو یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان محض کسانوں کا پس افتادہ ملک بنا رہے اور جزوی طور پر سیاسی بے اعتمادی۔ یہ دونوں توجیہیں اگر انہیں حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھا جائے تو گھل مل کر ایک ہی چیز بن جاتی ہیں۔"

شاید اس سے زیادہ سچے الفاظ کبھی منھ سے نہ نکلے ہوں گے۔

اگر تلافی مافات کرنی ہے تو وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ دوران جنگ کی صنعت سازی کو محض گورنمنٹ یا گورے چمڑے کے لوگوں تک محدود نہ کیا جائے۔ حصول مقصد کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا کامل اعتماد کیا جائے۔

بعض صاحبان یہ کہتے ہیں کہ روجر کمیشن کا تقرر اس لئے نہیں ہوا ہے کہ ہندوستانی اثرات کو نکال باہر کیا جائے۔ بلکہ معاملہ کی نوعیت ایسی ہے کہ دوران جنگ کی پیداوار کی رہنمائی کے لئے ماہرین کی رائے حاصل کرنی ضروری تھی اور ہندوستان میں ایسے ماہرین دستیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ استدلال ایک زبردست کفر ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ بڑی سے بڑی مخالفت کی فضا میں ہندوستانی صناعت پروان چڑھی ہے، کیا یہ شہادت اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ ہندوستانی صنعت سازوں میں استقلال منظم کرنے کی قابلیت اور تجارت کرنے کا مادّہ کافی سے زیادہ موجود ہے۔ کسی بھی صنعت کے ہندوستانی کارخانہ کا چٹھا اٹھائیے اور اس کا مقابلہ کسی ایسے کارخانہ کے چٹھے سے کیجئے جو یا انگریز کی ملکیت ہو یا اسکے زیر اہتمام ہو اور پھر خود نتیجہ دیکھئے۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے جسے روپیہ لگانے والی پبلک خوب جانتی ہے کہ روئی، کاغذ، شکر، چونا، یا جوٹ میں جہاں کہیں ہندوستانی اور انگریز کارخانے برابر برابر یکساں حالات میں کام کر رہے ہیں ہر جگہ ہندوستانیوں کے مملوکہ کارخانے زیادہ بہتر نتائج دکھاتے ہیں۔

اگر حکومت فی الواقع چاہتی ہے کہ کارآمد نتائج برآمد ہوں تو اُسے چاہئے کہ اپنی ضروریات کو ہندوستانی صنعت سازوں کی ایک کانفرنس کے سامنے پیش کرے، وقت کا تعین کرے اور نئی جدوجہد میں ہندوستانی صنعتوں کی امداد کا وعدہ کرے۔ اگر ایسا کیا جائے تو ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں گورنمنٹ کو نتائج کی طرف سے ہرگز مایوس نہ ہونا پڑے گا۔ "ادارہ"

لیکن کیا گورنمنٹ ہم پر بھروسہ کرے گی؟ کون کہہ سکتا ہے۔ (ترجمہ)

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صِنفِ نازک کا ایک یادگار مشاعرہ

مرتبہ محترمہ حمیدہ سلطان، احمد دہلوی

روداد

پچھلی سردیوں میں شیلانگ سے واپس آئے پندرہ دن بھی نہ گذرے ہونگے کہ مسز آصف علی نے دورانِ ملاقات میں ایک زنانہ مشاعرہ براڈکاسٹ ہونے کی تمنا ظاہر کی۔ مگر سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے خود انتظامات کرنے سے معذور رہیں۔

میں نے اندازہ کیا ان کو بڑا شوق ہے کہ دلی کی یادگار تاریخی اور شعر آفریں فضاؤں میں ایک شاندار زنانہ مشاعرہ منعقد ہو اور سارے ہندوستان سے خراجِ تحسین وصول کرے۔

آرزو، اپنی، اگر مشاعرہ کے انتظامات کا بوجھ رکھ دیا میرے کاندھوں پر، برسوں کا میل جول، دلی شفقت و محبت! میں انکار نہ کرسکی ورنہ مجھے ایسے کاموں سے کچھ دلچسپی نہیں جس میں ذرا بھی نام و نمود کا شائبہ ہو، ایک تو ان کا حکم، پھر خود بھی اپنی جنس کو شعر و ادب میں حصہ لیتے ہوئے دیکھنے کا شوق!..... میں نے کہا، سرِ تسلیم خم ہے ——

وقت کم، شاعر بہنوں کا جمع کرنا، کلام کی جانچ پڑتال، ایک مشکل تھوڑے ہی درپیش تھی!؟

لیکن خدا کا شکر ہے اٹھائیس جنوری ۱۹۴۲ء کے عورتوں کے پروگرام میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے یہ پہلا زنانہ مشاعرہ نشر ہوا،

(۲)

مگر ایک تو وقت کی کمی، دوسرے ریڈیو کی پابندیاں، کچھ آزادی اطمینان سے اس مشاعرہ کا لطف حاصل نہ ہو سکا، نہ سب بہنیں اس میں حصہ لے سکیں اس میں نے مسز آصف علی سے اپنی آرزو ظاہر کی کہ ایک مشاعرہ لیڈیز کلب دلی کی طرف سے منعقد کیا جائے، اس میں خوش ذوق ہندو مسلم خواتین حصہ لیں۔ اس مرتبہ بھی انتظامات کا بار میں نے اپنے ہی کاندھوں پر لیا؟

مسز آصف علی نے میری تجویز کو سراہا اور مشاعرہ کے انتظامات ہونے لگے۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا، لینے کو تو اتنی بڑی ذمہ داری لے لی، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو مستقل مصیبت ہے۔ اس مشاعرہ سے وہ کوفت ہوئی کہ توبہ ہی بھلی۔

صدر کے انتخاب کا سوال پیدا ہوا، چند معزز بہنوں کو میں نے گھر پر تکلیف دی، ان سب نے رائے دی، بیگم نواب [illegible] کو صدر بنایا جائے میں نے کہا، بیگم صاحبہ اس کی اہل ہیں، مگر یہ کیا، دلی میں مشاعرہ ہو، اور صدر باہر سے بلایا جائے[1]!؟

بڑی ردّ و کد اور کئی گھنٹوں کی جھک جھک کے بعد ایک بزرگ خاتون (؟) کو صدارت کیلئے منتخب کیا گیا، ان خاتون نے پہلے صدارت تو قبول کر لی مگر فرقہ دارانہ سوال اور مذہبی جھگڑے نکالے "اے بی بی! سرسوتی بھون ہندوؤں کا کلب، اور وہاں مشاعرہ!؟ میں تو پسند نہیں کرتی۔"

آخر ان سے بھی مایوس ہونا پڑا، میری آرزو تھی: دہلی کی کوئی خاتون صدر بنیں (!!)، ورنہ خواتین کی کوئی کمی تھی۔ ہر اعلیٰ افسر کی بیگم کرسیٔ صدارت

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

[1] اب پنجابیوں کو شکایت نہیں ——"!؟"

متمکن ہوسکتی تھیں۔

آخر مسز آصف علی کے مشورہ سے محترمہ خواجہ بانو صاحبہ اہلیہ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کو صدر تجویز کیا گیا۔ یہ مرحلہ بھی خدا خدا کرکے طے ہوا۔

کسی نہ کسی طرح تاریخ مشاعرہ کا تعین کیا گیا۔ ۲۶ مارچ ۱۹۴۳ء کے لئے خاص و عام خواتین کو دعوت دیدی گئی۔

ہر خاتون کے پاس خود جا جا کر، الگ منت سماجت کی، ٹیلیفون الگ، دلی جیسا بڑا شہر، مگر اس شہر میں جسے شعر و ادب کا مرکز کہا جاتا ہے بیس سے زیادہ بیبیاں نہ مل سکیں، اور پھر ان بیس کو جمع کرنے میں بھی جو مشکلیں مجھے اٹھانی پڑیں کچھ میرا ہی جی جانتا ہے۔

عورتوں میں شعر و ادب کی کافی ترقی ہوسکتی ہے مگر ——— بیجا قیود کی بدولت غریب عورتوں کے دماغ سے صلاحیتِ شعری بالکل فنا ہوگئی ہے ورنہ شعر و نغمہ صنفِ نازک کا خاص حصہ ہے، ان فنون سے تو عورت کو ایک خاص، صناعی اور قدرتی لگاؤ ہے۔

مشاعرہ کے سلسلے میں فروری کے مہینے سے لیکر مارچ کی ۲۶ر تک میری سرگردانی اسمبلی و کونسل کے امیدواروں کے الیکشن کی طرح تھی۔ اک جنون تھا، وقت الگ صرف کر رہی تھی، روپیہ الگ برباد ہو رہا تھا مگر چاہتی تھی کہ کسی طرح مشاعرہ کامیاب ہو۔

اب یہاں سے وہ مرحلہ سنیئے جس نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

کوئی مشاعرہ سے دو دن پہلے حضرت خواجہ حسن نظامی نے ٹیلیفون پر فرمایا: —

"سنا ہے ۲۶ر تاریخ کو کلب میں میوزک کانفرنس کا جلسہ ہے اور انعام تقسیم کرنے کے لئے چیف کمشنر صاحب آنے والے ہیں، کیا یہ صحیح ہے ——— !؟"

مجھے بڑا تعجب ہوا، مگر خیر میں نے تحقیق کی، سکریٹری نے کہا آپ کو غلط خبر ملی، میوزک کانفرنس کے جلسے ۲۵ر تک ہوگئے — مشاعرہ کے علاوہ ۲۶ر کو کلب میں کوئی جلسہ نہیں ہے۔

معلوم ہوگیا، مشاعرہ کوئی میری ذاتی چیز نہ تھا، لیڈیز کلب دہلی کی طرف سے تھا، میں تو صرف ایک کارکن تھی۔

انتظام اور دیکھ بھال کی غرض سے ۲۶ر کو ۳ بجے کلب پہنچ گئی مجھے پہنچے مشکل سے پاؤ گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ کلب کے ملازم نے آکر کہا:۔

"کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں" یا الٰہی بغیر تعارف کسی اجنبی سے ملاقات، پوچھو وہ کیوں ملنا چاہتے ہیں — !؟

ایک اور بہن نے بھی جو کام میں مدد دے رہی تھیں میری تائید کی، یکایک ملازم واپس آیا اور اس نے ایک خط دیا۔ یہ خط قبلہ خواجہ صاحب کا تھا۔ اس خط میں خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا: —

"یہ نواب زادہ شہاب الدین صاحب ہیں۔ انہوں نے میوزک کانفرنس کی ہے۔ آپ ۷ ½ بجے مشاعرہ ختم کردیں اور ان کو اطمینان دلادیں۔"

مجھے خواجہ صاحب کی اس مداخلت بیجا پر غصہ تو آیا لیکن ان کی بیگم صاحبہ صدر تھیں۔ آپ خود فیصلہ کیجئے کہ بااختیار ہوتے ہوئے خواجہ صاحب قبلہ کا رویہ کس قدر غلط اور زیادتی پر مبنی تھا، کیا کرسکتی تھی، چپ ہو رہی، مگر میں نے کلب کے ملازم کے ذریعہ نوابزادہ شہاب الدین سے کہلوادیا، آج مشاعرہ روکا نہیں جاسکتا، نہ کسی جلسے وغیرہ کیلئے کلب دیا جاسکتا ہے۔ آپ کوئی دوسرا انتظام کرلیں۔

کوئی بس نہ چلا، تو شہاب الدین صاحب نے رشتہ داری کا راگ الاپا۔ پاٹودی سے اپنے تعلقات بتلائے۔ سابق بیگم صاحبہ پاٹودی میری عزیز ہیں۔ مجبوراً مجھے خود ان حضرت سے گفتگو کرنی پڑی لیکن نواب زادہ صاحب کی پیچیدہ اور مسلسل تقریر جس میں میری مدح اور اپنی مجبوری، حالات پر تبصرہ سبھی کچھ تھا، عجیب تقریر تھی، میں چاہتی تھی کہ یہ وقت کی قیمت جانیں، کام بہت ہے، مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور تقریر جاری رکھی "میری محنت اکارت ہو جائے گی، چیف کمشنر صاحب کے سامنے میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ آٹھ بجے مشاعرہ ختم کردیجئے، مجھے ندامت سے بچا لیجئے۔"

آخر میں نے کہا کہ اگر مسز آصف علی اجازت دیں تو ۸ ½ بجے آجائیے اس سے پہلے مشاعرہ ختم نہیں ہوسکتا۔ کیا دلچسپ بات ہوئی، نواب زادہ صاحب نے فرمایا "میں مسز آصف علی صاحب سے ملا تھا انہوں نے فرمایا آج ہال کا مکمل اختیار حمیدہ سلطان صاحبہ کو ہے"۔

مشاعرہ کیلئے ہال لیا جا چکا تھا لیڈیز کلب دہلی کی طرف سے مشاعرہ تھا۔ میں مشاعرہ کی سکریٹری تھی، کلب کی نہ تھی، ان کی ذمہ داری تھی کہ موجود رہتیں۔

بہرحال وہ چلے گئے اور میں نے مسز آصف علی صاحب کو بذریعہ ٹیلیفون حالات سے آگاہ کر دیا۔ اس دن مسز آصف علی صاحب کی والدہ محترمہ کا آپریشن تھا اس لئے مسز آصف علی پریشان اور مصروف تھیں۔

آغاز مشاعرہ

ان قیامت کی باتوں کے بعد ٹھیک ۹ بجے مشاعرہ استقبالیہ نظم سے شروع ہوا۔ اسکے بعد خواجہ بانو صاحبہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ بعض بہنوں کا خیال ہے کہ یوں تو صدر صاحبہ کی ہر بات سر آنکھوں پر مگر اس فضا کیلئے یہ خطبہ قطعی ناموزوں تھا۔

ہال خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہت سی بچوں والی اہلِ ذوق بہنیں ہال سے باہر بیٹھی ہیں۔ اس لئے کہ بچوں کو ہال میں لانے کی اجازت نہ تھی۔ خواتین کا ایک عظیم الشان مجمع تھا اور میں بڑی مسرور تھی کہ میری محنتوں کا ثمر مجھے مل رہا ہے۔ باوجود علالت کے باوجود میرٹھ سے اردو زبان کی مشہور شاعرہ و ادیبہ خاتون بلقیس جمال صاحبہ تشریف لائی تھیں۔ اور بھی کئی بہنیں آس پاس سے آگئی تھیں۔ صفیہ بیگم صاحبہ شمیم ملیح آبادی اپنے مخصوص انداز اور دلنواز ترنم میں اپنی شاہکار نظم عورت سنا رہی تھیں۔ سننے والیاں محوِ حیرت تھیں۔ شمیم کی دلکش آواز نے جادو سا کر دیا تھا۔

یکایک ایک بہن نے سرگوشی کے انداز میں آکر کہا، چیف کمشنر صاحب، نواب زادے صاحب اور خواجہ صاحب آگئے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں مشاعرہ ختم کر دیجئے۔ مشاعرہ کی کارروائی ابھی جاری تھی اور میں نے نواب زادہ صاحب سے کہہ دیا تھا۔ آپ ۸ ½ بجے آجائیں۔ ۱۵ منٹ سے پہلے کارروائی ختم نہیں کی جا سکتی۔

چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ دوسری بہن پیغام لائیں۔ چیف کمشنر صاحب آپ کو سلام دیتے ہیں۔ میں نے ان بہن سے کہا، آپ ان کو کمرہ میں بٹھائیے اور ۱۵ منٹ کے لئے معافی مانگ لیجئے۔

سکریٹری صاحب کلب سے کہا کہ ہال کے دروازے بند کرا دیجئے۔ وہ حیران و سراسیمہ تھیں۔ میں نے خود جانا چاہا۔ بہرحال اس سراسیمگی میں تھی کہ ایک عقل مند بہن نے بلند آواز سے کہا کہ چیف کمشنر صاحب آگئے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ خواجہ بانو صاحبہ کرسیٔ صدارت سے کھڑی ہوگئیں۔

یہ حال دیکھ کر پردہ نشیں خواتین گھبرا گئیں۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مجمع منتشر نہ ہو۔ لیکن توبہ صاحب طوطی کی آواز نقار خانے میں کون سنتا ہے۔ چند ہی منٹ میں ہال خالی ہوگیا۔

یہ بے ترتیبی سکریٹری صاحب کی غفلت اور حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی بیجا مداخلت کا نتیجہ تھی۔ ورنہ ان نواب زادہ صاحب کو یہ جرأت ہو نہیں سکتی تھی۔ دوسرے دن میں نے خواجہ صاحب قبلہ سے اس طرح مشاعرہ کو برباد کر دینے میں حصہ لینے کے متعلق شکوہ کیا، دلی رنج اور اپنی سُبکی کے خیال نے میرا لہجہ سخت کر دیا تھا، اور یہ قدرتی طور پر تھا۔

اسکے جواب میں سُنا ہے خواجہ صاحب قبلہ نے منادی میں لکھا کہ بیگم صاحبہ نے بیجا غصہ کیا اور میں نے صبر۔ حالانکہ یہ غلط بیان خواجہ صاحب کی ثقاہت کیلئے موزوں نہ تھا۔ شریف بیگمات اور پردہ نشیں خواتین کے اتنے بڑے مجمع کو منتشر کر دینے کی رسوائی اور دہلی کے سب سے پہلے زنانہ مشاعرہ کی برہمی کا الزام ان کے سر پر ہے۔

میری ڈیڑھ ماہ کی ان تھک مسلسل کوششوں کو خواجہ صاحب قبلہ نے خاک میں ملا دیا اور اس پر یہ فرماتے ہیں کہ اک مسلمان عورت کی دلیری دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی ——— !؟

غریب مسلمان عورت کی ہر کوشش کو منہدم کرنے میں ایسے محترم بزرگوں کا ہاتھ نہ ہو تو وہ بھی اپنی اخلاقی خوبیوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی اہلیت رکھتی ہے لیکن جب ایسے لوگ جو ادب اردو کے بڑے حامی اور سرپرست بن کر بھی اس کی جڑ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ پنپنے کے آثار نہیں کہے جا سکتے۔

مجھے افسوس ہے کہ اپنی مصروفیت اور علالت کے باعث روداد

مشاعرہ دیر سے شائع کر رہی ہوں۔

اب ان شاعر خواتین کا کلام ملاحظہ فرمایئے جو اس مشاعرہ میں شریک ہوئیں۔ اور جنہوں نے اپنے اعلیٰ اور لطیف خیالات اور جذبات سے حاضرین کو محظوظ و مستفید کیا۔

حمیدہ سلطان

"نواب زادہ موصوف" میرے بھی شناسا ہیں۔ مشاعرہ کے سلسلے میں ایک یادگار لطیفہ ہوا، یعنی چیف کمشنر صاحب کو انہوں نے مدعو کیا اور انگریز کے سوشل وعدہ کے باوجود ان کی "ہیچمدانی" نے ان کو یقین دلا دیا کہ "دلی کا قادرِ مطلق" ایسی معمولی کانفرنس میں کیا آسکتا ہے۔ مگر ۸ بجے کمشنر صاحب سرسوتی بھون کے گیٹ پر موجود تھے اور گیٹ بند۔ ہال کا جہاں تک تعلق تھا خالی ہوتا تب بھی بالو جوہ نہیں کھل سکتا تھا مگر چیف کمشنر صاحب کے آجانے سے حادثاتی طور پر ان کو ہال دلا دیا، مردوں کا بس محض اس لئے چل گیا کہ عورتوں کا جلسہ تھا۔ ان عورتوں کا جو مدافعت تو درکنار آنکھ بھی نہیں ملا سکتیں۔

میرے خیال میں یہ کافی درس آموز روداد ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "مسلمان عورت" کس قدر مجبور ہے!؟

ساغر

تہنیّت

آسمانِ نیلگوں پر ضو فشاں ہے ماہتاب
سلکِ گوہر کی طرح بکھری ہے سلکِ کہکشاں

ٹمٹماتے ہیں ستارے جس طرح چشمِ حباب
ہے فضا ساکن، زمیں خاموش، ساکت آسماں

یاسمیں کے سیم گوں غنچے بھی ہیں سوئے ہوئے
ہے تقاطرِ شبنمِ گل ریز کا گوہر تراش

برگِ گل ہائے حسیں اک کیف میں کھوئے ہوئے
اک شعاعِ نور سی ہے آسماں سے سیم پاش

رک گئیں امواج ساکن ہو گیا آبِ رواں
نیلوفر آغوش جو میں سو رہا ہے بے حجاب

جھک گئیں خاموش چشمہ کے کنارے ڈالیاں
عکسِ مہ سے اک تجلّی ہے تہِ دامانِ آب

اس فضائے کیف آور میں یہ بزمِ رنگ و بو
محفلِ رنگیں میں جوشِ شوق و سامانِ طرب

ذرّہ ذرّہ سے نمایاں انبساطِ آرزو
پتّہ پتّہ گل بداماں گل بدوش و گل بکف

مرحبا جوشِ تمنّا حبّذا شوقِ سرور
عشرتِ رنگیں سے ہے تابش فزا تارِ نظر

مرتعش ہے قلب کے پردوں میں اک کیفِ طہور
ہے شبِ امید میں عکسِ تجلّائے سحر

آرزوئے دیرینہ امیدوں کی بر آئی ہے آج
عشرتِ شامِ تمنّا رشکِ صبحِ عید ہے

لے رہی ہے رونقِ شب صبحِ فردا سے خراج
فضلِ ربّانی کی شامل اس طرح تائید ہے

ہو مبارک آپ کو اے ہم نوایانِ چمن
محفلِ عشرت فروزاں جلسۂ شوق آفریں

ہو مبارک آپ کو اے نکتہ سنجانِ سخن
مجلسِ شعر و ادب بزمِ لطیفِ دل نشیں

یہ گلستاں حشر تک گل ریز و گل افشاں رہے
اہلِ گلشن کی نوائیں آسماں افراز ہوں

یہ چمن زارِ ادب پنہاں طرب ساماں رہے
اب دعا میں اہلِ محفل میری ہم آواز ہوں

تا ابد بزمِ سخن ہو ربِّ عالم پُر بہار
گل بدوش و گل بداماں گل بکف گل در کنار

محترمہ رابعہ پنہاں صاحبہ

طرحی غزلیں

محبوب جہاں صاحبہ

کروں میں اس سے عرضِ مدّعا کیا
وہ سمجھے گا وفا نا آشنا کیا

تمنّا تک ہے لطفِ زندگانی
تمنّا مٹ گئی تو پھر رہا کیا

نہ اب وہ بال و پر ہیں اور نہ جرأت — چھٹے بھی گر قفس سے تو مزا کیا

سُنی جب میری باتیں ہنس کے بولے — یہ ہے تمہیدِ عرضِ مدّعا کیا؟

نہیں جب اُن کو اندازہ جفا کا — تو پھر سمجھینگے وہ میری وفا کیا

محبّت میں جو اے محبوب گذری

کہیں اب تم سے اس کا ماجرا کیا!؟

امت الشکور صاحبہ راز

سفینہ لاپتہ ہے ناخدا کیا — مرے اشکوں کا طوفاں ہے بپا کیا

بہار آتے ہی کھل جاتے ہیں غنچے — بدل جاتی ہے گلشن کی فضا کیا

وہی ہوگا جو قسمت میں لکھا ہے — کسی سے ہم کریں جا کر گلا کیا

پھرا کرتا ہے جو ہم رنگِ مجنوں — بگولے کو بیاباں میں ہوا کیا

نظر آتی ہے صورت رہزنوں کی — بنائیں ہم کسی کو رہنما کیا

چلے آتے ہیں میکش میکدے میں — فلک پر جھوم کر آئی گھٹا کیا

اجل کا رات دن رہتا ہے کھٹکا — نکالے کوئی دل کا حوصلہ کیا

نہ لی کروٹ بشر نے راز مر کر

گئی ہے کان میں کہہ کر قضا کیا

—— ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء

شکیلہ خاتون صاحبہ شکیل

دلِ ناداں تجھے آخر ہوا کیا   کسی کی یاد میں گم ہو گیا کیا
بُرا کوئی کہے لیکن نہ مانو   بھلا سمجھو بُرے کا ماننا کیا
مجھے مقصود ہے تری پرستش   مرے جینے کا ورنہ مدّعا کیا

حیاتِ جاوداں ہے بعدِ مُردن
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

رفعت جہاں صاحبہ نکہت گلشن آبادی

خفا ہو کس لئے مینے کیا کیا   بتاؤ تو ہوئی مجھ سے خطا کیا
حسینوں کا جفا کاری ہے پیشہ   پھر ان کی بیوفائی کا گلہ کیا؟
شکستہ ساز کو کیوں چھیڑتے ہو   مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کیا
جو سر سے پاؤں تک کافر ہیں کافر!   انہیں نامِ خدا سے واسطا کیا
نہیں جب امنِ ساحل کی ضرورت   تو پھر فکرِ خدا و ناخدا کیا
جفا بھی اب تو عنقا ہو گئی ہے   وفا کا ذکر اے نکہت بھلا کیا

آفتاب جہاں صاحبہ آفتاب دہلوی

خوشی کا ذکر کیا غم کا گلہ کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نہیں ملتا محبّت کا نشاں بھی — یہ بدلی ہے زمانے کی ہوا کیا

گناہِ عشق کی میں مرتکب ہوں — ذرا دیکھیں وہ دیتے ہیں سزا کیا

تصوّر میں وہی باتیں ہیں اُن سے — جدا ہو کر وہ ہوتے ہیں جدا کیا

کرم کرتے نہیں چلیے نہ کیجیے — ستم کی لذّتوں کا پوچھنا کیا

ڈرے میری بلا سیلابِ غم سے — خدا جب آشنا ہے نا خدا کیا

نہیں کچھ اعتبارِ زندگانی — مگر دل میں تمنّائیں ہیں کیا کیا

مسرّت ہے نہ الفت ہے، نہ راحت — الٰہی تیری دُنیا کو ہوا کیا

جہاں ہو آفتابِ عالم آرا
وہاں کی روشنی کا پوچھنا کیا

(باقی)

مشاعرہ کی باقی غزلیں نومبر ۱۹۴۰ء میں شائع کی جائیں گی۔ یہ ایک نادر شے الیشیا میں شائع ہو رہی ہے جسے شدید فنی نقطۂ نگاہ سے ہرگز نہیں دیکھنا چاہئے۔ ممکن ہے اسی ہجوم میں سے کوئی سرو جنی اور قرۃ العین (طاہرہ) پیدا ہو جائے۔ (ساغر)

جدائی کا گیت

(سید مطلبی فرید آبادی)

جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ
مت دُگدا میں مُنہ کو موڑ ــــــ چلا ہوں تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

(۱) تیری یاد نہیں بھولے گی — من کی بگیا میں تو جھولے گی
ٹھنڈے سانس یہاں تو لے گی — دل کی کلی واں نا پھولے گی
پلک اُٹھا، مت دل کو توڑ — مت دُگدا میں مُنہ کو موڑ ــــــ چلا ہوں تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

(۲) تو ہر دے میں بسی ہے رانی — رگ رگ میں تو رسی ہے رانی
پریم جال میں پھنسی ہے رانی — مجھ مجنوں کی سسّی ہے رانی
پربت دکھا، نا سر پہ سکو توڑ — مت دُگدا میں مُنہ کو موڑ ــــــ چلا ہوں تجھکو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

(۳) پھر اچھے دن آئیں گے رانی — بچھڑے سب مل جائیں گے رانی
دیس کے باسی گائیں گے رانی — جھنڈوں کو لہرائیں گے رانی
دو ہی دنا کی بات ہے، رانی میرا پلا چھوڑ — مت دُگدا میں منہ کو موڑ ــــــ چلا ہوں تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

(۴) سورج، بادل، چند، ستارے — سب موئے دی کھیں کارے کارے
پربت، ریت، سینچی، پیارے — کوئی نہ دی کھے گھرے اندھارے
دیس بھگتی کی گیل تو چھوڑ — مت دُگدا میں مُنہ کو موڑ ــــــ چلا ہوں تجھ کو چھوڑ

(۵) ایسی ہوک اُٹھی ہے من میں — ایسی آگ لگی ہے تن میں
اگنی پھیلے جیسے بن میں — اگنی ہی اگنی جیون میں
نہیں تو جل نا جاؤ پیاری پلا سید کا دے چھوڑ
مت دُگدا میں مُنہ کو موڑ ــ مت دل توڑ ــــ نا سر پہ مروڑ ــــ میرا پلا چھوڑ ــــ چلا ہوں تجھ کو چھوڑ
جیل چلا ہے، دیس سپاہی، رانی تجھ کو چھوڑ

---

۱ آنچل ۲ تجھ ۳ مجنوں اور سسّی پنجاب کے مجنوں ولیلیٰ ۴ جسم ۵ سکھ ۶ دونوں ۷ دامن ۸ مجھے ۹ دکھائی دیتے ہیں ۱۰ محبت ۱۱ رسم ۱۲ ہوا خواہ ۱۳ شہید وطن ۱۴ آگ۔

عیدِ نظّارہ

(محترمہ عزیز جہاں بیگم اداؔ)

مژدہ نگاہِ شوق! کہ عیدِ نظّارہ ہے
پلکیں کسی کی راہگذر میں بچھاؤں میں

آمد ہے آج ایک سراپا بہار کی
سو طرح غمکدے کو اپنے سجاؤں میں

خورشید کی جبیں سے کرن مستعار لوں
مہتاب سے ضیائے جواں مانگ لاؤں میں

دامانِ ابرِ تیرہ سے گوہر سمیٹ لوں
قوسِ قزح کے رنگ سے محفل رچاؤں میں

باغِ ارم سے آرزوئے رنگ و بو کروں
روئے شفق سے غازۂ احمر چھڑاؤں میں

شبنم سے اشکہائے گہرتاب چھین لوں
غنچے کے لعل لب سے تبسم چراؤں میں

بلبل سے پاکبازیٔ الفت طلب کروں
معصومیٔ شباب کو پھولوں سے چھاؤں میں

جذب و وفا و ہمتِ پروانہ چاہیے
بہرِ گداز و سوز سوئے شمع جاؤں میں

رنگینیاں شراب سے تھوڑی سی مانگ لوں
اور سادگی طفلکِ معصوم پاؤں میں

ظلمت میں ہو نہ نور فشاں ماہِ نیم ماہ
بہرِ نثار ساغرِ انجم منگاؤں میں

وہ اور میرے گھر میں ہوں مہماں خوشا نصیب
گلہائے اشکِ سرخ سے دیپک جلاؤں میں

آنکھوں کو میری دولتِ دیدار ہے نصیب
خود کو نہ ان کے شوق میں کیوں بھول جاؤں میں

وہ ابتدا سے آج سنیں گے حدیثِ غم
بلبل کی طرزِ نغمۂ رنگیں اڑاؤں میں

جب حسن ہی نیاز پہ مائل ہو اے ندیم
پھر کیا صلاح آج نہ کیوں روٹھ جاؤں میں

اے اضطرابِ شوق سنبھلنے دے اسقدر
ہاتھوں پہ رکھ کے دل کو پئے نذر لاؤں میں

اور اس کے بعد عرض کروں حکم ہو اگر
رنگین ایک مطلع اداؔ کا سناؤں میں

اے چشمِ مست تیرا اشارہ جو پاؤں میں
جو نغمے سو رہے ہیں انہیں بھی جگاؤں میں

سہیلی کا پریم (گیت)

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

جب پیتم نین سماؤ گی — جب پریم کی گود بساؤ گی
پھر ڈھونڈے ہاتھ نہ آؤ گی — من مندر میں چھپ جاؤ گی

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

اب تتلی سی تھراتی ہو — ہر بات پہ سو بل کھاتی ہو
اب اپنے من کی گاتی ہو — جب ان کے من کی گاؤ گی

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

جب راتیں نیند اڑائیں گی — جب آنکھیں برہا گائیں گی
پھر سکھیاں یاد نہ آئیں گی — تم سکھیوں کو یاد آؤ گی

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

اب الّڑھ ہو متوالی ہو — ہاں سچ ہے بھولی بھالی ہو
اب الجھے بالوں والی ہو — جب ایک اک لٹ سلجھاؤ گی

چلو آؤ سہیلی بات سنو
اے البیلی بات سنو

کیوں نجمی پینگ بڑھاتے ہیں — یہ بندھن ٹوٹے جاتے ہیں
اب خاطر والے آتے ہیں — اب خاطر میں کیوں لاؤ گی

نجم آفندی اکبرآبادی

ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء

ساغر

اک آغوشِ تمنّا و از زمیں سے آسماں تک ہے
محبّت ہی محبت ہے مرا قبضہ جہاں تک ہے

مرے نزدیک بیٹھو اور نفس سے عطر برساؤ
بہاران نکہتوں کے اس مہکتے کارواں تک ہے

[illegible]ی بدگماں ہو جائیں وہ معصوم نظریں بھی
گناہِ عشق کی لذّت نگاہِ بدگماں تک ہے

خدا لائے جذبۂ الفت یہ رسوائی بھی ہے کیا کم
کہ راہِ عشق کا پرتو ضمیرِ رازداں تک ہے

نظر بچتے ہی اُنکا آستاں ہوگا مرے سجدے
یہ میری گریۂ مسکینی نگاہِ پاسباں تک ہے

شگفتِ لالہ و گل سے طلوعِ ماہ و انجم تک
ہے اک حشرِ تبسم حُسن کا پرتو جہاں تک ہے

سحر ہوتے ہی گل ہونگے نہ رنگِ گل نہ خاکِ گل
یہ ساری چاندنی گلشن میں برق و آشیاں تک ہے

انہیں بجھتے ہوئے پتّوں سے گلشن پھوٹ نکلیں گے
بہاروں کا یہ ماتم صرف انجامِ خزاں تک ہے

فضا پر موت چھا جائے جو ہم خاموش ہو جائیں
کہ ساری گرمیِ محفل ہماری داستاں تک ہے

چمن کی سمت کروٹ بھی نہ لینگی بجلیاں سو سو
کہ پیہم اضطرابِ برق میرے آشیاں تک ہے

دلِ گرم و جواں قلقل دلِ گرم و جواں مینا
جنونِ مے کشی ساغر دلِ گرم و جواں تک ہے

ـــ ایشیا۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء

دُکھ سُکھ

وداعِ آخر

(مسلسل قسط سوم)

(محمد جمیل احمد بی اے، بریلوی)
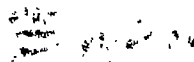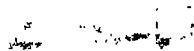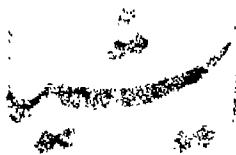
[**خلاصۂ قسط اوّل و دوم:**- اپنی اکتالیسویں سالگرہ کے دن ناول نگار رحیق پہاڑ سے وائنا واپس آیا، اور اس کو ایک گمنام عورت کا خط ملا، جس میں اس نے اپنی سچی، گہری اور خاموش محبت کا فسانہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں دوہرایا تھا۔ جب اس کا اکلوتا بچہ اس کے سامنے مُردہ پڑا تھا، وہ تیرہ برس کی تھی، کہ رحیق اس کے قُرب کے ایک مکان میں رہنے لگا، اور اسی وقت سے اسے رحیق سے ایک جاں سوز عشق پیدا ہو گیا۔ جو وقت کے ہر ہر لمحہ کے ساتھ ترقی کرتا رہا وہ گھنٹوں دروازہ سے اس کو جھانکتی، اس کے کمرہ کو دیکھتی، اس کی کتابوں کو پڑھتی، اور اس کی محبت میں کھو جاتی، وہ سولہ برس کی تھی، کہ اس کی ماں نے جو ایک بیوہ عورت تھی، انسبرگ کے ایک متموّل شخص سے شادی کر لی۔ اور پھر یہ لوگ انسبرگ کو منتقل ہو گئے۔ جہاں اس نے انتہائی کرب کے دو طویل سال، تڑپ تڑپ کر گذارے اب وہ اٹھارہ سال کی تھی، اور وہ بات جو معصوم بچی کے خیالات سے پوشیدہ تھی، اب اس کی تمام تر آرزو بن چکی تھی۔ "ج"]

"میرے ساتھیوں کو یقین تھا، کہ میں باحیا اور شرمیلی ہوں، مگر میں اپنا مقصد قطعی طور پر متعین کر چکی تھی، میری تمام ہستی ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئی تھی — میں وائنا واپس چلوں، آپ کے پاس واپس جاؤں، میں اپنی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش میں بالآخر کامیاب ہو گئی، گو دوسروں کے نزدیک میرا یہ فعل غیر معقول اور غیر قابلِ تفہیم تھا، میرا سوتیلا باپ ایک آسودہ حال شخص تھا، اور مجھے اپنی لڑکی کی طرح رکھتا تھا۔ مگر میں نے زور دیا کہ اپنی معاش کا انتظام میں خود کروں گی، اور آخر کار اسے اس پر راضی کر ہی لیا، کہ میں وائنا واپس آ کر درزی کی ایک بڑی دکان پر، جو اس کے عزیز کی تھی، ملازم ہو جاؤں۔

کیا ابھی مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے، کہ جب بالآخر میں وائنا پہنچی تو خزاں کی اس شام کو جب ہوا میں کہر کا اثر تھا، میرے قدم پہلے مجھے کہاں لے گئے؟ کپڑوں کے کمرے میں میں نے اپنا بکس چھوڑا اور ایک ٹرام کی طرف دوڑی وہ کس قدر آہستہ آہستہ چل رہی تھی! اس کا ہر دفعہ رکنا میرے لئے ایک نئی پریشانی کا باعث تھا۔ آخر کار میں اس گھر تک پہنچ گئی۔ میرا دل اچھلنے لگا، جب میں نے آپ کے کمرے میں روشنی دیکھی، وہ شہر جو اب تک مجھے اس قدر اجنبی، اس قدر بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ دفعتہً پُر رونق سا نظر آنے لگا، میں خود پھر ایک مرتبہ زندہ ہو گئی، چونکہ اب میں آپ کے نزدیک تھی، آپ جو میری زندگی کا ایک غیر مختتم خواب ہیں، جب آپ کے، اور میری اوپر کو اٹھی ہوئی نگاہوں کے درمیان صرف شیشہ کا ایک چمکدار پتلا ٹکڑا تھا، تو میں یہ حقیقت بالکل بھول گئی تھی۔ کہ میں آپ کے ذہن اور آپ کی یاد سے بہت دور ہوں، گویا ہمیں پہاڑوں، وادیوں اور دریاؤں نے بیچ میں حائل ہو کر جدا کر دیا ہے۔ میرے لئے اتنا ہی بہت تھا، کہ میں آپ کی کھڑکی کو دیکھتی رہوں، اس میں روشنی تھی، وہ آپ کی قیام گاہ تھی، آپ وہاں تھے، وہ میری دنیا تھی، دو برس سے میں اس ساعت کا خواب دیکھ رہی

تھی، اب وہ ساعت آگئی تھی، اس خوشگوار شام کو جب آسمان پر بادل چھائے
ہوئے تھے، میں آپ کی کھڑکیوں کے سامنے کھڑی رہی، یہاں تک کہ روشنی مجھ پر بھی
اس وقت سے پہلے میں نے اپنا مکان تلاش نہیں کیا۔

ہر شام کو میں اسی طرح آتی۔ چھ بجے تک میں کام کرتی۔ کام سخت تھا، مگر
پھر بھی مجھے مرغوب تھا، چونکہ سٹور روم کا شور و شغب میرے ذہنی و قلبی ہیجان کو
چھپائے ہوئے تھا، جیسے ہی کہ دروازے بند ہوتے، میں اپنے محبوب مقام پر دوڑ
آتی، میری تمام تر خواہش یہ تھی، کہ آپ کو ایک دفعہ اور دیکھ لوں، آپ سے صرف
ایک دفعہ مل لوں، صرف دور سے آپ کے چہرے کو اپنی نظروں میں جذب کر لوں۔ آخر کار
ایک ہفتہ کے بعد میں آپ سے ملی، اور وہ ملاقات محض اتفاقیہ ہو گئی۔ میں کھڑی ہوئی
آپ کی کھڑکی کو تک رہی تھی، کہ آپ سڑک کے اس پار سے آئے۔ ایک ہی لمحہ میں
میں پھر بچہ تھی، وہی تیرہ برس کی لڑکی، حالانکہ مجھے آپ سے نظریں چار کرنے کا
بے حد شوق تھا، میں نے اپنا سر جھکا لیا، اور آپ کے قریب سے تیزی سے آگے بڑھی
جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا تھا، بعد کو مجھے اس طریقہ سے اسکول کی لڑکی کی طرح
بھاگ جانے سے شرم آئی۔ چونکہ اب مجھے احساس تھا کہ میں واقعی کیا چاہتی
تھی، میں چاہتی تھی، کہ آپ سے ملوں، میں چاہتی تھی کہ ان تھکا دینے والے برسوں
کے بعد بھی آپ مجھے پہچان لیں، آپ مجھے دیکھیں مجھ سے محبت کریں۔

بہت عرصہ تک آپ نے مجھے نہیں دیکھا، حالانکہ میں روز رات کو آپ کے
مکان کے سامنے کھڑی ہوتی تھی، چاہے وائینا کے موسم سرما کی ٹھنڈی ہوائیں
چلتی ہوں۔ اکثر اوقات میں بغیر کسی نتیجہ کے گھنٹوں انتظار کرتی، اکثر بعد میں آپ
کسی دوست کے ہمراہ گھر چھوڑ کر چلے جاتے، دو مرتبہ میں نے آپ کو ایک عورت کے ساتھ دیکھا
اور یہ حقیقت کہ اب مجھ میں "عورت" جاگ چکی تھی۔ اور آپ سے متعلق میرے جذبات
کچھ نئے، کچھ مختلف تھے، مجھ پر اس طرح واضح ہوئی، کہ جب میں نے آپ کو ایک غیر
اجنبی عورت کے ساتھ غایت اعتماد سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ تو
دفعتہً میں نے دل میں ایک شدید کرب، ایک گہری دکھن محسوس کی یہ میرے لئے
نئی اور تعجب انگیز بات نہ تھی، چونکہ بچپن ہی سے میں نے دیکھا تھا کہ اس قسم کے کتنے
ملاقاتی آپ کے گھر آتے ہیں، مگر اب اس منظر نے مجھے ایک شدید جسمانی اذیت
پہنچائی، میرے دل میں دشمنی و شوق کا ایک مشترک جذبہ تھا، جب میں نے ایک اور
عورت سے جسمانی تعلقات کی بیّن و ظاہر مثال دیکھی، ایک دن غرورِ جوانی سے
مغرور ہو کر جس کا اثر اب بھی باقی تھا میں...... معمول کے مطابق آپ کے مکان
کے سامنے نہیں گئی۔ مگر مدافعت اور ترکِ علائق کی وہ سنسان شام کس قدر
بھیانک تھی! دوسرے دن رات کو، انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ میں معمول کے
مطابق آپ کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی اور منتظر تھی، جیسے کہ آپ کی بند اور
مسدود زندگی کے سامنے میں ہمیشہ منتظر رہی ہوں۔

آخر کار وہ وقت بھی آیا، جب آپ نے مجھے دیکھا، میں نے دور سے آپ کو
آتے ہوئے دیکھا، اور اپنی تمام طاقتوں کو جمع کر کے یہ عزم کیا، کہ میں آپ کے راستہ سے
نہیں ہٹوں گی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شراب کے ایک بھرے ہوئے ٹھیلے سے سڑک
رک گئی، اور اسلئے آپ کو بالکل مجھ سے قریب ہو کر گذرنا پڑا، غیر اختیاری طور پر آپ
کی نظریں مجھ پر پڑیں، اور ٹھہری رہیں، اگرچہ ابھی آپ نے میرے چہرے کی دلکشی و دلآویزی
کو محسوس نہیں کیا تھا، آپ کے چہرے پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی۔ جس کے
ساتھ آپ، عورت کو دیکھنے کے عادی تھے، بجلی کی ایک رو کی طرح وہ پچھلی یاد
میرے جسم میں سرایت کر گئی — آپ کی اسی تپاک اور دلکش نظر کی یاد جو بیک وقت
بغلگیر ہوتی ہوئی بھی معلوم ہوتی تھی، اور عریاں ساز بھی، جس نے برسوں پیشتر آپ نے
ایک "لڑکی" کو جگا کر ایک "عورت" اور عاشق بنا دیا تھا، ایک یا دو لمحہ تک اسی
طرح آپ کی نظریں مجھ پر جمی رہیں، اور اس وقفہ کے دوران میں، میں اپنی نظریں
بھی نہ ہٹا سکی، اور پھر آپ گذر گئے۔ میرا دل اس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا
کہ مجھے اپنی رفتار ہلکی کر دینا پڑی، اور جب ایک اندرونی خواہش سے مجبور ہو کر میں نے
مڑ کر دیکھا، تو آپ کھڑے ہوئے تھے، اور مجھے دیکھ رہے تھے، آپ کے چہرے کی راز جویانہ
اور استفسارانہ دلچسپی نے مجھے یقین دلا دیا، کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا، آپ نے مجھے
اس وقت اور اس کے بعد بھی نہیں پہچانا، میں کس طرح بتاؤں کہ مجھے اس سے کس قدر
مایوسی ہوئی، یہ اس قسم کی مایوسیوں میں پہلی مایوسی تھی، یہ پہلا موقع تھا، جب مجھے
وہ بات برداشت کرنا پڑی، جو ہمیشہ میری قسمت رہی، اور آپ نے کبھی مجھے نہیں پہچانا
مجھے یوں ہی آپ کے بغیر پہچانے ہوئے ہی مرنا ہوگا! آہ، میں اپنی یاس و حسرت کی
کیفیت کس طرح آپ کو سمجھاؤں، اس زمانہ کے دوران میں، جو میں نے انسبرگ میں
گذارا ایسی کبھی آپ کے خیال سے خالی نہیں رہی۔ وائینا میں ہماری دوسری ملاقات
ہمیشہ میرے ذہن میں رہی، میرے تخیلات، میری کیفیت مزاج سے پلٹے لیتے رہے
کبھی ایک پرمسرت انجام کے امکانات کا تصور مجھے خوش کر دیتا، اور کبھی نامرادی
کا خیال مغموم، ہر قابل قیاس تبدیلی میرے ذہن میں واقع ہوئی، اکثر طول و
غمگین لمحات میں خیال ہوتا تھا، کہ آپ نے مجھے بیکار سمجھ کر، سادہ و کم رو سمجھ کر یا سرد

ضدی خیال کر کے جھڑک دینگے، نفرت کرنے لگیں گے، میں نے بیرخی و بے توجہی کا امر ممکن تصور کر لیا تھا، مگر یاس و حزن کے انتہائی مدارج میں بھی، اپنی ہستی کو حدود ہیچ و پوچ سمجھ لینے کے باوجود بھی، میں اس مکروہ ترین امکان کو بھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دے سکتی تھی، کہ آپ میری ہستی سے کبھی آگاہ نہیں ہوئے، اب میں سمجھ گئی ہوں (آپ ہی نے مجھے سکھایا ہے!) کہ ایک آدمی کیلئے ایک لڑکی یا ایک عورت کا چہرہ غیر معمولی طور پر تغیر پذیر ہونا چاہیئے، وہ کیفیات مزاج کے عکس کے سوا اور کچھ نہیں جو اس قدر تیزی سے گذرتی ہیں۔ جیسے آئینہ سے عکس، مرد ایک عورت کے چہرے کو نہایت آسانی سے بھول سکتا ہے، چونکہ عمر اس چہرہ میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ اور مختلف اوقات میں پوشاک مختلف گرد و پیش اور مختلف ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ عورت کی جتنی معلومات بڑھتی جاتی ہے۔ وہ توکل و قناعت تسلیم و رضا سیکھتی جاتی ہے۔ مگر میں جو ہنوز لڑکی تھی، ابھی آپ کی بھول کو سمجھنے کے قابل نہ تھی، جس وقت سے کہ میں آپ سے واقف ہوئی تھی، میرا ذہن آپ کے تصورات کا گنجینہ رہا تھا، اور اس نے مجھ میں ایک یہ غلط خیال پیدا کر دیا تھا، کہ آپ بھی اکثر میری بابت سوچتے ہوں گے، اور میرے منتظر ہوں گے، میں زندگی کے بار کو کس طرح اٹھا سکتی، اگر میں یہ سمجھ لیتی، کہ میں آپ کے نزدیک نہ ہونے کے برابر ہوں، کہ میرے لئے آپ کے حافظہ و یادداشت میں کوئی جگہ نہیں ہے، اس شام کو آپ کی نگاہوں نے مجھے بتایا، کہ اس طرف کوئی ادنیٰ ترین تعلق بھی ایسا نہ تھا، جو مجھے آپ کی زندگی سے منسلک و وابستہ کر دیتا، پہلی دفعہ میں حقیقت کی تلخی میں غرق ہوئی، پہلی دفعہ میں نے اپنی تقدیر کا اشارہ پایا۔

آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ دو روز بعد جب ہم دونوں سڑک پر پھر ملے اور آپ نے بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کرنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھا، تو یہ آپ نے اس لڑکی کو پہچان کر ایسا نہیں کیا تھا، جو اس قدر مدت سے آپ سے محبت کر لی تھی، اور جس میں آپ نے "عورت" کو جگا دیا تھا، بلکہ اسکی وجہ یہ تھی، کہ آپ نے اس اٹھارہ برس کی خوبصورت لڑکی کا چہرہ پہچان لیا تھا، جس سے دو روز قبل آپ اسی جگہ شام کو ملے تھے، آپ کے چہرہ کے انداز میں استعجاب کی ایک مرغوب و پسندیدہ جھلک تھی، اور آپ کے لبوں پر ایک تبسم رقص کر رہا تھا، پہلی کی طرح آج بھی آپ گذر گئے اور پہلے کی طرح آج بھی آپ نے اپنی رفتار ہلکی کر دی، میں، از بر اندام تھی، میں نازاں تھی، میری خواہش تھی، کہ آپ مجھ سے بات کریں، میں نے اس وقت پہلی مرتبہ محسوس کیا، کہ میں آپ کے لئے زندہ ہوں، میں بھی آہستہ آہستہ چلی اور آپ بچنے کی کوشش نہیں کی، دفعتاً میں نے آپ کے قدم کی آواز اپنے پیچھے سنی، بغیر مڑے ہوئے میں جانتی تھی، کہ اب آپ کی پیاری آواز مجھے مخاطب کرے گی شدتِ امید سے میرے اعضا جیسے شل پڑ گئے تھے، اور میرا دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا، کہ میں نے سوچا مجھے ایک جگہ بالکل رک کر کھڑا ہو جانا پڑے گا آپ میرے قریب آگئے تھے، آپ نے گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا، گویا ہم پرانے دوست تھے — حالانکہ آپ درحقیقت مجھے نہیں جانتے تھے، حالانکہ آپ نے کبھی میری حیاتِ متألم کی بابت کچھ نہیں جانا، آپ کا طریقہ اس قدر سادہ، اس قدر دلکش تھا کہ بغیر کسی جھجک کے میں جواب دینے کے قابل تھی، ہم سڑک پر چلتے رہے اور آپ نے مجھ سے کہا، کہ شام کا کھانا دونوں ساتھ ہی کھائیں، میں راضی ہو گئی۔ کون سی بات تھی جو میں آپ سے منع کر سکتی؟

ہم نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا، آپ کو یہ جگہ یاد نہیں ہوگی۔ آپ کے نزدیک یہ اس قسم کی بہت سی باتوں میں سے ایک بات تھی، کیونکہ بہرحال میں تھی کیا؟ ایسی سینکڑوں عورتوں میں سے ایک تفریحی مرحلہ، غیر مختتم زنجیر کی ایک کڑی۔ اس شام کو ایسی کیا بات ہوئی۔ جو آپ مجھے یاد رکھتے میں بہت کم بولتی چونکہ میں بے انتہا مسرور تھی، کہ آپ کے قریب ہوں، اور آپ مجھ سے ہم سخن ہیں، میں ایک لمحہ بھی سوالات یا لغو الفاظ میں برباد کرنا نہیں چاہتی تھی، میں اس ساعت کیلئے، اس طریقہ کے لئے جس سے آپ نے میرے جذبہ بے تابی کا جواب دیا، آپ کی ہمیشہ ممنون رہوں گی، آپ نے جو نیک سلیقہ برتا تھا، میں اس کو کبھی نہیں بھولوں گی، آپ میں کوئی نازیبا اشتیاق نہ تھا۔ ملاطفت و ملاعبت کے اظہار کی کوئی جلدی نہ تھی۔ پھر بھی آپ نے اول لمحہ ہی سے اس قدر دوستانہ اعتماد کا اظہار کیا، کہ اگر میری تمام ہستی پہلے ہی سے آپ کی نہ ہوتی تب بھی آپ مجھے جیت لیتے، کیا میں آپ کو یہ بتا سکتی ہوں، کہ یہ بات میرے لئے کس قدر اہمیت کی حامل تھی، کہ میری پانچ سال کی امیدیں اس قدر مکمل طور پر پوری ہو گئیں۔

رات زیادہ ہو گئی اور ہم ریسٹورنٹ سے چلے آئے، دروازہ پر آپ نے مجھ سے دریافت کیا، کہ آیا مجھے جانے کی جلدی ہے یا میں کچھ اور وقت آپ کے ہمراہ صرف کر سکتی ہوں، میں نے کہا میرے پاس کافی وقت ہے، ایک لمحہ کے تامل کے بعد آپ نے مجھ سے کہا، کہ کیا میں گفتگو کرنے آپ کے کمرے میں چل سکوں گی، "میں مسرور ہوں گی۔" میں نے آمادگی سے جواب دیا، اور اس طرح بجے

نہیں رکھ سکتے۔ ایسے رُومانی لوگ اپنی پسند اور ناپسند کے معاملہ میں انتہا پسند ہوتے ہیں۔ کیا "کمپنی کی حکومت" سے ایسی طبیعت آشکار ہے؟ ہاں! ہمارا یہی خیال ہے۔ اس دعوے کا ثبوت ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"کالی کٹ کے راجہ زیمورن کو کیا خبر تھی کہ بدو کے افسانوی اشتر کی طرح پرتگیز بھی اُسے خیمے سے باہر نکالنے کی فکر میں ہیں سنہ ۱۵۰۰ء میں پرتگیزوں نے کالی کٹ کے مقام پر ایک کارخانہ قائم کیا۔ تین سال بعد کالی کٹ کے سینہ پر ایک پرتگیزی قلعہ نظر آیا۔ سنہ ۱۵۰۶ء میں پرتگیزی علم گوا کی دیواروں پر لہرایا۔ سنہ ۱۵۱۰ء میں کالی کٹ کے مہمانوں نے زیمورن کے شاہی محلات کو نذرِ آتش کر دیا۔

میزبان کی خدمت میں مہمان کا ہدیۂ تشکر!

طرز شاعرانہ ہے اور شاعری محض جذباتی۔ جس واقعہ کا ذکر ہے صحیح ہے اور تاریخ سے ثابت۔ لیکن یہ پارہ تاریخ کی کتاب میں شامل نہیں ہو سکتا۔ تاریخ کو سند کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر واقعہ کو سبب اور تدریجی نشو کی۔ اور ان چیزوں کی اس کتاب میں کمی ہے۔ اسی طرح،

"ولیم بنٹنگ جنگ سے گریز نہ کر سکا۔ اس کے عہدِ حکومت میں کورگ کا وسیع علاقہ کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ مدراس کی گورنری کے زمانہ میں ولیم بنٹنگ کی آنکھ کورگ پر تھی۔ وہ کورگ کو ایک انگلیشی نوآبادی بنانا چاہتا تھا۔ ولیم بنٹنگ نے کچھار کو بھی کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا۔"

کیا یہ شریک کر لینا ایسا منہ کا نوالا تھا کہ جب جی چاہا کوئی علاقہ شامل کر لیا۔ گویا ہندوستان کا نقشہ لے کر جس علاقہ پر سُرخ پنسل سے نشان لگا دیا وہ کمپنی کا ہو گیا۔؟

لیکن اس تنقید سے یہ مراد نہیں کہ یہ کتاب ایسی خامیوں سے بھری ہے یا اس کا اثر ایک صدائے صحرائی ہے۔ واقعہ تو یوں ہے کہ اس کتاب کا ایک مقصد ہے اور وہ مقصد صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ باری نے ہند اور یورپ کے تاریخ بنانے والوں کو ان کے صحیح لباس و رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے نقطۂ نگاہ سے بعض اوقات اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ اس "تباہی کے گلہ" میں "شائبہ خوبیٔ تقدیر" کا ذکر بھی ہوتا اور اس کا لحاظ بھی ہوتا کہ یورپی اقوام اس دور میں باوجود اپنی بہیمیت کے "شمشیر و سناں" سے زیادہ آشنا تھیں اور ہم "طاؤس و رباب" سے ۔۔۔۔۔۔۔ اور اب؟ اب ہم کیا ہیں اور کیوں؟ یہی تو باری نے بتایا ہے۔

باری نے جو بارِ گراں اپنے ذمہ لیا ہے وہ "پردۂ زنگاری" کو علیحدہ کر کے "معشوقِ حقیقت" کو بے نقاب کرنا ہے۔

قیصر

فردوس

ایڈیٹرز گردھاری لال آنند
لطیف اختر بی اے
ناشر۔ بزمِ اُردو جموں و کشمیر (جموں)
سالانہ چندہ چار روپیہ فی پرچہ ۶ ر ششماہی ۲ ر

بزمِ اردو جموں و کشمیر، ریاست کشمیر کی ایک پُرانی بزمِ ادب ہے جس کے مختلف مشاعروں میں سنہ ۱۹۲۵ء سے شریک ہوتا رہا ہوں۔ اس کے دفتر سری نگر اور جموں، کشمیر کے دونوں صدر مقامات میں قائم ہیں۔ اس کے موجودہ صدر پنڈت وشوناتھ صاحب ماہ بی اے ہیں اور جوائنٹ سکریٹری جناب قیس شروانی۔ یہ اور ان کے دوسرے رفقاء حتی الامکان کشمیر میں اردو زبان اور اُردو شعر و ادب کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اب بزمِ اُردو جموں و کشمیر نے اپنا "علمی و ادبی" رسالہ فردوس کے نام سے شائع کیا ہے جس کی اشاعت کی بڑی ذمہ داری بزمِ اُردو جموں و کشمیر پر عائد ہوتی ہے۔

میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کی اشاعت کے اصلی وجوہ و اسباب کیا ہیں لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ بزمِ اُردو جموں و کشمیر کوئی اتنی بڑی انجمن نہیں ہے جس کے لئے کسی آرگن کی اشاعت ضروری ہو جاتی۔ اتنا ضرور ہے کہ [illegible] پورے کشمیر سے کوئی ایک ایسا ادبی علمی رسالہ شائع نہیں ہوتا جس کو [illegible]

ایشیائی سنہ ۱۹۵۱ء

ں ہوں، اور مجھے تعجب تھا، کہ کیوں ستارے مجھ پر نہیں جھک رہے ہیں۔ میری
ہُوں میں کبھی اس بات پر نہیں پچھتائی، کہ اس رات کو میں نے خود اپنے آپ کو کیوں
پ کو سونپ دیا، جب آپ میرے پاس سو رہے تھے، جب میں نے آپ کے
فس کی آواز سنی، جب میں نے آپ کا جسم چھوا، اور اپنے آپ کو آپ کے اس قدر
ریب پایا، میں فرطِ مسرت سے آنسو نہ روک سکی۔

میں علی الصبح ہی چلی گئی" مجھے کام پر جانا تھا، اور میں آپ کے ملازم
نے سے پہلے ہی چلی جانا چاہتی تھی، جب میں جانے کے لئے تیار ہو گئی، آپ نے مجھے
ی آغوش میں لے لیا، اور بہت دیر تک میری طرف دیکھتے رہے، کیا کوئی
بھولی بسری یاد آپ کے دماغ میں آ رہی تھی، یا صرف میری مسرت کے نور نے مجھے
پ کی نظروں میں خوبصورت بنا دیا تھا، آپ نے میرے لبوں کو بوسہ دیا، اور
ں چلنے کیلئے اٹھی، آپ نے دریافت کیا" کیا تم کچھ پھول لو گی؟" لکھنے کی میز پر نیلے
ریں گلدان میں چار سفید گلاب کے پھول تھے، (میں اس گلدان کو پہلے سے جانتی
ی، جب میں نے بچپن میں اس پر ایک جھجکتی ہوئی نظر ڈالی تھی) اور آپ نے وہ پھول
ھے دیدیئے، بہت دنوں تک میں ان پھولوں کو پیار کرتی رہی،

ہم نے ایک اور شام ملنے کا انتظام کیا تھا، یہ ساعتیں مسرت و استعجاب
سے پر تھیں، آپ نے مجھے ایک رات اور بھی بخشی، پھر آپ نے کہا کہ کچھ عرصہ کیلئے
پ وائنا کے باہر بلوائے گئے ہیں —— آہ، مجھے آپ کے سفروں سے ہمیشہ کسقدر
رت رہی ! —— اور آپ نے وعدہ کیا کہ، آپ واپس آتے ہی مجھے اطلاع دینگے
ں نے صرف آپ کو ڈاکخانے کا پتہ دیا جہاں خط میرے طلب کرنے تک محفوظ
ہ سکتے تھے، اور آپ کو اپنا صحیح نام نہیں بتایا، میں نے اپنے راز کی حفاظت کی
ںسر تبہ پھر رخصت ہوتے وقت آپ نے مجھے گلاب کے پھول دیئے —— رخصت
وتے وقت، ! !

دو مہینے تک ہر روز میں اپنے آپ سے پوچھتی رہی۔ مگر نہیں، مگر اپنی
تید کے اس کرب و مایوس کا ذکر نہیں کروں گی، میں شکایت نہیں کرتی، میں
پ سے اسی طرح محبت کرتی ہوں جیسے کہ آپ ہیں —— پرجوش و تغافل
شعار، فیاض و وفا نا آشنا —— میں آپ سے اسی طرح محبت کرتی ہوں، جیسے
کہ آپ ہمیشہ رہے ہیں، دو مہینے ختم ہونے سے کہیں پہلے آپ واپس آچکے تھے
اپ کی کھڑکی کی روشنی نے مجھے یہ بتا دیا تھا۔ مگر آپ نے مجھے کوئی خط نہیں لکھا، زندگی
کی اس آخری ساعت میں میرے پاس آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک سطر بھی
نہیں ہے۔ اسکی ایک سطر بھی نہیں ہے جس کو میں اپنی تمام زندگی سونپ
چکی، میں انتظار کرتی رہی، مایوسی سے انتظار کرتی رہی، آپ نے مجھے پاس
نہیں بلایا، آپ نے مجھے ایک لفظ نہیں لکھا، ایک لفظ بھی نہیں ....

میرا بچہ جو کل مر گیا، وہ بھی آپ کا تھا۔ وہ آپ کا لڑکا تھا، ان
تین راتوں میں سے ایک کا حاصل !۔ اس وقت سے اسکی پیدائش تک میں
آپ کی تھی، صرف آپ کی معلوم ہوتا تھا۔ میں آپ کے لمس سے متبرک ہو گئی ہو
اس وقت میرے لئے قطعی ممکن نہ تھا، کہ میں کسی اور شخص کی پیشکش الفت کو
قبول کر سکوں۔ وہ ہمارا بچہ تھا، میری دانستہ محبت اور آپ کی بے پرواہ،
عیاشانہ اور نادانستہ مہربانی کا ماحصل ! ہمارا بچہ، ہمارا لڑکا، ہمارا اکلوتا بچہ!
شاید آپ چونک اٹھیں، شاید آپ کو یوں ہی سا تعجب ہو۔ آپ کو حیرت ہوگی۔
کہ کیوں میں نے لڑکے کی بابت کبھی آپ کو کچھ نہیں بتایا، اور کیوں اس قدر طویل
عرصہ خاموش رہنے کے بعد اب میں آپ کو یہ بتا رہی ہوں، جب وہ اپنی
آخری نیند سو رہا ہے۔ اور مجھ سے جدا ہونے کو ہے —— کبھی، کبھی واپس ہونے
کے لئے ! میں آپ کو بتا بھی کیسے سکتی تھی۔ میں ایک اجنبی تھی، ایک لڑکی جس نے
وہ تین راتیں، آپ کے ساتھ بہت شوق سے گذاری تھیں۔ آپ اس وقت کبھی
یہ یقین نہ کرتے، کہ ایک گمنام لڑکی، جس کا آپ سے اتفاقیہ ساتھ ہو گیا تھا، آپ سے
بے وفا سے، وفادار رہی ہے، آپ کبھی ہرگز بغیر شبہات کے اس لڑکے کو اپنا
تسلیم نہ کرتے۔ اگر آپ ظاہرا میرے الفاظ کا یقین کر بھی لیتے، تب بھی آپ کے
دل میں یہ پوشیدہ شبہ باقی رہ جاتا، کہ غالباً آپ کے بعد بھی میں نے کسی
دولتمند شخص کو اس لڑکے کا باپ بنایا ہے۔ آپ کو ضرور شبہات ہوتے، میرے
اور آپ کے درمیان، ہمیشہ ایک بے اعتباری کا سایہ حائل رہتا۔ میں اس کو
برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ علاوہ ازیں میں آپ کو جانتی ہوں، شاید میں آپ
کو آپ سے بھی زیادہ جانتی ہوں۔ آپ بالکل بےفکر، آزاد او رطلب ہیں، اور
یہ ہی آپ محبت کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو اس بات سے نفرت ہوتی
کہ آپ دفعتہً ایک باپ بن گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بچہ کی زندگی و
قسمت کے ذمہ دار ہیں۔ آزادی کا سانس آپ کیلئے زندگی کا سانس ہے۔ اور
آپ میری ہستی کو ایک بندھن تصور کرتے، اندر ہی اندر اپنی دانستہ مرضی کے
خلاف آپ مجھے ایک مشکل و مجسم دعویٰ سمجھ کر مجھ سے نفرت کرتے، شاید کبھی کسی
وقت، کسی ساعت، یا کسی تیزی سے گذر جانے والے لمحہ کے لئے آپ مجھے ایک بار

۶۳

محسوس کرتے مجھ سے نفرت کرتے، مگر میرے غرور کا تقاضا تھا، میں زندگی بھر آپ کی کسی مصیبت یا فکر کا باعث نہ بنوں، میں بجائے اسکے کہ آپ کو بار معلوم ہوں، تمام بار اپنے ہی کاندھوں پر لے لینا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ان تمام عورتوں میں جن کو آپ جانتے ہیں، میں ہی صرف وہ عورت ہوں جس کا خیال آپ ہمیشہ محبت و تشکر کے جذبات کے ساتھ کریں۔ درحقیقت آپ کو کبھی میرا خیال آیا ہی نہیں، آپ مجھے بالکل بھول گئے۔

میں آپ کو الزام نہیں دے رہی ہوں، یقین کیجئے، میں شکایت نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے، اگر آپ کو خیال ہو کہ گاہے گاہے میرا قلم زہر اگلنے لگتا ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ چونکہ میرا بچہ، ہمارا بچہ شمعوں کی تھرتھراتی ہوئی روشنی میں مردہ پڑا ہے، میں نے خدا کے خلاف اپنی مٹھیوں کو بھینچ لیا ہے اور اسے قاتل کہا ہے۔ چونکہ وفور غم سے میں اپنے آپے سے باہر ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے، کہ میں شکایت کر رہی ہوں، میں جانتی ہوں، کہ آپ رحمدل ہیں اور ہمیشہ دوسروں کی مدد کرنے کو مستعد رہتے ہیں آپ غیر سے غیر شخص کے ایک لفظ پر اسکی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ کی رحمدلی مخصوص ہے، وہ لامحدود و غیر مسدود ہے، کوئی شخص بھی آپ کو اتنا پا سکتا ہے جتنا وہ اپنے ہاتھوں سے گرفت کر لے۔ تاہم مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کا رحم و کرم سستی سے کام کرنے کا عادی ہے، آپ سے مانگنا پڑتا ہے آپ ان کی مدد کرتے ہیں جو مدد کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ شرم کی وجہ سے مدد کرتے ہیں۔ کمزوری کی وجہ سے مدد کرتے ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کرتے، کہ استمداد فی نفسہ ایک پُرمسرت کام ہے۔ مجھے صاف طور سے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے، کہ وہ لوگ جو مصائب و آلام میں ہیں، آپ کے نزدیک ان لوگوں سے زیادہ قابلِ رحم، زیادہ عزیز نہیں ہیں، جو آپ کی طرح عشرت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ کی قسم لوگوں میں سے کسی سے بھی، ان میں سب سے زیادہ رحمدل شخص سے بھی کچھ مانگنا مشکل ہے۔ بہت مشکل ہے۔ ایک دفعہ جبکہ میں ہنوز بچہ تھی، میں نے اپنے دروازہ کی دراز سے جھانکا تھا، کہ کس طرح آپ نے ایک فقیر کو کچھ دیا، جس نے آپ کے دروازہ کی گھنٹی بجائی تھی۔ ہاں اس کے سوال کرنے سے بھی قبل آپ نے نہایت سرعت سے، نہایت فیاضی سے اس کو دیا تھا، آپ کے طریقہ میں ایک خاص بے چینی و اضطراب تھا۔ ایک [illegible] سرعت و تیزی تھی۔ گویا کہ آپ کا خاص مقصد اس سے چھٹکارا پانا تھا

معلوم ہوتا تھا، کہ آپ اس سے نظریں چار کرنے سے ڈرتے ہیں۔ میں استمداد کے اس ڈرپوک و مضطرب انداز کو، لفظ تشکر سے عذر کرنے کے اس طریقہ کو کبھی فراموش نہ کر سکی۔ یہ ہی وجہ ہے۔ کہ میں نے مصیبت میں کبھی آپ سے رجوع نہیں کیا۔ آہ میں جانتی ہوں، کہ باوجود اس شک کے، کہ میرا بچہ واقعی آپ کا ہے، آپ مجھے وہ سب مدد دیتے جس کی مجھے ضرورت تھی۔ آپ مجھے آرام و آسائش پہنچاتے اور مجھے روپیہ دیتے۔ بہت روپیہ دیتے، مگر ہمیشہ ایک اضطراب اور بے چینی کے پردے میں مصیبت کو ٹال دینے کی ایک پوشیدہ آرزو کے پردہ میں مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے اس ہونے والے بچہ سے بھی چھٹکارا پانے کا مشورہ دیتے، میں اس بات سے سب سے زیادہ خوفزدہ تھی، چونکہ میں جانتی تھی، کہ آپ جو کچھ کہیں گے مجھے کرنا ہی ہوگا، مگر وہ بچہ میرے لئے سب کچھ تھا، وہ آپ کا تھا، یہ آپ ہی نے دوسرا جنم لیا تھا — وہ "آپ" نہیں جو بےفکر و مسرور ہیں اور جنکو حاصل کرنے کی میں کبھی امید نہیں کر سکتی، بلکہ وہ "آپ" جو صرف میرے ہی لئے پیدا کئے گئے تھے، میرے ہی ایک گوشت کا ٹکڑا، جو میری ہستی سے لاینفک طور پر وابستہ تھا آخر کار میں نے آپ کو پا لیا تھا! میں اپنی رگوں میں آپ کے خون کی گردش محسوس کر سکتی تھی، میں اپنے دل کی ہر تڑپ کے ساتھ آپ کو غذا دے سکتی تھی، آپ پر محبت سے ہاتھ پھیر سکتی تھی۔ آپ کو پیار کر سکتی تھی، یہ ہی وجہ ہے کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ میں حاملہ ہوں تو میں اس قدر مسرور تھی! یہ ہی وجہ ہے، کہ میں نے اس راز کو آپ سے چھپائے رکھا، اب آپ مجھ سے عذر نہیں کر سکتے تھے۔ آپ میرے تھے۔

مگر آپ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے۔ کہ انتظار کے یہ مہینے اتنی ہی خوشی سے کٹے، جو میں نے اپنی مسرت کے اولین لمحات میں محسوس کی تھی، وہ آلام و افکار سے پر تھے، انسانی پستی اور رذالت کے تنفر سے معمور، مجھے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، آخری مہینوں میں، میں کام پر نہ جا سکی، چونکہ میرے سوتیلے باپ کے عزیز میری حالت کو سمجھ لیتے اور گھر خبر بھیج دیتے، میں اپنی ماں سے بھی روپیہ مانگنا نہیں چاہتی تھی، لہذا وضع حمل کے وقت تک میں اپنے چھوٹے موٹے زیورات بیچ کر گذر کرتی رہی۔ زچگی سے ایک ہفتہ پیشتر میری جیب میں جو کچھ دام پڑے تھے، وہ ملازم نے چرا لئے۔ اور اسلئے مجھے زچاؤں کے شفاخانے جانا پڑا۔ وہ بچہ، آپ کا لڑکا، بدبختی و بدنصیبی کے اس خرابے، اس محتاج خانہ میں غریبوں، لاوارثوں، بے خانمانوں کے درمیان میں پیدا ہوا، وہ ایک منحوس مہلک جگہ تھی، ہر چیز اجنبی، ہر چیز بیگانہ تھی۔ ہم وہاں اپنی تنہائی میں ایک

دوسرے سے بیگانہ پڑے تھے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات تھے، شفاخانے کے اُس وارڈ میں جہاں خون۔ کلوروفارم کا تعفن تھا، جو آہ و ماتم کی آوازوں سے معمور تھا، ہم افلاس و مصیبت کے تنہا رشتہ میں منسلک وہاں پڑے تھے، شفاخانے کے ایسے کمروں میں، سرہانے کی تختی پر لکھے ہوئے نام کے علاوہ مریض اپنی تمام شخصیت، اپنی تمام انفرادیت، اپنی تمام انانیت کھو بیٹھتا ہے۔ بستر پر پڑا ہوا مریض انسان نہیں، گوشت کا ایک تڑپتا ہوا ٹکڑا، مطالعہ و مشاہدہ کی ایک چیز ہے۔

ان باتوں کے بیان کرنے کیلئے میں آپ سے معافی کی خواستگار ہوں، میں ان کا پھر کبھی تذکرہ نہیں کروں گی، گیارہ برس سے میں خاموش رہی اور تھوڑی دیر میں ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جاؤں گی۔ ایک مرتبہ میں چیخنا چاہتی تھی، کہ یہ بچہ کس قدر گراں قیمت پر خریدا گیا تھا۔ یہ بچہ جو میری مسرت کا ذریعہ تھا، اور جو اب مردہ پڑا ہے، میں وہ المناک مہیب ساعتیں فراموش کر چکی تھی۔ اسکے تبسم اور اس کی آواز میں ان کو محو کر چکی تھی، اپنی مسرت میں ان کو بھول گئی تھی۔ اب جبکہ وہ مُردہ پڑا ہے وہ کرب و اذیت پھر زندہ ہو گئے ہیں اور میں صرف ایک مرتبہ الفاظ میں اس کو ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں آپ کو الزام نہیں دیتی، صرف خدا کو، ہاں صرف خدا کو جو ان سب بے معنی مصیبتوں کا خالق ہے، کبھی آپ کے خلاف کوئی برہم خیال میرے دل میں پیدا نہیں ہوا۔ دردِ زہ کے جانسوز کرب میں بھی مجھے آپ پر غصہ نہیں آیا۔ میں کبھی ان راتوں پر نہیں پچھتائی جب مجھے آپ کی محبت مل گئی تھی۔ میں ہمیشہ آپ سے محبت کرتی رہی، ہمیشہ اس ساعتِ مسعود کو دعائیں دیتی رہی جب آپ میری زندگی میں آئے۔ اگر میرے لئے یہ ممکن ہوتا کہ میں زمانے کو لوٹا کر اتنے عرصہ کیلئے پھر زندہ رہ سکوں، چاہے یہ زندگی جہنم ہی میں بسر کرنا پڑے، تو میں ایک بار نہیں متعدد بار ایسا کر چکی ہوتی۔

ہمارا بچہ جسے آپ جانتے بھی نہیں کل مر گیا۔ آپ کی نظر میں اسپر نہیں پڑیں اس کی بشاش ہستی سے آپ کا سبھی بعید ترین گریزیا عارضی انفصال بھی نہ ہو سکا۔ بچہ کی پیدائش کے بعد بہت عرصہ تک میں آپ کی نظروں سے پوشیدہ رہی، میری ہستی پر آپ کی محبت کا چھا جانے والا اثر کم ہو گیا تھا، ہاں مجھے یقین ہے، میرے دل میں آپ کی محبت کا وہ پہلا سا جوش باقی نہ رہا تھا۔ اب آپ کی محبت میری پہلی سی قلبی اذیت کا ذریعہ نہ تھی۔ چونکہ اب میرے پاس لڑکا تھا۔ میں اپنے آپ کو اسکے اور آپ کے درمیان میں تقسیم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنی ہستی کو آپ کے سپرد نہیں کیا جو مجھ سے بے نیاز و مسرور تھے۔ بلکہ اس لڑکے کے لئے وقف کر دیا جس کو میری ضرورت تھی، جس کی میں پرورش کر سکتی تھی، جس کو میں پیار کر سکتی تھی، جس کو سینے سے لگا سکتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا اپنے قلب میں آپ کی تڑپتی ہوئی مضطرب آرزو کا درماں مجھے مل گیا ہے، معلوم ہوتا تھا آپ کے اس دوسرے جنم نے جس میں آپ سچ مچ بالکل میرے تھے، میری قسمت کی تباہی و بربادی کو دور کر دیا ہے، اب یوں ہی کبھی کبھی میرے جذبات آپ تک، آپ کی قیام گاہ تک پہنچتے تھے، ایک خاص بات یہ کہ ان پھولوں کی طرح جو آپ نے محبت کی پہلی شب کو مجھے دئے تھے کچھ سفید گلاب کے پھول میں آپ کی سالگرہ کے دن ہمیشہ بھیجتی رہی۔ کیا اس دس گیارہ سال کے دوران میں کبھی ایک دفعہ بھی آپ کو یہ خیال آیا کہ آپ اپنے دل میں سوچیں کہ یہ پھول کس نے بھیجے ہیں؟ کیا آپ کو کبھی یہ بھی یاد آیا کہ اسی قسم کے چند پھول آپ نے ایک دفعہ ایک لڑکی کو دئے تھے؟ میں نہیں جانتی اور کبھی نہیں جان سکوں گی۔ میرے لئے اتنا ہی بہت تھا کہ لاعلمی کی تاریکی سے آپ کو وہ پھول بھیجا کروں، اتنا ہی بہت تھا کہ ہر سال اس ساعتِ مسعود کی یاد کو اپنے دماغ میں تازہ کر لیا کروں!

(باقی)

سایہ نما قاتل

کلیس روڈ تھانہ سٹی کے مرکز میں ناکمبھ جاسوس بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں چھوٹی تپائی پر تھے اور دل میں امنگیں تھیں کہ آدھی رات ہو اور فریضۂ نیم شبی سے گلو خلاصی ہو جائے۔ پہلو والی کرسی پر انسپکٹر آباد جلوہ فرما تھے اور ابھی ابھی کلب کی واپسی میں گھر جاتے ہوئے آ گئے تھے۔

"سارا حلقہ شب خوشاں ہو یا جزیرۂ خیر آباد" ناکمبھ نے انسپکٹر آباد کے جواب میں کہا جس نے پوچھا تھا کہ کہو کیا حال چال ہے "زندگی روزمرّہ کا دائرہ بن کر رہ گئی ہے۔ پیری بڑھتی جاتی ہے اور جنبش کا انتظار رہتا ہے۔"

انسپکٹر نے دانت دکھا دئے۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ اس کا ماتحت قابل قدر ہے، اور اس پر نچلا بیٹھنا ایک بوجھ ہے۔

بڈھے نے تشفی آمیز لہجے میں کہا "رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" اور اسے خبر نہ تھی کہ اس کے الفاظ میں کتنی پیشگوئی کی شان تھی۔

ناکمبھ نے ایک سانس لی اور پھر حیرت انگیز سکوت میں غوطے لینے لگا۔

کرسی کے اگلے دو پائے اٹھے ہوئے تھے اور ناکمبھ پچھلے پاؤں پر ٹیک لگائے چھت کو ان دیکھے طور پر دیکھ رہا تھا۔ دوسری کرسی پر انسپکٹر آباد شام کا ایک اخبار لئے یونہی سیر کر رہے تھے۔ یکایک ناکمبھ کی میز پر فون کی گھنٹی بجی جس کے تیز اور پیہم ترنم نے بوجھل سناٹے کو توڑ دیا۔

"اخوہ" ناکمبھ نے زور سے اپنے پاؤں فرش پر دھماکے سے پٹکے۔

"غالباً کوئی معمولی سی بات ہو گی جو میرے بستر کو ایک گھنٹہ اور میرا منتظر رکھے گا۔" بڑبڑاتے ہوئے اس نے رسیور کو کانوں سے لگا لیا۔

"یہ تم ہو ناکمبھ؟" نچلی والی منزل سے کرلست کی آواز آئی "ایک شخص جو اپنا نام نہیں بتاتا کہتا ہے کہ وہ جاسوسی سارجنٹ ناکمبھ سے بہ نفس نفیس ٹیلیفون پر باتیں کرنی چاہتا ہے۔

میں آپ کا نمبر ملا کر سلسلہ قائم کئے دیتا ہوں۔

دوسرے ہی لمحے میں ناکمبھ کے کانوں میں ایک اور صدا آئی۔ یہ نقاب پوش صدا تمکنت اور نفرت، طعن اور تشنیع سے بھری ہوئی تھی۔

"کیا مجھے جاسوسی سارجنٹ ناکمبھ سے بولنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے"

"یقیناً" ناکمبھ نے بے دلی سے کہا،

"بہتر" تار پر ایک قہقہہ سا دوڑ گیا۔ "ذرا بہت غور سے میرا ایک ایک حرف سنئے تاکہ واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے آپ کو تمام باتیں معلوم رہیں"

"باتیں۔ ظہور پذیر ہونے والے واقعات"۔ سارجنٹ کی ساری اکتاہٹ کافور ہو گئی، وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ حسنِ اتفاق سے انسپکٹر آباد بھی یہیں موجود ہیں بہتر ہے کہ تم انھیں سے باتیں کرو"

"انسپکٹر آباد" لہجہ میں بلا کی نفرت اور سبکی تھی۔ "انہیں سارجنٹ انسپکٹر کو غائب سمجھو، میں تو کسی نفیس حریف کے ساتھ بساطِ عقل بچھا کر کھیلنا چاہتا ہوں، جو پورا پھکیت کھلاڑی اور جاسوس ہو، جیسے کہ تم ہو"

"دیکھئے میں شرما جاؤں گا" ناکمبھ نے دانت پیس کر کہا، اور رسیور کے دہانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر انسپکٹر آباد سے کہنے لگا۔ یقیناً کوئی عملی ظریف ہے جو مجھے بنانا چاہتا ہے"

"یہ تمھاری بھول ہے سارجنٹ" دہانۂ فون پر کڑک کے ساتھ آواز آئی۔

"تم نے جو انسپکٹر سے کہا وہ میں نے سن لیا۔ بیشک تم نے دہانۂ فون پر ہاتھ رکھ لیا تھا مگر تم نے دستہ کو اپنے سینے کے پاس رکھ چھوڑا تھا۔ اسی لئے تمھاری صدا تمھاری انگلیوں کے درز سے سا کر مجھ تک پہونچ گئی۔ میں تمھیں اتنا سادہ نہیں سمجھتا تھا اگر تمھیں اپنی شہرت، لیاقت اور محنت کو کلنک کا ٹیکہ لگانا منظور نہیں تو جزئیات کا دھیان رکھا کرو۔

"بہت خوب، آئندہ احتیاط کی جائے گی" ناکبتھ نے مغلوبی انداز میں کہا "ذرا اپنا کام جلد بتاؤ، میں گھر جانے والا ہوں۔ بلفل پہیلیاں چھوڑ دو۔ آج تم بھی ساری رات بستر کا منہ دیکھو گے"

"خیر تم اپنی کہو" سارجنٹ نے جھنجلا کر کہا۔

آواز نے حاضر جوابی سے کہا "پہلے آپ کو سارا کچا چٹھا معلوم ہو جانا چاہئے" "آپ فانڈا محل سے واقف ہیں؟ میں نے اس محل کو اکثر دیکھا ہے"۔ ناکبتھ نے اقرار کیا

"ہاں کیوں نہ دیکھا ہوگا" غائب متکلم نے کہا "فانڈا محل اپنی شان کا نرالا ہے، اور ظاہراً بہت عظیم معلوم ہوتا ہے۔ تم جانتے ہوگے کہ اس محل کے مالک بارٹ فانڈا صاحب ہیں۔ جن کے پاس لاانتہا دولت موجود ہے اور یہ تو بھی بہتر جانتے ہیں کہ سارا سرمایہ اُن کے پاس کیونکر جمع ہوا۔ بیشک تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ بیگم فانڈا مر چکی ہیں اور ان کی تین اولادیں موجود ہیں مگر تم یہ نہ جانتے ہوگے کہ راجرصاحب اس وقت بُری طرح بیمار ہیں۔ فالج گر چکا ہے۔ بھتیجے پرخون کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ دیدوں کی تشخیص یہی ہے۔

"یہ سنکر بہت افسوس ہوا۔ ناکبتھ نے ایک چھچھلتی سی نگاہ دیوار گھڑی پر ڈالی "مگر ان تمام قصوں کا مجھ سے کیا علاقہ؟"

تار پر جو آواز آرہی تھی یکایک مدھم ہوگئی۔ اس میں سردی سے پیدا ہونے والی کپکپاہٹ اور سرگوشی کی سی تیزی پیدا ہوگئی۔ "آج ٹھیک ٹھیک آدھی رات کو فانڈا ارلج میں ایک آدمی قتل کر دیا جائے گا۔ وہ میرا پہلا شکار ہوگا۔ مگر مجھے اپنے مقصد حاصل کرنے کے لئے یعنی فانڈا کے لاکھوں روپیہ پر قبضہ کرنے کے لئے اور بھی بہت سے آدمیوں کو قتل کرنا ہے۔

ناکبتھ ایک تکان کے ساتھ اپنی کرسی پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی اور اُس نے چلا کر دہانہ فون میں کہا۔ "میں بہت تھکا ہوا ہوں اور سونے جا رہا ہوں مجھے کسی غیر ذمہ دار احمق سے بک بک کرنے کی فرصت نہیں۔ شب بخیر"

"ٹھہرو" اس حکم میں بلا کا اصرار انتہا کا تحکم تھا۔ سارجنٹ رسیور رکھتے رکھتے رک گیا۔ "سارجنٹ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ تمہیں بھی ابھی معلوم ہو جائے گا۔

"بیشک" ناکبتھ نے تیزی سے کہا "ایک سنجیدہ قاتل یقیناً حکام کو پہلے ہی سے اپنے ارادوں کا اشتہار دے دیگا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے بکواس کا دماغ نہیں میں یہ سلسلہ قطع کرتا ہوں۔

"رکو" غائب متکلم کی آواز گھٹ کر انتہائی خوفناک ہوگئی۔ ناکبتھ تاثیر سزا سے گھبرا سا گیا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم عین موقع پر شروع ہی سے موجود رہو تاکہ میں تم سے آزادی سے گفتگو کر سکوں ...... پولیس والوں میں آزادی سے مل جل جاؤں اور ان کو مدد دوں کہ کسی غلط آدمی کے سر پر سارا الزام نہ تھوپ دیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا" سارجنٹ نے غصہ سے اکڑ کر کہا "اگر تمہارا بیان صحیح مان لیا جائے تو بھی تم سے پہلے بہتوں نے سوچا تھا کہ وہ قتل کر کے بے داغ نکل جائیں گے، مگر آج ان کی ہڈیاں بھی جیلخانوں میں پس کر چونا ہوگئی ہیں۔

"ہاں گدھوں کے جسم چونا ہوگئے ہوں گے" آواز میں تشنیع تھی، "مگر سارجنٹ تم کو بھی اقرار ہوگا کہ بہت سے غیر گرفتار شدہ قاتل ہیں جو ہم تم جیسے آزاد آدمیوں میں چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ میں بھی اسی جماعت کا ایک رکن بن جاؤں گا مجھے آزاد رہ کر اس دولت سے پورا لطف حاصل کرنے کا حق ہے جو قتل و غارت سے حاصل کروں گا۔

ناکبتھ کی رگیں اینٹھ سی گئیں۔ سانس گلوگیر ہونے لگی۔ سوچا کہ پاگل تو یقینی ہے مگر شبہ کی بھی ایک جھلک انداز تکلم میں تھی۔

حقارت سے بھری ہوئی آواز کہتی ہی گئی، "میرا ارادہ ہے کہ قتل کو تکلیف سا بنا دوں۔ میں نے اپنی پوری اسکیم اچھی طرح سوچ لی ہے۔ ابھی ابھی چند لمحوں میں تم اور انسپکٹر آباد آ دھمکے تو میں تم لوگوں کے سواگت کے لئے چہار دیواری کے قریب ہی موجود ہوں گا۔ اور سارجنٹ یاد رکھو تمہیں آپ بہت سے مقدمات کی تفتیش کرنی پڑیگی۔ باغ کا بڑا مالی پودوں کے خریدار بہانے سے ٹھیک آدھی رات کے دو چار منٹ پہلے اپنا دروازہ کھولے گا سب سے پہلے اُسی کو قتل کروں گا تاکہ شبہ کی انگلی میری طرف سے دوسری طرف مڑ جائے اور قتل و غارت کا جلسہ شروع ہو جائے۔

"مگر ــــــ" ناکبتھ نے کہنا شروع کیا

"یقیناً یہ سب مجذوب کی بڑ معلوم ہوتی ہوگی" یخ بستہ آواز نے معترض ہو کر کہا "یہ ظاہری حماقت بھی میری نفیس تجویز کا جزو ہے۔ تمام واقعات ایسے غیر

مد تل انتنے جنوں آ میز معلوم ہوں گے جس میں ٹیلیفون کی یہ دعوت اور یہ بات چیت بھی شامل ہے۔ کہ تم لوگوں کے ہوش و حواس شروع ہی سے پراگندہ ہو جائیں گے اور لاکھوں کی دولت حاصل کرنے میں جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے جائیں گے ویسے ہی بیکار اور بظاہر مجنونانہ حرکتیں بھی بڑھتی جائیں تاکہ تمھاری دہشتوں میں کمی نہ ہونے پائے۔ ایک کے بعد ہی دوسرا قتل اتنی تیزی سے ہوگا کہ تم صحیح طور سے کچھ سوچ بھی نہ سکو گے۔ غالباً تم میرا مفہوم سمجھ گئے ہوگے۔ مطلب یہ ہے کہ تم حواس باختہ ہو کر کسی بے گناہ کو گرفتار کرلو گے۔ اس کی سزا ہو جائے گی اور وہ پھانسی کے تختے پر لٹک جائے گا اور خود بخود میدان میرے واسطے صاف ہو جائے گا تاکہ میں اپنی اپنی دولت کا آزادی کے ساتھ لطف اُٹھا سکوں۔

ناگمبھ نے دیر تک اپنے غصہ کو روکا۔ پھر متانت سے کہنے لگا "بہت خوب حضور اعلیٰ اب برائے کرم آپ اپنا نام اور پتہ بتادیں تو میں آپ کی خدمت میں ایک اچھی سی موٹر بھیج دوں اور آپ کے واسطے سرکاری مہمان خانہ میں ایک گرم اور سجی سجائی کوٹھری تیار رکھوں۔

تار پر ایک مرتبہ اور قہقہہ آمیز فضا دوڑ گئی "میرا پتہ فانڈا محل کے کتب خانہ سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمھیں ضرورت نہیں کہ بات کرنے والے کی جگہ کا پتہ لگاؤ، میرا نام تمھیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ تم سے ملاقات ہوگی اور تم کل پرسوں ایسے محشر خیز دنوں میں مجھ سے باتیں بھی کرو گے۔ مگر جہاں پناہ کو شبہ بھی نہ ہوگا کہ میں ہی قاتل ہوں۔

"مگر مجھے اپنے روزنامچہ میں یہ گفتگو لکھنی ہوگی"۔ ناگمبھ کی آواز میں وہ اثر تھا جو سرکش بچوں کے بہلانے کے لئے ہوتا ہے۔ "بتاؤ میں کس نام کا اندراج کروں"

آواز نے حاضر جوابی سے کہا" ایسا نام جو میرے کردار کے لئے بالکل موزوں ہو۔ ایسا نام جو کل کے اخبارات میں موٹی موٹی سرخیوں سے لکھا جائیگا۔ ایسا نام جسے تم فانڈا محل کی فصیل کے نیچے مجھے اپنے انتظار میں دیکھ کر کہہ دو گے یہی نام میرے لئے موزوں ہے۔ میں جس نام سے یاد کیا جانا چاہتا ہوں وہ سایہ نما قاتل ہے"

متکلم نے یہ کہتے ہی کہتے سلسلہ قطع کر دیا۔

"بڑی دیر کی،" انسپکٹر آباد نے سرجنٹ سے مڑتے ہی پوچھا "قصہ کیا ہے"

ناگمبھ نے حرف حرف بیان کر دیا۔ انسپکٹر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

"میں عملی مسخروں سے شدید نفرت کرتا ہوں" گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا "بارہ میں دس باقی ہیں" فرض منصبی کے طور پر ہم کو تفتیش کرنی ہی پڑے گی۔ آؤ شرط لگالو وہاں تمھیں کوئی مخمور عملی ظریف ملے گا جس کو گھر کے تمام قہقہہ زن لوگ گھیرے ہوں گے وہ سب کے سب ہم لوگوں سے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کر کے سگار اور ساغر پیش کریں گے۔ یہ مذاق بھی کوئی مذاق ہے۔

"مگر متکلم کے لہجے میں خلوص بھرا ہوا تھا،" ناگمبھ نے اپنی ٹوپی اٹھائی اگر راجہ صاحب بیمار ہیں تو ایسا جلسہ وہاں کیسے ہو سکتا ہے۔

انسپکٹر آباد نے تیز نگاہوں سے ماتحت کو دیکھا۔

"کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ وہاں کوئی قتل واقع ہوگا چلو دو منٹ میں پہونچے جاتے ہیں۔

ناگمبھ نے ہلکے سے دانت پیسا اور آگے آگے ہلکے ہلکے چلا۔ دونوں سارجنٹ کی نئی موٹر آسٹن شات کے قریب پہونچ گئے

انسپکٹر بغل والی سیٹ پر سکڑ کر بیٹھ گیا اور سارجنٹ نے چکے پر ہاتھ ڈالا مگر اُس کے سر میں ہزاروں خیالات چکر کھا رہے تھے۔ مذاق، فریضہ، اگر متکلم ظریف تھا تو واقعی غضب کا اداکار تھا جس نے اپنے شیریں لب ستہ لہجے میں بلا کی حقارت پیدا کرلی تھی، وہ طعن سے بھری ہوئی صدا اب تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ادھر وہ آسٹن ٹیکسی اور تیزی کے ساتھ فانڈا محل کی طرف رواں تھی۔

جلسوس ناگمبھ اور انسپکٹر آباد دونوں نے ایک چیز کو بیک وقت دیکھا۔ فانڈا محل کے دروازے پر سڑک والے لیمپ کی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی مگر دونوں کی آنکھوں میں چکا چوندسی ہوگئی، دیدے اُبل پڑے بیچارے ایسی عجیب تھی کہ اُنھیں گھور کر دیکھنا پڑا۔

چہار دیواری کے پاس ہی بیچ ہوا میں معلق ایک نورانی مگر خوفناک، دہشت زا اور وحشت انگیز نقاب لہریں لے رہا تھا۔ اس کی لہروں میں میٹھی چٹکیاں بھی شامل تھیں۔

ناگمبھ نے بریک دیا۔ اور اتنے اچانک طور پر کہ موٹر کے تمام پرزے ہل گئے اور وہ کھڑی ہوگئی۔

یہ شیطانی چہرہ سارجنٹ کے نیم اُمید کے خلاف فوراً ہی غائب نہیں ہوگیا بلکہ پودوں کے حاشیہ پر اُسی طرح لٹکتا رہا ایک سنگین لمحے تک دونوں پولیس والے گردنیں نکال کر گھورتے رہے۔ روشن نگر بد نما چہرے کی باچھیں طعن آمیز طریقے سے ادھی کھل گئیں۔ سارجنٹ کو اپنے کاندھے کی چتونوں میں ہلکا سا لرزہ محسوس ہوا مگر وہ فوراً سنبھل گیا۔

"اگر میں اس ظریف کو پا جاؤں تو مزاج پوچھ لوں۔ ناکبھہ فرزدگاہ پر تھل کر پہنچا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اونچے کرلئے اور فصیل کی منڈیر کی طرف جست کی۔ حسنِ قسمت سے فصیل پر بلور کے ٹکڑے جمے ہوئے نہیں تھے۔ مگر اینٹوں کے ... حاشیہ سے پوری چھل اُٹھیں۔ پھر بھی وہ پوری قوت لگا کر اوپر چڑھ گیا۔ دوسرے ہی سکنڈ میں وہ پار تھا۔ کودنے میں اُس کے انگوٹھے نرم سبزے میں دھنس گئے۔ وہ ہوا میں لہرانے والے سبزہ گوں روشن نقاب کی طرف دیوانہ وار دوڑ پڑا۔

ممکن ہے کہ ایک عملی مذاق رہا ہو۔ غالباً ایسا ہی تھا۔ مگر ایسے ظریف سے دست بگریبان ہونے کے شوق میں جاسوس بیتابانہ بڑھ رہا تھا۔

بڑبڑاہٹ کھڑکی کی آوازیں اور دھمدھاہٹ بتا رہی تھی کہ انسپکٹر آبھی تعاقب میں ہے۔ ناکبھہ کو اس خیال سے بڑی تسلی ہوئی اور وہ پوری طاقت سے اس شیطانی پیکر کی طرف روانہ ہوگیا۔

سارجنٹ آگے بڑھتا گیا وہ چیز پیچھے ہٹتی گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز پودوں، جھاڑیوں ٹہنیوں سے بے تکلفی اور آسانی کے ساتھ گزر رہی ہے، جو سارجنٹ کی راہ میں کوڑے کاٹنے اور روڑے بن رہی تھیں۔ مگر یہ بات حیرت انگیز نہ تھی۔ غالباً نقاب میں ... کی ڈور لگی ہوئی تھی اور کوئی اسے کھینچ رہا تھا پھر بھی وہ رات کے سیاہ چادر میں مستانہ طور پر ناکبھہ کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔

یکایک جبکہ سارجنٹ اور انسپکٹر کانپتے کانپتے خاردار جھاڑیوں کو پھاڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ سایہ نما چہرے سے ایسا تیز اور ہنسی سے بھری ہوئی آواز آئی، پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ناکبھہ نے ویسی ہی آواز ابھی چند منٹ پہلے ٹیلیفون پر سُنی تھی۔

انسپکٹر اب ناکبھہ کی برابر پہونچ چکا تھا۔ وہ بھی بڑبڑا اُٹھا۔ اس سے مطلب ـــــ"

ناکبھہ نے باقی جملہ نہیں سُنا وہ جھاڑیوں کا پردہ پھاڑ کر لان پر پہونچ چکا تھا۔ اب تو لہکتا ہوا روشن چہرہ بالکل اُس کے روبرو تھا اور ایک اوسط درجہ کے آدمی کے سر کے برابر اونچا تھا وہ بمشکل حرکت کر رہا تھا۔ ناکبھہ نے پھر ہاتھ بلند کرکے جست کی وہ قریب قریب اس وحشی چیز کے اوپر پہونچ گیا۔ مگر اسے چھونے حواس نے بتایا کہ یہ تفریح اور عملی مذاق نہیں، بلکہ واقعہ ہے اگر چہ پھٹا ہوا تو اب تک اُس نے قہقہہ لگا کر ختم کردیا ہوتا اور اسی کو کافی سمجھتے کہ دو پولیس والے جھاڑیوں میں اُلجھ کر ہانپتے کانپتے دوڑ رہے ہیں۔ یہ عبث حقیقی تھی اب ناکبھہ کو یقین آگیا۔ طرّہ یہ کہ وہ بے جسم کا چہرہ اب صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا سارجنٹ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور ہوا میں جست کرکے اس شخص کے پکڑنے کی کوشش کی جسے وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مگر روشن نقاب کے نیچے ہوا ہی ہوا تھی اور وہ منہ کے بل زمین پر تھا۔ اُس نے گرتے گرتے پھر وہی تیز اور حقارت آمیز قہقہہ سُنا اس میں فتحمندی اور بشاشت کی جھلک بھی آگئی تھی، پلک جھپکتے ہی ناکبھہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُدھر کی طرف لپک پڑا جدھر سے یہ سوکھا قہقہہ بلند ہوا تھا اسے کیا خبر تھی کہ ٹھیک اسی لمحہ پر انسپکٹر بھی داہنی طرف حملہ کر رہا تھا۔ چاندنی نہیں تھی، چاروں طرف اندھیرا گھُپ تھا۔ مگر ناکبھہ کو ایسا نظر آیا گویا کوئی شخص کالی رات سے بھی زیادہ کالا سامنے ہے وہ اور انسپکٹر آباد چشم زدن میں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے زمین پر نظر آئے۔

ان کے گرتے ہی سایہ نما چہرہ جھکنے لگا اور اتنا جھکا کہ قریب قریب ان کے چہرے کو چھو گئے اور پھر وہی طعنہ بھرا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

بُری طرح ہانپتا ہوا ناکبھہ بہ دقت پھر کھڑا ہوا اور کھڑے ہوتے ہی وہ اُس طرف جھپٹا جدھر سے اس قہقہہ کی صدا بلند ہوئی تھی۔ یہ حرکت اس برق روشی کے ساتھ ہوئی تھی کہ اُس کے ہاتھ میں کسی کا دامن آگیا اور اس کا بدن کسی اور جسم سے ٹکرا گیا۔ دوسرے ہی لمحہ میں وہ زخمی شیر کی طرح اس اندھیری رات میں ایک پھسلنے والے جسم سے ہاتھا پائی کر رہا تھا جس کے چہرے پر سایہ نما روشن نقاب تھا۔

ناکبھہ نے اس قابل حسین پیکر کو زیر کرنے کے لئے ساری طاقت ختم کردی مگر وہ پیکر بھی کالے کوڑیالے کی طاقت اور غصہ کے ساتھ بیچ رہا تھا۔

دونوں کے پھیپھڑے میں پنکھے لگے ہوئے تھے وہ آواز کے ساتھ سانس لے رہے تھے اور گتھے جا رہے تھے۔ ناکبھہ کا پاؤں سبزہ تر پر پھسل گیا وہ گرا مگر

اپنے دشمن کو گھسیٹتا ہوا، اس کی پیٹھ زمین پر لگی تھی کہ دوسرے نے اپنا چاقو بلند کر لیا۔ ناکبھ نے چاقو کے پھل کو اپنے گلے کی طرف آتے ہوئے دیکھا اس نے عین موقع پر اپنے سر کو جھٹک کر وار کو خالی دیا پھر دونوں ہاتھوں سے اُس نے اُس کلائی کو پکڑ لیا جس میں چاقو تھا اور اتنی زور سے مروڑا کہ دشمن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

پھل کی نوک کسی کپڑے میں اُلجھ گئی۔ حقارت پاش نقاب پیچھے ہٹا۔ دشمن رومال گھوم گیا۔ کلائی چھوٹ گئی اور روشن چہرہ پیچھے ہٹتا ہوا غائب ہوگیا۔

ناکبھ آہستہ آہستہ کھڑا ہوا اور ایک لمحہ کھڑے کھڑے اُس نے جاں بخش ہوا سے اپنے پھیپھڑے بھرے وہاں سے وہ انسپکٹر آباد کے پاس پہونچا جو بڑی مشکل سے اُٹھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ "تمہارا سر سیدھا میری کنپٹیوں پر پڑا تھا، میں گر کر بیہوش ہو گیا تھا" سارجنٹ نے اسے سہارا دیکر بٹھایا۔ انسپکٹر نے پوچھا "کیا وہ نکل گیا" "ہاں" ناکبھ نے اقرار کیا۔

"اور ایسی گھپ اندھیاری میں اُسے ڈھونڈھ نکالنے کی کوئی امید بھی نہیں۔ آؤ چلو اب کوٹھی پر چل کر سب کو خبردار کر دیں۔ کل صبح کنگھی لے کر اس مقام کا ذرہ ذرہ چھان ڈالیں گے کسی نہ کسی کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہے ——"

یکایک وہ رک گیا اور گھوم کر دیکھنے لگا ہوا میں ایک چیخ بلند ہوئی گویا کوئی شخص مرنے کے قریب ہو۔ ناکبھ کو محسوس ہوا جیسے اس کا خون جم گیا ہو۔

"وہ میرے پیچھے ہے وہ مجھے ——" چیخ مدھم ہو کر گلوگیر ہوگئی۔ ناکبھ اور انسپکٹر ایک ہو کر صدا کی طرف دوڑ پڑے۔ دونوں نے سرکاری پستول جیبوں سے نکال لیے۔

مگر ناکبھ انسپکٹر سے زیادہ تیز رفتہ آگے بڑھ گیا۔ اُس نے آخری کانٹے دار جھاڑی پار کی تھی کہ اُسے ہانپنے کی آواز سی آئی اور دو پیکر سایہ کی طرح ایک بڑے شاہ بلوط کے نیچے گتھے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے صدا دی کہ میں پہونچ گیا اور اپنی رفتار بھی تیز کر دی۔ مگر یہ سب بقدر ایک قہقہے کے ناشکور ثابت ہوئی۔ اب چاندنی بادل آلود ابر میں سے جھانکنے لگی تھی۔ اس کے ایک لمحے پر تو میں ناکبھ کو ایک چاقو ہوا میں لہراتا ہوا سر سے بلند دکھائی دیا۔ چاقو شیطانی طور پر جھک کر نیچے جھکا اور اگر سیاہ پوش پیکر اُچھل کر درختوں میں غائب ہوگیا اور وہاں سبزے پر ایک مجروح دم توڑتا نظر آیا۔

ناکبھ نے ذرا سی جھلک دیکھی کہ وہ رواں دواں پیکر محل کی پشت کی طرف بھاگا۔ یکایک اُس نے اپنا داہنا ہاتھ بلند کیا اور اپنے چھ فائر والے پستول کو ہوا میں خالی کر دیا۔ ساری فضا دھوئیں اور زناٹوں سے گونج اٹھی۔ جواب میں صرف ایک طعنہ آمیز قہقہہ ملا۔

اس کے بعد روح فرسا سکوت طاری ہوگیا۔ کسی ہمسایہ گھڑیال میں پورے بارہ قریبوں میں بارہ بجے ٹھیک آدھی رات ہوگئی۔

سایہ نما قاتل نے اپنے وعدے کا حرف حرف پورا کر دکھایا تھا۔

کئی طویل اور سنگین لمحوں تک ناکبھ بت بنا کھڑا رہا۔ اور اُس جگہ کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا جہاں سے وہ پیکر غائب ہوا تھا پھر پستول جیب میں رکھ کر انسپکٹر کی طرف مڑا۔ جو گھٹنوں کے بل کھڑا ہو چکا تھا۔

"پیچھا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ ناکبھ نے بھی گھٹنوں کے بل ہو کر کہا۔ یقیناً وہ چور دروازے سے چپکے سے داخل ہو گیا ہوگا اور نقاب اُلٹ کر لوگوں کے ساتھ مل جل گیا ہوگا۔

اب اس نے بہت احتیاط سے مقتول کو دیکھا۔ اُس کے گلے میں دستے تک چاقو اُتر گیا تھا۔ زبان نکل آئی تھی، دیدے پھٹے ہوئے تھے اور بے گناہ وہ پتھر کی طرح سرد اور سخت ہو چکا تھا

اپنا رومال دستے پر لپیٹتے ہوئے ناکبھ نے چاقو زخم سے باہر کھینچ لیا اور اُس کو تیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ چاقو عام قسم کا تھا مگر نیا تھا اور بہت تیز تھا۔

انسپکٹر نے ادب کر سانس لی اور کہا ہم عین موقع پر موجود تھے پھر بھی —— " وہ کانپ کر چپ ہوگیا۔ "ہاں" ناکبھ نے لفتی آواز میں کہا۔ "طرۃ تو یہی ہے اب ہیں ——"

وہ یکایک چپ ہوگیا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ فانڈا محل کے ہر کمرے میں قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ شور و غل سے گھر والے جاگ اُٹھے تھے اور سامنے کی برجی سے متجسس، متحرک، اور متحیر لوگ باہر آرہے تھے۔ ناکبھ انسپکٹر آباد ابھی کھڑے بھی نہ ہوئے تھے کہ آنے والوں میں سے چند آدمیوں نے اپنی ٹولی الگ کر لی اور اُن کی طرف بڑھے۔ (باقی)

سید طالب علی ایم۔ اے الہ آبادی

(م۔ک۔م)

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے"؟

"وہ یہ نہیں کہتی کہ کٹی کو تم سے محبت ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ تمہاری بیوی ہوگی!"

یہ الفاظ سن کر لیون کا چہرہ خوشی کی مسکراہٹ سے جگمگا اُٹھا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسوؤں کی جھلک تھی۔

"کیا وہ ایسا کہتی ہے؟" اس نے کہا "میں ہمیشہ سے یہ کہتا چلا آیا ہوں کہ تمہاری رفیقۂ حیات بہت پیاری ہے۔ بہرحال ہمیں اب اس معاملہ میں زیادہ گفتگو کرنی نہیں چاہیئے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا۔ اچھا۔ بیٹھ جاؤ"

مگر لیون نہیں بیٹھا۔ اس نے کمرے میں ایک طرف سے دوسری طرف جمے ہوئے قدموں کے ساتھ دو ایک مرتبہ چکر لگائے آنسوؤں کو روکنے کے لئے زور سے دو ایک مرتبہ آنکھوں کو میچا اور پھر میز کے قریب کرسی پر آکر بیٹھا۔ "تمہیں میری بات سمجھنی چاہیئے" اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ محبت نہیں ہے۔ میں محبت کر چکا ہوں مگر وہ ایسی نہیں تھی جیسی کہ یہ ہے یہ صرف جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے یہ تو ایک ایسی اندرونی قوت ہے جو میرے اوپر حاوی ہے۔ میں نے ماسکو چھوڑ دیا تھا کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس مسرت کا حاصل کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے اگرچہ وہ اس عالم کے لئے ایک نعمت ہے۔ میں اپنے آپ سے لڑا مگر بیکار۔ اب میں اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ اس کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ اس کا ایک مرتبہ فیصلہ ہونا چاہئے۔ اور ...."

"لیکن پھر تم چلے کیوں گئے تھے؟"

"اوہ۔ ٹھہرو۔ میں نے اس کا خیال کتنی مرتبہ کیا؟ سنو! تم خیال نہیں کر سکتے کہ تمہارے الفاظ نے میرے اندر کتنی جرأت پیدا کر دی ہے۔ مجھے کیسی خوشی ہے کہ میں بالکل خود غرض ہوا جا رہا ہوں اور سب کچھ بھول رہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے .... میرا بھائی نکولی یہیں ہے .... مجھے آج صبح ہی بتایا گیا ہے ..... مگر میں اس کے متعلق سب کچھ بھول چکا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ بھی خوش و خرم ہوگا۔ لیکن یہ ایک دیوانگی کا دورہ سا ہے۔ پھر

بھی ایک بات میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ تم شادی شدہ ہو۔ اور غالبًا اس جذبہ کو سمجھتے ہو۔ میرے لئے یہ تکلیف دہ ہے کہ ہم جیسے لوگ جو معمّر ہونے جا رہے ہوں اپنے گزشتہ گناہوں کے ساتھ...... اخیر، جلد از جلد ایک معصوم دوشیزہ لڑکی کی قربت حاصل ہونا چاہیے یہ ایک انقلابی کشمکش ہے........ میں اس (کٹی) کے قابل نہیں ہوں۔"

"اپنے آپ کو ملامت کرنے کے لئے تم نے بہت سے گناہ تو نہ کئے ہوں گے۔"

"ہاں۔ مگر اس کے ساتھ ہی......" لیون نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "اس کے ساتھ ہی جب میں اپنی گزشتہ زندگی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے نفرت ہو جاتی ہے۔"

"لیکن ہم کر کیا سکتے ہیں۔ دُنیا کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا ہے" اسٹیفن ارکیڈی دچ نے کہا۔

تسکین کی صرف ایک صورت ہے۔ التجا! مجھے معاف کر دو۔ یہ دیکھ کر نہیں کہ میں کس قابل ہوں۔ اپنے کرم پر نگاہ رکھ کر اور صرف اسی طرح وہ معاف بھی کر سکتی ہے۔

(۱۱)

لیون نے اپنا گلاس ختم کیا اور دو منٹ تک دونوں دوست خاموش رہے۔

"میں ایک بات تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں" اسٹیفن آرکیڈی دچ نے کہنا شروع کیا "کیا تم 'اونسکی' کو جانتے ہو؟"

"نہیں! تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ہمیں ایک بوتل اور چاہیئے" اسٹیفن آرکیڈی نے ملازم سے کہا جو اِن کے لئے گلاس بھر رہا تھا۔ اور میز کے آس پاس گھومتا رہتا تھا خصوصًا اس وقت جبکہ اُس کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔

"کیونکہ 'اونسکی' تمہارا رقیب ہے!"

"لیکن یہ اونسکی ہے کون؟" لیون نے پوچھا اور اس کا چہرہ جس نے ابھی اپنے پُر شباب جوش سے اسٹیفن کو حیران کر دیا تھا ایک دم پژمردہ ہو گیا۔

"وہ کاؤنٹ کیرل آئیو نیو دچ اونسکی کا لڑکا ہے اور سینٹ پیٹرسبرگ کی سوسائٹی کے سب سے آگے بڑھنے والے نوجوانوں میں سے ایک ہے۔ میں اس سے 'وز' میں ملا تھا جبکہ میں ڈیوٹی پر تھا وہ وہاں فوجی امیدوار کی حیثیت سے آیا تھا۔ وہ بہت دولتمند ہے حسین ہے اور با اثر تعلقات رکھتا ہے۔ اڈی کیمپ ہے۔ دلکش انداز رکھتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ بہت خوش مزاج انسان ہے۔ وہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ میں نے اس کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسے ایک بہت ہوشیار تہذیب یافتہ جوان پایا۔ وہ آجکل میں اپنی شہرت کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیگا۔"

لیون نے اپنی بھوؤں کو سکیڑا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"تمہارے جاتے ہی وہ ماسکو آ گیا تھا۔ اور کٹی کی محبت میں سر تا پا غرق ہو گیا۔ غالبًا تم کٹی کی ماں سے تو واقف ہو......"

"معاف کرنا۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا" لیون نے ذرا درشتی سے جواب دیا۔ اُسی وقت اسے اپنے بھائی 'نکولی' کا خیال آیا اور اسے اس وقت تک بھولے رہنے پر خود کو ملامت کی۔

"ایک منٹ۔ صرف ایک منٹ" اسٹیفن نے اپنا ایک ہاتھ نہایت خلوص سے لیون کے بازو پر رکھ کر مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں نے تم سے سب کچھ کہہ دیا ہے مگر اِن تمام اُلجھے ہوئے معاملات سے جو نتیجہ میں نے نکالا ہے میں اُسے جانتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ تمام حالات تمہاری موافقت میں ہیں۔"

لیون نے کرسی سے تکیہ لگا لیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو چکا تھا

"مگر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم معاملہ کو جس قدر جلد طے کر سکو کر لو" ابلانسکی اسٹیفن نے لیون کا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔ بس اَب میں اور زیادہ نہیں پیوں گا" لیون نے گلاس کو ہاتھ سے سرکاتے ہوئے کہا "نہیں تو پھر میں بالکل مدہوش ہو جاؤں گا اَب تم اپنے حال چال بتاؤ" اس نے گفتگو کا رُخ بدلنا چاہا۔

"بس ایک بات اور۔ چاہے کچھ بھی ہو مگر میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اس معاملہ کو بہت جلد طے کر لو۔ آج رات کو کوئی گفتگو نہ چھیڑنا" اسٹیفن نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "ہاں کل جاؤ۔ اور

تجویز کو باقاعدہ پیش کردو.......... اور میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"کیا اب بھی تم ہمارے یہاں شکار کے لئے نہیں آنا چاہتے بہار کے موسم میں آؤ۔" لیون نے کہا۔ اسے اس بات کا دلی رنج تھا کہ یہ گفتگو کیوں چھیڑی گئی۔ اور سب سے زیادہ اسے اسٹیفن کی نصیحت اور مفروضہ رقیب کے متعلق اس کے چبھتے ہوئے جملوں سے اِسے بڑی تکلیف ہوئی۔

اسٹیفن ارکیڈی وچ مسکرایا۔ اس نے لیون کی دماغی کیفیت کو محسوس کرلیا۔ "کسی نہ کسی وقت میں بالکل گر جاؤں گا۔ میرے عزیز دوست میری بات یاد رکھنا۔ عورت ایک ستون ہے جس کے گرد تمام دُنیا چکر کاٹتی ہے۔ میرے اپنے معاملات بھی خراب ہیں بہت خراب۔ اور سب عورتوں کی وجہ سے ہیں۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے.........." اس نے ایک ہاتھ میں سگار لے کر دوسرے ہاتھ سے جام شراب اُٹھاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "تم اپنی قیمتی رائے دو"

"کس بات کے متعلق ؟"

"معاملہ کچھ ایسا ہے۔ فرض کرو تمہاری شادی ہو چکی ہے اور اسی زمانہ میں جبکہ تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو کوئی اور عورت تمہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے.........."

"مجھے معاف کرنا۔ میں اس معاملہ کو سمجھ نہیں سکتا۔ مجھے یہ بات ایسی معلوم ہوتی ہے .... کہ ہم یہاں سے بہترین کھانا کھا کر چلیں اور راستہ میں ایک نانبائی کی دوکان سے ایک روٹی چُرالیں۔"

اسٹیفن کی آنکھوں میں پہلے سے زیادہ چمک پیدا ہو گئی "کیوں نہیں ؟ بعض اوقات روٹی کی خوشبو تمہیں اس قدر مست کردیتی ہے کہ تم اپنی خواہش کو روک نہیں سکتے۔"

یہ کہتے ہوئے ابلانسکی مسکرا رہا تھا۔ لیون سے بھی مسکراہٹ ضبط نہ ہوسکی۔

"اچھا اسے چھوڑو۔ ایک عورت کا خیال کرو۔ ایک غریب پیاری مخلص عورت کا جس نے سب کچھ تمہارے اوپر نثار کردیا ہو اور جب یہ سب کچھ ہو چکا ہو تو کیا اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ میرے خیال میں تو خاندان میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے اس سے رشتہ کو منقطع کرنا ضروری ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مرد کو اس پر رحم نہیں آئے گا۔ اور وہ جدائی کو کم تکلیف دہ بنانے کے لئے اس کے مستقبل کا کوئی انتظام نہیں کرے گا؟"

"معاف کرنا۔ تم جانتے ہو کہ میرے لئے عورتیں دو حصّوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں.......... یعنی......... واضح الفاظ میں یوں سمجھو۔ کچھ تو عورتیں ہیں اور کچھ.......... میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی دیکھوں گا۔ ایک ایسی گری ہوئی عورت جو خوبصورت ہو ایسی تمام عورتیں اس مصنوعی طور پر رنگین فرانسیسی لڑکی کی طرح ہوتی ہیں جس نے اپنے بالوں میں بناوٹی خم پیدا کئے ہوں اور دُکان کی میز پر بیٹھی ہوئی ہو۔ اور ایسی تمام عورتوں سے میں نفرت کرتا ہوں۔"

"لیکن نئی انجیل کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"برائے مہربانی ذرا ٹھہرو۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے الفاظ کو اس طرح استعمال کیا جائیگا تو وہ غالباً انھیں فرماتے ہی نہیں۔ لوگ انھیں تمام انجیل میں سب سے زیادہ یاد رکھتے ہیں۔ بہرحال میں اس معاملہ میں جو کچھ خیال کرتا ہوں وہ نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ وہ کہہ رہا ہوں جو محسوس کرتا ہوں۔ اس قسم کی عورتوں میں میرے لئے کوئی دلکشی نہیں ہوتی۔ اور ان کے متعلق میرے دِل میں وہی احساس پیدا ہوتا ہے جو تمہارے دل میں مکڑیوں کے متعلق ہوتا ہے۔ اور تم نے غالباً مکڑیوں کی خصوصیات کا اتنا گہرا مطالعہ نہ کیا ہوگا جتنا کہ میں نے اس قسم کی عورتوں کی عادتوں کا کیا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس طرح تم ڈکنس کے اس کردار کے مطابق ہو جو تمام مشکل مسائل کو ہمیشہ بائیں طرف سے سیدھی جانب پھینک دینے کا عادی تھا لیکن کسی واقعہ سے انکار کردینے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اس کا جواب دیدیا گیا۔ آخر انسان کرے کیا میں تو

یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ میری بیوی بوڑھی ہوتی جارہی ہے۔ اور اب میں اس سے اتنی محبت نہیں کرسکتا جتنی کہ اس کی عزت کرسکتا ہوں۔ اور میں ابھی جوان ہوں زندگی سے لبریز میری ملاقات کسی اور سے ہوتی ہے مگر اس کا مطلب صرف تباہی ہے صرف تباہی !" اسٹیفن نے انتشار میں دُہرایا۔

لیون کے لبوں پر طعن آمیز مسکراہٹ آئی۔

"لیکن میں کروں کیا ؟" ابلانسکی نے پوچھا

"نئی روٹی مت چراؤ !"

اس پر اسٹیفن کو زور سے ہنسی آگئی۔" بڑے اخلاق کے معلّم ! اب دو عورتیں سامنے ہیں۔ ایک اپنے حق پر زور دیتی ہے اور وہ تمہاری محبت ہے اور وہ تمہاری محبت ہے جسے تم نہیں دے سکتے ہو۔ دوسری عورت تمہیں سب کچھ دے دیتی ہے اور جواب میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ ایسی صورت میں تم کیا کروگے۔ تمہارا عمل کیا ہوگا یہ کیسا المناک حادثہ ہے۔"

"اگر تم مجھ سے پوچھو تو اس میں المناکی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ افلاطون کے نظریہ کے مطابق محبت دو قسم کی ہوتی ہے اور دونوں محبتیں انسان کے لئے کشش رکھتی ہیں۔ بعض لوگ صرف ایک قسم کی محبت کرسکتے ہیں اور بعض لوگ صرف دوسری قسم کی۔ جو لوگ افلاطونی محبت کو نہیں سمجھتے ہیں انھیں اس سلسلہ میں المناکی کا ذکر ہی نہیں کرنا چاہئے۔ ایسی محبت کسی المناکی سے بہت بلند و بالا ہوتی ہے اسی طرح افلاطونی محبت کا انجام بھی کسی المناک واقعہ پر نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ بہت لطیف اور ملکوتی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ...."

یہاں لیون کو اپنی کوتاہیوں اور اس اندرونی کشمکش کا جس سے وہ گزر رہا تھا خیال آیا۔

"لیکن بہرحال تم بھی اپنی جگہ صحیح ہوسکتے ہو۔" اس نے ایکدم گفتگو کا رُخ بدلا "یہ ہوسکتا ہے کہ میں اس معاملہ میں کچھ نہ جانتا ہوں اور بالکل لاعلم ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک ایسے انسان ہو جو اپنی زندگی کا ایک مقصد رکھتا ہے۔ یہ تمہاری ایک قیمتی خصوصیت ہے اور ساتھ ہی یہی تمہارا قصور بھی ہے۔ تم یہ چاہتے ہو کہ زندگی کے تمام واقعات اسی ایک مقصد سے متعلق ہوجائیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کرتا۔ تم ریاست کی ملازمت کو چھوڑ دیتے ہو کیونکہ وہ تمہیں بیکار اور بے مقصد معلوم ہوتی ہے۔ تم چاہتے ہو کہ ہر شخص کسی ایک مقصد کے ماتحت۔ کسی ایک لائحۂ عمل کے مطابق کام کرے۔ تم یہ یقین رکھتے ہو کہ خاندانی زندگی اور محبت علیحدہ علیحدہ قائم نہیں رہ سکتے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ زندگی کا جمال اسی وقت تک ہے جب تک نور اور ظلمت میں نمایاں امتیاز قائم رکھا جائے۔"

لیون نے ایک آہ کھینچی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ابلانسکی کی باتیں سُننے کے بجائے اپنے خیالات میں گم ہوگیا۔ جلدی دونوں یہ سمجھ گئے کہ اس ڈنر نے جو انھیں ایک دوسرے سے اور قریب کرنے کے لئے تھا۔ باوجود ان کی گہری دوستی کے دونوں کے درمیان اختلافات کی خلیج اور وسیع کردی۔ ابلانسکی کو اس قسم کے واقعات سے اکثر دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے وہ جانتا تھا کہ ایسے موقع پر کیا کرنا چاہئے۔

"میرا حساب کیا ہوا" اس نے ہوٹل کے ملازم سے کہا اور دوسرے کمرے میں جاکر اپنے ایک ملاقاتی سے ایک ایکٹرس اور اُس کے چاہنے والوں کے متعلق گفتگو کرنے لگا۔ لیون سے گفتگو کرنے کے بعد جس سے اس کے دماغ پر کافی اثر پڑا تھا یہ ایک دلچسپ تبدیلی ثابت ہوئی۔

اتنے میں ملازم حساب کا کاغذ لے آیا۔ ڈنر کی قیمت اٹھائیس روبل اور کچھ ہوئی تھی۔ لیون کو ایک ڈنر میں اس قدر رقم کا صرف ہونا ناگوار تو ہوا مگر اس نے اپنے حصّے کے چودہ روبل چپکے سے ادا کردئے۔ اور اُسی وقت گھر کو روانہ ہوگیا۔ کیونکہ اسے شرنسکی خاندان میں جانا تھا۔ جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔

(باقی آئندہ)

مترجمہ :- محترمہ سیّدہ خاتون یحییٰ

دو شہروں کی کہانی

چارلس ڈکنس کا ایک شاہکار اُردو میں

نومبر ۱۷۷۵ء کی ایک بھیگی ہوئی شام کا ذکر ہے۔ ایک سن رسیدہ شخص مسٹر لوری جو لندن کے ٹیلسن بنک سے بھی تعلق رکھتے تھے ڈاک گاڑی میں ڈوور کی طرف سفر کر رہے تھے۔ اُن کا ایک عجیب و غریب مقصد تھا۔ کسی گم شدہ شخص کو قبر سے باہر نکالنے کے لئے سفر کی تکلیف اُٹھا رہے تھے۔ جیسے جیسے گاڑی چلتی گئی مسٹر لوری کے سامنے اس شخص کا چہرہ زیادہ نمایاں طور پر آتا گیا۔ ایک ایسے شخص کا چہرہ جس کی عمر پینتالیس کی تھی۔ حالت خراب و خستہ تھی اور سر کے بال قبل از وقت سفید ہو چکے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مسٹر لوری کو وہ چہرہ ہزاروں بار ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ سینکڑوں مرتبہ اس اونگھتے ہوئے مسافر نے اس "خیالی پیکر" سے سوال کیا۔

"دفن ہوئے کتنا عرصہ گزرا؟"

جواب ہمیشہ ایک ہی ملا۔ "تقریباً اٹھارہ سال!"

"کیا تم نے قبر سے دوبارہ باہر نکالے جانے کی تمام امیدیں منقطع کر دی ہیں؟"

"مدّت ہوئی!"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم دوبارہ زندگی کی طرف بُلائے جا رہے ہو؟"

"لوگ ایسا کہتے ہیں!"

"مجھے اُمید ہے کہ تمہیں زندہ رہنے کی آرزو ہے"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا"

گاڑی تمام رات چل کر دوپہر سے پہلے ڈوور پہنچ گئی۔ مسٹر جارویس لوری نے ناشتہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی ہم سفر ساتھی سے ملے جو مدفون شخص یعنی اپنے باپ کو دوبارہ زندگی کی طرف بلانے کے لئے فرانس جانے والی تھی

'لوسی مینٹ' فرانسیسی بھی تھی انگریز بھی۔ عمر سترہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ میانہ قد۔ نازک اور حسین پیکر۔ سُنہرے گھنے بال نیلگوں آنکھیں جو مسٹر لوری کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی پیشانی میں عجیب و غریب صلاحیت تھی۔ کبھی اوپر کو اُٹھ جاتی کبھی ایسے بل پڑ جاتے جن سے اندرونی جذبات کا اظہار ہونے لگتا۔ ان جذبات کا جن میں اضطراب۔ حیرت۔ خوف اور گرمیٔ توجہ چاروں کیفیتیں شامل تھیں۔ اگر وہ صرف انھیں پر مشتمل نہیں تھے۔

لوسی کی پرورش انگلستان میں اس یقین کے ماتحت کی گئی تھی کہ اس کے ماں باپ دونوں اس جہان سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مسٹر لوری کو چند حیرت انگیز خبریں لوسی پر ظاہر کرنا تھیں یعنی یہ کہ اٹھارہ سال ہوئے فرانس کے دو نوجوان بدمعاش امیروں

نے ڈاکٹر مینٹ کو دو مریضوں کے علاج کے لئے خفیہ طور پر بُلایا تھا۔ ان مریضوں میں ایک کسان لڑکی تھی جسے وہ بھگا لائے تھے اور جس کے ساتھ انھوں نے ایسا بُرا سلوک کیا کہ آخر کار وہ مر گئی دوسرا اس کا بھائی تھا جو بہن کو بچانے میں گولی کا نشانہ بنا تھا۔

دونوں بیمار مر چکے تھے۔ اس بدترین فعل کو چھپانے کے لئے ڈاکٹر کے سامنے سونا پیش کیا گیا۔ مگر بہادر ڈاکٹر نے اسے ٹھکرا دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس کے دولتمند اور امراء بے انتہا طاقت کے مالک تھے۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر مینٹ کو گرفتار کر لیا گیا اور قید خانہ میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر کی بیوی کو جو اس واقعہ سے دو سال بعد مر گئی۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا شوہر کیوں اور کس قید خانہ میں بھیجا گیا۔

مسٹر لوری نے یہ تمام قصّہ لوسی سے بیان کیا۔ سُنتے وقت وہ کانپ رہی تھی اور بالکل بے جان معلوم ہوتی تھی۔ اس کی پیشانی جو مسٹر لوری کے لئے خصوصاً جاذب نگاہ تھی خوف اور درد کے زیادہ گہرے مظاہرہ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"لیکن اس کا پتہ معلوم ہو گیا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اغلب ہے کہ اس میں بہت تبدیلی ہو گئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صرف ایک بیکار شکستہ ہو کر رہ گیا ہو۔ تاہم ہمیں نیک گمان کرنا چاہئے وہ ابھی تک زندہ ہے۔ تمہارے باپ کو پیرس میں ایک پُرانے ملازم کے مکان میں رکھا گیا ہے۔ اور ہم وہیں جا رہے ہیں۔ میں اس لئے جا رہا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو اُس کی شناخت کروں۔ اور تم اس کی زندگی بحال کرنے، محبّت، فرض ادا کرنے اور اسے آرام و راحت پہنچانے کی غرض سے جا رہی ہو۔"

لوسی کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور اس کے بعد مسٹر لوری سے۔ اِس نے مدھم، صاف اور سہمی ہوئی آواز میں اس طرح کہا گویا وہ خواب میں بول رہی ہو:۔

"میں اس کی روح کو دیکھنے جا رہی ہوں۔ یہ اس کی روح ہو گی۔ وہ نہ ہو گا۔"

"ایک بات اور کہنی ہے۔" مسٹر لوری نے کہا "اس کو اب ایک دوسرے نام کے ماتحت پکارا جاتا ہے۔ اس کا اصل نام عرصہ ہوا بُھلا دیا گیا یا مدّت سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ اس کی تفتیش کرنا بالکل بیکار ہو گا کہ آیا اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا ہمیشہ جان بوجھ کر قید میں رکھّا گیا ہے۔ یہ نہ صرف بیکار ہے بلکہ خطرناک بھی ہے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس موضوع کا ذکر کسی جگہ اور کسی طریقہ پر بھی نہ کیا جائے اور اس کو فرانس سے باہر لایا جائے۔ میں باوجودیکہ ایک انگریز ہونے کی حیثیت سے بالکل محفوظ ہوں تاہم اس معاملہ کا ذکر کرنے سے اجتناب کرتا ہوں۔ یہ بالکل ایک خفیہ چیز ہے۔ اور میری تمام اسناد کا لب لباب صرف ایک نظر میں ہے۔

(St. Antoine) میں شراب کی دُکان

اس عہد میں فرانسیسی عوام کی جو حالت تھی اس کی صحیح تصویر پیش کرنا بہت دشوار ہے۔ ملک کے طول و عرض میں یہ بے چارے محنت کرتے تھے اور بھوکے مرتے تھے۔ انھیں زدوکوب کیا جاتا تھا اور طرح طرح کے مظالم ان پر توڑے جاتے تھے اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ امیر لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکیں۔ کسانوں کے کاندھوں پر موقعہ اور بے موقعہ محصولات کا بار رکھا جاتا تھا۔ ان کی زندگیاں خوفناک افلاس، بھوک، اور سینکڑوں بلاؤں میں مبتلا کی جاتی تھیں تاکہ شاہی دربار پانی کی طرح روپیہ بہا سکے۔

سینٹ انٹائنی کے محلّہ میں اُفلاس، عریاں چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ ہر قدم پر بھوک کے دُبلے پتلے مجسّمے متحرک تھے۔ ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ گویا چھڑیوں یا لکڑیوں کو پھٹے پُرانے کپڑے پہنا دئے گئے ہیں۔ ان بھوکے لوگوں کو فلک بوس عمارتوں سے دھکّے دیکر نکال دیا جاتا تھا۔ ان کے جسموں پر گھاس، پھونس، کاغذ، لکڑی اور چیتھڑوں کے پیوند کے ساتھ بھوک پیوست کی تھی "بھوک" بغیر دھوئیں کی چمنیوں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھانکتی تھی۔ "بھوک" گندے اور بدبودار گلی کوچوں سے نکل کر جہاں کے

کوڑے کرکٹ میں کھانے کا بچا کھچا تنکا مفقود تھا ادھر اُدھر بھٹکتی پھرتی تھی۔ نان بائی کی الماریوں پر موٹے حرفوں میں "بھوک" کندہ تھا۔ خراب روٹیوں کے تھوڑے سے ذخیرہ کی ہر چھوٹی سی روٹی پر، ترکاری کی ہر دُکان پر، اور فروخت ہونے والے ہر کھانے پر "بھوک" لکھا ہوا تھا۔

غرض ان تمام چیزوں سے بھوک نمایاں تھی جو مفلس لوگوں سے تعلق رکھتی تھی۔

ایک تنگ گلی، بدبو اور تعفن سے رچی ہوئی جس میں اور دوسرے اسی طرح کے تنگ اور پیچیدہ کوچے آکر مل گئے تھے وہاں پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ہوئے لوگوں کا مجمع تھا۔ یہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا وہ کسی شکاری کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ اور جس طرح ایک جنگلی جانور شکاری کے تعاقب سے تنگ آکر حملہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ بھی جان پر کھیلنے کیلئے آمادہ معلوم ہوتے ہیں۔ ناتواں اور کمزور ہونے کے باوجود ان کی آنکھوں میں انتقام کی آگ کے شعلوں کی کمی نہ تھی۔

سڑکوں کے آرپار کافی فاصلہ پر ایک بھدا سا لیمپ ایک رسّی اور چرخی سے باندھ کر لٹکایا گیا تھا۔ رات کے وقت جب لیمپ جلانے والا ان کو نیچے جھکاتا، لیمپ جلاتا اور پھر اوپر اُٹھا دیتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ دھیمی بتیوں کا ایک دھندلا سا کنج سروں پر مریضانہ انداز میں لٹکا ہوا ہے۔

وہ وقت بھی مستقبل کے بطن میں پوشیدہ تھا جب لیمپ جلانے والے کے طریقۂ کار کو ترقی دیکر اس علاقہ کے پتلے پتلے بیشمار رو کو ایک نئے تخیل کے احساس کے ساتھ انسانوں کو اوپر کھینچنے کے لئے دار و رسن میں تبدیل کیا جانے والا تھا۔

سڑک کے ایک کونے پر ایک شراب کی دُکان تھی۔ جو اس حصہ کی اور دُکانوں سے بہتر حالت میں تھی۔ دُکان کا مالک دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اس شخص کی گردن بجار کی طرح فربہ، عمر تیس سال سیاہ گھونگر والے بال، شگفتہ تاہم ناقابلِ فہم چہرہ۔ بظاہر ایک ایسا شخص تھا جس کا ایک متعین مقصد ہو اور جس کی انجام دہی سے کوئی اسے باز نہ رکھ سکے۔

جیسے ہی کہ وہ اندر آیا اسکی بیوی (Madam Defarge) (دوکاندار کی میز) (Counter) کے پیچھے ایک کونہ میں بیٹھ گئی۔ میڈم ڈیفارج ایک طاقتور عورت تھی جس کی عمر اس کے شوہر کے لگ بھگ تھی۔ اس کی آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں کہ شاذ و نادر ہی اِدھر اُدھر اُٹھتی ہیں۔ لیکن نظریں نگراں تھیں۔ لمبے ہاتھ جن میں بہت بھاری بھاری چھلّے پڑے ہوئے تھے۔ متحمل چہرہ۔ سخت خد و خال لیکن اطوار و عادات میں سکون و طمانیت۔ میڈم ڈیفارجے کے بُشرے سے ایسی سیرت کا اظہار ہوتا تھا جس نے شاذ و نادر ہی اِن معاملات میں غلطی کا ارتکاب کیا ہو جو اس کی نگرانی میں دیئے گئے ہوں۔

اس کا بُنائی کا سامان اس کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن چمٹیا سے اپنے دانت اٹھانے کے لئے اس نے سامان نیچے رکھدیا۔ وہ اپنی داہنی کہنی کو بائیں ہاتھ سے سہارا دئے ہوئے اس طرح مصروف تھی جب اس کا شوہر اندر آیا تو میڈم ڈیفارجے نے بجز کھانسنے کے کچھ نہیں کہا۔

کھانسی کے ساتھ اس نے اپنی بھویں اوپر کو اُٹھائیں گویا کہ وہ شوہر کو اشارہ کر رہی تھی کہ وہ اپنے گاہکوں میں نووارد گاہک کو دیکھ لے۔

شراب والے نے دوکان میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں یہاں تک کہ اس نے ایک عمر رسیدہ جنٹلمین اور ایک نوجوان خاتون کو ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا پایا جیسے ہی کہ وہ (دوکاندار کی میز) کے پیچھے سے گزرا، اس نے نہایت غور کے ساتھ اس بزرگ جنٹلمین کو اس خاتون سے یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "ہمیں اسی شخص سے ملنا تھا"

مسٹر ڈیفارجے نے اپنے دل میں کہا "خبیث تم اِس مقام پر کیا کرنے آئے ہو میں تم سے واقف نہیں۔"

لیکن اس نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اِن اجنبیوں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ تین آدمیوں سے گفتگو میں مشغول ہو گیا

جو (**counter**) پر کھڑے ہوئے شراب پی رہے تھے۔ ہر ایک ایک دوسرے کو (**Jacques**) کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔
یہ ایک مختصر سا لفظ تھا جس کی اہمیت صرف وہی لوگ جانتے تھے جو اس راز سے واقف تھے (**St. Antoine**) کے علاقہ میں رہنے والے مفلس اور بے چین لوگوں کا یہ پاسپورٹ تھا جو اپنے اچھے دن لانے کے لئے سازش کر رہے تھے۔

اس دوران میں تمام گاہک چلے گئے۔ اور وہ عمر رسیدہ جنٹلمین اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ اور مسٹر ڈیفارجے سے گفتگو کی پھر مسٹر ڈیفارجے وہ جنٹلمین اور نوجوان خاتون باہر چلے گئے۔ میڈم ڈیفارجے نے مستقل مزاجی سے اپنی بُنائی جاری رکھی۔

ڈیفارجے مسٹر لوری اور مس مینٹ کو ایک بدبودار صحن میں سے لیکر گزرا۔ پھر وہ ایک تاریک دروازہ میں پہنچا۔ اور وہاں سے گزر کر پلید اور شکستہ زینہ کی طرف لیگیا۔ جب وہ لوسی کو متعفن سیڑھیوں پر لیجا رہا تھا تو راستہ میں اس نے آہستہ سے کہا "اس میں حیرت انگیز تبدیلی ہوگئی ہے۔ وہ بہت بدل گیا ہے۔"

جوں جوں لوری اور اس کے ساتھی زینہ پر چڑھتے جاتے تھے مسٹر لوری اپنے دل و دماغ پر ایک قسم کا وزن محسوس کر رہا تھا۔

شراب کی دوکان کا مالک آگے چل کر رُک گیا۔ دیواریں زور سے گالی کے ساتھ دستک دی۔ وہ سیدھے بالاخانہ پر پہنچ گئے ڈیفارجے نے دروازہ کھولا اور مسٹر لوری کو حیرت زدہ دیکھتے ہوئے اس نے کہا:

اتنے عرصۂ دراز تک وہ یہاں رہا ہے کہ وہ خوفزدہ ہو جائیگا اگر دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے تو بہت سے امکانات ہیں۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے یا مر جائے یا خدا معلوم اس کو کیا کیا نقصان پہنچے۔

دروازہ اندر کی جانب کھولا گیا۔ اس نے کمرہ میں جھانک کر دیکھا اور کوئی بات کہی۔ ایک کمزور و نحیف آواز نے جواب دیا۔

بالاخانہ تنگ و تاریک تھا۔ جس میں بغیر پالش کی کھڑکی لگی ہوئی تھی۔ ایک نیچی بنچ پر ایک سُفید بالوں والا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا

اس کی پشت دروازہ کی جانب تھی۔ اور آگے جُھکا ہوا وہ جوتے بنانے میں مشغول تھا۔

زندگی کی طرف دوبارہ دعوت

(Recalled to life)

جوتے بنانے والے کی ڈاڑھی سفید تھی۔ جو مخصوص طریقہ سے ترشی ہوئی تھی۔ چہرہ میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور آنکھیں بہت روشن تھی۔ اس کی قمیص کے زرد چیتھڑے گریبان کے قریب سے پھٹے ہوئے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا جسم کس قدر بوسیدہ اور درماندہ ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ہڈیاں تک صاف نظر آتی تھیں۔ آواز کمزور اور مدھم۔ اور نگاہ بے مقصد معلوم ہوتی تھی۔

"تمہارا پیشہ جوتے بنانا نہیں ہے؟" مسٹر لوری نے کہا۔

اس کی بھونچکی نگاہیں کمرے میں چاروں طرف پڑیں اور آخر کار اس نے جواب دیا۔

"کیا میرا پیشہ جوتے بنانا نہیں ہے؟ ...... نہیں! میرا پیشہ جوتے بنانا نہیں تھا۔"

(**Bastille**) کے قیدخانہ میں ۱۸ سال کی طویل مدت کی قید تنہائی سے اس کے اعصاب اس درجہ شکستہ ہو چکے تھے کہ باوجود مسٹر لوری اور اس کی لڑکی (قیدی کی لڑکی) کی انتہائی مہربانی اور شرافت کے ان کو یہ سمجھانے میں کافی دیر لگی کہ وہ کون تھے اور کیوں اس کے پاس آئے تھے۔

"میں نے حرفہ کو خود حاصل کیا اور بہت عرصہ کے بعد بمشکل تمام اس کو سیکھا۔ اور جب سے اَب تک میں جوتے ہی بناتا رہا ہوں۔"

بعض وقت چند لمحوں کے لئے اس کی توجہ اِدھر اُدھر بَٹ جاتی تھی۔ اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اَب بھی قیدخانہ میں ہے اس کا علاج بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ اسے پیرس سے باہر ——
اُس پیرس سے باہر جس کے ساتھ ہولناک متعلقات وابستہ تھے فوراً

لیجایا جائے۔ اور آرام دہ اور نئے ماحول میں بتدریج اس کا علاج کرایا جائے۔

لوسی اس سفید ریش شخص پر ترس کھا کر کچھ از خود رفتہ سی ہو گئی مسٹر لورؔی جلدی جلدی واپسی کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے اور وہ اس بوڑھے کے پاس ٹھیری رہی۔

اس کا باپ بڑے انتشار میں مبتلا تھا لیکن وہ کھاتا تھا اور پیتا تھا ایک ایسے آدمی کی طرح جو کافی عرصہ تک اطاعت گزاری کا عادی ہو چکا ہو اور ہر اُس بات پر عمل کرتا تھا جو اُس سے کہی جاتی تھی۔

بالآخر جب روانگی کا وقت آیا تو وہ جوتے بنانے کے اوزار اور نامکمل جوتوں کو ساتھ لئے بغیر جانے پر راضی نہ ہوا میڈم ڈیفارجے جس کا بُنائی کا کام ہنوز جاری تھا ان چیزوں کو لانے کی غرض سے زینہ پر گئی۔ وہ جلدی سے ان کو واپس لے آئی اور اس کے سپرد کر دیا اور اس کے بعد فوراً ہی دروازہ سے لگ کر کھڑی ہو گئی..... وہ بُن رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی چیز کو نہیں دیکھ رہی۔

ڈیفارجے کوچ بکس پر بیٹھ گیا اور یہ الفاظ کہے "سرحد کی طرف"

کوچوان نے اپنا ہنٹر چٹخایا اور وہ لیمپوں کی مدھم روشنی میں تیزی سے نکل گئے۔

تمام رات کے طویل سفر میں مسٹر جاروس لورؔی کے کانوں میں وہی قدیم سوال گونجتا رہا۔

"مجھے اُمید ہے کہ تم دوبارہ زندہ ہونے کی آرزو رکھتے ہو؟"

اور وہی پُرانا جواب۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

پانچ سال بعد

عدالت کے تاریک راستوں میں ایک ۲۵ سال کے نوجوان کے آس پاس سے مبارکباد کی صدائیں اُٹھ رہی تھیں۔ ایک فرانسیسی شخص چارلس ڈارنے نے اب انگلستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس پر فرانس اور انگلستان کے مابین جاسوسی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور وہ فاتحانہ طریقہ پر بری کر دیا گیا تھا۔

اس کے اطراف و جوانب میں ڈاکٹر مینٹ، اس کی بیٹی لوسی مینٹ مسٹر لوری، مشیر قانون اور وکیل صفائی مسٹر اسٹرائور سزائے موت سے بچنے پر اسے مبارکباد دے رہے تھے۔

جس روشنی میں یہ لوگ کھڑے ہوئے تھے اس سے بھی کہیں زیادہ روشنی اگر ہوتی تب بھی یہ پہچاننا مشکل ہوتا کہ ڈاکٹر مینٹ جس کے چہرہ سے ذہانت ٹپک رہی تھی اور جس کی وضع قطع سے بلندی کا اظہار ہوتا تھا یہی شخص ہے جو پیرس کے بدبودار گوشہ میں ایک موچی کا کام کرتا تھا۔

یہ تو ممکن نہ تھا کہ ڈاکٹر مینٹ اپنی طویل اسیری کے جملہ آثار کو فراموش کر دیتا۔ تاہم پُرسکون اور خاموش انگریزی زندگی اور اس کی لڑکی کی پُرخلوص اور گہری نگہداشت نے اس کو ایک نیا آدمی بنا دیا تھا۔

لوسی ایک ایسا سنہرا رشتہ تھی جس نے اُسے اس ماضی سے منسلک کر دیا تھا جو اس کے مصائب سے پہلے گزر چکا تھا۔ نیز ایسے حال سے متحد کر دیا جو اس کے آلام کے بعد اسے نصیب ہوا۔

پانچ سال قبل جب وہ فرانس سے انگلستان کی طرف سفر کر رہے تھے، لوسی اور اس کے باپ کی ملاقات چارلس ڈارنے سے ہوئی۔ یہ نوجوان شخص عیار، سُرخ فام مسٹر اسٹرائور کا شکریہ ادا کرنے میں مشغول تھا جس نے اس کے مقدمہ کو بڑی خوبی سے انجام دیا تھا۔ اس کے بعد چارلس ڈارنے اور یہ دونوں باپ بیٹی ایک گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ مسٹر اسٹرائر لباس تبدیل کرنے والے کمرہ میں چلا گیا۔ وہاں اس کا ایک ہم پیشہ وکیل سڈنی کارٹن موجود تھا۔ سڈنی کارٹن چارلس ڈارنے کی طرح ایک اور نوجوان شخص تھا۔ حقیقتاً ان دونوں میں اگرچہ کوئی رشتہ داری نہ تھی، تاہم ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ تھے کہ اگر ان کے لباس اور اخلاق و عادات میں اختلاف نہ ہوتا تو ان میں امتیاز کرنا دشوار تھا۔

ڈارنے صاف اور سادہ لباس میں ملبوس تھا

اور اس کے لمبے بال گردن پر بندھے رہتے تھے لیکن سڈنے
کارٹن ہمیشہ میلا کچیلا رہتا تھا۔ اور اس کے بال بے ترتیبی کے ساتھ
چہرے پر بکھرے رہتے تھے۔

نوجوان اور کسی زمانہ میں ترقی پذیر کارٹن کی زندگی کی کہانی
ایک المناک داستان تھی۔ وہ ایک کاہل ترین آدمی تھا اور وہ شراب
جو اس کے گلے سے اُتر چکی تھی اگر اس کو ایک جگہ جمع کیا جا سکتا تو
ایک جہاز کو تیرانے کیلئے کافی تھی۔ ہر شخص کی زبان پہ تھا کہ " یہ
بیکار آدمی ہے "۔ کیونکہ جب سب لوگ کام کرتے تو سڈنے کارٹن
سویا کرتا تھا۔ اور جب سب لوگ سو جاتے تو وہ شراب نوشی
کیا کرتا تھا۔

سڈنے کارٹن اسٹرائور کا بڑا گہرا دوست تھا۔ اس لئے
مؤخر الذکر کا یہ انکشاف تھا کہ کسی مشکل مقدمہ کی تیاری کرنے میں
اگر کوئی کاہل شخص چاہے تو اس کی کوئی برابری نہیں کرسکتا یہی وجہ
تھی کہ اسٹرائور اس کو شراب میں اچھی طرح مشغول رکھ کر اپنے مشکل
کاموں میں اس کی مدد لینے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس ذریعہ سے کارٹن
———— تھوڑا بہت سامانِ زندگی حاصل کرتا تھا۔ تاہم اس کے
جبلی محاسن اس کی بُرائیوں کے نیچے سب کے سب دب نہیں گئے تھے۔
نہایت خاموشی اور مایوسی کے ساتھ وہ ————
لوسی مینٹ سے محبت کرتا تھا وہ ایک ایسے درخشاں خواب کی مانند
تھی جو اسے اس کے اسفل سے اُبھار کر بعض اوقات اعلیٰ تصوّرات کی
طرف لے آتا تھا۔

ڈاکٹر مینٹ کی سادہ رہائش گاہ ایک پُرسکون سڑک کے
ایک گوشہ میں واقع تھی جو   سے کچھ زیادہ فاصلہ پہ
نہ تھی۔ یہاں وہ اور اس کی لڑکی مس پروس کی سخت محافظت میں رہتے
تھے۔ جو قدیم انا (نرس) تھی۔ یہاں مسٹر لوری ہر اتوار کو تیسرے پہر کے
وقت آیا کرتے۔ اور چارلس ڈارنے بھی اکثر آتا تھا۔ یہانتک کہ سڈنی
کارٹن بھی جب وہ ہوش و حواس میں ہوتا وقتاً فوقتاً ادھر آنکلتا تھا۔

مقدمہ کے چار ماہ بعد گرمی کی ایک شام کو کارٹن
میں تھا۔ یکایک طوفان آنے کی وجہ سے وہ سب باغیچہ سے اندر
کمروں میں چلے گئے۔ گلی کوچوں میں بڑی چلت پھرت ہو رہی تھی۔
لوگ طوفان کی تندی سے بچنے کے لئے تیزی کے ساتھ پناہ تلاش
کر رہے تھے۔ بازگشت کی صداؤں کے لئے یہ ایک عجیب وغریب گوشہ
تھا۔ آنے جانے والے قدموں کی صدائے بازگشت یہاں گونجتی تھی
لیکن وہاں آنے جانے والا کوئی بھی نہ تھا۔

" میں اکثر اوقات شام کے وقت یہاں تنہا بیٹھتی ہوں "۔
لوسی نے دھیمی آواز میں کہا۔ " اور بازگشت کی صداؤں کو سنتی ہوں
میں یہ خیال کرتی ہوں کہ پاؤں کی یہ تمام آہٹیں رفتہ رفتہ ہماری
زندگی میں داخل ہو گئی ہیں "۔

" خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مس مینٹ! ایک نہ ایک دن کوئی عظیم
گروہ ہماری زندگی میں داخل ہونے والا ہے۔ ایک عظیم انسانی جماعت
ہمارے اوپر نازل ہونے والی ہے اور مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ
میں اس مجمع کو بجلی کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں "۔

اعلیٰ حضرت مارکوئس ان بڑے نوابوں میں سے تھا جو دربار
میں زبردست اقتدار کے مالک تھے۔ وہ خود پیرس کے عظیم الشان
ہوٹل میں اپنا پندرہ روزہ دربار منعقد کرتا تھا۔

مارکوئس اپنے اندرونی کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کمرہ اس کے
ان پجاریوں کے لئے جو باہر کے کمروں میں بیٹھے تھے حرم مقدس کی
حیثیت رکھتا تھا۔

بہت جلد دربار ختم ہو گیا۔ اور تمام اجتماع میں سے صرف ایک
شخص وہاں رہ گیا تھا وہ آہستہ آہستہ باہر آیا اور نہایت خاموشی کے
ساتھ زینہ سے نیچے اُترا۔

اعلیٰ حضرت مارکوئس ساٹھ سالہ آدمی تھا۔ خوش پوشاک، تُند
مزاج۔ اور ایک نفیس نقاب کا سا چہرہ لئے ہوئے۔

وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا وہ اس بات کی زحمت گوارا
نہیں کرتا تھا کہ اس کے گھوڑوں کے سامنے سے لوگ ہٹ جائیں اسکے
بعد گاڑی کو آگے بڑھائے۔ اور بسا اوقات لوگ بال بال اسکی گاڑی
کے نیچے آنے سے بال بال ہی بچ جاتے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے
اس طرح گاڑی چلائی گویا کہ وہ کسی دشمن پر حملہ کر رہے تھے۔ اور جو لوگ

سڑکوں پر چل پھر رہے تھے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ پہیوں کی تیز گڑگڑاہٹ اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کیساتھ مارکوئس کی گاڑی گلیوں سے ہوکر گزری۔ جس بیرحمانہ لاپروائی کے ساتھ گاڑی چلائی جارہی تھی اس کا موجودہ زمانہ میں اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ موڑوں پر اس کی تیز رفتاری قائم تھی۔ عورتیں اس کے سامنے چیختیں، مرد ایک دوسرے کو پکڑتے اور بچّوں کو اس کے راستے سے ہٹانے کے لئے گھسیٹتے تھے۔ آخرکار ایک فوّارے کے نزدیک گلی کے ایک موڑ پر تیزی سے گھومتے ہوئے اس کا ایک پہیّہ کسی چھوٹی سی مریض چیز سے اٹک کر رُکا۔ مجمع کی طرف سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں گھوڑے الف ہوکر رک گئے۔

مارکوئس نے اطمینان سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "کیا خرابی ہوگئی؟"

دراز قد آدمی نے جو نائٹ کیپ پہنے ہوئے تھا گھوڑوں کے پاؤں میں سے ایک بنڈل کو اٹھایا۔ اور فوّارہ کے دامن میں کھرنجہ پر رکھدیا۔ پھر وہ کیچڑ اور نمی میں اس بنڈل پر جھکا اور خونخوار حیوان کی طرح بڑبڑانے لگا۔

"اعلیٰ حضرت مارکوئس! معاف کیجئے۔ یہ ایک بچّہ ہے" ایک پھٹے حال شخص نے کہا۔

دراز قد آدمی یکایک زمین سے اُٹھا اور دوڑتا ہوا گاڑی تک آیا "مارڈالا" اس آدمی نے والہانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے کہا "مرگیا"

"تم میں سے کوئی نہ کوئی ہمیشہ راستہ میں ہوتا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ تم نے میرے گھوڑوں کو کیا نقصان پہنچایا ہے۔ لو یہ اس شخص کو دیدو" مارکوئس نے سکون کے ساتھ کہا۔

اس نے ایک سونے کا سکّہ باہر پھینکا۔ ایک گہرے رنگ کے پُراسرار شخص نے اٹھالیا۔ یہ شخص ڈیفارجے مے فروش تھا سکّہ کو اٹھاکر بڑی جرأت کیساتھ گاڑی کے اندر پھینک مارا۔

"کتّے کہیں کے" مارکوئس نے کہا اور اپنی گاڑی چلادی اور دیہاتی رقبہ کے اندرونی حصّہ میں میلوں تک لئے چلاگیا۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ گاڑی کے پیچھے تمام راستے ایک ایسا شخص جس کی آنکھیں وحشت ناک تھیں زنجیر کا سہارا لئے ہوئے لٹکا ہوا چلا جارہا تھا — کس کام کے لئے؟ ...... انتقام کی خاطر۔

جب مارکوئس گھر پہنچا تو اندھیرا ہوچکا تھا۔

اعلیٰ حضرت مارکوئس کا شاطو (باغ) ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے سامنے ایک لمبا پتھریلا صحن تھا اور بڑے دروازہ کے بالمقابل دو سنگین زینے تھے جو ایک پتھریلے چبوترے پر آکر ملتے تھے یہ تمام عمارت پتھر کی بنی ہوئی تھی۔ بھاری سنگین جنگلے، سنگین بڑے بڑے گلدان جن میں ترشے ہوئے پتھر کے پھول، آدمیوں کے سنگین چہرے اور شیروں کے سنگین سر ہر سمت دکھائی دیتے تھے۔

شاطو کا عظیم الشان دروازہ اس کے مالک کی آمد پر کھلا۔

"مسٹر چارلس، جن کا میں انتظار کررہا تھا انگلستان سے آگئے؟"

"حضور! ابھی تک نہیں۔"

نو وارد کچھ دیر بعد آیا۔ یہ مارکوئس کا بھتیجا تھا اور انگلستان میں چارلس ڈارنے کے نام سے مشہور تھا۔

مارکوئس نے اس کا درباری انداز سے استقبال کیا۔ لیکن انھوں نے مصافحہ نہیں کیا۔ یہ دونوں اتنے مختلف تھے کہ کبھی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہوئے۔

چچا — ظالم اور سخت مزاج تھا اور اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ دُنیا اور اس کی تمام مسرّتیں صرف سرمایہ داروں کیلئے ہیں۔

بھتیجے نے اپنی مرحومہ ماں کی آخری وصیّت کو اپنے دل میں گہری جگہ دی تھی جس کا منشا یہ تھا کہ جب وہ برسراقتدار آئے تو عوام النّاس کو خوفناک مظالم سے نجات مل جانی چاہئے۔

آج وہ مارکوئس سے یہ کہنے آیا تھا کہ وہ جائداد جو اسے ترکہ میں آئندہ ملنے والی تھی اس سے وہ دست کش ہوجائے گا۔ اور عوام کی بہبود اور فلاح میں نہ کہ خود اپنے نفع کی خاطر اس کو استعمال میں لائے گا۔

"اور آپ کا کیا ہوگا؟" چچا نے کہا "معاف کیجئے۔ کیا آپ اپنے اس جدید فلسفے کے ماتحت عمدہ اور نفیس زندگی بسر کرنے کا

ارادہ رکھتے ہیں؟"

"زندگی بسر کرنے کے لئے وہی کرنا چاہئے جو میرے دوسرے ہموطنوں کو حتیٰ کہ اُن لوگوں کو جن کی پشت پر شرفائے ملک ہیں کرنا ہوگا۔ یعنی "کام"

"مثال کے طور پر انگلستان میں"

"جی ہاں! خاندانی عزت و حرمت اس ملک میں میرے وجود سے کم از کم محفوظ ہے۔ خاندانی نام کو میری وجہ سے دوسرے ملک میں کوئی بٹہ نہیں لگ سکتا۔ اس لئے کہ دوسرے ممالک میں میں اس نام کو استعمال نہیں کرتا۔"

"میں بیس سال زندہ رہنے کی امید کرتا ہوں" چارلس کو شب بخیر کہتے ہوئے مارکوئس نے طنزاً کہا۔

لیکن اس وقت اس کو اس قابل رحم شخص کا کوئی علم نہ تھا جس نے اس کی گاڑی کے نیچے سفر کیا تھا۔

جب صبح ہوئی تو شاطو (باغ) کے سنگین چہروں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان میں ایک اور سنگین چہرہ کا اضافہ ہوگیا تھا۔ — یہ سنگین چہرہ اعلیٰ حضرت مارکوئس کے تکیہ پر الٹا پڑا ہوا تھا۔ اس سنگین وجود کے قلب میں اُترا ہوا' اور اس سے وابستہ ایک چاقو تھا۔ چاقو کے دستے پر کاغذ کا ایک پرزہ تھا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

"اس کو جلد اس کی قبر میں اُتار دو —— منجانب جیکیں"۔

بُنائی

ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ چارلس ڈارنے انگلستان میں فرانسیسی زبان کے ایک اعلیٰ اُستاد کی حیثیت سے مشہور ہوگیا تھا۔ اور مزید یہ کہ چارلس ڈارنے دام محبت میں گرفتار تھا۔ وہ اُسی ساعت سے لوسی مینٹ سے محبت کرنے لگا تھا جبکہ اس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ سڈنی کارٹن کو بھی اس سے بہت پریم تھا۔ وہ دوسری جگہ کتنا بھی ہر دلعزیز ہو لیکن بلاشبہ ڈاکٹر مینٹ کے گھر پر اس کی ذہانت کبھی مقبول نہ ہوئی۔ وہ اس قدر تصوراتی' اتنا سُست اور بیکار رکھا کہ موسم گرما کی ایک شام کو جب وہ لوسی کے ساتھ تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ لوسی نے اس سے پوچھا:۔

"کیا یہ قابل رحم نہیں ہے کہ اس سے بہتر زندگی نہ گزاری جا سکے؟"

"خدا جانتا ہے کہ یہ قابل شرم ہے۔"

"تب اس کو بدل کیوں نہیں دیتے؟"

اس نے دوبارہ مشفقانہ نظریں اس پر ڈالیں۔ سڈنی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لوسی اسے دیکھ کر حیرت زدہ اور مغموم ہوگئی۔ اس کی آواز میں بھی آنسو تھے جیسا کہ اس کے جواب سے ظاہر ہوتا تھا:۔

"تبدیلی کا وقت گزر گیا۔ میں اپنی موجودہ حالت سے بہتر اب کبھی نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی اب مجھے اور پستی اور خرابی کی طرف لے جائے گی۔"

اس نے رنجیدگی کے ساتھ یہ اور اضافہ کیا:۔

"وقت جلد آنے والا ہے جب تم نئے رشتوں میں منسلک ہو جاؤ گی۔ آہ! مس مینٹ! جب وہ وقت آ پہنچے تو کبھی کبھی یہ سوچ لیا کرنا کہ دنیا میں ایک وجود ایسا ہے جو تمہارے علاوہ اس زندگی کو بچانے کے لئے —— اس زندگی کو بچانے کیلئے جس سے تم پریم رکھتی ہو اپنی زندگی بھینٹ چڑھانے کیلئے تیار ہوگا۔"

مسٹر ڈیفارجے کی شراب کی دوکان میں آج معمول سے پہلے مے نوشی شروع ہو گئی تھی۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا جب دو گرد آلود اشخاص اندر داخل ہوئے۔ ایک مسٹر ڈیفارجے۔ دوسرا سڑکوں کا مرمت کرنے والا تھا۔ اس تنگ و تاریک مقام پر اس سے قبل ایک سفید بالوں والا ضعیف آدمی جوتے بنایا کرتا تھا۔

سڑک کوٹنے والے نے ڈیفارجے اور اس کے دوستوں جیکیں نمبر ایک۔ جیکیں نمبر دو۔ اور جیکیں نمبر تین سے وہ ہیبتناک کہانی بیان کی کہ کس طرح مارکوئس کا قاتل گرفتار ہوا۔ اور اس کو انتہائی ظلم و تعدی کے ساتھ سزائے موت دی گئی۔ جب اس نے اپنا قصہ ختم کیا اور چلا گیا تو چاروں جیکیں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

(باقی آئندہ)

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۴۰ء

کسوٹی

(چند نئے رسالے، کتابیں اور اخبارات)

تصویر دہلی
(باتصویر)

یہ ایک نیا ہفتہ وار ہے جسکے اڈیٹر ہمایوں صاحب بی۔ اے ہیں اور جسے ایم۔ اے حامد صاحب نے دہلی سے شائع کیا ہے۔ سرورق پر تین ستاروں میں تین عنوان، ادب، فلم اور آرٹ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور یہ خود ہی اپنے اصول کا اعلان ہیں۔

اس وقت تک تصویر کے دو نمبر دیکھنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مالی آسانیوں کی "تصویر کدہ" میں کمی نہیں مگر مضامین کی طرف سے حامد صاحب کی بے نیازی حیرتناک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بغیر اقتصادی پُشت پناہی کے موجودہ سخت زمانے میں کسی اخبار کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جبتک کسی ہفتہ وار میں علمی و ادبی عناصر اور سیاسی اصابت رائے کا وافر خزانہ موجود نہیں ہوگا محض اقتصادی پشت پناہی اخبار کی کامیابی کی ضامن نہیں ہوسکتی۔

تصویر کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ وہ دہلی سے شائع ہوتا ہے جہاں ریاست دین و دنیا اور تیج و یکلی جاری ہوکر اپنا ادبی، سیاسی اور علمی اعتبار قائم کرچکے ہیں۔ یہ بالکل کُھلی ہوئی حقیقت ہے اور ادارۂ تصویر کو اجرائے تصویر سے قبل ہی اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر قدم اُٹھانا چاہئے تھا۔ مقابلہ کے لئے لازم تھا کہ ادارتی استحکام کے ساتھ ملک کے بہترین ادیبوں اور شعراء کا ایک حلقہ بنالیا جاتا۔ تاکہ تصویر متاخرین کے معیار سے ہمدوش ہوکر شائع ہوتا۔ خاصکر اس جنگ کے زمانے میں جبکہ حالات نے دو تین محاذوں پر مقابلہ کو ناگزیر کردیا ہے۔

تصویر اپنے ظاہری جمال کے لحاظ سے سچ مچ تصویر ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت یعنی اپنے تمام گیٹ اَپ کے ساتھ وہ واقعی دلکش ہے لیکن اس خارجی حُسن کے ساتھ اسکے داخلی جمال میں اضافوں کی گنجائش ہی نہیں شدید ضرورت ہے۔ اور اگر اس ضرورت کے ساتھ اس کے کارکنوں نے فوری توجہ نہ کی تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ معاصرین میں اپنی ادبی اور آرٹسٹک خصوصیتوں کو کیونکر نمایاں کرسکے گا۔

تصویر میں وافر حصّہ فلم انڈسٹری کے متعلق ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا خاص میدان یہی تجویز کیا ہے کوئی ہرج نہیں، ہمیں تو حسرت ہے کہ ملک میں کوئی ایسا "آئیڈل ہفتہ وار" جاری ہوکر قائم ہوجائے جو فلم اور اسکے متعلقات کے بارے میں واقعی ایک اعلیٰ ترین آرگن کہا جاسکے۔

فلمی دُنیا میں تکمیل کی بڑی گنجائش ہے۔ اور علمی طور پر اس دُنیا کی افادیت دوسری زبانوں سے بہت سے بہتر لٹریچر پیش کیا جاسکتا ہے اس میں جان بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہاں کی بے جان فلم انڈسٹری، دبے ہوئے فن کاروں اور مفلوج فلمی ترقی میں روح بھی پیدا کرسکتا ہے۔ میدان سامنے ہے۔ تصویر اپنا فرض ادا کرے تصویر اگر چاہے تو وہ ایک اور بڑا فرض بھی ادا کرسکتا ہے، وہ اُس خلیج کا پاٹنا ہے جو ادبی دُنیا و فلمی دُنیا کے مابین حائل ہے۔

اس خلیج کے حائل ہوجانے نے فلمی دُنیا میں بے رنگی سی پیدا

کررکھی ہے یعنی موجودہ تصویر میں ایک ایسا سنائی لٹریچر ہیں جسے ہمارے دیسی ادب سے کوئی خاص تعلق نہیں، عجیب قسم کی شاعری، عجیب قسم کی نثر، عجیب قسم کے گیت جنہیں اُردو شاعری سے تعلق نہ ہندی گیتوں سے۔ نہ غزل نہ نظم، نہ افسانہ، نہ ڈرامہ، نہ ٹھمری ——

اگر تصویر چاہے تو فلمی دُنیا میں ادبی موج دوڑ سکتی ہے مگر میں دیکھتا چلا آرہا ہوں کہ جس قدر اخبار شائع ہوتے ہیں، ان کا مقصد سوائے جلبِ منفعت کے اور کچھ نہیں۔ یہ کوڑھ اخبار نویسوں سے متعدی ہوکر رہ گیا ہے۔

"زر اندوزی" تائید اور تردید کا مقصد ہے۔ تائید اور تردید زر اندوزی کے لئے کی جاتی ہے۔ ترقی ہو تو کیونکر۔ روپیہ کمانا فلم اسٹوریوں کی اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی ہے، ایک مجرمانہ دباؤ ڈال کر جلبِ منفعت آرٹ کی بدبختی بن گئی ہے۔ اصلاح ہو تو کیونکر!؟

اخبار نویسوں کے اعمال و افعال نے کمپنیوں کے تصویر میں اہلِ قلم کو اس درجہ گرا دیا ہے کہ کوئی بھلا آدمی ان سے ربط پیدا کرنے کے لئے قدم نہیں اُٹھا سکتا۔

تصویر ایک نیا ستارہ ہے، وہ اپنی ضو کی پاکیزگی سے ایک نئے فلمی تنقیدی اخلاق کا آغاز کرسکتا ہے اور گو مشکل سہی لیکن خود فلم کمپنیوں کے مالکوں کی قلبِ ماہیت کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔

تصویر میں تعلیم و تربیت اور ترقی کی اس لئے گنجائش ہے کہ اس نے ابھی آنکھ کھولی ہے۔ بے حیا لڑکے کی طرح اُن اخبار نویسوں اور اخباروں کی اصلاح اب ناممکن ہے جو جرائم پیشگی میں طاق ہوچکے ہیں۔ لیکن ابھی تصویر کی معصومیت دوشیزہ ہے جو ایک سانچے میں ڈھالی جاسکتی ہے۔ بہر حال تصویر کو چاہئے کہ وہ اپنی سعادتِ صحافت کو قائم کرے۔

"ان نمبروں میں بھی کافی صلاحیت اور اپج موجود ہے ذرا سی توجہ اور نظام کے بعد تصویر کو اونچا کیا جاسکتا ہے موجودہ صورت میں بھی تصویر پڑھنے دیکھنے اور خریدنے کے قابل ہے، میں ایشیا کے ناظرین سے اس کی خریداری کی پُرزور سفارش کرنے میں اپنی روح کو بالکل مطمئن پاتا ہوں۔

میں دیکھتا ہوں کہ جدّت و تازگی کی کمی سہی مگر یہ دونوں نمبر قابلیت اور رنگارنگی سے مرتب کئے گئے ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ اسکے بعد جو نمبر شائع ہوئے ہونگے، وہ ان نمبروں سے بہتر ہونگے۔

سالانہ قیمت ۶؎ فی پرچہ ۲ر عقب جامع مسجد دہلی

اضطراب لکھنؤ

ماہنامہ

اڈیٹر: نسیم سندیلوی بی-اے-
مسعود اختر جمال-
سائز ۲۰x۲۶/۸ سالانہ قیمت عہ "معاونین" سے

نگار اور نیا ادب کی موجودگی میں لکھنؤ سے اضطراب کی اشاعت نہایت حیرتناک ہے۔ اضطراب کے شائع کرنے والوں کے سامنے یہ حقیقت رہنی چاہئے تھی کہ نگار اور نیا ادب اپنا مستقل اور ترقی یافتہ معیار رکھتے ہیں اور اب جو رسالہ لکھنؤ سے شائع ہو وہ کم از کم ان دونوں رسالوں کے معیار سے کم معیار پہ شائع نہ ہو۔

اضطراب کے اوراق ہمیں یہ بتانے سے قاصر رہے ہیں کہ اسکی اشاعت کا خاص مقصد کیا ہے۔ ایسی حالت میں ہر شخص یہی سمجھ سکتا ہے کہ اُردو زبان و ادب اور سماج کی جنہ جنسی و اخلاقی ادبی و سیاسی ضرورتوں کی کفالت اس کا مقصد ہوسکتا ہے۔

یہ مقصد گویا ایک اجتماعی مقصد ہے، اور ایسے دو رسالوں کی موجودگی میں جو اس مقصد کو خوبصورتی اور تکمیل کے ساتھ پورا کر رہے ہیں کسی ذہین فرد یا جماعت کے خیال میں جو فرائض اور ذمہ داریوں کی اہمیت سے واقف ہے۔ یہ اپج پیدا نہیں ہونی چاہئے۔ خاص کر ایسی حالت میں کہ نگار کو چھوڑ کر "نیا ادب" کو حکومت کی طرف سے کئی کچوکے دئے جاچکے ہیں اور وہ گوناگوں مشکلوں میں مبتلا رہا ہے۔

وہ نوجوان جو اضطراب کا علم لے کر اُٹھے ہیں ان کو نیا ادب کے لئے بے چین ہونا چاہئے تھا۔ اور جس قدر روپیہ وہ اس وقت تک اضطراب کی اشاعت میں صرف کرچکے ہیں، اسے نیا ادب کے استحکام میں لگانا چاہئے تھا۔ اگر اہلِ اضطراب کے پیشِ نظر زبان و ادب کی حفاظت و ترقی کا اجتماعی مقصد ہے تو اس کی تکمیل ایک مرکز پر مجتمع ہوکر بہ آسانی ہوسکتی تھی۔

نیا ادب بھی تازہ دم نوجوانوں کا آرگن ہے، اور وہ ہر اس نوجوان

فرد یا جماعت کو اپنے اندر ضم کر سکتا ہے، جو زبان و ادب کی خاطر کام کرنے کے لئے بے چین ہوں۔ صحیح الخیال کام کرنے والوں کے نزدیک انفرادی خیال کے بجائے ایک اجتماعی تصور ہونا چاہئے۔

لیکن بہر حال ایسا نہیں ہوا اور اضطراب جداگانہ ایک رسالہ ہے جو جگر صاحب مراد آبادی کے قصیدۂ منثور سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک "انعامی تنقید" ہے۔ جو انتقاد کی مبادیات پر بھی صحیح نہیں اُترتی؛ البتہ یہ سارا مضمون ایک "نغمۂ عقیدت" ضرور ہے۔ شروع میں سوانح حیات اور حضرت جگر کی زندگی تک کو کھول کر بیان نہیں کیا گیا۔ یہن پوری کا ذکر ہوا اور "بامِ طور" جیسی بلند جگہ کا ذکر نہو۔ تنقید نگار کی کیسی کھلی ہوئی ناواقفیت ہے۔!؟

اصل میں "شعر اور تنقید" ایک نہایت اہم فریضہ ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جبتک کہ نقاد، شاعر کی زندگی میں داخل نہو کر ـــــ نہایت گہرائی کے ساتھ اس کی زندگی کے ایک ایک پہلو کا مشاہدہ نہ کرے۔

معلوم ہوتا ہے صغیر احمد صاحب نے جگر صاحب کو صرف مشاعروں میں دیکھا ہے یا محض اُس وقت جب وہ اپنے مدّاحوں کے گروپ میں عشقیہ شاعر ہوتے ہوئے شاعری کی فلسفیانہ تعبیرات کرنے کی کوشش فرمایا کرتے ہیں۔

اس "انعامی تنقید" میں قدم قدم پر ٹھوکریں ہیں اور ایک جگہ منطقی ربط نہیں، یہی نہیں؛ دعاوی ہیں اور دلائل غائب۔ ایک جگہ مضمون نگار لکھتے ہیں :۔

"ہر موزوں طبع اس وقت تک شاعر کہے جانے کا مستحق نہیں جب تک وہ خود اپنے شعر کی تفسیر نہ بن جائے اس معیار پر جب جگر کو دیکھتے ہیں تو ان کی شاعرانہ عظمت مسلّم ہو جاتی ہے کیونکہ ان کا ہر شعر خود ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔"

یہ لکھ کر مقالہ نگار نے نہ جگر صاحب کی زندگی کی خصوصیات بتائیں اور نہ ان کے اشعار میں وہ زندگی بتائی جس کو ہم ان کی روحانی یا مادّی حیات کا پہلو سمجھ سکتے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"ایجاد و تخلیق" جگر کی دوسری خصوصیت ان کا تخلیقی آرٹ ہے۔"

حضرت جگر میرے دوست ہیں، ان کے کلام سے مجھے محبت ہے اور باوجود چند اصولی اختلافات کے میں ان کو پسند کرتا ہوں۔ لیکن اس وقت جگر صاحب کو محفوظ کر کے واقعہ یہ ہے کہ صدیوں سے ہر غزل گو کی دُنیا چند مخصوص و محدود عنوان اور موضوعات تک محدود ہے لیکن اس پر بھی کوئی غزل گو اتنی جدت نہ کر سکا کہ غزل میں ضمائر ہی کو حقیقی بنا دیتا؛ تو جن لوگوں کی تقلید اور لکیر کے فقیر ہونے کی یہ حالت ہو وہ ایجاد و تخلیق کیا کر سکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اُردو غزل میں جس قدر "تخلیق و ایجاد" ممکن تھی وہ میر و مومن و غالب تک ہو لی اور اس زمانے کا کوئی غزل گو اس حد تک بھی نہیں آسکا جو مومن و غالب کا مرکزِ آغاز ہے۔

البتہ اُردو زبان کے جدید نظم گو شعراء نے اُردو شاعری میں ایجاد و تخلیق کا فرض ادا کیا اور ان کی شاعری کو تخلیقی ادب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اقبال و جوش اور دوسرے مخصوص نظم نگار شعراء نے زندگی کے جن عنوانات خارجی اور داخلی کیفیات کے متعلق جس قدر تخلیقی ادب پیدا کیا وہ ایسی متاع ضرور ہے جس کی نظیر قدیم شاعری کے خزانوں میں نہیں ملتی۔

ایک جگہ "فاضل انعامی مقالہ نگار" تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"متقدمین کے کلام میں طرزِ ادا اور جدت بیان کے ساتھ ساتھ "جوش و ولولہ" بہت کم ہے جگر نے اُردو کے قالب میں (اُردو شاعری کے قالب میں نہیں) جوش و سرمستی کی نئی روح پھونک دی ہے۔"

کہنے کو تو بہت جی چاہتا ہے مگر معاصرین ضرورت سے زیادہ نازک احساس واقع ہوئے ہیں، انعامی مقالہ نگار سے دو دو باتیں کرنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں، بیچارے جگر صاحب بیچ میں آئے جاتے ہیں۔

اور یہاں مقصد یہ نہیں ہے کہ جگر صاحب پر براہِ راست

انعامی مقالہ نگار کی طرح میں بھی ظلم ڈھاؤں بلکہ مقصد یہ ہے کہ انعامی مقالہ نگار کو سمجھاؤں کہ تنقید اس قدر آسان کام نہیں ہے جس قدر کہ انہوں نے سمجھ رکھا ہے۔

جگر صاحب کا موازنہ متقدمین کے ساتھ کرکے انہوں نے ایک ایسا دعویٰ کر دیا جس کو وہ ثابت نہیں کر سکتے۔

میر کے یہاں باوجود قنوطی ہونے کے جوش و ولولہ کی کمی نہیں اور غالب کی تو یہ ایک خصوصیت ہے جس شاعر کے کلام میں جوش و ولولہ نہ ہوگا آخر وہ شاعر کیا ہے۔ جذبات کو ولولہ کے ساتھ بیان کرنے ہی کا نام شاعری ہے، اور موجودہ عہد میں یہ جوہر سب سے زیادہ جوش کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ جگر صاحب کے یہاں یہ جوہر بھی انفعالیت میں پایا جاتا ہے مگر جوش کی شاعری میں ولولہ کی کافی مقدار گھلی ہوئی ہے۔

جوش ہی نہیں، اقبال کے کلام کی جان جوش و ولولہ ہی ہے

چند چوٹی کے اشعار بطور مثال سُنئے ؎

جہاں ہر کبوتر ہے قانع قفس میں ۔۔۔ وہاں دولتِ بام و در بیچتا ہوں
جہاں برق و شبنم سے وابستگی ہے ۔۔۔ وہاں ذوقِ برق و شرر بیچتا ہوں
جہاں اُنس ہے تنگ دامانیوں سے ۔۔۔ وہاں وسعتِ بحر و بر بیچتا ہوں

جلوہ گاہِ ناز میں جس وقت رکھتا ہوں قدم ۔۔۔ اس کرہ کو حلقۂ بیرونِ در پاتا ہوں میں
دیکھتا ہوں جس قدر گہری نظر سے بار بار ۔۔۔ حسن کو پہلے سے کچھ پاکیزہ تر پاتا ہوں میں
دوڑتا ہے نبضِ خس میں برقِ سوزاں کا لہو ۔۔۔ سینۂ شبنم میں طوفانِ شرر پاتا ہوں میں

یا اس شعر کی تخلیقی اور ولولہ انگیزی کہ ؎

اشتیاقِ اوج میں ہیں نا تراشیدہ صنم ۔۔۔ پتھروں میں جنبشِ صد بال و پر پاتا ہوں میں
راہِ حق ہی میں نہیں ہیں حسن کے نقشِ قدم ۔۔۔ گمرہی کو بھی کسی کی رہگذر پاتا ہوں میں

"بارگاہِ شعر" میں کہتا ہے ؎

چومی ہے نخوتوں نے یہ خاکِ فتادگی ۔۔۔ ڈالی ہے رفعتوں نے فلک کی سپر یہاں
ٹوٹا ہے آکے قلبِ تہِ حسنِ ازل کی ضرب ۔۔۔ آئینہ توڑ دیتا ہے آئینہ گر یہاں
ہوتے ہیں نورِ صبح سے تعمیر سقف و بام ۔۔۔ بنتے ہیں رنگِ شام سے دیوار و در یہاں
ہر ذرۂ حقیر بصد ناز و دلبری ۔۔۔ رکھتا ہے آفتاب کے زانو پہ سر یہاں

مجھے پڑے ہیں زمانے کے ہاتھ سے ہر چند ۔۔۔ مگر یہ سمیر برق و شرار ہیں ہم لوگ
نگاہ روبرو اے روحِ نعمتِ دارین ۔۔۔ بہ ہوش باش کہ یزداں شکار ہیں ہم لوگ

یا جنگل کی شہزادی کا یہ شعر کہ ؎

چہرے پہ رنگ تمکیں، آنکھوں میں بیقراری ۔۔۔ ایمائے سینہ کوبی فرمانِ بادہ خواری

تصنیف ہو رہے ہزاروں چھپتے ہوئے فسانے ۔۔۔ ان انکھڑیوں کی ضو پر کانپیں شراب خانے

سچ ہے طوفانِ جوانی کو دبا سکتا ہے کون ۔۔۔ سرشبابِ شعلہ پرور کا جھکا سکتا ہے کون!؟

وارثِ کونین ہوں میرا کوئی ثانی نہیں ۔۔۔ میرے قدموں پہ جھکی رہتی ہے فطرت کی جبیں
مسکراتی ہے غرورِ عرش پہ میری زمیں ۔۔۔ ظالم و سرکش عناصر ہیں مرے زیر نگیں

لطف یہ ہے کہ اکثر دعوے بے بنیاد ہیں، اور جو بے بنیاد ہیں ان میں شدید تضاد ہے۔ ایک جگہ فاضل انعامی مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"جگر کے کلام میں مجموعی حیثیت سے "غالبیت" نہیں ٹپکتی ان کی زبان نہایت شستہ اور صاف ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"جگر غزلوں میں بہت سے ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن کو اب تک کسی غزل گو نے نہیں استعمال کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ نامربوط اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوتے، میرے نزدیک یہ شاعر کا ایک زبردست آرٹ ہے غزل جیسی نازک اور لطیف صنف میں غیر مستعمل الفاظ نہایت خوش اسلوبی سے کھپا دینا ایک ایسا اعجاز ہے جو صرف حضرت جگر مرادآبادی کے حصے میں آیا ہے۔ طوالت مضمون کے خیال سے مثال کے طور پر صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں" (یعنی ایسے اشعار جگر صاحب کے کلام میں زیادہ سے زیادہ ہیں — !؟ خدا جگر صاحب کو ان کے دوستوں سے بچائے)۔

ہم عشقِ مجسم ہیں لب تشنہ و مستسقی
دریا کی طلب کیسی دریا کو رُلاتا ہے

اس صفت سے جگر کو موصوف کرنا ان غریب پر بڑا ظلم ہے۔ ان کے کلام میں ایک (   ) غنائی شاعری کی تمام خصوصیتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں اور وہ غیر مترنم الفاظ سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ "عشق مجسّم" اور "لب تشنۂ و مستقی" دونوں ترکیبیں غیر مترنم اور جگر کی بندشوں کی نزاکت کے منافی ہیں۔ لیکن اس ایک مثال سے (جس کو فاضل انعامی مقالہ نگار نے مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیا ہے) جگر صاحب کی اس خاص غنائی صفت کو دبایا نہیں جاسکتا۔

ایک دوسری جگہ تحریر ہوتا ہے کہ: —

"جگر کا فلسفۂ زندگی"

(۱) ہماری زندگی آج کل افلاس و جہالت کے باعث نئی نئی اُلجھنوں میں گرفتار ہوتی چلی جارہی ہے، اب "ان" (؟) کی نگاہیں رونے والے شاعر پر نہیں ٹھہرتیں، اب عوام ایسی شاعری کو پسند کرنے لگے ہیں جو ان کے دل کا غم بُھلا سکے جس میں زندگی ہو، اثر ہو، اور سرور آگیں نغمات کے دھارے ہوں۔

جگر ہماری سوسائٹی میں اسی "انفرادیت" کے باعث مقبول ہے۔ وغیرہ"

پھر ایک جگہ کہتے ہیں کہ: —

(۲) "وہ دُنیا کو ایک خواب نہیں تصوّر کرتے بلکہ جائے عمل اور کارزارِ حیات سمجھتے ہیں۔" لکھا ہے

سمجھ سوچ کر پاؤں آگے بڑھانا
حقیقت ہے دُنیا کہانی نہیں ہے

جگر صاحب انقلابی اور اجتہادی دل و دماغ لے کر آئے ہیں اور قدامت پرستی سے کوسوں دور ہیں۔ زمانے کے مصائب ان کے مزاج میں قنوطیت (نراشا) نہیں پیدا کرتے بلکہ وہ ان کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں یہی "پیغام" بھی دیتے ہیں۔ ذیل کے شعر میں وہ زمانے کے حوادث اور اپنے جذبات میں کتنی لطیف ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں ملاحظہ ہو:
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر میرے لئے بیتاب ہے، معلوم نہیں کیوں"

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل انعامی مقالہ نگار "جدید شعرائے اُردو" کے نقادوں سے متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے محبوب موضوع میں وہ خصوصیتیں دکھانے کی کوشش کی ہے جو اس میں واقعاتی طور پر نہیں ہیں اور جو نہیں ہونی چاہئیں۔

اوپر کے دو ٹکڑوں میں جن باتوں کو دُہرایا گیا ہے یہ ملک کے انقلابی اور قومی شعراء کے تذکرہ میں لکھی جاتی ہیں۔ نیچرل یا خطیبانہ اور پیغامی شاعری میں بُنیادی طور پر خارجی عناصر ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ مسائلِ حیات سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اور اس ہم آہنگی کی وجہ سے انقلابیوں کا ایک نقطۂ نگاہ بھی ہوتا ہے وہی پُختہ ہو کر ان کا فلسفۂ زندگی بن جاتا ہے، لہٰذا جہاں ان کی شاعری کے محاسن شاعرانہ سے بحث کی جاتی ہے یہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ یہ زندگی اور انسان کو فلاں سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔"

جس طرح اقبال کیلئے لکھا جاسکتا ہے کہ

(   ) ہیں یا دُنیا کو "اسلامی فسزم" یا پین اسلامزم کی زنجیر میں منسلک کرکے مغلوں کے دور کا اسلامی زمانہ واپس لانا چاہتے تھے۔ اور اسلام کو وہ بہترین نسخۂ حیات خیال کرتے ہیں اور انسان کیلئے ایک ذی عمل روحانیت لازمی قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے برخلاف جوش اشتراکی نظام کے قائل نظر آتے ہیں اور وہ دُنیا میں انسان کی خالص خود مختاریت قائم کرنا چاہتے ہیں وہ مذہب ہی نہیں ذی عمل روحانیت کو بھی زندگی کیلئے لازمی قرار نہیں دیتے ہیں۔

. . . .

. . . .

. . . .

لیکن پیغامی یعنی فلسفی شعراء کے برخلاف غنائی شاعر اور اسکی شاعری کے فرائض بالکل مختلف ہیں۔

غنائی شاعر کا فرض زندگی میں محض مسرّت پیدا کرنا ہے۔ اور بس، اس کی شاعری کو خارجیت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں، داخلی عنصر اس کی شاعری کا جوہر ہوتا ہے اور انسانی روح پر اس کی شاعری کا جادو اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح سارنگی اور ستار کا۔"

سارنگی اور ستار کو بوں، جنج اور کراہ سے کوئی نسبت نہیں۔ اس طرح غنائی شاعری کو فلسفہ و حکمت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

جگر صاحب غنائی شاعر ہیں، اور لافانی غنائی شاعر ہیں۔

ان بیچاروں کے متعلق "انقلابی" اور "اجتہادی" "فلسفۂ زندگی" "جہدِ عمل" اور "کارزارِ حیات" قسم کی ترکیبیں لکھنا ایسا ہی ہے جیسے بلبل پہ پہاڑ لاد دینا۔

جو شعر انعامی مقالہ نگار نے مثال میں دیا ہے 'وہ' اور اس میں لفظ "تغیہ" کا استعمال نئے ماحول اور شعرائے جدید کا فیضان ہے اس ایک شعر سے کوئی متغزل فلسفی شاعر نہیں ہو سکتا۔

ہاں اگر میں جگر صاحب پر مضمون لکھتا تو دنیا کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا کہ "ادبِ لطیف" کا رسیا اب "ادبِ کثیف" کے جاروب کشوں کی خاکِ پا سے موتی رولتا ہے۔

ان کی تازہ نظمیں ؏

آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

یا "مدت میں وہ تجدیدِ ملاقات کا عالم"

یہ متغزل جگر کے رنگ میں بکھری ہوئی غزلیں نہیں ہیں، بلکہ یہ مسلسل نظمیں ہیں جو ایک خیال کی بنیاد پر لکھی گئی ہیں۔

یقیناً یہ جدید رومانیت کے اثرات ہیں جن سے بڑی کشمکش کے بعد بھی جگر صاحب اپنا دامن نہ بچا سکے۔

یہ ان کا ارتقا ہے اور اس ارتقا پر ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا تنقیدی مضمون آرزو صاحب لکھنوی پر ہے جس میں نظم و غزل کے مسئلہ پر کمزور دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ اور اس مضمون کے لکھنے والے نے بھی وہی زیادتی اپنے موضوع سے کی ہے جو جگر صاحب کے ساتھ انعامی مقالہ نگار نے کی تھی۔ یعنی خیر سے آرزو صاحب کو سرمایہ داری کے مظالم اور غربت کی بے بسی کا مرقع نگار بتایا ہے۔

افسوس یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ خارجی شاعری کی تخلیق بھی بغیر داخلی اہلیت کے ناممکن ہے۔!؟ اب بتائیے اس شعر میں کیا جائے ؏

عجب زندگی ہے عجب زندگی ہے
کہ ہیں ظلم پر ظلم اور بے بسی ہے

بہر حال یہ مضمون پہلے مضمون سے غنیمت ہے، شاید اس لئے کہ "انعامی" نہیں ہے۔!؟

مجھے افسوس ہے کہ اضطراب کا ہر صفحہ مجبور کرتا ہے کہ میں اس کو ایک "رجعت پسند" آرگن کہوں۔ "ہماری شاعری" کے عنوان سے سوز شاہجہانپوری کا ایک مختصر سا مضمون ہے اور اس کا بھی مقصد محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں پہ دھول اڑائی جائے جو شاعرانہ ترقی کی دوڑ میں ہوا بن کر اڑ رہے ہیں۔

اس مضمون کی روح یہ اعتراض ہے کہ موجودہ شاعری محض الفاظ اور ان کے غلط استعمالات کا ایک معجون مرکب ہے۔ آئیے ذرا اس مسئلہ پر تفصیلی نگاہ ڈالیں۔

موجودہ شاعری کی دنیا کو چار حلقوں میں اگر تقسیم کیا جائے تو یہ حلقے بنیں گے۔ (۱) ترقی یافتہ متغزلین (۲) ترقی یافتہ متغزلین کے غلط مقلدین۔ (۳) ترقی یافتہ انقلابی نظم نگار شعراء (۴) اور ان کے غلط مقلدین۔

فرسودہ اور پٹی ہوئی شاعری یا انفعالی شعراء سے مجھے غرض نہیں، موجودہ شاعری اور شعراء کے یہی چار حلقے بن سکتے ہیں۔ جہاں تک نمبر ۱ اور نمبر ۳ کا تعلق ہے، ان کے ترقی یافتہ ادب نے آج اردو شاعری کو اس درجہ بلند کر دیا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی شاعری کے سامنے زیادہ شرمندہ نہیں ہو سکتی۔

(۱) عشقیہ شاعری (اور (۲) انقلابی جدید شاعری، دونوں کے نکھار اور ارتقا نے اردو ادب کو تباہی و شرمندگی سے بچا لیا ہے۔ اب رہے نمبر ۲ اور نمبر ۴ سو ہر ملک میں "غلط مقلدین" کا نہ کوئی معیار ہوتا ہے اور نہ ان کی کچھ عمر ہوتی ہے، اس لئے ان کے اشعار کو موضوع بنا کر حقیقی شعراء یا ان کے ادب کو تنقید کا نشانہ بنانا ہرگز تنقید نہیں ہو سکتا۔

جن اجزاء اور عناصر کو جناب سوز نے گنایا ہے یہ غلط ہے کہ

موجودہ شاعری محض ان اجزا کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ اقبال، جوش اور دوسرے لوگوں کے دواوین سوز صاحب کی نظر ہی سے نہیں گذرے، یہی نہیں اور بھی بہت سے نوطلوع ستارے ایسے ہیں جن کی ضو منفعل شاعری کے آفتاب و ماہتاب کی روشنی کو ماند کر رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں لڑکیاں ایسی نظمیں اور غزلیں کہتی ہیں جن کے آگے فرسودہ غزل گو اساتذہ کا کلام بے روح معلوم ہونے لگا ہے۔

اصل میں یہ مضمون نظم نگار شعراء کے حلقے پر ایک کمزور ضرب ہے اور یہ حضرت سخت قسم کے دقیانوسی معلوم ہوتے ہیں۔ جب انسان کی خود کوئی حیثیت نہیں بن سکتی تو اسی طرح دل مسوستا ہے۔

اس کے بعد سوز صاحب نے صاحبانِ ترنم پر چنگاریاں پھینکی ہیں۔ اس انداز اور ان اطوار سے آپ اضطراب کی متاعِ ادب کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں۔

سارا رونا تو دراصل ترنم ہی کا ہے، کیونکہ جدید متغزلین اور نظم نگار شعراء میں زیادہ تر ایسے ہی خوش نصیب ہیں جو ترنم کے ساتھ اپنا کلام سناتے ہیں اور ان کو وہ ہر دلعزیزی اپنے کلام اور ترنم کی وجہ سے حاصل ہے جس کو مغلوب کرنا فرسودہ، بوڑھے، حاسد اور متشنج شعراء کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان شعرائے جدید کے اقتدار کا عالم اس وقت دیکھیے جب وہ کسی مشاعرہ یا جلسے میں موجود ہوں، کوئی نظام باقی نہیں رہتا۔ "گلوگیر شعراء" (جن کی نسل میں سے سوز صاحب بھی معلوم ہوتے ہیں) موجود ہوتے ہوئے نابود ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی روحانی تکلیف ہے جس کو گمراہ سبزۂ آغازی اور ڈاڑھیوں کا سپید رنگ برداشت نہیں کر سکتا۔

لیکن اگر عقل کا ایک جزیہ بھی ان حضرات کے پاس ہے تو ان کو نفسیاتی اور حقیقی اسباب پر غور کرنا چاہیے جن کی بنیاد پر جدید شعراء عوام میں ہر دل عزیز ہیں۔

گو آپ جانتے ہیں لیکن آئیے ذرا ان حقائق کو دہرائیں اور اپنے دوستوں کی آتشِ حسد کو سرد کرنے کی کوشش کریں جو ان کے دل و جگر کو پھونکے ڈالتی ہے۔

"یہ صرف ایک حد تک صحیح ہے کہ ترنم شاعر کو مقبول کر سکتا ہے؛ ہمارے سامنے ایک مترنم شاعر کی مثال موجود ہے جو ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۳۹ء میں مر گیا۔" (!؟!)

اس کی موت کا مقابلہ اس کا ترنم نہیں کر سکا کیونکہ اسکی شاعری میں بلوغ کی اہلیت نہ تھی اور نہ صرف ماحولی یا قومی بلکہ وہ محض عشقیہ شاعری کی کسوٹی پر بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ جدید شعراء اس لئے عوام میں مقبول، زندہ، تابندہ اور پائندہ ہیں کہ وہ سماج کی آواز ہیں؛ جوانی کے نمائندہ ہیں وہ موجودہ سیاسی، مجلسی، ارتقاء اور زندگی کی اُٹھان کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اور اپنے عصر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اُن لطیف حقائق کی نمائندگی کرتے ہیں جو انسانی روح و دل سے اُچھلنے کے لئے صدیوں سے بے تاب تھے۔

وہ فرسودہ، گلوگیر، منفعل اور مُردہ شاعروں کی اُس نسل سے نہیں ہیں، جو منافق ہیں، قافیہ سے خیال پیدا کرتے ہیں۔ اور فن کی تلیا میں سے شعر کی تھرڈ کلاس سیپیاں تلاش کر کے جوہریوں کے سامنے موتی کا نام لے کر رکھتے ہیں؛ جدید شعراء شاعری کے بحرِ بیکراں اور فطرت کے ناپیدا کنار سمندر کے لاپرواہ غوّاص ہیں۔ جان پر کھیل جانے والے غوطہ زن ہیں، وہ زندگی کی نہایتوں کی تہ تک جاتے ہیں اور بیش بہا موتی نکال لاتے ہیں۔

ان کی کامیابی ان کو مست کر دیتی ہے۔ اس موتی کو اپنے خونِ دل سے رنگین بنا کر سماج کی گردن میں ڈال دیتے ہیں، اور مست ہو ہو کر گاتے ہیں۔

وہ ڈرائنگ روم کے بھاٹ نہیں ہیں، وہ امراء کے وظیفہ خوار خوشامدی نہیں ہیں وہ بوڑھے طبقۂ انسانی کے فاقہ مست ڈوم نہیں ہیں، وہ ندیم ہیں انسانیت کے، وہ نقیب ہیں آزادی اور ذہنی ارتقاء کے، وہ مغنی ہیں انسانی روح و دل کے لطیف ترین حقیقتوں کے، وہ مطرب ہیں، سرمست اور الھڑ شباب کے، اور وہ نمائندے ہیں اس عصرِ خونیں کے جس سے ہستی کانپ رہی ہے۔

جن مُردہ روایتوں کا نام ادارۂ اضطراب نے مذاقِ سلیم اور

روحِ ادب رکھا ہے۔ سچ پوچھئے تو جدید شاعری نے اس کو اُجاگر کیا ہے اور قدیم غزل نے اس کی میت تیار کی ہے۔

لیکن بہرحال اسی اُلٹی سیدھی ترتیب کے باوجود اضطراب میں جذوب صاحب کی غزل، پیراشوٹ کے متعلق مضمون اور اضطرابِ عالم اور نقوشِ ماضی، بر جبیں آمنہ صاحبہ کی نظم اچھی چیزیں بھی موجود ہیں میں اپنے نادیدہ دوستوں سے عرض کروں گا کہ دُنیا بہت آگے نکل چکی ہے بہت جاگ چکی ہے، بہت ہوشیار ہوگئی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں وہ واقعی اضطراب کو ایک ادبی رسالہ بنائیں، اپنے اندر جوش و ولولہ پیدا کریں، ترقی یافتہ بنیں، محنت کریں، کوئی وجہ نہیں کہ وہ انفرادی طور پر زبان و ادب اور سماج و ملک کی خدمت نہ کرسکیں۔ ایک چھپی ہوئی خواہشِ ترقی اضطراب کی لہروں میں ضرور پائی جاتی ہے۔ ذاتیات اور غلط مقابلہ سے بلند ہوجانا ہی ذہن و دماغ کی صحت و ترقی کی دلیل ہے۔

آخر میں اضطراب کے ٹائٹل کے متعلق بھی ایک بات ادارۂ اضطراب کو محسوس ہونی چاہیئے۔

زبان کی ترقی کے لئے اس نظریہ کی تصدیق کی اب ضرورت باقی نہیں رہی ہے کہ زبان کو جس قدر آسان اور سہل بنایا جاسکے بنایا جائے غالبًا اس سلسلے میں رسم الخط بھی ایسا ہونا چاہیئے جس کو محض "کوئی" نہ پڑھ سکیں ہندوستانی بھی پڑھیں!

کوئی شک نہیں کہ یہ ابداعِ جمیل (خوبصورت بدعت) ہے خوب! مگر میں نے کشمیر سے واپس آکر اس رسالہ کو ہفتہ بھر تک مرہٹی رسالہ سمجھا اور اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ کسوٹی کا باب لکھتے وقت معلوم ہوا کہ آپ اُردو رسالہ واقع ہوئے ہیں!؟

نیا ادب اس "کوفیت" کا موجد ہے مگر وہ بھی اب اپنی ایجاد سے دست بردار ہوچکا ہے!

ایک طرف آپ ہندو بھائیوں سے شکایت کرتے ہیں کہ وہ اُردو نہیں پڑھتے دوسری طرف آپ نستعلیق خط سے رجعت کرکے ایسے رسم الخط میں اپنے رسائل کے نام لکھواتے ہیں جن کو اُردو خواں عوام بھی نہیں پڑھ سکتے ــــــ !؟

بہرحال میں اضطراب کی ترقی اور اشاعت کا خواہاں ہوں اور پُرزور سفارش کرتا ہوں کہ ناظرینِ ایشیا اسکو منگاکر دیکھیں۔

داستان لاہور	سائز ۲۰×۳۰/۸ اڈیٹر خلیل احمد و بشیر ہندی سالانہ چندہ صہ، فی پرچہ ۶ر ۴۵ ٹمپل روڈ لاہور

"ہزار داستان" کے بعد "داستان" کا لاہور سے شائع ہونا اس ارتقا کی مناسبت کو پیش کرتا ہے جو ۱۵ برس کے اندر ادبی دُنیا میں پیدا ہوا ہے۔ گو داستان میں سے "ہزار" کی کمی ہوگئی ہے لیکن یہ کمی اُس ذہنی و ادبی تکمیل کا سرآغاز ہے جس کے لئے ادبی دُنیا رات دن کوشش کررہی ہے۔

ہزار داستان کا تصور یقینًا ہمارے گزرے ہوئے ساونتی عہد کے کلچر کی تصویر پیش کرتا ہے جس کی ہر شے سے ہمارے احساس و خیال کو ایک نفسیاتی لگاؤ تھا۔ اور باوجود ناپسندیدگی کے آج بھی اس عہد کا تصور ہمیں سرشار کردیتا ہے۔

فارسی اور اُردو ادب میں "ہزار داستاں" کی چہک روح و دماغ میں چٹکیاں لیتی تھی دل کو مست کرتی اور سراپردۂ دلوں کے پس منظر کو چیرتی ہوئی لالہ رخوں کے جلسوں تک میں پہنچا دیتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر "ہزار" کی کمی اس لفظ میں ایک ایسا عجیب رومانی اور حکیمانہ اضافہ کرگئی ہے جس کی وحدانیت، وحدت پر بھی چھائی ہوئی ہے اور کثرت پر بھی ــــــ!

داستان میں زندگی کی ہر کہانی پوشیدہ معلوم ہوتی ہے جن مسائل سے اراکینِ داستان نے بحث کرنا چاہی ہے، ان تمام مقاصد اور مسائل کا بکھراؤ داستان کی اتھاہ دُنیا میں پایا جاتا ہے۔ اس تصرف پر خلیل و بشیر کی ملی جلی اسم تراشی پر داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ خلیل و بشیر جو داستان کے واضع اور مرتب ہیں، رسائل کے شائع کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور ان کو ادبی و تجارتی تجربہ ہے لیکن داستان کے دو نمبر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی راہ واضح نہیں کرنا چاہتے۔ اور جدت و قدامت کے بین بین سلامت روی کی پالیسی پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر نے ایسا چاہا مگر اس سلامت روی کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ یا بالکل قدیم ہوگئے یا بالکل جدید۔ بہرحال ادب کا نیا نظریہ ملک میں مقبول ہورہا ہے۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے تخیل سے رہائی حاصل کرنے کی جد و جہد شروع کردی ہے، اور ادب کا سر رشتہ زندگی کے دامن سے باندھا جاچکا ہے، اب یہ حقیقت تسلیم کی جاچکی ہے کہ فرسودگی اور قدامت ہمارے مرض کا علاج نہیں۔ (باقی آئندہ)

SAGHAR

IN ENGLISH

ایشیا

(۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومتِ صوبۂ متحدہ

محکمۂ تعلیمات حکومتِ صوبۂ بہار

زیرِ سرپرستی ڈاکٹر محمد سید محمود

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان) — — قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)

اُردو دُنیا کی طرف سے ہندی سنسار کیلئے بہترین تحفہ

رس ساگر

بادۂ مشرق کا نیا رُوپ

ہندوستانی ادب میں یہ پہلی مکمل کوشش ہے جس کی بُنیاد میں لسانی اتحاد - قومی ملاپ اور ہندوستان کی ایک لنگوا فرینکا دریافت کرنے کے خیال کی طرف قدم اُٹھایا گیا ہے - یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ساغرؔ کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کی منتخب نظمیں اور نیا کلام ناگری حروف میں ایک مرتّب مجموعہ کی شکل میں چھاپا گیا ہے اور حواشی میں ان تمام الفاظ کے معنی آسان زبان میں دیدیئے گئے ہیں جن کو ہندی دُنیا بالوجود آسانی سے نہیں سمجھتی -

کتاب کے لئے خاص طور پر پیلا اینٹک پیپر مل سے بنوایا گیا ہے اور چھپائی ہندوستان ٹائمز پریس دہلی میں ہوئی ہے -

"رس ساگر" مجموعی طور پر نہایت حسین اور اعلیٰ سامانوں کے ساتھ شائع ہوا ہے اور اُردو دُنیا کی طرف سے ہندی سنسار کے لئے بہترین تحفہ ہے آپ اپنے ہندی جاننے والے دوستوں کو نہایت فخر و مسرّت کے ساتھ اس تحفہ کی نذر دے سکتے ہیں -

مینیجر ادبی مرکز میرٹھ (یوپی)

ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین "ایشیا" دسمبر ۱۹۴۰ء

تصحیح

عیدِ نظارہ (مطبوعہ اکتوبر نومبر نمبر ۱۹۴۲ء)

اکتوبر نومبر نمبر میں صفحہ ۵۴ پر عزیز جہاں بیگم ادا صاحبہ کی نظم عیدِ نظارہ شائع ہوئی تھی۔ نہایت افسوس ہے کہ اس میں کئی جگہ کتابت کی غلطیاں رہ گئیں براہ کرم اس طرح تصحیح فرما لیجئے۔

(دوسرے شعر کا دوسرا مصرع)

غلط۔ سو طرح ٹمکڑے کو اپنے سجاؤں میں

صحیح

اس طرح ٹمکڑے کو اب اپنے سجاؤں میں

(چوتھے شعر کا دوسرا مصرع)

غلط قوسِ قزح کے رنگ سے محفل سجاؤں میں

صحیح

قوس قزح کا رنگِ عروسی رچاؤں میں

دسویں شعر کا پہلا مصرع

ظلمت میں ہو نہ نورفشاں ماہِ نیم ماہ

صحیح

ظلمت میں ہوگا نورفشاں ماہ نیم ماہ

اڈیٹر

ایشیا

جلد ۶ | ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء | نمبر ۵

ہندی ساہتیہ سمیلن کے ۲۹ اُنتیسویں اجلاسِ پونہ کا خطبۂ صدارت

اور اُس پر ایک طائرانہ نظر

میں یہ تو نہیں کہتا کہ زندگی اور ادب کا مجھے ایسا خاص تجربہ حاصل ہے جس کی بنا پر میں پھیلے ہوئے مسئلوں پر کوئی حکم لگا سکوں۔ ملک میں بہت سے بزرگ ایسے موجود ہیں جو زبان کے مسئلے پر کامل فیصلہ صادر کر سکتے ہیں لیکن اِن بزرگوں اور ناچیز میں نقطۂ نگاہ کا جو امتیازی فرق ہے وہ فیصلہ کرنے والوں کے تین اسکول قائم کرتا ہے۔

(۱) ملک میں ایک وہ جماعت ہے جو ہندی والوں سے سیاسی اختلاف کی بنا پر لسانی اختلاف رکھتی ہے، اور کانگریس کو متہم کرنے کے لئے اُردو کے مسئلے اور اُس کے سلسلے میں اختلاف سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے۔

(۲) دوسری جماعت ایسی جماعت ہے جو ہندوستان کی آزادی کو پہلا فرض سمجھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی لسانی اتحاد چاہتی ہے۔ سیاسی طور پر یہ جماعت ملکی ترقی کی راہ میں روڑا نہیں بلکہ آزادی کی جدوجہد میں دل و جان سے شریک ہے اور وہ ملک میں ایک قوم، ایک زبان، ایک آزاد حکومت، اور ایک ادب کی بنیادی کوشش پر یقین رکھتی ہے۔

(۳) تیسری جماعت مسلمانوں میں ایسی ہے جو وقت کے تمام تقاضوں سے آزاد ہو کر محض اُردو، اُردو پکارتی ہے اور وہ کوئی ایسی درمیانی راہ یا میل ملاپ کی قائل نہیں، جو جماعت نمبر ۲ چاہتی ہے۔

میں جماعت نمبر ۲ کے عقیدوں سے متفق ہوں، اور اس اتفاق کے سلسلے میں زیادہ نہیں لیکن کچھ تجربہ گرد و پیش کے حالات اور تقاضوں کا رکھتا ہوں۔ اُردو دنیا کے مقابلے میں کم سہی، لیکن مجھے ہندی سنسار، ہندی مصنفین، ہندی جرنلزم، ہندی جرنلسٹ، ہندی افسانہ نگار، ہندی کویوں، ہندی نقادوں اور ان کے پس منظر میں ہندو جنتا میں بولی جانے والی زبان، ادنیٰ اور اعلیٰ نیچے اور اونچے، درمیانی، اور درمیانی سے کچھ کم درجہ کے ہندو گھرانوں کے بچوں، بچیوں، کماریوں، بیویوں، بوڑھی عورتوں اور نوجوان و بوڑھے مردوں کی بولی کو میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔

اور ــــ اِن کانوں نے صرف شہر کے باسیوں ہی کی بولی نہیں سنی گلمرگ (کشمیر) کی چوٹیوں پر گھوڑے کی لگام پکڑنے والے... کشمیری کی بولی بھی سنی ہے۔ تمام شمالی ہند کے گاؤں کے بھائیوں سے بھی باتیں کی ہیں اور بہار میں گنگا کے کنارے کٹی میں پڑے ہوئے سادھوؤں اور دہقانیوں کی بھی بولی سنی ہے۔

یہی نہیں، بلکہ مجھے ہندی ادب سے محبت ہے اور میں ہندی کے مدھر اور گاتے ہوئے شبد اپنی نظموں میں آزادی سے استعمال کرتا ہوں۔ میرے نئے

اپنے منتخب کلام کو ناگری رسم الخط میں مرتب کیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ دو شاندار قوموں کو زبان کے مسئلے پر اس درجہ اُلجھا دیا جائے کہ آنے والی زندگی میں اُن کے سیاسی تعلقات کبھی اچھے ہی نہ ہو سکیں، صرف یہی نہیں، میں ہندوستان کے تمام فرقوں کو ایک قوم کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہوں اور کسی شرط پر بھی تیسری طاقت کی طرف ہاتھ بڑھانے کا پاپ کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میں واحد طور پر ادب اور زبان کے مسئلے پر حقیقت کی روشنی میں اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق رکھتا ہوں اور اُن لوگوں کو جو قومی ایکتائی کی ریڑھ کی ہڈی پر کاری ضرب لگانا چاہتے ہیں بتا سکتا ہوں کہ وہ مسئلے کو اپنی اصلی صورت میں سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے، اور اُن کی اُلٹی سیدھی لنترانیاں ملک کو سخت نقصان پہونچا رہی ہیں۔

۶ر دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء کو پونا میں آل انڈیا ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا اس کی صدارت یو، پی کے سابق وزیر تعلیم سمپورنانند صاحب کرنے والے تھے لیکن وہ ستیہ گرہ کے سلسلے میں جیل چلے گئے اور اُن کا وہ خطبۂ صدارت پڑھا گیا جو غلط بیانی، ناعاقبت اندیشی اور اَدَبی نفاق انگیزی کا شاہکار ہے۔ یہ شاہکار تمام و کمال اپنی اصلی صورت میں میرے سامنے نہیں ہے انگریزی اور اُردو اخبارات میں اس کے جس قدر اقتباسات آئے ہیں اُنھیں پر میں رائے زنی کر سکتا ہوں۔

میں سمپورنانند جی کو ایک سوشلسٹ خیال کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ زندگی اور ادب میں اک ترقی پسند انسان ہوں گے لیکن اس تقریر نے اُن کا سارا بھرم کھول دیا اور معلوم ہوا کہ وہ ہندوؤں کے اُسی رجعت پسند گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جو زندگی میں آگے جانے کا قائل نہیں اور زندگی کو صدیوں کے پہلے دقیانوسی اور دیمک لگے ہوئے تمدّنی روایات اور فلسفوں میں لپیٹ کر قدیم مصریوں کے "ممی سسٹم" کو جاری کرنا چاہتا ہے۔

میں یقین کرتا تھا کہ سمپورنانند جی ہمارے محترم پنڈت پیارے لال شرما سابق وزیر تعلیم (میرٹھ) کی طرح سنجیدہ، سچے اور وسیع المطالعہ بزرگ ہوں گے۔ لیکن جب میں نے اُن کے خطبۂ صدارت کا وہ حصّہ پڑھا جس میں اُنھوں نے موجودہ ہندی شاعری اور اُردو شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے اُردو شاعری کو "شاہد و شراب اور قورمہ کباب کے آدرش" سے تعبیر کیا ہے اور اسے ایک ڈربے تک محدود ظاہر فرمایا ہے تو مجھے دلی دُکھ ہوا۔ اس لئے اور بھی دُکھ ہوا کہ ایسے خود ساختہ ترقی کرنے والے بزرگ کے لئے جس نے ڈسٹرکٹ بورڈ کے کلرک کے درجہ سے اُٹھ کر وزارتِ تعلیم کی کرسی حاصل کی اور قومی لڑائیوں میں ایک بہادر سپاہی کی طرح حکومت کے مقابلے میں ڈٹا رہا مجھے اپنی اچھی رائے بدلنی پڑی اور ایسی رائے قائم کرنی پڑی جو میری گذشتہ اچھی رائے کے مقابلے میں نہایت بُری اور گری ہوئی ہے۔

سمپورنانند جی شاعر کی سیرت (کرتویہ) کے بارے میں کہتے ہیں کہ:-

"ہمیں بجا طور پر اپنے شاعروں پر فخر ہے، ہندی نثر تو مقابلتہً نئی ہے لیکن ہندی شاعری اپنی روایت کے اعتبار سے صدیوں کا سلسلہ رکھتی ہے، زمانہ کے ساتھ ساتھ اس روایت میں بھی فرق آیا ہے۔ ہندوستان کی آخری عظمت کا سورج ڈوب گیا۔ آریہ اور اناریہ (غیر آریہ سنسکرتی تہذیب) کا تصادم ہوا، ان روایتوں کو اُن درباروں میں جگہ ملی جہاں بدعنوانیوں اور عیاشیوں نے لوگوں کو اُن کے ماضی سے بے خبر کر دیا۔ لیکن آج وہی روایت پھر ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اور دنیا کے ایک نئے نظام کے قیام کو دیکھ رہی ہے" (ترجمہ)

آریہ اور اناریہ یعنی آریہ (ہندو) اور غیر ہندو تہذیبوں میں تصادم ہوا، جہاں تک میں سمجھتا ہوں مقرر کا مقصد یہ ہے کہ ہندی ادب کو مسلم درباروں میں جگہ ملی، (صرف شاہجہاں کے دربار سے ۸۰۰ ہندی کویوں کو وظائف ملتے تھے) اور یہ وہ دربار تھے "جہاں بدعنوانیوں اور عیاشیوں نے لوگوں کو ماضی سے بے خبر کر دیا تھا"

تاریخ و ادب پر یہ وہ آنکھ بند کر کے تبصرہ ہے جو سمپورنانند جی کی تاریخی اور اَدَبی معلومات کا بھانڈا پھوڑتا ہے۔

اگر یہ عمرانی و تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے خود ہندوستان کے آریہ اپنے اخلاق و تہذیب کا جنازہ نکال چکے تھے اور اپنی زندگی کی ساری شگفتگیاں اور تازہ دمی، بدعنوانیوں اور تعیّش کے نذر کر چکے تھے تو "اناریہ" درباروں کی عیاشیوں اور بدعنوانیوں کو آپ کو متہم کرنے کا کس نے حق دیا ہے؟!؟

میں تو ہندی ادب سے آپ کی برابر واقف نہیں، مگر آپ کی ساری قدیم ہندی شاعری یا تیاگ کا راگ ہے یا شرنگار رس، کوئی شک نہیں کہ اس میں تیاگی جذبات اور (Lyrical Poetry) عشقیہ شاعری کے عناصر گہرے فلسفیانہ رنگ میں گھلے ہوئے نہیں لیکن وہ انسانی جذبات میں کوئی ایسی زندگی نہیں پیدا کرتے جسکو ہم (Action) عمل سے تعبیر کر سکیں۔ ہندی ادب کا یہ حال مسلمانوں سے پہلے تھا لہٰذا "اماریہ" درباروں پر یہ اتہام کہ اُن میں بیٹھنے کی وجہ سے لوگ اپنے آپنی سے بے خبر ہوگئے تھے، محض بہتان اور تاریخِ ادب سے قطعاً ناواقفیت کی دلیل ہے۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :-

"ہمارا کوی دلتوں کی آواز سُنتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ ایک جانب کروڑوں مصیبت زدہ، ننگے بھوکے انسان ہیں، دوسری جانب فیکٹریاں اور کارخانے ہیں، یہ تضاد اس کے دل میں گھر کر جاتا ہے، وہ اسے محسوس کرتا ہے، ایک سچا شاعر جد و جہد سے جی نہیں چُراتا وہ ان آنسوؤں کے آگے آشا کی جھلک دیکھتا ہے، اس کا پیمبرانہ تصور مستقبل کی تصویر کھینچتا ہے، چاہے وہ روشن نہ ہو، لیکن اُسے سچائی کی وہ جھلک نظر آجاتی ہے جو حواسوں کے ذریعہ محسوس نہیں کی جا سکتی، وہ کوتا (شاعری) اس لئے لکھتا ہے کہ اُسے حقیقت نظر آجاتی ہے اور یہی حقیقت حُسن ہے، سچا شاعر آرٹ کو زندگی سے الگ تھلگ نہیں رکھتا۔ سچائی محض خوبصورتی ہی نہیں بلکہ نیکی بھی ہے، شاعر کی آواز میں انسانیت کے لئے ایک پیغام ہونا چاہیے"

(ترجمہ)

نہایت خوب، یہ وہ تمام حقائق ہیں جنھیں سمپورنانند جی سے پہلے ہزاروں زبانوں نے ہم تک پہونچایا ہے، اِن میں سے کوئی ایک ایسی نئی حقیقت نہیں جو آجکل کے اُردو ہندی شعراء از خود نہ جانتے ہوں۔

موجودہ زمانے میں جس قدر ہندی شعراء ہیں اُن میں سے اکثر سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور اُن کے کلام و زندگی کو پاس سے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے۔

(یو، پی کے چند مشہور ہندی شعراء)

(۱) نرالا جی	(لکھنو)
(۲) اوما دیوی جی ورما	(الٰہ آباد)
(۳) متھیلی شرن گپت	(جھانسی)
(۴) بچن جی	(الٰہ آباد)
(۵) سنیہی جی	(کانپور)
(۶) شرما	

(نوجوانوں میں)

(۷) ہردیش	(کانپور)
(۸) نرنکار	(بریلی)

نرالا جی کی شاعرانہ خصوصیات
اوما دیوی جی کی شاعرانہ خصوصیت مسٹیسزم (تصوف) (Mysticism) اور المناکی (Pessimism) ہے۔

متھیلی شرن گپت اِن تمام سے بوڑھے اور مستند کوی ہیں، اِن میں وہ ساری ماہرانہ اور اُستادانہ خصوصیات ہیں جو کسی بڑے مہاکوی میں ہوتی ہیں، لیکن ان کی شاعری کے تمام عناصر دھرم، ویدانت اور بھگتی کا سازوسامان ہے، جو پُرانے کویوں کی خصوصیت تھا۔

بچن نئے زمانے کے شاعر ہیں، مگر اِن کی شاعری بھی المناکی اور مسٹیسزم (Mysticism) تصوف کی آئینہ دار ہے یہ بھی سخت نراشاوادی ہیں۔

سنیہی جی پُرانے ہندی شاعر ہیں ایک اسکول کے بانی ہیں، مگر جہاں تک میں جانتا ہوں یہ کسی خاص بات پر زور نہیں دیتے۔ مہاکوی ہیں اور ہر چیز کو شاعرانہ طور پر بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

ہردیش کانپور کے نوجوان شاعر ہیں اور بہت اچھے گیت کہتے ہیں ان کے گیتوں کا پس منظر (Back Ground) اک روحانی روحانیت ہے یا دھرم، ویدانتک اور کرشن بھگتی کے خیالات ہیں۔

البتہ بریلی کے نرنکار جی جو ابھی بہت نوجوان ہیں اُن کے خیالات میں میں نے ایک طوفان ضرور دیکھا مگر جو کچھ وہ سوچ رہے ہیں اور جس منزل پر ہیں

اُس کو مکمل طور پر بیان نہیں کر سکے ہیں۔

(بہار کے چند مشہور شاعر)

(۱) نیپالی جی
(۲) دنکر صاحب

میں بہار میں انہی کو جانتا ہوں، نیپالی کی شاعری خوب ہے۔ مگر وہ ہمیں کوئی پیغام نہیں دیتے۔

دنکر کے کلام میں جوش ہے اور اس کے کلام کی خصوصیت مغل عہد کی تمام تر روایات کی قصیدہ خوانی ہے۔ بھارتیہ پریم (حُبِ وطن) کے جذبات بھی اس کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اِن کے سارے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو شعرا سے سخت متاثر ہیں، اِن کی زبان بھی سخت ہندی نہیں ہوتی۔

بچن جی نے پہلے "مدہ شالہ" (میخانہ) ہندی میں لکھی، یہ رباعی کے وزن کی چیز نہیں، مگر رباعی کی طرح چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور اس میں "خمریات" شراب و شاہد اور اُس سے تعلق رکھنے والی باتوں کو نظم کیا!

اِس سلسلے میں اُردو فارسی شاعروں کی جس قدر رباعیات ہو سکتی ہیں، سب کو ہندی شعرا نے ہندی میں اپنی مہر لگا کر پیش کر دیا۔ نہ خیام کی روح کچھ کر سکی نہ ریاض کی، نہ ہم کچھ بنا سکے نہ جوش، اسی طرح مولانا خیر بھوروی نے گذشتہ ماہ مجھ سے کہا کہ دنکر صاحب نے تقریباً سارا "بادۂ مشرق" ہندی میں اپنا "لیا ہے!

کسی دوست کو متہم کرنا مقصود نہیں، نہ کسی کا دل دکھانا مقصود ہے اُردو شاعر ہوں یا ہندی مہا کوی سب کا مقصد کسی نہ کسی طرح جنتا کی خدمت کرنا ہے اور اپنے آرٹ سے گری ہوئی انسانیت کو اُٹھانا ہے لیکن میں جیل کی سلاخوں میں بیٹھے ہوئے سمپورنا نند جی سے ادب کے ساتھ یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے "اپنے" اُس ایک کوی کا نام بتا دیں جو دلتوں کی آواز سُنتا ہے"!؟

مقابلہ کا سوال نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار کرنا ہے کہ کیا جدید ہندی شاعری اقبال جیسا شاعر پیش کر سکتی ہے؟

اُردو زبان کے نئے دَور نے جو زبردست اُردو شاعر پیدا کئے کیا اُن کے مقابلے کا ایک شاعر بھی ہندی شاعری پیش کر سکتی ہے!؟

آگے چل کر سمپورنا نند جی فرماتے ہیں:-

جب میں موجودہ ہندی شاعری پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دَور کی نمائندہ ہونے کی کوشش کر رہی ہے اس میں تلاش، تجربہ، غلطی، بغاوت، بندش، تصادم، مصیبت اور وہ تمام جذبات پائے جاتے ہیں جو ہزاروں ہندوستانی مرد عورتوں کے دلوں میں ہیجان برپا کئے ہوئے ہیں۔ لیکن، اس میں وہ شگفتگی نہیں پائی جاتی جو آشا سے پیدا ہوئی ہو۔

جو کچھ میں نے ہندی شاعروں کے نراشاوادی) الم پرست (Pessimistic) ہونے کے متعلق لکھا۔ سمپورنا نند جی اس کو مانتے ہیں

" اور اس میں پیغام نہیں پایا جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کمی بھی جلد پوری ہو جائے گی اور کوئی نئے یگ کا مشعل بردار ثابت ہوگا

آگے چل کر اِس طرح اُپدیش دیا جاتا ہے:-

" لیکن اِس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر رنگ رلیوں سے پرہیز کرے اور محنت کی زندگی بسر کرے، سچائی کا راستہ پھولوں میں سے ہو کر نہیں ہے پوترتا (پاکیزگی) کے ساتھ تیاگ بھی ہونا چاہئے۔ ویاس اور والمیکی کے راستہ پر وہی لوگ چل سکتے ہیں جن میں ہمّت ہے اور آتم تیاگی (روح کو تج دینے والے) ہوں جو ایسا کر سکے وہ دوسروں کی رہنمائی کرے گا اور اس کی آواز گیتوں میں لافانی رہے گی"

اِن سطور میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن کی صداقت سے انکار نہیں، لیکن تین متضاد باتیں اِن سطور میں ملتی ہیں رنگ رلیوں پر دفعہ ۱۴۴۔ عام محنت کا مطالبہ (روٹی کے لئے) اور (۳) آتم تیاگی

ہر عہد کا شاعر، شاعر کیا لیڈر تک اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اقتصادی ماحول کی سمپورنا نند جی سوشلسٹ ہیں اس لئے وہ اچھی طرح اِس اشارے کو سمجھ سکتے ہیں۔ اگر انقلاب ناقص ہے تو پیداوار ناقص ہوگی اور شاعر انقلاب بھی ناقص پیدا ہوگا یعنی اُس کے کلام اور اُس کی زندگی میں کوئی مطابقت نہ ہوگی۔ لیکن جب وقت انقلاب مکمل ہو گیا۔ شاعر بھی کامل پیدا ہوگا۔ یعنی اُس کی زندگی اور شاعری ایک ہوگی

اُردو شاعری پر بہتان

آگے چل کر اُردو شاعری کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :۔

اُردو شاعری نے کنول اور بھونرے کی جانب سے توبے رُخی برتی اور ایران کے گل و بلبل کو قبول کیا۔ حالانکہ نہ انھوں نے اور نہ اُن کے سننے والوں نے کبھی انھیں دیکھا ہے "

ہندوستان میں جہاں گوشت کی غذا کوئی لغو تخیال نہیں کی جاتی اور جہاں لوگوں نے اپنے بزرگوں کا سوم رس پینا چھوڑ دیا اور شراب کی مذمّت کی وہاں شاعروں نے شاہد و شراب اور قورمہ و کباب کے آدرش کو اپنے سامنے رکھا ہے "

" ایسی شاعری کتنی ہی میٹھی کیوں نہ ہو ہماری سوشل زندگی کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے وہ وسیع پیمانے پر ہر دلعزیز نہیں ہے بلکہ ایک ڈربے تک محدود ہے "

ان سطور کو جو شخص بھی پڑھے گا، اس کے دل کو تکلیف ہو گی ایک تو اس لئے کہ سمپورنانند جی کے الفاظ اور اسلوب ان کے شایانِ شان نہیں، دوسرے انھوں نے شدید غلط بیانی اور دلی نفرت انگیزی سے کام لیا ہے؛ تیسرے اس لئے کہ وہ اُردو شاعری کی اُس شاندار ترقی سے ناواقفِ محض معلوم ہوتے ہیں جو تھوڑے عرصہ ہی میں ہوئی ہے :

جو شخص اُردو شاعری کے بالپن سے واقف ہے، وہ اس تاریخی حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ پہلے پہل اردو شاعری اور اردو نثر پر بھاشا کا اثر پڑا، اور میر تک اس کے اثرات گہرے پائے جاتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ مسلم سلاطین کے دورانِ حکومت میں ایران اور ہندوستان کی سماجی آمیزش اور روز افزوں ربط و ضبط کی وجہ سے ایرانی کلچر کے اثرات اُردو شاعری پر زیادہ پڑے، لیکن جس عہد میں سمپورنانند جی اسکو ہم کر رہے ہیں اس عہد میں ممکن طور پر مقامی رنگ اُردو شاعری میں آچکا ہے۔ اور جہاں اُردو شاعری نے فلسفۂ و حکمت کی اونچی منزلوں پر اپنا آشیاں بنایا ہے وہیں سرسوتی بن کر جمنا اور کنول کے پھولوں سے کھیلتی ہوئی گنگنا رہی ہے ؎

دلِ مایوس کا عالم نہ پوچھو | کنول اک صبحدم مرجھا رہا ہے

کانوں میں بیلے کے جھمکے آنکھیں مِرگ کے چھونے | گورے رُخ پہ تل ہیں یا ہیں ہاگن کے دو بھونرے

کومل کومل اسکی کلائی جیسے کنول کے ڈنٹھل | نور سحر مستی میں اٹھائے جس کا بھیگا آنچل

فطرت کے میخانے کی وہ چلتی پھرتی بوتل!
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی

طوالت کے خوف سے کم کم مثالیں ہی دوں گا؛ ورنہ اُردو شاعری میں "کنول کے استعمال" پر بجائے خود ایک اچھا خاصہ رسالہ لکھا جا سکتا ہے۔

میں سمپورنانند جی کو بتانا چاہتا ہوں کہ اگر میں اردو شاعری کا تمام خزانہ اُن کے سامنے رکھ دوں تو اس کے جواہر کی جوت سے ان کی آنکھیں چوندھیا جائیں۔ یہ حیرت ناک بات ہے کہ اردو زبان کی خود بخود ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں ایسی اعلیٰ درجہ کی عشقیہ (شرنگار رس) اور حکیمانہ شاعری پیدا ہوتی چلی گئی، جو بننے والی ہندی زبان صدیوں پیدا کرنے سے معذور رہیگی؛ اس ثبوت کے لئے میں اس صحبت میں قدیم و جدید شعرائے کے وہ اشعار پیش کروں گا۔ اور اُن نظموں اور کتابوں کا ذکر کروں گا جن کے ذکر سے کم ازکم یہ ضرور ثابت ہو جائیگا کہ اردو شاعری قورمہ و کباب کا آدرش نہیں ہے اور جس ڈربے تک محدود ہے وہ اس درجہ یونیورسل ہے کہ خود اس میں سمپورنانند جی اور کل وہ متعصب دنیا سما سکتی ہے جو اسکو "قورمہ و کباب کا آدرش سمجھتی ہے "

اس حیثیت میں کہ مجھے اس تمام ہندو جنتا کا جس کے کان میں پجارن۔ جمنا۔ وطن، اور میرے ٹوٹے پھوٹے گیتوں کی بھنک پڑی ہے پریم حاصل ہے اس لئے میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو شاعری کے بارے میں یہ سمپورنانند جی کا اپنا ذاتی خیال ہے ورنہ ہندو قوم ہرگز اُردو شاعری کو قورمہ و کباب کا آدرش نہیں سمجھتی۔

کیوں کر سمجھ سکتی ہے ؟ کیا اُس نے سمپورنانند جی کی طرح اپنی بُدھی انڈین؛ دشمن میں غرق کر دی ہے۔ وہ جانتی ہے اُردو شاعری نے امیر خسرو کو پیدا کیا، نظیر اکبرآبادی اور میر و غالب پیدا کئے، آتش و مومن پیدا کئے، امیر و داغ پیدا کئے آتش و ناسخ پیدا کئے نسیم پیدا کیا۔ حالی و اسمٰعیل پیدا کئے۔ اکبر و یاس اور چکبست پیدا کئے اقبال و جوش

ایشیا ۲۳ مارچ ۱۹

پیدا کیے، اصغر و جگر پیدا کیے، سیماب و عزیز پیدا کیے ظفر علی خان و محروم پیدا کیے حسرت و فانی پیدا کیے، اختر و حفیظ پیدا کیے روش و احسان پیدا کیے اور مجاز و ملا پیدا کیے ——— !؟

اس غیر مرتب فہرست میں پرانے اور نئے، جوان اور بوڑھے، سب شریک ہیں، ان میں سے اکثر شعراء کے کلام کی مثالیں دے کر میں یہاں بتاؤں گا۔ کہ اردو شاعری قورمہ و کباب کا آدرش نہیں، بلکہ زندگی، انقلاب، آزادی، روحانیت اور اونچے سے اونچے آدرش کا آئینہ ہے اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اردو شاعروں نے اتنا ہی کام کیا ہے جس قدر کہ یہاں کے سیاسی لیڈروں نے۔

کیا یہ شاعری قورمہ و کباب کا آدرش (پیغام) ہے۔!؟

غالب:-

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　　ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

———

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

———

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے　　　یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

ہماری زبان میں مرزا غالب سمپورنانند جی سے شکایت کرتے ہیں ؎

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے　　　کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

———

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

———

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود　　　قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

———

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اسیرانِ وطن کی نمائندگی (یعنی سمپورنانند جی کی نمائندگی) قورمہ و کباب کا آدرش دینے والا شاعر اس طرح کرتا ہے ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی　　　یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں　　　ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا　　　جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

———

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر　　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

———

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل　　　کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

———

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　　آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

———

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے　　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

———

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ　　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

یہ چند شعر ادھر ادھر سے مجھے یاد تھے لیکن اردو فارسی میں غالبِ اعظم کا جو شاعرانہ مرتبہ ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ "شاہد و شراب" کے کس قدر اشعار غالب نے کہے تو میں عرض کروں گا کہ قورمہ و کباب زندگی کی ضروریات میں سے ہے اور خود شراب ہر قوم کی اعلیٰ سماج کے اجزائے تہذیبی میں سے ایک ضروری جزو رہی ہے۔ لہذا غالب جس ماحول کی مخلوق ہے۔ اس کے لحاظ سے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا جس طرح پرانے زمانے کے ہندی شعراء کے کلام میں اس قسم کی باتوں کو ہم کھوٹ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

اگر سمپورنانند جی کے کانوں تک میری آواز پہونچ سکے تو میں ان کے اس غیر ادبی اعتراض کا جواب غالب کے ہی الفاظ میں دوں گا۔ کہتا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سمپورنانند جی قورمہ و کباب و شراب، کا طعنہ دے کر شاید علمِ کلام کے مشہور و معروف اصول کو ٹھکرانا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ سنسکرت اور ہندی کی دیومالا، شاعری کے دامن کو ان برائیوں سے کیسے پاک کریں گے یا گیتا میں کرشن جی کی تعلیمات کا وہ مفہوم ہمیں باور کرانے کیلئے کس طرح مجبور کر سکتے ہیں جو وہ اور بڑے بڑے گیتا کے مفسرین پیش کرتے ہیں، کیا لفظوں کو ان کی روح سے جدا کر کے گیتا کی تعلیم خود غرضی، اور قتل و غارت گری کی محرک نہیں سمجھی جائے گی۔ !؟ ظاہر ہے

ایشیا دسمبر ۱۹۴۳ء

کہ گیتا کی روح کو سمجھنے کیلئے تشبیہاتی اور استعاراتی لوازمات کو تسلیم کرنا پڑیگا۔

خواہش کرا محقول پرستش دیا قرار کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

حالیؔ :-

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

اقبالؔ کی بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، شکوہ و جواب شکوہ اور ڈاکٹر سر اقبال کی تمام شاعری کی موجودگی میں کیا کسی معقول و منصف انسان کو ہمت بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اُردو شاعری کی اس درجہ توہین کرے جتنی سمپورنا نند جی نے کی ہے۔ جو زبان ان جواہرات سے لبریز ہو کہ ؎

آ تجھکو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے شمشیر و سنان اول طاؤس و رباب آخر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں کہ شاہیں کیلئے ذلّت ہے کارِ آشیاں بندی

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ جہاں وہ چاہئے مجھکو کہ ہو ابھی نوخیز

گو اُسکی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند

جو لوگ اُردو شاعری کو قورمہ و کباب کا آدرش سمجھتے ہیں ان کو اقبالؔ جواب دیتا ہے کہ ؎

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

اقبالؔ محض ان چند اشعار سے نہیں سمجھا جا سکتا جو از بر تھے وہ لکھدیئے وہ تو بڑی ہستی ہے۔ میں اگر اُردو شاعری کے کسی نوجوان نمائندہ ہی کو پیش کردوں تو سمپورنا نند جی لاجواب ہو سکتے ہیں؛ میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ اُردو شاعری آج جس بلند مقام پر پہونچ چکی ہے اس مقام تک تو تیر ہندی شاعری کو پہونچنے میں کم از کم ایک صدی صرف کرنا پڑے گی؛

ہم نے تقریباً ڈھائی صدی میں زبان کا ایک سانچہ بنایا اس کے بعد اُردو زبان میں وہ لوگ پیدا ہوئے جن کو اُردو شاعری کا جنم داتا کہا جا سکتا ہے۔ اور اُن کے بعد ہم اسی طرح ہندی کو بھی پہلے تجربے، اور اسلوب بنانے کی منزلوں سے گذریں گے۔ اول ہندی زبان بنے گی، پھر وہ برسوں میں ہندوستانی جنتا میں پھیلے گی۔ پھر لوگ اس کو بولیں گے۔ پھر اس کا ایک کلچر بنے گا؛ اس کے بعد اس کا ایک ایسا پیمانہ بنے گا جس میں نازک شاعرانہ خیالات نظم کئے جا سکیں۔

اس دوران میں عمل (Action.) اور ردِّ عمل (Reaction) ..... کیا تاریخ بناتا ہے یہ دیکھنا ہے یعنی جس طرح ہم فارسیت اور عربیت کو کامل طور پر ترک کر کے صاف اور آسان اسالیب اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں؛ اور سارے اجنبی تصوّرات اور غیر ملکی روایات کو چھوڑ کر ہمارا اُردو ادب اب خالص ہندوستانی ہو گیا ہے [1] اسی طرح میرا غلب خیال یہ ہے کہ سنسکرت آمیز ہندی زبان اور اس کی شاعری میں بھی (Reaction.) ردِّ عمل ہوگا؛ اس ردِّ عمل کے بعد کہیں ایک ایسا سانچہ بن سکے گا جس میں خیالوں اور آکاش بانی (الہام) کی مورتی اپنے سچے خد و خال کے ساتھ ڈھل سکے؛ اس ردِّ عمل کے بعد جو سانچہ بن سکے گا وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا جو اُردو کا سانچہ ہے؛

موجودہ ہندی شاعری جس کے بارے میں ہمارے صوبہ کے دماغی اور ذہنی تعلیم و تربیت کے سابق مجازی خدا، یہ الہامی فیصلہ فرماتے ہیں کہ وہ موجودہ یگ کی نمائندہ ہونے کی کوشش کر رہی ہے؛ ہمارے علم میں نہیں کہ اس نے کیا نمائندگی کی، مگر قورمہ و کباب کا آدرش دینے والی شاعری نے

---

[1] "ہندوستانی روایات اور اُردو شاعری"۔ اس عنوان پر میں بشرطِ فرصت جنوری ہی میں ایک مضمون پیش کرنے کی سعی کرونگا۔ ساغرؔ

ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

بلاشبہ نیشنلزم اور انقلاب کی نمائندگی کی ہے سنیئے ؎

جوش

چہرۂ امروز ہے میرے لئے ماہِ تمام خوفِ فردا ہے مری رنگین شریعت میں حرام
ڈال دونگا طرح نو اجمیر و ہریدوار میں پھونک دونگا کفر و ایماں کو دہکتی آگ میں
لوٹ دو گنگا کو اک مرکز پہ لانے کیلئے اک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کیلئے
ایک دن نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر ہندوستان

(مفرہ باب)

جوش نے اردو شاعری میں جس قدر نئے اور شاہکار نمونے پیش کئے، ان کی تعداد اتنی عظیم الشان ہے کہ اس مختصر مضمون میں اس کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مختلف اور لاتعداد شاندار نظموں میں اس کی ایک نظم کسان ہی ایسی کلاسیکل آئیڈل اور غیر فانی نظم ہے جس کے متعلق سپور نانند جی کو چیلنج کیا جا سکتا ہے کہ وہ والمیک اور کالیداس سے لیکر موجودہ زمانے کے تمام ہندی لٹریچر سے ایسی ایک نظم دنیا کے سامنے پیش کریں ورنہ قورمہ و کباب کا آدرش رکھنے والی شاعری کی عظمت کے قائل ہو جائیں۔

زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود مشعلِ گردوں بجھ جاتی ہے اک ہلکا سا دُھواں

یہ اور دوسرے اشعار میں غروبِ آفتاب کی نہایت باریک اور لطیف نقاشی کے بعد وہ اپنے موضوع کو اس شان سے پیش کرتا ہے ؎

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار کرتی ہے دریوزۂ تابش، کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر، تمدن کا چراغ
جس کی بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

شاعرانہ تعبیرات کے علاوہ وہ اس کے مقدس کاندھوں پر رکھے ہوئے ہل کے ۳۲ نام رکھتا ہے ؎

کون ہل ظلمت شکن، قندیلِ بزمِ آب و گل قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوشنما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پر جسکی چمن پرور شگوفوں کا نظام شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے البیلا زمیں
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی
طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ نازپرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشیدِ زرافشاں کا علم محنتِ پیہم کا پیماں، بخت کوشی کی قسم
جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ ماہ کا دل، مہرِ عالمتاب کا نورِ نگاہ
قلبِ [illegible] جس کی جوانی کا بہارِ روزگار جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق طیار کرتا ہے شراب اڑ کے جسکا رنگ بن جاتا ہے جانِ پرورِ گلاب
قلب آہن جسکے نقشِ پا ہوتا ہے رقیق شعلۂ [illegible] ہمدمِ تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں [illegible] رہتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جسکا مس [illegible] میں بنتا ہے اک جادو مبین
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمین

"کسان"

اس فن کارانہ کمال کے بعد کسان کو جاتا ہوا دکھا کر سرمایہ دارانہ نظام کی ہیبتناکیوں کو بیان کرتا ہے ؎

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں کی راہ فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے باربار گھر کی نا امید دیوی کا شبابِ سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائیگا بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منہ اترا ہوا
سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

دلسوز و دردناک مصوری کرنے کے بعد وہ سرمایہ داری کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
دیکھ کر تیرے ستم اے حامیٔ امن و اماں گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
ادعائے پیرویٔ دین و ایمان اور تو دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہلِ دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لئے بیتاب ہیں

"کسان"

کالج کے سپوتوں کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎

مرد کہتے ہیں اُسے لے مانگ چوٹی کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام

بغاوت، ہوشیار، ایک شہیدِ وطن کی یاد میں، مستقبل کے غلام، زمانہ بدلنے والا ہے، مستقبل، شکستِ زنداں کا خواب، علی گڑھ سے خطاب، مقتلِ کانپور، غدّار سے خطاب، خریدار نہ بن، زندہ مردے، رعبِ حکومت، دامِ فریب، ناخدا کہاں ہے، ضعیفہ، بوالعجبی، حیف اے ہندوستاں، بھوکا ہندوستان، بہتے ہوئے خون کی برادری، پیاسی ندی، بادشاہ کی سواری، سجّاد سے، دھمکی، بیدار کر، مردِ انقلاب کی آواز، شاعرِ ہندوستان، غرورِ ادب، دردِ مشترک یہ اور ایسی سینکڑوں نظمیں اپنے اندر نیشنلزم، انقلابِ زندگی، تعمیرِ قوم اور بیداری کی وہ روح رکھتی ہیں جنھوں نے قومی ارتقاء کی کامیابی میں شاندار امداد کی ہے۔

اُردو کے تمام شاعر، یعنی قورمہ کباب کا آدرش دینے والے تمام دہشت کوی ایک ایک ہندو مسلم، عیسائی سکھ، پارسی، گھر میں اپنا وہ آدرش پہونچا چکے ہیں جو جاگرتی اور کرانتی کا آدرش ہے۔ وہ جدّت، نئی زندگی اور انقلاب کے پیغامبر ہیں، ایک کہتا ہے ؎

کلاہِ خواجگیٔ کائنات کج کر کے
نیا زمانہ، نیا روزگار پیدا کر — جوشؔ

دوسرا کہتا ہے ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو — کاخِ امراء کے در و دیوار ہلادو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسّر ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

اقبالؔ

تیسرا کہتا ہے ؎

انگیٹھیاں ہوں بدستِ تبسم و نکہتِ گُل — کچھ اس طرح روشِ گلستاں بدل ڈالو
حیات کوئی کہانی نہیں حقیقت ہے — اس ایک لفظ سے کل داستاں بدل ڈالو

شاعرؔ

یہی قورمہ و کباب کا آدرش پہونچانیوالا اپنے بیٹے سجّاد کو وصیت کرتا ہے کہ ؎

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کیلئے
سرکٹانا ہند کو آزاد کرنے کیلئے
باپ کی سوتی ہوئی قسمت جگانے کیلئے — قبر پر دو پھول لے آنا چڑھانے کیلئے
باغِ ہستی کے نہ وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
مژدۂ آزادیٔ ہندوستاں کے پھول ہوں — جوشؔ

جن لوگوں کو سمپورنانند جی قورمہ و کباب کا پیامی کہتے ہیں، وہ اُن منافق وطن پرستوں سے بہت بلند ہیں جو دیش پریم کو بھی اپنی جاگیر خیال کرتے ہیں۔ اور اپنا من مانا ملک بنانا چاہتے ہیں، جو تنگ دل ہیں، تنگ نظر ہیں۔ اپنی لیڈری کے زعم میں ہر شخص کو کچل کر گذرنے کیلئے پُل بنانا چاہتے ہیں۔ جو مُردہ اور دفن شدہ روایات کی ہڈیوں کو نکال کر ایک نیا، تہذیب کا عجائب خانہ سجانا چاہتے ہیں، مگر ہم ہر بات سے آزاد ہو کر ایک نو تعمیر آزاد بھارت کی خاطر اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہیں کہ ہند کو آزاد کرانے کیلئے سر کٹادینا۔ ہم مرنے کے بعد بھی جنت کو ٹھکرا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

نغمۂ ہندوستاں گونجے گا سازِ عرش تک
چوٹیاں ہونگی ہمالہ کی فرازِ عرش تک — ساغرؔ

اس شعر میں وہ لامحدود جرأت ہے جو سمپورنانند جی کی تنگ دلی کے جواب میں پیش کی جاسکتی ہے۔

موجودہ اُردو شاعری، حکیمانہ خیالات، اعلیٰ اور پاکیزہ جذبات گہرے تاثرات، اونچے محسوسات، کومل اور مدھر تصورات اور دہکتی ہوئی انقلابی روح کا ایک بھڑکتا ہوا ام شعلہ ہے، اب اس درجہ پر نہیں کہ آپ اس کے اثرات کو دبادیں۔

وہ گرم دوپہر کا سورج ہے، وہ پورن ماشی کا چاند ہے، جس کی کرنوں سے بچ نکلنا انسانی بس کی بات نہیں۔ وہ ایک چمکتی ہوئی تقدیر جو ہر سوتی کے ماتھے پر سورج بن کر چمک رہی ہے۔

کرانتی اور جوش کا سیلاب اگر نہ دیکھا ہو تو دیکھئے ؎

شاعر کی محبوبہ شاعر سے کہتی ہے۔

تمہارے دل پہ تحیر کی کیوں حکومت ہے،
تمہارے دل پہ تحسّر کی کیوں حکومت ہے،
تمہارے دل پہ تفکر کی کیوں حکومت ہے،
تمہارے دل پہ تغیر کی کیوں حکومت ہے،

تمہارے دل پہ مراراج کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر جواب دیتا ہے :-

یہ شہر یار کے بازار اور یہ جنسِ لطیف
بسورتے ہوئے چہرے یہ جسم ہائے نحیف
کوئی بنی ٹھنی بیٹھی ہے اور کوئی کثیف
رذیل جنکو سمجھتے ہیں عاشقانِ شریف

سیاہ کارو مد تنغ [?] سماج کی مخلوق
یہ فتنہ کار ددنی سامراج کی مخلوق

ساغر

سماج اور سامراج یہ دونوں سنسکرت کے الفاظ ہیں، لیکن سنسکرت نہیں معلوم ہوتے، یہ ہندوستانی کے اُس اسٹائل کا کمال ہے جس کے متعلق "سمپورنانند جی" ریڈیو سے شاکی ہیں کہ "ہندو تہواروں تک کے موقع پر ایسی زبان کو سننا پڑتا ہے جو عربی اور فارسی کے لفظوں سے بھری ہوئی ہوتی ہے" اور سنئے ؎

محبوبہ کو جواب دیتے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎

یہ دوپہر، یہ کڑی دھوپ اور یہ سناٹا
ہتوڑی ہاتھ میں ہے اور اجیر دوشیزہ
ہے ڈھیر چاروں طرف پتھروں کے ٹکڑوں کا
خمارِ خواب سے کھاتے ہیں ہاتھ جب جھونکا

نگاہِ قہر وہیں آنکھ کھول دیتی ہے
غریب نیند میں موتی سے رولیتی ہے

یہ راہ راہ یتیم اور گلی گلی بیوہ
یہ موڑ موڑ پہ بوڑھی بھکارنوں کی صدا
یہ بام بام جوانی وحُسن کا سودا
یہ ہر قدم پہ جنازہ وقارِ عورت کا

یہ دل گداز مناظر مٹا گئے مجھ کو
تمام رازِ محبت بتا گئے مجھ کو

ساغر

میں اردو زبان کا ایک معمولی شاعر ہوں لیکن "قورمہ و کباب" کا اس طرح آدرش دیتا ہوں :-

محبوبہ کہتی ہے ؎

مدام سایہ فگن تھا جو نوجوانوں پر
جو برق بن کے چمکتا تھا گلستانوں پر
نقوش ثبت ہیں جسکے ابھی زمانوں پر
ستارے جس سے سلگتے تھے آسمانوں پر

وہ تند شعلۂ آواز کیوں نہیں شاعر!؟

شاعر جواب دیتا ہے ؎

حیات بے بس و تنہا مری نظر میں نہ تھی — نحیف آہِ شررزا مری نظر میں نہ تھی
کراہتی ہوئی دنیا مری نظر میں نہ تھی — یہ پیر زال، یہ بیوہ مری نظر میں نہ تھی
سُنے نہ تھے کبھی مزدور حُسن کے نغمے!
مرے خیال میں بھی فاقہ کش کے گیت نہ تھے
کہیں ہے بارشِ دولت کہیں غموں کی اوس — یہ عشرتیں یہ مسرت یہ قصرِ جنت بوس
یہ جھونپڑوں میں کسانوں کی انتڑیوں کی مروڑ — یہ ہے نظامِ جہاں میں خدا نہیں افسوس
نہیں ستارے نہیں خاک ہی کو بھڑکا دے
مری نوا سے امیروں کے دل ہی سلگا دے — ساغر

جب طلائی رنگ سکوں کو نچایا جائیگا — جب مری غیرت کو دولت سے لڑایا جائیگا
جب رگِ افلاس کو میری دبایا جائیگا
اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤنگا
اور اپنے پاؤں سے انبارِ زر ٹھکراؤنگا

(۲)

حکمِ آخر قتل گہ میں جب سنایا جائیگا — جب مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائیگا
جب یکایک تختۂ خونیں ہٹایا جائیگا
اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤنگا
عہد کرتا ہوں کہ میں تجھ پر فدا ہو جاؤنگا — ساغر

ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

قورمہ وکباب کا آدرش دینے والی شاعری اس طرح انقلاب کا فرمان جاری کرتی ہے:۔

اٹھو اور اُٹھ کے نظامِ جہاں بدل ڈالو — یہ آسماں، یہ زمیں یہ مکاں بدل ڈالو
انگیٹھیاں ہوں بدستِ نسیم و نکہتِ گل — کچھ اس طرح روشِ گلستاں بدل ڈالو
حیات کوئی کہانی نہیں حقیقت ہے — اس ایک لفظ سے کل داستاں بدل ڈالو
بہا کے شیب کی رگ میں بھرو شباب کا خون — دلِ ضعیف سے قلبِ جواں بدل ڈالو
نظامِ قافلہ بدلا تو کیا کمال کیا — مزاجِ راہبرِ کارواں بدل ڈالو

ہر ایک ذرّہ سے پیدا کرو نئی دُنیا
نئے جہاں سے پُرانا جہاں بدل ڈالو — ساغر

"نیا پجاری"

وطن وہ وطن وہ مہکتا شوالہ — وہ راحت کا مندر محبت کا کعبہ
خطیبِ ہمالہ کا زرکار منبر — وہ گنگا کی گودی، وہ جمنا کا جھولا
وہ مندر ہے میرا وطن جس کے اندر — ہزاروں خدا ہیں تو لاکھوں کلیسا

مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری — ساغر

حکیمانہ تصورات اور خیالات کے اظہار میں اُس نے جو کمال حاصل کیا ہے اس کی مثال ذیل کی رباعیات سے کیجئے ؎

جوشؔ کہتا ہے ؎

یہ بزمِ گہِ عمل ہے بے نغمہ و صوت — اس دائرہ میں ولولۂ روح ہے فوت
یکسانی رنگی و یکسانی اسلوبِ حیات — دراصل ہے ایک سانس لیتی ہوئی موت[ل]

وجودِ باری تعالیٰ (ایشور) کے متعلق کہتا ہے ؎

ہنسنا بھی عجیب شے ہے رونا بھی عجیب — پانا بھی ہے طرفہ بات کھونا بھی عجیب
ایک قادرِ مطلق کا بہ اوصافِ حسن — ہونا بھی عجیب ہے، نہ ہونا بھی عجیب

نومیدیٔ نظارۂ انوار بھی جہل — اُمیدِ شہود و شوقِ دیدار بھی جہل
اک قادرِ مطلق کا جہاں تک ہے سوال — انکار بھی جہل ہے اور اقرار بھی جہل

ان حقائق کو مہاتما گوتم بُدھ نے بھی اس طرح نہیں کہا تھا جس طرح جوشؔ نے بیان کیا؛ وہ اپنی "تشکیک" (Sinbhaf) کو جہل سے تعبیر نہ کر سکے، بھگوان تھے نا!؟

ہر عہد کا ادب اپنے ماحول کا عکس ہوتا ہے اور ہر ادیب و شاعر اپنے زمانہ کے اخلاق، و روایات کی تصویر۔ چنانچہ قدیم غزل کی شاعری میں اگر شعراء، الم پرست (نراشاوادی) تھے تو اُس کی بنا اسلام اور اسلامی تمدن و حکومت کی پستی و تباہی تھی اور اس تباہی کی اصل وجہ وہ منفعل روحانی تخیل جو تصوّف کے نام پر صوفیا نے مسلمانوں پر مسلّط کر دیا تھا۔

یہ سادہ ہوسنت بھی دراصل (Feudalism. جاگیردارانہ نظام) کا ردِ عمل تھے؛ اور مسلمانوں کی عام یاس پرستی انکی تعلیمات کا نتیجہ۔

لیکن اقبالؔ اور دوسرے شعراء حالیہ نے اُردو شاعری کو یاس انگیز داخلیت سے یکسر آزاد کر دیا؛ ذیل کی مثالوں سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے ؎

ہر بات پہ منہ ترا اُتر تا کیوں ہے؟ — جینے کیلئے بنا ہے مرتا کیوں ہے؟
کونین کے ساتھ کھیل اے طفلِ حیات! — کونین خود اک کھیل ہے ڈرتا کیوں ہے؟

جوشؔ

اُردو شعراء نے ہندوستانی قوم کو موت سے دست و گریباں ہونے کی تعلیم دے کر ان کی نڈھال اور نراش زندگی کو طاقت اور شگفتگی دی ہے جو سیاست دانوں کے بس کی بات نہ تھی۔

ہاں مرگ و حیات کے سمجھتا ہوں میں راز — آغاز انجام ہے تو انجام آغاز
دیتا ہے زمانہ جب اجل کی دھمکی — دل سے آتی ہے قہقہوں کی آواز

جوشؔ

ہندوستانی ذہنیت کو تبدیل کرنے میں اُردو زبان کے مشہور اور اعلیٰ شاعروں نے جو خدمات انجام دی ہیں، سمپورنانند جی ان سے انکار نہیں کر سکتے۔ اُردو شاعری نے ہندوستانی سماج کے بنانے میں وہی حصہ لیا ہے جو کسی ترقی کرنے والے ملک کا ساہتیہ (ادب) لیا کرتا ہے۔

جس ڈربہ تک بقول سمپورنانند جی یہ محدود ہے اس ڈربے کی لمبائی چوڑائی جوشؔ کے ان چار مصرعوں میں ملاحظہ فرمائیے ؎

پھولوں کی اگر ہوس ہے خاروں کو نہ دیکھ — عشرت کی ہے دُھن تو سوگواروں کو نہ دیکھ
تعمیرِ حیات ہے اگر پیشِ نظر — مر کر بھی مٹے ہوئے مزاروں کو نہ دیکھ

(جوشؔ)

ل (Monotony of life.)

ایشیا دسمبر ۱۹۴۲ء

تعبیر نہیں ہے عصر سے تو ہے تیرے وجود سے زمانہ

بجلی جو گری تو غم نہ کیجئے سو بار بنے گا آشیانہ

پرواز کرلے اسیرِ گلشن ہر شاخ ہے تیرا آشیانہ

ساغر

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا دنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا

قوت حاصل کر اور مولیٰ بن جا معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا

یہ دور بانشتار (آدمیت) سے شروع ہو کر معبودیت (ایشورتا) تک وسیع ہے، اُردو شاعری نے انسان کی 'خودی' کو لامحدود کردیا ہے اس پر بھی اگر ہمارے سوشلسٹ لیڈر کو یہ شاعری قورمہ کباب والی شاعری نظر آتی ہے تو یہ ان کا انتہائی خطرناک تعصب ہے۔ جو ان کے ترقی یافتہ اور سوشلسٹ ہونے کی تردید کرتا ہے ؟

ایک خاص نکتہ

اصل میں اُردو شاعری نے انہیں اجزا اور عناصر کو قبول یا اختیار کیا جو ترقی یافتہ اور زندہ زبانوں یا اُن السنہ کے ترقی یافتہ ادب کی جان تھے ؟ معلوم ہوتا ہے کہ سمپورنانند جی اور ان کے ہم خیال ہندوستانی شاعری اور واحد قومی زبان میں سنسکرت عناصر کی بھرمار چاہتے ہیں کیا اس بھرمار سے کوئی ترقی یافتہ زبان پیدا ہو سکتی ہے ! ؟

میرا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ جس زبان کو ہندی کے بجاری رائج کرنا چاہتے ہیں اس میں ہرگز وہ وسعتیں پیدا نہیں کی جا سکتی جو زندہ اور کارآمد زبان کے لئے لازمی اور ضروری ہیں ؟ ہندی کے لئے سنسکرت کو سرچشمہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ خود سنسکرت ہزار ہا سال سے مردہ زبان چلی آرہی ہے۔ اس دوران میں انسانی سماج نے جو کچھ ترقی کی ہے اور زبانوں میں جن ذخیروں کا اضافہ ہوا ہے اُن سے سنسکرت یکسر محروم ہے ؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی زبان کو سرچشمہ بنا کر جس کی ناداری کسی دلیل کی محتاج نہیں کیوں کر کوئی اچھی کارآمد اور قابلِ قبول زبان کہی جا سکتی ہے۔

پہلے سنسکرت کو آپ اس معیار تک پہونچانے کی کوشش کیجئے جو دورِ حاضر کی ضرورت کے مطابق ہو؛ اس کے بعد کہیں آپکو یہ حق ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی زبان کی تعمیر سنسکرت کے ستونوں پر قائم کی جائے ؟

انقلابی تصورات اور اُردو شاعری

کیا سمپورنانند جی یہ بتا سکتے ہیں کہ جنگ کے سلسلے میں حکومتِ ہند نے کتنے ہندی شعراء کی کتابیں اور نظمیں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے سلسلے میں ضبط کیں ــــــ ! ؟ کیا وہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ ہندی شاعروں میں سے کسی ایک شخص نے بھی کوئی ایسی نظم کہی جو نیشلزم اور دُنیا کی ادبی تاریخ میں یادگار رہیگی۔ اگر مذکورہ نظم کی پیشگوئی کے مطابق اس جنگ کا خاتمہ ہوا تو اس نسل کے نہیں لیکن دوسری نسل کے ہندوستانی جس شخص کا اسٹیچو گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے بنائیں گے۔ وہ ایک اُردو شاعر ہی ہوگا اور آج بھی وہ نظم اگر "جنتا" کے کھلے جلسے میں پڑھی جائے تو میں چیلنج کرتا ہوں کہ اس کے تیز اور دہکے ہوئے انگارے ہر آتما کی انگیٹھی کو دہکا کر جہنم بنا دے سکتے ہیں۔ اسوقت میں سمپورنانند جی کو بتا سکتا ہوں کہ اُردو شاعری کو کیا ہردلعزیزی حاصل ہے۔

شہروں اور تحصیلوں ہی میں نہیں، ہم اپنی انقلابی اسپرٹ، کسانوں اور مزدوروں کے سنسان اور ستم رسیدہ دلوں تک پہونچا چکے ہیں آج کشمیر کی پہاڑیوں سے راس کماری تک اس کا ڈنکا بج رہا ہے ؟ اس کی ہردلعزیزی کی گونج ملک کے گوشہ گوشہ اور کونے کونے میں اپنا جھنڈا اگاڑ چکی ہے۔

سیّد مطلبی فریدآبادی کی دیہاتی بولی کی کوتائیں جس شخص نے سُنی یا پڑھی ہیں، وہ تسلیم کریگا کہ یہ کام بھی ہم نے ہی کیا ہے۔ اور اس کا سہرا بھی کہ دیہات میں انقلاب اور دلکش پریم کا پیغام پہونچائیں ہمارے ہی سر ہے ؎

اس نظم "کسان بکھا" کے دیباچہ میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"پوری کتاب خالص دیہاتی زبان میں ہے، نئی ہندی کے حامی جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے یہ زبان اس لئے اختیار کی ہے کہ ہماری آواز دیہاتوں تک پہونچے وہ اسے پڑھیں اور دیکھیں کہ ان کی ہندی نہ دیہاتوں کی زبان ہے نہ شہریوں کی" (باقی)

ساغر

ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء

متحدہ آزاد ہندوستان کا دستور

سوال نامہ آل پارٹیز آزاد مسلم کانفرنس اور اس کے جوابات

از۔ ساغر

سوالات

نمبر ۱۔ اس لحاظ سے کہ ہندو مسلمان اور ہندوستان کے دوسرے باشندے زاید از ایک ہزار سال ایک دوسرے کے ساتھ مختلف حالات میں رہتے چلے آئے ہیں، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام ملک کے لئے ایک ایسا طرزِ حکومت تشکیل دیا جائے جس کے تحت ملک کو وہی آزادی اور کامل اقتدار حاصل ہو جو دنیا کے دوسرے آزاد ممالک کو حاصل ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ تمام باشندگانِ ہند خواہ اُن کے سیاسی اور مذہبی معتقدات کچھ بھی ہوں ملک کے تمام ذرائع و وسائل میں برابر کے حقدار ہوں گے، اور زندگی کے ہر شعبے میں انہیں شہریت کے مساویانہ اور مکمل حقوق حاصل ہوں؟

نمبر ۲۔ کیا آپ ضروری سمجھتے ہیں کہ دستورِ اساسی میں مساوی حقوق کے سلسلے میں مذہبی جماعتوں کے مخصوص حقوق کا جداگانہ باب شامل کیا جائے خواہ ان حقوق کا تعلق کل ہندوستان یا اُس کے کسی حصہ میں رہنے والی اقلیت کے ساتھ ہو یا اکثریت کے؟

نمبر ۳ (الف) آپ کی نزدیک بنیادی حقوق میں مسلمانوں کے لئے کس قسم کے مذہبی حقوق شامل کئے جائیں۔

(ب) اس قسم کے حقوق کے (۱) تعین اور (۲) ان کے منصفانہ فیصلے کے لئے آپ کی رائے میں کس قسم کا سیاسی عدالتی انتظام ہونا چاہئے۔

جوابات

نمبر ۱ یقیناً ایک ایسا طرزِ حکومت ہی نہیں، بلکہ ہم ایک ایسی کامل آزاد ریاست کا قیام ضروری سمجھتے ہیں جس میں ملک کے سکھ، پارسی، عیسائی اور ہندو مسلم عوام کو مکمل آزادی اور اقتدار حاصل ہو۔
سوال کے دیگر اجزا سے اتفاق ہے۔

نمبر ۲ "بنیادی حقوق" کی بیرہ واضح شقوں کے بعد مساوی حقوق کے سلسلے میں مذہبی جماعتوں کے مخصوص حقوق کا جداگانہ باب شامل کرنے کی میرے نزدیک کوئی ضرورت نہیں، جب تک کہ مذہبی حقوق کی وضاحت نہ ہو لیکن مخصوص حقوق سے اگر آپ کی مراد بعض ایسے نزاعی مسائل مثلاً گائے کی قربانی یا عام شاہراہوں پر ذبیحہ گاؤ کا انسداد، مسجد کے آگے باجہ بجانے کا استرداد، مذہبی جلوس نکالنے کی آزادی، یعنی رواجی و رسمی تقریبات مذہبی اور اسی قسم کے مسائل سے ہے تو خیرا محض احتیاطی، در اندفاعی طور پر مخصوص حقوق کے جداگانہ باب شامل کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ مگر یقیناً یہ بات ہر اقلیت اور اکثریت کے مخصوص حقوق سے مساوی طور پر متعلق ہونا چاہئے۔

نمبر ۳ (الف) بنیادی حقوق نمبر ۳ اور نمبر ۴ میں وہ تمام مذہبی حقوق ضبطِ تحریر میں آگئے ہیں۔ جو مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے تمام جزئیات پر حاوی ہیں۔ یہاں تک کہ اوقاف اور خیراتی اداروں کی حفاظت کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن اوقاف اور خیراتی اداروں کے تجزیہ اور احتساب

سوالات

نمبر۴ (الف) عام شہریت کے سلسلے میں فرقوں اور افراد کے بنیادی حقوق میں آپ کیا سیاسی، اقتصادی، تمدنی (کلچرل) اور معاشرتی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

(ب) آپ کے نزدیک ان حقوق کے تحفظ کے لئے کیا آئینی یا عملی ذریعہ یا کارروائی اختیار کی جائے؟

نمبر۵ - مثلاً کیا آپ مذکورہ بالا تمام مسائل کے سلسلہ میں حسب ذیل امور کو شامل کریں گے؟

(الف) کسی فرقہ، گروہ یا جماعت کو حق نہ ہوگا کہ وہ تمام ملک یا اس کے کسی حصہ یا وسائل کو اپنی خصوصی ملکیت بنائے، اور ملک کا دستور اساسی وفاقی ہوگا نہ کہ وحدانی، اور صوبہ یا وفاقی حصہ یا ریاستیں تمام معاملات میں مکمل طور پر خود مختار ہوں گی، اور وفاقی مرکز خود مختار صوبوں کی طرف سے صرف ان اختیارات کا حامل ہوگا جو سب صوبوں کے مشترکہ مفاد سے تعلق رکھتے ہوں، اور یہ کہ ان وفاقی مضامین کی ایک فہرست طے شدہ تیار ہونی چاہئے۔ مثلاً امور خارجہ، مواصلات، محاصل بحری، بندرگاہیں، ساحلی علاقوں کا محفوظ علاقہ، روشنی کے رہنما مینار وغیرہ وغیرہ کی۔

(ب) نہ تو وفاقی حکومت کا اور نہ صوبوں کی حکومت کا کوئی مذہب بہ حیثیت حکومت کے ہوگا، اور نہ حکومت کی طرف سے کسی خاص فرقے کی جماعتوں یا ملتوں کو سرکاری خزانے سے کوئی امداد یا وظیفہ دیا جائیگا لیکن اگر کسی فرقہ کے نمائندوں کی ۵۰ فی صدی کی اکثریت اپنے فرقے کے کسی خاص مذہبی جماعت یا تحریک کی امداد یا انتظام کے لئے کوئی خاص ٹیکس لگانا چاہے تو وفاقی یا صوبوں کی حکومت اس فرقے کے لئے ایک قانونی وقف کی تشکیل کے لئے قانون بنا سکتی ہے اور وقف کے لئے ٹیکس وصول کرنے میں امداد بھی دے سکتی ہے یا آپ اس کے علاوہ کوئی اور دوسری صورت تجویز کرتے ہیں؟

(ج) بنیادی حقوق کی منشا کی تکمیل کے لئے تمام ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، خواہ ان کی اپنی اندرونی تقسیم کسی قسم کی ہو، ان میں سے ہر ایک، ایک ہی مذہبی فرقہ شمار ہوں گے، اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ اپنے بنیادی مذہبی اعتقاد کی مناسبت سے

جوابات

کی سخت ضرورت ہے، برٹش حکومت کوئی اسلامی یا قومی حکومت نہیں ہے، وہ صاحبان وقف اور ادارہ ہائے خیراتی کے کارکنوں کے طرز عمل پر نگاہ احتساب نہیں ڈال سکی۔ چنانچہ بہ آسانی یہ بتایا جاسکتا ہے کہ صاحبان وقف وغیرہ اوقاف کی آمدنیوں سے ذاتی کاروبار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ناجائز ذاتی مصرف سے بھی گریز نہیں کرتے لیکن بہرحال اس سوال کے پس منظر میں اگر یہ اشارہ پوشیدہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی حقوق:-

(۱) وراثت (۲) نکاح و خلع (۳) زکوٰۃ (۴) اوقاف وغیرہ کو "مخصوص مذہبی حقوق" کی حیثیت دی جائے اور اس قسم کے حقوق کے

(ب) (۱) تعین کا حق علمائے مذہب کے سپرد کیا جائے (جیسا کہ دینی طور پر اب بھی ان امور پر علمائے کرام ہی کا کنٹرول ہے) تو غالباً ایک حد تک یہ کوئی غلط اقدام نہ ہوگا۔ لیکن

(۲) ان مخصوص حقوق کے منصفانہ فیصلے کے لئے اگر مذہبی عدالتیں قائم کی جائیں گی تو یہ عجیب قسم کا تضاد ہوگا۔ اس لئے کہ تعین کے عامل بھی علماء ہوں گے اور قاضی بھی علماء!؟ دراصل تعین کا حق ان علمائے اسلام کے ایک بورڈ کو ہونا چاہئے جن کو قومی حکومت متعین کرے اور فیصلہ کا حق عام قومی عدالتوں کو۔

اس قسم کے حقوق متعین کرنے کا حق ان علمائے مذہب کو ہونا چاہیئے جو اسلامی شریعت کے ماہر بھی ہوں اور جن کا سیاسی شعور بھی مکمل ہو۔

نمبر۴ (الف) گو بنیادی حقوق میں زبان، تعلیم اور رسم الخط کی گارنٹی موجود ہے لیکن اردو زبان کا مسئلہ مسلمانوں میں شدید اہمیت اختیار کر چکا ہے، اگرچہ عوام کے دعووں میں غیر منطقی عناصر زیادہ ہیں لیکن مسلمانوں کی عام رائے یہی ہے کہ زبان اور رسم الخط کے تحفظ کی دستور میں زبردست گارنٹی موجود ہو۔

(ب) میرے نزدیک ہندوستان کے ہر اقلیتی و اکثریتی صوبہ میں عدالت اور جملہ صوبائی حکومتوں کے کاغذات و فارم قانونی طور پر علاوہ مقامی زبان کے اردو رسم الخط میں بھی ہونے چاہئیں۔ ہندوستان اپنی وسعت مختلف النسل، مختلف العقیدہ اور مختلف آب و ہوا اور صوبوں کی تقسیم کے لحاظ سے ایک شاندار انٹرنیشنل اجتماع کے مماثل ہے تو جس طرح ایک

سوالات

علیحدہ فرقے شمار ہوں گے۔

(د) بنیادی حقوق میں حسبِ ذیل امور شامل ہوں گے۔

(۱) اجتماع اور انجمن بنانے کی آزادی۔

(۲) تقریر و تحریر اور صحافت کی آزادی۔

(۳) ضمیر کی آزادی اور مذہبی معتقدات اور ان پر عمل کرنے کی آزادی

(۴) پرسنل لاز۔ تمدن، زبان، تعلیم، رسم الخط، معابد، قبرستان، اوقاف اور خیراتی اداروں کی حفاظت۔

(۵) بلا امتیاز صنف تمام شہریوں کے حقوق اور ذمہ داریاں یکساں ہوں گی۔

(۶) کسی شہری کو اس کے مذہب، فرقہ معتقدات یا صنف کی وجہ سے سرکاری ملازمت، اقتدار یا اعزازی عہدے کے لئے کسی تجارت اور پیشہ میں کام کرنے میں کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔

(۷) تمام شہریوں کو پبلک سڑکوں، کنوؤں، مدرسوں، تمام تفریح گاہوں اور دوسرے پبلک اداروں کے استعمال کے لئے مساویانہ حقوق حاصل ہوں گے۔

(۸) خاص قواعد و ضوابط کے ماتحت جو شہریوں کے لئے یکساں ہونگے ہر شخص کو اسلحہ رکھنے اور لے کر چلنے پھرنے کا حق ہوگا

(۹) کسی حالت میں کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم نہ کیا جائے گا نہ اس کے مکان یا جائداد میں مداخلت کی جائے گی نہ اس کو اس سے بیدخل کیا جائیگا اور نہ اسے ضبط کیا جاسکے گا (بجز اس کے کہ قانون اس کی اجازت دیتا ہو)

(۱۰) ہر بالغ کو حقِ رائے دہی حاصل ہوگا۔

(۱۱) ابتدائی تعلیم مفت ہوگی۔

(۱۲) ہر قسم کے مزدوروں کے لئے کم از کم مقررہ مزدوری جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہے، کارخانوں میں کم کام کے مقررہ گھنٹے۔ کام کرنے کے لئے اچھا ماحول، بڑھاپا، بیماری اور بیکاری کے اقتصادی نتائج سے بچنے کی صورتیں۔

(۱۳) حکومت اس امر کی ضامن ہوگی کہ کوئی شہری بے روزگار نہیں رہیگا۔ لیکن اگر وہ بے کار رہے (بجز اس صورت کے کہ وہ خود کام کرنے سے

جوابات

بین الاقوامی زبان (انگریزی) ملک کے ہر گوشے میں اظہار و بیان اور تقریر و تحریر کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دوسرے نمبر پر صرف اردو (ہندوستانی) ہی ایک ایسی زبان ہے جو کشمیر سے لے کر راس کماری تک کسی نہ کسی شکل میں اظہار و بیان کی بین الاقوامی ضرورتیں پوری کرتی ہے اور اس میں قومی ضرورتیں کو پورا کرنے کی زیادہ اہلیت موجود ہے۔

کلچرل حقوق کے سلسلے میں میں تجویز کروں گا کہ ہر صوبائی زبان کے ساتھ ہندوستانی کو لازمی قرار دیا جائے اور آزاد ہندوستان کی زبان اردو (ہندوستانی) ہی قرار دی جائے مرکزی وفاقی حکومت کا محکمۂ خارجہ کا کام تو انگریزی زبان میں ہوسکتا ہے لیکن امورِ داخلی تمام تر اردو زبان میں طے پانے چاہئیں۔

تشریح :- (اردو زبان سے میری مراد وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں ہر فرقہ کی مادری زبان ہے اور بول چال کا ذریعہ بنی ہوئی ہے) صوبوں اور مرکزی حکومتوں کی سرپرستی زبان کے مسئلے کے حل کا باعث ہو سکتی ہے لازمی طور پر اس سرپرستی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپس میں زبان کے جو جھگڑے پیدا ہوگئے ہیں وہ ختم ہو جائیں گے، اور ایک مشترکہ زبان تمام ہندوستان میں ترویج پا جائے گی۔

فیڈرل گورنمنٹ کو مستقل طور پر اظہار و بیان کا ذریعہ (ہندوستانی) اور رسم الخط میں فارسی اور ناگری رسم الخط کو بنانا چاہئے اور صوبائی حکومتوں کو اپنی اپنی زبان کی سرپرستی کرنی چاہئے اور ساتھ ہی اردو (ہندوستانی) کی سرپرستی کا فرض ادا کرنا چاہئے۔

نمبر ۵ (الف) بلاشک میں مندرجۂ ذیل امور کو مندرجۂ بالا امور میں شامل کرنے کے حق میں ہوں اور مجھے کلی طور پر ان سے اتفاق ہے، لیکن وفاقی دستور میں حکومت پاکستان خالصہ ستان۔ ڈراوڈر استان کے تخیل سے بالکل پاک و صاف ہونی چاہئے۔

(ب) بلاشک متصورہ قومی حکومت کا بہ حیثیت حکومت کوئی مذہب نہیں ہونا چاہئے۔ ہر قسم کی فرقہ پرستی سے اس حکومت کو محفوظ ہونا چاہئے وظائف ہی نہیں، کوئی ایسا جزیہ، معرضِ عمل میں نہیں آنا چاہئے جس میں قدیم روایتی جھلک پائی جاتی ہو۔

سوالات

انکار کردے) تو اُس کو حکومت کی جانب سے بقدرِ کفاف گذارہ دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ حکومت اس امر کی بھی ضامن ہوگی کہ وہ تمام شہریوں کو جو بوجہ ضعیفی یا قدرتی معذوری کام کرنے کے ناقابل ہوں بقدر کفاف گذارہ دے۔

(ھ) ایمان، مذہبی معتقدات اور مذہبی اعمال، پرسنل لاز، زبان، رسم الخط، تمدن (کلچر) اور تبلیغ کے سلسلے میں تمام فرقے آزاد اور خود مختار ہوں گے اور افراد کو مذہب بدلنے اور اُس کا اعلان کرنے کی ممانعت نہ ہوگی اور کسی شخص کو اس کی سزا نہ دی جائے گی کہ اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا ہے، اور کسی شخص کو خاص مذہبی عمل اور مخصوص طریق معاشرت اختیار کرنے پر ناجائز دباؤ ڈال کر مجبور نہ کیا جائیگا۔

(و) وفاقی یا صوبائی حکومتوں یا مقامی نیم حکومتی اداروں مثلاً میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، پورٹ ٹرسٹ وغیرہ کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ کسی مذہبی ادارے یا عبادت گاہ یا قبرستان، یا مرگھٹ کے قائم شدہ معاملات میں دخل اندازی کرے (خواہ ان کا انتظام حکومت کے زیرِ نگرانی ہو یا نجی طور پر) نہ مذہبی عوامی رسوم میں حکومتی اداروں کو دخل اندازی کا حق ہوگا۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ ہر شخص اپنے حقوق کو بغیر کسی مداخلت اور مزاحمت استعمال کر سکے۔

(ز) کوئی جائداد موقوفہ یا جو الیشور دیوتاؤں کے نام پر وقف اللہ کی گئی ہو، کسی حالت میں بھی (باوجود کسی قانون انتقال، قانون تمادی، قانون ضبطی یا اور کسی وجہ کے) کسی ایسی غرض کے لئے استعمال نہ کی جائے گی جس کے لئے وہ وقف یا وقف اللہ نہ کی گئی ہو مگر یہ دفعہ ملعنی پر اثر انداز نہ ہوگی۔

(ح) کسی شخص کو اپنے عقیدہ کی بنا پر اپنے لئے خوراک منتخب کرنے اور اس کے لئے استعمال کرنے یا کسی پیشہ اور تجارت کو اختیار کرنے سے کسی قانون، دفتری حکم یا معاشرتی دباؤ کے ذریعہ محروم نہیں کیا جائیگا۔

(ط) کوئی شہری محض صنف، مذہب یا عقیدہ کی بنا پر کسی پبلک ملازمت سے محروم نہیں کیا جا سکیگا۔ پبلک ملازمت میں سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی ملازمتیں، از روئے قانون قائم شدہ اداروں، اور سرکاری وظیفہ یا امداد پانے والے اداروں کی ملازمتیں شامل ہوں گی۔

جوابات

قانونی وقف کی تشکیل کے سلسلے میں میری ایک ترمیم ہو۔ یعنی مذہبی جماعت ہی نہیں بلکہ ہر اُس مفید تحریک و انتظام کو قانون بنانے کا جواز ہونا چاہیے جو کسی فرقہ کے نمائندوں کی ۵۰ فی صدی کی اکثریت سے پیش ہو اور جو اس کی اصلاح و ترقی میں موثر ثابت ہوتی ہو۔

(ج) مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ اس سوال میں فرقہ در فرقہ احساس کو فنا کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو مختلف سمتوں میں منتشر اور پراگندہ کرنے کی ذمہ داری اُن گرد وبندانِ مذہب پر عائد ہوتی ہے جو مسلمانوں کو ۷۲ فرقوں میں تقسیم کر کے کمزور کرتے ہیں اور پھر بھی اسلامی اخوت اور مساوات کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ !؟ یا جدید سیاسی شعور کی بنیاد پر محض ذرا سے اختلافِ عقائد کی بنا پر مسلمانوں میں علیحدہ سیاسی نمائندگی چاہتے ہیں۔ !؟

میرے خیال سے یہ اتحادِ دین اور اخوتِ اسلامی کے قطعی منافی ہے، میرے نزدیک مذہبی طور پر مسلمانوں میں صرف ایک فرقہ ہے جس کا وجود مکمل ہے اور جس کا نام "مسلمان" ہے۔ میری رائے میں بلا کسی اختلاف و تقسیم کے صرف مسلمانوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ خواہ وہ سنی ہو یا شیعہ، قادیانی ہو یا اہلِ حدیث، حنفی ہو یا وہابی یا کوئی اور مسلم فرقہ۔

بنیادی حقوق اور اس سے متعلقہ اُمور اپنی جگہ قطعی مکمل ہیں۔ شق نمبر ۱۲ میں مزدوروں کے حقوق کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی لازمی طور پر ہونی چاہیے کہ مزدور حاملہ عورتوں کو زچگی کے دوران میں تین تین ماہ کی (Maternity leave) رخصت دی جائے۔

اس طرح شق نمبر ۱۱ میں ابتدائی تعلیم کے مفت ہونے کے ساتھ "جبریہ" کے الفاظ کا اضافہ کیا جانا نہایت ضروری ہے۔

مذہب کے ترک و اختیار کی مکمل آزادی، ایمان، معتقدات، مذہبی اعمال، پرسنل لاز، زبان، رسم الخط، تمدن (کلچر) کے سلسلے میں تمام فرقوں کی آزادی اور خود مختاری ہر قومی حکومت کے مسلمہ فرائض ہونے چاہئیں لیکن تبلیغ کی آزادی ہر فرقہ کو ایک دوسرے سے متصادم کر سکتی ہے یہ خدشہ کوئی نیا خدشہ نہیں ہے۔ ملک میں سنہ ۲۳ء کے بعد فرقہ پرستی کی نیو جن تحریکوں نے ڈالی اُن تحریکوں میں سے شدھی، سنگٹھن، تبلیغ اور تنظیم کی تحریکیں بھی تھیں۔

سوالات (ی) (۱) دستورِ اساسی کی کوئی دفعہ جس کا تعلق مختلف مذہبی جماعتوں کے حقوق و مفاد سے ہو جائز نہ ہوگی۔ تا وقتیکہ اُسی فرقہ کے نمائندوں نے اس کو وضع نہ کیا ہو، بلکہ اس طریقے سے جو دفعہ وضع کی جائیگی وہی دستور میں داخل کی جائے گی۔ مزید برآں دستور کی کسی ایسی دفعہ میں بغیر متعلقہ فرقہ کے نمائندوں کی منظوری کوئی اضافہ، ترمیم یا تنسیخ نہ ہو سکے گی۔

(۲) کسی مجلسِ وضع قوانین میں کوئی ایسا مسوّدہ قانون پیش نہ ہوسکیگا جو کسی مذہبی فرقہ کے بنیادی حقوق پر مخالفانہ اثر ڈالتا ہو، تا وقتیکہ اس فرقے کے نمائندے اس کے حق میں نہ ہوں۔

(۳) ہر معاشرتی یا مذہبی یا پرسنل لاز سے متعلق قانون جو کسی دوسرے مذہبی فرقے پر اثر انداز نہ ہو، اگر متعلقہ فرقے کے کل نمائندوں کی اکثریت اسے منظور کرانا چاہے تو وہ مجلس میں پاس کرایا جائیگا۔

(۴) کسی شہری کی نقل و حرکت پر خواہ وہ ہندوستان کے کسی حصے سے کسی حصے کی طرف ہو، کوئی پابندی عائد نہ کی جائے گی، بلکہ سب باشندوں کو یکساں اور مساویانہ شہری حقوق حاصل ہوں گے۔

(۵) قانون سازی میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کیا جائیگا۔

(ل) تمام اُن شکایتوں کا حق سماعت جو بنیادی حقوق یا دستورِ اساسی کی خلاف ورزی کی وجہ سے پیدا ہوں، متعلقہ صوبوں کی ہائی کورٹوں کے بنچ کو ہوگا۔ اور اس کے اپیل کا حق سماعت فیڈرل کورٹ یا سپریم کورٹ کو حسب ضرورت ہوگا۔

نمبر ۶ (الف) کیا آپ کی رائے میں تناسب ملازمت آل انڈیا ملازمتوں میں وہی قائم رہے جو مرکزی حکومت کی جانب سے ۱۹۴۳ء میں بھی منظور شدہ ہے یا آپ کے خیال میں کوئی دوسری تجویز ہے؟

(ب) صوبائی حکومتوں، میونسپلٹیوں اور نیم حکومتی اداروں کی ملازمتوں میں آپ کیا تناسب ملازمت تجویز کرتے ہیں؟

نمبر ۷ - مہربانی فرما کر یہ تجویز فرمائیں کہ تمام انتخابی اداروں میں طریق انتخاب کیا اور کس قسم کا ہو اور آیا نشستیں محفوظ ہوں یا اور کیا ہوں؟

نمبر ۸ - امورِ ذیل کے متعلق آپ کی تجویز کیا ہیں؟

(۱) صوبہ جات کے حدود میں تغیر و تبدل اگر ضروری ہو۔

جوابات اس بدبخت ملک میں اہلِ مذاہب نے (خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں) مذہبی احساسات کو نہایت غلط طور پر استعمال کیا ہے اور اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ شدید قسم کی بے معنی مذہبی منافرت آپس میں پھیل گئی ہے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے باقاعدہ تبلیغی مراکز اور مشنریز ہیں جو نہایت اہتمام و سلیقے کے ساتھ اس کاروبار کو کرتے ہیں۔ لیکن تمام ہندوستان میں (جہاں تک میں کہہ سکتا ہوں) مسلمانوں کا کوئی ایسا انسٹی ٹیوشن موجود نہیں ہے جس میں نومسلم افراد کی تعلیم و تربیت اور گذر اوقات کا انتظام ہو۔ یا معمولی نومسلم عوام کو ان کے ادنیٰ سوشل مرتبے سے بلند کرنے کے ذرائع و سامان موجود ہوں۔

ان حالات میں عام مسلمانوں یا کسی خاص مسلم جماعت کو یہ اصرار کرنا کہ بنیادی حقوق میں تبلیغ کی آزادی بھی تسلیم کی جائے خود مسلمانوں کا شدید نقصان کرنا ہے۔ تبلیغ کی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں اس کے ذریعے ہر وقت قومی حکومت کی راہ میں کانٹے بچھائے جا سکتے ہیں۔ مسلمان تبلیغ کے سلسلے میں تحریص سے کام نہیں لیتے۔ خاصکر عیسائی مشنریوں کے مقابلہ میں جن میں سے بعض کی سرپرستی غیر ممالک اور بعض کی پشت پناہی برٹش حکومت کی اخلاقی امداد کرتی ہے، مسلمان تبلیغی سرگرمیوں کو شروع و جاری بھی کیا کر سکتے ہیں۔ اس کا بیّن ثبوت گذشتہ تحریکِ تبلیغ کی کھلی ہوئی ناکامی ہے۔

(۲) لیکن ناکامی نفس تبلیغ کی نفی کے مترادف نہیں ہو سکتی، یہ ایک فریضہ ہے اور اس کے سلسلے میں حکومت رائے عامہ سے مجبور ہو سکتی ہے لیکن (۶) بنیادی حقوق کے آخری الفاظ میں آپ نے دربردہ تبلیغ کی آزادی دے دی ہے اور میرے خیال سے وہ کافی ہے۔ میری رائے میں تبلیغ کی آزادی پر حدود و قیود قائم ہونے لازمی ہیں۔ جو واقعات تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے میں روزانہ ملک میں ہوتے آئے ہیں ان میں زیادہ تر تعداد عورتوں اور ایک خاص ٹائپ کے افراد کی ہوتی ہے مختلف المذاہب فرقوں میں نفس دین کی بنیاد پر تبدیلیٔ مذہب بہت کم دیکھی گئی ہے۔ بلکہ اس کی بہت بڑی وجہ سیاسی و اقتصادی حریفانہ جذبات ہیں۔

اگر کوئی اکثریت محض اس لئے کسی معمولی اقلیت کو آزاد و بلند کر دینا

سوالات

(۲) اکابینہ کی ہیئت ترکیبی کا تعین۔

(۳) دفاعی محکمہ میں ملازمتوں کی ترتیب

(۴) صوبائی محکمۂ عدلیہ کی تشکیل اور ساخت

(۵) پبلک سروس کمیشن کی ہیئت ترکیبی

نمبر ۹۔ آپ کی رائے میں وفاقی اور اہم صوبہ جاتی تعلقات اور رسل و رسائل کے لئے سرکاری زبان کونسی ہو سکتی ہے؟ کیا آپ کے خیال میں زبان ہندوستانی نہیں ہے جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور ہندوستان کے بہت بڑے حصّے میں عام طور پر سمجھی جاتی ہے؟

نمبر ۱۰۔ حسب ذیل مسائل کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

(۱) قرضداروں کو قرضہ کی مصیبت سے نجات دلانے کی صورتیں۔

(۲) سود اور ربوا پر پابندی کی صورتیں؟

نمبر ۱۱۔ کیا براہِ مہربانی آپ شراب خوری کے عام انسداد اور منشیات کے رواج کو بند کرنے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے؟ اور یہ کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

نمبر ۱۲۔ جن صوبوں میں زرعی شرح لگان بہت زیادہ ہے اور کسی نہ کسی صورت میں بیگار کا رواج اب تک قائم ہے ان کے انسداد کے لئے آپ کیا تجویز پیش فرماتے ہیں؟

نمبر ۱۳۔ کیا آپ کے علم میں مسلمانوں کے کچھ ایسے طبقے ہیں جو بعض معاشرتی حقوق سے محروم کئے جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان کو منصفانہ مساوات کی سطح پر لانے کے لئے آپ کیا تجاویز مناسب سمجھتے ہیں؟

نمبر ۱۴۔ اور آخر میں آپ کے خیال میں اور بھی جو تجاویز ایسی ہوں جنھیں آپ فرقہ وارانہ مسائل کے منصفانہ حل کے لئے ضروری سمجھتے ہوں، مہربانی فرما کر تحریر فرمائیں، نیز جو دوسرے متعلقہ مسائل آپ کے خیال میں ہوں، اُن کے متعلق بھی اظہارِ خیال فرمائیں۔

جوابات

چاہتی ہے کہ خود کو اور بھی کثیر کر لے تو میں اس کو قومی لوٹ کھسوٹ کہونگا اور اگر کوئی اقلیت دینی تبلیغ پر محض اس لئے زور دیتی ہے کہ وہ دوسری اقلیتوں کو ملا کر ایک بڑی اکثریت میں تبدیل ہو جائے تو یہ اس جماعت کے سیاسی مقصد کی تکمیل ہوئی ——— خدمتِ دین سے اس کو کیا واسطہ!؟

ہر مذہب کی بہترین تبلیغ اس کے ماننے والوں کے اعمال و اخلاق ہیں۔ اس لئے جو فرقہ ملک میں تبلیغ کو ناگزیر خیال کرتے ہیں وہ خود نیک اخلاق کا مجسمہ بنیں۔ کسی دین کے بنیادی معتقدات کے بعد اگر کوئی مرکزِ کشش ہے تو محض اس دین کے ماننے والے! اور اُن کا اخلاق۔ مطلب یہ ہے کہ انفرادی طور پر تو ہر شہری کو اپنے اصول کی تبلیغ کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ لیکن منظم تبلیغی جماعتوں کو ممنوع قرار دینا اتحادِ اقوامِ ہند کے لئے ضروری و لازمی ہے۔

(و) کامل اتفاق ہے۔

(ز) مجھے اس سے جزوی طور پر اتفاق ہے لیکن "کسی حالت میں بھی" کے فقرے سے آخر کیا مراد لی جائے!؟ فرض کیجیے کہ جائداد موقوفہ یا جو ایشور دیوتاؤں کو دھرم ارتھ کی گئی ہو، مقصدِ وقف یا آسمانی دیوتاؤں کے بجائے خود ارضی دیوتاؤں پر صرف ہو رہی ہو اور متعلق فرقے کی اکثریت بھی اس کے خلاف ہو تو کیا قومی حکومت اس کا احتساب نہ کرے گی ——!؟

اگر دستور بالوجوہ حکومت کو یہ ذمہ داری تفویض نہیں کرنا چاہتا تو اسے ایسی دفعہ اس باب میں رکھنی چاہیئے جو پیدا ہونے والے مسائل کا حل کر سکے اور جو متعلقہ فرقہ کی کسی کمیٹی کا فرض قرار دے دیا جائے۔

بنیادی حقوق کی شق نمبر ۴ میں اوقاف اور خیراتی اداروں پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ ملک میں اکثر اوقاف اور خیراتی اداروں کی نہایت سقیم حالت ہے، اوقاف پر انفرادی قبضہ اقتدار رہا ہوا ہے بعض بڑے اوقاف کی کمیٹیاں سہی پھر بھی اُن کے امور تدین اور فرض شناسی کے ساتھ سرانجام نہیں پاتے بعض جگہ یہ اوقاف اور ان کی آمدنی مقصدِ وقف کی ضرورتوں سے زیادہ ہے لیکن اس زیادہ روپیہ کا کوئی مفید استعمال نہیں ہوتا۔

اسی طرح خیراتی اداروں کا انتظام بھی عام طور پر دی پایا جاتا ہے اور وہ بھی افراد اور بعض جگہ جماعتوں کے جلب منفعت کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اِن حالات میں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اُن کا انتظام خود حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن یہ انضرام لازمی طور پر ہونا چاہیئے کہ ضرورت کے مطابق آمدنی مقصد وقف پر صرف ہو اور باقی آمدنی فرقہ متعلقہ کی کسی ذمہ دار جماعت کے سپرد کر دی جائے جو حکومت کے زیر نگرانی فرقہ متعلقہ کی ترقی و فلاح کے لئے صرف کر سکے مثلاً تعلیم وغیرہ پر صرف کرنے کی مجاز ہو۔

(ح) یہ ممکن گارنٹی ہے جو دی جا سکتی ہے اور مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں۔

(ط) یہ ممکن گارنٹی ہے جو دی جا سکتی ہے اور مجھے اس سے اتفاق ہے

(ی) (۱) — یہ ممکن گارنٹی ہے جو مذہبی جماعتوں کے حقوق و مفاد کے سلسلے میں دی جا سکتی ہے اور بحیثیت مسلمان میں اس کو حقوق کی کامل آزادی کے مترادف یقین کرتا ہوں۔ نیز اس سے کامل اتفاق ہے

(۲) مجھے اس سے کامل اتفاق ہے۔

(۳) مجھے اس سے اتفاق ہے

(۴) مساویانہ شہری حقوق اور اُن کی وسیع آزادی سے قومی دستور کی نہایت ادسعت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہونا چاہیے کہ ملک کا کوئی حصہ کسی قوم کا خاص وطن نہیں ہوگا۔ بلکہ ہندو مسلم عیسائی سکھ پارسی، انگریز اور راجپوت تمام فرقے اپنی زندگی شہریوں کے مساوی حقوق کے ساتھ بسر کریں گے۔ یہ آزادی یقیناً ہندوستانیوں کے تصور و خیال کے عین مطابق ہوگی اور میں بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان اس سے کامل اتفاق کرتا ہوں۔

(ک) افراد اور افراد، جماعت اور جماعت کے درمیان کسی ترجیحی سلوک کی یقیناً کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔

(ل) اتفاق ہے۔

نمبر ۶۔ (الف) میری رائے میں فیڈرل گورنمنٹ میں مسلمانوں کی ملازمتوں کا تناسب ۳۳ فی صدی ہونا چاہیئے۔

تشریح۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فیڈرل گورنمنٹ کے ہر محکمہ میں اور ہر

دسمبر ۱۹۴۱
ایشیا

منصب پر مسلمانوں کا ۳۳ فی صدی تناسب ملازمت قائم رہے۔

(ب) صوبہ جاتی حکومتوں میں تناسب ملازمت کے سلسلے میں بنیادی اصول یہ ہونے چاہئیں کہ کوئی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہونے پائے اقلیتوں کے حقوق کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک سمجھوتہ کے ذریعہ اقلیتوں کو مناسب اور معقول (Weightage) پاسنگ دیا جانا ضروری ہے۔

نمبر ۷۔ جملہ انتخابی اداروں میں فی الحال بلاواسطہ مخلوط طریقۂ انتخاب رائج کیا جائے، جس میں مسلمانوں کی نشستیں محفوظ ہوں، اور اگر دوسری اقلیتیں اپنی نشستیں محفوظ کرانا چاہیں تو مخلوط انتخاب کے ساتھ ان کی نشستیں بھی محفوظ کردی جائیں۔

نمبر ۸۔ اگر جغرافیائی، لسانی یا دیگر ضروری یکسانیتوں کی بنا پر صوبوں کے حدود میں تغیر و تبدل کی ضرورت پڑے تو یقیناً تغیر و تبدل کی گنجائش ہونی چاہیے۔

(۱) کسی صوبائی یا مرکزی حکومت کی وزارت ایسی نہیں ہونی چاہیے جس میں مسلمان وزیر نہ ہو۔

(۲) مرکزی کابینہ میں مسلمان وزراء کی تعداد کا تناسب ۴۰ فیصدی ہونا چاہیے۔

مخلوط انتخاب کے نفاذ کے بعد مجالس قانون ساز میں فرقہ دارانہ بنیاد پر پارٹیاں بننے کا بہت کم امکان باقی رہے گا اور پارٹیوں کی تشکیل سیاسی نظریات پر مبنی ہوگی۔ ایسی حالت میں جمہوری اصول کو مدنظر رکھ کر خالص سیاسی اکثریت کی پارٹی کابینہ کا تعین کریگی اور اس کی ہیئت ترکیبی میں مسلمان وزراء کا معقول تناسب ہونا ضروری ہوگا وزارت کی ذمہ داری مشترک ہوگی۔

(۳) ایک عارضی دفاعی عسکر کی بنیاد قومی اصول پر ہونی چاہیے۔ تاہم اس وقت تک کے لئے جب تک قومیت کا صحیح احساس ہندوستانیوں میں پیدا نہ ہو جائے۔ ایسی ترتیب قائم کرنی پڑے گی جس میں مسلمانوں کا تناسب فوج اور اس کے تمام متعلقہ محکموں اور مختلف مناصب پر کم از کم ۴۰ فی صدی ہو۔

(۴) عدالت محکمۂ تنفیذی (Executive) سے بالکل علیحدہ ہوگی۔ اس کی بنیاد قطعی قومی ہوگی نہ کہ فرقہ وارانہ، تاہم مسلمانوں کے

سوالات

جوابات

حقوق کے تحفظ کی خاطر جو تناسب عام ملازمتوں کے سلسلے میں ہوگا
اسی کا لحاظ محکمۂ عدلیہ کی ملازمتوں میں بھی رکھا جائے۔
پبلک سروس کمیشن میں ملازمتوں کا تناسب دیگر صوبائی ملازمتوں کی
طرح ہونا چاہیئے۔ مرکز اور تمام صوبوں میں علیحدہ پبلک سروس
کمیشن ہونے ضروری ہیں۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا تقرر صدر
جمہوریۂ ہند کرے گا اور اسی طرح صوبائی سروس کمیشن کا تقرر صوبائی
صدر جمہوریہ کریں گے۔

نمبر ۹ - ہندوستانی زبان
بے شک یہ ہندوستانی زبان ہے۔

نمبر ۱۰ - کسی صورت میں زر اصل کا ڈیڑھ گنا ادا کر دینے کے بعد مقروض کے خلاف
کوئی ڈگری نہیں ہونی چاہیئے۔ سو روپیہ اور اس سے کم کی آمدنی رکھنے
والے مقروضین سے ۵ فی صدی سے زیادہ قرض بذریعۂ اقساط وصول
نہ کیا جائے۔
حکومت کی کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ ایسی صورتِ حال پیدا کرے جس میں
سوائے لین دین کے کوئی گنجائش باقی نہ رہ سکے۔
(۱) اس لئے مندرجہ بالا تجاویز محض وقتی اور عارضی ہونی چاہیئیں ورنہ
دراصل سود، جمہوریہ ہندوستان میں قطعاً ممنوع ہونا ضروری ہے۔
قرض دینے اور قرض وصول کرنے کا کام بالآخر خود حکومت کو کرنا ہوگا
(۲) ۱۰ میں جو اصول پیش کیا گیا ہے اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا
ہی نہیں ہوگا۔

نمبر ۱۱ - کسی پچھلی دفعہ میں اکل و شرب کے متعلق پابندیاں عائد کرنے کو ممنوع قرار
دیا گیا ہے، یہ ایک عام اصول ہے تاہم اقتصادی اور حفظانِ صحت کے نقطۂ
نگاہ سے بعض رائج الوقت اشیاء ایسی ہیں کہ جن پر پابندیاں عائد کرنی ہوں گی
وہ مسکرات جو طبی نقطۂ نگاہ سے قوم کی خرابیٔ صحت کا باعث ہیں وہ قانوناً
ممنوع ہونی چاہیئیں۔
اس کے علاوہ قانون کی دخل اندازی زیادتی ہوگی، یہ کام مذہبی مصلحین پر
چھوڑ دینا چاہیئے۔

نمبر ۱۲ - کسی صورت میں بھی کاشتکاروں یا چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو ایسے محاصل
ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جو ان کی پیداوار میں سے اتنا حصہ چھین لیں

جوابات

کر جس کے بعد کاشتکار یا زمیندار آرام کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکیں۔
(۱) بنیاد پر حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ایسا قانون بنائے جس کی رو سے پیدا کرنے والا اپنی پیداوار سے پورا پورا نفع حاصل کر سکے اور اس کو بھاری بھاری محاصل ادا نہ کرنے پڑیں۔

(۲) کسی کاشتکار یا زمیندار یا کسی بھی فرد یا جماعت یا گورنمنٹ کو یہ حق حاصل نہ ہونا چاہیئے کہ وہ زراعتی مزدوروں یا کسی قسم کے بھی مزدوروں سے کوئی بیگار لے سکیں، اس سلسلے میں صاف اور واضح قانون حکومت کی طرف سے بنایا جائے اور اس میں زراعتی مزدوروں کی اجرتیں وضع کر دی جائیں، خلاف ورزی کی صورت میں سخت تعزیرات قانون میں رکھی جائیں۔ بیگار، از روئے قانون مطلق ممنوع ہونی چاہیئے۔

نمبر ۱۳ بے شک ــــــ مثلاً حجام، نداف، نجار اور نور باف وغیرہ وغیرہ ــــ ہندوستان کی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ طرز معاشرت نے، جو ان سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں بھی اپنے مذہب کے خلاف یہ طبقے پیدا کر دئے ہیں جن کو ایسے مواقع میسر نہیں کہ وہ زندگی کے کل شعبوں میں برابر کے حصہ دار بن سکیں۔ یہ طبقاتی تقسیم آزاد جمہوری ہندوستان میں ختم ہو جانا چاہیئے۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے ان پسماندہ طبقوں کو تعلیم اور دوسرے ضروری شعبوں میں ترقی کرنے کے لئے خاص حقوق دئے جائیں تاکہ سوسائٹی کی بلند ترین سطح تک پہنچ سکیں اور حکومت کے نظم و نسق میں برابر کے شریک ہوں۔

(اس جگہ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ دوسرے فرقوں کے طبقات پر بھی یہی اصول لازماً نافذ ہونا چاہیئے)

نمبر ۱۴ فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے مخلوط انتخاب ایک بنیادی شے ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

(۱) لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ قومی نقطہ نظر کی نشو و نما اور مشترک سیاسی و اقتصادی مسائل کے تعمق کے لئے جب تک ذہنی تعلیم و تربیت نہ ہو اس وقت تک قومی رجحان مستحکم بنیادوں پر پیدا نہیں کیا جا سکتا اس لئے نہایت ضروری ہے کہ قومی پروپیگنڈا ڈیپارٹمنٹ کو زیادہ وسیع اور منضبط کیا جائے۔

ایک وسیع التخیل اور وسیع العمل پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ مستقل حیثیت میں کھولا جائے

سوالات

جوابات

جس میں محنتی، مخلص، باہر قومی نقطۂ نگاہ رکھنے والے افراد کی خدمات حاصل کی جائیں اور انھیں معقول مشاہرہ دیا جائے تاکہ وہ فکرِ معاش زندگی کی طرف سے یکسو ہو کر اس نہایت اہم کام کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکیں۔

(۲) پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں ہر زبان کے ماہر ہونے لازمی ہیں۔

نمبر ۱۷ دوسرے متعلقہ مسائل کے سلسلے میں ایک امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ حکومت کی تشکیل بلا شبہ جمہوری ہونی چاہئے، لیکن یہ جمہوریت سرمایہ دارانہ جمہوریت نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ تمام فرقہ وارانہ اور طبقاتی مسائل کی جڑ طبقاتی ناانصافی ہے۔ جو اقتصادی ناانصافی پر مبنی ہے۔ کوئی جمہوری حکومت جو عامۃ الناس (مزدور و کسان) کو چند اصلاحی قوانین پاس کر کے مطمئن کرنا چاہتی ہے وہ عوام کے مرض کا مستقل علاج نہیں کر سکتی۔ محض مزدوروں کی اجرتیں اور بیکاروں کے لئے دستور میں کے بنیادی حقوق متعین کرنا، اقتصادی ناانصافی کا علاج نہیں ہے۔ اس لئے کہ بہت سی جمہوریتیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں جو سرمایہ دارانہ اصولوں پر چلائی جا رہی ہیں اور مزدور کو محض پہلی حالت سے کسی قدر بہتر اچھی حالت تک پہونچا کر یا اس کی بہتر حالت کا احساس کرا کے بڑی ہوشیاری کے ساتھ لوٹ کھسوٹ کی جا رہی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ حکومت کی تشکیل اس طرح کی جائے کہ سرمایہ دارانہ مفاد کو محفوظ رکھنے اور اسے ترقی دینے میں مدد کرنا حکومت کے لئے ناممکن ہو جائے۔

مجملاً یہ کہ حکومت عوام کے مفاد کی خاطر ہونی چاہیے۔

اور اس میں کوئی چور دروازہ نہیں ہونا چاہئے۔

ساغر نظامی

حالیؔ مسدّس کے آئینہ میں

ادب اور انسانی زندگی کا تعلق نہایت گہرا اور اہم ہے! اتنا اہم کہ بغیر انسانی زندگی کا مطالعہ کئے ہوئے کسی خاص عہد کے ادب کو سمجھ لینا اور اس پر عبور حاصل کر لینا قریب قریب ناممکن ہے۔ ادب پر زندگی کے ہر رُخ کا اثر پڑتا ہے۔ ادب زندگی کی تمام تر پوشیدہ و ظاہر تفصیلات کو کسی نہ کسی طرح منعکس کر ہی دیتا ہے۔ ادب اس لحاظ سے ایک آئینہ ہے جس میں کسی نہ کسی زاویہ سے زندگی کا ہر رُخ دکھائی پڑتا ہے یہ عکس عموماً قوم کی ذہنیت کا ہوتا ہے۔ جب کسی قوم میں جو ایک عرصہ تک محکوم و غلام رہ چکی ہو آزادی کے جذبات رونما ہوتے ہیں تو سب سے پہلے اس کی جھلک ادب ہی میں نظر آتی ہے اور ملی قوتیں انہی جذبات کے ذریعہ سے بیدار ہوتی اور اُبھرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح مگر اس کے برخلاف جب کسی فاتح حکمران قوم کی عظمت کا ستارہ پستی کی طرف مائل ہوتا ہے اور وہ اپنی شوکت و عظمت کھونے لگتی ہے تو زوال کے آثار سب سے پہلے ادب ہی میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ ذہنیتوں کی پستی سب سے پہلے ادب اور وہ بھی خصوصاً شاعری میں جھلکنے لگتی ہے اور اس کے بعد تمام قوم پر تباہی اور ادبار کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔

شاعری اس حیثیت سے ایک "آلۂ موسم نما" ہے کہ جس میں قومی ادبار کے طوفان کا اثر سب سے پہلے دکھائی پڑنے لگتا ہے۔ انحطاط کا سیلاب اس کے بعد آتا ہے اور قوم کی خودداری و آزادی اس کی رَو میں خس و خاشاک کی مانند بہ جاتی ہے۔

تاریخ ادب شاہد ہے کہ جب اُردو شاعری نے دکن اور گجرات میں ہوش سنبھالا اس وقت وہ اسلامی تمدن جس کی ابتدا ہندوستان میں محمود غزنوی کے حملوں سے ہوئی تھی اور جس کو مغلوں نے فروغ دے کر اس درجہ تک پہونچا دیا تھا کہ آج بھی اس کی داستان رگِ دل پر نشتر کا کام کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ مٹ رہا تھا۔ انحطاط کے ان آثار میں قوم اور افراد کی ذہنیت پستی پذیر ہو چکی تھی۔ ادبار نحوست اور زوال کی کالی گھٹاؤں نے ملک میں اندھیر کر رکھا تھا۔ معاشرت کی جڑ کھوکھلی ہو چکی تھی۔

اس زوال و ادبار کی نمایاں تصویر جعفر زٹلی کا کلام ہے جو اس کا شاہد ہے کہ لوگ بے حیائی، نمائش اور گندگی کو اُچھال اُچھال کر دکھاتے اور داد پاتے تھے۔ مرثیہ گوئی خواہ بیجاپور کی ہو خواہ اودھ کی ماسبق انحطاط کا سبب معلوم ہوتی ہے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ زوال آمادہ قوم میں ذہنیتیں اور طبیعتیں غم والم کی طرف زیادہ مائل تھیں۔ دکن میں مرثیہ گوئی کو اس وقت فروغ ہوا جب کہ وہاں سے سلطنت تباہ ہوئی۔

اُردو شاعری میں مرثیہ کے لئے براہ راست عربی شاعری کی مرہونِ منت ہے یعنی اُردو میں مرثیے کی ابتدا عربی شاعری کے اثر سے ہوئی۔ مرثیے سے آجکل عوام یہ مطلب لیتے ہیں کہ جو اشعار خواہ وہ مثنوی کی شکل میں ہوں خواہ مسدس کی شکل میں خواہ کسی اور شکل میں، شہدائے کربلا کے دل ہلا دینے والے واقعات اور خون رُلانے والے حالات پر لکھے جائیں، مرثیہ کہلاتے ہیں، حالانکہ ایسا سمجھنا غلط ہے اس سے اُردو شاعری میں مرثیے کا دائرہ تنگ ہو کر رہ گیا ہے۔ اصلاً مرثیہ بالکل وہی چیز ہے جو انگریزی میں (ایلی جی) کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اس لئے مرثیہ کی صحیح مگر مجمل تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اشعار جس میں کسی قلبی رنج و غم کا اظہار ہو مرثیہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ خواہ اس قلبی رنج و غم کی وجہ کسی عزیز کی موت ہو خواہ کسی قبرستان یا کسی ایسے ہی دردناک منظر کو دیکھ کر دل میں رنج و غم کے جذبات پیدا ہو جائیں خواہ وہ کسی فرقہ کی بداعمالیوں اور بدچلنیوں کو دیکھ کر دل میں یہ جذبات عود کر آئیں۔ یہ جذبات ایک قوم کے زوال پر بھی دل میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک جذبہ قومی سے لبریز دل ان حالات قومی کو دیکھ کر کہ جن سے اس کی وہ محبوب قوم جسے "اپنی قوم" کے نام سے موسوم کرتا ہے جس کا وہ خود ایک رکن ہے بتدریج زوال کی طرف بڑھ رہی ہے، پیدا ہو سکتے ہیں۔ انہی جذبات کو لباس شعر میں پیش کرنا مرثیہ کہلاتا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ایسے اشعار میں صرف واقعہ نگاری ہی نہیں کرتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا شاعر خود بھی اس رنج و غم میں ماتم کناں ہے اور جذبات کا اظہار اس کی دلی تکلیف کا شاہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ موثر مرثیہ یا نوحے وہی ہوتے ہیں جن کا تعلق خود اس شاعر کے عزیز و ...

ہوتا ہے۔ قدما اور متوسطین کے ادوار میں مرثیہ صرف واقعات کربلا کے بیان تک محدود ہو کر رہ گئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت کم لوگ اچھے اچھے مرثیوں کو تشریح کہنے کے لیے تیار ہوں گے۔ کوئی ہرج نہ تھا اگر انیس اور اُن کے دیگر معاصرین و متقدمین بھی اس مرثیئے سے وہ کام لے سکتے جو کہ واقعی ایک مرثیہ کا ہونا چاہیے مگر ان کا تو خیال اور عقیدہ ہی کچھ اور تھا۔ آج ہم میر انیس کے معتقد ہونے کی حیثیت سے اُن کے مراثی کو خواہ کچھ ہی رنگ کیوں نہ دے لیں مگر ذرا انصاف شرط ہے۔ کیا ایسے مرثیئے سے مسلمانوں کو کوئی فیض پہونچ سکتا ہے؟ کیا وہ اس سے کوئی قابل عمل سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ آج ہم دل میں یہ کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں کہ مرثیہ اخلاقیات و شاعرانہ جذبات کے بہترین مرقعے پیش کرتا ہے۔ مگر کیا کوئی بھی ایسا ہے جو اس نصب العین کو سامنے رکھ کر اس پر عمل پیرا ہو سکے۔ خود میر انیس ہی سے پوچھ لیجیے کہ وہ اپنے مراثی سے کیا سبق دیتے تھے۔ اُن کا مطلب صرف یہ تھا کہ مرثیہ پڑھ کر لوگ رونے لگیں اور اسی کو وہ اپنے کلام کی معراج خیال کرتے تھے اُن کا خیال تھا کہ ذکر حسینؑ پر رونے دھونے سے دلوں کو چین آ جاتا ہے۔ اگر صرف آنسو بہانے سے دل کو چین آ گیا تو اصلاحی و تعمیری شان کہاں رہی اور پھر رونے سے کیا اثر ہوا اور پھر اگر اثر ہو بھی تو کیا؟ جب کہ وہ ناہی فرض عین ہو تب پڑھنے والوں میں قوت عمل پیدا بھی کیونکر ہو سکتی ہے۔ میر انیس نے صاف صاف بیان کر دیا ہے کہ میرے مرثیئے کا مقصد صرف رونا رلانا ہے اور صرف رونے سے دل کی لگی بجھ سکتی ہے ؎

جس جا ذکر حسینؑ ہو جاتا ہے   رونے سے دلوں کو چین ہو جاتا ہے

آ کر بزم عزائے شہ میں رونا   ہر شخص پہ فرض عین ہو جاتا ہے

اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ انیس کے کلام میں درد و اثر نہیں۔ سب کچھ ہے مگر ہندستان کے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے والی چیز اس میں نہیں، خیر اس وقت تو زیر بحث مسدس حالی ہے۔ یہاں تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ نظم بھی جس میں کسی قوم کے عروج و زوال کی داستان پُر اثر طریقے پر بیان کی جائے۔ اور زوال کا نوحہ کیا جائے۔ مرثیہ ہے اس حیثیت سے اگر ہم مسدس کے تیز رو مد اسلام پر نگاہ ڈالیں تو ہم بلا کسی خاص اعتراض کے ماننے کو تیار ہو جائیں گے کہ مسدس ایک مرثیہ ہے۔

مسدس سے امانت نے واسوخت کا کام لیا پھر سودا نے اس صنف سخن میں اہلبیت کے مرثیے لکھنا شروع کئے۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے تو گویا اس صنف سخن کو بالکل اسی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ حالی سب سے پہلے اُردو شاعر ہیں، جنھوں نے مسدس کو قومی مرثیوں کا ذریعہ بنایا اور اپنا درد دل قوم کو سنایا۔ اس حقیقت سے بھی حالی کے مسدس میں تعمیری شان پائی جاتی ہے کہ شاعری کی ایک خاص صنف جو کہ صرف ایک چیز یعنی مرثیۂ اہلبیت کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی اور اس طرح اس کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا تھا اسے سیاسی اعتبار سے ایک زیادہ مفید کام کے لئے منتخب کر لیا اور اس طرح اُردو شاعری میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔

اب ہم براہ راست اُن خدمات کا ذکر کرتے ہیں جو حالی نے مسدس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی کیں۔ "مسدس" شہرت سے بے نیاز، نہ کسی تعریف کا محتاج ہو نہ تعارف کا نہ کسی نئی مدح و توصیف کا، نہ کسی جدید نقد و تبصرہ کا۔ ایک داستانِ درد شروع سے آخر تک ہے۔ شاعر مسلمان ہے اور اس حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستانِ غم بیان کر رہا ہے۔ یہ نظم شروع سے آخر تک سراسر اخلاص اور یکسر درد سے بھری ہوئی ہے لفظ لفظ سے دل پر چوٹ لگتی ہے۔

مولانا حالی نے قوم کی تباہی ذلت اور رسوائی کے نظارے دیکھے، قوم کا ماضی اُن کی بارئیک بیں نگاہوں کے سامنے تھا۔ دل بھر آیا۔ قوم کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے اور غفلت کی نیند سونے والوں کو بیدار کرنے کے لئے مسدس کی بنیاد ڈالی اور قوم کی آنکھوں کے آگے اسلام کے زوال کی داستانِ غم کھول کر رکھ دی

کوئی قرطبا کے کھنڈر جا کے دیکھے   مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے   خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

کونسا دل ہے جو ان اشعار پر گداز نہ ہو جائے۔ کون شخص ہے جسے اپنی موجودہ حالت پر ان حالات کا تخیل کر کے شرم نہ آئے۔ اُردو شاعری کی شاہراہ میں مسدس کی حیثیت ایک بلند مینار جیسی ہے جو اس راستہ پر چلنے والوں کو ایک پُر فضا میدان دکھا رہا ہے۔ جہاں دلبستگی اور شگفتگی طبیعت کے سامان راہرو کو متوجہ کرنے کے لئے

۵۔ مرثیہ یا قدیم شاعری کی کسی صنف کو "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کی روشنی میں دیکھنا غلطی ہے۔ یہ نظریہ ہمارے زمانے کی پیداوار ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے عہد کی شاعری کو اس نظریہ کی کسوٹی پر کسیں۔ انیس کے مراثی فن اور جذبات نگاری کے لحاظ سے اعلیٰ ترین شاعری کے نمونے ہیں۔ ساغر

ایشیا

بکثرت موجود ہیں، مولانا حالیؔ نے اپنے مخصوص انداز میں قوم کی ترقی، قوم کے اسلاف کی شان و شوکت، دبدبہ و صولت کا مرقع پیش نظر کیا ہے۔ پھر دوسری قوموں کے تنزل کا بیان کرکے اُن کے دل کو گداز کیا ہے اور پھر اس پر اپنی قوم کے زوال کی داستان دل پر نشتر کا کام کر رہی ہے۔ ناکارہ و غفلت شعار مسلمانوں کو ایک دلگداز مگر ساتھ ہی ساتھ دل افروز انداز میں بتایا ہے کہ ان کے بزرگ کون تھے۔ کیا تھے؟ انھوں نے دنیا میں کیا کیا کیا؟ ایک عالم اُن کے علم و ہنر کا ممنون اور ایک دنیا اُن کی تہذیب کی مرہون ہے۔ اُن کی شان و شوکت، اُن کی سطوت و جبروت، اُن کی عدالت و شجاعت تاریخ میں زریں الفاظ میں لکھی گئی ہے۔

اندھیرا تو اِرنج پر چھپ رہا تھا ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا
ولایت کے سورج پہ ابر آ رہا تھا شہادت کا میدان دھندلا رہا تھا

ہر رہ چراغ اک عرب نے جلایا
ہر اک قافلے کا نشاں جس سے پایا

وہ بتلاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف شعر و ادب میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے

ادب میں پڑی جان اُن کی زباں سے جِلا دین نے پائی اُن کے بیاں سے
سِناں کے لئے کام اُنھوں نے لساں سے زبانوں کے کوچے تھے بڑھکر سناں سے

ہوئے اُن کے شعروں سے اخلاق صیقل
پڑی اُن کے خطبوں سے دنیا میں ہل چل

اِن دل افروز واقعات کے بیان کرنے کے بعد وہ ہمیں تبلاتے ہیں کہ ہم اب کیا ہیں۔ مگر ہماری موجودہ حالت کا خاکہ صرف ہمیں عبرت دلانے کے لئے صرف ہماری رگِ حمیت کو جوش میں لانے کے لئے کھینچا ہے۔ یہاں کہیں وہ ہماری بد مذاقی، ہمارے افلاس، ہماری نکبت اور ہماری بد اطواریوں کا ذکر کرتے ہیں اور کہیں ہماری حرماں نصیبی اور تنفادت و غفلت سے گہرا رنگ بھرتے ہیں ایک ذرا علم و ادب ہی میں دیکھ لو کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔

مخالف اُن کے اِس جو کہ جادو بیاں ہیں فصاحت میں مقبول پیر و جواں ہیں
بلاغت میں مشہور ہندوستاں ہیں وہ کچھ ہیں ...... لیکن یہاں ہیں

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں
تو بھانڈ اُن کے اشعار محفل میں گائیں

حالیؔ کا خیال ہے کہ ایک شخص اگر بلندی سے دنیا کو دیکھے تو اس میں شک نہیں کہ وہ بہت سی قوموں کو تباہ و پریشان دیکھے گا۔ بہت سے ملکوں کو ویران دیکھے گا۔

مگر اسے ایک باغ سب سے علیحدہ نظر آئے گا جس کی حالت یہ ہوگی۔

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں جہاں آکے دیتا ہے رو ابرِ نیساں
تر دّد سے جو اور ہوتا ہے ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

حالیؔ کا مقصد اور مدّعا یہی تھا کہ مسلمان یہ سب کچھ دیکھے سمجھے اور غیرت و حمیت سے کام لے، اور اپنی بگڑی حالت کو کسی طرح سنبھالے۔ حالیؔ نے قوم کی ذلت اور اس کے ادبار کی گہرائیوں میں یاس و حرماں کی تاریکیاں دیکھی ہیں اور اس ظلمتکدے کے دردناک اور تباہ کُن اثرات سے قوم کو بچانا چاہتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ

یہ جو کچھ ہوا ایک شمّہ ہے اس کا کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانے نے اونچے سے جس کو گرایا وہ آخر کو مٹی میں مل کر رہے گا

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

حالیؔ ہمیں تبلاتے ہیں کہ ہمارے مذہب کو، ہمارے تمدن کو، ہمارے دبدبہ شان و شوکت کو جو نقصان پہونچا وہ ہندوستان میں آکر پہونچا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ہی اس کے ذمّہ دار ہیں۔

وہ دینِ حجازی کا بے باک بیڑا نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہونچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا نہ عمّاں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا

کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر [1]

---

[1] اس کے ساتھ ہی آپ کو اقبالؔ کا یہ شعر نہیں بھولنا چاہئے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ذمہ داری فاضل مقالہ نگار عائد فرما رہے ہیں وہی اندلس کے مسلمانوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومیں بدویت اور تازگی کی گود میں آنکھ کھولتی اور بڑھتی ہیں اور تہذیب تمدن کے ارتقا کی آغوش میں دم توڑ دیتی ہیں، جو بھی اسباب ہوئے ہوں لیکن مسلمانوں کی تباہی کا آغاز تو اُسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب روحِ اسلام کے خلاف جناب معاویہ نے خلافت کے اصول انتخاب کے خلاف یزید کو ولی عہد مقرر کیا۔ جب اسلامی جمہوریت کی بنیاد ہل گئی اور شہنشاہیت کو مسلمانوں نے اختیار کر لیا، تباہ ہو گئے۔

ساغر

حالی نے کوئی اصلاحی پہلو چھوڑا نہیں ہے جس پر روشنی نہ ڈالی ہو۔
اُنھوں نے اس میں شک نہیں کہ قوم کے متوسط طبقے سے خطاب کیا ہے جس کی وجہ اُنھوں نے خود ہی بتا دی ہے وہ جانتے تھے اور بجا جانتے تھے کہ اگر ہماری قوم سُدھرے گی تو متوسط طبقے کے ہاتھوں سے اور تباہ ہوئی ہے تو متوسط طبقہ بڑی حد تک اس کا ذمّہ دار ہے۔ شریف آدمیوں کے بچے اور لڑکے جس طرح تباہ ہوئے ہیں ذرا وہ بھی سن لیجئے۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے — تباہ ان کی حالت بُری اُن کی گت ہے
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے — کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی

اس میں شک نہیں کہ حالی نے مشکل ترین صنفِ سخن مشکل ترین مقاصد کے حل کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ مگر یہ صرف حالی کے "خلوص" کا نتیجہ ہے کہ تائید غیبی سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ مسدس ہماری شاعری میں ایسی چیز ہے کہ جس کا نباہنا آسان کام نہیں۔ باوجود کوشش و کاوش کے ایک آدھ شعر بھرتی کا آہی جاتا ہے، اور اگر بھرتی کا مصرع نہ داخل کیا جائے تو مسدس کی چُول نہیں بیٹھتی۔ خود میر انیس کے ہاں دیکھ لیجئے۔ مرثیہ اگرچہ اُن کی موروثی ملکیت ہو گیا تھا مگر پھر بھی جگہ جگہ بھرتی کے اشعار سے چُول بٹھا کر سلسلہ کو قائم رکھا ہے[1]۔ مگر حالی کا مسدس بلا شبہ اس عیب سے یکسر پاک ہے کہیں بھی ایک شعر یا ایک مصرع بھرتی کا موجود نہیں سب مصرعے ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ایک جان اور ایک قالب معلوم ہوتے ہیں۔ مسدس کے اعلیٰ مقاصد دھیان میں رکھ کر ہمیں شعر کی اس تعریف پر پورا پورا یقین آجاتا ہے کہ اسے حقیقت اور زندگی سے وابستہ ہونا چاہئے۔ مسدس ایک ایسی نظم ہے جس میں ہماری قوم کے خط و خال صاف صاف نظر آتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا ایک کامیاب مرقع ہے جس میں بیان نے اس کی شہرت اور اثر میں کافی اضافہ کیا ہے۔ جہاں اس میں اخوت، ایثار، ہمدردی، وفا، محبت، الفت، شجاعت، ہمت، عالی حوصلگی، فراخ دلی، سخاوت، قربانی، بہادری، رحم، انصاف اور بے تعصبی کے سبق دئے گئے ہیں وہاں ہماری قوم کے ادبار، حسد، لالچ، ریاکاری، مکاری، دغا، فریب، حق تلفی وغیرہ کے تیز نشتر بھی پوشیدہ ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں اور جن کی تیز نوکیں رگِ جاں کو چھیڑتی ہیں۔ مگر ان نشتروں میں بھی ایک مصلحانہ شان ہے، اور یہ وہی تاثیر رکھتے ہیں جو کہ ایک کامل جراح کے نشتر، جو زخم کے اندرونی حالات تک واقف ہوتا ہے۔ ہم مولوی عبدالحق صاحب کے قول سے بالکل اتفاق کرتے ہیں کہ "یہ تیز نشتر غمگسار سرجن کے ہیں نہ کہ بے درد بد اندیش کے"

مسدس کے زندۂ جاوید ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ بھلا جو نظم ایسے جواہرات سے مالا مال ہو جن کی چمک دمک میں کبھی کمی نہ آئے بلکہ جس میں اضافہ ہوتا ہو اُس کی مقبولیت کا کیا کہنا ہے وہ تو ہر زمانہ ہر عہد میں ایسی ہی تازہ رہے گی۔ گویا خضر نے اسے آبِ حیات سے سینچا ہے۔ قومی لیڈروں کے لئے اس میں رہنمائی کے گر ہیں۔ اور ادب کے چاہنے والے ہمیشہ اس میں ادب کی چاشنی اور تازگی پائیں گے مسلمان قوم اس وقت تک اسے پڑھ کر آنسو بہاتی رہے گی جب تک کہ وہ اپنی تباہی سے نہ نکل جائے گی۔

ڈاکٹر راس مسعود کا قول ہے "میرا عقیدہ ہے کہ اگر مولانا حالی مرحوم بیش بہا ادبی خدمت اردو کی نہ کرتے جو اُنھوں نے کی تو ہما تک ہماری شاعری کا خاتمہ ہو جاتا اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہوتی جس کو پیش کر کے ہم یورپ کی شاعری کا مقابلہ کرتے۔ مسدس میں چند بند ایسے ہیں جن سے بہتر دنیا کی کسی قوم کے ادب میں آج تک کوئی چیز نہیں لکھی گئی! میرا اشارہ اُس حصّے کی طرف ہے جہاں بغداد کے عروج کو بیان کر کے اُس کا زوال دکھلایا گیا ہے۔ جب تک اس دنیا میں ہماری مادری زبان رائج ہے۔ الطاف حسین حالی کا نام نہیں مٹ سکتا اور نہ اس اثر میں کمی واقع ہو سکتی ہے جو اُن کے ذریعہ سے ہمارے ادب پر پڑا ہے۔ مولانا مرحوم کی نثر بھی لاجواب ہے اور نظم میں بھی وہ سادگی پائی جاتی ہے جو ہمیشہ سچے جذبات کی بہترین نشانی ہے"

مسدس کی یہ مقبولیت کہ اس کے بہت سے بند دلوں پر نقش ہو گئے ہیں اور زبانوں پر چڑھ گئے ہیں لوگ انھیں پڑھ کر سر دُھنتے ہیں کچھ تو اس وجہ سے کہ مسلمانوں کو اندلس کے مسلمانوں کے عروج و زوال سے واقفیت تو انھیں بندوں کے ذریعے سے ہوئی اور وہ بھی ایسی داستانِ غم سے، اس جادو اثر کلام کی بدولت واقف ہوئے اور کچھ اس میں حالی کا اخلاص بھی پوشیدہ ہے۔ اردو کے ایک ثبت ادیب کا قول ہے کہ ادب و شاعری میں اخلاص و صداقت کا رنگ ادیب یا شاعر کی طبیعت سے پیدا ہوتا ہے یہ حالی کی بہتر

[1] انیس تو انیس دبیر کے لئے بھی آپ ایسا نہیں فرما سکتے۔ میر انیس تاؤ الکلامی اور آرٹ کے لحاظ سے دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر وں میں ایک منفرد شاعر ہیں۔ ایک نہایت نفیس دلیرانہ انداز ہونہ انیس بھرتی کے شعر کہہ کر سلسلے کی چول بٹھاتے ہیں اس کے کلام میں ثبات اور ترقی تاثیر اور ساتھ ہی ایک "آہنگ" ہے جو دوسرے شعرا میں نہ پائی جاتی ہے۔ — اعظمی

ہو کہ مسدس اس قدر مقبول ہو۔

مسدس میں صرف یہی نہیں ہو کہ قوم کے زوال کی داستان پُردرد طریقے میں بیان کردی ہو بلکہ اس میں وہ طریقے بھی بتائے گئے ہیں جن سے یہ زوال آمادہ قوم پھر راہِ ترقی پر گامزن ہو سکتی ہے۔ اس قوم کا ستارہ پھر چمک سکتا ہے اس کی دلچسپی کی شان ایسی ہے کہ جب کسی شخص کا کوئی قریبی عزیز مرجاتا ہو اور وہ مکان پر واپس آکر اس کی بیماری، اس کی موت کا کل قصہ سنتا ہے تو اس قصے سے اسے تسکین ہوتی ہے۔ یہی حالت مسدس کی بھی ہے کہ اس میں قوم کی کیفیات صحیح ہیں جو ابھی حال ہی میں گزری ہے۔ حالی نے مسدس میں جن ناخوشگوار واقعات کا ذکر کیا ہے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کو اپنی قوم کی موت پر نہیں بلکہ اُس کی زندگی پر سخت حیرت ہے۔

اقبال نے اسلام پر نوحہ کرنے والوں پر حالی کا نام نہیں لیا وہ کہتے ہیں

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر　　　　داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی　　　　ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

خود اُنھوں نے اپنے آپ کو مسلی کا محرمِ غم کیا ہے اور اس کے زوال پر آنسو بہائے ہیں۔ مگر ہم حالی کو اس موقع پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی نے شیراز کی تباہی پر نوحہ کیا اور اندلس کی بربادی پر ابن بدرون نے اپنا دل دوز نوحہ سنا کر مردہ قوم کے تازہ زخموں پر نمک پاشی کی۔ کیا ہم حالی کو اس موقع پر بھول جائیں۔ حالی نے ان سب سے بلند کام کیا۔ انھوں نے صرف اپنے ملک کی بربادی پر ہی ماتم نہیں کیا۔ بلکہ سارے اسلامی ممالک کے زوال پر روتے روتے ہوئے خون بہادی۔ عرب، ہندا، اندلس، شام و دیلم غرض ہر جگہ کی تصویر حالی نے مسدس کے پردہ سیمیں پر پیش کر کے قوم کے دل کو گداز کردیا۔ اس تصویر میں اُنھوں نے بغداد کا حریم خلافت اندلس کا بیت الحمرہ غرناطہ کی شوکت بلنسیہ کی اشبیلیہ کے محراب ودر اور قرطبہ کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر سنجار اور کوفہ کے میدان سمر قند و مراغہ اور زافیلون کے رسد خانے سب کے بعد دیگرے دکھائے اور دیکھنے والے پر عجب کیفیت طاری کردی۔ یہ سب کچھ قوم کی رگِ حمیت کو جوش میں لانے کے لئے کیا گیا۔ ساری قومی تاریخ ایک جگہ موثر پیرائے میں بیان کردی۔ رونے کے علاوہ ذرا خودداری و فخر و غرور کی چاشنی بھی تھی۔ عرب کی حالت، رحمتِ عالم کی بعثت، قرآنِ کریم کی تاثیر، اسلام کا شکوہ، فتوحات کی وسعت، علوم و فنون کی ترقی، علماء اور حکماء کا کمال، تعمیر بلاد، سیر و سیاحت، اور بغداد و اندلس کے قابلِ فخر آثار میں خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ نظم کئے گئے کہ مسلمانوں کو فقیری میں بادشاہی کا مزہ آگیا۔ یہ مسدس ہی تھا جس نے اُن کے جھکے ہوئے سر غرور سے بلند کردئے اور ان کی ماضی کی عظمت اس موجودہ نکبت و ادبار میں بھی تسکین کا باعث ہوگئی، یہ صرف حالی پیرایۂ بیان کا نتیجہ تھا۔ ورنہ حالی جیسے شاعر و مصلح کے ہاں کہ جن کا ہاتھ سینہ کوبی میں مشغول اور جن کی آنکھ سے جوئے خون رواں تھی ایسے زوال دیدہ کی داستان میں سرمایۂ تسلی کہاں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو حالی کے کلام میں بھی صاف صاف امید کی جھلک ملتی ہے۔ ورنہ حالی کی شاعری صرف اس کی مصداق ہوتی۔

سینہ کوبی میں رہے جبتک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

مگر غم و فخر کے سرمایہ کے ساتھ اس عجیب و غریب تصنیف میں موجودہ وقت کا احساس دلا کر آئندہ کی فکر کا سامان بھی موجود ہے "شامِ غم" صبحِ امید کی خبر دیتی ہے۔ اور ظلمتِ شب میں آفتاب کی کرن بھی نظر آجاتی ہے۔ صرف کمزوریوں کا راز ہی فاش نہیں کیا گیا بلکہ انھیں مٹا ڈالنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ وہ سب کے سب قابلِ عمل ہیں، صرف احساس کے نشتر چبھو کر فصد خون ہی بہایا نہیں گیا ہے بلکہ ان زخموں کی مرہم پٹی بھی کردی گئی ہے۔ جن دماغوں کو اپنے تنزل کا احساس ہوجاتا ہے انھیں اپنی ترقی کے آثار بھی نظر آجاتے ہیں حالی نے ضمیمہ میں صاف صاف شاہراہ دکھائی ہے جو مسلمانوں کی آمد کے لئے بے قرار ہے۔ اور جس پر چل کر مسلمان اعلیٰ مقاصد کو پھر حاصل کرسکتے ہیں۔

سب سے آخر میں حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں عرض کرکے قوم کے لئے موثر الفاظ میں دعا کی ہے۔ حالی صاف صاف بتاتے ہیں کہ دعا میں بڑی تاثیر ہے اور یہی تدبیر مسلمانوں کے سنبھلنے کی ہے۔

تدبیر سنبھلنے کی نہیں کوئی ہمارے
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے

صاف صاف بیان کردیا ہے کہ مسلمانوں کو دین کی فکر ہے۔

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں　　　　پر فکر ترے دین کی عزت سے سوا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں عزت ہے ہماری　　　　اُمت تری ہر حال میں راضی بہ رضا ہے

زندگی اسی کلام کو نصیب ہوئی ہے اور بجا نصیب ہوئی۔ اس کی شہرت اور زندگی ہم فانیوں کے تخیل کی پرواز سے بلند و بالا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اردو شاعری میں صرف

مسدس حالی کے اور کوئی چیز نہ ہوتی تو بھی آج دنیا کی بڑی سے بڑی زبانوں سے مقابلہ کر سکتی تھی۔ حالی اگر مسدس کے سوا کچھ اور نہ کہتے تو یہ اُن کی شہرت کے لئے دنیا میں اور بخشش کے لئے عقبیٰ میں کافی تھی۔ پھر سرسید کا یہ قول کہ قیامت میں جب خدا مجھ سے سوال کرے گا کہ دنیا سے کیا لایا تو کہہ دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں کسی حیثیت سے بھی قابل تردید ہے؟ کہیں کبھی گنجائش ہے کہ اس میں قلم لگایا جا سکے؟ اُردو شاعری میں اگر مسدس کو چھوڑ کر کل قومی شاعری میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دی جائے اور مسدس دوسرے میں تب بھی مسدس کا پلہ بھاری رہے گا۔ اور اگر بلحاظ مقبولیت دیکھا جائے تو ابھی تک کسی ایک نظم کو کسی ادب میں اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ بچوں سے لے کر بوڑھے تک اسے پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ مسدس پر ایک نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مرثیہ ہے۔ مگر پھر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس مرثیہ میں ایک تعمیری شان ہے اور یہی اس کے لطف و دلچسپی کا باعث ہے جو روز افزوں ترقی پر رہے گا۔

حالی نے ایک جگہ مقدمۂ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ مثنوی سے ابھی تک وہ کام نہیں لیا گیا ہے جس کام کے لئے کہ وہ موزوں ہے۔ مگر آج ہم بلا تکلف اور بلا تردد کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ اردو شاعری میں مثنوی سے وہ کام نہیں لیا گیا ہے جس کام کے لئے کہ وہ بنی ہے مگر مسدس سے وہ کام لے لیا گیا اور یہ صرف حالی کی بدولت ہے۔ مسدس واقعی اپنا منشا پورا کر چکا۔

مسدس حالی نے صرف اسلامی چمن کی آبیاری ہی نہیں کی بلکہ اُردو شاعری کے رُوئے زیبا سے ایسے بدنما دھبے دھو دئے جو تا قیامت مٹنے والے نہ تھے اور میرا خیال ہے کہ بلاشک بجائے میر انیس[۱] کے کلام کے یہ اشعار حالی کے مسدس پر زیادہ چسپاں ہیں۔

مری قدر کر اے زمینِ سخن	تجھے بات میں آسماں کر دیا
سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر	مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

ابو مسلم صدیقی، بی۔ اے (علیگ)

---

[۱] اس مضمون کا موضوع "حالی مسدس کے آئینے میں" ہے۔ اور وہی فرسودہ باتیں مسدس کے متعلق لکھی گئی ہیں جو بارہا کہی گئی ہیں۔ لیکن ایک بات۔۔۔۔ قطعی نئی ہے۔ یعنی مقالہ نگار نے کئی جگہ حالی اور انیس کا مقابلہ کر کے حالی کو انیس سے بہتر اور بڑا شاعر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دعویٰ اسی نظم کے متعلق اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کیا گیا ہے جس کو برسوں عوام و خواص میں مقبولیت حاصل رہی ہے لیکن اس نفسیاتی نکتے کے باوجود صدیقی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حالی اور انیس کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ جذبات کو اُبھارنے کے علاوہ انیس کی فن کارانہ حیثیت حالی سے کہیں ارفع اور بلند ہے اور انیس میں بہت زیادہ شعریت پائی جاتی ہے۔ حالی خطابت کے بھنور میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ انیس مرثیہ میں بھی شاعر ہی رہتا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں حالی اور انیس کا مقابلہ کرنے ہی کی کیا ضرورت ہے!؟ مدیر

مشرق میں عورت کا مرتبہ

چین کی عورتیں

چین ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کی عورتوں کو یہ ناز ہے کہ انھوں نے کبھی غیر ملکی تہذیب و تمدن کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔ چین کی عورتوں کی تہذیب و تمدن اور معاشرت و زبان ہمیشہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے ممیز رہی۔ اس کی وجہ ان کی قوم پرستی میں مضمر ہے۔ اُن کے خمیر میں وطن کا احساس ہے۔ اُن کی طبیعت میں یہ میلان نہیں ہے کہ جہاں کسی ملک کی تہذیب یا کسی اور طرز کو دیکھا اور قبول کر لیا۔ وہ اپنے اصولوں پر بڑی سختی سے کاربند ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کی حالت دنیا کے دوسرے ملکوں سے جدا ہے۔ چینی عورتوں کی معاشرت اس ملک میں بہت ابتر رہی ہے۔ چینی مذہب کے ناخدا کنفیوشش نے عورتوں کو گھر کی دیگر چیزوں میں شمار کیا ہے اس کا خیال ہے "عورت صرف بقائے نسل کے لئے ہے اور اس کی پیدائش کا واحد مقصد مرد کی لطف اندوزی ہے۔ انھیں عقائد سے ایک چینی خاتون مان ہو دی مان جو ملکہ کی ہمعصر تھی، لکھتی ہے، "ہم بشریت کی آخری صنف میں ہیں۔ دنیا کی کمزور ضعیف ترین صنف ہم ہیں، وہ افعال و اعمال جو سب سے کمتر ہیں، ہمارا حصہ ہیں —— ہم زندہ ہیں لیکن مُردوں سے گئے گزرے —— ہم انسان ہیں لیکن انسان سمجھے نہیں جاتے۔ گھر کے پالتو کتے بلی جانوروں سے بھی بدتر، ہماری کوئی قیمت نہیں" ان متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں ہر انسان سوچ اور سمجھ سکتا ہے کہ عہد قدیم میں چینی عورتوں کی کیا قدر و منزلت تھی اور تہذیب و تمدن میں چینی عورت کی خانگی زندگی کیا تھی، اس زمانے میں چینی عورت صرف لونڈی سمجھی جاتی تھی اور اُس کا فرض یہ ہوتا تھا کہ گھر کا کھانا پکائے کپڑے دھوئے اور نہ صرف شوہر بلکہ پورے خاندان کی خدمت کو عبادت تصور کرے۔ یہ تھی آخری حد عہد قدیم کی، چینی عورتوں کی گھریلو اور خانہ دارانہ زندگی کی قدیم زمانہ میں نیو تہیم شو کے قول کے مطابق چینی عورتیں ایک سایہ یا آواز بازگشت کی وقعت و حیثیت رکھتی تھیں، یہ تھی اُن بیچاری عورتوں کی کسمپرسی اور بے بسی۔

جس طرح انسان کے جسم کی حرکت کے ساتھ ساتھ سایہ حرکت کرتا ہے یا اصلی آواز کے ساتھ آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے اسی طرح چینی عورتوں کو مردوں کے اشاروں پہ چلنا پڑتا تھا

ایک چینی عورت نے اپنے بچے کو مخاطب کر کے ایک نظم لکھی تھی جس کا مفہوم یہ ہے :-

"میرے بچے! میں عورت ہوں اور تیری ماں! گھر کی ظلمت ہوں اور قانون اور شوہر کی نظر میں حقیر۔ میں عورت ہوں اور تیری داد طلب شکوہ کرنے والی ماں! یہ دنیا اور دنیا والے میرے وجود کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ میرے وجود کا مقصد محض تفریح ہے۔

میرے زندگی کے تاروں میں غمگین نغمے لرزاں ہیں، پھر بھی میں ایثار و محبت کا ایک سبق ہوں، مبارک مجسمہ ہوں، میری ہی گود میں یہ قوم کے بہادر سورما پیدا ہوئے۔ میں نے ہی ان قومی ناخداؤں کو پالا، میری ہی آغوش میں پل کر، بڑھ کر مجھے یہ بھول گئے، میں عورت ہوں، جنت ہوں، اور پیارے بچے تیری ماں، میرے خون کے قطروں سے دودھ بنا اور دودھ کے قطروں سے پھر خون بنا، تمھارے جسم کو طاقتور بنا کر میں خود کمزور ہو گئی! بڑے ہو کر کہیں میرے خون کی قیمت نہ گرا دینا۔ میرے بچے! میری اُمیدیں تجھ پر لگی ہیں — میں تیری ماں ہوں، تم بڑھو، پھولو پھلو، اور بڑے ہو کر احسان فراموش نہ بنو، میری ہستی کو پہچانو، میری مظلومیت کو سمجھو، اور انصاف کو نہ بھولو، مانو یا نہ مانو میں قربان ہی ہوتی رہوں گی، میں تیری ماں ہوں، تمھیں سہارا دیتے دیتے تمھیں بڑا

کرکے خود بے سہارے ہو جاؤں گی، تمھارے ننھے مُنّے دماغ کو عقل سکھا کر خود بے عقل اور رکمزور ہو جاؤں گی، تم آج بے زبان معصوم ہو کل اپنی زبان سے میرے لئے قاعدے بنانا، تم کو میں نے انسان بنایا ہے۔ گوشت کے بے جان ناتواں جسم کو میں نے روح بخشی؛ میرے لختِ جگر! میرے بچے بڑے ہو کر بھول مت جانا میرے حقوق کو کسی نے نہیں سوچا۔ تمھارا فرض ہوگا کہ ماں کی لاج رکھو، اپنی مظلوم ماں کی عزت کرنا تم، ویسے نہ بن جانا جیسے کہ اور قوم کے سپوت ہیں، میں آس رکھتی ہوں کہ تم ماں کے وقار کو دنیا میں قائم رکھو گے، میرے سہارے! اپنے محسن سے دھوکا نہیں کرتے، میں تیری ماں ہوں! تمھارے جسم کے ہر حصے میں جو خون گردش کرتا ہے وہ میرے ہی جسم کا ٹکڑا ہے۔ خون ہے روح کا جو ہر ہے جو بہت سی امیدوں پر لٹا رہی ہوں اور لٹاتی رہونگی، میں وطن پرست ہوں، قوم پرست ہوں۔ تم بڑے ہو کر وطن پرست بننا؛ میری خوشی، میری تمنا، میری زندگی کا مفہوم بس تمھارے خیالات پر ہے؛ میں چینی عورت ہوں یا ایثار کا زندہ ثبوت؛"

میرے پیارے بچے! میں تیری ماں ہوں!!"

اس چینی عورت کی یہ نظم کس درجہ پُر معنی تھی اور اس کا مفہوم کتنا موثر، ظاہر ہے کہ یہ ایک قسم کا شکوہ ہے اور وہ بھی اپنے بچے سے

چین کی عورتیں دستکاری میں بھی بہت ماہر ہیں اور ہر قسم کی دستکاری میں کمال کرتی ہیں۔ معمولی معمولی ٹکڑوں سے وہ نہایت بیش قیمت بیڈ کور۔ ٹی کوری۔ ٹیبل کلاتھ اور نائٹ گون تیار کرتی ہیں جو ہندوستان میں کافی قیمت میں فروخت ہوتے ہیں۔ اُون کا کام بھی بڑی صفائی سے کرتی ہیں، بچوں کی فراکیں، موزے اور بنیائن نہایت خوبصورت تیار کرکے اپنے مردوں کے ہاتھ ہندوستان میں ہر سال فروخت کے لیے بھیجتی ہیں ہر ٹانکہ اتنا خوبصورت اور صاف ہوتا ہے کہ اُن کا ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے خصوصاً کڑھائی اور کتائی کا کام تو بہت ہی محنت سے بناتی ہیں۔ صحت اور تندرستی خاصی اچھی ہوتی ہے، البتہ پاؤں بہت چھوٹے ہوتے ہیں، بمشکل چل سکتی ہیں؛ یہ بھی عہدِ قدیم کا رواجی سلوک یا قانون اُن کے لئے ہے اور وہ اس پر بھی خاموشی سے کاربند ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ چینی عورت کی مظلومیت قابلِ رحم ہے اور اس کا صبر قابلِ تحسین ہے۔

مصرِ قدیم کی عورتیں

مصر کی قدیم تہذیب کو تمام تہذیبوں پر فوقیت حاصل ہے۔ بابلی، سامری، آشوری، عامری، اور دیگر قدیم اقوام کی طرح اہلِ مصر کے حالات بھی تاریک تھے۔ فرانس نے نپولین کے دور سے اس کی تحقیق شروع کی۔ اسی زمانے کے شمپولون (Shampollion) نامی ایک طالبِ علم نے خطِ رمزی یعنی اہلِ مصر کے قدیم رسم الخط کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی اور اس علم کو حاصل کرنے کے شوق میں اس نے اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کر دیا۔ سب سے پہلے قبطی زبان کا علم صرف و نحو لکھا، یہ زبان قدیم مصری زبانوں سے نکلی تھی اور اہلِ یورپ اس کو ہیروگلیف Hieroglyphe یعنی متبرک زبان کہتے تھے۔ بعد میں اس زبان کو بہت ترقی ہوئی۔ بعد میں یہی زبان ہیراٹک (Hieratic) مقدس سمجھی گئی۔ مجھے اس زبان سے اور بحث سے صرف اُس زمانے کی عورتوں پر روشنی ڈالنی ہے اس لئے ان انکشافات سے جو نتائج اخذ کئے اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ دیگر قدیم قوموں کے مقابلہ میں مصری خواتین کا درجہ بہت بلند تھا، اس ملک کی عورتوں کو قوم کے افرادِ خاندان کا بانی کہتے اور سمجھتے تھے اور ترکہ بھی مصر کی عورتوں کو زیادہ ملتا تھا۔

کھانا پکانا۔ کپڑا بُننا۔ بچوں کی پرورش کرنا۔ آٹا پیسنا۔ اور اس کے علاوہ بازار میں تمام خرید و فروخت کرنا بھی مصری عورتوں کے فرائض میں داخل تھا۔

محققین نے مصرِ قدیم کے مشہور شہر طیبہ (Thebes) کا جو منظر کھینچا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو انتہائی فضیلت حاصل تھی تاریخِ مصر میں جابجا مصری عورتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔

عہدِ قدیم میں مصر میں خانہ داری کا نظام بہت زیادہ زبردست تھا مصری عورتوں نے سیاسیات میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے تین ہزار پانچسو سال قبل مصر میں ایک مشہور ملکہ گذری ہے جس کا نام حشپوت تھا اُس کے بنائے ہوئے قوانین دو ہزار سال تک تقریباً مصری عورتوں میں اور ملک میں رائج رہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں عورتوں کو جو درجہ مصر میں حاصل تھا وہ آجکل ترقی یافتہ خواتین کے لئے قابلِ رشک اور حیرت انگیز ہے۔

مصر کی عورتیں حسن میں بھی اور ملکوں سے کم نہیں ہیں کافی خوبصورت ہیں

معصرِ جدید کی عورت، سماج میں بالکل آزاد ہے اور مغربی اثرات سے متاثر ہے۔ لباس و معاشرت کے لحاظ سے اس میں اور ایک یورپین لڑکی میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

ہندوستان کی عورتیں

قدیم ہندوستان میں عورت کو خانہ داری کے ضروری کاموں کے علاوہ اعلیٰ خاندانوں میں تعلیم اور فنونِ سپہ گری بھی سکھائے جاتے تھے، راجہ وکرما جیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں جب ہر طرف امن کا دور دورہ تھا، عورتیں فنونِ لطیفہ کی تعلیم بھی حاصل کرتی تھیں اور گھریلو کاموں میں بھی ماہر تھیں، کوکن کے علاقہ میں عام طور پر مرد سپاہیانہ زندگی بسر کرتے اور عورتیں ضروریاتِ زندگی کے دیگر فرائض انجام دیتی تھیں۔

مسلمان مغل شہنشاہوں کے زمانے میں شہزادیوں شہزادوں کی طرح تمام کرتب اور اعلیٰ علم و ہنر، نیزہ بازی، بندوق چلانے اور دوسرے علوم فنون میں ماہر بنائی جاتی تھیں۔

مصوری اور موسیقی کو ان کی زندگی میں خاص دخل تھا۔ شعر و سخن سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ دستکاری میں شاید ہی کوئی کام ہو جو نہ آتا ہو۔ ذہانت قابلِ رشک تھی، اور تہذیب کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ، موجودہ وقت میں بھی مغل خاندان میں اس کے نشانات باقی ہیں اور انسانیت، اخلاق، مروت، ہمدردی کے جذبات قدرت نے نہایت فیاضی سے عطا کئے ہیں۔ گو سلطنت نہیں رہی، لیکن طبیعتوں میں آن بان وہی باقی ہے۔ زبان پر عبور حاصل ہے۔ باتیں کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح اردو بولنا اور سمجھنا صرف مغل خاندان کا حصہ ہے، ورنہ یوں تو سب ہی کہتے ہیں کہ اردو ہماری زبان ہے، عہدِ قدیم میں ہندوستانی عورتیں نہایت تندرست اور محنتی اور اپنے گھریلو کاموں میں ہوشیار تھیں، گھر کا کام بچوں کی پرورش اور خاندان کی خدمت، سب کچھ کرتی تھیں، اور کنبہ کے ساتھ تمام زندگی گذارتی تھیں، بہادر بھی تھیں۔

تاریخ میں ہندوستانی عورتوں کے کارنامے بھرے پڑے ہیں، رضیہ سلطانہ کی بہادری، عقلمندی۔ نورجہاں کی ذہانت اور وقار، سیتا جی کی وفاداریاں اور ضبط و استقلال، اور بھی مختلف عورتوں کا حال تاریخ میں ستاروں کی طرح درخشاں ہے۔ پڑھنے سے حیرت ہوتی ہے، یہ تو رہا عہدِ ماضی کا حال۔

اب موجودہ حال سنئے۔ ہندوستانی عورت درحقیقت ایک "معجونِ مرکب" یا مختلف غذاؤں کا مکسچر بن چکی ہے اور یہ سلسلہ چل رہا ہے نہیں معلوم یہ کب تک چلتا رہے گا اور کبھی منزل بھی سامنے آئے گی یا یوں ہی تھک کر منزل کے سامنے رہ جائیگی۔

اس وقت ہندوستانی عورتوں کے تین فرقے ہیں ایک وہ جو ترقی تعلیم تہذیب و اخلاق کے تمام مدارج طے کر چکی ہیں اور ان کا گھر اور لباس اور طرزِ معاشرت دیکھ کر یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ ہندوستان کی باشندہ یا ابھی ابھی ولایت سے واپس آئی ہیں۔ خدانخواستہ اگر نوکر کو بھی آواز دیں گی تو آسی انداز سے "بوائے" — ایسا کانوں کو محسوس ہوگا گویا پپیہا بولا۔ اردو زبان بولنا تو اُن کے مذہب میں جائز نہیں، اخبار، رسالے جو دفتر والے بیچارے کن کن امیدوں سے "بخدمت شریف" بھیجتے ہیں وہ اُن کے ہاں تو بہرا خانساماں وغیرہ ملاحظہ کرتے رہتے ہیں یا پھر ردی کے بطور الماریوں میں بچھائے جاتے ہیں اور اس کے بعد نذرِ آتش۔ کھانا خواہ مزے دار ہو یا بدمزہ لیکن کھایا جاتا ہے انگریزی، پھر خواہ تکلیف دہ ہو لیکن ہر وقت مکمل لباس انگریزی کیسی ہی باشد ضرورت ہو لیکن مجال نہیں کہ اردو میں بولیں خواہ گرامر بھی غلط ہو لیکن بولیں گی ہر وقت انگریزی۔ گھر میں شوہروں سے خواہ ہر وقت جوتا ہی چلتا رہتا ہو لیکن شام کو جب موٹر میں یا پیدل گھومنے جائیں گی تو نہایت شان سے ہاتھ میں ہاتھ ہوگا۔ اس طبقہ میں اگر کبھی شامت زدہ ہندوستانی بہنیں پہونچ جاتی ہیں تو حیران رہ جاتی ہیں۔

میں نام لینا مناسب نہیں سمجھتی یو۔پی کے ایک نہایت معزز گھرانے کی بہو بیگم میں نے ڈانس میں شریک ہوتے دیکھا وہ عام پبلک کے ساتھ اسکیٹنگ کرتے دیکھا (نہایت خوب مشاہدہ تھا۔ اس میں حیرت کی کونسی بات ہے!؟ ساغر)

یورپ کی باتیں یورپ جانے، یہ تو بدقسمت ملک ایشیا ہے۔

دوسرا طبقہ ہندوستانی عورتوں کا وہ ہے جس نے تعلیم کا غلط مقصد سمجھ لیا ہے۔ بڑی تیزی سے وہ ترقی کے راستوں پر دوڑ رہی ہیں۔ لیکن کس طرح؟ اُنھیں یہ تک نہیں معلوم کہ ہمیں کن کن کاموں میں حصہ لینا چاہیئے اور کس طرح؟ کچھ امیر دولتمند بہنوں نے انجمنیں قائم کر رکھی ہیں۔ کچھ محترم بہنوں نے اسکول کھول رکھے ہیں۔ لیکن اُن کے اصول بالکل غلط، مثلاً ایک دس بارہ لڑکیوں کو جمع کر لیا اور طوطے کی طرح اپنا خود ساختہ کورس رٹا دیا اور ہر آئے گئے سے یہ کہدیا

کریں نے قوم کے لئے یہ قربانی کی ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ سچ مچ کوئی قوم کی یتیم بچی بچہ ان کے سامنے آجائے تو یہ کہہ کر منہ پھیر لیتی ہیں کہ "کہاں تک قومی کاموں میں صرف کریں، آگے بڑھو ——— ان بہنوں کے گھر کی طرزِ معاشرت "آدھا تیتر آدھا بٹیر" والا مضمون ہے اور شہرت پسند ہیں، مضمون نگار ہوں یا نہوں شاعر ہوں یا نہوں لیکن اخباروں میں رسالوں میں نام دیکھ لیجئے۔ کچھ امیر بہنیں نذرانہ دیکر شاعروں کے خونِ جگر کی لکھی نظمیں، غزلیں حاصل کر لیتی ہیں، کچھ اپنے باپ، بھائی، شوہر کی مدد سے نامور بن جاتی ہیں۔

میں سمجھتی ہوں یہ تو کوئی بڑی بات نہیں کہ ہمارے پاس سرمایہ کم ہو لیکن ہاں یہ بڑی بات ہے کہ جو کچھ ادبی سرمایہ ہو وہ دوسروں کا ہو اور اپنی قابلیت بالکل صفر ہی ہو

تیسرے طبقے کی حالت یہ ہے کہ وہ "راہِ نجات" اور چند کتابوں سے آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھتیں اور جمعہ جمعہ آٹھویں دن نہانا کافی سمجھتی ہیں، بچوں کو مارپیٹ کر پرورش کر لیا، شوہر کو چیخ چیخ کر خاموش کر لیا۔ دن بھر چھالیہ پان کھاتی رہیں، دن کب نکلا، رات کب آئی؟ موسم کب شروع ہوا اور کب ختم، دنیا میں آجکل کیا ہو رہا ہے، سیاست کس چڑیا کا نام ہے، تاریخ کسے کہتے ہیں، جغرافیہ کیا بلا ہے، دنیا میں اُن کے پیدا ہونے کا کیا مقصد ہے؟ اس سے اُنھیں دُور کا بھی واسطہ نہیں، یہ بیچاریاں اگر کبھی کسی پڑھی لکھی عورت کو اچانک دیکھ لیں تو جھٹ مکان کے کسی کمرے میں چھپنے کی کوشش کرتی ہیں، مرد بھی خوش ہیں اور یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ پڑھنے لکھنے سے فیشن بڑھ جاتا ہے۔ "دیکھو نا وہ فلانے تعلقدار کی لڑکی فلاں یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھ پڑھ کر خراب ہو گئی یا پڑوس میں دیکھو ڈپٹی کی بیوی کو ——— پڑھی ہوئی بہت ہے تو ہر وقت جگھٹا لگا رہتا ہے۔ بعض وقت تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ کوئی شریف زادی کا مکان ہے یا . . . . کا ——— اور میاں ہیں کہ بس غلام بنے ہوئے ہیں توبہ توبہ میں ہوتا تو جان لے لیتا یا زہر کھا لیتا وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہے ہندوستان کے موجودہ طبقوں کا نمونہ اور ذہنیت پہلے طبقے میں تو خانہ داری کا کچھ کام ہی نہیں، دوسرے طبقے میں خانہ داری کا کام طوعاً و کرہاً کیا جاتا ہے اور وہ بھی بے دلی سے۔ تیسرے طبقے میں چونکہ پیسہ کم ہے اس لئے خانہ داری کے جھگڑے بھی کم ہیں اور لے دے کر ایک سالن روٹی کا پکانا۔ سو وہ دو وقت پکا لیا، کھایا پیا آرام سے سو گئیں۔

موجودہ وقت کی ہندوستانی عورتیں اس بات کو بھول چکی ہیں کہ عہدِ گزشتہ میں ہر طبقے کی عورتوں میں صنعت و حرفت کا زور تھا دستکاریوں میں کوئی کام ایسا نہ تھا کہ نہ آتا ہو۔ آج اگر ہم نمونہ کے لئے وہ تمام کام دیکھنا چاہیں تو مفقود ہیں، ہاں کہیں کہیں شاہی خاندانوں میں آنکھوں کی عبرت کے لئے وہ دستکاریاں موجود ہیں۔ یہ میں نے بہت مختصر لکھا ورنہ ابھی بہت سے مسئلے باقی ہیں۔

فرائض کی تفریق، حقوقِ نسواں پر بحث، طرزِ معاشرت، خانہ داری وغیرہ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میرے یہ آخری فیصلہ کُن الفاظ ہیں کہ موجودہ ہندوستانی عورت قوم کے لئے ایک بوجھ ہے گھر والوں کے لئے ایک زندہ لاش ہے۔ اپنی ہم جنس کے لئے بجائے سبق کے ایک زحمت ہے۔ کبھی ہندوستانی عورتوں کے لئے مشہور فلاسفروں کا قلم اُٹھتا تھا۔ ادیب افسانے لکھتے تھے۔ اُن کی ہمت ذہنیت، جانفشانی کے کارنامے وردِ زبان تھے۔ آج وہ تمام خوبیوں کے سرمایہ سر پیٹ رہے ہیں۔ مٹے ہوئے نقش ہندوستانی عورت کی خصلت دُہرا رہے ہیں کہ کیا تھیں اور کیا ہو گئیں۔

شفیق بانو بیگم

۱۳

برما کی عورتیں

(از ادارہ)

برمی عورتوں کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ سماجی اور اقتصادی حیثیتوں سے قطعی آزاد ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ سوائے سوویٹ یونین دنیا کے کسی ملک میں بھی عورتوں کو اس قدر آزادی میسّر نہیں ہے جس قدر کہ برما میں۔

جب ہم لوگ ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے تو ہم سے برما کی عورتوں کے متعلق سوالات کئے گئے۔ ہم نے اُن سوالات کے جوابات حتی الامکان دیئے، مگر وہ جوابات غیر یقینی تھے، کیونکہ باوجود سیاسی جدوجہد کے ہم برما کی عورتوں کے متعلق بہت کم علم رکھتے تھے۔

نیشنل پلاننگ کمیٹی کی ویمن کمیٹی (Women Sub Comm-ittee of National Planning Committee)

کے ممبروں سے جب عورتوں کے مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا اور اس سلسلے میں جو کچھ معلومات فراہم ہوئیں اُن سے یہ پتہ چلا کہ عورتوں کے مسائل کو سمجھنا تو درکنار ہم خود عورتوں کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتے۔

بہرحال ہندوستان کے عوام کو برما کی عورتوں کے صحیح حالات سے آگاہ کرنے اور برمی عورتوں کے متعلق خود اپنے علم کو وسیع کرنے کے لئے میں کوشش کروں گا کہ جو مسائل اب تک ہمارے لئے پس پردہ تھے اُن کو ظاہر کر دیا جائے۔

سماجی حیثیت سے برمی عورتیں قطعی آزاد ہیں۔ اُن کے لئے پردہ ہی نہیں بلکہ اور بھی کوئی ایسی سماجی پابندی نہیں ہے۔ سماج میں اس کی حیثیت بالکل مساوی ہے، وہ مرد کے ساتھ ساتھ آزادانہ چل پھر سکتی ہے، باہمی منافرت بہت کم پایا جاتا ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو وہ قدیم سماج یا شاید ہندو تہذیب کی بوسیدہ یادگار ہے، اور وہ بھی خیالات کے امتزاج اور برمی نسائیت میں سماجی بیداری کی ترقی کے ہاتھوں ختم ہوتا جا رہا ہے۔

خاندانی زندگی میں باپ برائے نام گھر کا مالک ہوتا ہے، حقیقت میں ماں ہی حکمرانی کرتی ہے، وہی تمام خاندانی زندگی کی تنظیم کرتی ہے اور خاندانی روایتوں کو قائم رکھتی ہے۔

برمی عورت ملکیت کا حق رکھتی ہے، یہ حق ایک بیوہ عورت کو بھی ہوتا ہے ایک بیوہ کو دوسری شادی کرنے کا حق ہوتا ہے، بلکہ شادی کے سلسلے میں بعض وقت کنواری لڑکیوں پر بیوہ عورتوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ اپنی ملکیت پر پورا قبضہ ہوتا ہے۔ برما میں شادی کو مذہبی یا روحانی معاہدہ کے بجائے کاروباری معاملہ سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی قاعدہ ہے کہ چاہے لڑکی اور لڑکا دونوں اپنی خوشی سے شادی کریں مگر خاندان کے بزرگوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی خوشحالی کا خیال رکھیں۔

گذشتہ چند سالوں میں ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں جن سے "آزاد محبت" اور "معاہدہ کی شادی" کی مخالفت اور اس پر اعتراضات کا ہونا پایا جاتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہ مالی مشکلات کی وجہ سے والدین اپنی لڑکی کی شادی زبردستی ایک ایسے شخص سے کر دیتے ہیں جس سے لڑکی کو کوئی تعلق خاطر نہیں ہوتا اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لڑکی کسی مرد کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور اس وجہ سے اُس کو حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ مگر آخرکار والدین اور لڑکیوں میں صلح ہو جاتی ہے۔

مستثنیات کو چھوڑ کر شادی کے معاملہ میں زیادہ تر لڑکے اور لڑکیاں آزاد ہی ہوتے ہیں۔

برما میں بچپن کی شادی کا رواج بالکل نہیں ہے۔ ایک فرقہ "ارکان" ایسا ضرور ہے جس میں شادی کی رسم عجیب سی ہے۔ اس فرقہ میں ایک لڑکی کی منگنی ایک لڑکے سے بچپن میں ہو سکتی ہے لیکن لڑکی اور لڑکے کو ساتھ رہنے کی اجازت اُسی وقت ہوتی ہے جب لڑکی بالغ ہو جاتی ہے۔

شادی کے لئے لڑکی کی عمر کم از کم بیس سال اور لڑکے کی عمر پچیس سال ہونا ضروری ہے لیکن اب عمر کی کمی کو دیکھتے ہوئے اور یہ سمجھ کر کہ یہ صرف رسمی سی بات ہے برما والے اس سے کم عمر میں شادی کرنے کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس قدر پختہ عمر میں شادی ہونے کے باوجود برما میں بچوں کی شرح اموات اتنی زیادہ ہیں کہ ہندوستان کے کسی صوبہ میں اتنی نہ ہوں گی اس کی وجوہ غالباً یہی ہو سکتی ہیں کہ مناسب ڈاکٹری امداد نہیں ملتی۔ زچہ گیری کے پرانے اصول اب تک جاری ہیں اور مزید یہ کہ خاندانوں کے اقتصادی حالات بھی بہت خراب ہیں۔

برما کے مختلف فرقوں میں آپس کی شادیوں پر اعتراض کرنے کے بجائے انھیں مبارک سمجھا جاتا ہے، اس سے متحدہ قومیت کی تعمیر ہوتی ہے، لیکن دوسری قوموں کے افراد سے شادیوں پر سخت نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان نسلوں کی تباہی اور قومی تنزل ہوتا ہے، ایک اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ یورپین اقوام اور چینیوں کے ساتھ شادیاں ہوئے پر اس قدر اعتراضات نہیں ہوتے ہیں جس قدر ہندوستان والوں کے ساتھ شادیاں کرنے پر ہوتے ہیں کسی یورپین کے ساتھ شادی کر کے ایک برمی عورت نئی زندگی اختیار کر سکتی ہے کسی چینی کے ساتھ شادی کر کے بھی برمی عورت کی زندگی۔ اس کے سماجی اصول اور اس کا مذہب سب قریب قریب اُسی طرح قائم رہتے ہیں لیکن کسی ہندوستانی کے ساتھ شادی کر کے برمی عورت کو سماجی زندگی اور مذہب کے اعتبار سے بالکل مختلف ماحول ملتا ہے اس کے علاوہ برمی عورتوں کا Personal Law ہندوستانی مردوں کے Personal Law سے متصادم ہو جاتا ہے مجموعی طور پر دوسری قوموں سے شادیاں قابل اعتراض سمجھی جاتی ہیں۔ جہاں تک برمی عورتوں کی تعلیم کا تعلق ہے وہ کافی ترقی یافتہ ہیں، قدیم زمانے میں مذہبی اسکولوں کے ذریعہ عوام کو تعلیم دی جاتی تھی، ان اسکولوں میں تعلیم کے واسطے لڑکیاں نہیں جاتی

تھیں۔ اس کے بجائے لڑکیاں اپنے گھروں پر یا تو ان فقیروں (بودھ مذہب کے علماء) سے تعلیم پاتی تھیں جو روزانہ خیرات لینے آتے تھے یا اپنے خاندان کے بڑوں اور بزرگوں سے پڑھتی تھیں، ان کو ابتدائی تعلیم اور گھریلو صنعت و حرفت سکھائی جاتی تھی۔ جب لڑکیاں بڑی ہو جاتی تھیں تو ان کو نہ تو مزید تعلیم ہی دی جاتی ہے اور نہ گھر کے کاموں سے انھیں اتنی فرصت ملتی تھی کہ وہ اپنا مطالعہ جاری رکھ سکیں

برما کی لڑکیاں عام اسکولوں میں مذہبی طریقۂ تعلیم کی خرابی ہوتے ہوئے تعلیم پاتی ہیں، اُن کی تعلیم یا تو ابتدائی ہوتی ہے یا ثانوی۔ عام طور پر اعلیٰ تعلیم کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی ہے۔ کیونکہ سب کا یہ خیال ہے کہ لڑکی چاہے کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو جائے اُس کا کام گھر کی دیکھ بھال ہوگا اور اُس کا خاوند اُس کے لئے کمائے گا اور اگر اسے اپنے گذارے کے لئے خود بھی کمانا پڑے، تب بھی اسے زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔

تعلیم یافتہ لڑکیاں یا تو تعلیم دینے کا پیشہ اختیار کرتی ہیں یا نرسیں (nurses) بن جاتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسی ہوتی ہیں جو شادی کے بعد اپنے کام کو خیرباد کہہ دیتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں بیکاری اور افلاس کی زیادتی کی وجہ سے بہت سے جوان شادی کو ایک قسم کا اقتصادی بار سمجھتے ہیں اور وہ شادی کے لئے اس قدر جلد تیار نہیں ہوتے جیسے پہلے ہو جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں تعلیم دینے اور نرس بننے کے علاوہ دوسرے کاروبار بھی اختیار کر لیتی ہیں اور ان میں سے اکثر شادی کے بعد بھی اپنا کاروبار نہیں چھوڑتیں؛

اس لئے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے۔ اگر متوسط طبقے کی برمی عورتیں اچھی کمانے والی ہوتی ہیں، رنگون سے باہر اور رنگون میں بھی تقریباً تمام دکانوں اور کارخانوں کا کاروبار عورتیں چلاتی ہیں۔ برما کی عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ عملی اور کاروباری ہوتی ہیں، وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ منتظم بھی ہوتی ہیں، وہ کاروبار کو ترقی دینے اور حسابات کو صحیح رکھنے کے طریقوں سے واقف ہوتی ہیں، چنانچہ قدرتی طور پر وہ کاروبار جن کی منتظم عورتیں ہوتی ہیں اُن سے زیادہ بہتر ہوتے ہیں جن کا انتظام مردوں کے سپرد ہوتا ہے، برما میں متوسط طبقے کے مرد کاروباری لحاظ سے اس قدر نااہل ہوتے ہیں کہ اُن کے کاروبار یا تو ناکام ہو جاتے ہیں یا پھر اتنی ترقی نہیں کر سکتے جتنی کرنی چاہیے'
مزدوروں میں بھی برمی عورتوں کا جوش و خروش اور محنت کم نہیں ہے۔ وہ مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں۔ برمی مزدوروں عورتوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک صنعت و حرفت کا کام کرنے والی اور دوسری زراعت پیشہ صنعت پیشہ مزدوروں میں عورتوں کی تعداد کم پائی جاتی ہے۔ بڑی بڑی صنعتوں میں عورتوں کو کم مقرر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر چاولوں کے کارخانوں اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں عورتیں کام کرتی ہیں۔

آزادی

انھیں ویرانیوں کو جنتِ مسرور کردوں گا
یہی غمگیں فضا نغمات سے معمور کردوں گا
خدا وندانِ زر کو بندہ مجبور کردوں گا
نگاہِ تیز سے ساغر دلوں کے چور کردوں گا
وطن کی خاک کے ذرّوں کو رشکِ طور کردوں گا
حجاباتِ غلامی بڑھ کے یکسر دُور کردوں گا

طلسمِ بزمِ عشرت ایک دم میں ٹوٹ جائیگا
لرز کر ہاتھ سے دامانِ ہستی چھوٹ جائیگا

اُلٹ دوں گا نقابِ شاہدِ رعنائے آزادی
نظر آئے گا بے پردہ رُخِ زیبائے آزادی
شہیدوں کا لہو ہوگا جمال آرائے آزادی
بہار افروز ہوگا جلوہ لیلائے آزادی
محیطِ دہر ہوگی وسعتِ پہنائے آزادی
دماغِ بندگی ہو جائیگا شیدائے آزادی

انھیں تاریکیوں سے ہوگا وہ نورِ سحر پیدا
جو ذرّوں میں کریگا مہرِ تاباں کی نظر پیدا

فسونِ ساحرانِ مغربی کم ہوتا جائے گا
رہا زنجیرِ زرداری سے عالم ہوتا جائے گا
ربابِ عیش، سازِ نغمہ غم ہوتا جائے گا
طرب افزا ترانہ، شورِ ماتم ہوتا جائے گا
نظامِ کائناتِ جور برہم ہوتا جائے گا
یہی وحشت کدہ خلدِ مجسم ہوتا جائے گا

بہارِ تازہ پیدا ہوگی خونِ لالہ افشاں سے
طلوعِ صبحِ نو ہوگا ہر اک چاکِ گریباں سے

شرقی الہ آبادی

ایشیا دسمبر ۱۹۳۱ء

رُوس کا نظامِ تعلیم

(اشتمالی تعلیم کے اصول عملی نقطہ نگاہ سے)

(ترجمہ)

ذہنی آزادی

یہ اصول فطری ہے کہ کسی چیز کی بے پناہ تبلیغ ہی انسان کو اُس کام کے کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور جب کسی سیاسی یا انقلابی تحریک کی تبلیغ اسی نقطۂ نگاہ سے کی جائے تو انسان میں انقلابی اور سیاسی جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہ جذبہ بڑھ کر ایک ایسی شکل اختیار کرتا ہے کہ حکومت یا جماعت انسان کی ذہنی آزادی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں کہ وہ مجبور ہی ہو جاتی ہے بلکہ اسے جدید آزادی حکومت طلب آدم کو یا جماعت کی طرف سے ذہنی آزادی کا درجہ عطا کرنا پڑتا ہے۔ اسی سیاسی تبلیغی مطمحِ نظر کا انقلاب ممالکِ روس میں سخت اور کٹر اشتمالیت کا باعث بنا۔ اور باشندگانِ روس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ذہنی آزادی کا جذبہ دوڑ گیا۔ انسان کو اُس کے مادۂ عقل و فہم اور سوچ وچار کی حد تک انفرادی حیثیت سے ذہنی آزادی عطا کی گئی۔ اُسے عقلی حدود اور منظم طریقے پر "جہدی طریقے" کو کامیاب بنانے کی آزادی دی گئی اور اُس کی کامیابیوں پر حوصلہ افزائیاں بھی کی گئیں۔ لیکن ایسے ذریعے جن میں انسان دوسروں کے سہارے اپنے سوچ بچار اور عقل و فہم کی گاڑی چلا سکے، مسمار کر دیا گیا۔ آئیے اب دیکھیں کہ اس نقطۂ نگاہ کے بموجب فلسفۂ اشتمالیت نے اپنے بچوں، اساتذۂ مدارس و جامعہ کو کس قدر ذہنی آزادی عطا کی۔

ظاہر ہے کہ ذہنی آزادی کے بغیر تو فلسفۂ اشتمالیت کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی تھی پھر بڑی عمر کے لوگوں کو یک بیک مکمل ذہنی آزادی بغیر کسی تربیت کے دے دینا فلسفۂ سیاست کے لحاظ سے مضرت رساں ہے یہ پڑھ کر سوال کرنے والا بغیر یہ دریافت کئے نہیں رہ سکتا کہ اشتمالی حکومت نے اشتمالی عوام کو کس طرح ذہنی آزادی عطا کی، وہ کیا تھی اور کس حد تک تھی۔ یہی تو مجھے اس وقت بتانا ہے۔ اشتمالی حکومت نے سب سے پہلے اپنے بچوں، اساتذۂ مدارس، علمائے جامعہ و عوام کو غیر متعصب اور غیر فرقہ وارانہ مسائل پر اُن کی عقل و فہم کے مطابق سوچ وچار کرنے کی مکمل آزادی دی۔ پروفیسر لاسکی (Laski) کو اشتراکی جمہوریہ کے دار القانون میں ایک تقریر "نمائندہ حکومت" پر کرنے کی دعوت دی گئی۔ اور اس تقریر کے ذریعہ حکومت نے لاسکی کے ذریعہ اپنے بچوں اور اساتذہ پر اپنی ذہنی آزادی کے نقطۂ نگاہ کو واضح کیا۔ لاسکی نے نہایت صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ حکومت عوام میں کس قدر ذہنی آزادی چاہتی ہے۔ اس نے کہا:—

"ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر ایک شخص میں یہ جذبہ اور سمجھ پیدا ہو جائے کہ ہر فرد اور جماعت اپنے جائز مطالبات صاف طور پر ہم سے کہہ سکے، ملک کی تمام قانونی انجمنوں، اداروں اور خود حکومتی اداروں میں ہم بغیر کسی خوف کے نہایت آزادانہ طور پر اپنی ملکی، اور سماجی حالت کے

ایشیا، دسمبر ۱۹۴۰ کو

ہر پہلو پر سوچ وچار کر سکیں۔ آج دُنیا کے ممالک میں جس طرح طلبا اور عوام وغیرہ کے جذبات اور خیالات کچلے جا رہے ہیں ہم اُس سے واقف ہیں لیکن ہم دُنیا پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے نظریئے دُنیا سے کس قدر مختلف ہیں۔ ہم یہ دُنیا کو دکھا دینا چاہتے ہیں کہ عوام اور طلبا کو ذہنی آزادی دینے سے ملک و قوم کس قدر ترقی کر تی ہے اور کس درجہ بام عروج پر پہنچ جاتی ہے۔۔۔۔" اسی ذہنی آزادی کے فلسفہ کو پیش نظر رکھ کر جمہوریت اشتراکیہ نے سرمایہ دارانہ معاشیات کو روسی سکولوں میں پڑھانا بند کر دیا ہے۔ اعتراض ہو سکتا ہے، یہ کیا ذہنی آزادی ہے کہ طلبا کو تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ معترض کا یہ اعتراض کسی حد تک بجا ہو لیکن میں معترض سے یہ عرض کرنے کی جرأت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالے پھر ایسے اعتراض کرے۔ کیا معترض اس بات کا جواب دے سکے گا کہ آج دُنیا میں کہاں تصویر کے دونوں رُخ بتائے جاتے ہیں جو روس ہی بتائے۔ پھر سوویٹ روس کو دونوں رُخ بتانے کی ضرورت۔ اُس کی تو تصویر کا ایک ہی رُخ ایسا ہے کہ انسان پر یہ راز کھُل جاتا ہے کہ درونِ پردہ کیا ہوگا۔ پھر آپ خود ہی بتایئے کہ ایسی صورت میں دونوں رُخ پر روشنی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے آپ خود ہی دیکھئے کہ آج جہاں اس کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ جس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں وہاں کی حالت کیا ہے؟ ایسے مقامات کی حالت یہ ہے کہ طلبا کے دارالتفریح کی بندش صرف اس وجہ سے عمل میں لائی جاتی ہے کہ وہاں وہ انقلابی اور سیاسی گفتگو بحث ومباحثہ اور سوچ وچار نہ کر سکیں اور اُن کے جلسے منتشر کر دئے جاتے ہیں تاکہ اُن میں ایسے جذبات وخیالات نہ پیدا ہوں جو حکومت پر نکتہ چینی کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی بات چیت اور سوچ وچار ہمیشہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ حکومت کے اُس بے لاگ اور سرمایہ دارانہ نظام پر جو شب وروز وہ عمل میں لاتی رہتی ہے۔ آج ہم اُنہیں ممالک میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کس طرح ذہنی آزادی اور معاشیاتِ ملک کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا کیا جاتا ہے اور کس کس طرح سے ان دونوں کا خون ہوتا ہے۔ یاد رکھئے کہ جبتک روئے زمین پر معاشیاتی تحفظ نہیں ہوتا اُس وقت تک تمام دُنیا میں انسانوں کا ایک طبقہ ہمیشہ ایسا رہے گا جو اپنی دولت وثروت کے بل بوتے پر اور اسکے زعم ناقص میں دوسرے طبقے کو اپنے سے حقیر اور ذلیل سمجھتا رہیگا اور اس کا علاج وہ طبقہ کریگا جو آج حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا ہے جس کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور کاروبار کرنا معیوب گردانا جاتا ہے اُس وقت جب تمام عالم انسانی میں اقتصادیات ومعاشیات کے مسئلہ کا حل درپیش ہوگا اور جس وقت ایک معاشی انقلاب کی لہر اٹھے گی تب اس اہم حقیقت کو سمجھ سکے گا ذہنی آزادی کے سلسلے میں اسٹالن کی پیشین گوئی جو اُس نے اشتمالی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کی تھی آج جمہوریۂ اشتراکیہ کی حالت پر حرف بحرف صادق آ رہی ہے کہ " مابہ الامتیاز شئے کی منزل بسا اوقات اپنے جبر کی پوری اہمیت رکھتی ہے جو سابقہ غیر روشن خیال جذبات کے منافی ہے " اُس وقت سے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں سوویٹ روس کی حالت " قابل رشک " حد تک پہنچ گئی ہے۔ اسی نے جمہوریۂ روس کو اُس بلند بام عروج پر پہنچا دیا جس کی بنا پر آج دُنیا کی نگاہیں روس کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں اور اکثر قومیں اُس اشتمالی آندھی کے خطرے کو محسوس کر رہی ہیں جو سوویٹ روس سے بہت جلد اُٹھنے والی ہے لیکن یہ خوف وخطر فضول ہیں آنے والی بات ہو کے رہے گی۔ اس لئے بہتر ہوتا کہ وہ حفظ ماتقدم کے فلسفۂ حیات کو پیش نظر رکھ کر ابھی سے سنبھل جائیں ورنہ وہ وقت دور نہیں جب وہ یہ کہتی ہونگی کہ اب کیا ہوگا۔؟!

ذہنی آزادی پر بحث کرنے والے سے یہ بھی دریافت کیا جا سکتا ہے کہ ذہنی آزادی۔ روشن خیالی — آخر ہیں کیا بلائیں!؟ آیئے اس نکتہ کو بھی واضح کریں تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ یہ کیا بلا ہے؟ اس وقت سوویٹ روس میں ذہنی آزادی وروشن خیالی سے جو مراد لی جاتی ہے اور جن معنوں اور اصطلاحوں میں یہ سمجھی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ہر فرد وبشر نہایت آزاد اور صائب طور پر اپنی رائے کا اظہار کر سکے اپنی آزادانہ رائے بموقع انتخابات نہایت آزادانہ طور پر بلا کسی اثر یا سہارے کے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق دے سکے۔ آج ہم

جب اسکے تحت سوویٹ روس کی ملکی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں نہ تو بھوکے ادیب و شاعر اور مصور ہیں اور نہ بھوکے ماہرانِ موسیقی و اداکار۔ آج اسی ذہنی آزادی کے جذبہ نے اُن کی معاشی حالت کو سدھار کر زندگی کو محفوظ کر دیا ہے۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جو ہر اشتمالی و اشتراکی کی رگ و پے میں اپنی ملکی ترقی اور فلاح و بہبودی کی روح بنا ہوا ہے۔ اور ہر فرد ملک بلا امتیاز قوم دل و جان سے ملکی تعمیر میں لگا ہے۔ آج وہ ممالک جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ اُن کو ذہنی آزادی کا مرتبہ حاصل ہے وہ مجھے یہ بتائیں کہ اُنہوں نے اپنے دماغی کام کرنے والوں کو کیا آزادی دے رکھی ہے اور اُن کے آرام و سکون حاصل کرنے کے لئے کیا انتظام کر رکھا ہے غالبًا مجھے اس سوال کا جواب نفی میں ملے گا۔ مگر دوسری طرف سوویٹ روس کے ایسے دار التفریح کو ملاحظہ فرمائیے جو مخصوص ہیں دماغی کام کرنیوالوں کے لئے۔ ان میں آپ اُن کی تفریح اور دلبستگی کی ہر چیز پائینگے تو دوسری طرف کتاب خانے، جن میں تقریبًا دُنیا کی بہترین اور مقبول ترین زبانوں کی مختلف عنوان اور موضوع کی کتابیں، رسالے اور اخبار ملیں گے۔ ساتھ ہی ان تفریحی اداروں میں جن کا دوسرا نام دار الطبیعیات بھی ہے، کمرۂ ملاقات، کھانے کا کمرہ، اور دار المطالعہ اور دوسرے کمرہ آرام کے لئے بھی ملیں گے۔ ان دار الطبیعیات کا ممبر ہونے کے لئے کوئی خاص شرط بھی نہیں . . . .

ان کا ممبر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو دماغی کام کرتا ہے۔ اشتمالی ہے یا سیاست کے کسی شعبے سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مُفت تعلیم

تم جاہل عوام سے اشتمالی حکومت کی بُنیاد نہیں رکھ سکتے۔ یہ ہے وہ نعرہ جو دُنیا کے سب سے بڑے مفکر (Thinker) لینن نے بارہا ہر جلسے اور ہر موقع پر بلند کیا۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ کسی ملک کی بہتری اُس کے پڑھے لکھے عوام ہی پر مبنی ہے۔ جبتک ملک کے عوام کو اتنا نہ پڑھا دیا جائے کہ اہلِ ملک اپنے ملکی معاملات دُنیا کی سیاست اور سیاسی چالوں کو سمجھ سکیں اُس وقت تک اُس ملک کی حالت نہیں سدھر سکتی۔ اور اس حالت کو سُدھارنے کے لئے ایک قومی اور جمہوری حکومت کو تعلیم مفت دلوانا ہو گا۔ تاکہ وہ طبقہ جو حکومت اور غلط نظامِ انسانی کی بنا پر جاہل ہے تعلیم حاصل کر سکے۔ اور زیورِ علم سے مالا مال ہو سکے۔ اپنے ملک کی سچی اور ہمدردانہ خدمت کر سکے، اپنے ملک کی اہمیت کو سمجھ سکے اور دُنیا کو سمجھا سکے۔ انہی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اشتمالی رہبروں نے اپنے ملک میں بھی تعلیمی کام کو جاری و ساری کیا۔ شروع شروع میں انہیں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں۔ ان دقتوں کا اندازہ حقیقۃً وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں ایسے موقعوں پر مندرجۂ بالا قسم کی مشکلات پیش آتی ہیں سب سے بڑی مشکل تو سرمایہ کی کمی تھی، پھر مدرسوں کی کمی۔ روس جیسے بڑے ملک کے لئے زار کی حکومت نے جس قدر مدرسے ملک میں قائم کئے تھے ناکافی تھے۔ انقلاب کے آنے کے بعد سے نئے مدرسے اس لئے نہیں قائم کئے جا سکتے تھے کہ ان مدرسوں کے نظامِ تعلیم کی تبدیلی وغیرہ پر کافی خرچ ہو رہا تھا۔ سرمایہ کم، کام زیادہ، پھر بھلا آپ ہی بتائیے کہ ایسی صورت میں سوویٹ روس کس طرح نئے مدارس کا مزید اضافہ کرتی۔ انقلاب کے آغاز میں شہری متوسط طبقہ (Bourgeois) کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ یہ طبقہ تمام ملک کی بہتری کو سوچنے کے بجائے اپنے ہی بچوں کی تعلیم پر خود غرضانہ طور سے روپیہ پانی کی طرح بہاتا تھا اور جو بیچارے لاچار و مجبور تھے وہ اپنے نونہالوں کو جاہل رکھ کر قسمت پر قناعت کرتے تھے۔ حکومت نے اسے محسوس کیا اور تعلیم کو لازمی اور مفت سارے ملک میں جاری کر دیا۔ نئے دار الصبیان قائم کئے گئے اور سارے ملک میں مفت تعلیم کا دور دورہ شروع ہوا۔ اب بچے ان دار الصبیانوں میں رہ کر اس وقت تک تعلیم حاصل کرتے تھے جبتک کہ وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر لیں۔ یہی نہیں کہ اشتمالی حکومت نے صرف مدرسوں ہی کی تعلیم کو "مفت" کیا ہو۔ بلکہ طلبا یونیورسٹی نیز ہر تعلیم گاہ تحقیقی ادارے، اور موسیقی، آرٹ و تمثیلی اکاڈمیوں، رات کی تعلیم گاہوں، دار التفریحوں وغیرہ میں ہر قسم کی تعلیم بڑا ہو یا چھوٹا، بوڑھا ہو یا بچہ مفت حاصل کر سکتا تھا۔ یہ رعایت کسی خاص طبقہ کے بڑے بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کے لئے نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ یہ رعایت عام تھی۔ جاہل اور معمولی پڑھے لکھے کسان اور کارخانوں کے مزدور نیز عام مزدور بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اور آپ تعجب کرینگے کہ شروع میں جب تعلیم مُفت کی گئی ہے تو

اُس وقت لوگوں کے تعلیمی ذوق وشوق کا یہ حال تھا کہ کارخانوں اور کھیتوں کو چھوڑ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اب بھی جامعہ میں طلبا کی زیادہ تعداد کارخانوں ہی کے کام کرتے والوں کی ہوتی ہے۔ آج اس مفت تعلیم کی برکت نے سوویٹ روس میں کسی کو بھی جاہل نہیں چھوڑا سوویٹ روس کے محکمۂ تعلیم کے اعداد و شمار یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ طلبا کی ۸۰ فی صدی تعداد یونیورسٹیوں میں آج اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہے اور تقریباً اتنی ہی یا اس سے کچھ زیادہ تعداد بغیر اپنے ماں باپ کی کسی امداد کے نہایت آرام اور چین کی زندگی گزار رہی ہے اور دن رات اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں نہایت بے فکری کے ساتھ موجود ہے ہمارے ملک میں ماں باپ مالی کمزوری کی وجہ سے اپنے بچوں کی شادیاں تعلیم کے زمانے ہی میں کر دیتے ہیں۔ اور جس طرح خاندانی جھگڑوں کی بنا پر ان غریب قابلِ رحم نونہالوں کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں یا بیوی ہی کا ہو کر رہ جانے سے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں سب پر ظاہر ہے۔ اسی طرح روس میں بھی عموماً طلبا اپنی شادیاں خود اپنے زمانۂ تعلیم ہی میں کر لیتے ہیں۔ ایک متمدن اور مہذب ملک کے ہونے کی وجہ سے وہاں کسی خاندانی جھگڑے کے ہونے کا تو انہیں اندیشہ لاحق نہیں رہتا بلکہ میں اسکے کہنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ ان اشتمالی طلبا کی شادیاں یورپ کے دوسرے ملکوں اور خود ہمارے ملک کی گھر بلو شادیوں کے مقابلوں میں زیادہ کامیاب رہتی ہیں اور اشتمالی ہم سے زیادہ خوش اور پُرسکون زندگی اپنی اس نئی زندگی میں گزارتے ہیں۔ لیکن اربابِ حکومت اس کو سمجھتے ہیں کہ جبتک طالبِ علم کے اور اُس کی ہونے والی اولادوں اور اُس کی بیوی کے اخراجات وغیرہ کا معقول انتظام نہ کر دیا جائے گا وہ اپنی اس نئی زندگی کو کبھی کامیاب نہ بنا سکے گا اور نہ اپنی تعلیم کو مکمل کر سکیگا۔ اس لئے جب کوئی طالبِ علم شادی کرتا ہے تو اُس کو اُس کی بیوی کو اور اُس کی ہر اولاد کو حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے اور ان بچوں کا جبتک وہ اپنی ماں کے پاس رہتے ہیں اُس کے بعد سے جب وہ ماں سے الگ ہوتے ہیں معقول تعلیمی انتظام خود حکومت کرتی ہے۔ یہیں پر اس کا تذکرہ بھی کرنا ضروری ہے کہ انقلاب کے بعد سوویٹ روس نے ایک طبقہ کو حقوقِ تعلیم ہی سے محروم کر دیا گیا تھا یہ طبقہ (Kulaks) کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی وہ لوگ جو زار کی زندگی کے محافظ، مذہب کے پیشوا وغیرہ تھے۔ اس طبقہ کی تعداد تقریباً دو تین لاکھ ہے۔ (سوویٹ روس کے ممالک کی کُل آبادی تقریباً ایک سو ستر لاکھ یا اس سے کچھ زائد ہے) حکومت کے اس حکم اور بندش کا یہ مطلب بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ انہیں بالکل ہی تعلیم حاصل کرنے کی مناہی تھی نہیں بلکہ ایسا نہیں تھا۔ اس طبقہ کو صرف یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیمات کے حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس مسئلہ نے کہ اس طبقہ کو ہمیشہ کے لئے اعلیٰ تعلیمات سے محروم کر دیا جائے یا اعلیٰ تعلیمات حاصل کرنے کی اب اجازت دے دی جائے۔ آج سے چند سال پہلے بہت نازک سوال کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اشتراکی و اشتمالی نوجوانوں کا یہ کہنا کہ اس میں اُن بچوں کا کیا قصور ہے جو (Kulaks) کی اولاد میں سے ہیں، یہ تو اُن کے والدین کا قصور تھا کہ اُنہوں نے اہلِ ملک کے ساتھ دشمنی کی اور ملک کے ساتھ ہمیشہ غدّاری کرتے تھے۔ بہرحال اس سوال نے چند ہی سال کے بعد اتنی نازک صورت اختیار کر لی کہ مشہور و معروف جریدہ (Komsomolskaya Pravda) جو اشتمالی اور اشتراکی طلبا کے خیالات کا زبردست ترجمان اور آرگن ہے نے اپنے ایک شذرہ میں اس مسئلہ پر نہایت غیر جانبدارانہ اور زوردار الفاظ میں اُن بچوں کی حمایت و ترجمانی کی جو اپنے والدین کے قصوروں کی بنا پر اعلیٰ تعلیم سے محروم کر دئے گئے تھے اور حکومت سے درخواست کی کہ یہ پابندی اُٹھالی جائے۔ کیونکہ اس سے ایک اشتمالی حکومت کے نظام پر اور فلسفۂ اشتمالیت اور... نئے نظامِ انسانی پر ایک بدنما دھبہ عائد ہوتا ہے۔ "کیا سوشلزم کا یہ اصول ہے کہ باپ کا قصور دوسری جگہوں کی طرح سے بیٹے پر عائد کر دیا جائے اور بیٹے کا باپ پر۔ حالانکہ سوشلزم اس کو کبھی جائز نہیں قرار دے سکتا۔"

اس کے اس شذرہ، طلبا کے شور و شغب اور تعلیمی رہبروں کے جلسوں اور تقریروں نے بالآخر حکومت کو چند سال بعد

——— ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

مجبور کر دیا کہ وہ ایسی پابندیوں کو فوراً اُٹھا لے[1]

آپ میں سے بعض اصحاب یہ فرمائینگے کہ بھئی ہمارے یہاں بھی تو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ آخر غریب بچوں کو وظیفہ دے کر جو تعلیم دلائی جاتی ہے روس کے نظامِ تعلیم سے ملتی جُلتی ہے۔ مگر یہ چیز ہرگز نہیں ہے۔ سوویٹ روس کے مفت تعلیم کے اصول میں اور آپ کے یہاں کی خیراتی تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دیکھیے اوّل تو ہمارے یہاں کی وظیفہ دے کر تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ وظیفے دو طبقے قرار دے کر دئے جاتے ہیں۔ اور یہ وظیفے طبقۂ غریب کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ پھر ان وظیفہ پانے والے طلبا کی اس قدر دل شکنیاں کی جاتی ہیں کہ اُن کی اعلیٰ دماغی قابلیت فنا ہو جاتی ہے اور اُن کے کام کرنے کے جذبات مُردہ ہو جاتے ہیں۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ انہیں میں بعض بہت بلند ہستیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر آپ خود ہی بتائیے کہ سو میں کتنے ایسے ہوتے ہیں۔ شاید جواب آپ ایک یا دو دینگے۔ درست۔ لیکن دوسری طرف سوویٹ روس کے حالات پر نظر ڈالئے تو زیادہ تعداد طلبا کی ایسی ملے گی جو زندگی کے اُس بامِ عروج پر ہوں گے جس پر انسان کبھی نہ کبھی پہنچتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہاں تعلیم میں کوئی طبقاتی خصوصیت نہیں رکھی گئی ہے۔ پھر انسان کتنے ہی بامِ عروج پر پہنچ جائے لیکن اُس کا تعلق طبقۂ مزدور (Worker class) ہی سے رہتا ہے۔ آج دُنیا میں صرف سوویٹ روس ہی میں ایسا نظام ہے جہاں کسی طبقۂ انسانی کو انفرادیت کا درجہ نہیں دیا گیا ہے گو اس فلسفہ اور اصول کا پہلا علمبردار "اسلام" ہے لیکن افسوس کہ اسلام کے فلسفہ اور اصول کے ماننے والوں نے اپنی اُن چیزوں کو چھوڑ کر جنکا تعلق حیاتِ انسانی سے تھا جزئیات کو اسلام قرار دیدیا جس کی وجہ سے سوشلزم منظرِ عام پر آیا، ورنہ آج شاید اسی اسلام (میں اسلام کو مذہب نہیں سمجھتا بلکہ اشتمالیت واشتراکیت کی طرح سے حیاتِ انسانی کے شکستہ ڈھانچے کو درست کرنے اور جوڑنے کا ایک نظام) کا نام اشتمالیت و اشتراکیت ہوتا۔ ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ..... سوویٹ روس میں انسان کو طبقاتی انفرادیت کا درجہ نہیں عطا کیا ہے بلکہ تمام طبقوں کو ایک سطح پر لاکر سب کی حیثیتیں بلند کر دی گئی ہیں۔ اس تعلیمی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ یعنی اہلِ جمہوریہ اشتراکیہ کو جو طبقاتی بلندی اور مساوات کا درجہ عطا کیا گیا اُس سے اُن میں مُلکی تعمیری کام کرنے کا جذبہ اور تعلیم حاصل کرنے کا خیال عملی جامہ پہن گیا۔ آج آپ جمہوریۂ اشتراکیہ میں یہی نہیں کہ ملک کے کسی مسئلہ پر تبادلۂ خیال اُس مسئلہ ہی کے ماہر سے کریں بلکہ آپ ہر مسئلہ پر خصوصاً مسئلہ تعلیم پر ہر پڑھے لکھے (اور وہاں تقریباً ۹۹ فی صدی آبادی پڑھی لکھی ہے) انسان سے گفتگو کر سکتے ہیں اور وہ شخص اپنی رائے کو اس صائب طریقہ پر پیش کریگا کہ آپ دنگ رہ جائیں گے اور دل ہی دل میں کہیں گے کہ یہ کس بلا کا انسان ہے کہ ماہرِ تعلیم نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بہت بڑا ماہرِ تعلیم ہے۔ چونکہ

---

[1] ۲۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو مرکزی انتظامیہ مجلس عوامی کونسل کے کمشنروں کی طرف سے ایک اعلان جاری ہوا جس پر کیلنن (Kalinin) اور ا ا اکلاؤ (Akylow) کے دستخط تھے۔ اس نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔ اعلامیہ کے ذریعہ یہ حکم نافذ ہوا کہ شہری متوسط طبقہ یعنی (Kulaks) کے علاوہ تعلیمی حقوق جن سے اُن کو محروم کر دیا گیا تھا اُن پر سے یہ پابندیاں اُٹھائی جاتی ہیں۔ اور اب اُن کے بچے اعلیٰ تعلیمات حاصل کر سکینگے اور ان لوگوں کو ملکی و شہری حقوق حاصل ہو سکینگے آئندہ وہ تمام بچے جنہوں نے امتحان میٹرک پاس کر لیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں وغیرہ میں داخل کئے جا سکتے ہیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیماتی صنعتی کمیٹی کو نیز دوسرے تعلیماتی کمشنروں کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ اس حکم کو فوراً عملی جامہ پہنائیں۔ اور آئندہ سے مدارس کے اُستاد، اور ثانوی درسگاہوں کے اساتذہ اور یونیورسٹی کے علما اس کا خیال رکھیں کہ طلباء کے داخلہ کے وقت اُن کے والدین کی سوشل حالت اور اُن کی حیثیت وغیرہ کا جو خیال رکھا جاتا تھا وہ اس حکم کے بعد سے ترک کر دیا جائے۔"

[2] جی نہیں، سب سے پہلے ایران میں مزدک نے اس فلسفے کی مبادیات پیش کیں۔ ساغر

ایشیاء دسمبر ۱۹۴۰ء

جو کسی عمل پر پورے بھروسے کے ساتھ اپنے خیالات پیش کر رہا ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُس کا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔

آئیے معت تعلیم کے فوائد کے تحت دو حقیقی کہانیاں آپ کو سناؤں۔ ان میں سے ایک سوویٹ روس کے جامعہ حکومت لین گراڈ (Leningrad State University) سے متعلق ہے اور دوسری ادارۂ تعلیمی قزاقستان (Kazakstan) سے ـــــ انقلاب کے چند سال ہی بعد دو بچے ایک دار الصبیان میں داخل کئے گئے۔ یہ بچے حقیقی معنوں میں بدقسمت تھے یعنی ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور یہ بیشتر کئی ہندی بچوں کی طرح بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرتے تھے۔ انہوں نے کچھ دنوں تک تو ایسی زندگی گزاری لیکن اُسکے بعد وہ حکومت کے پرورش گاہِ بچگان میں داخل کردئے گئے اور اُن کی تعلیم و تربیت بجانب حکومت جاری ہوگئی جب وہ ذرا بڑے ہوئے تو تعلیم کے ساتھ رفتہ رفتہ تھوڑی بہت تجارتی تربیت بھی دی جانے لگی۔ جب اُنہوں نے یہ ابتدائی تعلیمی و تجارتی تربیت ختم کرلی تو حکومت ہی کی طرف سے اُن کا ایک کارخانے میں تقرر کردیا گیا۔ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ سوویٹ روس کے ایام آغاز میں جس کو ذرا سا بھی تعلیم کا مزا ل جاتا تھا وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کی فکر میں شب و روز رہتا تھا۔ یہی ان بچوں کا حال ہوا۔ زیادہ سے زیادہ تعلیم کا ذوق و شوق تو سارے ملک میں روزافزوں ترقی کر رہا تھا پھر بھلا یہ بچے کیسے "معمولی پڑھے لکھے" رہتے۔ انہوں نے حکومت سے درخواست کی کہ اُنہیں اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ اُن کے کہنے کی دیر تھی۔ ادھر اُنہوں نے یہ درخواست حکومت کے سامنے پیش کی اور اُدھر اُن کا داخلہ ثانوی درسگاہ میں ہوگیا۔ کیونکہ ابتدائی تعلیم تو وہ مکمل کر چکے تھے۔ جب اُنہوں نے ثانوی تعلیم بھی مقرر کرلی تو قدرتی طور پر جامعہ میں داخل ہونے کا خیال پیدا ہوا۔ بہرحال اُن کا داخلہ لین گراڈ کی جامعہ میں ہوگیا۔ جامعہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے دو علمِ طبیعیاتِ برقی (Electro - physics) کے شعبہ میں اس فن کی مہارت حاصل کرنے کی درخواست کی اور اس شعبہ میں بھی داخلہ لیا۔ اُنہوں نے اس شعبہ میں اس قدر دل لگا کر اور محنت سے کام کیا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دونوں طلبا کو اس کے "دائرہ طبیعاتِ برقی کا بالترتیب صدر و نائب صدر (Chairman and Vice chairman of the Electro physics Sector) مقرر کردیا گیا۔ اور اس طرح سے اُن کی محنتوں اور تعلیمی ذوق و شوق کی حوصلہ افزائیاں کی گئیں۔ نیز دوسرے طلبا سے اسی دائرہ کے ایک جلسے میں ایک پروفیسر نے اپنے دورانِ تقریر میں کہا کہ ان بچوں کی تعلیمی جد و جہد اور محنت سے سبق لے کر اپنے ملک و قوم کو بامِ عروج پر پہنچاؤ۔"

دوسرا واقعہ جیسا کہ میں سطورِ بالا میں عرض کر چکا ہوں ادارۂ تعلیمی جمہوریہ اشتراکیہ قزاقستان (Pelagogical institute of U. S. S. R. Kazakstan) کا ہے۔ اس ادارہ کے ایک مقرر نفسیات تھے (Lectures of Psychology) جو ایک گڈریے کی اولاد تھے اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں اور محنت کی بنا پر اس عہدہ پر پہنچ گئے تھے اور اب پروفیسری کی تعلیم و تربیت پا رہے تھے۔ ان پروفیسر صاحب کی بیوی بھی کسی تعلیمی ہی شعبے میں تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ وہ بھی پروفیسری کی تعلیم و تربیت پا رہی تھیں ان میاں بیوی کو ایک ملازمہ کی ضرورت پڑی۔ اتفاق سے ایک نوجوان کسان لڑکی اُن کی خدمت کو مل گئی۔ یہ لڑکی جاہلِ مطلق تھی۔ پروفیسر موصوف کی بیوی نے اُسے پڑھانا لکھانا شروع کیا۔ اور اُس میں جذبۂ تعلیم کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔ اور یہ جذبہ اُس کا اسقدر ترقی کر گیا کہ موصوف کی بیوی سے اجازت لیکر اُس نے ایک مدرسہ شبانہ میں داخلہ لے لیا۔ کچھ دن مدرسہ میں پڑھنے لکھنے کے بعد اپنے اساتذہ کے کہنے سُننے سے اُس نے شعبہ صنعت و حرفت میں بھی داخلہ لے لیا۔ اور اب پہلے سے زیادہ زور و شور کے ساتھ محنت شروع کردی۔ اتفاق سے پروفیسر صاحب کو حکومت نے کسی سرکاری مشن پر امریکہ بھیجدیا۔ لیکن پروفیسر صاحب نے اپنے جانے سے پہلے لڑکی کو ایک کارخانہ

میں ملازم رکھا دیا۔ پروفیسر موصوف کے جانے کے بعد اُس نے اور زیادہ محنت شروع کر دی۔ ادھر تو وہ شب و روز تعلیمی ترقی کر رہی تھی اور اُدھر اُس کے کارخانے کے مالکان اُس کے کام سے اس قدر خوش تھے کہ اُسے برابر ترقی کر رہے تھے۔ ابھی وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر پائی تھی کہ اُسے اُس کارخانہ کی ایک رکن (Director) بنا دیا گیا۔ لیکن اُس نے رکنِ کارخانہ ہونے کے بعد بھی اپنی تعلیم کو نہ چھوڑا۔ اور بالآخر اپنی تعلیم کو مکمل کیا۔ میدانِ صنعت و حرفت میں زندگی کے بامِ عروج پر پہنچی اور آج اپنی زندگی آرام و چین سے گزار رہی ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب سننے کے لئے غالباً آپ سب بے چین ہونگے۔

سوال یہ ہے کہ تعلیم کے اوپر جو اس قدر روپیہ بہایا جا رہا ہے اور ایسی حالت میں سوویٹ روس کی معاشی حالت اور مالی حالت اپنی سطح پر نہیں پہنچی تو یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ یہ سوال معقول ہے۔ لیکن اس کا جواب میں صرف چند سطروں میں دیگر اشتمالی تعلیم کے اصولوں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ یعنی ملک کی تمام اشیاء مثلاً تجارت وغیرہ (ذاتی تجارت یا صنعت و حرفت یا کسی قسم کا ذاتی کاروبار کوئی شخص سوویٹ روس میں نہیں کر سکتا) ملکیت ہوتی ہے حکومت کی۔ اور ان تمام سے جو آمدنی ہوتی ہے اُسے سوویٹ روس مختلف طور پر برابر اپنے عوام میں تقسیم کرتی ہے۔ اور انہیں طریقوں میں ایک طریقہ رقم کے ادا کرنے کا تعلیم کے ذریعہ بھی ہے۔

سعدی جعفری

افکار

کچھ دور نہیں ہے وہ زمانہ — بجلی ہوگی نہ آشیانہ
پھر نغمہ ہو کوئی دلبرانہ — دل کے لئے موت ہے زمانہ
تخریب مری جنونِ تعمیر — تعمیر مری مدافعانہ
بنیادِ حیات رکھ رہا ہوں — تخریب تو ہے فقط بہانہ
پرواز کر اے اسیرِ گلشن — ہر شاخ ہے تیرا آشیانہ
بجلی جو گرے تو غم نہ کیجئے — سو بار بنے گا آشیانہ
سوتا مجھے دیکھ کر مسلسل — چپکے سے گزر گیا زمانہ

جودت مری بُت شکن ہے ساغر
فطرت مری صرف آذرانہ

ساغر

"ضمیر" اور "مذہب"

آپ کو معلوم ہے کہ ایشیا میں کبھی مذہبی مباحث پر مباحثہ نہیں ہوتا' اس کی سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں مذہبی تحقیق و تجسس کا جذبہ نہیں۔ جیسا پنڈتوں اور ملاؤں نے بتا دیا اسی کو سچ سمجھ لیا۔ "عبادت" عبد اور معبود کے درمیان گویا ایک تجارت ہے' تاکہ دوسری دُنیا میں موتی کے محل' دودھ کی نہریں' اور .... مل سکیں۔

ان مسائل پر اگر ذرا دماغی کاوش کیجئے۔ ذرا آزاد ہو کر سوچئے' تو "متشکک" اور "ملحد" —— اور اس کے بعد کسی کا چمکدار چہرا۔!! "چہرا" اور "....." —— ہم قافیہ سہی' لیکن پہلا قافیہ' انسان کا قافیہ تنگ کرتا ہے اور دوسرا بیچارہ تو محض "قافیہ" ہے۔

خیر یہ فقرے یونہی .... ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ نسلِ حاضر کے نزدیک دوسرے سیاسی و اقتصادی اور علمی و ادبی مسائل اس قدر ہیں کہ اُنہیں سے ... عہدہ برا ہونا تقریباً ناممکن ہے اسی لئے ایشیا میں عمداً میں مذہبی مسائل کو نہیں چھیڑتا۔ کیونکہ اس قسم کے مباحثہ میں تعمیر سے زیادہ تخریب کا امکان ہے اور تخریب' اس نہج سے مجھے منظور نہیں۔

لیکن محترمہ جاوید صاحبہ کا مضمون جن کی عزت میں بواجی کی طرح کرتا ہوں اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ ہر چند کہ یہ نہایت مدلل و مبسوط ہے' تاہم یہ نئی بحثوں کا آغاز کر سکتا تھا۔ لیکن نئی بحثوں کا آغاز نہیں کیا گیا۔

ساغر

آج کل اکثر رسائل میں شکوک سے لبریز اور ملحدانہ خیالات سے مملو مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک مضمون "ہمایوں" اکتوبر نمبر ۳۹ء (برٹرینڈ رسل کے ایک مضمون کا ترجمہ) بعنوان "گناہ کا احساس" اور ایک مضمون "اخلاق اور مذہب" کے عنوان سے میرٹھ کے رسالہ "ایشیا" کے جنوری' فروری' اور مارچ ۳۹ء کے سہ ماہی نمبر میں میری نظر سے گزرا' مجھے ان مضامین کے بعض حصوں سے اصولاً اختلاف ہے۔ بہت اچھا ہو کہ ناظرین کرام مطالعہ کے وقت مذکورہ مضامین کو سامنے رکھیں۔

رسل کے نزدیک "ہر وہ آواز جو انسان کے باطن سے بلند ہوتی ہے ضمیر کی آواز ہے" اور علاوہ اسکے اسی مضمون میں اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر ملک و ہر رسم کی طرح ہر ملک کے انسانوں کے ضمیر کی آواز بھی مختلف ہوا کرتی ہے۔ میرے نزدیک رسل کے یہ دونوں مفروضہ نظریے غلط ہیں' حقیقت یہ ہے کہ انسان کے باطن سے آنے والی ہر آواز ضمیر کی آواز نہیں ہوا کرتی' دوسرے ضمیر جس شے کا نام ہے اس کے اصول ہمیشہ اور ہر حالت میں اٹل ہیں' تمدنی ضوابط' انسانی خواہشات اور اختلاف ماحول سے متاثر ہو کر تبدیل نہیں ہو سکتے' دراصل ضمیر کے اصول کیا ہیں' اور اس کی آواز مخصوصہ کے پرکھنے کا معیار کیا ہو سکتا ہے؟ ان امور پر روشنی ڈالنے سے پیشتر ہم ضمیر کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کرینگے۔

—— ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

بہر حال و بہر صورت یہ امر تسلیم شدہ ہے، انسان اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ بغیر اپنے ایما، کے پیدا ہوا یا کیا گیا ہے، اور اسی طرح اس کی صنفی عظمت بھی غیب کی عطا ہے، گویا حاصل کلام یہ کہ انسان اپنے خلق ہونے کی حد تک اصول جبر کے ماتحت تھا، منکرین ہستیٔ باری تعالیٰ کا کہنا ہے، یہ کسی ارادے کی کارفرمائی نہیں بلکہ طاقت اور مادّے کے اتفاقیہ باہمی امتزاج کا نتیجہ ہے تھوڑی دیر کے لئے ہم ان کے اصول کو مانے لیتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس ان سوالات کا کیا جواب ہے، جبکہ طاقت اور مادّہ دونوں بے ارادہ تھے اور ازل سے ان کا باہمی امتزاج ہی قسم قسم کی اشیاء پیدا کرتا چلا آتا تھا، تو کیا وجہ ہے کہ جنس انسانی کے خلق ہو جانے کے بعد طاقت اور مادّے کا یہ ترکیبی سلسلہ ختم ہو گیا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو آخر کیوں! اور اگر نفی میں ہے تو وہ کونسی نئی اشیاء اور نئی صورتیں ہیں، جن کو طاقت اور مادّے کا امتزاج اب پیدا کیا کرتا ہے؟ موجودات کی ہر شے کی افزائش کا طریقہ تو اب دوسرا ہے، وہ نہیں جو کسی شے کی پہلی آفرینش کے وقت استعمال میں آیا ہو گا، دوسرے یہ کہ جبکہ ارادہ، ادراک، ذہن اور شعور کا وجود تھا ہی نہیں تو انسانی جسم میں یہ عجوبۂ روزگار شے پیدا کس طرح ہوئی، آخر یہ کس بنا پر مان لیا جائے کہ ایک بے ارادہ شے ایک مدرک اور باشعور ہستی کی تخلیق کی متحمل بھی ہو سکتی ہے چنانچہ میں کہوں گی کہ نئی اشیاء کی پیدائش اور موجودہ اشیاء کی آفرینش کا ایک خاص نقطے اور وقت پر پہنچ کر مسدود ہو جانا، اور ایک اور محض ایک جنس میں ارادے اور ذہن وغیرہ کا پیدا ہو جانا بیّن دلیل ہے اس امر کی کہ اس نظام عالم کے پس منظر ایک زبردست ارادہ کارفرما ہے، اور اس ارادے کو جو کچھ بھی طریق اوّلین پر پیدا کرنا مقصود تھا، جب ہو چکا تو آئندہ افزائش اور پیدائش اشیاء کائنات کیلئے وہ دوسرے طریقے رواج پائے جن کی سازگاری کا زیر ارادۂ طاقت مخفی پیشتر ہی سے انتظام ہو چکا تھا۔

اسکے علاوہ ایک گروہ وہ ہے جو وجود ہستیٔ پروردگار کا مع اس کی غیر فانی صفات و ذات کے قائل ہے، مگر حیات بعد الموت کا منکر، اور اسی کے ساتھ ساتھ دُنیا کے مذاہب کے قوانین کو خدا کا ترتیب کردہ نہیں بلکہ دماغ انسانی کا ساختہ سمجھتا ہے۔ "ایشیا" کے مضمون حوالہ شدہ میں متشککانہ خیالات سے اسی موضوع پر بحث کی گئی ہے، چنانچہ اس جگہ سب سے پہلے ہمارا موضوع بحث حیات بعد الموت ہو گا، اس مسئلے کے ثبوت میں اگر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو انسان ہی کی تخلیقی نوعیت ہے، غور کیجئے انسانی ہیولیٰ یعنی مادائی نفس کو اگر فانی مان لیا جائے، تو اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ موجودہ صورت میں آنے سے پیشتر فنا نہیں ہو گیا، جبکہ اس سفلی عالم میں اسکے اقدامِ ارتقاء کی انتہا ہو چکی تھی! مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ بالعوض اسکے کہ وہ فنا ہو جاتا، اب وہ میدانِ علویّت اور روحانیت میں گامزن ہے، اور ارتجاعِ علویّت نے اسکے اندر جو تغیر پیدا کر دیا ہے اسکے اثر سے وہ ارادہ، ادراک، ذہن اور شعور رکھنے والی مافوق الکائنات شے بن چکی ہے، اور فی الحال میدانِ علویّت میں یہ اس کا پہلا قدم ہے جو اس کے لئے محض ابتدائے سفر کا حکم رکھتا ہے، چنانچہ بہ ایں صورت یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان جیسی اہم جنس فنا ہو سکے گی یا کر دی جائے گی، سیاق اور سباق کیا چاہتا ہے، یہ کہ اگر نفس لاشعور کو قدرت، عالمِ سفلیت کے تمام مراحل طے کرنے کی فرصت دے سکتی ہے تو اب نفس باالشعور کو بھی علویّت کے تمام مرحلے طے کرنے کی

....

.... اجازت اور فرصت دی جانی چاہیئے۔ حاصل کلام یہ کہ انسانیت کم از کم اس وقت تک فنا نہیں ہو سکتی، تا آنکہ وہ تمام مراحل رجاتی طے نہ کرلے، اور موت! موت محض جوہر نفس کو زیادہ روشن، واضح مستحکم اور ترقی یافتہ صورت میں تبدیل کرنے کیلئے طاری کی جاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح جیسے کہ تخم پودے کی صورت میں تبدیل ہونے سے پیشتر اپنی شکل و ہیئت معدوم کر دیا کرتا ہے۔

ماسوا اسکے آیئے! انسان کی تخلیقی نوعیت کو اشتہادات کے آئینے میں میرے زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھئے، زندگی، خواہش، نفس ناطق، پیدائش، اور فنائیت جیسے یقینی واقعات، اور انسان کی ذہن، شعور اور ادراک، ارادے جیسی صنفی خصوصیات کو

سامنے رکھتے ہوئے انتہائی غور و فکر کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچی ہوں وہ یہ ہے کہ فطرت اپنی صفت بے نیازی کی ضد کو منصۂ شہود پر لانے کے لئے مصروفِ عمل ہے، جو فی الحال غیر مکمل حالت میں ہے۔ آپ ثبوت چاہیں گے، دیکھئے میرا نظریہ جداگانہ مفہوم رکھنے والے دو فقروں پر مشتمل ہے، چنانچہ میں پہلے بجائے پہلے نظریے کے دوسرے فقرے کے ثبوت میں دلیل پیش کروں گی، اگر میں یہ سوال کروں کہ انسان! جو ماحصل ہے اپنے صانع حقیقی کے اس صنعتی جھپا ماکا، کیا خدا کی ہستی جس کو کہ ہم رحیم و کریم مانتے ہیں اس کی ہر خواہش اور آرزو کو پورا کر دیتی ہے؟ تو یقیناً میرے اس سوال کا جواب آپ کی جانب سے نفی میں ہوگا، پھر خدا کے اس فعل کو اگر ہم اسکے جذبات معبودیت اور حاکمیت پر مبنی سمجھ لیتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی دیکھنا ہے کہ آیا صانع مطلق وہ تمام چیزیں جو بحکم قدرت مہیا کرنے کی حیثیت سے اسکے شایان شان ہو سکتی تھیں پیدا کر چکا ہے؟ جواب یہاں بھی نفی ہی میں ہوگا۔ گویا موجودہ صورت میں قدرت کی صنعت گری، اور دوسری طرف اس کے تخلیقی ماحصل کے جذبات طلب اور خواہش دونوں تشنۂ تکمیل ہیں، چنانچہ فطرت کی صفت عطا اور اس کی تخلیقی خامی کے دو سبب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ قدرت موجودہ اشیاء سے بہتر چیزیں پیدا کرنے سے قاصر تھی، دوسرے یہ کہ خدا کی ہستی حریص ہے، اور اس حد تک حریص ہے کہ وہ اپنی صنعت گری اور بخشش کی تشنگی کو تو گوارا کر لیتی ہے، انسانی خواہشات کی آسودگی کو کسی نہج منظور نہیں کرتی، لیکن قطع نظر اسکے جب ہم یہ دیکھتے ہیں، وہ بس پردہ ہستی جو انسانی جنس کو بلا اس کی طلب کے اپنی یکتائے روزگار صفات کا حصے دار بنا لیتی ہے، حریص اور خسیس تو کسی طرح بھی نہیں کہی جا سکتی! تو ہم لاجواب ہو جاتے ہیں اور علاوہ اسکے ہم بمقابلہ اس عالم پست کے نظام شمسی کی پائداری کو دیکھتے ہوئے نہیں کہہ سکتے کہ خدا موجودہ اشیاء سے بہتر اشیاء خلق نہیں کر سکتا تھا۔ گویا سوال وہیں کا وہیں رہا، پھر آخر یہ تشنگیاں اور ناکامیاں بے سبب ہیں؟ نہیں! بلکہ ایک زبردست دلیل ہیں اس امر پر کہ قدرت بر بنائے مصلحت تدریج سے کام لے رہی ہے۔ اور اس سے ثابت ہے کہ انسان اور کائنات کے متعلق خلاقِ عالم نے جو اسکیم ترتیب دی ہے، وہ فی الحال نامکمل حالت میں ہے۔

اب آپ میری رائے کے پہلے حصہ کو لیجئے، یہاں بھی میں بطور دلیل انسان ہی کی ہستی کو پیش کروں گی دیکھئے! انسان چند ایک ایسی صفات کا حامل ہے جو ہم کو دیگر جانداروں میں نظر نہیں آتیں اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ انسان کی یہ مخصوص صفات ہماری مادی آنکھوں سے پنہاں اُس ہستی کی صفات کے مشابہ ہیں جو اس دنیا کا خالق و مالک ہے اب سوال یہ ہے کہ انسان کی یہ مخصوص صفات اس کی اپنی حاصل کی ہوئی ہیں، یا اسکے خالق کی ارادتاً دی ہوئی! چنانچہ اگر ہم اکتسابی مانتے ہیں یعنی لازمۂ زندگی، تو زندگی رکھنے والے تو اور بھی ہزارہا جاندار موجود ہیں، مگر وہ ان صفات کا اکتساب کیوں نہیں کر سکے اس لئے ہم اس بات کے تسلیم کر لینے پر مجبور ہیں کہ کائنات سے مافوق الصفات خصوصیتیں انسان کی اکتساب کردہ نہیں بلکہ انسان کی صنف میں خدا کی ارادتاً ودیعت کی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ کنہ علویت کی اس مخصوص ودیعت نے کون کون سی خصوصیات انسان میں پیدا کر دی ہیں، چنانچہ اس حد تک جس حد تک کہ کثافت کی شرکت اجازت دے سکتی تھی، انسان مثل خدا کے سوچ سکتا ہے، یاد رکھ سکتا ہے، خلق کر سکتا ہے اور عزم و ارادے پر بھی قابض ہے وغیرہ وغیرہ، پھر جبکہ حقیقت یہ کچھ ہے تو کیا انسان کو بھی خدا کی ہستی کا مثل مان لیا جائے؟ نہیں! اگرچہ خدا اور انسان میں ایک حد تک صفاتی یکسانیت پائی جاتی ہے لیکن باوجود اسکے بھی انسان اور اسکے پروردگار میں بعد المشرقین موجود ہے، اگرچہ ربِّ کائنات ذہن رکھتا ہے اور ایک حد تک ذہنی صفات انسان میں بھی موجود ہیں، اسی طرح خدا سوچ سکتا ہے، اور انسان بھی، وہ خلق کر سکتا ہے، اور ایک نوعیت سے انسان بھی، وہ ذات ارادے کی مالک ہے اور ایک مقررہ حد تک انسان بھی، مگر! باوجود اس بنیادی مشابہت کے یہی بنیادی صفات ہم کو ہر دو جگہ بہ ضدین کی شکل میں کام کرتی نظر آتی ہیں، ایک جگہ یعنی حریم علویت پروردگار کی ہستی کے ساتھ اس کی ذہنی و شعوری استعداد نہ اپنے لئے کچھ سوچتی ہے نہ خلق کرتی ہے اور نہ ارادہ کرتی ہے، اور دوسری جگہ

یعنی نفس سفلیت میں ذہنی شعوری اور ارادے کی استعداد کے افعال و فوائد سے انسان خود مستفیض ہوتا ہے، گویا خالق اکبر پیدا کرتا ہے، لیکن ہر شے کے تصرف سے قطعی بے نیاز ہے، مگر انسان کی ہستی اپنی ترتیب کردہ اشیاء کے علاوہ خدا کی کروڑوں پیدا کردہ چیزوں کو بھی تمام و کمال صرف میں لانے کی اہل ہے، اور اب بھی تشنہ کام و تشنہ آرزو، چنانچہ استعدادِ ذہن، شعور، ادراک اور ارادے کے اس اختلاف کار نے انسان کی ہستی کو مقابلۃً خالق اکبر کی ہستی کے اضداد کی شکل میں لاکر کھڑا کر دیا ہے، وہ ہستی بے نیاز ہے اور انسان مجسمۂ نیازمندی، وہ صانع محض ہے اور انسان خریدار مطلق، وہ ناز ہے انسان نیاز، وہ کنز ہے انسان امانت دار، وہ مطلوب ہے اور انسان طالب، انسان کی یہی وہ صنفی، خلقی اور عملی حیثیت تھی جو مجھے اپنی رائے کے ثبوت میں پیش کرنا تھی۔

اب اگر کوئی سوال اُٹھایا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے، خدا کو اپنی کسی صفت کا تضاد پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بلاشبہ یہ سوال ایک اہم سوال ہے۔ احدیت مآب خدا جمیع صفات اور بےمثل صانع تھا، لیکن خود قطعی طور پر بے نفس اور بے نیاز، ظاہر ہے کہ اس صورت میں صانع حقیقی کی صنعتوں کا خریدار ہی نہیں، بلکہ اس کی صفات دیگر کے بر ما دینے والا بھی کوئی نہیں تھا، چنانچہ اس جمود کے خلاف خدا کی صفتِ عطا و بخشش اس کی صفتِ خالقیت پر ایک ایسی بالاشعور ہستی کے خلق کرنے کے لئے مقتضی ہوئی، جو اپنے اندر صانع مطلق کی پیدا کردہ نعمتوں کو تمام و کمال صرف کرنے کی اہلیت و صلاحیت رکھتی ہو، اس خلا کو اگر کوئی شے پُر کر سکتی تھی تو وہ خواہش اور طلب کی تخلیق تھی، چنانچہ حریم ذات یوں اپنی بعض صفات کے تقاضوں پر تخلیقِ عالم کیلئے مجبور ہوئی، اور جنس خواہش اور آرزو، نفس عرف کہ یا زندگی کے نام سے پیدا کی گئی، یہ ابتدا تھی اس شے کی جو صنف انسانی میں تکمیل کو پہنچنا تھی، اب چونکہ ایک بے شعور یا محدود شعور رکھنے والا نفس خواہش بالصنف کے محدود دائرے کے اندر رہتے ہوئے محض چند ایک معمولی قسم کی اشیاء سے بہرہ اندوز ہو سکتا تھا۔ اس لئے لازم ہوا کہ عددِ نفس یا خواہش کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کر دیا جائے اور اس کی تشکیل کے لئے ضروری تھا کہ ربّ اکبر اپنی خصوصیات کے مثل صفات سے کسی صنف کو متصف فرمائے، چنانچہ وہ تکمیل شدہ جنس بشکل انسان پیدا ہے، اور ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ انسان! بلحاظ اپنی بعض صفاتی خصوصیات کے ہستیٔ پروردگار کے مشابہ، اور بلحاظ اپنی اضدادی خصوصیات کے حریم ذات کی ضد کا حکم رکھتا ہے اور اس طرح انسانی ہستی کو ایک اہم حیثیت حاصل ہو گئی ہے، چنانچہ اس مشہودہ اور عملی دُنیا میں ایک طرف انسان کی ہستی حریم ذات کے نمو کی ذمہ دار اور آئینہ دار ہے اور دوسری جانب اُس بے مثل صانع کی صنعتوں کی خریدار اور صرف میں لانے کی واحد اجارے دار ہے، اور یہی وہ حقیقت آفریں نقطہ ہے، جو ہم پر اس راز ہائے سربستہ کا انکشاف کر دیتا ہے، انسان کی ہستی اپنے خالق کی ہستی کے لئے شئے لازم کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے، خدا کی ہستی غیر فانی ہے، چنانچہ انسان کو اس کی ہستی کا لازمہ مان لیجئے فطرت نما آئینہ تصور کر لیجئے، خدا کی ہستی کا تضاد جان لیجئے اور یا پھر صفات فطرت کو بر مانے اور مصروف رکھنے کا اجارے دار سمجھ لیجئے بہر حال و بہر صورت اس جنس کو بھی غیر فانی ماننا پڑے گا، یوں وہ ہستی جو خلاق کنندہ ہے ہر شئے مشہودہ اور غیر مشہودہ کی اس امر کی مختار اور مجاز ہے کہ جس نقطے سے یا جس طریقے سے اس نے یہ پھیلاؤ پھیلایا ہے اسی طرح سمیٹ کر ہر شے کو معدوم کر ڈالے، لیکن ایک وہ ہستی جو عالم الغیب بھی ہو ایسا ارادہ کر ہی نہیں سکتی تھی جس کی تنسیخ کی ضرورت پیش آ سکتی، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ جو بن چکا ہے وہ اب مٹ نہیں سکتا۔

یہاں قدرتی طور پر ایک سوال اور پیدا ہو جاتا ہے، اگر خدا کی ہستی کامل القدرت تھی تو تدریج سے کام لینے کے کیا معنی یعنی! انسان ایک ہی مرتبہ میں مکمل ترین صورت میں کیوں پیدا نہیں کیا گیا؟ دیکھئے جنس خواہش کی تخلیق کیلئے مکان، زمان اور شہود کا خلق کرنا لازمی تھا اور اسی طرح ہر مکان و زمان اور شہود کیلئے متضاد الطرف ہونا لابدی، چنانچہ انسان جس شکل میں بھی پیدا کیا جاتا اس کے افعال و خیال سے بہر صورت یہی صورتِ حال پیدا ہونا تھی، جواب پیدا ہے اس لئے اجسام طلب بالاشعور کو تبدیلِ ہیئت یعنی موت سے مستثنیٰ کر دینے، اور ان کی ہر خواہش کی تکمیل کا ذمہ لینے سے بہتر قدرت پر

فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ انسانوں کو ایک فانی دُنیا میں پیدا کر کے اپنی اپنی اخلاقی اور عملی قدریں قائم کرنے کا موقع عطا فرمائے، ورنہ دوسری صورت کروڑہا ..... انفاس کے مفاد، اور سکون قلب کے سخت منافی ثابت ہوتی اور ظاہر ہے کہ یہ امر قدرت کے اصول عدل و انصاف کے خلاف تھا، اسی وجہ سے اس مرتبہ محض طلب و خواہش کا دائرہ وسیع کرنے پر اکتفا کی گئی، دوسرے یہ کہ خدا کی ہستی اپنے اصول کے مطابق ہر نفس کو مساویانہ طریقے پر مستفید اور فیضیاب کرنے کی خواہشمند ہے، اس لئے بجائے اسکے کہ وہ خود انسانوں کے مراتب مقرر کرتی اس نے اس امر کا انحصار خود انسان کی پسند اور کوشش پر رکھ دیا ہے، ورنہ بصورت دیگر جنس انسانی خالق اکبر پر اپنے مراتب کے بارے میں معترض ہو سکتی تھی، اور بصورت موجودہ اس قسم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور ہاں! خدا پر انسان کے مستقبل کے بارے میں جو فرض عائد ہوتا تھا اس کا بدرجۂ احسن انتظام کر دیا گیا ہے، جس کی تفصیل ذیل میں کسی دوسری جگہ آئیگی۔

سطور بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو اصل بحث کی تمہید سمجھنا چاہئے۔ اصل مضمون یہاں سے شروع ہوتا ہے، اگر مجسمۂ انسانی کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی ہستی میں مادّی جسم، زندگی، یعنی جان کے علاوہ ایک اور لطیف عنصر بھی شامل ہے جس کو "روح" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، چنانچہ انسان کے دونوں مذکورہ بالا عنصر تو ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔ ہم اس وقت صرف روح کے متعلق بحث کرینگے، روح کیا ہے محض صفات اربعہ کا مجموعہ، ادراک، ذہن، ارادہ اور شعور، اس جگہ ایک حقیقت کا انکشاف بھی ضروری ہے، قاعدۂ کلیّہ کے مطابق ہر شے موجود اور مشہود، محتاج اور دو رخوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے، اسی طرح اگرچہ روح انسانی کلیّہ کے مطابق چند لا احتیاج صفاتِ غیر مرئی پر مشتمل ہے، لیکن چونکہ قالبِ روح شئے مشہودہ ہے، اس لئے روح اپنے فعل کی حیثیت سے اس جگہ یعنی اپنی عنصری عمل گاہ میں دو رُخی ہو جاتی ہے، یعنی ایک روح کا خلقی اور مخرجی رُخ ہے اور دوسرا منزلی اور عملی، ....

... اسی طرح روح کا مخرجی رُخ اس کا رُخ اوّلین ہے، اور منزلی رُخ، رُخ ثانی، چنانچہ انسان کی روح کے رُخِ اوّلین کی وہ طاقت جو انسان کی روحانی قدر و قیمت اور اسکے توازن اور عدم توازن کے احساس کو انسان کے شعور میں لانے کی ذمہ دار ہے، اس کا نام "ضمیر" ہے، یا پھر یوں سمجھ لیجئے کہ ضمیر نام ہے اُس مشیّتی برقی سلسلے کا، جو حریم ذات اور اسکے حکم سے ترکیب پانے والی روح کی اس شعوری استعداد کے درمیان قائم ہے جو انسانوں کو تقسیم ہے۔

یہ ضمیر کی صنفی تعریف تھی، اب ہم یہ دیکھیں گے، ضمیر کے اصول کیا ہیں، اور کیا ہو سکتے ہیں، صانع حقیقی کی مشیّت کم از کم اس دُنیا کے لئے آجتک وہی ہے جو روزِ اوّل اس عالم اور اس میں پیدا کی جانے والی اشیاء کے لئے اس نے مقرر کر لی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شے کا مذہب اور اس کا کلیّہ کبھی تبدیل نہیں ہوتا اور نہ کوئی دنیوی طاقت ایسا کرنے کی مجاز ہے، مثلاً آپ پھٹکری کی خاصیت کو پھٹکری سے جُدا نہیں کر سکتے، بعینہٖ اسی طرح روح انسانی کے اصول یا دوسرے لفظوں میں مشیّتِ پروردگار انسان کیلئے قطعی طور پر لاتبدیل چیز ہے اب خواہ ماحول جُدا ہو، قومیّت دوسری ہو، تہذیب و تمدن میں فرق ہو لیکن انسان ہر جگہ انسان ہے۔ اسی روح کا حال! جو جنس انسان کے لئے ایک مرتبہ ترکیب پا چکی ہے، میرے اس دعوے کا ثبوت آپ انسانیت کے عمرانی آئینے میں دیکھئے، ابتداء آفرینش سے آجتک ہر زمانہ ہر ملک اور ہر طبقہ کے انسانوں کے اصول تسلیمیہ آپ کو وہی نظر آئیں گے، تہذیب، تمدن، زبان، ذوق ہر شئے عموماً تبدیل ہوتی رہتی ہے لیکن انسانیت کے اصول تسلیمیہ وہی ہیں، وہ تفریق قبائلی رسمیات سے متاثر ہو کر بحیثیت مجموعی یا انفرادی کبھی تبدیل نہیں ہو سکے مثلاً رحم و کرم، محبت، شفقت، ہمدردی، عدل، انصاف، جذبات مساوات اور حق گوئی جیسے اصول اپنے مخصوص اوزان کے ساتھ ہر جگہ انسانیت کے سچّے اصول تسلیم کئے جاتے ہیں اور کئے جاتے رہے ہیں، تاریخ کسی ایسے زمانے کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، جس میں انسانوں نے اجتماعی حیثیت میں برخلاف ان حقائق کے نفس کی گمراہیوں کو حق تسلیم کیا ہو، ایک بدکردار سے بدکردار نفس کے نزدیک بھی یہ حقائق، حقائق ہی کی صورت میں تسلیم ہیں، عملی صورت خواہ اس کی کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر وہ فطرۃً خود کے مقابلے میں دوسروں کی جانب سے افعال علویّہ ہی کے مظاہرے کا خواہشمند ہوتا ہے، علاوہ

اس کے معصوم بچوں کو آپ ہمیشہ افعال علویہ کا عامل پائینگے، واقعات کی یہ کسوٹی ساغر صاحب نظامی کے اس قول کو غلط ثابت کرتی ہے "برائی اور بھلائی میں تمیز کرنے والا ضمیر بھی بچپن ہی سے ایک خاص ماحول میں پرورش پاتا ہے، اور اس کی بری اور بھلی سیرت بھی اسی ماحول سے بنتی ہے" لیکن آخر معصوم بچے کس تربیت کے زیر اثر سچ بولا کرتے ہیں؟ جبکہ گندے سے گندے ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کو بھی ہم سچ بولتا ہوا پاتے ہیں، چنانچہ برخلاف اسکے واقعات اور مشاہدات جو ثبوت لاتے ہیں وہ اس حقیقت پر مبنی ہیں، روح انسانی کا رخ اوّلین ان حقیقت آفریں صفاتِ علویہ سے تعمیر ہے، جو صفات حریم ذات کا حصہ ہیں، اور اسی طرح وہ صفاتِ عالیہ جو دنیا بھر کے انسانوں کے نزدیک اجتماعی اور انفرادی ہر دو حیثیت سے مستند ہیں اور انسان کی دنیائے عمل میں جن کا استعمال زریں اصولوں کے نام سے کیا جاتا ہے، وہ اصول روحِ انسانی کے اصول صحیحہ ہیں۔

چنانچہ انسانیت کا ہر نمونہ طبعاً اور خلقاً استعدادات و خصوصیات روحانی کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، خارجی اثر سے نہ کوئی استعداد پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ مٹائی ہی جا سکتی ہے، تربیت اور ماحول ایک حد تک اثر انداز ضرور ہو سکتے ہیں، مثلاً ایک اچھا ماحول عارضی طور پر صفات عالیہ کے اظہار کے مواقع پیدا کر دیتا ہے اور اچھی تربیت بھی! لیکن تاوقتیکہ انسانیت کا ہر نوعمر نمونہ ذاتی غور و فکر کے ذریعے کسی امر کی معنوی حیثیت سمجھ لینے، اور اپنی فطرت کے حقائق کی روشنی میں آپ اپنی اخلاقی دنیا بنا لینے کے قابل نہیں ہو جاتا، خارجی اثرات کمزور رہتے ہیں۔ اکثر اور بیشتر تربیت اور ماحول کے نقوش مٹ کر دوسری شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم بعض نیک سے نیک والدین کی اولاد کو بدکردار، اور بعض بدخصائل والدین کی اولاد کو نیک دیکھتے ہیں، میں اگرچہ تربیت کے خلاف نہیں لیکن یہ ضرور کہونگی کہ تربیتِ صحیحہ وہی ہو سکتی ہے جو بچے کو عادتاً نیک بنا دینے کے بجائے اس کے ضمیر کی طاقت کو فروغ دے سکے، اور ہر امر کی حقیقت بچے کے ذہن نشین کر سکے، چنانچہ تربیت کو ہم خارجی اثر کہہ سکتے ہیں، لیکن نیکی کی اصل

وہی خاصۂ مشیت ایزدی ہے، جو انسان کی ہستی میں اس کی روح کے ذریعے شامل ہے، اب آپ انسان کی اس طبعی استعداد کو فطرت کی تربیت کہئے

. . . .

مشیت

. . . .

خالق سمجھئے، اور یا پھر انسانیت کے اجتماعی یا انفرادی مذہب پر محمول کیجئے بہر حال یہی وہ انسان کا حقیقی اور فطری مذہب ہے جس کے اصولوں کی شرح کو انسان کے شعور میں لانے کے لئے ضمیر کی طاقت مقرر ہے۔ چنانچہ حقائق کی خلاف ورزی یعنی بر موقع عدم قیام توازنِ صفاتِ روحانی، منجانب ضمیری طاقت تنبیہ کا احساس ہونا، اور مابعد ان روحانی اوزان کے فقدان کے تدارک کیلئے سچائی اور حقیقت کی جانب مراجعت کی ترغیب دینا ایک امر جبری ہے۔ گناہ کا احساس کیجئے یا نہ کیجئے، بے اختیارانہ طور پر اس کا احساس ہوگا[1]۔ انسان کے رخ ثانی یعنی اس کی نفسانی طاقت ضمیر کی آواز کی اس پیدائش کے انسداد سے قطعی قاصر ہے، جس طرح خواہش کرنا انسان کے رخ ثانی کی خصوصیت ہے، اور ضمیر آرزو اور طلب کی پیدائش کو روکنے کا مجاز نہیں، بعینہ اسی طرح شعور کے ہر فیصلے کے درست اور نادرست ہونے کے متعلق عادلانہ اور منصفانہ طریقے پر احساس پیدا کر دینا ضمیر کی خصوصیت ہے۔

اگرچہ ضمیری اور نفسانی دو برابر کی زبردست طاقتیں ہیں، مگر انسان کے ادارۂ شعور سے اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرنے کی مجاز نہیں، ہر امر کے متعلق فیصلہ صادر کرنا انسان کی شعوری طاقت کا کام ہے، اور انسان کے شعور کا یہ مختارانہ تصرف ہی وہ چیز ہے جو اس کو اپنے ہر فعل کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے، ہاں! ان ہر دو طاقتوں کی طرف سے اپنے منشاء اور ضرورتوں کے خلاف فیصلے کی صورت میں، بطور تنبیہ، احتجاج اور

[1] اس کی وجہ ضمیر کو کیوں مانا جائے — ؟ گناہ کا احساس ماحول کے خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ ماحول ہمیں یہ بتاتا رہا ہے کہ گناہ خلافِ اخلاق عمل ہے اس لئے ہم اس کی خرابی کا احساس کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں کوئی ماحول ایک صدی تک گناہ کی تائید میں تربیت دے تو ہم حسن گناہ کا احساس کرنے لگیں گے۔ اس لئے ضمیر ماحول کی مخلوق ہے۔ نہ کہ کوئی دوسری طاقت
ساغر

انتقام ومکافات فیصلہ یا عمل کا سلسلہ ضرور شروع ہو جاتا ہے۔ میں یہاں ایک چھوٹی سی مثال کے ذریعہ اس امر پر مزید روشنی ڈال دینا چاہتی ہوں مثلاً نفس، فقدانِ طاقت کے خوف سے بطور حفظ ما تقدم ضرورت خوراک کے احساس سے شعور کو خبردار کرتا ہے، اب اگر شعور اس احساس کے حق میں فیصلہ نہیں کرتا، اور قالب کو خوراک نہیں پہنچتی تو انسان کی جسمانی طاقت جواب دینا شروع کر دیتی ہے، اور نفسی طاقت کوفت اور بے چینی کا اظہار کرتی ہے، یہ گویا انسان کی نفسانی خودی یا نفسی قوتِ ارادی کا اپنے مشورے پر متوجہ نہ ہونے کے خلاف احتجاج یا شعور کے طرزِ عمل کی سزا ہوگی، اسی طرح جب انسان اپنی روحانی صفات کا غلط استعمال کرتا ہے تو ضمیر یا بہ الفاظ دیگر اس کی روحانی خودی کے احتجاج یا تنبیہ کا احساس انسان کے سینے میں ایک زبردست دھکے کی صورت میں ہوتا ہے اور انسان کے رُخ اوّلین کا حسّی ادارہ اضطراب اور بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔ اور یہ حالت اس وقت تک طاری رہتی ہے تاوقتیکہ انسان کا شعور اپنے مجرمانہ فعل پر متاسف نہیں ہوتا، اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کا عزم نہیں کر لیتا، انسان کے اس روحانی مدوجزر کو زہد اور مذہب کی زبان میں احساس گناہ، ندامت، اور توبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میرے اس بیان سے ہیل کے اس قول کی تردید ہو جاتی ہے، آپ لکھتے ہیں "گناہ کا احساس بہتر زندگی پیدا کرنے کی بجائے آدمی سے اس کی خوشی کو چھین لیتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر کہوں گی، گناہ کے احساس کا پیدا ہونا ایک امر جبری ہے اختیاری نہیں، کہ انسان اسکے احساس کو روک سکے، بقول ہیل "اگر کوئی آدمی مضطرب ہے، یا وہ اپنی نظروں میں ذلیل ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس نے خود ذلالت کا احساس پیدا کر لیا ہے"۔ بلکہ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اس کے کسی قول وفعل سے اس کی روح کے رُخ اوّلین کا توازن خراب ہو گیا ہے، اور ودیعت شدہ قدرتی طاقت ترغیب دے رہی ہے، کہ وہ اپنے افعال کا جائزہ لے کر اپنے صفاتی توازن کو درست کر سکے بعینہٖ جس طرح چند روز غذا نہ کھانے سے بھوک معدوم ہو جایا کرتی ہے بعینہٖ اسی طرح ضمیر کی آواز پر پیہم عدم توجہی، ضمیر کی آواز کو بھی کمزور اور پژمردہ کر دیا کرتی ہے، نتیجۃً جبکہ غذا کے عدم استعمال سے ایک دن مجبوراً انسانی پر موت کا طاری ہو جانا یقینی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلسل گناہگارانہ زندگی بسر کرنے سے انسان کا جوہر روحانی قریب المرگ نہ ہو جائے لیکن! تاہم جبتک انسان زندہ رہتا ہے اس کے افعال کی ہیئت کے تبدیل ہو جانے کا احتمال اور امکان باقی رہتا ہے، چنانچہ اس قسم کی صدہا مثالیں دُنیا میں موجود ہیں۔

سطور بالا میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ ضمیر کے اصول ہر جگہ ایک اور ہر حالت میں نہ تبدیل ہو جانے والے ہیں اور اسی طرح اس کی آواز بھی اپنے اٹل اصولوں کی بنا پر ایک ہے۔ ہیل لکھتا ہے "مختلف ملکوں میں ضمیر کا حکم بھی مختلف ہوتا ہے"۔ لیکن! اختلاف رکھنے والے احکام اور آواز ضمیر کی نہیں، بلکہ یہ جداگانہ ماحول رکھنے والی اقوام کے نفس کی آواز ہوا کرتی ہے جو بربنائے اختلاف رسمیات، تہذیب و تمدن اور آب ہوا کے بعض فروعی معاملات میں مختلف خواہشات اور آرزوئیں رکھنے پر مجبور ہیں۔ ورنہ انسان تو بالآخر ہر حالت میں ایک ہی وزن کی روح اور نفس رکھنے والے مجسمے کا نام ہے، اس لئے بنیادی اختلاف غیر ممکن! ضمیر کی آواز کو متمیز کرنے کے بارے میں، میں یہاں دو عالمگیر اصول بیان کروں گی۔ اوّل وہ آواز ضمیر کی آواز ہو سکتی ہے، جو انسان کی راہبری افعال علویّہ کی جانب کرتی ہو، اور افعال علویّہ وہ ہیں، جو دُنیا کے ہر طبقے اور ہر قوم کے انسانوں کے نزدیک مستند طور پر افضل ترین مانے جاتے ہوں دوسرے کثیر التعداد نفوس کیلئے یکساں نفع رساں اور سودمند ہو سکتے ہوں، اور دوسرے ضمیر کی آواز وہ ہے جو انسان کی توجہ اپنے رُخ اوّلین کے عرفان کی جانب مبذول کرتی ہو، اور عرفان رُخ اولین نام ہے اس مرتبے کی پہچان کا، جو بمقابلہ خدا اور اپنے ہمجنسوں کے انسان کو حاصل ہے، اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں، بقول ہیل ایک شرابی قوم کے فرد کے باطن سے اسکے شراب نہ پینے پر اگر ملامت آمیز آواز بلند ہوتی ہے، وہ اسکے ضمیر کی آواز ہو سکتی ہے یا اس کے نفس کی!

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے محض اس حقیقت کا واضح کرنا مقصود تھا، انسانیت اور بشریت سے رُخ اوّلین کے اصول اور اس کا مذہب، اجتماعی، اور انفرادی ہر دو صورتوں میں ایک واحد اور مشترک شے ہے، اور اس حالت میں یہ ایک ظاہر سی بات ہے کہ بشریت کی

اس عالمگیر مشترک چیز کو ہم انسان ساختہ کسی حالت اور کسی صورت میں بھی نہیں کہہ سکتے، بلکہ وہ قدرت کی عنایت اور ودیعت ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔ دستورہائے مذاہب عالم کا مخرج اصلی دماغ انسانی نہیں، بلکہ ذہنِ اعظم ہے، اور یہ محض ہماری حقیقت ہی کے اصولوں کی شرح تھی جو علاوہ حسّی راہبر (ضمیر) کی موجودگی کے ایک دوسرے خارجی طریقے سے یعنی بذریعۂ وحی اور الہام کے ہم تک پہنچائی جاتی رہی ہے۔ ساغر صاحب نظامی کا قول ہے "مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسے مذاہب جن میں اصولی اختلافات موجود ہوں کسی ایک خدا سے منسوب نہیں کئے جا سکتے" بلاشبہ لیکن جبکہ خدا کی مشیّت دُنیا کی ہر شے اور انسان کے لئے ہمیشہ سے ایک چلی آئی ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اسی مشیّت کی خارجی شرح میں اصولی یا کوئی فروعی اختلاف ہوتا! اگر اختلاف نظر آتے ہیں تو وہ مقننِ ازلی کے یا ان ہستیوں کے پیدا کردہ نہیں جو ان دستوروں کے شارح تھے، بلکہ یہ نتیجہ ہے اُس تحریف کا جو عام انسانوں کے ہاتھوں دستورِ مذاہب میں کر دی جایا کرتی تھی، دوسرے اس وقت جبکہ انسان کی عقلی ترقیات کا دائرہ محدود تھا، اصولِ مذہب بھی سادہ تھے، کیونکہ صرف ضبطِ نفس مقصود تھا اور ہے، اور پھر جوں جوں انسان کے تخیّلات اور تصوّرات نازک سے نازک صورت اختیار کرتے چلے گئے، اور عقل و ایجادات کی فراوانیاں انسان کی بسر اوقات کو پُر پیچ بناتی گئیں، اسی مناسبت سے دستورِ مذہب کی شرح بھی مفصّل اور باریک سے باریک تر کی جاتی رہی اور جب ضرورت باقی نہ رہی وہ سلسلہ ہی مسدود کر دیا گیا۔

تیسرے خدا نے کسی قوم کی اُن رسومات، تہذیب و تمدّن، اور شعائر کو مٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی جن کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ذِد انسان کی حقیقت اور حق العباد پر نہیں پڑتی تھی اور اس طرح اس قوم کی (جس میں کوئی نبی مبعوث ہوتا تھا) بعض دنیوی رسوم بھی بعد میں شعائر اور دستورِ مذہب کے ساتھ مربوط ہو جایا کرتی تھیں، مثلاً جس طرح عرب قوم کی رسمِ نکاح، تقطیع لباس، بعض قیود تمدّن، اور افراد قوم کے اسم وغیرہ دستورِ اسلام کے ساتھ مربوط ہو کر رہ گئے ہیں، ورنہ ان فروعات کا دراصل نفسِ مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، درحقیقت مذہب انسانی جس شے کا نام ہے وہ انسانوں میں ان کے بشریت کے جوہر کے ساتھ جاری اور ساری ہے! اور اسی شے کو "وجودی صورت" صحائف آسمانی کی شکل میں دی گئی ہے۔

فطرت کا اوّلین اصول عدل ہے جو کائنات کی ہر شے میں بصورت ہر شے کے ترکیبی توازن کے موجود ہے۔ بلکہ یوں کہئے تو بیجا نہیں، کہ ہر شے کا توازن ہی اسکے وجود کے قیام کا ذمّہ دار ہے، چنانچہ جس شے کے توازن میں اختلال پیدا ہو جائیگا۔ اسکے وجود کا مجروح یا معدوم ہو جانا ایک امرِ مسلّم ہے، ظاہر ہے کہ انسان کی ہستی ایک ایسے جہانگیر اصول سے جس کی قدرت خود بھی پابند نظر آتی ہے مستثنےٰ نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ ہر ہوشمند ہستی سمجھ سکتی ہے، کہ بدکردار اور مجرمانہ خیالات رکھنے والے انسان کی روح میں پیدا ہو جانے والا اختلال کیا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے؟ اصولاً اس کی ہر لغزش اس کی روح کے وجود کو زخم پہ زخم پہنچاتی رہے گی اور اگر اس جراحت کے اندمال کا ذریعہ بھی مسدود ہے تو بالآخر اس کی روح کے رُخ اوّل پر موت کا طاری ہو جانا یقینی ہے اور نتیجۃً ایسا آدمی خدا کی مشیّت کے اس معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، کسی شے کو ہم اس کے صحیح توازنِ ترکیبی کی موجودگی ہی میں اس کی جنس کے نام سے پکار سکتے ہیں، کوئی چوپایہ درندوں کی شکل و اوصاف اختیار کر کے چوپایہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ پانی اپنی مائع شکل میں پانی ہے، منجمد شکل میں برف، ابر اور ژالہ کہلاتا ہے، بعینہٖ اسی طرح توازنِ روحانی کا ضائع کر دینے والا انسان معنوی حیثیت میں انسان کہلانے کا مستحق نہیں، قدرت مجبور نہیں تھی، وہ انسان کو بھی خاص اصولوں کا پابند بنا سکتی تھی جیسا کہ دیگر اشیائے کائنات کی حالت سے عیاں ہے، لیکن خدا کو عجب پسند ندرت آگیں، اور آزادتر آرزو اور طلب کی تخلیق منظور تھی، اسکی صفتِ بے نیازی کے تضاد کی تکمیل اسی طرح ممکن تھی۔

علاوہ اسکے متشکّکین کے نزدیک عبادت کا مسئلہ سخت قابلِ اعتراض ہے، دراصل یہ اس خودداری کا مظاہرہ ہے جو ارتجاعِ علویت کے اثر سے سفلیت میں پیدا ہے، چنانچہ اصولاً بھی ایک ایسی ہستی کا جس کے خمیر میں علویت کا اثر موجود ہو، کسی شے مشہودہ اور غیر مشہودہ

کے روبرو سربسجدہ ہونے پر مجبور کیا جانا، اسکے وقارِ خلقی کی انتہائی توہین اور ذلّت کے مرادف ہے، مگر! باوجود اس قدر و قیمت رکھنے کے ہم انسانوں کو علاوہ خدا کی ہستی کے، ایسی چیزوں کی پرستش کرتا ہوا بھی دیکھتے ہیں، جو خود اس کی ذات سے بدرجہا ہیچ اور فروتر ہیں، آخر وہ کونسا جذبہ ہے جو اس کو اپنی فطرت کے خلاف عمل پیرا ہونے پر مجبور کرتا ہے! وہ اس کی غایتِ آفرینش ہے، وہ اس کا ذوقِ آرزو ہے اور اس کی خواہشات کی نیرنگیاں اور فراوانیاں ہیں جو اس کو اس کی فطرت کے خلاف نیازمندانہ شعار برتنے پر مجبور کرتی ہیں، پروردگار عالم الغیب ہے اس کو اس جنس کی نوعیت کے لحاظ سے اس کے جذبات کا تمام و کمال علم تھا۔ چنانچہ خالق اکبر نے انسان کے جذباتِ پرستش کی آسودگی کے لحاظ سے خود اپنی ہستی کو اس کے سامنے رکھا، یہ عبادت کی حقیقت ہے اور میرے خیال میں انسان کے نیازمندانہ جذبات کی آسودگی کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ ممکن ہی نہیں تھا۔

بقول ساغر صاحب اگر بلا دستورِ مذہب کی پابندی کے

۵ بعض انسان افضل ترین اخلاق و اعمال کے حامل ہیں تو یقینی طور پر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ضمیر کے معتمد ہوا کرتے ہیں، ایسے انسان اپنے ہر ارادے کو عملی قالب میں ڈھالنے سے پیشتر انسانیت کے عالمگیر ضمیر کے آئینے میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں، دستور مذاہب بھی انسانوں میں یہی چیز پیدا کرنے کے لئے تربیت دئے جاتے رہے ہیں سلسلۂ الہامیہ کی تجدید قدرت اسی وقت کرتی تھی جبکہ انسانیت من حیث النوع غور و فکر سے عاری ہو جایا کرتی تھی، میں کہوں گی اگر انسانیت بحیثیت مجموعی اپنی قیمت اور مرتبے کو سمجھ لیتی ہے، اور ایسے دستور مرتب کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جن کی رو سے اس کی قدر کی تذلیل اور مفادِ غیر کے نقصان کا قطعی انسداد ہو سکے تو ایسی صورت میں دستور مذہب کی پابندی اور عدم پابندی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن چونکہ ایسا ہونا ناممکنات سے ہے اس لئے دستورِ مذہب کی موجودگی ایک ضروری اور لازمی چیز ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ہر ذی شعور فرد پر اسکے امر و نواہی کی پابندی لازمی، تاکہ عوام الناس کیلئے راہِ عمل وا رہے اور سرکش طبیعتیں

سر برآوردہ انسانوں کی گمراہی کی آڑ نہ لے سکیں، دستور مذہب جبر کا مجاز نہیں، اسی طرح ضمیر بھی! محض مشعلِ راہ اور انسان کے فہم و تمیز کو ہر امر کے متعلق ایک اچھا فیصلہ دینے کے قابل بنا دینے کا معاون ہے دُنیا بمنزلہ ایک یونیورسٹی کے ہے، جہاں انسان ڈگری حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں، چنانچہ بہتر سے بہتر ڈگری حاصل کر لینا اس کی اپنی کوشش پر منحصر ہے، اور پھر نفس کی موت! اسکے فردنامۂ زندگی کی تکمیل کی دلیل، اور ثبوت ہوتا ہے اس امر کا کہ اس ہستی کا زمانۂ کوشش، اور اپنے فردنامۂ زندگی میں ردّ و بدل ترمیم و تنسیخ کا وقت ختم ہو چکا، اور اس کی حیات آئندہ اسی ریکارڈ سے تعمیر ہوگی، اس کے خالق کی خوشی اسی میں ہے، ہر وہ انسان جو پیدا ہوا ہے، خود کو اس ابدی دُنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہونے کا اہل ثابت کرے یہی وجہ تھی کہ اس شدو مد کے ساتھ راہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا گیا بتایا گیا ہے کہ وہ انسان آئندہ زندگی میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کا اہل ہوگا، جو خود سے فروتر اشیا یا کسی مساوی الدرجہ اور مساوی القدر ہستی کے روبرو سربسجدہ ہو کر اپنے مرتبے کی بصورت قول و فعل تذلیل کا مرتکب نہ ہوا ہوگا۔ دوسرے اس کی ہستی اپنے ہمجنسوں کے لئے خیر ثابت ہوئی ہوگی، غور کیجئے، آپ تمام تعلیمات مذہبی کا لب لباب اوپر لکھے ہوئے خط کشیدہ فقروں میں موجود پائینگے، ظاہر ہے کہ وہ شر انگیز، تنگ چشم، حاسد اور ظالم انسان جس کے قول و فعل سے اس کے ہمجنسوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ان عالی مرتبہ انسانوں کی دُنیا میں رہنے کا مجاز نہیں ہو سکتا، جن کی زندگیاں ایک دوسرے کے لئے خیر ہی خیر ثابت ہوئی ہونگی، لامحالہ اس کو کسی فروترین جگہ پر رہتے ہوئے ناکامیاب اور غیر مطمئن زندگی بسر کرنا ہوگی اور اسی طرح وہ انسان وہاں اپنی کسی خواہش اور آرزو کی آسودگی کا سامان نہ پائینگے۔ جنہوں نے اس دُنیا کی فروترین اور خود کے مساوی المرتبت ہستیوں کو اپنا حاجت روا تسلیم کیا ہوگا سوائے خدا کی واحد ہستی کے نہ کوئی اس دُنیا میں حاجت روائی کا اہل ہے اور نہ وہاں ہوگا، لیکن ایسے لوگ فریبِ نفس میں مبتلا رہکر اپنے قول و فعل سے ایک لاتبدیل نقشۂ زندگی بنا چکے ہونگے اور وہاں ہمیشہ انہیں اپنے معبودانِ باطل کی تلاش میں سرگرداں رہینگے، یہی وہ صورتیں ہیں جن کو اصطلاحِ مذہب اور زہد میں جزا و سزا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ورنہ اس معاملے

سوویٹ نقدِ ادب

لفظ تنقید کا مفہوم سوویٹ روس میں اس سے کچھ مختلف ہے، جو مغربی یورپ میں سمجھا جاتا ہے۔ سوویٹ لوگوں کے لئے اس سے مراد نہ تو وثیقہ رسی اور خوردہ بینی ہے اور نہ آرٹ کی پارلیمنٹ میں متخالف رایوں کی زرگری جنگ۔ سوویٹ یونین میں تنقید کا مفہوم ان کروروں انسانوں کی کوششوں اور شقتوں سے وابستہ ہے جو اشتراکی بنیادوں پر دنیا کی نئی تعمیر پر تُل گئے ہیں۔

سوویٹ یونین کی زندگی جو پرانے سماج کی عمارت کا گوشہ گوشہ کھود ڈال رہی ہے، بجائے خود پرانے سماج پر ایک قطعی اور مستقل تنقید ہے۔

اس انقلابی تنقید کو جگانے والی جنگی جہاز ارورا[1] کے لوگوں کی وہ گرج تھی جو (Winter Palace) پر برسے۔ اور پچھلے سترہ سال کی مدت میں تنقید کا یہ نیا عنصر، جو پرانے روس کے لئے بالکل اجنبی چیز تھا سوویٹ زندگی کا ضروری جزو بن گیا ہے۔ باپ گھر میں اگر نشے کی حالت میں داخل ہوتا ہے تو اسکول کا طالب علم بیٹا اس کی تنقید کرتا ہے، کارخانے میں اگر کوئی بات اشتراکیت کی تعمیر کے خلاف نظر آتی ہے تو ایک مزدور اس پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ غرض تنقید اور یہی تنقید سوویٹ روس کی سانسیں بنگئی ہیں، اور سوویٹ روس کو اگر سمجھا جاسکتا ہے تو اسی پس منظر کے ساتھ ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔

سوویٹ روس کی تنقید میں دو باتیں سب پر چھائی ہوئی نظر آئیں گی۔ ایک تو انقلاب کا دباؤ یا اثر اور دوسری کلچری ورثے کا تحفظ اور اس کا تنقیدی استعمال: انقلاب کے اثر یا دباؤ سے مراد یہ ہے کہ محنت کش عوام نے انقلاب کو پورے کا ر ناکر نئی تعمیر شروع کردی ہے اور وہ ایک ایسا سماج بنا رہے ہیں جس کی بنیادیں اصولِ اقتصاد پر قائم ہیں۔ اور کلچری ورثے کے تحفظ و استعمال کی تصریح یہ ہے، غلامی کی بیڑیوں کو کاٹ کر کروروں انسان اب کلچر، علم اور صنعت کے مدعی و مستحق بن رہے ہیں!

سوویٹ نقدِ ادب نے ادب اور ادیبوں کی زندگی میں اہم کام انجام دیا اور دے رہا ہے، اور سوویٹ مصنف کے ذہن و شعور میں انتقاد کی جگہ اس سے مختلف ہے جو دوسرے ملکوں کے مصنف کے ذہن و شعور میں ہوسکتی ہے۔

سرمایہ دارانہ سماج میں جس طرح اور ہر چیز مال تجارت بن جاتی ہے اسی طرح چھپی ہوئی رائے اور فکر بھی مال تجارت بن گئی ہے۔ اناطول فرانس مدعی ہے کہ اس نے اپنے متعلق ایک بھی تنقیدی مضمون نہیں پڑھا، کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی، اس کے معنی یہ ہیں کہ اناطول فرانس قسم کی سی جودت و ذہانت ایک ایسی ہانڈی ہے جو گھر میں روزمرہ پکتی ہے، چنانچہ مغربی ملکوں میں تنقید، تمسخر یا تحقیر پر توجہ نہ دینا ہی ایک خود دار انسان یا مصنف کے شایانِ شان ہے لیکن ایسے ملک میں جہاں ہر ادبی پیداوار ایک "سماجی واقعہ" کی حیثیت رکھتی ہو نقدِ ادب ایک جدا ہی چیز ہوگی۔ اس لئے کہ اس سے کروروں آدمیوں کو لگاؤ اور دلچسپی ہے انقلاب کے وہ مسئلے جو سوویٹ ادب سوویٹ پبلک کے سامنے پیش کرتا ہے، ان مسائل کی گونج سوویٹ تنقید کے اندر بھی سنائی دیتی ہے۔ اسی بنا پر سوویٹ نقدِ ادب ایک مختلف شے بنجاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ وہ تمام مسائل جو پچھلے پندرہ سال میں سوویٹ زندگی کا جزو رہ چکے اور اس زندگی میں ہلچل پیدا کرچکے ہیں، ادب میں

[1] زار کے فوجی بیڑے کا وہ جہاز جس پر سب سے پہلے بغاوت ہوئی، اور جس نے انقلاب کی ابتدا کی۔

ادبی تنقید کا تاریخی موضوع بنگئے ہیں ــــ ادبی تنقید جن نقادوں کا مشغلہ ہے ان کے علاوہ سوویٹ مصنف اور سوویٹ پبلک بھی ادبی تنقید اور صناعت کی بحثوں میں دلچسپی لیتی ہے یا ان کے حصّہ لینے کی بنا بھی یہی ہے۔

نقد ادب، سوویٹ روس میں در اصل ایک محاذ ہے۔ جہاں انقلاب ادب سے ہم کلام ہوتا ہے۔

انقلاب روس کے پیدا کردہ نقادِ ادب کون تھے؟ سوویٹ تنقیدی ادب کیونکر وجود میں آیا؟ اور سوویٹ ادب کے مسائل، اس کے کارنامے، اور اس کی ناکامیاں کیا ہیں؟

کسی کو یہ مغالطہ نہ ہونا چاہیے کہ یونانی اصنامیات میں جس طرح علم و فضل کی دیوی خدائے خدایان زیوس کے دماغ سے تکمیلی صورت میں پیدا ہوئی ویسے ہی انقلاب کے دماغ میں سے سوویٹ تنقید مکمل شکل میں نمودار ہوگئی۔ سوویٹ تنقید نے خود انقلاب کے انقلابات کے ساتھ ترقی کی ہے، اور مختلف منزلوں میں اس کے سامنے مختلف قسم کے سوال آتے رہے ہیں، لیکن تقریباً تمام سوالوں کی جڑ "مارکسیت" (Marxism) اور صناعت کا باہمی رشتہ تھا۔ ان بحثوں میں بنیادی سوال یہ تھا کہ صناعت کو "مارکسیت" سے کس طرح مطابقت کیا جاسکتا ہے۔ سوویٹ نقاد اسی مسئلے کے حل میں لگے رہے ہیں۔

فلسفہ، اقتصادیات اور سیاسیات کا صناعت سے رشتہ و تعلق قائم کرنے کے متعلق مارکس نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور اس رشتہ و تعلق کو پورا ابروز ہونے دیا ہے۔ لینن اور اسٹالن نے اس کو متمول بھی بنادیا لیکن مارکس کے اخلاقیات اور نقد ادب کے باب میں انقلاب کے بنیادی سوالوں میں منہمک رہنے کے سبب سے زیادہ چھان بین نہ کی جاسکی تھی اس لئے یہ مسئلے سوویٹ ادبی تنقید کے لئے تیز اور گرم بحثوں کا سبب بن گئے۔ ان بحثوں سے ان مسئلوں کو پورا ابروز حاصل ہوا اور ان میں باریکیاں اور نزاکتیں آگئیں۔

سوویٹ تنقید نے ان مسائل کو جس طرح حل کیا ہے اس کا مکمل تصور قائم کرنے کے لئے اسے تاریخی نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ سوویٹ تنقید کو تین دوروں میں بانٹا جاسکتا ہے پہلا دور رسالہ (Karanaya Nou) ۲۵-۱۹۲۱ء کا دور ہے دوسرا رسالہ (Na Literaturnom Postu) اور نقادوں کی اس جماعت کی مشغولیت کا دور ہے جو پرولتاریا اہل قلم کی ایسوسی ایشن (Rapp) کے لیڈر تھے۔ اور تیسرا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب بولشویک پارٹی کی سنٹرل کمیٹی نے طے کردیا کہ اہل قلم کے مختلف ادارے اور پارٹیاں ختم ہوکر سوویٹ مصنفین کی صرف ایک انجمن بننا چاہیئے۔

ان تینوں دور کی خصوصیات سمجھنے کے لئے یہ جان لینا چاہیئے کہ سوویٹ تنقید کی بنا کن اصول پر ہوئی تھی۔ سوویٹ تنقید کا پہلا قدم یہ تھا کہ اس نے قبل انقلاب کے بورژوا طرز انتقاد کے اصول اور طریقوں کو یکسر ترک کردیا۔ (اگرچہ افسانے کے اندر یہ ترک شروع شروع واضح نہ تھا)

اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ سوویٹ تنقید انقلابی ورثہ یا روایات اور اصلاً مارکس کی تعلیمات پر قائم ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں وہ انیسویں صدی کے مسلمہ ادبی نقاد Belinsky، Dobrolubo اور Chernyshevsky کے نظریات و کلیات پر مبنی ہے۔

"مارکسیت" اور آرٹ کے رشتے پر اگرچہ بہت زیادہ جرح و بحث نہیں ہوئی لیکن اس کی بعض ایسی مثالیں موجود ہیں جنکو کلاسکی ہونے کا درجہ حاصل ہے Plekhnov نے جس کی تصانیف لینن کی رائے میں مارکسی ادب کا بہترین نمونہ ہیں، سب سے زیادہ سیر حاصل بحث کی ہے۔ پلاخنوف نے جو اصول نقد وضع کیا ہے اسے وہ "خارجی نسلی" Objective Genetic نام دیتا ہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ صناعت پارے کو انجام کار میں عمرانی اقتصادیات (Socio-economic) کے ماحصل کی حیثیت سے جانچا جائے۔

سوویٹ تنقید نے لینن اینگلس فرافسکی اور مہرنگ کے انفرادی تنقیدی خیالات سے بہت کچھ استفادہ کیا اور کررہی ہے۔ لینن نے ٹالسٹائی پر تین مقالے لکھے جو مشہور عام ہیں اور جو استدلالی مادیت (Dialectic materialism) کے اصول و طریق کو ایک زبردست صناع کے صناعت پاروں سے مطابقت دینے کا عدیم المثال کارنامہ ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹالن کے عندیات (Idealogy) سائنس کلچری انقلاب بولشوک خود تنقیدی کے تاریخی تفاعل (Function) اور سوویٹ ادبی تنقید کے باب میں بیش قیمت خزانہ ہیں۔ سوویٹ تنقید انقلاب کے ابتدائی سالوں (۱۹۲۱ء) سے شروع ہوتی ہے جس وقت ہر طرف خانہ جنگی (سول وار) کی آگ بھڑکی ہوئی تھی جب ریلوں کے انجن کوئلہ نہ ملنے کے سبب جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے تھے۔ جب غلہ کی قلت کے سبب سے لوگ دانے دانے کا شمار کررہے تھے۔

ایسے مختصر وقت میں پرولتاریا طبقہ ادب کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کرسکا تھا ہے

کہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت تک جو کچھ ادبی سرمایہ تھا وہ قبل انقلاب کے ادیبوں کی تصانیف پر مشتمل اور پیٹرو گراڈ اور ماسکو میں محدود تھا اور تنقید کا جو انداز اس وقت تک عام تھا وہ بس "قواعد پرستی" اور "آئین نوازی" پر زور دیتا تھا۔ یہ ادبی سرمایہ تعلیم یافتہ طبقے کی بھی ایک مخصوص جماعت کا کارنامہ تھا، جو مقابلتاً کم عرصہ ان کی تعلیم کی تھی اور اس جماعت کی ادب پسندی لئے ہے کہ اس پر ختم تھی کہ انقلاب سے بچے رہیں، ان کے ادبی انداز نے ادب کو ایک قسم کی "شگفتگی" یعنی (Foriegn Settlement) بنا دیا تھا۔ جس کا خاص ضابطہ زندگی سے بے نیاز ہونا تھا۔

سب سے ممتاز "قواعد پرست" (Formalist) مصنف (W. Shklovsky) تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ :-

"صناعت ہمیشہ زندگی سے بے نیاز رہی ہے، صناعت کے اندر قلعوں پر اڑنے والے پھریروں کے رنگ منعکس نہیں ہوتے"

اس قواعد پرستی کے اُن ادیبوں سے بعض ایسی کتابیں تصنیف کرائیں جو بتاتی ہیں کہ صناعت چند ایسے طریقوں کا مجموعہ ہے جو ایک محدود حلقے میں بروئے کار آتے اور باہم دگر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایسی تصانیف میں Shklovsky کی B. Eichenbaum 'Theory of Prose' کی Poetic - 'Tynyanov' کی اور On Tolstoy کی Language. ہیں۔ اِن تصانیف کے علاوہ اس جماعت نے مختلف کتابوں پر مضامین بھی لکھے ہیں۔ اس اسکول کی عمر دس سال سے آگے نہ بڑھی، بہر حال اس کو سوویٹ تنقید کا جزو قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس جماعت کا نظریہ صناعت بورژوا نظریہ تھا۔

بعد انقلاب کے شروع سالوں میں اس جماعت کے ساتھ ساتھ ایک اور جماعت بھی تنقید کے میدان میں اُتری جو اپنے آپ کو "مستقبلی" (Futurists) کہتی تھی۔ یعنی Left Front والے Chuzhak Brik 'Mayakovsky اس جماعت میں اور Arvatov شامل تھے۔ ان "لیفٹ فرنٹ" والے "مستقبل پرستوں" نے جو تنقیدی ادب پیدا کیا اُسے سوویٹ تنقید کا ایک جزو کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر قطعی طور سے انقلابی رجحانات تھے مگر ساتھ ہی، اس جماعت کے تنقیدی ادب میں انقلاب سے متعلق "پیٹی بورژوا" کے اس

حصے کے متعلق بھی اظہار خیال ہوا ہے جسے انقلاب کے اندر سوائے تخریب کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ فرانسوی ضرب المثل کے مطابق یہ "مستقبلی" نقاد "جہاں پناہ" سے زیادہ "شاہ پرست" تھے۔ اِن کا نظریہ صناعت یہ تھا کہ صناعت ایک مستعار چیز ہے اور پرولتاریا کے لئے بالکل غیر ضروری" اِن کا محبوب فقرہ تھا کہ "صناعت عوام کے لئے افیم کی گولی ہے!" یہ فقرہ مارکس کے اس مشہور فقرے سے ماخوذ ہے کہ "مذہب عوام کے لئے افیم کے مترادف ہے"
چنانچہ مایاکوفسکی نے روسی شعراء کو ایک نظم لکھ کر تنبیہ کی ہے کہ شعر کہنا ترک کر دیں۔

اس موقع پر (Lunacharsky) نمودار ہوا۔ اس کے جو مضامین ان دنوں میں شائع ہوتے۔ سوویٹ تنقید کی پہلی آواز تھی اور ایک ایسے آدمی کی آواز تھی جو صناعت کو حقیقتاً سمجھتا تھا۔ لوناچارسکی کو اصل میں سوویٹ تنقید کا باوا آدم سمجھنا چاہئے۔

چونکہ سول وار کا ہنگامہ بجائے خود ناموافق تھا اس پر کاغذ کا قحط اس لئے اس زمانے میں کوئی وقیع ادبی رسالہ وجود میں نہ آسکا۔ خود سوویٹ تنقید آگے نہ بڑھی تاوقتیکہ سوویٹ ادب نے ترقی نہ کی اور سوویٹ ادب کی ترقی کا زمانہ A. Voronsky کی ادبی معروفیت سے وابستہ ہے جو ایک اعلیٰ نقاد اور رسالہ Krasnaya Nov کا ایڈیٹر تھا۔ فرانسکی کے تنقیدی خیالات کی خصوصیت "ارادۂ عوام" People's Will ہے۔ اس سے اس کی مراد تعلیم یافتہ طبقے کے میلان سے تھی۔ اس کے تنقیدی مضامین نے انقلاب کے حامیوں کو بڑی تقویت پہونچائی۔ لیکن اس کے نظریاتی خیالات جنھیں اس نے Art of Seeing the world میں مکمل کیا ہے، انقلاب کی بڑھتی رو سے برسر جنگ تھے۔

فرانسکی ایک اعتبار سے پلاخانف سے بڑھ گیا تھا پلاخانف آرٹ کو "جماعتی مفاد کا اظہار" کہتا تھا، اور فرانسکی اُسے بس ایک پُرسکون مشغلہ سمجھتا تھا جو "جنگ کی حالت میں جاری نہیں رہ سکتا!"
فرانسکی صناعت میں جو پہلی بات دیکھنا چاہتا تھا وہ اس کا بلاواسطہ اثر یعنی خرد مشاہدے کا پہلو تھا اور اس کا صناعتی تخیل ٹالسٹائی اور پراؤسٹ کی تصانیف پر مبنی تھا۔ جن کے اندر براہ راست مشاہدہ بہت

نمایاں ہے اس سے ظاہر ہے کہ فرانسکی کے نظریہ میں مارکس کے ادبی تخیل
کی جان یعنی طبقاتی تحریک کا وجود نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ فرانسکی اور فرانسکی
کی ہم خیالی کوئی اتفاقی امر نہ تھا۔

نقادوں کی ایک خاص جماعت فرانسکی کے ہم خیال اور اس کے
نظریوں کی مؤید ہو گئی (D. Grobov اور A. Lezhnev
وغیرہ اور اس تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتی تھی جو جنگجو اور انقلابی پرلتاریا
کو دور ہی سے دیکھ رہا تھا۔

مگر فرانسکی کے اس اتفاوی دستے پر رسالہ (Na Postu)
کے ذریعہ سے اشتراکی نقادوں Roskolmikov اور Rodovolin
وغیرہ نے زبردست حملہ کر دیا۔ اس گروہ نے ادب کے اندر اشتراکی
عسکریت کو بھی داخل کیا کیونکہ اس میں وہ نوجوان انشاء پرداز شامل تھے جو
سول وار کے محاذوں سے حال میں پلٹے تھے۔ Na Postu کے اس حلقے
نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مصنّع کے اندر کامل عندیاتی استقامت و یکسانی۔
consistancy لازمی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ لکڑی کو حد سے
زیادہ جھکانے کا مترادف تھا۔ یہ شرط اتنی سخت تھی کہ اس کے اندر صنّاع
کے شعور کو تشکیل پا لینے کے مدارج کی بھی رعایت نہ تھی۔

لیکن اس حلقے کے نقادوں کی بھی باری آئی Rapp (پرولتاریا
انشاپردازوں کی ایسوسی ایشن) کے ممبروں نے Na Postu والوں
پر سخت حملہ کر دیا۔

اور پھر ایک عرصے (۱۹۳۲) تک سوویٹ تنقید Rapp ہی کے
ہاتھوں میں رہی رسالہ Na Postu کا نام بدل کر Na Lit
eraturnom Postu رکھا گیا۔ اس جماعت میں زیادہ تر ایسے لوگ
شامل تھے جو یا تو Komsomol کے ممبر تھے یا چند سرخ فوج کے
ریزیدیاتی Serebryaky اور Ermilov، ... وغیرہ بالخصوص اس جماعت کے لیڈر ہوتے رہے۔

اب وہ وقت آیا کہ تنقیدی ادب کا میدان سخت قسم کی عندیاتی جنگ
کا میدان بن گیا۔ یہ جنگ اصل میں اس جنگ کا عکس یا ضمیمہ تھی جو اس وقت
سارے ملک میں بڑے شد و مد سے جاری تھی، اور جس نے اس وقت بہت زور
باندھا جب پرولتاریہ نے تمام محاذوں سے حملہ شروع کیا Kulak (زمیندار)

جماعت کو فنا کر دینے کا جہاد یا کارخانوں میں کام کرنے والے تعلیم یافتہ اور بڑھ
کی انفرادی رجعتی سازشیں، ان کی تباہ کارانہ مصروفیتیں، کاشتکار کا "سب مل"
کھیتی کے کام میں مکمل طور پر بدل جاتا، ان تمام باتوں نے سماجی کشاکش اور
دباؤ کی فضا پیدا کر دی تھی جو حد درجہ حسّاس تھی، اور اس کا اظہار ادبی تنقید
کی بساط پر ہو رہا تھا۔ Rapp کے عہد کی تنقید کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ
اصلاً صحافتی نوعیت رکھتی تھی۔ ان نقادوں کا طریق کار تھا کہ صناعتی پہلو کو
نظر انداز کر کے، سب سے پہلے اُسے طبقاتی (class) نظریوں پر جانچا جاتا تھا۔

تاہم، یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ Rapp حلقے کے نقاد تین پہلوؤں سے مقابلہ
کر رہے تھے جن کے نتائج کو مارکسی تنقید کے فوائد میں سمجھنا پڑے گا اس گروہ کے مقاصد
میں ایک تو فرانسکی اسکول کی غلطیوں کو آشکار کرنا تھا۔ دوسرے Pereverzev
اسکول کی "مارکسیت" دشمنی کو واشگاف کرنا اور تیسرے ادبی
(Literaturnaya) محاذ کے خلاف جہاد کرنا تھا۔

پرافرسیف کی جماعت نے ادبی تنقید کی تمام توجہ اور مصروفیت کو دو
عنصروں پر منحصر کر دیا تھا۔ ایک طرز (Style) اور دوسری نقل (Image)
یہ دونوں عنصر بلا واسطہ یا مشینی (mechanically) طور پر طرز کی طاقت
کو قطعی ثابت کرنے کے لئے طبقاتی حلقوں (classes) سے اخذ کئے جاتے تھے
ان کا استدلال یہ تھا کہ مصنّف کے تصوّرات کی دنیا محدود و معیّن ہوتی ہے۔
اگر ادب میں اس دنیا سے باہر نہیں نکل سکتا تو ادب میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور
طبقاتی جدوجہد بالکل الگ رہ جاتی ہے پریفرسیف نے "مینشویت" پر بھی نقد و جرح
کی، مگر اس کے معاملات کی فہم اور واقعات تک رسائی کا طریقہ بھدا تھا۔ اور
Rapp حلقے کے نقادوں نے اسکے ان نظریوں کی پول کھول دی۔

اسی دوران میں Leftist رجحان ترقی یافتہ گروہ جماعت رونما
ہو گئی تھی جسکا نام "ادبی محاذ" تھا۔ اس جماعت کا نظریہ یہ تھا کہ Lef کی
غلطیاں اُن نئے اور بدلے ہوئے حالات میں اسی طرح جاری رہنا چاہئیں مگر
جب لیف خود ۱۹۲۸ء میں اپنی مغالطوں پر آگاہ ہو کر صحیح راستہ پر آ گیا تو ادبی محاذ
والوں نے اپنے خیال و رجحان کو تعمیری زمانے میں پھر ایک حد تک زندہ کیا۔
اس جماعت کے خیال میں ادب کے اندر کوئی تصوّری پہلو تھا ہی نہیں وہ ادب
کو صرف تعمیری کہنا چاہتے تھے۔ اسی لئے "میکانکی" صحافت پر زور دیتے تھے اور اسی
کو پرولتاریا کی معراج سمجھتے تھے۔ لیکن بالآخر Rapp والوں نے ان کے

نظریوں کا کھوکھلا پن بھی ثابت کر دیا اور "ادبی محاذ" کے اصول شکست کھا گئے۔

مگر دوسری نظریاتی اور سیاسی غلطیوں کے علاوہ Rapp جماعت کی ایک غلطی یہ بھی تھی کہ وہ پرولتاریا اور اشتراکی کلچر کا موازنہ کرتے اور جبتی و صحافتی سطح پر اتر آتے تھے۔ جہاں کسی کام کے صناعتی پہلو کا نظر انداز ہو جانا لابدی ہے۔ اس طرح فن تنقید ایک محدود حلقے کے جماعتی مفاد کا آلۂ کار بن کر رہ گیا۔

لیکن سنٹرل کمیٹی کے ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء فیصلے نے کہ تمام سوویٹ مصنفین کی صرف ایک انجمن ہو Rapp کو بھی ختم کر دیا۔ یہ فیصلہ کسی تنظیمی ضرورت کا فیصلہ نہ تھا۔ بلکہ اس کی تہ میں تنقید کے لئے گہرے سیاسی اور نظریاتی نتائج چھپے ہوئے تھے۔ اس فیصلے نے ایک اور اہم بات یہ کی کہ نقاد بننے کا معیار بدل گیا اور ادبی تنقید کے مسائل میں ایک نیا اور سنجیدہ زاویہ نکل آیا، اس لئے کہ اب تنقید کے میدان میں ایسے لوگ آنے لگے تھے جنہوں نے حکمت و فلسفہ کی باقاعدہ تعلیم سوویٹ عہد سے پہلے حاصل کی تھی۔

تنقید کے مرکزی آرگن کو Literary Critic کی ادارت Yadin کے ہاتھ میں آئی جو کلاسکی انسٹیٹیوٹ کا ڈائرکٹر بھی تھا Yadin کے مددگار بھی ایسے ہی لوگ تھے جن کی فلسفہ کی تعلیم باقاعدہ ہوئی تھی

آج سوویٹ تنقید کی خصوصیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سوویٹ نقد ادب کے مسائل وہی ہیں جو سوویٹ ادب کے سامنے عام طور پر آتے رہتے ہیں۔ اب ایسے طبقاتی رجحان جو اصل مقصد کے لئے مضر رساں ہوں، مناسب کم یا زیادہ توجہ حاصل نہیں کر پاتے۔ اہل قلم کی بہت بڑی اکثریت عرصہ ہوا کہ اشتراکی نظام قائم کرنے کے مقصد سے متفق ہو کر اس میں شامل ہو چکی ہے چنانچہ اب تنقید کا اصل مقصود ذہنی تعلیم و تربیت بن گیا ہے۔ یعنی اپنے شعور میں سرمایہ داری نظام کے اثرات اور توارث سے جد و جہد کرنا اور آتِ صناعت کے نہ دکھانا، اور چونکہ اب ادبی تنقید میں پرولتاریا کے صناعتی وسائل کو نشو و نما دینے والے مسائل پیش ہوتے ہیں اس لئے صناعانہ دستکاری اور صناعتی قدر، سوویٹ تنقید کی مخصوص اہمیت ہے اور اس کا مرکزی و نظریاتی مسئلہ اشتراکی واقعیت ہے۔

"اشتراکی واقعیت" کیا ہے؟ اس اصطلاح سے مراد صناعت کا وہ تصور ہے جس کی پہلی ضرورت زندگی کو اس کے عمومی اور جوہری رجحانات کے ساتھ پیش کرنا ہے۔

"زندگی کے اصلی خط و خال سچائی کے ساتھ پیش کرو۔"

یہ ہے وہ مطالبہ جو سوویٹ تنقید اپنے اہل قلم سے کرتی ہے، اور یہ مطالبہ در اصل سوویٹ پڑھنے والے عوام کا ہے۔ کیونکہ ادب لطیف (Bells Letters) اب سوویٹ عام کی روزمرہ کی کلچری زندگی کا ایک جزو ہو گیا ہے۔

اس کے باوجود، سوویٹ زندگی اس وقت جس منزل میں ہے سوویٹ پڑھنے والے عوام کا یہ مطالبہ اب زیادہ زور کے ساتھ پیش ہوگا، اور سوویٹ ادب میں اگر اب تک سوویٹ شعور کی تشکیل کرنے کے لئے تنقید کو اہمیت حاصل نہ تھی تو وہ اہمیت اسے اب مل جائے گی۔ اور وہ عام ادب کی وسیع دلچسپی کے نئے ادبی مسائل کو وسیع تر پیمانے پر جانچے گی۔

اس نوع کا پہلا مضمون گورکی کا وہ مقالہ ہے جو اس نے سوویٹ ادب کے عمومی صناعانہ خاصے اور زبان کے متعلق شائع کیا ہے، گورکی کے انتقادی مضامین کا مجموعہ (On Literature) مستقبل کی ادبی تنقید اور اس کے خاص میلان کو صاف اور واضح کر کے پیش کر دیتا ہے

سوویٹ ادب اور سائنس

پچھلے دہ سال (سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء) میں سوویٹ سائنس اور اس کا مسالا ادب کے نمایاں موضوع بن گئے ہیں اور یہ صورت حال کوئی اتفاقی امر نہیں ہے۔ سوویٹ ادب کا ان مسائل سے دو چار ہونا ناگزیر تھا۔ اس لئے کہ سائنس کو سوویٹ یونین میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔

مختلف ادبی جماعتوں کا خاص مقصد یہ ہے کہ اہل سائنس اور اہل قلم میں تعاون و تعامل ہو، ان مختلف مسائل پر جو دونوں جماعتوں کے لئے مساوی طور پر دلچسپی کا باعث تھے، ادیبوں اور سائنس دانوں کے درمیان بحث و گفتگو نتیجہ خیز ثابت ہو چکی ہے، اور ہوگی۔ اس باہمی رشتہ و تعلق کے بارے میں ایک نوجوان سوویٹ انشا پرداز کا خیال تھا کہ "اس قسم کی کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب سائنسی موضوعات پر ادبی تصنیف کا مسالا اور موضوع ادبی چاشنی کے بغیر خود اپنی جگہ بھی پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کی چیز ہو!"

یہ خیال تمام تر صحیح نہیں، کیونکہ ایسی کتاب تو خالص ریاضیات اور طبیعیات پر بھی

ایضاً دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء

لکھی جاسکتی ہے جو عام پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی رکھتی ہو اور ادب کے لئے بھی اہم ہو، سائنسی ادبی تصنیف کی خاص ضروریات میں بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ اس کے اندر قیمت اور زمانے کی علامات موجود ہوں، سوویٹ سائنس کو ترقی دینے والے مسائل لوگوں کو یقین دلانے کے انداز میں پیش کئے گئے ہوں، اور اس تحریک کا مقصد صاف طور پر ظاہر ہوتا ہو۔

ایک بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اس قسم کا ادب پیدا کرنا سوویٹ مصنفین ہی کا فرض منصبی کیوں قرار پائے؟ لیکن جب یہ امر مسلمہ ہے کہ سائنسی مقاصد کے باب میں سوویٹ یونین اور دوسرے ملکوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہو بالکل اسی طرح جس طرح سوویٹ کے باشندوں کے اعمال و افعال اور دوسرے ملکوں کے باشندوں کے افعال و اعمال کا نقطۂ نظر جدا ہے۔

سائنس اور سائنس دانوں کے متعلق سوویٹ ادب کو بھی دوسرے ملکوں کی تصانیف سے مختلف ہونا چاہئے چنانچہ سوویٹ ادب اس نوع کی سائنسی ادبی تصانیف سے جو دوسرے ملکوں میں لکھی گئی ہیں مستفید ہوتا ہے اور اُسے ہونا چاہئے ان تصانیف سے سوویٹ ادب کا آشنا ہونا یہ معلوم کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ سائنسی ادب کے لئے کتنا اہم مسالا اور وسیع امکانات بہم پہونچاتا ہے

سائنسی بروز کی تاریخ میں ادب کے لئے موضوع اور مسالے کے خزانے موجود ہیں V. Kaferin نے اس مضمون میں مثال کے طور پر مشہور روسی ہندسی Labachefsky کے حالاتِ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتا ہے :-

لباچیفسکی کی سوانح عمری آپ کو ہر انسائیکلوپیڈیا میں ملے گی اس میں آپ کو کوئی دلچسپی نظر نہ آئے گی۔ بس اتنا علم ہو جائے گا کہ وہ قازان یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔ ساری عمر میں صرف دو بار وہ بھی چند دنوں کے لئے قازان سے باہر گیا اور یہ کہ وہ ایک نئے سائنس کا موجد تھا جو اسی کے نام سے موسوم بھی ہوا۔ یعنی لباچیفسکی کی Pan - Geometry لیکن آپ ذرا غور سے کام لیں گے تو بہت سے دلچسپ پہلو سامنے آجائیں گے۔ سب سے پہلے آپ کا ذہن سوال کرے گا کہ اس دور افتادہ ملک کی ایک یونیورسٹی میں ساری عمر پڑا رہنے والا انسان واقعی جری نفس اور کمال مستقل مزاج آدمی تھا کہ ایک ایسے مسئلے کی مخالفت کا اعلان کیا جو دو ہزار برس سے معتقد مسئلہ تھا۔ اور ایسی حالت میں اعلان کیا جبکہ اُسی یونیورسٹی میں پروفیسر Nicolsky اپنا نظریہ صحیح ثابت کرنے کے لئے کہہ رہا تھا کہ

" خدا کے فضل سے یہ دو مثلث باہم مناسب موافق تسلیم کئے جائیں گے"

اگر اس طرح فکر کی تو آپ کو محسوس ہوگا کہ لباچیفسکی کے متعلق آپ کے تمام تصورات غلط تھے۔ کیونکہ آپ دیکھیں اور سمجھیں گے کہ اس کی بظاہر خوش اور پُرسکون زندگی المناک اور یاس انگیز واقعات کا مجموعہ ہے اور اس کی واقعی زندگی سے اس کی سوانح عمری بالکل ہمنوا نہیں ہوتی۔

پھر آپ کو نظر آئے گا کہ حیرتناک حد تک متضاد معاملات سے لبریز زندگی سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی اس بڑے مفکر کی اختراع کی داستان بیحد دلچسپ ہے ۱۸۲۶ء میں اپنی دریافت مکمل کر لینے کے بعد لباچیفسکی عمر بھر اس کوشش میں رہا کہ کوئی امتیاز نہ سہی، توجہ تو حاصل ہو۔ اس نے اپنی تحقیقات کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مختلف اوقات میں اور مختلف زبانوں میں سات مقالے شائع کرلئے۔ لیکن کسی سے بہتر نام نہ پاسکا۔ بدترکی تو حد نہ تھی۔ گالیاں اور استہزا ایک تھا۔ آپ اگر وہ تمام تبصرے اور ریویو پڑھیں تو غصے کو ضبط کرنا مشکل ہو جائیگا۔ لباچیفسکی نے صرف ایک مرتبہ اپنی توہین کرنے والوں کا جواب لکھا وہ بھی ایک "فٹ نوٹ" میں۔

لباچیفسکی کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی کہ اس کو ایک ذہین شاگرد مل جائے جس کو وہ اپنا سرمایۂ تحقیق سونپ جائے، اس زمانے میں جبکہ اس کی بینائی جاتی رہی تھی، وہ اسی تلاش میں یونیورسٹی کے امتحانوں میں جاتا تھا کہ ممکن ہے اس کی مراد پوری ہو جائے، مگر ہوتا کیونکر جبکہ خود اس کے شاگرد اسے کم سنکی فرد سمجھ رہے تھے، چنانچہ اس کے مرنے پر قبرستان میں جو اساتذہ و طلبا کی تقریریں ہوئیں تعریف کی کوئی ایسی بات اُٹھا نہ رکھی گئی جو لباچیفسکی میں بیان نہ کی گئی ہو، لیکن اس کی دریافت اور اس کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کسی ایک متنفس نے بھی اشارہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ شاید اُس مخالفت کرنے میں مروّت مانع تھی اور موافقت کرنے میں خود اپنی عقل و دانش کو رسوا کرنا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ لباچیفسکی اگر یہ دریافت نہ کرتا تو نہایت سکون و راحت کی زندگی گذارتا، بہرحال آپ اگر اس نظر سے مطالعہ کریں گے تو وہ مطالعہ لباچیفسکی کی موت پر ختم نہ ہو جائے گا بلکہ آپ اس کی دوسری زندگی کا مطالعہ کریں گے۔

لباچیفسکی کی دوسری زندگی اس کے مرنے کے بعد شروع ہوئی اور وہ نہ صرف اس وقت بھی جی رہا ہے بلکہ نامعلوم مدت تک جیئے گا۔ اس دوسری زندگی میں لباچیفسکی ممتاز ہے، محترم ہے، مشہور ہے۔ وہی لوگ جو چند برس پہلے قبرستان میں لباچیفسکی کی دریافت کا حوالہ دیتے شرماتے تھے اب اس پر مفتخر ہیں کہ وہ اُس

یونیورسٹی میں پڑھے ہیں۔ جس کا باپ حیفک کی پروفیسر تھا۔

غرض سائنسی موضوعات کو ادب کا مسالا بنانے کے لئے ایک انشا پرداز کو سائنس کی کتابوں کا مطالعہ لازم ہے۔ مگر نہ اس طرح جیسے سائنس داں پڑھتا ہے، ایک ادیب کا مطالعہ اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ وہ سائنس داں مصنف کے خیالات کو از سر نو مرتب کرے۔ سائنس کے خشک بیانات کے بین السطور میں سائنس داں کی زندگی اور مزاجی کیفیات کو پڑھے، اس جدوجہد کی تاریخ کو پڑھے اور اس کے معنی کو سمجھے جو اس سائنس داں کو اپنے مخالفوں اور موافقوں کے ساتھ کرنا پڑی۔ سائنسی تحقیقات میں مخالفوں کے علاوہ دوستوں کی مخالفت ناگزیر ہے ایک ادبی مصنف کے لئے سائنسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے یہ طریقہ اختیار کرنا از بس ضروری ہے۔

سائنس داں خود اپنے نفسیات کو ترک کر دیتا ہے مگر ادبی مصنف کا فرض ہے کہ اُس کے نفسیات کو خود محسوس کرے۔ اس لئے کہ سائنس داں اپنے کام کے نفسیات کو پیش کرنا بالکل غیر ضروری سمجھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے بیان کو زیادہ سے زیادہ مختصر اور خشک عبارت میں پیش کرنے ہی کو بہتر طریقہ سمجھتا ہے، جو ادبی مصنف کے طریقے سے بالکل تضاد رکھتا ہے۔

یہاں تک کہ جو کچھ کہا گیا وہ اس نقطۂ نظر سے تھا کہ سائنس اور سائنس دانوں کی تاریخ میں ادب کے لئے موضوع اور مسالے کی افراط ہے لیکن حالیہ سائنس بھی اور خاصکر سوویٹ سائنس ادبی موضوع اور مسالے کے لازوال خزانے رکھتا ہے۔ ادبی موضوعات میں سائنسی فنتاسی (Scientific Fantastic) ناولوں نے ایک خاص جگہ حاصل کر لی ہے اور اس میں کسی کو شک کی گنجائش نہیں کہ اس قسم کا مسالا ادبی کام کے لئے بہت بڑے امکان پیش کرتا ہے۔ دریافت و انکشاف کا یہ لا انتہا سلسلہ انسانوں کی طرز ماندوبود کو بدلے بغیر نہیں رہ سکتا اور ایسی دریافت و انکشاف کے متعلق ادیبانہ پیشگوئی کرنے میں کوئی بڑی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی، سب جانتے ہیں کہ برودت قوت (Energy) کا ذریعہ ہے، قوت سے ہوا حاصل ہو سکتی ہے اور ایسے مختلف طریق ہے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں فوٹوگرافی کے عنصروں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ الحاصل سائنس ایسے ادبی موضوع اور مسالا بہم پہونچا دیتا ہے جس پر صناع ادب کو

کوئی بڑی کاوش نہیں کرنا پڑتی اور کوئی بڑا خطرہ بھی برداشت نہیں کرنا پڑتا، ان تمام آسانیوں کی موجودگی میں ایک بات البتہ ایسی ہے کہ کسی سائنسی فنتاسی ناول کے مصنف کی کوششوں پر پانی پھر جائے یعنی پیش یا افتادہ واقعات کو سائنسی فنتاسی مسالے سے مطابقت دینا سائنسی فنتاسی ناول کے ہیرو کو ژول ورن نے سب سے پہلے رومانی کردار بنانے کی ابتدا کی۔ ادب اور بالخصوص اطفالی ادب میں رومانیت ایسی قابل نفرین چیز نہیں جیسی کہ آجکل اُسے سمجھا جا رہا ہے با ایں ہمہ سائنسی فنتاسی ناول کی بنا اس سے مختلف ہونا چاہیئے

A. F. Ioffe
سوویٹ سائنس دانوں اور اہل قلم کی مشترک کانفرنس میں جب نے ایک نیا گلیور پیدا کرنے کی تجویز پیش کی تو اس سے مدعا یہ تھا کہ زندگی کے معیار کا یہ جو عظیم الشان پیمانہ تیار ہو رہا ہے اس کے اندر تضاد نا مطابقت یا عدم استقلال ضرور رونما ہوگا اور یہ نا مطابقت و عدم استقلال اعلیٰ قسم کا ادبی مسالا بن سکتا ہے۔ ژوفے کا یہ خیال عمل میں آجائے تو اعلیٰ مرتبہ کی ادبی تصانیف وجود میں آسکتی ہیں، اور چونکہ یہ ادبی تصانیف موجودہ اندازِ تصور سے وابستہ اور طرزِ تحقیق سے ماخوذ نہ ہوں گی اس لئے ایسے ادب کی خصوصیتِ کبریٰ سائنسی ادب کی نئی مثال ہونا ہوگی۔

سوویٹ سائنس دانوں کی سماجی یعنی غیر علمی زندگی کے حالات نے سوویٹ مصنفوں اور ڈراما نویسوں کی خاص توجہ جذب کر رکھی ہے۔ لیونوف کا مشہور ناول "اسکتاریفسکی" جس پر اہلِ فن نے سنجیدہ تبصرے کئے اس قسم کی اعلیٰ تصنیف ہے۔

لیونوف کا مقصد سائنس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے اندر جماعتی اختلاف کو دکھانا ہے اور اسکی خاتمت تصنیف ایک مشہور طبیعیاتی کی سوویٹ حکومت کا حامی بن جانا، بلکہ کہنے کہ اس عبوری حالت کو منظر عام پر لانا ہے جو افسانے کی ابتدا کے وقت مکمل ہو چکی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ناول کا ہیرو فسانہ شروع ہونے سے پہلے سوویٹ کا حامی بن چکا تھا لیکن اس تغیر کو فسانے کے اندر پردے کا رکھا گیا ہے

کفے دن کی رائے میں لیونوف نے اس موضوع کو اس زور آور اظہاریت کے ساتھ پیش نہیں کیا جس کا کہ وہ موضوع مستحق و متقاضی تھا۔ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ لیونوف ایسے سائنسداں کا کردار پیش کرتا ہے جس کے متعلق لیونوف کی رائے بے لوث نہیں بلکہ قیاسی یا تعصب سے متاثر ہے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک حد تک ناول کا پلاٹ پرانے ہی ڈھرے پر چلتا ہے یعنی باپ ایک مجتمع میں اور بیٹا مخالف گروہ کے ساتھ ہے ایک نئی اکثر

ہوجاتی ہے وغیرہ۔ ایسی صورت واقعہ اگرچہ سوویٹ واقعیت" میں بھی ناممکن الوقوع نہیں، لیکن لیونوف کے ناول میں واقعات کی یہ صورتیں مصنوعی معلوم ہوتی ہیں دوسری ممکن وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ناول کا مسالا رسمی طور پر تو نامناسب نہیں ہو لیکن اس کے اندر وہ قطعیت (Concreteness) مفقود ہے جو اُس مسالے کو پُرزور، اور پڑھنے والے کی دلچسپی کا سبب بناتی۔

لیونوف نے اگر روزمرہ کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ گہرا کیا ہوتا جن کے بغیر کوئی سائنس داں اپنے کام کا تصور ہی قائم نہیں کرسکتا، وہ اگر ایک سائنس داں کی زندگی کے مشاہدے میں اپنے تعصب و قیاس کو راہ نہ دیتا تو اسکٹازیفسکی کا کردار اور مجموعی حیثیت سے وہ ناول بہت بہتر ہوتا۔

"اینا کرینینا" میں ٹالسٹائی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایک نقاش نقاشی کے تمام انداز (Forms) کا علم حاصل نہ کرسکے، کیونکہ حقیقی نقاشی کے اندر جس کا ملہم خود زندگی ہے، یہ علم نقاش کو از خود حاصل ہوجاتا ہے۔ لیونوف کا ناول ٹولسٹائی کے اس نظریے کا ثبوت نہیں دیتا۔ اس کے ہیرو کی دریافت کا تعلق زمان و مکان سے معلوم ہی نہیں ہوتا، اور پڑھنے والا بالکل نہیں سمجھ سکتا کہ ہیرو کی اس دریافت کا درجہ تاریخ سائنس میں کیا ہے۔

اس کے برخلاف Zoshchenko نے اپنی تازہ تصنیف Youth Returned میں لیونوف کے طریقے سے جدا راہ اختیار کی ہے لیونوف ایک ایسے سائنس داں کو پیش کرتا ہے مگر زوشچینکوف نے ایک سائنسی ناول لکھنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔

(Youth Returned) ایک کامیاب کتاب ہے اور اس کو کامیاب بنانے والی خصوصیات معمولی غور سے روشن ہوسکتی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو مصنف کی جرأت انشا ہے، اس لئے کہ عام طور پر سوویٹ مصنف بھی اپنی تصنیف میں اپنی ذات کو داخل نہیں کرتے۔ زوشچینکوف نے اس کتاب میں جہاں تہاں اپنے متعلق اشارے کئے ہیں یہ اشارے اسی لئے قابل قدر ہیں کہ وہ "ذاتی" ہیں۔ اس سے پہلے Derzhavin کے سوا کسی سوویٹ مصنف نے اپنے متعلق کسی ادبی تصنیف میں ایسی دلیری نہیں دکھائی مگر زوشچینکوف کے یہ اشارے سائنٹیفک ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی ان اشاروں کو سائنٹیفک نہ مانے لیکن مصنف کی ذاتی انہماک و دلچسپی کے بارے میں کسی کو شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ زوشچینکوف ایک جگہ لکھتا ہے "وہ کتا جس پر تجربہ کیا گیا میں تھا" یقیناً کوئی سوویٹ مصنف اس صاف گوئی کو اپنی ادبی تصنیف میں روا نہ رکھتا۔

اس کتاب کے کامیاب ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس نے ایک ایسے سائنس کو برو ز دینے کی کوشش کی ہے جو عام پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کی چیز ہے۔ اگرچہ بعض ماہرین طبیعیات نے اس پر اعتراض کئے ہیں اور ممکن ہے کہ جو طبی نسخے اس کتاب میں درج ہیں صحیح ہوں لیکن غور کی بات یہ ہے کہ مصنف نے یہ کتاب پڑھنے والے کی جگہ پر لکھی ہے — ایسے پڑھنے والے کی طرف سے جو پینتیس سال کی عمر میں حیران ہے کہ اس کے اعصاب میں انتشار کیوں ہے؟ اس کی آنکھوں کی چمک کیا ہوئی؟ اس کا چہرہ پھیکا اور پیٹ ڈھل ڈھل کیوں ہے؟ اور اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایسی کتاب لکھ لینا جس کا وہ پڑھنے والا جس میں یہ علامتیں موجود ہوں، یہ سمجھنے لگے کہ یہ کتاب خود میں نے لکھی ہے، آسان کام نہیں۔

تیسری دلیل کہ یہ ناول کامیاب ہے یہ ہے کہ اس کی طرز جدید اور انداز مناسب ہے۔ زوشچینکوف نے اپنی مستقل ذکاوت اور ذہانت سے اپنی طرز کو سائنس کی طرز سے ملا دیا ہے۔

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ سائنسی ادبی تصنیف میں مصنف کے ذاتی واقعات شامل ہوجانے سے کوئی حیرت انگیز نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے مگر یہ امر واقعہ ہے کہ زوشچینکوف کسی اختراع کا موجد ہو یا نہ ہو، لیکن اس کی یہ تصنیف ادب کا ایک نادر نمونہ ضرور ہے۔

آخر میں یہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تبصرے میں جو تنقیدی اشارے کئے گئے ہیں ان کو سائنسی ادب کا نمونہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ نظریاتی مقالوں میں یہ سوال حل نہیں کیا جاسکتا وہ تو خود ادب ہی کے اندر حل ہوگا اور سوویٹ ادب میں سائنسی ادب کا سوال پیدا ہوچکا اور اس پر کافی توجہ صرف کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جس چیز کو سائنسی ادب کا مسالا کہا جاسکتا ہے یعنی سوویٹ سائنس کے اعلیٰ دماغوں کے گہرے علمی خیالات، وہ اہم واقعات جو سوویٹ نفسیات کو از سر نو ڈھال رہے ہیں، اور سوویٹ لوگوں کا عالمگیر نقطۂ نظر، یہ سب باتیں سوویٹ ادب میں جھلکیں گی!

ل۔ احمد

ایشیا

دوسرا باب

افسانے و ڈرامے

ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء

پریم بندھن

نوجوان جوگی وندھیاچل کی پہاڑی پر کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ایک حسرت و مایوسی تھی۔ گرو کے حکم کے مطابق اسے کل ان تمام سرسبز میدانوں، دلفریب جھیلوں، ان خوش آیند مناظر کو، جہاں اس نے بچپن سے جوانی تک اپنی زندگی بسر کی تھی ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا تھا۔ گرو کے حکم میں دم زدن کی مجال نہ تھی۔ نوجوان جوگی نے اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا، لیکن وہ اس وقت بھی کھڑا ہوا ان مناظر کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

دوسرے دن رخصت کے وقت تمام گاؤں کے لوگ آئے وہ رو رہے تھے۔ انہیں جوگی سے انسیت تھی۔ وہ جوگی کو جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔ مجمع سے ایک ضعیف آدمی آگے بڑھا۔ اس کی بوڑھی آنکھیں عقیدت کے آنسوؤں سے تر تھیں اس نے کہا:۔

"جوگی نہ جاؤ ہمارا گاؤں ویران ہو جائیگا۔ ہم بوڑھوں کی کون دیکھ بھال کرے گا۔"

ایک بیوہ عورت آگے بڑھی اور بولی:۔

"جوگی تو ہمارا سہارا ہے، کیا اب یہ سہارا بھی ٹوٹ جائیگا۔ کیا تو ہمیں چھوڑ کر چلا جائیگا۔ تیرے بعد ہمارا کون ہے؟"

ایک بچہ بھیڑ میں سے دوڑ کر جوگی کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا:۔

"میں تمہیں نہیں جانے دونگا۔"

جوگی نے بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مجمع پر ایک محبت بھری نظر ڈالی اور کہنے لگا:۔

"مگر مجھے جانا ہی ہوگا۔"

مجمع سے آواز آئی،

"آخر کیوں؟"

جوگی بولا،

"یہ گروجی کا حکم ہے۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے، یہاں سنسار اور سنسار کا بوجھ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ گروجی کا خیال ہے کہ میں یہاں رہا تو میری آتما شکتی نہیں پا سکے گی، میں تباہ ہو جاؤنگا تم مجھ سے دور سہی مگر تمہاری یاد میرے دل میں رہے گی۔ میں اپنے بچپن کے منظروں، اپنے محسنوں کو نہیں بھول سکتا۔"

لیکن جوگی کی نظروں میں کچھ اضطراب و بےچینی تھی وہ چاروں طرف بیتابی سے نظریں ڈال رہا تھا۔ آخر مایوس ہو کر اس نے حسرت سے گردن جھکا لی۔

جوگی کو حکم تھا کہ آج ہی رات کو گاؤں سے چلا جائے۔ شام ہو چکی تھی، اندھیرا چھا رہا تھا، جوگی مجمع میں ایک ایک سے ملا، لیکن اس کی نظروں کا اضطرب، اسکے دل کی بیقراری ویسی ہی رہی۔ اب اندھیرا چھا چکا تھا، جوگی سب سے ملکر چلا اور ایک طرف تاریکی میں غائب ہو گیا۔

چندرا گاؤں کی ایک خوبصورت مگر غریب لڑکی تھی۔ وہ کھیت میں کام کر کے اپنا پیٹ پالتی تھی۔ باپ اور ماں دونوں مر چکے تھے اس کی صرف ایک خالہ تھی جو دوسرے گاؤں میں بیاہی گئی تھی اور

وہیں رہتی تھی۔ چندرا کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی گاؤں کے ایک کنارے پر تھی جہاں وہ تنہا ہی رہتی تھی۔ یہ اس کو ماں اور باپ کے بعد ترکہ میں ملی تھی۔

اب رات ہو چکی تھی۔ جھونپڑی کے دروازہ پر کسی نے آہستہ سے آواز دی۔

"چندرا"

پھر چند لمحوں کے وقفہ کے بعد کسی نے کہا،

"چندرا"

اور پھر بغیر کسی جواب کا انتظار کئے ہوئے دروازہ کھولکر اندر داخل ہو گیا۔

چندرا بیہوش پڑی تھی،

جوگی یہ دیکھ کر گھبرا گیا، چندرا کے چہرے پر پانی چھڑکا، اسکا سر اٹھا کر گود میں رکھا اور دامن ہلا کر ہوا دینے کی کوشش کرتے ہوئے ایک اضطرار انگیز لہجہ میں پکارنے لگا،

"چندرا، چندرا"

تھوڑی دیر کے بعد چندرا کے جسم میں کچھ حرکت ہوئی اس نے آہستہ آہستہ پلک اٹھائی اور آنکھ کھولدی۔

جوگی بولا،

"چندرا۔ دیکھو میں وداع ہونے آیا ہوں۔ سب لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ تم نہیں آئیں چندرا، میں تم سے ملے بغیر کیسے جا سکتا تھا میں خود ہی چلا آیا۔"

چندرا کے بے اختیار آنسو بہنے لگے، بولی،

"میں جانتی ہوں، میری وجہ سے تمہیں دیس نکالا مل رہا ہے، میری وجہ سے تمہیں اپنا گھر، اپنا گاؤں، اپنا سب کچھ چھوڑ دینا پڑ رہا ہے میری وجہ سے بھگوان تم سے خفا ہو جانے والے ہیں، میری وجہ سے، مگر شاید اب اس کی ضرورت نہ ہوگی، جوگی تم نے ٹھیک کہا ہے۔ تم وداع ہونے کے لئے آئے ہو، اپنی شانتا سے وداع ہونے کے لئے۔ میں تمہارے لئے اس قدر مصیبتوں کا باعث نہیں بنوں گی۔ میں وداع ہو جاؤں گی جوگی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اب سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔"

"چندرا۔ چندرا تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"ہاں میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں جوگی سب کچھ جلد ہی ختم ہو اب سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ اب گرو جی تم سے ناراض نہیں ہو تم گاؤں سے اب نہیں نکالے جاؤ گے۔"

"مگر چندرا میں تو گرو جی سے رخصت ہو آیا ہوں۔ بعض انسان خود بھی تو نہیں سمجھتا کہ کیا کر رہا ہے۔ دیکھو نا۔ گرو جی مجھے خ[illegible] کرنے آئے تھے۔ میں ان سے رخصت ہو گیا۔ تم مجھے رخصت کر[illegible] نہیں آئی تھیں، میں خود آکر تم سے مل گیا۔"

"آہ یہ تم نے کیا کہدیا جوگی، تم نے کیا کہدیا۔ بھگوان! کیا میرے بھاگ میں تھا، کیا اتنا ہی کافی نہ تھا۔ بھگوان! یہ کیسے شعلے بھڑک اٹھے۔ یہ مجھے کیا ہو گیا، جوگی یہ تم نے کیا کہدیا۔"

"چندرا، میں سچ کہہ رہا ہوں، یقین کرو چندرا۔"

"جوگی! ..... مگر اب یہ سب بے سود ہے۔ اب سب کچھ ہی ختم ہو جائے گا۔ میں نے زہر کھا لیا ہے۔ اب سب کچھ جلد ہی ختم ہو جائے گا۔"

"چندرا یہ تم نے کیا کیا!"

"کچھ نہیں جوگی، پریم پر ایک چھوٹی سی بھینٹ چڑھائی ہے اور نہیں۔ یہی تو زندگی ہے، جو ہم چاہیں وہ پا کر بھی نہ پا سکیں، یہی تو جیوا ہے، تم نے بہت اچھا کیا جوگی تم آگئے، مجھے سب کچھ مل گیا، شکتی شانتی، میں سوچ رہی تھی میرے دیوتا مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے، یہ سوچ رہی تھی اب میں کس کے قدموں میں جان دوں گی، یہ سوچ کر مجھے مرنے سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ مگر تم بڑے دیالو ہو۔ تم آگئے، مجھے سب کچھ مل گیا، مجھے سہارا دو جوگی۔ مجھے سہارا دو کہ اٹھ کر ایک دفعہ آخری دفعہ ان قدموں کو چھولوں جوگی، میری دنیا مجھے مل گئی۔ مجھے سہارا دو کہ اٹھ کر ان چرنوں میں اپنا سر رکھ دوں اور ہمیشہ کی نیند سو جاؤں۔"

ایک بجھا ہوا سا تبسم چندرا کے لبوں پر دم توڑ رہا ہے۔ اسکی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ ان میں نشہ کا سا خمار چھایا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنا سر جوگی کے قدموں میں رکھ دیا اور دو ہچکیاں لیکر خاموش ہو گئی، جوگی بالکل ایک بت کی طرح خاموش اور بے حس و حرکت تھا!

دوسرے دن صبح، تمام گاؤں کے لوگ چندرا کی جھونپڑی پر جمع تھے۔ جوگی خودکشی کر چکا تھا۔ دونوں لاشیں اندر پڑی تھیں، گرو کھڑا ہوا اپنے کئے پر آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا جو جوگی نے مرتے وقت اپنے دوست رامو کو لکھا تھا۔ پرچہ میں تحریر تھا:۔

"رامو بھیا! گرو جی کے پاس جانا اور کہنا، جوگی نے آپ کو پرنام کہا ہے، ان سے کہنا چندرا محبت کی قربان گاہ پر نثار ہو چکی اب میری باری ہے۔ ان سے کہنا آپ کا جوگی زندگی کی طرح موت میں بھی ہار گیا اسکے جیون کو آپ نے ٹھکا دیا تھا۔ اور اس کی موت کو چندرا نے ٹھکا دیا وہ بازی لے گئی۔ میں ایک ہاری ہوئی موت مر رہا ہوں اس لئے ــــ اس لئے کہ اب شاید کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا ہے، رامو بھیا گرو جی سے کہنا آپ نے میرے جیون کو توڑ ڈالا، چور چور کر دیا۔ مگر آپ میرے پریم کو نہ توڑ سکے ــــ شاید ــــ شاید ــــ شاید اس لئے کہ میرا پریم آپ کے دھرم سے بھی زیادہ پکا۔ زیادہ مضبوط تھا۔ رامو بھیا گرو جی سے کہنا کہ جوگی نے مرتے وقت ایک بات سمجھی ہے ــــ بہت بڑی بات، ــــ سارے دھرموں کا خلاصہ ــــ کہ جیون اور آتما کی مکتی بگاڑ اور جدائی میں نہیں، ملاپ اور پریم میں ہے۔"

جمیل احمد بی، اے، بریلوی

صرف اک پرواز

یہ ادائے خرام و مستیٔ ناز	گردشِ ماہ بھی ہے پا انداز
کیا لبھائے انہیں مری آواز	ساز ہے، ساز بھی شکستہ ساز
وہ ہیں نازک سماعت و نازک	سن نہ لیں دکھ بھری مری آواز
نگہ غور سے نہ دیکھ مجھے	خود بخود کھل رہا ہے دل کا راز
دل کا انجام دیکھئے کیا ہو	ہو رہا ہے شباب کا آغاز
میری ہستی کو مست کر ڈالا	حسن رنگیں ہو تیری عمر دراز

ارض کو آسماں بنا ڈالو

زندگی کیا ہے صرف اک پرواز

پرواز مچھلی شہری

ایشیا، دسمبر ۱۹۴۰ء

سایہ نما قاتل

مسلسل

(دوسری قسط)

چاندنی اب ذرا اور تیز ہو گئی تھی اور چاروں طرف نور پاشیاں شروع ہو گئی تھیں۔ آنے والوں میں سے دو کے ہاتھ میں برقی مشعل تھے نا کمبھ کو فانڈا محل کے معزز مکینوں کا علم پہلے سے تھا۔ اس نے تین آدمیوں کو فوراً ہی پہچان لیا اک تو تھا خاندانی وکیل، دوسرا اینسل ڈاکٹر تھا خاندانی طبیب اور تیسرا مارس دین تھا جس نے حال ہی میں راجہ صاحب کی لڑکی سے شادی کی تھی "خیریت تو ہے؟" مارس دین نے تیزی سے پوچھا اور ٹھیک اسی وقت مشعل کی روشنی نا کمبھ اور انسپکٹر پر ڈالی۔

"تم پولیس والے ہو؟ تم کون ہو؟" وہ یکایک سکڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اس کی نگاہ ایک اچانک مردے پر پڑ گئی تھی۔ پناہ! یہ تو ہمارا بڑا مالی ہے۔ کیا وہ مر چکا ہے؟"

ہاں نا کمبھ کا لہجہ سنجیدہ تھا، نظریں مشین تھیں "اب کوئی ضرورت نہیں ڈاکٹر صاحب آپ کا شکریہ۔ ڈاکٹر اینسل لاش کی طرف بڑھ کر رک گئے۔ "مہربانی کر کے آپ سب لوگ یہیں رہئے ابھی ہم ——"

کسی نے کان بھی نہ ہلایا مارس دین کی رہبری میں سب نے مقتول کو گھیر لیا۔ نا کمبھ کے لبوں پر ایک لعنت آتے آتے جذب ہو گئی۔ جمہوری جلوں نے نشانِ قدم کے سوراغ کو اپنی روا روی سے پاش پاش کر دیا تھا طویل مرتعش لمحے گزرتے رہے جسم کشادہ، خوفزدہ لوگ کھڑے ہوئے مقتول مالی کو دیکھ رہے تھے۔ دہشت تھی۔ پھر بھی اچانک اور تیز موت کی موجودگی جاذبِ نگاہ تھی۔

مارس دین سب سے پہلے پیچھے ہٹا اور اپنی نگاہ بلند کی۔

"کیونکر —— کیسے —— ؟"

نا کمبھ کو کچھ چھپانا نہ تھا اس نے صاف صاف کہدیا۔

اس نے تمہیں فون پر اطلاع کی تم لوگ عین موقعہ پر پہنچ گئے۔ تم نے سایہ نما قاتل کو دیکھا پھر بھی تم مالی کو نہ بچا سکے۔ مارس دین نے غصہ میں بھر کر کہا تم تو اس قابل ہو کہ ——"

"طعن تشنیع سے ہمیں فائدہ نہ پہنچے گا" نا کمبھ نے بات کاٹ کر کہا واقعات جس طرح میں نے بتایا ہے اسی طرح ظہور پذیر ہوئے مجھے یقین ہے کہ قاتل بھاگ کر گھر میں گھس گیا میں ہر شخص سے باری باری جرح کے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ مارس دین صاحب برائے مہربانی اس کا انتظام کر دیجئے کہ خاندان کے ارکین، نوکر و مہمان سب کے سب کتب خانہ میں آ کر ایک جگہ جمع ہو جائیں۔

"بیشک مارس دین نے جواب دیا، مگر آخر غریب مالی کے قتل کرنے کی وجہ بھی تو ہو؟"

ظاہر ہے کہ قاتل کی ترکیب یہی تھی" نا کمبھ نے کہا اب آپ لوگ مہربانی کر کے سب کے سب اندر چلے جائیں۔ سب لوگ محل کی طرف مڑے۔ انسپکٹر آبادے نے مڑ کر اپنا رومال مقتول کے ڈراونے چہرے پر پھیلا دیا۔ پھر وہ اور جاسوس دونوں محل کی طرف شانہ بشانہ روانہ ہوئے۔ نا کمبھ کے داہنے ہاتھ میں رومال میں لپٹا ہوا چاقو تھا۔

"بہتر ہوگا کہ مجھے یہ چاقو دیدو" انسپکٹر نے ناکمبھ کے ہاتھ سے چلتے وقت وہ چاقو لے لیا۔ "تم جبتک لوگوں سے پوچھ گچھ کرو گے میں ماتسن کو بلالوں گا تاکہ وہ نشانات کی تحقیق کرسکے۔ لاش فانڈا محل کے رہنے والوں کے حوالہ کردی جائیگی۔ یہ بڑا مالی تھا۔ غالباً اس کی تجہیز وتکفین محل والے کرینگے پنچایت نامہ کل صبح مرتب ہوجائیگا۔

ناکمبھ نے بےخیالی میں اپنے سر کو اک کان دی متردد زبان سے پردہ اٹھایا۔ سب لوگ صدر دروازے سے داخل ہوئے آدھی دہلیز میں پہنچکر انسپکٹر آبادون کی طرف مڑے ناکمبھ نے وحشت زدہ زبان سے پوچھا کتب خانہ کدھر ہے۔ دربان نے چپکے سے کہا اوپر والی منزل پر داہنے ہاتھ۔

ناکمبھ نے اقراری جنبش سر کو دی اور دبیز قالینوں سے منڈھے ہوئے زینہ پر چڑھنے لگا۔

وہ کتاب خانہ کی طرف مڑنے والا ہی تھا کہ پہلو والے کمرہ کی ذراسی کھلی ہوئی درج سے ایک سفید پوش نرس دکھائی دی۔

ناکمبھ نے دو قدم بڑھ کر پوچھا "اس کمرہ میں کون ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا راجہ صاحب فانڈا ہیں اس کی بڑی اور وحشی آنکھیں کچھ اور کھل گئیں۔ براہِ کرم اندر تشریف نہ لائیے گا گریہ تو بتائیے کہ قصہ کیا ہے۔

"قتل ہوا ہے قتل" ناکمبھ نے بےساختہ جواب دیا بڑا مالی چھری سے ہلاک کیا گیا ہے۔ میں اس کمرے کو بھی اندر سے دیکھوں گا۔

جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کمرے میں داخل ہوگیا مگر وہ دو ہی قدم اندر چل کر ٹھٹھک گیا۔ اس کی نگاہیں ایک پرانی وضع کی نفیس مسہری پر جم کر رہ گئیں۔ مریض بہت سے تکیوں کے سہارے لیٹا تھا، سر ذرا سا اٹھا ہوا تھا۔ اسکے چہرے پر جھریوں کے جال پڑے ہوئے تھے مگر اب بھی خودداری اور استقلال کی جھلک چہرے سے صاف ہویدا تھی۔ ناکمبھ نے اس مریض کو فوراً پہچان لیا یہ کروڑپتی راجہ صاحب فانڈا تھے۔

براہِ کرم میری مداخلت کو معاف فرمائیے میں سارجنٹ جاسوس ہوں ایک قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ آپ کے مالی کو کسی شخص نے چھری سے ہلاک کردیا ہے جو کالے کپڑے پہنے ہوئے تھا اسکے ہاتھ میں ایک روشن مگر بھیانک نقاب تھا۔ مجھ کو یقین واثق ہے کہ قاتل اسی خاندان کا ایک رکن ہے اور وہ اس وقت بھی یہیں کہیں موجود ہے۔

راجہ صاحب بُت بنے رہے مگر ان کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہوئی جس سے بےبسی اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا مگر ٹھیک اسی وقت نوجوان نرس ناکمبھ کے شانے پر ٹھوکے دے رہی تھی۔

جناب سارجنٹ صاحب آپ راجہ صاحب سے ایسی وحشتناک خبریں نہ بیان کیجئے۔ وہ بہت زیادہ بیمار ہیں وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو آنکھوں کے سوا جنبش نہیں دے سکتے نہ بول سکتے ہیں۔

"مجھے یہ سن کر بڑا رنج ہوا" ناکمبھ نے مسہری کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔ سیاہ آنکھوں نے زبان بےزبانی سے شکریہ ادا کیا اور پھر ناکمبھ کی آنکھوں میں گڑ گئیں گویا وہ انتہائی کوشش میں تھیں کہ وہ اپنا پیام سارجنٹ تک پہنچا دیں اس گھورنے نے ناکمبھ کو مجبور کردیا کہ وہ نرس سے پوچھے "کیا راجہ صاحب سن اور سمجھ سکتے ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں لڑکی نے فوراً کہا اور آپ کو ان کی آنکھوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آپ کی خبر نے انہیں حواس باختہ کردیا۔ مہربانی کرکے آپ چلے جائیے ورنہ ان کی حالت اور بگڑ جائے گی۔

ناکمبھ مذبذب سا ہوگیا اور مسہری کی طرف گھورتا رہا کالی آنکھیں شعلہ افشاں رہیں۔ سارجنٹ کے چھٹے حواس نے بتایا کہ مریض اپنا مفہوم کہنے کے لئے بیتاب ہے ناکمبھ نرس کی طرف بڑھا "تم کہتی ہو کہ راجہ صاحب دیکھ سکتے ہیں، سن سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں مگر بول نہیں سکتے تو پھر ان سے تبادلہ خیالات کس طرح ہوتا ہے؟"

کیوں نہیں لڑکی کی آنکھیں اور بڑی ہوگئیں ہم لوگ مریض سے سوال کرتے ہیں وہ اگر ایک مرتبہ آنکھیں جھپکا دے تو نہیں ہے اور دو مرتبہ پلکیں جھپک جائیں تو ہاں ہے۔

ناکمبھ مڑکر دو قدم اور مسہری کی طرف بڑھا۔

"کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

کالی آنکھیں دو مرتبہ جھپکیں۔

"شائد" ناکمبھ کہتا گیا "آپ نقاب پوش سایہ نما قاتل کو جانتے ہیں؟"

مریض کی آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں اور پلکیں دو مرتبہ جھپکیں۔

ناکمبھ یہ سوال کرتے وقت کانپ سا اُٹھا "آپ کو یقین ہے کہ قاتل آپ ہی کے خاندان کا ایک رکن ہے؟"

فوراً شعلہ ور سیاہ آنکھوں نے اثباتی اشارہ کیا۔ "تو پھر" ناکمبھ نے شوق آمیز لہجہ میں کہا "میں تمام ممبران خاندان کی ایک فہرست مرتب کر دوں گا اور آپ کے پاس آ کر باری باری ایک ایک کا نام پڑھتا جاؤں گا آپ کو جس پر شبہ ہو گا اس کے نام پر دو مرتبہ پلکیں جھپکا دیجئے گا۔

راجہ صاحب کی آنکھیں قبالی طور پر جھپکیں۔ یکایک نیم وا دروازے پر آہٹ ہوئی اور مارس دین داخل ہوا۔ میں نے سب کو جمع کر لیا ہے سوا میرے خسر اور ان کی نرس کے۔ سارجنٹ صاحب ادھر تشریف لائیے اور جرح قدح شروع کر دیجئے۔

ناکمبھ نے سر ہلایا اور مارس دین کے ساتھ ہو لیا۔ راستے میں اس نے کہا خوش قسمتی سے ایک سبیل نکل آئی ہے۔ راجہ صاحب میری رہنمائی کر سکیں گے۔

"ہاں" مارس دین نے کہا میں نے آپ کی باتیں سُن لی ہیں مگر سارجنٹ صاحب آپ کو یہ نکتہ کبھی بھولنا نہ چاہئے کہ امیر آدمی کی نگاہ میں اسکے خاندان کا ہر رکن مشتبہ ہوتا ہے۔

ناکمبھ نے کتب خانہ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا راجہ صاحب ایسے کم ظرف نہیں ہو سکتے۔ مارس دین نے ہنس کر اور ایک طرف سرکتے ہوئے کہا خیر آپ ان سب کی خبر لیجئے۔

(۵)

ناکمبھ نے دروازہ میں داخل ہوتے ہی ان پر ایک گہری نگاہ ڈالی دو ماماییں ہچکیاں بھر رہی تھیں اور گہری خاموشی تھی، سنگین اور روح فرسا سکوت کمرہ میں چھایا ہوا تھا۔ الماریاں اور میز کرسی بھی متین، مغموم اور لرزاں نظر آ رہی تھیں، اس نے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور دو قدم آگے بڑھا اس کی آنکھیں ایک سے دوسرے کی طرف ایسے جا رہی تھیں جیسے وہ تصویر کھینچنے کے کیمرا ہوں اور ان میں آ جانے والے تمام نقوش محفوظ ہوں۔

اس نے باری باری ہر ایک کو غور سے دیکھا سہولت اور احتیاط تھی جلد بازی نہ تھی۔ اسے احساس تھا کہ ان میں سے کوئی بھی قاتل ہو سکتا ہے اور وہ شخص یقیناً دماغی ہیجان میں مبتلا ہو گا پولیس کی ایک سرد اور دل میں اُتر جانے والی نگاہیں ضرور اس ہیجان میں اور تموّج پیدا کر دیں گی ممکن ہے کہ کسی کی آنکھوں میں بےچینی اور لبوں میں حرکت پیدا ہو جائے۔

اس مجمع کے خارجی حاشیہ پر ف صاحب خاندانی مشیر قانون لانبا قد، اکہرا جسم، چالیس کے لگ بھگ، ہاتھ پاؤں سے فولادی قوت اور صلاحیت معلوم ہو رہی تھی، بازکی سی ناک، پتلے پیوستہ ہونٹ جو دونوں باچھوں کی طرح ذرا سے جھکے ہوئے تھے اور بے رنگ تیز آنکھیں جنہوں نے ناکمبھ کی پوری نگاہ کا پورا جواب دیا۔ وکیل کی بغل میں ڈاکٹر اینل صاحب تھے، جوانی تھی اور وہ تیس کے قریب تھے چھ فٹ لمبے تھے اور اعضا میں تناسب تھا، ان کی ہر حرکت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سیکھے سکھائے پہلوان ہیں۔ ڈاکٹر اینل کی آنکھیں ناکمبھ کی نگاہوں کے سامنے ذرا بھی نہیں جھکیں مگر جیسے ہی ڈاکٹر نے اپنی آنکھیں ذرا سی جھکائیں ناکمبھ اُچھلتے اُچھلتے رُک گیا۔

ڈاکٹر کالا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور کالی واسکٹ تھی۔ پتلون بھی سیاہ گوں کپڑے کا تھا۔ مگر ناکمبھ کی آنکھیں کوٹ میں سل گئی تھیں۔ ٹھیک بیچ والے بٹن کے پاس کوٹ میں ایک ہلکی سی سلوٹ تھی۔ بجلی کی طرح ناکمبھ آنکھوں کے سامنے لان کی دھینگا مشتی سایہ نما قاتل کی لپاڈگی اور اسی سلسلہ میں چاقو کی نوک سے کوٹ کی خراش! یہ سب تصویریں پھر گئیں۔

آنکھوں میں چمک ہونٹوں میں سختی اس طور سے دوسرے کی طرف مُڑا۔ مارس دین کے قریب ایک بے رنگ عورت اسی کی ہمسن بیٹھی ہوئی تھی، مارس دین نے کہا یہ میری بیوی ہیں۔ سارجنٹ صاحب کی آنکھیں ایک لمحہ تک اس سر بہ گریباں اور جھکے ہوئے شانوں کی عورت پر جمی رہیں۔

ناکمبھ نے سر ہلایا اور اس کی نگاہیں دوبارہ مارس دین کی

طرف مڑ گئیں۔

مارس دین کی عمر قریب چالیس کے تھی۔ بلند قد، سخت اور ورزشی بدن تھا۔ دونوں پاؤں میں متوازن فاصلہ تھا، وہ ناکمبھ سے اپنی فولادی برنجی آنکھیں ملائے ہوئے تھا۔ اس کے نفیس کھڑے ہونے کے انداز نے ناکمبھ کو یاد دلا دیا کہ مارس دین کو دیھاند میں بہت مشاق تھا اور چاروں طرف شہرت تھی۔

سارجنٹ کو اس کی سخت اور بیداغ نگاہوں نے بتا دیا کہ وہ امریکن تھا اور راجہ صاحب فانڈا کی بڑی لڑکی سے پہلے وہ ایک جہاز پر جاسوس کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا جو جزائر برطانیہ کے قریب نذرِ طوفان ہو گیا تھا

حقیقت یہ ہے کہ تمام باتیں ایک لمحہ میں ناکمبھ کو یاد آ گئیں مارس دین نے ایک مرتبہ راجکمار فانڈا کو ایک بحری سفر میں تاش کے پھکیتوں کے ہاتھ سے بچا لیا تھا۔ اسی وجہ سے مارس دین کی بڑی آؤ بھگت راجہ صاحب کے یہاں ہوئی اور طرۂ کامیابی یہ تھا کہ جین فانڈا کے ساتھ شادی ہو گئی۔

ناکمبھ نے دماغی طور پر فیصلہ کر لیا کہ مارسدین کی حالت بہت نازک ہے یکایک تنخواہ دار جاسوس سے بڑی شاہزادی کا شوہر بن جانا غضب کی خوش بختی تھی۔

ناکمبھ کی نگاہوں میں اب بھی شدید فکر کی جھلک تھی۔ اس نے سمٹے سمٹائے نوکروں پر جھجھلتی سی نظر ڈالی اور پھر جارج فانڈا اور کلوداکو دیکھنے لگا۔ نوجوان مشکل سے ۳۰ کا ہو گا لڑکی دو تین برس اور کم کی تھی۔ مارس دین کی بیوی اور یہ مل کر فانڈا محل کے پورے مکین تھے اور بس۔

جارج فانڈا پتلا دبلا تھا گو یا مریض ہو۔ چہرے سے ضعف اور شیطنت برستی تھی۔ ناکمبھ کی تیز نگاہوں کے زیرِ اثر اس نے دو تین مرتبہ طرزِ نشست بدلی .... دم سکڑ سکڑ گیا۔

"یہ تو اتنا بھی نہیں کہ کسی بلی کو مار سکے" ناکمبھ نے ذہنی فیصلہ کیا اور کلوداکی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بڑی حسین تھی، اوسط سے زیادہ لمبی، اکہرے جسم کی تھی، مگر اعضا میں بلا کا تناسب تھا "جدید روشنی کی ہے اور ورزشی ہے" ناکمبھ نے طے کر لیا "جانے کون خوش نصیب منگیتر ہے" ناکمبھ حسینہ کی بیچ والی انگلی پر ہیرے کا بسنتی چھپا دیکھ کر حیران ہو گیا۔

اس نے اپنی آہستہ اور خاموش نظر بازی ختم کر کے غیر جانبدارانہ لہجہ میں کہا۔

(۶)

"میں جاسوس سارجنٹ ناکمبھ ہوں۔ تم میں سے کچھ لوگ مجھے جانتے ہوں گے مگر یہ سب کو معلوم ہے کہ فانڈا محل کا مالی ابھی ابھی چاقو سے مار ڈالا گیا ہے" اب اس نے پھر تیز نظر سے ایک ایک کو دیکھا اور وقفہ کے بعد کہنے لگا۔

"سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آدھی رات گئے شاہزادیاں اور راجکمار اور خاندانی وکیل اور ڈاکٹر پورے طور پر ملبوس یہاں کیوں جاگ رہے تھے اور کس کام سے اکٹھے تھے"۔

ف نے کہا "یہ ایک فطری سوال ہے میں خاندانی وکیل کی حیثیت سے اس کا جواب دونگا" اس کا لہجہ اسکے چہرے کی طرح خشک تھا "راجہ صاحب فانڈا بہت بیمار ہیں ان کی بیماری دنوں اور ہفتوں .... بلکہ مہینوں یا شائد سال بھر کھنچ سکتی ہے" اینسل نے معترض ہو کر کہا۔

"ہاں شائد سال بھر" مگر راجہ صاحب کو اندیشہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کس وقت دم اکھڑ جائے۔ لہذا انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کا آخری وصیت نامہ تمام ورثار کے سامنے پڑھ کر مصدق ہو جائے اور چونکہ راجہ صاحب .... .. ہیں انہوں نے آج آدھی رات کا وقت اس امر کیلئے مقرر کر دیا تھا۔ صرف یہی وجہ تھی کہ ہم سب یہاں تیار بیٹھے تھے۔

"شکریہ" ناکمبھ نے اثبات میں سر ہلا کر پوچھا "مگر جس وقت مہلوک مالی چیخ رہا تھا اور میرا پستول زناٹے سے چل رہا تھا اس وقت آپ لوگ کہاں تھے، سب اکٹھے تھے یا الگ الگ۔

جواب انفرادی طور پر ملے بعض آہستہ بعض لرزہ اور عجلت کے ساتھ معلوم نہ ہوا کہ چیخ اور پستول ماری کے وقت کوئی دو آدمی

ایک ساتھ نہ تھے۔

ناکمبھ نے کوئی تنقید نہیں کی اس کی خاموش نگاہیں ایک بار اور آئینسل کے سیاہ کوٹ کی سلوٹ پر پڑیں۔ سب کہ جھکے تو ناکمبھ نے کہا "نوکر جا سکتے ہیں اور لوگ ابھی رہیں تو بہتر ہے"۔

نوکر ایک ایک کرکے کمرے سے نکل گئے۔ سارجنٹ نے دروازہ بند کرکے قفل بند کردیا اور کنجی اپنی جیب میں ڈال لی۔ مارس دین نے تیز لہجہ میں پوچھا "سارجنٹ اس قید و بند کی کیا وجہ ہے؟"

ناکمبھ نے اطمینان سے کہا "وجہ یہ ہے کہ مجھے یقین ہے کہ اسی کمرے میں سایہ نما قاتل موجود ہے"۔

ہر ایک نے دب دب کر سانس لی۔ ڈاکٹر کا چہرہ تمتما اٹھا، مشیرِ قانونی نے اپنے پتلے ہونٹوں پر زبان پھیری، مارس دین نے زیرِلب زہر خند کیا۔ اس کی بیوی نے گویا سنا ہی نہیں۔ کلودا بت بنی ہوئی گھورتی رہ گئی۔

ناکمبھ نے غور سے ردّ عمل دیکھا اور کہا۔

"مالی کے قتل سے پہلے فرشِ سبزہ پر مجھ سے اور سایہ نما قاتل سے ایک ایک جھوڑ ہو گئی تھی۔ قاتل جو بھی ہو اسکے ہاتھ میں ایک چاقو تھا۔ اس کش مکش میں چاقو کی نوک میں نے دشمن کی طرف موڑ دی تھی اور مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ کوٹ کے دامن سے اُلجھ گئی" ناکمبھ نے وقفہ دیا آنکھیں اور چمک گئیں پھر اس نے بہت آہستہ سے کہا۔ "اینسل تمہارے کوٹ پر اک سلوٹ ہے۔ یہ کیسے آئی؟"

سب کی نگاہیں ڈاکٹر کی طرف مڑ گئیں۔ اور آہ نما سانس نکل گئیں۔ ڈاکٹر نے جھک کر اپنے کوٹ پر نگاہ کی۔ کامل سکوت چھا گیا ہر لمحہ ایک عمر معلوم ہوتا تھا۔ نوجوان جارج ...... اور بھی لرزہ نصیب ہو گیا۔ ڈاکٹر امینل نے آنکھیں اُٹھائیں چہرہ سفید تھا اور تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

"میں" (ہکلا کر) سارجنٹ کیا تم مجھ پر سایہ نما قاتل کا شبہ کر رہے ہو؟

"میں نے تو یونہی پوچھا تھا" ناکمبھ نے کہا "کہ تمہارے کوٹ میں سلوٹ کیسی ہے؟"

جوان ڈاکٹر نے بڑی ہمت سے اپنے ہیجان پر قابو حاصل کیا۔

"میں اس کی وجہ بہت آسانی سے بتا سکتا ہوں۔ میں اپنے مریض کے کمرے میں تھا اور اپنا دستی بیگ ٹھیک کر رہا تھا، سامان رکھ ہی رہا تھا کہ چیخ کی صدائیں فضا میں بلند ہوئیں۔ میرا ہاتھ کانپ گیا اور تیز آلۂ شگاف کی نوک کوٹ سے اُلجھ گئی۔ میں اس کو بالکل بھول گیا تھا اب یاد آیا ہے"۔

"اس واقعہ میں امکانی جھلک تھی اور ڈاکٹر کا لہجہ بھی مطمئن تھا ــــ مگر"

ناکمبھ نے پوچھا "کیا آپ کے دستی بیگ کا بھرنا دایہ کا کام نہ تھا؟"

ڈاکٹر کی گھگّی بندھ گئی تھی

"ہاں یقیناً" مگر اتفاق سے اس وقت نرس وہاں نہ تھی باہر چلی گئی تھی"۔

ناکمبھ ڈاکٹر کی نگاہوں کا وزن ایک طویل لمحہ تک کرتا رہا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں ذرا بھی نہ جھپکیں۔ یا تو وہ سچ بول رہا تھا یا مشاق اداکار تھا۔

ناکمبھ اب قب کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے وکیل کے پتلے ہونٹوں پر اک مشکوک تبسم کھیلتا ہوا پایا۔

"آخر کیا بات ہے" ناکمبھ نے پوچھا۔

"شاید کوئی بڑی بات نہیں" وکیل نے خشک لہجہ میں جواب دیا اور بڑی پر زور دیکر کہا "مگر آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کوٹ کی سلوٹ کی طرف ہماری توجہ مبذول کردی ہے۔ اب مجھے بھی یاد پڑتا ہے کہ چیخ اور شور کے وقت جو لوگ گھر سے نکلے ہیں ان سب میں آخری نکلنے والا تھا یا شاید آخری سے پہلا، میں جیسے ہی صدر دروازے پر پہنچا میں نے مُڑ کر دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے سے آ رہے ہیں شائد وہ راہ راجہ صاحب کے کمرے سے راہِ مستقیم نہیں ہے۔

ڈاکٹر امینل نے مشیرِ قانونی کو گھور کر دیکھا "کیا کہا؟ اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو سن لو کہ میں تو اسکے بعد پہلے شاگرد خانہ کی طرف گیا تھا میرا خیال تھا کہ یہ آواز بھی وہیں سے بلند ہوئی ہے۔

بے شک مشیر قانونی نے طعن اور شبہے سے ملے ہوئے لہجہ میں کہا۔

ڈاکٹر امینل کی مٹھیاں بندھ گئیں اور ناکمبھ کو شبہ ہوا وہ وکیل پر حملہ کر دیگا غالباً ف کے دل میں بھی یہی اندیشہ گزرا تھا وہ دو قدم پیچھے سرک گیا اور اس کی تنگ آنکھوں سے نفرت کے شیطانی شعلے نکل رہے تھے۔ اسی ایک سنگین لمحہ میں ناکمبھ کو معلوم ہو گیا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی نفسیاتی طور پر کسی آدمی کو قتل کر دینے پر قادر ہے۔ سارجنٹ نے یہ بھی دیکھا کہ مارسدین آگے جھکا ہوا اس نظارہ سے لطف اُٹھا رہا تھا اور اس کی آنکھیں اس ہوش ربا نظارہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر امینل نے مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا اور وہ سارجنٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

"غالباً کوٹ کی سلوٹ اور ف کے اشارات کی بنا پر میں شدید طور پر مشتبہ ہو گیا ہوں۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ مجھے گھر سے جانے کی اجازت نہیں؟"

اس گھر کا ہر شخص کم و بیش مشتبہ ہے ناکمبھ نے حاضر جوابی سے کہا مگر جہاں تک میرا تعلق ہے کسی کی راہ میں حائل نہیں ہوں جس کا جہاں جی چاہے چلا جائے مگر کیا جانے سے پہلے تم میں سے کوئی شخص ایسی کوئی بات نہ بتائے گا جس سے قاتل کا سراغ لگ سکے۔ ٹیلیفون پر اس کی آواز کافی بدلی ہوئی تھی اس لئے میں اسے پہچان نہیں سکتا چونکہ تم میں سے کوئی دو آدمی ایک جگہ نہیں تھے اس لئے صرف قاتل ہی بتا سکتا ہے کہ کتب خانہ سے کس نے فون کیا تھا۔ برائے کرم خوب سوچ کر بتاؤ۔ ممکن ہے کہ کوئی معمولی سی بات سراغ کیلئے کافی ہو سکے۔

آہستہ مگر سروں کی منفی جنبش نے اس بات کا جواب دیا۔

مگر یہ تو تم کو ضرور ہی معلوم ہوگا آخر قاتل کی غرض کیا ہے اور یاد رکھو قاتل نے مجھ سے فون میں کہا تھا کہ صرف ایک ہی نہیں متعدد قتل ہوں گے۔ ممکن ہے کہ تم ...... پانچ میں سے بعض قتل کئے جائیں اس لئے بھی ضروری ہے کہ تم پولیس کی مدد کرو ذاتی رنجشوں کو بالائے طاق رکھ کر اس سنگدل قاتل کے پتہ لگانے میں پوری امداد دینا چاہیئے۔

"بڑی عمدہ درخواست ہے" ف نے جواب دیا غرض تو صاف ظاہر ہے یعنی فانڈاراج کی لاکھوں کی دولت مگر غریب ٹالی کے قتل کرنے کی غرض مجھے قطعاً معلوم نہیں ہوتی۔

مگر صرف ایک وجہ جو قاتل نے مجھے فون پر بتلائی تھی ناکمبھ نے جواب دیا مگر دوسرا شکار فانڈا محل کے مکینوں میں عظیم الشان ہستی ہوگی۔

پھر ایک لمحہ کے لئے سنگین سکوت ہو گیا۔ امینل نے کہا ہمارے قیام کا اب کوئی حاصل نہیں ہے اگر آپ براہ کرم قفل کھولدیں۔"

ناکمبھ نے جاتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا "اگر مجھے ضرورت پڑی تو آپ کہاں ملیں گے"

ڈاکٹر نے گھڑی دیکھتے ہوئے لبوں کو سکوڑ کر کہا "رات زیادہ بھیگ چکی ہے۔ مگر سویرا ہے۔ خدانخواستہ راجا صاحب کی طبیعت اس امتحان سے بگڑ گئی تو مجھے فوراً بلایا جا سکتا ہے میں بقیہ رات اپنے مطب میں گزاروں گا۔

ناکمبھ نے اوروں سے کہہ دیا کہ وہ بھی جا سکتے ہیں اور خود ڈاکٹر کے ساتھ دہلیز تک آیا۔ انسپکٹر آباد دور کھڑے تھے انہوں نے سارجنٹ کو اشارے سے بلا لیا اور سرگوشیوں میں پوچھا "کچھ پتہ لگا؟"

ناکمبھ نے منفی طور پر سر ہلایا "کچھ نہیں مبہم شبہات البتہ پیدا ہو گئے ہیں۔ آپ کو کچھ سراغ ملا؟"

انسپکٹر نے بڑبڑا کر کہا "کوئی خاص بات نہیں روزمرہ والی کارروائی ہو گئی۔ لاش کو اس کمرۂ خواب میں منتقل کر لیا ہے اور مشین صاحب "نشانات" کا تجربہ فرما رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمام مکینوں کی علامتیں حاصل کر لیں مشین کے ساتھ کولمبن بھی آئے ہیں۔ چار آدمی زریں نقاب کی تلاش میں محل کا گوشہ گوشہ چھان رہے ہیں۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہارے مبہم شبہات کیا ہیں۔

ناکمبھ نے کہا آپ نے نقاب کے تذکرے سے وہ شبہ اور بڑھا دیا ہے اب میں ڈاکٹر امینل کے تعاقب میں جا رہا ہوں۔ شاید

شاید نقاب زریں کا کچھ پتہ چل جائے۔"

انسپکٹر - کیوں - کس واسطے - ؟؟

نائکہ نے معترض ہو کر کہا "آپ کو یاد ہوگا جب میں سائیں ساقی قاتل سے اُلجھا ہوا تھا تو چاقو کی نوک اس کے کوٹ میں در آئی تھی - ڈاکٹر کے کوٹ میں اسی جگہ ایک سلوٹ پڑی ہوئی ہے۔"

"خدا کی پناہ" انسپکٹر نے کہا "تم تو ڈاکٹر سے پوچھا ضرور ہوگا"۔

نائکہ نے ڈاکٹر کا جواب دُہرا دیا۔

"قابل فہم ہے بلکہ قابل تسلیم ــــ مگر" انسپکٹر نے کہا

نائکہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نقاب زریں کو بھول سا گیا تھا - غالباً وہ کرنٹ اور باریک تاروں سے بنا ہوا ہے جو آسانی سے توڑ مروڑ کر کسی دستی بیگ میں رکھا جا سکتا ہے۔

انسپکٹر نے سانس لیتے ہوئے کہا "جیسا کہ ڈاکٹر کا دستی بیگ ہے"۔

وہ ایسا بیگ جیسا ڈاکٹر ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے چلا گیا ہے - سارجنٹ نے یہ کہا اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا - انسپکٹر صاحب ان دیکھی نگاہوں سے گھورتے رہ گئے۔

(باقی آئندہ)

آزادی

حمیدہ سلطان احمد

ایک برفانی صبح تھی، گو دن کے دس بج چکے تھے لیکن آسمان پر گہرا ابر چھایا ہوا تھا۔ ٹھٹھرا دینے والی سرد ہوائیں ابھی تک چل رہی تھیں - سردی سے اعضا اکڑے جا رہے تھے۔ اس لئے میں نے کرسی آتشدان کے قریب کھینچ لی - اور خیالوں میں کھو گئی - ساون کی رم جھم گھرے بادلوں کی موجودگی اور خاصکر جاڑوں میں تنہائی میں تیز آگ کا جلنا تخیّل کو تیز اور واہمہ آفریں کر ہی دیتا ہے - میرا دماغ مکمل، نامکمل، خیف قوی، اور طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا آتشدان میں نہ جانے کیا شاعری ہے کہ انسانی دماغ میں تخیلات کا ایک اتھاہ سمندر موجزن ہو جاتا ہے - اسی کاروان تخیل میں یکایک میرے دماغ میں ایک خیال اس طرح آکر رُکا جیسے سڑک سے کٹ کر کوئی رہ گیر کھڑا ہو جائے - اور اس خیال نے دوسرے خیالوں کی ساری بھیڑ چھانٹ دی۔

اسی حلقۂ خیال میں گزری ہوئی شام تھی، ایک سیاسی کارکن تھے، میں تھی اور آزادی کے مسئلے پر ایک گرما گرم بحث۔

"میں آپ سے کہتا ہوں کہ سیاسی رہنماؤں کا اچھوتوں کیساتھ میل جول صدیوں کی دوری کو ختم کر سکتا ہے، سماج کی بندشیں رفتہ رفتہ کمزور ہو کر بالکل ڈھیلی پڑ جائیں گی - خاص طبقوں کے خاص افراد کا اچھوتوں کے قریب ہونا اس بات کی ترغیب ہوگا کہ دوسرے خاص اور چھوت چھات کرنے والے اپنی فطرت کو نرم کریں۔"

"یہ ایک حد تک درست ہو سکتا ہے لیکن جب تک آپ سسٹم تبدیل نہ کریں اس وقت تک یہ تبدیلی کیونکر ہو سکتی ہے - !؟

سرمایہ دارانہ نظام میں جو امیرانہ تمدن چل رہا ہے، اس تمدن نے امیر و غریب چھوٹے اور بڑے بھوکوں اور پیٹ بھروں کے درمیان جو شدید تقسیم کی ہے جو گھناؤنی حالت پیدا کر دی ہے محض جادو کی چھڑی

سے تو آپ اسے نہیں بدل سکتے۔

اس نظام کا ہلا دینا آسان کام نہیں، بچپن ہی سے اونچ نیچ کا فرق، ذات پات کی بندش اور اس مایوسانہ زنجیروں میں مذہبی تخیل سے پُر ذریب آسرا دماغوں کو ایک ماحول کے اثرات سے رچا دیتا ہے۔

ایک بچے کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی دھرم اور ریتی رواج کا پورا پورا احساس کرا دیا جاتا ہے اور "قسمت" و بھاگ کے ہمت شکن بندھنوں کے اندر وہ پروان چڑھتا ہے، آنکھ جو کھلتی ہے تو انسانیت ماحول کے مطابق بھنگی ہوتی ہے یا چمار، مالی ہوتی ہے یا کسان، مزدور ہوتی ہے یا اور کوئی!؟

اقتصادی لوٹ کھسوٹ نے طبقاتی تقسیم کی ہے اور طبقاتی تقسیم نے انسانی ترقی کو صدیوں سے روک دیا ہے۔

جب تک آپ سماجی آزادی ملک میں پیدا نہ کریں اُس وقت تک ملکی آزادی کیونکر آسکتی ہے۔!؟

"آپ ایک زاویۂ نگاہ سے بحث کر رہی ہیں!؟"

"دو زاویۂ نگاہ سے تو بحث آپ ہی کر سکتے ہیں۔"

میرا مطلب یہ ہے کہ ——

آپ کا مطلب کیا ہے —— یعنی جو دلائل میں نے پیش کئے وہ لچر ہیں۔ کیا یہ غلط ہے کہ جب تک سسٹم تبدیل نہ ہوگا آپ ملک میں آزادی، امن اور مسرت پیدا نہیں کر سکتے۔ فرض کیجیے کہ ایک ایسی جمہوریت قایم کرنے میں آپ کامیاب ہو گئے جو یہاں کے سرمایہ دار اور راجاؤں اور نوابوں کے طبقہ پر مشتمل ہوئی تو آپ جملہ ۴۳ کروڑ ہندوستانیوں کو کیونکر ایک سطح پر لا سکیں گے!؟

"مگر ہوگا یہی کہ پہلے ہندوستان کو سرمایہ داری کی تکمیل کرنی ہوگی۔ پھر امپیریلزم کی۔ اس کے بعد صحیح جمہوریت ملک میں پیدا ہوگی —— !؟

"تو پھر آپ یوں کہیئے کہ آپ سرمایہ داری کے نمایندے ہیں اور ساری قومی جد و جہد آپ کے بیان کے مطابق اس وقت آزادی کے لئے نہیں امپیریلزم کے لئے ہے —— !؟

"جی نہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ نظام کے طور پر ہر ملک کو ان مدارج سے گزرنا پڑتا ہی ہے۔ مثلاً۔"

"مثالوں سے مجھے چڑ ہے، میں خود بھی کوئی مثال نہیں دوں گی ایک طرف آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے طبقۂ بالادست سے حکومت چھین کر ہندوستانی طبقۂ بالادست کے ہاتھوں میں دینا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف کسانوں، مزدوروں اور اچھوتوں کی ترقی اور فلاح چاہتے ہیں۔ اچھوتوں کو شرفا کی برابری کرنے میں زمین و آسمان ایک کئے دے رہے ہیں۔ مذہب کو ڈھکوسلا بتا رہے ہیں اور ہندوستانی سماج ہے کہ اس کی مشینری کی ایک کل سیدھی نہیں، غلامی اور فرسودگی کا ایک سست رفتار چرخہ، ڈوریاں ہزار اور چکر گھنٹوں میں دو تین۔!!

رسم و رواج کے وہ بندھن کہ خدا کی پناہ، شادی جیسے اہم مسئلہ پر کسی کو غور و فیصلہ کا حق نہیں، یہاں شاید ہی کوئی شخص حسب مرضی شادی کر سکتا ہو، بیچاری عورتیں سو اُن کو تو بولنے کا بھی حق نہیں۔ الکالب کھولنا عظیم گناہ ہے۔ رہے مرد، سو اُن کو بھی کیوں دوش دوں!؟ وہ بھی ذات پات کی بندشوں، طبقاتی اور خاندانی بڑائی اور پستی، اور سب سے زیادہ اقتصادی حیثیت کی کمی و بیشی، خوش حالی و بدحالی کی وجہ سے اپنی مرضی کے مطابق شادیاں کرنے میں برائے نام ہی کامیاب ہیں۔ سماج میں انسان اور انسانیت کی کوئی حیثیت نہیں، اس کی خوشنودی کے لئے سرمایہ دار ہونا ضروری ہے۔ حیوان نما انسان کی پشت پر اگر سونا کھنک رہا ہے تو بلا تامل اس کو سر آنکھوں پر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ غریب جو سرمایہ دار نہیں، مگر اخلاقی خوبیوں کی دولت رکھتا ہے، بلند فطرت انسان ہے، اگر اقتصادی لحاظ سے سوسائٹی میں نمایاں حیثیت نہیں رکھتا تو پھر وہ دیوتا ہی کیوں نہ ہو مُنہ لگانے کے بھی قابل نہیں۔ سماج کے نزدیک سب سے بڑا نقص غربت ہے، اور سچ ہے غربت ہی سب سے بڑا نقص ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نظامِ تمدّن کے ہوتے ہوئے ہندوستان آزاد ہونے کی خواہش کیسے کر سکتا ہے؟ قدم قدم پر فرسودہ معاشرت، نفس نفس میں رسم و رواج کی زنجیریں، یہ بندھن اتنا سخت ہے کہ باوجود مغربی نقالی کے وہ آزادی جو انسان کو انسان کہلانے کا مستحق بنا دیتی ہے ہندوستان کو آزاد ہو کر بھی حاصل نہیں ہوگی۔

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۴ء

ہمارے دل و دماغ پر غلامی کی مہریں لگی ہوئی ہیں ہم چاہیں بھی تو اپنے ماحول سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ ان زنجیروں کو جو ہم کو جکڑے ہوئے ہیں ڈھیلا کرنے کی کوشش ہم کو قابل نفرت بنا دیتی ہے۔ اچھوت سدھار اور سب کو ایک نظر دیکھنے کا خیال خام ہے۔

تمام ہندوستان ذات پات، اونچ نیچ کی لعنت میں گرفتار ہے۔ ذہنیتیں بالکل تباہ ہو چکی ہیں۔ آزادی کا درخت بالکل کھوکھلا ہے اس کی جڑ میں دیمک لگی ہوئی ہے۔

اوپری باتوں سے فائدہ نہیں آپ لوگ اصل مرض کا علاج نہیں کرتے۔

جس ملک میں ذرا ذرا سی انسانی کمزوریوں کو معاف نہیں کیا جاتا ہو۔ جہاں شادی کو بھی تجارت سمجھکر جہیز و مہر کا سودا چکایا جاتا ہو۔ جس ملک میں نوجوان دلوں کو مرضی کے خلاف کچل کر رکھ دیا جاتا ہو، اور جہاں بچپن سے ہی جذبات کی کلیوں کو مرجھا کے رکھدیا جائے وہ خاک ترقی کرے گا۔ حقایق پر تخیل کے رنگین نقاب ڈالنے سے کیا حاصل ہے ؟

"میں سمجھا آپ ملکی آزادی سے پہلے سماجی آزادی کی تکمیل چاہتی ہیں۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے"۔

ان کے لبوں پر پھیکی سی ہنسی آئی۔ "آپ بہت متاثر معلوم ہوتی ہیں"۔

جی نہیں متاثر نہیں، از سر تا پا سلگ رہی ہوں۔

"مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے"۔

جائیے بھی۔

بہت اچھا، میں رخصت ہوتا ہوں، پھر تبادلہ خیال ہوگا۔

یہ کہا اور چلے گئے۔

میرے حلقہ خیال میں سورج کی ایک کرن نے داخل ہو کر اس کو تار عنکبوت کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ میں نے ایک لمبا سانس کھینچا اور دریچہ کھول دیا۔

(۲)

آسمان کی سنہری کرنوں نے کمرے کو منور کر دیا۔ ساتھ ہی میرے کانوں میں زیدی کی آواز آئی۔ یہ میری چھوٹی شریر بھانجی ہے چار سالہ ننھی فریب کار اس کا پورا نام تو زاہدہ ہے لیکن میں اس کو پیار سے زیدی ہی کہتی ہوں۔ مجھے اس کی معصوم شرارت بہت عزیز ہے میں نے دریچے سے باہر جھانکا۔ زیدی سُرخ گرم فراک اور گرم کوٹ پہنے ہوئے گیندے کے پھولوں کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے بال ہوا سے بکھر گئے تھے۔ چہرے پر شوخی و خوشی کا نور تھا۔ وہ تتلی پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر مہترانی کا چھ سالہ بچہ منو شوق کی نظروں سے تتلی کو گھور رہا تھا۔ شاید اس کے ننھے دل میں بھی اس غبار رنگیں کو پکڑنے کا شوق تھا۔ لیکن غریب کو شروع سے اپنی تمناؤں کو دل میں دفن کر دینے کا سبق دیا گیا تھا اس لئے دور ہی سے بولا "بے بی اس طرح نہیں یوں تو وہ اُڑ جائے گی دھیرے دھیرے اس کے پاس جاؤ"۔ منو کی آواز سے طفلانہ شوق ٹپک رہا تھا۔

زیدی منو کی ہدایت پر عمل کرنے کے لئے رُک گئی۔ اور تُتلا کر کہا میلے پاچ (میرے پاس) آکر بتا منو تتلی کیونکر پکلوں (پکڑوں)

منو قریب آگیا۔ زیدی کے بُلانے سے خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھلی پڑتی تھیں۔ گویا قارون کا خزانہ مل گیا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی۔ اللہ رے فرق۔ دونوں بچے تھے معصوم لڑکپن دونوں ہی کا تھا لیکن ایک صاف ستھری قوم کے لحاظ سے آرام دہ لباس میں ملبوس۔ بچپن کی تازگی کا نور رخساروں میں لئے ہوئے ہنسی کی بولتی چالتی گڑیا۔ دوسرا غریب اس قیامت کی سردی میں کثیف پھٹا ہوا کرتا اور نہایت پرانا سوئٹر پہنے ہوئے ٹانگوں سے ننگا۔ میلا کچیلا، دُبلا پتلا، فاقے زدہ، سہما ہوا۔

باوجود منو اور زیدی کی کوشش کے تتلی اُڑ گئی، ان کے ہاتھ نہ آئی۔ تلافیٔ شکست کے طور پر زیدی نے پھول توڑنے شروع کر دئے اور ایک پھول منو کو دیکر بولی لے تو اپنے گھر میں لگائیو۔

میں ہنس پڑی اور ہنسی کی آواز سے چونک کر زیدی نے مجھ کو دیکھا کچھ دیر تو وہ سہمی کھڑی رہی لیکن پھر بھاگ گئی گویا اُسکو خوف تھا کہ میں اس غریب بچے کے ساتھ کھیلنے سے اُس پر ناراض ہونگی۔

ادھر منّو نے ہاتھ جوڑ کر التجا آمیز لہجہ میں کہا "بیگم جی پھول میں نے نہیں لیا ہے بی بی نے دیا ہے۔ میں نے مُسکرا کر کہا۔ ڈر نہیں منّو! اور پھول لے گا۔

منّو ابھی جواب نہ دینے پایا تھا کہ اُس کی بڑی بہن بالو نے آکر اُس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا اور چیخ کر بولی کیوں رے تو یہاں کھیل رہا ہے۔ میں نے کہا تھا کیاری صاف کر دے۔ کام کرتے تو موت آتی ہے۔ بے چارا منّو تھپڑ کھا کر روتا ہوا گیندے کے پھول کو سینے سے لگائے کیاری کی طرف چلا گیا۔

میں نے بالو سے کہا اری تو بڑی ظالم ہے کیوں مارا بیچارے کو بچّہ ہی تو ہے !؟ کھیلنے دیا ہوتا۔

بالو سرد آہ بھر کر بولی۔ بیگم جی یہ سب امیروں کی باتیں ہیں ہم غریبوں کے لئے بچپن، جوانی، بڑھاپا سب ایک ہے۔ آنکھ کھولتے ہی ہم کام کرتے ہیں اور آنکھ بند کرنے تک کام ہی کرتے رہیں گے کمبخت نکما ہے۔ معلوم ہے ماں گھر میں بخار میں پڑی بُھن رہی ہے جلدی سے کام ختم ہو جائے تو جا کر اس کی خبر لوں، یہ کہتی ہوئی وہ چلدی۔ اور میرے مُنہ سے نکلا اُف سماج کا ظلم۔ کیا منّو بچہ نہیں اس کو کھیلنے کا حق نہیں۔ اُس کی ضد کرنے کی عمر نہیں۔ زیدی کے خلاف مزاج اگر کوئی بات ہو جائے تو گھنٹوں روتی اور پٹخیاں کھاتی ہے۔ یہ غریب بچّہ تھپڑ کھا کر بھی کام کرنے کے لئے مجبور ہے اُس کو اس کا احساس ہے تاکہ وہ غریب اور اچھوت بچّہ ہے۔ لیکن آزاد منّو ہے نہ زیدی۔

ایک ذلت و فلاکت کے بندھن میں ہے دوسری جاہ و تمکنت ثروت و حشمت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسی طرح امیروں کی دُنیا الگ ہے غریبوں کی الگ۔

سُکھ کسی کو بھی نہیں۔ دکھ ہی دکھ ہر جانب بکھرا پڑا ہے کیا یہی آزادی ہے؟

حمیدہ سلطان احمد

مجبوری

"تو آپ معاف نہ کر دیں گے بابو جی، میں ایشور کی قسم کھا کر کہتی ہوں اب کبھی دیر نہ کروں گی۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں، چھما کیجئے دیا کیجئے بابو جی۔ رکھیا پر ترس کھائیے۔" یہ چند الفاظ رکھیا کی تھرتھراتی ہوئی زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے اور وہ پھر زناٹے کی ایک بیت کھاتے ہی تلملا کر زمین پر گر پڑی، چند موتی کے دانے اسکے تمتمائے ہوئے سُرخ گالوں پر ڈھلک گئے، مگر ان موتی کے دانوں کی قیمت بابو جی کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی !————

رکھیا ایک بوڑھے ملاح کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں دُنیا سے اُٹھ چکی تھی۔ بوڑھا باپ تھا۔ کمسن بھائی زندہ تھا———" بوڑھا مانجھی اپنی روٹی حاصل کرنے کے لئے روزانہ اپنا پُرانا دقیانوسی جال کاندھے پر رکھ کر پو پھٹنے سے پہلے ہی گھاٹ پر چلا جاتا تھا اور جو مچھلی پھنستی اس کو بیچ کر زندگی بسر کرتا تھا۔ اور جو کئی کئی دن مچھلی نہ پھنستی تو یہ تینوں تین تین دن بھوکے ہی رہتے———— آج تین دن سے بوڑھا مانجھی بیمار پڑا ہوا ہے، اس کی کٹیا میں ایک دانہ تک نہیں ہے، اس کا تنہا بچہ "سوشیل" بھوک کے مارے تڑپ رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رکھیا کی انتڑیوں میں سوس ہو رہی ہے لیکن تینوں اپنی کٹیا میں پڑے ہیں جیٹھ کا مہینہ ہے۔ چلچلاتی دھوپ پڑ رہی ہے۔ دُور دُور انسان تو انسان حیوان تک۔ ۔ کا نشان نہیں ہے، ہر طرف سناٹا ہے۔ کبھی کبھی صرف ایک بچے کی آواز "دی دی بھوک لگی ہے، کھا ٹیلا دینے" اس خاموشی کو چیرتی ہوئی اس سُنسانی اور ویرانی کی تصویر میں درد کا رنگ بھر دیتی ہے———— رُکھیا پلٹ پلٹ کر اپنے اس بلبلاتے ہوئے ننھے بھائی کو دیکھتی اور ایک آہ بھر کر رہ جاتی ہے !————

اس نے کہا "گھبراؤ نہ سوشیل کل میں گاؤں والے بڑے بابو جی کے یہاں جاؤں گی———— اُن سے کہوں گی———— وہ ضرور ہم لوگوں کی سہایتا کریں گے"————

سوشیل روتے روتے سو گیا، لیکن رکھیا کو نیند نہ آئی، اس نے رات آنکھوں میں کاٹ دی اور بھور ہوتے ہی سب کو سوتا چھوڑ کر بڑے بابو جی کے یہاں پہنچی———— بڑے بابو نے غور سے دیکھا پھر پوچھا "تو کون ہے کیا چاہتی ہے؟" رکھیا نے اپنی ساری بپتا سُنائی لیکن بڑے بابو جی کی کڑکتی ہوئی بجلی کی طرح آواز نے فوراً اسے خاموش کر دیا، بڑے بابو نے کہا———— مدد مانگنے آئی ہے، جیسے ہاتھ پیر میں گھن لگ گیا ہے———— تو جوان ہے———— جا کام کر، پیسے ملیں گے۔" رکھیا دل برداشتہ ہو گئی، اسکی ساری امیدیں فنا ہو گئیں، اس نے ڈرتے ڈرتے بابو جی سے پوچھا "کونسا کام کروں بابو جی؟" بابو جی نے پھر چلاتے ہوئے کہا "کیا تو اندھی ہے۔ دیکھتی نہیں کہ ہمارا مکان بن رہا ہے جا اینٹ ڈھو۔"

رکھیا نڈھال ہو گئی لیکن پھر اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا، اُس نے ٹھان لیا کہ جو کچھ بھی ہو اور جیسے بھی ہو، آج یہ اپنے بھائی کو ضرور کھلائیگی۔ اینٹ اٹھاتے اٹھاتے آدھے ہی دن میں اس کے ہاتھوں میں پھپھولے پڑ گئے۔ اس نے آج تک اتنی سخت اور کٹھن محنت کبھی نہ کی تھی۔ یہ تو صرف گھر کی پاسبانی کیا کرتی تھی———— وہی اپنی چھوٹی سی کٹیا کی !!———— دوپہر کے وقت کھانے کی چھٹی ہوئی،

رکھیا بابوجی کے کمرے کے دروازہ کے پاس آکر ٹھٹھک گئی، بابوجی نے دیکھا اور تاؤ میں چار پیسے نکال کر پھینک دیئے ـــــ سوکھے ہوئے دھان میں پانی پڑا ـــــ رکھیا بہت خوش تھی۔ اس نے گویا چار اشرفی پالی تھیں ـــــ اس نے بابوجی سے التجا کی " بابوجی! کل سے میں شام تک کام کرونگی، مجھے کام دو گے نا؟ ـــــ

بابوجی نے کہا "اچھا کل سویرے ہی آنا" ـــــ

رکھیا نے ساڑھے تین پیسے کے ستو اور ایک ادھیلے کا نمک لیا۔ اور مارے خوشی کے گرتے پڑتے اپنی کٹیا پر آئی، دیکھا کہ سوشیل بابو کے پاس ٹھنک رہا ہے اور کہہ رہا ہے " بابو کھائیلا دو نا" رکھیا نے فرط مسرت سے چلایا۔ لے سوشیل میں کھانا لائی ہوں، پھر اس نے کہا بابوجی! اٹھو نا تم بھی کھالو، لیکن آہ! بڈھا مانجھی نیا منجدھار میں چھوڑ کر ابدی نیند سو رہا تھا، وہ کاہے کو کسی کے جگائے اٹھ سکتا تھا ـــــ؟

رکھیا نے بوڑھے باپ کو جھنجوڑا لیکن بابو کا بدن برف کی طرح بالکل سرد تھا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ سنبھلی مگر یہ نہ سمجھ سکی کہ کیا کرے؟ ـــــ

گاؤں والوں نے لاش کو پاس کی ندی پر لیجا کر پھونک دیا ـــــ

رکھیا پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اب اس دنیا میں سوائے سوشیل کے اس کا کوئی اپنا نہ تھا۔

شام ہوئی، سوشیل نے پوچھا "دی دی بابو کہاں ہے"؟ رکھیا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ لیکن جی کڑا کیا اور بولی " تو سو جا نا سوشیل! بابو گھاٹ گئے ہوں گے اب آتے ہی ہوں گے"۔ ـــــ جب کبھی سوشیل بابو کو کھوجتا رکھیا اس کو باتوں میں پھسلا لیتی تھی۔ لیکن جب اس کا دل بابو کو ڈھونڈتا تو کوئی بھی بہلانے والا نہ تھا ـــــ صبح ہوتے ہی رکھیا گاؤں والے بڑے بابو کے یہاں گئی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا " بابوجی! میرے پتا سورگ باش ہو گئے ہیں اس لئے میں آج کام نہ کروں گی"۔

دوسرے دن رکھیا کام پر گئی۔ شام کو بڑے بابو نے اس کو دو آنے پیسے دئے ـــــ دن بھر کی مزدوری صرف دو آنہ!! ـــــ

اس نے ان پیسوں کو مٹھی میں دبایا اور بنئے کے یہاں پہنچی، چاول اور دال خریدی ـــــ رات کے وقت دونوں بھائی بہن بھوکے ہی سو رہے۔ صبح کو آدھے چاولوں کی کھچڑی پکائی اور دونوں نے مل کر کھالی۔ رکھیا کی گزر بسر اسی طرح ہونے لگی ـــــ

سوشیل دن بھر مارا مارا پھرنے سے بیمار ہو گیا۔ رکھیا اسے بہت پیار کرتی تھی وہ بھی اسکی جان نہ چھوڑتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے ساتھ اسے کام پر بھی لیجاتی تھی۔ گارے میں وہ دن بھر کیچڑ اور پانی میں کھیلتا پھرتا تھا ـــــ

آج وہ اسے کام پر نہ لے گئی۔ گھر میں سویا ہوا چھوڑ کر چلی آئی کھانے کی فرصت پاتے ہی گھر آئی۔ دیکھا کہ سوشیل باہر سے آرہا ہے اس نے اس سے دریافت کیا تو سوشیل نے کہا کہ میں تو تجھے ہی ڈھونڈنے گیا تھا، ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلدیں کہیں کی!؟ ـــــ

رکھیا نے اسے سمجھایا " بخار آرہا ہے چپ چاپ سو جا مگر وہ ضد کرتا رہا کہ نہیں ہم بھی ساتھ چلیں گے ـــــ آخر رکھیا نے پھسلا کر اسے سلا دیا۔ اور جلد جلد قدم اٹھائے بابوجی کے یہاں آئی، بڑے بابو کے منجھلے لڑکے بابو سکھدیو لال مزدوروں کی حاضری لے چکے تھے ـــــ آج رکھیا کو دیر ہو گئی تھی ـــــ اس نے بابو سکھدیو لال کو دیکھا، اس کی نگاہیں طالب رحم تھیں ـــــ سکھدیو نے اس نئی مزدورن کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ـــــ رکھیا کی بڑی بڑی متوالی آنکھیں اور سڈول چہرہ، کامنی جیسا بدن ـــــ

رکھیا بڑے بابو کے پاس اپنی حاضری بنوانے کے لئے پہنچی ـــــ بڑے بابو نے دیکھتے ہی دھتکار دیا اور کہا "حرامزادی! مفت کا پیسہ ہے نا!؟ ـــــ جا دور ہو جا ـــــ میرے یہاں تیرا کام نہیں ہے"۔ رکھیا نے منتیں کیں، ہاتھ جوڑے، لیکن بڑے بابو نے معاف کرنے کے بدلے ہزار سنائیں۔

رکھیا نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ " بابوجی رحم کرو!! ـــــ میرا بھائی مر رہا ہے۔ بخار میں پھنکا ہو رہا ہے۔ چھما کیجئے بابوجی! کیسے بچے گا اگر آپ کام نہ دوگے تو؟ ـــــ؟

رکھیا بابوجی کی دھتکاری ہوئی ـــــ نڈھال ـــــ

نراش ــــ چلی جارہی تھی ــــ
سکھدیو سنگھ دوسری طرف سے آیا ــــ اس نے رکھیا کو دیکھا ــــ اس کی باچھیں کھل گئیں ــــ "کیا ہے ری! تو کہاں جارہی ہے؟" سکھدیو نے پوچھا ــــ رکھیا نے آنکھیں اٹھائیں اور سہم گئی ــــ شاید اسے چلنے کی بھی اجازت نہیں ہے ــــ اس نے پھر ایک نظر سکھدیو کو دیکھا ــــ اس کی آنکھیں رحم کی خواستگار تھیں ــــ سکھدیو کھڑا ہو گیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا" دیکھ ری! میں سب جانت ہوں، تیکے بابوجی مارن ہیں، بابوجی بڑے ویسے ہیں، تو پھکر مت کر" ــــ رکھیا چیخ اٹھی، آہ! میرا بھائی! بابوجی آپ بڑے بھلے آدمی ہیں!!
آپ کی بڑی کرپا ہو گی بابوجی ــــ میرا بھائی مرجائیگا سکھدیو بابو!!
سکھدیو بابو نے جواب دیا" نہیں اب وہ نہیں مر سکتا آؤ"........... "نہیں سکھدیو بابو! چھما کرو .... مگر میرا سوشیل! چلو سکھدیو بابو............"
رکھیا اب خوش تھی ــــ اس کا بھائی سوشیل بھی اچھا ہو گیا تھا!!

عبدالرّشید عرفان

صدائے آتشیں

آہ مری ہے دلگداز، نالہ مرا ہے دلنشیں
عشق میں پھر بھی کامیاب میرا کوئی نفس نہیں

پرسشِ دل کا شکریہ دل کو نہیں سکوں ہنوز
ٹیس سی ہے کبھی کبھی، درد سا ہے کہیں کہیں

جب کبھی درد بڑھ گیا، بن گئے خود ہی چارہ گر
اپنے سکون کے لیے حسن کو زحمتیں نہ دیں

حدِ تعیّنات تک، حدِ تصوّرات تک
میری نگاہ میں تمہیں، میرے خیال میں تمہیں

ہوں میں بقیدِ گلستاں، اپنی ہی آگ میں تپاں
بن گئی برقِ آشیاں میری صدائے آتشیں

تیرا ہی دَور آج ہے، تیرا دلوں پہ راج ہے
جلوۂ خواب تاج ہے تیرا خیالِ مرمریں

تاج زبیری

ــــ ایشیا، دسمبر ۱۹۴۰ء

"ہم" اور "وہ"

(خواجہ محمد شفیع دہلوی)

(مسلسل)

اس لاجواب تنقیدی سلسلے کو جس میں ماضی اور حال کا موازنہ شخصیت اور اجتماعیت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کے احساس کا مقابلہ پرانے اور نئے لوگوں کی زندگی اور چال چلن پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ملک میں بےحد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایشیا کے اس شاندار سلسلے سے اثر لے کر کلکتہ کے مشہور روزنامہ "ہند" کے قابل اڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ایک لیڈر لکھا جس کا مفہوم یہ ہے:-

"پرانے زمانے کے ہندوستانیوں میں آپس کی وضعداریاں اور دوستیاں فداکارانہ تو تھیں لیکن وہ انفرادی تھیں۔ اجتماعی قومیت اور ملکیت کے احساس سے وہ سب محروم تھے اور اس میں کوئی شک نہیں، کہ انگریزوں نے جو تسلط ہندوستان میں بغیر کسی بڑی جنگ کے حاصل کیا اس میں ان کو کامیابی محض اس وجہ سے ہوئی کہ ہندوستانیوں میں قومیت اور ملکیت کا اجتماعی احساس نہیں تھا۔"

یہی نہیں، یہ موضوع تو ایک مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ "اردو مجلس دہلی" میں جو خود خواجہ شفیع صاحب کے مکان پر ہر اتوار کو منعقد ہوتی ہے کئی مضمون موافقت اور مخالفت میں پڑھے گئے، ان میں سے بعض میں نے دیکھے۔ لیکن موافقت ہو یا مخالفت، کسی میں وہ لگاوٹ نہیں ہے، وہ تو کچھ خواجہ شفیع ہی کے طرزِ تحریر کی خصوصیت ہے۔

اب اس شاندار سلسلہ کو خواجہ شفیع صاحب نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ اس قسط میں مقابلہ کی شان بڑی دلدوز ہے آخری حصہ قدامت اور فرسودگی کی چھاتی پر جدت کا ناقابلِ برداشت گھونسہ ہے۔

ساغر

ماں اولاد کو بیچ رہی ہے رانی راج کو۔ دھرم پتنی پتی کو دھوکو دے رہی ہے۔ بے وقوف عورت۔ بے وفا بیوی۔ رعایا کش ملکہ غلط صلاح کاروں کے ہاتھ میں پھنسی ہے۔ میاں سے دغا کر رہی ہے رعایا سے غدّاری۔ کیا زمانہ ہے بیوی کا ہاتھ اپنے سرتاج کے سر سے تاج اُتار رہا ہے۔ نام کی حکومت کے لئے تیمور کی ہڈیاں فروخت کی جا رہی ہیں۔

لال قلعہ پر گولا اُتارا جا رہا ہے نمک حرام نمک خواروں نے انگریزوں کو بتا دیا ہے کہ رنگ محل پر زیادہ گولہ باری کی جائے مطلب پرست شوہر دشمن بیوی نے زمین آسمان سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ ماں میتھ

مچا رہی ہے۔

زینت محل اپنا سنگار اُجاڑے بال بکھیرے سوانگ بنائے گریباں چاک پریشاں حال بیٹھی میاں کا دامن پکڑے شوے بہا رہی ہیں۔ یہ اصرار ہے کہ اس لال حویلی کو آگ لگاؤ۔ ہم کہیں جنگل میں جا پڑینگے یہ ہر گھڑی کی دعائیں دھوئیں سے میرا دل دہلا جاتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اتنے میں ایک اور گولہ پھٹا۔ بڈھے دولھا کی جوان بیوی میاں سے لپٹ گئیں۔ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ گلاب سے چہرے پر کیسر پھول گئی۔ ہاتھ پیر سرد پڑ گئے مردنی چھا گئی۔

ایشیا دسمبر ۱۹۴۷ء

حیا بیچنے والا ایماں عورت کی باتوں میں دغا کی گھاتوں میں آگیا۔ تیمور کا وارث قلعہ چھوڑ قبروں پہ جا پڑا۔ قلعہ دار سجادہ بن بیٹھا۔ بادشاہ نے گدائی اختیار کی۔

اغیار کی بن آئی دشمنوں کا نقشہ جم گیا۔ چال چل گئی شاہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ قلعہ ٹوٹ گیا۔ وزیر مُہروں کے جکڑ میں آگیا۔ بازی نرغہ میں پڑ گئی۔

شاہزادے مارے گئے سلاطین سولی چڑھے۔ جاں نثار تباہ حال ہوئے۔ بادشاہ گرفتار۔

غداروں کے ہاں گھی کے چراغ روشن ہوئے۔ خاندانِ تیموری کا چراغ جس نے عیش و عشرت سے لو لگائی تھی شمعِ محفل بن گیا تھا ایک پھونک سے گل کر دیا گیا۔

نہ وہ بزم رہی نہ وہ چراغ۔ نہ وہ محفل رہی نہ وہ شمع۔

اچھا ہوا نہ وہ بزم رہنے کے قابل تھی نہ وہ محفل۔ وہ چراغ گل گیر کو دعوت دے رہا تھا گل ہو گیا بُرا نہ ہوا۔ اس محفل میں اہلِ محفل مطلب آشنا مدعا دست تھے۔ شمع عصمت فروش آبرو باختہ تھی پروانے مطالب کے دیوانے۔ اس بزم کے چراغ کا دیا غریب رعایا کے کاسۂ سر کا تھا۔ روغن ان کے سینوں کی چربی کا۔ بتی کی جگہ دست کاروں کی انگلیاں جلائی جا رہی تھیں۔ اس چراغ کی لو گھر پھونکنے کی فکر میں تھی۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔

اس بزم کے پھولوں میں غداری اور دغا کے کانٹے چھپے تھے محبت بھرے حسین ہاتھ آستینوں میں چھریاں چھپائے۔ جامِ لالہ سینہ میں سم سیاہ لئے۔ ساقی میخواروں کے خون کا پیاسا۔ کلیاں اپنے سینوں میں ہوس زر چھپائے تھیں۔ گلے ملنے والے گلا کاٹنے کی فکر میں تھے۔

نوجوان بڑے میاں کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

ابو ظفر بہادر شاہ مرثیہ خواں جیل خانہ چلا گیا۔ آلِ تیمور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ بدنما داغ چھوڑ مرا کہ **یافث اغلان** کا نام لیوا پنشن خوار ہوا گرفتار ہوا دوسروں کا دست نگر ذلیل و خوار ہوا۔

بندہ پرور آفاتِ غلامی سے وہ نسل آشنا نہ تھی۔ لذتِ حکومت کام و دہن بھول چکے تھے۔ گھونگروؤں کی جھنکار دل میں بس رہی تھی تلواروں کی جھنکار کانوں پر گراں گزرنے لگی۔ نتیجہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ زمانہ نے سلاسلِ غلامی کی جھنکار کو ان کے خوابِ گراں کا مستقل خواب پریشاں بنا دیا۔

بادہ نوش بزمِ عیش میں گلرخوں سے ہم کنار گل تکیوں پر سر رکھ کر سو گئے تھے گھر میں چور گھس آئے۔ تمکنات سمیٹ لئے۔ اوّل تو نشہ ہارے چینے ہی نہیں اور چینے تو بیکار۔ ابھی تک خمار تھا طبع عالی کسل مند۔ سر گرانی تھی۔ اعضا شکنی۔ ابھی چور گھر میں موجود تھا یہ متوالے لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے۔ معشوقوں کی باہیں گلوں میں پڑی تھیں۔ دُردِ تہ جام ابھی باقی تھی ڈگوس گئے اور پھر پڑ رہے۔ وائے ناکامی۔

اب صفحۂ سفید کی طرف نظر ڈالی

ہندوستان میں ہل چل مچی ہے۔ حکومت کی بنیادیں ڈگمگا رہی ہیں۔ استبداد کی عمارت ڈھینے کو ہے۔ غلامی لرزہ براندام کھڑی ہے۔ غیر حکومت رختِ سفر باندھ رہی ہے۔ غلام خوابِ گراں سے آزادی کی انگڑائی لے کر اُٹھا ہے۔ ذلّت کی زنجیریں توڑ رہا ہے۔ بندھن دانتوں سے کاٹے ڈالتا ہے۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں کھڑا ہے اس پر رحمت کی پھوار پڑ رہی ہے۔

جنگِ آزادی کے نہتّے سپاہی سینہ سپر کھڑے ہیں۔ حکومت اپنے ہتھیار استعمال کر رہی ہے۔ یہ سر دے کر سلطنت لینے آئے ہیں۔ آزادی کی موت کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جیل خانہ بھر چکے ہیں قیدی چلے آ رہے ہیں۔ دس کی گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو بیس آن موجود ہوتے ہیں۔ ذاتی آزادی بیچ کر قوم اور ملک کی آزادی خریدنے والوں نے اپنی زندگی جیل خانوں کیلئے وقف کر دی ہے۔ زنداں کو دُلہن سمجھ رکھا ہے۔ سلاخوں کو سینوں سے لگا رہے ہیں۔

جو لاری قیدیوں کو لیکر جیل کے دروازہ پر پہنچتی ہے اس میں سے مقررہ تعداد سے زیادہ برآمد ہوتے ہیں۔ جیلر گھبرا اُٹھے ہیں۔ حکومت کے ہاتھ پیر پھول گئے ہیں۔

ظلم کرنے والا ہاتھ شل ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ آزادی صلب کرنے والے

۱۔ مہر بمعنی اشرفی۔

بازو مفلوج ہوا چاہتے ہیں۔

ہندوستانی اپنا حق لینے اُٹھے ہیں۔ مادرِ وطن کے سپوت اپنے جوان خون کے غازہ سے مادرِ وطن کو سُرخ رو کرنے پر آمادہ ہیں دھرتی ماتا کی زنجیریں کاٹی جارہی ہیں اس میں ہاتھ بھی کٹ رہے ہیں اور سر بھی۔

چند اوباش چاوڑی بازار کے ایک کوٹھے پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ بازار میں سے قومی نعرہ کی آواز آتی ہے رنڈی بیتابانہ برآمدہ میں جاتی ہے۔ تماشبین بھی اسکے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جوان۔ بوڑھے۔ بچے والنٹیر گذر رہے ہیں۔ طوائف ایک کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے یہ میرا بھائی ہے۔ اور ان الفاظ کے ساتھ ساتھ اسکے چہرہ پر ایک قابلِ پرستش سُرخی دوڑ جاتی ہے۔ مرد تماشائی اس مطعونِ خلائق عورت کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں تونے اپنے بھائی کو کیوں بھینٹ چڑھادیا۔ جواب ملتا ہے "آج وہ ننگ جوانی ہے جو زنداں میں نہیں" تماشائی والنٹیروں میں جا ملتے ہیں۔ جلوس گزرجاتا ہے۔ فضا میں آزادی کے نعرے گونج رہے ہیں۔

نوجوان کے چہرہ پر عجیب تبسم ہے۔ آنکھوں میں ایک خاص روشنی بڑے میاں سے کہتا ہے۔ دیکھا آپ نے اُس دور میں محصنات غیر مصافحات کی وہ ذہنیت تھی اور اس دور میں فاحشہ اس مقام پر ہے۔

بڑے صاحب اس تُند گفتاری کی تاب نہ لاسکے۔ بولے میاں اب میٹھے باتیں بنارہے ہو۔ اس وقت ہوتے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا۔ پھر ہم پوچھتے لے بیسی کے ساٹھ ہوتے ہیں۔ تم امن و امان کے زمانہ میں میٹھے زبان زوری دکھارہے ہو۔ اس وقت کی حالت سے آگاہ نہیں قیامتِ صغرا بپا تھی۔ نفسا نفسی کا بازار گرم۔ غدر پڑ رہا تھا۔ لے دے مچی ہوئی تھی۔ باپ کو بیٹے کی خبر نہ تھی۔ بیٹے کو باپ کی۔ جس کا جہاں سینگ سمایا نکل گیا۔ جس کو جہاں پناہ ملی جاچھپا۔ رزق آگے آگے تھا اور خلقِ خدا پیچھے پیچھے۔ نہ تن کو کپڑا تھا نہ پیٹ کو روٹی۔ جان کے لالے پڑے تھے۔ زمین و آسمان دشمن ہورہے تھے۔

نوجوان نے بڑے میاں کی طرف سخت نگاہ ڈالی اور کہا۔

زمین و آسمان دشمن ہوتے ہیں لیکن صرف اسکے جو اپنے ساتھ خود دشمنی کرتا ہے۔ زمین و آسمان ہلاک کرتے ہیں صرف اس کو جو اپنے پاؤں میں خود کلہاڑی مارتا ہے۔ زمین و آسمان دانہ دانہ کو محتاج کرتے ہیں گر صرف اس کو جو ہاتھ پیر ہلا کر کھانا نہیں چاہتا۔ زمین و آسمان کو الاہنا مت دیجئے آپ خود اپنے دشمن تھے۔ آپ اپنے ہاتھ سے اپنے پیر میں کلہاڑی مار رہے تھے آپ خود اپنی بربادی کے درپے تھے۔ اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔

بندہ نواز جب انہوں نے قفس قبول کیا اس وقت تک ان کے بال و پر موجود تھے اور صیاد کے ہاتھ میں قینچی نہ تھی۔ ان کے بازوؤں میں طاقت تھی اور پنجرہ کی تیلیاں کمزور۔ اس وقت تک اہلِ وطن کے پاس ہتھیار بھی تھے اور آزادی بھی۔ ایمان کی یہ ہے کہ ان کے پاس سب کچھ تھا ماں خواہش پرواز نہ تھی۔ ہمیں خواہش پرواز ہے پر پرواز نہیں "اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے"۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم پیدا پنجرہ میں ہوئے ہیں بال و پر بریدہ بازو شکستہ۔ پھر بھی ان لنج بازوؤں کو پھڑپھڑا رہے ہیں اور پیش رفتگاں نے صحیح و سالم بال و پر ہلائے تک نہیں۔

ہم تو قیدی ماں باپ کے ہاں جیل خانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ موردِ الزام تو وہ باہمت بزرگ ہیں جنہوں نے آزادی عیش و عشرت کی بھینٹ چڑھادی اور قید قبول کی۔

محترم بندہ ایک باپ سوداوی امراض مول لیتا ہے اس کو خدا بیٹا دیتا ہے لیکن ہونے والے کے بدن پر بدنما گٹھلیاں ہیں۔ لڑکا جوان ہوتا ہے اور وہ گٹھلیاں جان کے ساتھ ہیں۔ باپ اس بدنصیب لڑکے کے سرہانے کھڑا کہ رہا ہے کہ ناشدنی تجھ جیسے بدہیئت کو مجھے ساتھ لیتے ہوئے اور اپنا بیٹا بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ تیرے بدنما داغ یہ مکروہ غدود میرے لئے باعث ننگ و عار ہیں۔

جس وقت اس باپ نے یہ مرض خریدا تھا اس کو خواہشات نے اندھا کر رکھا تھا اب خودستائی نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ وہ غفلت پرست بھول گیا کہ یہ روگ اس کا ورثہ ہے جو بیٹے کو پہنچا ہے لڑکا غریب ناکردہ گناہ باپ کے گناہوں میں گرفتار ہے۔

حضور ہم کو غلامی پیش رفتگاں سے ورثہ میں ملی انہوں نے مول لی تھی۔ پھر بھی وہ اچھے اور ہم بُرے۔ اگر یہی آپ کا انصاف ہے تو ہمارا آپ کا انصاف اس دن ہوگا جس دن میزان کے پلڑے میں کچھ ڈالا جاسکے گا نہ نکالا جاسکے گا۔

ایشیا ستمبر ۱۹۴۰ء

یہ کہ نوجوان نے ایک اور ورق اُلٹا

غدر پڑ چکا ہے۔ عیش کی راتیں گذر چکی ہیں مصیبت کے دن کاٹے نہیں کٹتے۔ دلّی آباد ایک افسانہ ہے دلّی برباد ایک حقیقت۔ نازوں کے پالے ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ پھولوں میں تلنے والے خوار ہو گئے ہیں۔ مَن برسانے والے ہاتھ مٹھی بھر اناج کو محتاج۔ شاہزادے شارعِ عام پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ وارثِ تاج و تخت کشکولِ گدائی لئے پھر رہے ہیں اور وہ بھی خالی۔ راجہ نل بھیک مانگ رہا ہے اور لے مانگے نہیں ملتی۔

دلّی کا سہاگ اُجڑ چکا ہے۔ اس کا ساجن بچھڑ چکا ہے۔ عمر رسیدہ کمر شکستہ دولہا حجلۂ عروسی سے اُتار دیا گیا ہے۔ نیا نوشاہ اس چھپر کھٹ کی آرائش پیروں تلے مل رہا ہے۔

نام کے بہادر شاہ کی عروسِ سلطنت غریب کی جورو سب کی بھابی بنی ہے۔ کالے لوٹ مار مچا رہے ہیں گورے اپنا سکہ جما رہے ہیں۔

ابو ظفر بہادر شاہ عروسِ سلطنت کی آبرو نہ بچا سکا اسکی آبرو ریزی کی جا رہی ہے۔ دولت بھی لوٹی جا رہی ہے۔ عزت بھی اور عصمت بھی۔

شہر کربلا بنا ہے۔ ہر گھر ماتم کدہ۔ بازار بند پڑے ہیں۔ گلی کوچوں پر مُردنی چھائی ہے۔ گھر گھر سناؤنی آئی ہے۔

ایک گھر میں میاں تین وقت بعد ٹکڑا کھانے بیٹھا ہے۔ روٹی نصیب تھی پر طبیعت ٹھیک نہ تھی چاہنے والی بیوی نے کم مصالحہ پتلے شوروہ کا قلیہ اپنے ہاتھ سے پکایا تھا۔ ابھی اس نے نوالہ توڑا ہی تھا کہ باہر سے سگے سسر تشریف لائے۔ نہایت موٹے۔ سیاہ فام لال لال دیدے جیسے دہکتے ہوئے انگارے۔ تیز بڑے بڑے سفید دانت۔ داماد نے سلام کیا۔ بیٹی ایک طرف کو ہو بیٹھی۔ سسرے نے داماد کو درازئ عمر کی دُعا دی اور فرمایا بیٹا ذرا باہر جا کر دستخط کر آؤ سرکاری آدمی کھڑے ہیں۔ داماد اُٹھنے کو تھا کہ بیٹی نے کہا یہ ذرا کی ذرا کھانا کھا لیں۔ آج تین وقت بعد شوروہ چپاتی نصیب ہوا ہے چاہنے والا باپ بولا۔ ایک منٹ میں آکر کھا لیں گے کھانا بھاگا نہیں جاتا وہ غریب بھوکا باہر گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ بیوی دسترخوان بچھائے بیٹھی رہی۔ پر میاں وہاں گیا تھا جہاں سے پھر آنا محال تھا۔

باپ کا ایک منٹ کچھ اس قیامت کا تھا کہ وہ ختم نہ ہوا اور دھولے ہو گئے کیس۔

سونا لینے پی گئے اور سونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی ملے مرے دھولے ہو گئے کیس

یہ منظر دیکھنے کے بعد نوجوان نے بڑے صاحب کی طرف دیکھا اور کہا خون سفید ہو گئے تھے قلب سیاہ۔ نقش وفا نقش باطل ہو گیا تھا محبت حرفِ غلط۔ مُنہ کی مُہر دلوں پر ثبت تھی۔ ہوسِ زر نے اندھا کر دیا تھا غضب خدا کا حاکم کی خوشنودی کیلئے۔ تھوڑا سا روپیہ حاصل کرنے کو چار دن کی آسائش کے واسطے سگی بیٹی کا سہاگ اُجاڑ دیا۔ باپ نے بیٹی کی چوڑیاں اپنے ہاتھ سے توڑیں اور کچھ اس طرح کہ غریب کے ہاتھ زخمی اور پھر زخم سدا خون دیتے رہے۔ ان لوگوں کی محبت اشعار تک رہ گئی تھی۔ ماتا پتا و چونچلوں تک۔ وہ لوگ اُس دور میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے تھے سیرتِ انسانی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ انسانوں کی چلتی پھرتی بولتی چالتی مورتیاں رہ گئی تھیں۔ انسانیت سے معرا قالب تھے بے روح۔ جسد تھے بے جان کاغذ کے پھول تھے خوشبو سے خالی۔ یہ کہکر نوجوان نے صفحۂ سفید پر نگاہ ڈالی۔

جیل خانہ کی کوٹھریاں میں سیاسی قیدی بھوک ہڑتال کر رہے ہیں۔ ایک بنگال کا ہے ایک پنجاب کا۔ ایک سندھ کا ہے ایک مدراس کا۔ نہ رشتہ ہے نہ ناتا۔ نہ جان نہ پہچان۔ لیکن ہر ایک کو اس پر اصرار ہے کہ اگر دوسرا روٹی کھائیگا تو میں بھی کھاؤنگا ورنہ نہیں۔ بقائے حیات کیلئے ڈاکٹر مصنوعی طریقوں سے بزور و زبردستی غذا پہنچا رہے ہیں لیکن یہ جان دینے والے آن جانے نہیں دیتے۔ دم توڑ رہے ہیں پر نوالہ توڑنے کو راضی نہیں۔

نوجوان کے چہرہ پر خون دوڑا ہوا تھا اُس نے اُن بزرگ کی طرف دیکھا اور کہا۔ کہئے ایمان سے ان دونوں تصویروں میں کونسی انسانیت کی مکمل تصویر ہے اور کونسی حیوانیت کا مرقع۔

بڑے میاں سرنگوں بیٹھے تھے نوجوان نے ان کی طرف دیکھا اور کہا قسم ہے ملک اور قوم کی عزت کی۔ ہم ہیں ملک کے سپوت۔ ہم ہیں صفحۂ تاریخ کے زرّین حروف وہ تھے کلنک کے ٹیکے بدنامی کے بدنما داغ۔

ـــ مہر بعنی اشرفی

وداعِ آخر

قسط چہارم

(محمد جمیل احمد بی - اے بریلوی)

خلاصہ قسط اوّل و دوم و سوم

(نادل نگار رتیق کو اپنی) اکتالیسویں سالگرہ کے دن دوسرے خطوط کے ساتھ ایک دبیز لفافہ ملا، جو ایک اجنبی عورت نے لکھا تھا وہ صرف تیرہ برس کی لڑکی تھی، جب اُس نے رتیق کی محبت کا ننھا سا جذبہ کسی نامعلوم طور پر اپنے دل میں محسوس کیا ——— اور وہ اس میں بہ گئی،

اس وقت اس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی رتیق کی محبت ذیادہ معمور تھی، عمر کے ساتھ اس کی محبت بھی ترقی کرتی رہی، بس کی بیوہ ماں نے ایک شخص سے شادی کرلی اور اس کو زبردستی اپنی ماں کے ایک دوسرے شہر کو جہاں اس کا سوتیلا باپ رہتا تھا، منتقل ہونا پڑا۔ جہاں اس نے دو سال تڑپ تڑپ کر گذارے۔ اب وہ اٹھارہ سال کی تھی اور اس میں عورت بیدار ہوچکی تھی۔ آخر کوشش کرکے وہ پھر واپس آئی اور ایک دکان پر ملازمت کرلی، اب اس کا معمول تھا کہ دن بھر کے کام کے بعد سرما کی برفیلی ہواؤں میں رتیق کے مکان کے سامنے جاکر کھڑی ہوجاتی اور گھنٹوں اس کی کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کو دیکھتی اور محو رہتی۔ ایک دن اتفاقاً دونوں سڑک پر مل گئے مگر رتیق اسے بھول چکا تھا۔ ایک دن پھر سڑک پر ملاقات ہوئی اور رتیق نے اسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی وہ راضی ہوگئی اور وہ شب اس نے وہیں گزاری، کچھ عرصہ بعد اسی طرح اس نے دو راتیں اور رتیق کے ساتھ کاٹیں۔ اس کے بعد رتیق کہیں باہر چلا گیا اور غالباً اسے بھول گیا۔ ان تینوں راتوں میں سے ایک کا حاصل ایک لڑکا تھا جو غربت و افلاس، مصیبت اور بلاؤں کے ہجوم میں پیدا ہوا تھا۔ اب یہی اُس کی امید اور زندگی کا سہارا تھا جو اس وقت اس کے سامنے مُردہ پڑا تھا)

"آپ نے اس بچے کو کبھی نہیں دیکھا، آج میں اس کو آپ سے پوشیدہ رکھنے کی وجہ سے اپنے آپ کو قابل الزام ٹھہرا رہی ہوں۔ کیونکہ آپ یقیناً اس سے محبت کرتے۔ آپ نے اس کو خواب سے بیدار ہوکر تبسم ہوتے نہیں دیکھا آپ نے اس کی سیاہ آنکھوں کو نہیں دیکھا جو آپ کی آنکھیں تھیں، وہ آنکھیں جن سے وہ مجھے اور دنیا کو شادمانی و مسرت سے دیکھتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا، بہت پیارا تھا۔ آپ کی بشاشت اور متلون المزاجی سب اس میں موجود تھی ———

اس صورت میں کہ جس میں یہ صفات ایک بچہ میں ہوسکتی ہیں، وہ گھنٹوں عالم بےخودی میں چیزوں سے اسی طرح کھیلتا رہتا جیسے کہ آپ زندگی سے کھیلتے ہیں۔ اور پھر سنجیدہ ہوجاتا اور بہت دیر تک بیٹھا ہوا اپنی کتابیں پڑھتا تھا، وہ آپ تھے، دوسرے جسم میں آپ، خوش طبعی و سنجیدگی کا ارتباط و اشتراک جو آپ کے کردار کی اس قدر نمایاں خصوصیت ہے اس میں صاف صاف نظر آنے لگا تھا۔ اور جتنا زیادہ وہ آپ سے مشابہ ہوتا جاتا تھا اتنی ہی زیادہ میں اس سے محبت کرنے لگی تھی، وہ پڑھنے میں تیز تھا اور فرانسیسی زبان میں مینا کی طرح باتیں کرتا۔ اس کی کاپیاں درجہ میں سب سے زیادہ صاف رہتیں۔ وہ کیسا خوبصورت چھوٹا سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ جب گرمی کے موسم میں گریڈو (Grado) کے مقام پر ہم لوگ کنارِ ساحل پر سے جاتی تو عورتیں اسے روک لیتیں اور اس کے حسین بالوں سے کھیلتیں، سیمرنگ (Semmering) میں جب وہ برف پر پھسلنے والی گاڑی میں بیٹھ کر پھسلتا تو لوگ مڑ مڑ کر اس کو دیکھا کرتے، وہ حد درجہ خوبصورت، حد درجہ شریف النفس، حد درجہ دلکش اور جاذبِ توجہ تھا پچھلے سال جب وہ کالج میں داخل ہوا اور بورڈنگ ہوس میں رہنے لگا تو اس نے کالج کے پچھلی اٹھارہویں صدی کے لڑکے کی سی وردی پہننا شروع کی جس کی پیٹی میں ایک چھوٹی سی چھری آویزاں رہتی اور اب وہ یہاں پڑا ہے اس کی آنکھیں بے رونق اور زرد ہیں اس کے ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے ہیں۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ میں اپنے لڑکے کو قیمتی تربیت کیسے دے سکی، یہ میرے لئے کس طرح ممکن ہوا کہ میں آسودہ حال لوگوں کی مسرور و مغرور زندگی میں اس کو داخل کرنے کے سامان فراہم کر سکوں میرے محبوب میں آپ سے دور اندھیرے میں سے گفتگو کر رہی ہوں۔ بغیر کسی شرم و حجاب کے میں آپ کو بتا دوں گی۔ مجھ سے نفرت نہ کیجئے میں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ میں نے کسبی کا پیشہ نہیں کیا، میں ایک بازاری طوائف نہیں بنی۔ مگر میں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا، میرے احباب، میرے عشاق دولتمند لوگ تھے۔ اوّل اوّل میں نے انہیں ڈھونڈا اور پھر انہوں نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ چونکہ میں (کبھی آپ نے غور فرمایا ہے) ایک خوبصورت عورت تھی جس کسی کو میں نے اپنے آپ کو دے دیا وہ میرا ہو گیا۔ وہ سب میرے نیاز مند مداح تھے۔ وہ سب مجھ سے محبت کرتے تھے سوائے آپ کے جن سے میں محبت کرتی تھی۔

اب جبکہ میں آپ کو بتا چکی کہ میں نے کیا کیا۔ کیا آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سب کچھ سمجھ سکیں گے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کی خاطر کیا۔ آپ کے دوسرے وجود، دوسرے جسم کی خاطر کیا۔ آپ کے لڑکے کی خاطر۔ میں جانتی تھی کہ غریبوں کی دنیا میں زیردست ہی ہمیشہ مظلوم رہتے ہیں۔ میں اس خیال کو کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، آپ کا لڑکا، آپ کا پیارا لڑکا ایسے ارذل اور اسفل عالم میں عوام الناس کی بدچلنیوں اور بداخلاقیوں میں، غریبوں کے محلوں کی گندی تاریک گلیوں کی مسموم ہواؤں میں پرورش پائے۔ اس کے بے عیب و نازک ہونٹوں کو لاوارثوں کی زبان نہیں سیکھنا چاہئے۔ اس کے خوبصورت سفید جسم کو غربا کے سخت، موٹے جھوٹے کپڑوں سے خراب نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کے لڑکے کو ہر چیز کا بہترین حصہ مل جانا چاہئے، تمام دنیا کی دولت، تمام دنیا کی خوش طبعی حاصل ہونا چاہئے۔ زندگی میں اس کو آپ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔ اُس کو اسی ماحول میں رہنا چاہئے جس میں آپ رہ چکے تھے۔

یہ وجہ تھی جس کی بنا پر میں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ یہ میرے لئے کوئی ایثار نہ تھا۔ چونکہ جن چیزوں کا نام ہم نے رسمی طور پر "عزت" اور بے عزتی رکھ لیا ہے، وہ میرے لئے بے معنی تھیں۔ صرف آپ ہی ایک وہ ہستی تھے جو میرے جسم کے مالک تھے اور آپ کو مجھ سے محبت نہ تھی۔ پھر کیا میرے لئے میرا جسم بالکل بے معنی نہ تھا کہ میں اپنے جسم کے ساتھ کیا کرتی ہوں؟ میرے حبا

والفت شعاریاں اور نازبرداریاں حتیٰ کہ اُن کے انتہائی پُرجوش جذبے بھی کبھی میرے دل کی گہرائیوں کو نہ چھو سکے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر ایسے لوگ تھے جن کی میں دل سے عزت کرنے پر مجبور تھی اور حالانکہ خود اپنی قسمت کا خیال مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں ان کے یک طرفہ جذبہ محبت سے ہمدردی کروں یہ سب لوگ مجھ پر مہربان تھے۔ ان سب نے مجھ سے الفت کی اور مجھے خراب کیا۔ وہ میرا ہر ممکن پاس و لحاظ کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک باعزت معمر شخص نے جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اپنے ہر ممکن اثر و کوشش سے کام لے کر آپ کے لڑکے کا نام کالج میں درج کروا دیا۔ یہ شخص مجھ سے لڑکی کی طرح محبت کرتا تھا۔ تین یا چار مرتبہ اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اس سے شادی کر لوں آج میں ایک دولتمند بیگم ہوتی۔ ٹائرال (Tirol) کے ایک عالیشان محل کی مالکہ! میں فکروں اور پریشانیوں سے بری ہوتی، چونکہ پھر لڑکے کو ایک بے حد درجہ مہربان باپ مل جاتا اور مجھے ایک سنجیدہ، ممتاز اور رحم دل شوہر، مگر میں اپنے انکار پر اڑی رہی گو میں جانتی تھی کہ اس سے اس کو اذیت پہنچی ہو سکتا ہے کہ یہ میری بے وقوفی و حماقت ہو۔ اگر میں مان جاتی تو آج میں بھی کہیں محفوظ و پُرسکون زندگی بسر کرتی ہوتی۔ اور میرا بچہ اب بھی میرے پاس ہوتا۔ مگر میں آپ سے اپنے انکار کی وجہ کیوں چھپاؤں۔ میں اپنے ہاتھ باندھنا نہیں چاہتی تھی، میں آزاد رہنا چاہتی تھی —— آپ کے لئے! اپنے قلب کی عمیق ترین گہرائیوں میں، اپنے نفس کے اُس حصہ میں جو شعور کی حد سے باہر ہے۔ میں اپنے بچپن کی آرزوؤں کے خواب دیکھتی رہی، شاید کسی دن آپ مجھے اپنے پاس بلائیں۔ چاہے صرف ایک ہی ساعت کے لئے۔ صرف ایک ہی ساعت کے امکان کے خیال سے میں نے ہر دوسری چیز کو ٹھکرا دیا۔ صرف اس لئے کہ میں آپ کی آواز پر آزادی کے ساتھ لبیک کہہ سکوں، اس وقت سے کہ جب سے مجھ میں "عورت" جاگ اٹھی تھی۔ میری زندگی صرف ایک انتظار تھی۔ آپ کے ایک ایما، ایک اشارے کا انتظار!

آخرکار متوقع ساعت آئی پھر بھی آپ نے کبھی یہ نہیں جانا کہ یہ ساعت آئی! جب یہ ساعت آئی آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ کبھی نہیں کبھی نہیں، میں آپ سے اکثر ملی، تھیٹروں میں، نغمہ و سرود کی محفلوں میں، پریٹر (Prater) میں، اور اکثر دوسری جگہ، ہمیشہ میرا دل دھڑکا اور ہمیشہ آپ بغیر کسی توجہ کے میرے قریب سے ہو ہو کر گذر گئے۔ میری ظاہری شکل و شباہت بہت کچھ بدل چکی

تھی، دوشیزگیں لڑکی اب ایک عورت تھی، لوگ کہتے تھے —— ایک خوبصورت عورت، میں نفیس پوشاک میں ملبوس تھی، اور میرے گرد قصیدہ خوانوں اور مداحوں کا مجمع تھا۔ اب آپ مجھ میں اُس شرمیلی لڑکی کو کیسے پہچان سکتے تھے جس کو آپ نے اپنے سونے کے کمرے کی دھندلی روشنی میں دیکھا تھا؟ اکثر میرا ساتھی آپ کو سلام کرتا اور آپ مجھے دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیتے، مگر آپ کی نگاہیں ہمیشہ ایک خلیق و مہذب اجنبی نگاہیں ہوتیں تعظیم و تکریم کی نگاہیں، مگر وہ معرفت و شناخت کی نگاہیں نہ تھیں —— آہ وہ نگاہیں دور تھیں، مایوسی کی حد تک دور، مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ یہ ناشناسی، گو میں اب اس کی عادی ہو چکی تھی۔ ناقابل برداشت تھی۔ میں ایک دوست کے ہمراہ تھیئٹر کے ایک کوچ بکس میں بیٹھی ہوئی تھی اور آپ دوسرے بکس میں تھے جب تماشے کے پہلے نغمے کا آغاز ہوا تو روشنیاں کم کر دی گئی تھیں، میں آپ کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مگر میں آپ کا تنفس اسی طرح محسوس کر رہی تھی جیسے کہ میں نے آپ کے کمرے میں محسوس کیا تھا۔ آپ کا نازک ہاتھ عنابی سے ڈھکی ہوئی درمیانی دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ میں اُس وقت اس بے پایاں خواہش سے معمور تھی کہ جھک کر آپ کے اس ہاتھ کو بوسہ دوں، جس کا محبت آمیز لمس میں نے ایک دفعہ محسوس کیا تھا۔ تماشہ کی آوازوں کے ہنگامے میں یہ خواہش تیز تر شدید تر ہوتی گئی۔ میں بمشکل تمام لرزتے ہوئے اپنے آپ کو آپ کے ہاتھ کو بوسہ دینے سے روک سکی، پہلے ایکٹ کے اختتام کے بعد میں نے اپنے دوست سے کہا کہ میں جانا چاہتی ہوں۔ میری قوتِ برداشت سے یہ باہر تھا کہ آپ تاریکی میں میرے قریب بیٹھے رہیں —— اس قدر قریب اور اس قدر بیگانہ، اس قدر غیر!۔ مگر یہ ساعت ایک دفعہ اور آئی۔ صرف ایک دفعہ اور، یہ صرف ایک سال پہلے کا آپ کی سالگرہ کے دن ہی کا قصہ ہے۔ میرے خیالات پہلے سے زیادہ آپ پر مرکوز تھے، چونکہ میں آپ کی سالگرہ کو تیوہار کی طرح منایا کرتی تھی میں علی الصبح گلاب کے سفید پھول خریدنے کے لئے گئی جو میں ہر سال آپ کو اس ایک ساعت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے بھیجتی تھی جس کو آپ فراموش کر چکے تھے۔ سہ پہر کو میں اپنے بچے کو گاڑی میں سیر کرانے کو لئے جا رہی تھی اور ہم نے ساتھ چائے پی، شام کو ہم تھیئٹر گئے۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اس دن کو اپنی جوانی کی ایک مخفی و پُر اسرار سالگرہ کی طرح منائے۔ حالانکہ اس کو اس کا سبب معلوم نہ تھا۔ دوسرا دن میں نے اپنے اُس زمانے کے ایک گہرے دوست کے ساتھ گذارا جو برن (Brunn) کا ایک دولتمند باجر تھا جس کے ساتھ میں دو برس سے رہ رہی تھی، وہ مجھ پر بُری طرح فریفتہ تھا اور وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ کوئی وجہ نہ سمجھ سکا۔ گو اس نے مجھے اور میرے بچے کو تحائف کے بار سے لاد دیا اور اپنے والہانہ جذبۂ محبت میں کافی حد تک قابلِ محبت تھا۔ ہم دونوں نغمہ و سرود کی ایک محفل میں گئے جہاں ہمیں بہت سے زندہ دل اور بشاش لوگ ملے۔

رنگس ٹریسی (Ringstrasse) کے ایک ریسٹورنٹ میں ہم سب نے شام کو کھانا کھایا۔ ہنسی اور گفتگو کے درمیان میں، میں نے ناچ گھر چلنے کو کہا، عام طور پر میں ایسی جگہوں سے جہاں مسرت میں نیم مخموریت کا اثر ہو، حذر اور احتراز کرتی اور ایسی جگہ نہیں جاتی، مگر اس وقت کوئی زبردست اندرونی قوت کام کرتی معلوم ہوتی تھی کہ میں نے خود یہ تجویز پیش کی جس کا خیر مقدم بہت خوشی سے کیا گیا۔ میں ایک ناقابلِ تشریح خواہش سے معمور تھی، گویا کچھ غیر معمولی تجربات میرے منتظر تھے۔ معمول کے مطابق اس وقت بھی ہر شخص میری رائے سے ہم خیال ہونے کا خواہشمند تھا۔ ہم ناچ گھر گئے۔ تھوڑی سی الکوحل شراب پی۔ اور دفعتاً مسرت کی ایک ایسی جنون پرور کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی جس سے اُس وقت سے بیشتر میں واقف نہ تھی۔ میں نے پے بہ پے شراب کے کچھ جام اور پئے اور کچھ گانے والوں کے ساتھ جو موقع و محل کے مناسب ایک گانا گا رہے تھے، میں بھی شامل ہوگئی اور مجھ میں مسرت کے ساتھ رقص کرنے کی ایک آمادگی پیدا ہوگئی۔ پھر یکایک میں نے محسوس کیا کہ جیسے کسی برف کی طرح خنک یا جلتے ہوئے ہاتھ نے میرے دل کو پکڑ لیا ہو۔ آپ دوسری میز پر کچھ احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے مدحت آمیز اور محبت پرور نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اُن نگاہوں سے جنھوں نے مجھے غیر قابلِ بیان طور پر جھنجوڑ ڈالا ہے۔ لرزہ براندام کر کر دیا ہے۔ اپنی فطرت کے ایک نامعلوم جذبہ کے تحت میں اس دس برس کے دوران میں آپ پہلی دفعہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں لرز اٹھی اور میرا ہاتھ اس قدر زور سے کانپا کہ شراب کا پیالہ قریب قریب گر پڑا۔ خوش قسمتی سے میرے ساتھیوں نے میری یہ حالت نہیں دیکھی۔ چونکہ اُن کے حواس موسیقی اور قہقہوں کی آوازسے منتشر اور پریشان تھے۔

آپ کی نگاہیں رفتہ رفتہ زیادہ پُرجوش ہوتی گئیں اور انھوں نے میرے جذبات کو بھڑکا دیا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ آیا بالآخر آپ نے مجھے پہچان

لیا تھا۔ یا آپ کی خواہشات اُس عورت نے برانگیختہ کردی تھیں جو آپ کی نگاہوں میں بالکل بیگانہ و اجنبی تھی۔ میرے رخسار سرخ ہوگئے تھے، اور میں بے دلچسپی سے الٹی سیدھی باتیں کر رہی تھی۔ آپ نے اپنی نگاہوں کے اثر کو محسوس کرلیا تھا۔ آپ نے ملحقہ کمرے میں مجھے ایک لمحہ کے لئے بلانے کو سر کی ایک جنبش سے ایک خفیف سا اشارہ کیا اور پھر اپنا بل ادا کرکے آپ اپنے دوستوں سے رخصت ہونے اور زینے کے پاس چلے گئے۔ اور مجھے یہ اشارے سے بتلاتے گئے کہ آپ باہر میرے منتظر رہیں گے۔ میں ایک ایسے مریض کی طرح کانپ اٹھی جس کو بخار میں جاڑا چڑھ آیا ہو، میں مخاطب کی گئی تو جواب دینے کے قابل نہ تھی۔ میں اپنے ہیجان خون پر قابو حاصل نہیں کرسکتی تھی اس وقت محض اتفاق سے دو نیگرو نسل کے لوگوں نے اپنی چیخ و پکار کے ساتھ ایک وحشیانہ رقص شروع کیا۔ ہر شخص اُن کی طرف متوجہ ہوگیا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں کھڑی ہوگئی اپنے دوست سے کہا کہ میں ایک منٹ میں واپس آجاؤں گی اور پھر آپ کے پیچھے آئی۔ آپ برآمدہ میں میرے منتظر تھے اور جب میں آئی آپ کا چہرہ چمک اٹھا، ایک تبسم کے ساتھ آپ مجھ سے ملنے کے لیے آگے بڑھے۔ یہ ظاہر تھا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا، نہ پچھلے زمانے کی اُس بچی کو، نہ لڑکی کو، پھر میں آپ کے لئے ایک نئی ملاقاتی تھی! کیا واقعی آپ کے پاس ایک گھنٹہ میرے ساتھ گزارنے کے لئے ہے؟ آپ نے ایک مطمئن لہجے میں پوچھا جس سے ظاہر تھا کہ آپ مجھے ایک ایسی عورت تصور کر رہے ہیں جس کو کوئی بھی ایک رات کے لئے قیمت ادا کرکے خرید سکتا ہے۔ "ہاں" میں نے جواب دیا۔ وہی کانپتی ہوئی اتہائی "ہاں" جو آپ نے تقریباً دس برس پہلے ایک تاریک سڑک پر مجھ سے میری دوشیزگی کے زمانہ میں سنی تھی "آپ کب آسکیں گی؟" آپ نے دریافت کیا۔ "جب آپ چاہیں" میں نے جواب دیا، چونکہ جہاں آپ کا تعلق تھا وہاں میں کوئی شرم و حجاب نہیں جانتی تھی۔ آپ نے مجھے کچھ حیرت سے دیکھا، ایسی حیرت سے کہ جس میں شک اور رازجویانہ شوق شامل تھے، اور جس کا اظہار آپ نے اس سے پیشتر اس وقت بھی کیا تھا جب آپ میری آمادگی پر متعجب ہوگئے تھے "ابھی"؟ ایک لمحہ کے پس و پیش کے بعد آپ نے پوچھا "ہاں" "چلئے" میں کپڑوں کے کمرے سے اپنی چادر لانے کو ہوئی کہ مجھے یاد آیا کہ میرے براؤن (Brown) دوست نے اپنے اور میرے کپڑے ایک ساتھ داخل کئے تھے اور ٹکٹ اُسی کے پاس تھا۔ اُس کے پاس جانا اور مانگنا غیر ممکن تھا اور آپ کے ساتھ رہنے کا

۸۰

موقع کو چھوڑ دینا جس کی میں برسوں سے منتظر تھی اور بھی زیادہ غیر ممکن تھا۔ میں نے اپنی شال سنبھالی اور آپ کے ہمراہ اس شبنم آلود رات میں چلدی۔ صرف چادر ہی سے بے پروا ہوکر نہیں۔ بلکہ اس نیک طینت شریف مزاج آدمی سے بھی بے نیاز ہوکر جس کے ساتھ میں برسوں سے رہ رہی تھی ——— اُس حقیقت سے بھی بے نیاز ہوکر کہ ان سب لوگوں کے سامنے اسے چھوڑ کر چلے جانے سے میں اس کو اس کے دوستوں کی نظروں میں ایک ایسے شخص کی سی مضحکہ خیز اور نفرت انگیز حالت میں پیش کر رہی ہوں جس کی بیوی ایک اجنبی شخص کا اشارہ پاکر اُسے چھوڑ دے۔ اپنے دل میں، میں خوب اچھی طرح واقف تھی کہ میں ایک شریف دوست کے ساتھ کس قدر کمینہ پن، کس قدر ناشکری، کس قدر احسان فراموشی کا برتاؤ کر رہی ہوں۔ میں یہ جانتی تھی کہ میری یہ شدید جذباتی غلطی اُسے ہمیشہ کے لئے مجھ سے بیگانہ بنادے گی۔ میں جانتی تھی کہ میں اپنی زندگی پر مصیبتوں کو دعوتیں دے رہی ہوں۔ مگر میرے لئے اس کی دوستی کیا تھی؟ خود میری زندگی کیا تھی؟ اس اتفاقیہ موقع کے مقابلہ میں کیا تھی جب میں پھر آپ کے لبوں کا لمس اپنے لبوں پر محسوس کروں گی۔ جب میں آپ کی آواز کے بولوں کو پھر سُن سکوں گی، اب جبکہ سب کچھ ختم ہوچکا ہے۔ میں آپ کو بتاسکتی ہوں کہ مجھے آپ سے کس قدر محبت تھی، مجھے یقین ہے کہ اگر آپ مجھے بستر مرگ سے بھی بلائیں تو مجھ میں اتنی طاقت آجائے گی کہ میں اُٹھ کر آپ کی دعوت پر لبیک کہوں!

دروازہ پر ایک کرایہ کی موٹر کھڑی تھی اور ہم اس میں بیٹھ کر آپ کے مکان کو روانہ ہوئے۔ ایک دفعہ پھر میں آپ کی آواز سن سکتی تھی۔ ایک دفعہ پھر میں نے آپ کے قرب کی وجدانی مسرت محسوس کی اور بہت عرصہ پہلے کی طرح اس وقت بھی مسرت و پریشانی کی کثرت سے مجھ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ میں اچھی طرح بیان نہیں کرسکتی کہ جب ہم اس مانوس زینہ پر چڑھ رہے تھے تو کس طرح میں نے وہ تمام جذبات پھر محسوس کئے جو دس برس پہلے محسوس کرچکی تھی۔ کس طرح میں بیک وقت ماضی و حال دونوں زمانوں میں زندگی بسر کر رہی تھی میری تمام ہستی گویا آپ کی ہستی میں پیوست ہوگئی تھی۔ آپ کے کمروں میں کچھ خفیف سی تبدیلی ہوئی تھی۔ تصویریں کچھ بڑھ گئی تھیں، کتابیں کچھ زیادہ ہوگئی تھیں۔ فرنیچر میں ایک یا دو چیزوں کا اضافہ مگر سب ملا کر پہلے ہی کی طرح مانوس معلوم ہوتا تھا۔ لکھنے کی میز پر گلدان رکھا تھا اور اس میں سفید گلاب کے پھول تھے وہی پھول جو میں نے ایک دن پہلے اُس عورت کی یادگار کے طور بھیجے تھے جسکو آپ بھول گئے تھے جس کو آپ نے نہیں پہچانا تھا۔ اب

بھی نہیں، جب وہ آپ کے بالکل قریب تھی، جب آپ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے
تھے، اور آپ کے لب اس کے لبوں پر ثبت تھے! مجھے یہ دیکھ کر گونہ راحت ہوئی کہ
میرے فرستادہ پھول وہاں رکھے تھے۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ نے ایک
اس چیز کی قدر کی تھی جو میری پیش کش تھی، جو آپ سے وابستہ میری محبت کی زندگی
کا سانس تھی!

آپ نے مجھے اپنی آغوش میں لیا، اور میں آپ کے ساتھ قیام
پذیر رہی مگر پھر بھی آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ جب میں آپ کی شفقت آمیز تھپک والی
محبت نواز بوسوں سے کانپ رہی تھی تو یہ ظاہر تھا کہ آپ کے جذبات ایک محبت
کرنے والی محبوبہ اور ایک بازاری عشوہ فروش میں کوئی امتیاز نہیں کرتے، یہ ظاہر تھا
کہ آپ کے بے پناہ اور فضول خرچی سے صرف کئے ہوئے جذباتِ الفت کو صرف،
اپنے ہی اظہار سے سروکار تھا، مجھ پر، ایک اجنبی پر، جس کو آپ نے رقص گھر سے
پکڑ لیا تھا۔ آپ اس قدر مہربان، اس قدر مشفق بن گئے تھے، آپ مجھ سے
بے عزتی کا سخیفانہ برتاؤ کرنا نہیں چاہتے تھے، اور پھر بھی آپ چھا جانے والے،
مغلوب کر لینے والے جذبے سے معمور تھے۔ مسرتِ گذشتہ سے سرشار ہو کر میں پھر
آپ کی فطرت کے دونوں رخوں سے واقف تھی، آپ کے دماغی و جنسی جذبات کی
اس حیرتناک آمیزش سے واقف تھی۔ جس نے بچپن ہی میں مجھے آپ کا غلام
بنا دیا تھا۔ میں نے کسی دوسرے شخص کو اس لمحے کے کیف سے اس قدر مکمل طور سے
مغلوب ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے کسی شخص کو اس قدر زیادہ مسحور، اس قدر زیادہ
بیخود ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جس قدر کہ آپ کو، — آپ کو، کہ جن پر اس ساعت
کے گذر جانے کے بعد ایک غیر مختتم اور سنگدلانہ فراموشی طاری ہو جاتی، مگر میں
بھی اپنے آپ کو بھول گئی۔ میں جو وہاں تاریکی میں لیٹی تھی، کون تھی؟ کیا
میں ایامِ گذشتہ کی جذبات برانگیختہ بچی تھی؟ کیا میں آپ کے بچے کی ماں
تھی؟ کیا میں بالکل بیگانہ و اجنبی تھی؟! اس حیرتناک رات کو بہت باتیں
مل کر ایک ہو گئی تھیں، اور یہ ایک جذبہ، سرشاری کی حد تک مانوس، سرمستی
کی حد تک نیا تھا، میری خواہش تھی کہ یہ مسرت ہمیشہ تک باقی رہے
مگر صبح ہو گئی، ہم دیر میں اٹھے، اور آپ نے مجھ سے ناشتہ پر رکنے کے
لئے کہا۔ کھانے کے کمرے میں جہاں انتظام کسی غیر مرئی ہاتھ نے کیا تھا، ہم چائے پر
خاموشی سے گفتگو کرتے رہے، پہلے کی طرح آپ نے ایک پرجوش، و رفیقانہ بے تکلفی
کا اظہار کیا اور پہلے کی طرح پھر کوئی بےڈھنگے سوالات نہ تھے، میری بابتہ راز جوئی کا
کوئی شوق نہ تھا۔ آپ نے مجھ سے نام دریافت نہیں کیا، پھر پتہ نہیں پوچھا، پہلے
کی طرح اب بھی میں آپ کے لئے ایک اتفاقیہ شکار تھی، ایک گمنام عورت تھی، ایک
پُرجوش ساعت تھی، جو گذر جانے کے بعد اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑتی۔ آپ نے
بتایا کہ آپ ایک لمبے سفر پر شمالی افریقہ میں دو تین مہینے رہنے کے لئے جا رہے
ہیں۔ ان الفاظ نے میری مسرت کو چور چور کر ڈالا "ماضی، ماضی، ماضی، فراموشی"
میں آپ کے قدموں پر گر کر یہ استدعا کرنا چاہتی تھی کہ مجھے اپنے ہمراہ لیتے چلئے تاکہ
بالآخر اس تمام زمانے کے گذر جانے کے باوجود بھی آپ مجھے پہچان لیں، مگر میری کم
ہمتی تھی، بزدل تھی، کمزور تھی، میں صرف اتنا کہہ سکی "افسوس" آپ نے تبسم ریز
آنکھوں سے مجھے دیکھ کر پوچھا "کیا تمہیں واقعی افسوس ہے!؟"

ایک لمحہ تک میں ایک بیخودی کے عالم میں تھی، میں کھڑی ہو گئی اور آپ
کو ٹکٹکی باندھے تکتی رہی، پھر میں نے کہا۔ "جس شخص سے میں محبت کرتی ہوں وہ ہمیشہ
سفر ہی میں رہا ہے" میں آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی، میں نے
سوچا "اب ہاں، اب یہ مجھے پہچان لیں گے" آپ صرف مسکرائے اور تسلی دیتے ہوئے
کہا "کچھ عرصہ کے بعد واپس آجاتا ہے" میں نے کہا "ہاں آجاتا ہے مگر اس وقت تک وہ
سب کچھ فراموش کر چکا ہوتا ہے"

میں نے ضرور ایک گہرے جذبے کے تحت میں یہ الفاظ ادا کئے ہونگے
چونکہ میرے لہجے کا آپ پر اثر ہوا۔ آپ بھی کھڑے ہو گئے اور مجھے لطف و حیرت سے دیکھنے
لگے۔ آپ نے اپنے ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھ دیئے "اچھی چیزیں فراموش نہیں
کی جاتیں اور میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔" آپ مجھے بغور دیکھ رہے تھے
گویا آپ اپنے دل میں میرا ایک باقی رہنے والا عکس قائم کر رہے ہیں۔ جب میں نے
آپ کی ان پیوست ہو جانے والی نگاہوں کو، اپنی ہستی کے اس جائزہ کو دیکھا تو
میں یہ خیال کئے بغیر نہ رہ سکی کہ اب آپ کی بے بصری کا طلسم بالآخر ٹوٹ جائیگا
"وہ مجھے پہچان لیں گے، پہچان لیں گے" میں انتظار و امید میں لرز رہی تھی،
مگر آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ ہاں آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں آپ کی نظروں
میں اس وقت سے زیادہ اجنبی و بیگانہ کبھی نہ تھی۔ چونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ
ایسا نہیں کر سکتے تھے جو آپ نے چند لمحوں کے بعد کیا، آپ نے مجھے پھر بوسہ، ایک پرجوش
بوسہ دیا۔ میرے بال بکھر گئے تھے اور ایک دفعہ پھر مجھے ان کو سنوارنا پڑا۔ آئینہ کے
سامنے کھڑے ہو کر میں نے دیکھا —— اور جیسے ہی میں نے دیکھا، میں شرم و ذلت
کے جذبات سے بے قابو ہو گئی —— کہ آپ چپکے سے میرے دستانوں میں دو نوٹ

رکھ رہے تھے، میں بمشکل اپنے آپ کو چیخ اٹھنے سے روک سکی۔ میں بمشکل اپنے آپ کو آپ کے رخسار پر طمانچہ مارنے سے روک سکی، آپ مجھے اس رات کی قیمت ادا کر رہے تھے، جو میں نے آپ کے ساتھ گذاری تھی۔ مجھے جو بچپن سے آپ کے عشق میں گرفتار تھی، مجھے جو آپ کے بچے کی ماں تھی۔ آپ کے نزدیک میں صرف ایک بازاری عشوہ فروش تھی، جو آپ کو رقص گھر میں مل گئی تھی، صرف یہ کافی نہ تھا کہ آپ مجھے بھول جائیں، آپ کو مجھے میری قیمت ادا کرنے اور مجھے ذلیل و خوار کرنے کی بھی ضرورت تھی!

میں نے جلدی سے اپنی چیزیں اٹھا لیں تاکہ جتنا جلد ممکن ہو، میں نکل جاؤں، میں ایک شدید کرب محسوس کر رہی تھی۔ میں نے مڑ کر اپنا میٹ دیکھا وہ لکھنے کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ سفید گلاب کے گلدان کے پاس، میرے پھولوں کے پاس - بے اختیار جی چاہا کہ میں ایک آخری کوشش آپ کی یاد کو تازہ کرنے کی کروں، کیا آپ مجھے ایک گلاب کا پھول دیں گے؟ "ہاں ہاں" آپ نے سب پھول گلدان سے اٹھاتے ہوئے کہا، "مگر شاید یہ کسی عورت کے بھیجے ہوئے ہیں، کسی عورت کے جو آپ سے محبت کرتی ہے؟" "ممکن ہے" آپ نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ وہ میرے پاس بلا ناغہ کے آتے تھے مگر مجھے نہیں معلوم کس نے بھیجے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے مرغوب ہیں"، میں نے آپ کو غور سے دیکھا "غالباً یہ پھول آپ کو کسی عورت نے بھیجے ہیں جس کو آپ فراموش کر چکے ہیں"؟

آپ کو تعجب ہوا۔ میں نے آپ کو اور بھی زیادہ غور سے دیکھا میری آنکھیں چیختی تھیں "پہچانئے" ہاں اب تو مجھے آخری مرتبہ پہچان ہی لیجئے"، مگر آپ کے تبسم میں دلدوزی تھی، پہچان نہ تھی، آپ نے پھر ایک دفعہ مجھے بوسہ دیا۔ مگر آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔

میں تیزی سے چلی گئی، چونکہ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ انھیں دیکھیں، کمرے سے تیزی کے ساتھ جانے میں دروازے پر میں آپ کے ملازم جان کے اوپر ہم کے ایک گولے کی طرح گر پڑی۔ اس کو حیرت ہوئی اور ساتھ ہی مجھ میں ایک پرشوق انہماک پیدا ہو گیا تھا۔ وہ میرے سامنے سے ہٹ گیا اور میرے لئے سامنے کا دروازہ کھول دیا اور جب میں اس تیزی سے گذر جانے والے لمحے میں جس نے اپنے آنسوؤں میں اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک روشنی سی دوڑ گئی۔ ہاں میں آپ سے کہتی ہوں کہ اس تیزی سے گزر جانے والے لمحے میں اس نے مجھے پہچان لیا جس نے بچپن کے بعد پھر مجھے نہیں دیکھا تھا۔

میں اس کی اس قدر ممنون تھی کہ جی چاہتا تھا کہ میں جھکوں اور اس کے ہاتھ چوم لوں، میں نے اپنے دستانے سے وہ نوٹ گھسیٹ لئے جس سے آپ نے مجھے عذاب پہونچایا تھا اور اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ اس نے حیرت آمیز انداز میں مجھے غور سے دیکھا ـــــ چونکہ وہ اس ایک لمحے میں مجھے اتنا سمجھ گیا تھا۔ جتنا کبھی آپ عمر بھر نہیں سمجھے۔ ہر شخص، ہر شخص میری تحریک کے پیچھے پڑ گیا۔ ہر شخص نے مجھے اپنی مہربانیوں کے بارے دباب دیا، آپ نے، صرف آپ نے مجھے کبھی نہیں پہچانا۔

میرا بچہ، ہمارا بچہ مر گیا، اب کوئی نہیں ہے جس سے میں محبت کر سکوں دنیا میں آپ کے سوا اب کوئی نہیں، مگر آپ میرے لئے کیا ہیں؟ ـــــ آپ جنھوں نے مجھے کبھی، کبھی نہیں پہچانا۔ آپ جو مجھ سے اس طرح گذر گئے جیسے آپ ایک آبشار سے گذر جاتے، آپ مجھے اس طرح روندتے ہوئے چلے گئے جیسے ایک پتھر کو روند کر چلے جاتے، آپ مجھے ایک ابدی انتظار میں چھوڑ کر بغیر کسی خیال، بغیر کسی التفات کے اپنے راستہ پر چلے گئے۔ ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ اب میں نے آپ کو پالیا ہے آپ کو، اس نہ پائی جا سکنے والی ہستی کو، اس بچے کو پالیا ہے، مگر وہ آپ کا بچہ تھا! رات کو وہ بے رحمی سے چپکے سے سفر کو چلا گیا، وہ مجھے بھول گیا ہے اور کبھی واپس نہ آئے گا۔ میرے پاس آپ کی کوئی چیز نہیں، کوئی بچہ نہیں، کوئی لفظ نہیں تحریر کی کوئی سطر نہیں، آپ کے حافظہ دیاد میں میری کوئی جگہ نہیں، اگر کوئی شخص آپ کی موجودگی میں میرا نام لے تو آپ کے نزدیک وہ بالکل ایک اجنبی اور بیگانے کا نام ہوگا۔ کیوں مجھے مرنے کی خوشی نہ ہو جب میں آپ کے نزدیک مُردہ ہوں، کیوں مجھے جانے کی خوشی نہ ہو جب آپ میرے پاس سے چلے گئے۔

میرے محبوب! میں آپ کو الزام نہیں دیتی، میں اپنے سوز و غم اپنے پاس دھریاں کو آپ کی پرمسرت زندگی میں داخل کرنا نہیں چاہتی، آپ ڈریں نہیں میں آپ کو کوئی مزید تکلیف نہیں دوں گی، اپنی اس خواہش کی پیروی یہ کہ آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔ مجھے معاف کر دیجئے، جب میرا بچہ مردہ پڑا ہے تو اسی ایک مرتبہ میں آپ سے گفتگو کروں گی۔ میں پھر پوشیدگی کی تاریکی میں لوٹ جاؤں گی میں پھر خاموش ہو جاؤں گی، جیسے کہ ہمیشہ رہی ہوں، جب تک میں زندہ ہوں آپ میری آہ بھی نہیں سنیں گے۔ صرف میری موت کے بعد ہی آپ کو یہ ترکہ پہونچے گا، اس کا ترکہ جس نے آپ کو تمام چاہنے والوں سے زیادہ چاہا ہے۔ اس کا ترکہ جس کو آپ نے کبھی نہیں پہچانا۔ اس کا ترکہ جو ہمیشہ آپ کے بلاوے کی منتظر رہی۔ اس کا ترکہ جس کو آپ نے

کبھی نہیں بلایا۔ غالبًا، غالبًا جب آپ کو یہ میراث ملیگی تو آپ مجھے بلائیں گے اور وہ پہلا موقع ہوگا۔ جب میں آپ سے بے وفائی کروں گی۔ چونکہ میں آپ کی آواز موت کی نیند میں نہ سُن سکوں گی۔ میں اپنی کوئی تصویر، کوئی نشانی نہیں چھوڑ رہی ہوں، جیسے کہ آپ نے کچھ نہیں چھوڑا، چونکہ اب کبھی آپ مجھے نہیں پہچانیں گے، زندگی میں یہی میری قسمت میں تھا اور موت میں بھی یہی میری قسمت میں ہوگا۔ میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں آپ کو نہیں بلاؤں گی، میں بغیر آپ کو اپنے نام وصورت سے واقف کیے ہوئے چلی جاؤں گی، موت مجھ پر آسان ہوگی۔ چونکہ دُور سے آپ اس کو محسوس کرسکیں گے۔ اگر میری موت سے آپ کو تکلیف ہوتی تو میں کبھی نہ مر سکتی،

میں اور زیادہ نہیں لکھ سکتی۔ میرے سر میں بہت گرانی ہے۔ میرے اعضا میں درد ہے، مجھے بخار آنے کو ہے، مجھے لیٹ جانا پڑے گا۔ غالبًا سب کچھ بلد ہی ختم ہوجائے گا۔ غالبًا اس مرتبہ تقدیر مجھ پر مہربان ہوگی اور مجھے اپنے بچے کا جنازہ نکلتے ہوئے دیکھنا نہ پڑے گا۔

میں اور کچھ نہیں لکھ سکتی، الوداع میری الوداع! میں آپ کی بے انتہا ممنون ہوں گی۔ میں بے حد مسرور ہوں کہ میں نے آپ کو سب کچھ بتایا۔ اب آپ کو سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ گو آپ کبھی یہ نہ سمجھ سکیں گے کہ میں آپ سے کس قدر محبت کرتی تھی، مگر بایں ہمہ میری محبت آپ پر بار نہیں ہوگی۔ میں آپ سے وابستہ ہوں گی۔ یہی میری تسکین ہے، آپ کی شاداں و درخشاں زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ مجھے، میری موت آپ کے لئے تکلیف و گزند کا باعث نہ ہوگی، اس خیال سے مجھے راحت ہے۔

مگر کون، آہ کون اب سالگرہ کے موقع پر آپ کو سفید گلاب کے پھول بھیجا کرے گا؟" گلدان خالی رہے گا۔ میری زندگی کی وہ مہک، وہ سانس جو میں ہر سال آپ کے کمرے میں پھونک دیا کرتی تھی، اب آئے گی، میری ایک آخری خواہش ہے، پہلی و آخری خواہش، اس کو میرے واسطے پورا کر دیجئے۔ ہمیشہ سالگرہ کے موقع پر ——— اُس دن جب آدمی کو اپنا خیال آتا ہے ——— گلاب کے کچھ پھول لے کر گلدان میں رکھ دیا کیجیے، اس کو اسی طرح کیجیے جیسے اور لوگ ہر سال مردوں کی برسی کرتے ہیں۔ میرا اب خدا میں یقین نہیں رہا ہے، اور اس وجہ سے اب میں برسی کی فاتحہ و دعا نہیں چاہتی، میں صرف آپ میں یقین رکھتی ہوں، میں سوائے آپ کے اور کسی سے محبت نہیں کرتی، میں صرف آپ ہی میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ——— صرف سال میں ایک دن، سکون و خاموشی کے ساتھ، جیسے کہ میں ہمیشہ آپ کے قریب رہی ہوں، براہِ کرم ایسا کیجیے، مجھی! براہِ کرم ایسا کیجیے، . . . . میری پہلی اور آخری تمنا . . . . شکریہ شکریہ، مجھے آپ سے محبت ہے، مجھے آپ سے محبت ہے، . . . . . الوداع . . . . . .

اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط گر پڑا۔ وہ دیر تک بغور سوچتا رہا۔ ہاں اس کے دل میں ایک بھولی بسری دھندلی سی یاد تھی، ایک ہمسایہ کی بچی کی، ایک لڑکی کی، رقص گھر میں ایک عورت کی، ایک تیز بہنے والے چشمے کی تہ میں پڑے ہوئے ایک سنگریزے کی غیر متشکل اور دھیمی جھلملاہٹ کی طرح، دھندلی منتشر پریشان یاد! اس کے ذہن میں بہت سے سائے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے گذرے مگر وہ تحلیل و متوثر ہو کر اُس کے دماغ میں کوئی ایک تصویر پیش نہیں کرسکے، دنیائے احساسات میں بھولی ہوئی یاد کی کچھ متحرک جنبشیں تھیں، مگر اس کے باوجود وہ اچھی طرح کچھ یاد نہیں کرسکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اُس نے ان سب باتوں کو خواب میں دیکھا ہے، ہاں بڑی وضاحت کے ساتھ اور اکثر دیکھا ہے، پھر بھی یہ سب خواب ہی وا ہمے تھے، خیالی صورتیں تھیں، سیمیائی نمود تھی، اس کی نظریں لکھنے کی میز پر رکھے ہوئے نیلگوں گلدان پر گئیں وہ خالی تھا۔ برسوں سے وہ اس کی سالگرہ کے موقع پر خالی ہی رہتا تھا۔ وہ کانپ اُٹھا، اسے محسوس ہوا گویا ایک غیر مرئی دروازہ دفعتًا کھل گیا ہے۔ ایک دروازہ، جس میں سے دوسری دنیا کی ایک کپکپی پیدا کردینے والی ٹھنڈی ہوا، اس کے محفوظ کمرہ میں آرہی ہے۔ اُس نے موت کی آمد محسوس کی، اور محبت کا ایک لافانی جذبہ۔ اس کے دل ہی دل میں کچھ اُبل رہا تھا اور اُس مرحوم کا خیال اُس کے دماغ میں مضطرب تھا، دُور سے آنے والی صدائے موسیقی کی طرح خفیف، پُرجوش!

وداعِ آخر

جرمنی کے زبردست ناول نگار اسٹیفان زویگ کے افسانوی شاہکار کا ترجمہ
(Stefan zweig)

مترجمہ - محمد جمیل احمد بی اے بریلوی

اس غیر فانی شاہکار کو آپ اگست سنہ ۱۹۴۰ء سے لے کر دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء تک ملاحظہ کرتے رہے ہیں، اس نمبر میں اس کی آخری قسط شائع کی جا رہی ہے، اب ادارۂ ادبی مرکز نے طے کیا ہے کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے اور اس کی ادبی اہمیت کے لحاظ سے اس کو اعلیٰ اور حسین صورت میں پیش کیا جائے، تیاری شروع ہو گئی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس کی خریداری کے لئے اپنا نام محفوظ کرا دیں، قیمت اندازاً ایک (۱) روپیہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

ناظم مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

چوڑی والا

ماتی دیوی جی، "ہندی دنیا" کی مشہور افسانہ نگار دیوی ہیں، ہم اس نمبر میں ان کا ایک چھوٹا سا شاہکار "چوڑی والا" پیش کرنے کی مسرت حاصل کر رہے ہیں۔ اس میں بظاہر کچھ نہیں ہے مگر ایک ایک حرف اس تعلق کی داستان ہے جو انسانی روح کو جوڑتا ہے، یہ کہانی اسی "لاگ کی آگ" کو پیش کرتی ہے۔

ساغر

"چولی والے! او چولی والے! لکو ہم چولی پہنیں گے!!"

"اماں او اماں بولو ہم پہن لیں!" چوڑی والے نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کواڑ کھول کر چھوٹی سی ایک بچی نکل آئی اور اپنی پتلی پتلی گوری باہیں پھیلا کر بولی "پہناؤ نا چولی۔ ہم اچھی اچھی پہنیں گے!"

چوڑی والے نے خوبصورت خوبصورت چوڑیاں چھانٹ کر بچی کی کلائی بھر دی۔ "جاؤ پیسے لے آؤ" وہ بولا۔ "دو پیسے کی ہیں چولی والے!؟"

. . . . بچی نے سوال کیا۔ چوڑی والے نے ہنس کر کہا "نہیں جاؤ چار آنے لے آؤ"۔ بچی نے جیب سے دو پیسے نکال کر کہا "دو پیسے لے لو چولی والے!" چوڑی والے نے سنجیدگی کے لہجہ میں کہا "جاؤ اندر سے لے آؤ" ننھی سی بچی اندر گئی، چوڑی والے نے بچی کو اندر سے بولتے سنا "اماں کہتی ہے دو آنے لوگے"؟ چوڑی والے نے کہا "نہیں ساڑھے تین آنے ہی دیدو" "اماں کہتی ہے دو آنے دینگے نہیں تو چولی اُتار لو" ناامیدی کے لہجہ میں بچی نے جواب دیا۔ پھر اپنے آپ ہی کہا۔ "دو پیسے لے لو نا چولی والے" چق کے اندر سے جھانکتی ہوئی ننھی ننھی آنکھیں اُمید سے چمک اُٹھیں" "لاؤ دو ہی آنے۔ بڑی دیر ہو رہی ہے" مجبور ہو کر چوڑی والا بولا اور پیسے لے کر چلا گیا۔

اب اُس گلی میں چوڑی والے کی آواز اکثر سنائی دیا کرتی تھی۔ گلی کے دوسرے سرے پر سے ہی اُس کی آواز سُن کر ننھی سی تارا دوڑی آتی "چولی والے! او چولی والے"! پاس آکر اور ہنس کر کہتی "تم آ گئے"؟ چوڑی والا آتے گود میں اُٹھا کر کہتا۔ "کیا تجھے اب بھی میرے آنے میں شک ہے"؟ دونوں ہنستے۔ وہ اس کی ایک ایک چوڑی کھولتی "ارے یہ دو پیسے کی ہے۔ یہ چمکیلی بھی دو پیسے کی ہے چولی والے تمہاری سب چولیاں دو پیسے کی ہیں۔ لال بھی" چوڑی والا قہقہہ لگا کر کہتا "کیوں ری تیرا سسر بیچتا ہوگا دو پیسے کی" "ہٹ" کہہ کر بچی بھاگ جاتی۔ چوڑی والے کو اُس ننھی بچی سے محبت سی ہوگئی، اُس سارے شہر میں ایک وہی تھی جو اُس کی چوڑیوں کی اتنی تعریف کرتی تھی۔ بچی چوڑیاں پہن کر خوش ہوتی تھی۔ خوب ناچتی تھی۔ چوڑی والا سوچتا تھا کہ اُس کی زندگی کامیاب ہوگئی چوڑی کے ساتھ ساتھ بچی خوش ہو کر چوڑی والے کی بھی تعریف کرتی تھی، "تم بڑے اچھے ہو۔ چولی والے جیسی یہ لال چولی ہے" وہ لال چوڑیوں کے ہار کو چھو کر کہتی۔ پھر پوچھتی "چولی والے تم چولیاں کیسے بناتے ہو مجھے بنانا بتا دوگے، میں بھی بناؤں گی بیچوں گی، دو پیسے کی، خوب پہنوں گی تمہیں بھی پہناؤں گی" ایک سانس میں نہ معلوم وہ کتنی باتیں کر جاتی۔ پھر ساکت سی ہو کر سوال کرتی۔ "لیکن تم کیوں نہیں پہنتے ہو چولیاں" اس سوال کا جواب بنا چوڑی والے کو مشکل ہو جاتا۔ وہ پھر پوچھتی "چولی والے! تُو اچولی نہیں پہنتی کیوں؟ کیا وہ بڑی ہو گئی ہے؟؟" چوڑی والا چپ رہتا، وہ جانتا تھا کہ تُوا چوڑی کیوں نہیں پہنتی ہے وہ بیچاری بیوہ ہے، بچی جواب کا انتظار کئے بغیر ہی سلسلہ کہے جاتی "میں چولی جلول پہنوں گی تُوا کی طرح بلی ہونے پلی بھی--- چولی والے...." وہ اپنا منہ چوڑی والے کے کان سے لگا کر کہتی ـــ "بُوا کالی ہے اس لئے چولی نہیں پہنتی ہے چولی والے"۔ بچی آہستہ سے نانی دادیوں کی طرح کہتی تا کہ تُوا اُس نہ لے۔

اسی طرح بھولی تارا بچپن کے کھیلوں میں مصروف رہتی۔ چوڑی والے کے دل میں بھی گدگدی سی پیدا ہونے لگی وہ سوچتا کیا میں تارا کو ہی چوڑی پہنانے کے لئے چوڑی والا بنا ہوں۔

تارا بڑی ہو رہی تھی۔ لیکن چوڑی والا اُسے ننھی منی سی بچی ہی سمجھتا تھا اُس دن جب تارا کی ماں نے آڑ میں کھڑے ہو کر کہا "چوڑی والے! ایک مہینے میں تارا کی شادی ہو گی" تب وہ ہنس پڑا۔ اسے سخت تعجب تھا کہ اسے ذرا سی بچی کی شادی!؟ "ہمارے تمہارے لئے وہ بچی ہے مگر دنیا کی آنکھوں میں وہ شادی کے قابل ہو چکی ہے" مہینے بھر تک دُور دُور سے تلاش کرکے چوڑی والے نے تارا کو چوڑیاں پہنائیں۔ آخری دن ماں نے کہا کہ اب تارا بیاہ کی چوڑیاں پہنے گی۔ اُس دن چوڑی والا چوڑی بیچنے کہیں بھی نہ گیا، وہ تو تارا کو پہنانے کے بعد ہی کسی اور کو چوڑیاں پہناتا تھا۔

ساون میں تارا نے ہری ساری باندھی، ماں نے پھولوں سے سجا دیا اور چوڑی والے نے آکر ہری ہری چوڑیاں پہنائیں، تارا کے پاس چوڑیوں کا ڈھیر لگ گیا تھا، صندوق بھر گئے تھے، لوگ پوچھتے "یہ چوڑیاں کہاں سے منگائیں" سہیلیاں رشک کرتیں۔ تارا ناز کے ساتھ بھرے ہاتھ کی چوڑیاں جھنجھنا کر کہتی "بڑی دُور دُور کی ہیں"۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔

چوڑی والے نے سُنا تارا سسرال سے آگئی ہے۔ اُس نے رنگ برنگی چوڑیاں چھانٹیں اور تارا کے گھر کی طرف چلا۔ دہلیز پر بلی نے راستہ کاٹ دیا تھوڑی دیر رک کر وہ پھر آگے بڑھا۔ چند ہی قدم ہی چلا ہو گا کہ ایک بڑھیا نے چھینک دیا۔ چوڑی والے کو غصہ آگیا۔ کمبخت کو اسی وقت چھینکنا بھی تھا۔ اس نے چوڑیوں کا ڈبہ اس بغل سے نکال کر دوسری بغل میں دبا لیا اور گلی کی طرف تیزی سے لپکا۔ کچھ دیویاں گنگا جی سے نہا کر آ رہی تھیں اُنھوں نے چوڑی والے کو پہچان کر کہا۔

"چوڑی والے یہ چوڑیاں کسے پہنانے جا رہے ہو۔ تم جسے چوڑیاں پہناتے تھے، اب وہ چوڑیاں کبھی نہ پہنے گی"۔ عورتیں آگے بڑھ گئیں۔

کیا۔۔۔کیا۔۔۔کیا کہا؟ چوڑی والا جلدی سے تارا کے آنگن میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ تارا آگے بڑھی "چوڑی والے" چوڑی والے نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا ــــ سفید ساری پہنے، بغیر چوڑیوں کا لمبا ہاتھ پھیلائے تارا، کھڑی ہے، بال کے لٹھ چھوٹے تھے اور مانگ میں سیندور کا دیا بجھ چکا تھا۔

چوڑی والا ڈر سا گیا اُس کا گلا سوکھنے لگا ــــ ودھوا! تارا ودھوا آنکھوں سے آنسو نکل کر اُس کے جھرّی دار چہرے پر رک گئے۔ تارا نے چوڑیوں کا بکس بڑھا کر کہا "لو چوڑی والے! یہ چوڑیاں بیچ دینا۔ یہ سب میرے لئے بیکار ہیں" چوڑی والے کو وہ اُٹھا ہوا لمبا سونا سا خالی ہاتھ بہت بھدا معلوم ہوا دونوں کے ہاتھ میں چوڑیوں کے ڈبے تھے، ایک لوٹانے کے لئے آ رہی تھی اور دوسرا دینے کو جا رہا تھا دونوں آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے، دونوں کے ہاتھ کانپے اور ڈھلے ہوئے بکس گر پڑے چوڑیاں جھنجھنا کر بکھر گئیں کچھ ٹوٹیں کچھ ویسے ہی پڑی رہیں۔

اس کے بعد بوڑھے چوڑی والے کو کبھی کسی نے چوڑیاں پہناتے نہیں دیکھا۔ شاید تارا کے سہاگ کے ساتھ ہی اُس کا پیشہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

مالتی دیوی

نصیب کا بیوپار

ایک کہانی

سیّد فرید جعفری

برجیس، نئے زمانے کی لڑکی، ترقی یافتہ بیوی، ہر صبح بلا ناغہ تفریح کو جاتی، سمندر کی ہوا کے نمکین جھونکوں سے منہ دھوتی، فرحت حاصل کرتی اور گھر واپس آجاتی، مگر گھر پہنچنے سے پہلے وہ کسی نہ کسی بھکاری پر چند پیسے ضرور نچھاور کرتی، اس میں کبھی فرق نہیں پڑا، یہی اُس کی عادت سی ہوگئی تھی، وہ کہا کرتی کہ صبح کے وقت اگر چند پیسے کسی لاچار کو دیدیئے جائیں اور وہ اُس کو اپنے مرجھائے ہوئے ہونٹوں کا ذرا سا رقص دکھادے سارے دن نصیب مسکرایا کرے گا۔ برجیس کا شوہر اکثر اُسے جھڑکتا اور کہتا کہ اس طرح پیسے دینے سے بھلا نہیں بلکہ بُرا ہوتا ہے اس لئے کہ صبح صبح جب بھکاری کو پیسے بغیر اُنگلی ہلائے مل جائیں گے، وہ کام کاج کے لئے کیوں دوڑ دھوپ کرے گا۔ برجیس جواب میں کہتی کہ راتوں کو سڑکوں کے کنارے سونے والی مخلوق جس کا گھر نہ بار بھلا اتنی سکت ہی کہاں رکھتی ہے کہ کام کاج کے لئے دوڑ دھوپ کرے پھر کیا کام کاج اس زمانے میں دوڑنے دھوپنے سے مل جاتا ہے۔ خود اُس کے شوہر نے کام چاہنے والوں کو کتنی بار ٹکا سا جواب دیا تھا کہ کام کیا کھونٹی میں بندھا ہے۔ برجیس اپنے شوہر کو سمجھاتی کہ ملک میں کام کا کال ہے۔ کام ڈھونڈے سے نہیں ملتا، اور خدا کی مخلوق ایڑیاں رگڑ رگڑ جان دے رہی ہے۔ دم توڑ رہی ہے، سڑکوں پر اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مُرجھائے بچے کملائی ہوئی ماں کی گود میں بلبلا رہے ہیں۔ دودھ، ذرا سے دودھ کے لئے ہڑک رہے ہیں، ماں کبھی آتے جاتے سیٹھ، بابو میاں کی طرف حسرت کی نظر پھینکتی ہے التجا کرتی ہے خدا کا واسطہ دیتی ہے۔ اُن کو ان کے اپنے بچوں کی یاد دلاتی ہے، دودھ ذرا سے دودھ کے لئے پیسہ مانگتی ہے۔ مگر راہ چلتے اُسے ٹھکرا دیتے ہیں وہ اُن کے قدموں پر سر پٹکتی ہے، ساری انسانیت لرز جائے، پر راہ چلتے سیٹھ صاحب، بابو جی اور میاں ناک کو جھٹکتے ہوئے کھٹی ڈکاریں نکالتے، شرخ ٹائی پر ہاتھ پھیرتے یا ڈاڑھی کھجلاتے گزر جاتے ہیں، ہر شخص جس کے سامنے وہ ہاتھ پھیلاتی ہے یہی کہتا ہے کہ جوان ہے، ہاتھ پیر کی مضبوط ہے، کام کر سکتی ہے، پھر کام کیوں نہیں کرتی، وہ اکثر اپنا جواب دہراتی تو بابو تمھیں کام دیدو۔ میں کام کروں گی، میرے بچے بھوکے ہیں، سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں، میں اِن کی خاطر سب کچھ کروں گی، اس پر بابو جی گھبرا جاتے ہیں اور کترا کر جلد بھاگنا چاہتے ہیں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ "پھر تو نے بچے پیدا ہی کیوں کیے۔ تو آوارہ ہے اور اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے۔ بھلا ان پیٹ بھرے، محلوں کے رہنے والوں کو کیا معلوم کہ بچے اگر آوارگی کی نشانی ہیں تو اس کی ذمہ داری بھی تلملائی ہوئی انتڑیوں پر ہے۔ جب دولت اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتی تو بیچاری دُکھیا اپنے تن من پر کس طرح قابو حاصل کرے اور اگر وہ بچے آوارگی کی نشانی ہیں تو کوئی اُس بیوہ کے دل سے پوچھے۔ نہ معلوم کس روس نامش نے اُس کے شوہر کو کچل کر دنیا سے ناپید کر دیا تھا یا کس موسم نے اُسے اپنی گرمی سردی یا سیلاب کا شکار کر دیا تھا بچوں کی پیدائش روکنے کے لئے بھی پیسے چاہئیں، غریبوں کے لئے نہ اسپتال ہیں نہ ایسے گھر جہاں انھیں یہ نئی باتیں، نئے زمانے کی ترقی یافتہ باتیں، بتائی جائیں۔

مگر برجیس کا شوہر کچھ نہ سنتا بس اُس کی ایک رٹ ہوتی جسے اُس نے طوطے کی طرح رٹ لیا تھا۔ سب جھوٹ۔ سب غلط۔ بہت کام ہے۔ کیا بمبئی میں کام کی کمی ہے؟ برجیس کچھ دیر بحث کرتی پھر یہ کہہ کر چپ ہو جاتی کہ جب تک "ورک ہاؤس" کام گھر نہیں بنتے وہ اپنی عادت سے باز نہیں آئے گی۔ برجیس کا شوہر بیوی کی ترقی یافتہ باتوں کا اکثر مضحکہ اُڑاتا اور جب وہ کام گھر کا نام لیتی تو کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ بات آئی گئی ہوتی۔

ایک دن برجیس حسبِ معمول سیر کو نکلی، اس کو ایسا بھکاری نہ ملا جسکو وہ دوسرے پر ترجیح دے کر پیسے دیتی وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ ایک نوجوان نے اُسے روکا۔ نوجوان کے ہاتھوں میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ برجیس انتظار کرنے لگی، کہ وہ کچھ کہے گا۔ مگر اُس کے ہونٹ کئی مرتبہ کھُلے اور بند ہو گئے۔ برجیس نے دیکھا کہ اُس کی پھٹی ہوئی میلی گاندھی کیپ بوسیدہ سیاہ سرج کا کوٹ، قمیص کے کاج میں بٹنوں کے بجائے دھاگے، بے انتہا پھٹی ہوئی دھوتی، گھِسا ہوا سفید کینوس کا جُوتا جس میں سے اُس کی انگلیاں نکلی پڑتی تھیں، اُس کا آپ اپنا اشتہار تھے۔ وہ سمجھ گئی۔ نوجوان پھولوں کا گلدستہ بیچنا چاہتا ہے مگر یہ اُس کا پیشہ نہیں ہے اُس کی پیلی پیلی پیشانی پہ شرافت اور مٹی ہوئی شوکت لہریں مار رہی تھی۔ برجیس نے بات کرنے کے طور پر کہا۔

"تم پھول بیچتے ہو مگر تم مالی نہیں معلوم ہوتے اور میرے گھر میں تو خود ہی چمن ہے اور پھول ہیں"

"آپ کے چمن میں پھول ہیں، مگر میرے نصیب میں فاقہ ہے۔ خیر معاف کیجئے گا!"

"نہیں۔ نہیں مایوس نہ ہو۔ تم نے یہ نہ بتایا کہ تم پھول کیوں بیچتے ہو؟"

"بائی جی! یہ کوئی کیسے بتا سکتا ہے کہ وہ فلاں کام کیوں کرتا ہے کرنا پڑتا ہے اس لئے کرتا ہوں۔"

"مگر بہت سارے کام ہیں، یہ تمہارا پیشہ نہیں، تم اس میں کیسے کامیاب ہو گے؟ وہ کام کرو، جو تم جانتے ہو۔"

"تجربہ حاصل ہونے سے کام آیا کرتا ہے، یُوں میرے پیشے کو پوچھتی ہیں تو میرا پیشہ کتابیں پڑھنا، رٹنا اور امتحان دینا ہے۔ کالج باپ کی موت پر چھوڑا، نوکریاں تلاش کیں، ہر جگہ "نو ویکینسی"، "نو ویکینسی"۔ بیوہ ماں، شادی کی عمر کی بہنیں، دو برس کی بے روزگاری، گھریلو تجارت شروع کی، بہنیں چیزیں بناتیں، میں گھر گھر جا کر بیچتا۔ اس میں گالیاں سُنیں، ٹھوکریں کھائیں، دھکے دے دے کر گھروں سے نکالا گیا۔ مگر کام چھوڑا اُس وقت جب نفع رنگ رنگ کر بھی امیروں کے گھر سے نہ نکلا، دو روپیہ کی چیز کی قیمت ہونے اور چاندی میں لپٹی ہوئی دیویوں نے ہم سے شروع کی اور ۸ سے آگے بات نہ کی۔

انجام پر بد معاش، بے ایمان کہا گیا۔ آخر میں تنگ آکر وہ کام چھوڑا۔ ماں اور بہنوں کے زیور بیچے اور ایک چھوٹی سی دوکان لے کر بیٹھا مگر اس دوکان کو بھی بڑی دوکانوں نے صاف نگل لیا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ صبح اور شام کو پھول بیچتا ہوں، دن بھر کام کی تلاش میں گھومتا ہوں۔"

برجیس نے سوچا۔ بولی۔ "ٹیوشن کرو گے؟ میرا بھانجہ میرے ساتھ رہتا ہے، چوتھے درجہ میں پڑھتا ہے۔ تم اُسے پڑھا سکو گے؟"

"میں نے ایف۔ اے تک پڑھا ہے۔ آپ سمجھ سکتی ہیں۔"

"میرے ساتھ چلو" اور برجیس اُسے گھر لے گئی۔

برجیس کا شوہر اُسی وقت اُٹھا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔ برجیس نے اُس سے ساری کہانی کہی، اور نوجوان سے بات کرنے کو کہا۔ برجیس کا شوہر ہنسا۔ اور اس نے انکار کر دیا۔

"اب تمہارا دماغ چل نکلا ہے، راہ چلتوں کو پکڑ لاتی ہو، پھول بیچنے والا ٹیوشن کرے گا؟ ایف اے تک پڑھا ہے، نہ سرٹیفکیٹ نہ کوئی اور نشانی، بات کیا کروں، بی۔ اے۔ ایم۔ اے دس دس روپے میں ملتے ہیں جنہیں پڑھانے کا تجربہ بھی ہوتا ہے۔"

"مگر باتیں کرنے میں کیا ہرج ہے، شاید پڑھا سکے۔ بیوہ ماں، شادی کی عمر کی بہنیں، تمہیں ترس نہیں آتا؟"

"حد ہو گئی ہے، کوئی انتہا ہے، چور اُچکا ہو گا، بہانہ بنا کر گھروں میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ نہیں نہیں، اُس سے کہو کہ چلا جائے میں ایسے آدمیوں کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔"

"خیر جیسی تمہاری مرضی، مگر تمہیں مستقبل سے ڈرنا چاہئے، کیا معلوم کل ہم کس رنگ میں ہوں، یہ کہتی ہوئی برجیس باہر نکلی اور جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اُس نے نوجوان سے معذرت کی "میرے شوہر تجربہ کار آدمی چاہتے ہیں۔ مگر لو میں تمہیں پانچ روپیہ دیتی ہوں، اس سے اپنے کاروبار کو بڑھاؤ کاش میں تمہیں کام دے سکتی۔ نوجوان نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا "بائی جی کام کہاں ہے۔ کام کوئی نہیں دیتا۔ خیرات اکثر دیتے ہیں، آپ یہ گلدستہ لے لیجئے، میں سمجھوں گا کہ بڑی قیمت پر بیچا ہے۔ برجیس نے گلدستہ لے لیا اور اُلٹے پاؤں واپس مڑی، اُس سے آنسو ضبط نہیں ہو رہے تھے۔

دن گزرے۔ تیز تیز۔ جلدی جلدی، ہنسی خوشی کے دن آئی آج

گزر جاتے ہیں۔ برجیس اور اُس کے شوہر کے تعلقات بدستور رہے اُکھڑے اُکھڑے۔ بکھرے بکھرے۔ شوہر دیر کو اٹھتا، دس بجے کام پر جاتا۔ دن ڈھلتے واپس آجاتا۔ شام کو دوستوں کا قافلہ آتا۔ ہلکی پھلکی شام بھاری بھرکم تماشوں میں گذر جاتی، رات دیر کو شروع ہوتی اور دیر میں ختم ہوتی برجیس معمول کے مطابق صبح سیر کو جاتی، واپس آتی تو شوہر کے ناشتہ اور کھانے کو دیکھتی، کپڑے سنبھالتی۔ شوہر کام پر چلا جاتا تو گھر کی صفائی کرتی کچھ سینا پرونا کرتی، کچھ دیر اخبار اور کتاب پڑھتی، شام ہو جاتی، شوہر کے دوستوں کی مہمان داری کرتی، چڑھتی رات تک اونگھتی رہتی۔ سب کے ساتھ جاگتی، رفاقت کے گُن دکھاتی پھر مطمئن رفیقِ حیات کے ساتھ میٹھی نیند سو جاتی۔

لیکن اُس نے خود ہی کہا تھا کہ مستقبل سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے نہ معلوم کل ہم کس رنگ میں ہوں، اُس نے سچ کہا تھا۔ نئے زمانے کی گاڑی کو انجن گھسیٹتا ہے پھر بھی وہ ٹھوکر کھا جاتی ہے، وقت کا پہیہ چلتے چلتے رک جاتا ہے، کبھی کوئی پُرزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کبھی زنگ اُسے حرکت سے روکتا ہے ایک دن برجیس کا شوہر دیر تک گھر نہ لوٹا۔ لمحات گئے۔ منٹوں کا قافلہ چلا، گھنٹے بجے، سورج کی سواری کا دھندلا نظارہ بھی ختم ہوا سیاہی پھیلی اور رات نے ڈیرا ڈالا۔ برجیس اب پریشان ہونے لگی۔ اُس کے شوہر نے کبھی اس قدر دیر نہیں کی تھی۔ آخر بڑی دیر کے بعد اُس کا شوہر لڑکھڑاتا ہوا نشہ میں چور آیا۔ برجیس کو دھکا سا لگا۔ اُس کا شوہر اور نشے میں، وہ بھی بے ہوش، مگر اُس نے ایسے موقع پر جھگڑنا مناسب نہ سمجھا۔ پیار سے پوچھا "کہاں رہ گئے تھے پیارے! تمہارے انتظار میں میری بُری کیفیت تھی" ؟

اُس کے شوہر نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا "میں اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ہوں"

"کیوں؟ سبب؟"

"کمپنی کو سیٹھ کرم چند نے خرید لیا ہے وہ منیجری کے عہدہ پر کسی اپنے آدمی کو رکھنا چاہتا ہے"

"تو پھر علیحدہ کر دیا" جبیں ستارے اُس کے گلابی رخساروں پر ٹوٹے۔ آنکھوں سے ایک موٹا قطرہ نکلا اور اُس کے شوہر کے کھلے ہوئے منہ میں جاکر ٹوٹ گیا، وہ اُسے بلا ارادے پی گیا، لیکن آنسو کا قطرہ مرچ کے عرق کی بوند تھی، وہ بے چین ہو گیا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا مگر برجیس دلاسے دینے پر پہلے ہی بول پڑی

"تو گھبرانے کی کیا بات ہے، دوسری ملازمت مل جائے گی، تم ہی تو کہا کرتے تھے کہ بمبئی میں بہت کام ہے۔ کام کی کمی نہیں ہے، کام کرنے والوں کی کمی ہے"

برجیس کے شوہر نے رُک رُک کر جیسے وہ کچھ یاد کر رہا ہو، سوچ رہا ہو کہا "مجھے جواب صبح ہی ملا تھا۔ سارا دن میں نے کام کی تلاش میں گزارا۔ ہر جگہ (No Vacancy) نو ویکینسی۔ نو ویکینسی تم شاید .....

"نہیں نہیں، پچھلی باتوں کو یاد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، ہمت نہ ہارو، آج نہیں تو کل کام مل جائے گا۔ برجیس نے شوہر کو پُرانی یاد کی جلن میں نہ مبتلا ہونے دیا۔ وہ برابر دلاسا دیتی رہی۔

"ہم فاقہ کرتے رہے۔ تمہاری اِن ڈھائی سال کی ملازمت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے کچھ پس انداز نہیں کیا ہے۔ ہمت سے کام لو پیارے، تقدیر، کام جلدی نہ بھی ملا، میں کام کروں گی۔ آخر میرا پڑھنا لکھنا ایسے موقع پر کام نہ آئے گا تو کب آئیگا، میں ٹیوشن کروں گی۔ کہیں نہیں مجھے کام ضرور مل جائے گا"

برجیس کا شوہر ایک لفظ نہ بولا، وہ اپنے فلسفی دماغ کو کھنگال رہا تھا وہ اس میں اپنی بڑی بڑی باتیں تلاش کر رہا تھا جس میں اُس نے غریبوں بھکاریوں اور بے روزگاروں کا مضحکہ اُڑایا تھا، رات اسی طرح گزر گئی۔

دن کو جاتے دیر نہیں لگتی، زمانے کو گزرتے وقت نہیں لگتا لیکن اگر دن لولے ہوں اور زمانہ لنگڑا، پھر ایک ایک منٹ پہاڑ ہو جاتا ہے، افلاس و نادار کا بڑھتا ہوا سیلاب ہے روزگاروں میں روز ہزاروں کے اضافے کرتا۔ یہ لولے لنگڑے اپنے ڈھانچے کو پا بیچ زمانہ کے ساتھ گھسیٹتے رہتے، ایک قدم چلنا دوبھر ہوتا۔ ایک ایک منٹ پہاڑ معلوم ہوتا۔ پھر بیچارے برجیس کے شوہر کا شمار، گنتی ؟

کامل دو سال گزر گئے اور اُسے نوکری نہیں ملی۔ ساری جمع پونجی خرچ ہو گئی، تمام اثاثہ بک گیا۔ برجیس نے ملازمت کرلی۔ مگر اُس سے اتنے پیسے نہ آتے کہ گزر ہو سکتی، ہم مرتے پر تو ٹوٹتے۔ دو سال میں دو بچے، پیسوں کی کمی کے باعث جذبات پر قابو پانے کے لئے سائنس سے فائدہ نہ اٹھایا

جا سکا اور جذبات کا انسان سے چولی دامن کا ساتھ ہے نہ کبھی تھمے ہیں اور نہ تھمینگے۔ برجیس کا شوہر مایوسیوں کی چوٹ اور دوڑ دھوپ، اُگنی (؟) ست زدگی ہو کر رہ گیا۔ اس کی بیماری دن بہ دن بڑھنے لگی۔ اُسے شراب کی مستقل عادت ہو گئی۔ بغیر شراب کے وہ گھر میں شیطان بنا رہتا اور شراب پی لیتا تو بیمار ہلا ڈالتے پڑ جاتے۔ دماغ کا توازن کھو دیتا۔ برجیس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے، نوکر الگ ستائے گئے۔ مکان تبدیل ہوا، پھر بھی گزر نہ ہو سکی۔ عزیزوں اور دوستوں نے ہمیشہ ٹکا سا جواب دیا۔

ایک دن صبح کے وقت برجیس حسب معمول سیر کی تیاریاں کرنے لگی اُس کے معمول میں ابھی فرق نہ آیا تھا۔ اُس نے ساری رات آنکھوں آنکھوں میں کاٹی، کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اُس نے بکس کھولا، گلاب کی چند سوکھی ہوئی پتیاں ریزہ ریزہ ہو کر اُڑ گئیں، بھولی ہوئی کہانی یاد آگئی، وہ روز اُن پتیوں کو دیکھتی اور نظر انداز کر دیتی۔ مگر آج اُس نے اپنی زندگی کی اُس پارینہ کہانی کی اچھی طرح یاد کی جس نے اُس کے مستقبل کی موجودہ صورت کی بنیاد ڈالی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ سر پکڑے بیٹھی رہی، پھر اُٹھی، کپڑے تبدیل کئے اور مکان سے نکلی۔ اُسے آج پھر ایک نوجوان ملا، یہ بھی پھولوں کا گلدستہ بیچ رہا تھا۔ برجیس نے حسرت سے اپنے بیگ کی طرف دیکھا۔ پانچ آنے پیسے کُل جمع اور مہینے میں ابھی پورے پانچ دن باقی۔ برجیس نے اس نوجوان کو پہلے کی نسبت زیادہ خوش، زیادہ مطمئن پایا، اُس نے نیچی نگاہیں کرکے جیسے وہ حالت کو چھپانا چاہتی ہو کہا:-

"بھائی مجھے نہیں چاہئے، میرے یہاں خود ہی پھول ہیں"

نوجوان نے پوری خود اعتمادی اور کاروباری انداز سے جواب دیا "کوئی بات نہیں، بائی جی، مگر ہماری دوکان میں پھولوں کے بیج بھی بکتے ہیں، ہماری دوکان نئی ہے، اور ہم نے دنیا کے بہترین پھولوں کے بیج منگائے ہیں۔ کسی دن .....

برجیس پوری بات سنے بغیر گزر جانا چاہتی تھی، نوجوان نے اسے محسوس کیا اور بات کاٹ کر ایک اشتہار اُسے تھما دیا۔

"پھولوں کی نئی دوکان، رنگ برنگ کے پھول، ہر جگہ کے پھول، اور ہر قسم کے پھول"

چند بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کی انجمن نے یہ کاروبار شروع کیا ہے ... وغیرہ وغیرہ۔ برجیس کی سمجھ میں آیا۔ دھند اُس کی آنکھوں سے چھٹا اُس نے نوجوان کو آواز دی اور دو آنے دے کر پھولوں کا گلدستہ لے لیا۔

اب اُس میں نئی شکتی آگئی تھی۔ اُس کے فاقہ زدہ مرجھائے ہوئے ڈھانچے میں نئی زندگی دوڑ گئی تھی، اُس نے اشتہار پڑھا۔ دوکان کا پتہ معلوم کیا اور بس کی سواری پر ۲ (؟) اور خرچ کرکے چل دی۔ دوکان کے پاس پہنچ کر وہ ذرا گھبرائی، زمانے نے کروٹ لی تھی۔ پہاڑ زمین پر آرہا تھا۔ زمین سکڑ کر پہاڑ بن گئی تھی۔ مگر اُس نے ہمت کی اور دوکان میں داخل ہوئی، وہی نوجوان جسے اُس نے پانچ روپے کے نوٹ دیئے تھے، پھولوں کی ایک انجمن میں بیٹھا ہوا تھا، دوکان عورت مرد سے بھری ہوئی تھی۔ برجیس نے ٹھنڈی سانس لی، اُس کی ٹھنڈی سانس نوجوان کے لئے ٹھنڈی بجلی تھی، اُس نے مڑ کر دیکھا

اوہ بائی جی۔ بائی جی۔ آپ۔ آپ۔ میرا نصیب۔ یہ بیوپار ....

برجیس نے اُسے نہ بولنے دیا۔ بھائی تم گھبراؤ نہیں، اب میں بڑے بول والی نہیں ہوں، میرا سر نیچا ہو چکا ہے، یہ اپنے اپنے نصیب کا بیوپار ہے میرا شوہر ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا، دو برس ہو گئے، تم نے اِس دو برس میں اپنے نصیب کا بیوپار بڑھایا اور میرے شوہر نے اپنے نصیب کی ٹھوکریں کھائیں اور آج وہ دم توڑ رہا ہے، میں تمہارے پاس .....

نوجوان نے بات کاٹتے ہوئے کہا "ایسا نہ کہئے میں سمجھ گیا، سب سمجھ گیا، میں آپ کا احسان بھول نہیں سکتا۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں"۔

برجیس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ باہر نکلی، نوجوان اُس کے پیچھے تھا، اُسی وقت ایک چھوٹا سا بچہ اُس کے پیروں سے لپٹ گیا "مائی بھوکا ہوں۔ بھوکا ہوں مائی،" برجیس نے اب آشا کا ٹمٹماتا ہوا دیا دیکھ لیا تھا، آخری اکنی اُسے دیدی نوجوان بولا۔ نصیب کا بیوپار بہن!"

"ہاں نصیب کا بیوپار بھائی" برجیس بولی۔ اور دونوں برجیس کے گھر چل دیئے۔ یہ نصیب کی کایا پلٹ تھی، مستقبل کا انجام تھا کل کے خواب کی تعبیر تھی۔

بھکاری

(از محمد جمیل احمد بی۔ اے بریلوی)

ایک خوددار اور غیور بھکاری تھا، دینے والوں سے زیادہ اُسے قبول کرنے میں تکلیف ہوتی تھی، وہ اپنا کشکولِ گدائی بگوں کے بڑھا چلا جا رہا تھا، لوگ پیسہ، روٹی، کپڑا لے کر بڑھے مگر وہ حقارت سے اِن پر مُسکراتا ہُوا اک ادائے بے نیازی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ لوگ اور اور چیزیں لے کر آئے مگر اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی، جیسے کوئی شکار اپنے پیچھے شکاری کو آتا دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔

دنیا نے حیران ہو کر کہا،

یہ بھکاری آخر کیا مانگتا ہے؟ یہ کیا چاہتا ہے؟

بھکاری جا چکا تھا،

بھکاری خلوص کی بھیک مانگنے نکلا تھا، مگر اِن میں سے کسی کے پاس بھی یہ دولت نہ تھی۔

بھکاری ہر جگہ گھوم کر ناکام واپس آ چکا تھا، ایک آستان بھی ایسا نہ ملا جہاں اُس کو بھیک مل سکتی۔ کشکولِ گدائی ویسے کا ویسا ہی خالی تھا، بھکاری کی آنکھوں میں حسرتیں ماتم کر رہی تھیں۔ خود بھکاری کے پاس خلوص کی ایک بڑی دولت تھی۔ مگر یہ اس کے لئے کافی نہ تھا، معلوم ہوتا تھا یہ دولت کسی اور کی امانت ہو۔ اس کی تمنا تھی کہ امانت والے کو اُس کی امانت سونپ دے اور اس سے خود اپنے لئے خلوص کی بھیک مانگے۔

بھکاری نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کے دروازوں پہ دستک دی، وہ متبسم چہروں کے ساتھ آئے اور اُس کو لے گئے۔ بھکاری نے خوش ہو کر وہ دولت ان پر نچھاور کر دی اور مسرت سے بیخود ہو کر اپنے آپ کو قبول کیا۔

مگر کچھ ہی عرصہ میں اُس نے محسوس کیا کہ وہ ہنوز پہلے کی طرح بلکہ اب سے بھی زیادہ بھوکا ہے، وہ خلوص ڈھونڈتا رہا اور خلوص اُس کو نہ ملا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی پیشکش بھی بیکار گئی، وہ ٹھکرا دی گئی، اُس کے خلوص کا جواب فریب اور دنیاداری کی مکروہ نمائش سے دیا گیا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ اُس نے کشکولِ گدائی اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اُس کے آنسو ٹپکے اور اُس کا خالی دامن اُن سے تر ہو گیا۔

اُس کے عزیزوں نے کہا،

اس کو کیا ہوا ہے،

اس کے دوستوں نے کہا،

یہ شاید پاگل ہو گیا ہے، ہم نے تو وہی کیا جو دنیا میں ہوتا ہے۔

وہ اِن سب سے کنارہ کش ہو گیا، وہ اِن سب کو چھوڑ کر نکل گیا —— اور اپنی قسمت کا نوحہ کرتا رہا۔ خلوص کی جو دولت بھکاری کے پاس تھی وہ اسی طرح بار بار لٹتی رہی، مگر پھر بھی کم نہ ہوئی، وہ ہنوز ایک امانت تھی!

دُنیا کی دولت اور خلوص میں اتنا ہی فرق ہے۔

دُنیا کی دولت اپنے لئے ہوتی ہے اور خلوص کی دولت دوسروں کے لئے، دُنیا کی دولت بہ مشکل ہاتھ آتی ہے اور بہ آسانی برباد ہو جاتی ہے، خلوص کی دولت سعی و کوشش کی دسترس سے باہر، قدرت کا ایک عطیہ ہے جو بار بار لٹنے کے بعد بھی اتنا ہی رہتا ہے۔

بھکاری اس عطیۂ قدرت کا امین تھا، مالک نہ تھا!

عرصہ گذر گیا اور بھکاری ٹھوکریں کھاتا رہا۔ آخر قدرت کو اس پر ترس آیا، وہ راستہ میں اتفاقاً اُس کی نظریں ایک ہستی پر پڑ گئیں اور اُسے ہم کو خیال ہوا کہ شاید یہ امانت دوسرے کو سپرد کر دینے کا اب وقت آ گیا ہے اس نے اپنی پھٹی ہوئی چادر سے وہ دولت کھول کر اس کے قدموں میں

ڈال دی۔ اس نے اپنا کشکول اٹھانے کے لئے ایک لمحہ کو سر جھکایا ــــ مگر وہ ہستی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ کچھ نہ ملنے پر بھی بھکاری خوش تھا۔ اُس نے وہ آنکھیں دیکھی تھیں اُن میں خلوص کا نُور دیکھا تھا ایک بجلی کی سی رَو بھکاری کے دل میں پیدا ہوئی، یہ اُمید کی جھلک تھی آخر بھکاری نے آستانہ پالیا تھا۔

بھکاری اب دونوں وقت آستانے پر جانے لگا، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُس کو اس درسے خلوص کی بھیک ملتی بھی تھی یا نہیں، مگر ہاں یہ ضرور تھا کہ اُس کی پیشکش ٹھکرائی نہیں گئی۔ چونکہ صاحبِ خانہ صاحبِ خلوص ہی تھا بھکاری کے لئے اتنا ہی بہت تھا، اُس نے سب عزیزوں و بیگانوں، سب دوستوں اور آشناؤں کو کھو کر یہ آستانہ پایا تھا:

دنیا والوں نے اس بھکاری اور آستانے کے بیچ میں آجانا چاہا

انھوں نے کہا،

یہ یہاں کیوں آتا ہے،

وہ لوگ جو خلوص سے کوسوں دُور تھے، ایک بندۂ خلوص پر معترض تھے۔ دنیا میں یہ ہوتا آیا ہے، مگر شاید وہ بھول گئے کہ اگر بھکاری کسی اور آستانے پر جاتا یا کوئی اور بھکاری اس آستانے پر آتا تب بھی وہ بغیر ایک حرف کی تبدیلی کے یہی کہتے،

یہ یہاں کیوں آتا ہے؟

اس لئے بھکاری نے اِن کے کہنے کا کچھ خیال نہیں کیا مگر ہاں اس کی خودداری نے اِس آستانے کو ضرور غور سے دیکھا۔ دروازہ اس کے لئے پہلے ہی کی طرح کھلا ہوا تھا، حسبِ معمول دونوں وقت جاتا رہا ــــ اور اس طرح اس کے دن گزرتے رہے۔

عرصہ تک وہ آستانہ خالی رہا۔ اور صاحبِ خانہ بیرونِ خانہ،

بھکاری حسرت بھری نگاہوں سے اُس کو دیکھتا اور خاموش ہو جاتا۔ اب بھکاری کے دن نہیں کٹتے تھے۔ وہ سوچتا تھا نہ معلوم اب یہ آستانہ کب آباد ہو، صاحبِ خانہ کب واپس آئے، وہ خوابوں میں دیکھتا کہ پہلے کی طرح اب بھی وہ دونوں وقت اِس آستانے پر جا رہا ہے۔ لیکن اس کو خوابوں کی ضرورت نہیں، خوابوں کی تعبیر کی تلاش تھی!

آخر صاحبِ خانہ آیا، بھکاری خوشی سے پھُولا نہیں سمایا، بھکاری شوق سے اس دروازے کی طرف بڑھا، مسرّت نے اُس کی رفتار میں ایک لغزش آمیز تیزی پیدا کر دی تھی، وہ جانتا تھا کہ دروازہ اُس کے لئے کھُلا ہوا ہے۔ وہ شوق سے بیخود، مسرّت سے مسرور بڑھتا چلا گیا مگر یکا یک ــــ ایک دھماکا ہُوا، دروازہ اُس کے لئے بند تھا اور اُس سے ٹکرا کر بھکاری نیم جاں ہو کر گر چکا تھا، کشکولِ گدائی ٹوٹ چکا تھا، بھکاری کی آنکھوں سے خون بہ رہا تھا۔ ایک جاں گسل کرب میں اس کی زبان سے ایک چیخ نکلی، دروازے میں جھری ہوئی وہی آنکھیں جو بھکاری نے کبھی رہگذر پر اور پھر اکثر اسی آستان پر دیکھی تھیں پھر دکھائی دیں، مگر آج ان میں خلوص کا نور نہیں، بے تعلقی کی وحشت تھی۔ اس کے بعد دروازہ پھر بند ہو گیا!

بھکاری نے اپنے قلب کے ٹکڑے اس آستان پر نچھاور کر دیے، اور ہچکی لے کر خاموش ہو گیا۔

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

صِنفِ نازک کا ایک یادگار مشاعرہ

مرتبہ :۔ حمیدہ سلطان احمد دہلوی

(گذشتہ سے پیوستہ)

حمیدہ سلطان

محبت بھی یہ جرأت آزما کیا!؟ — غمِ دل اِن سے کہدوں بر ملا کیا ؟
بقا کیا ہے محبت میں فنا کیا — ترے کشتوں سے اس کا پوچھنا کیا
اشاروں میں یہ کیوں عہدِ محبت؟ — نگاہوں سے یہ پیمانِ وفا کیا
تصور میں یہ مبہم سی محبت! — ہے یہ بھی کوئی اندازِ جفا کیا
تمہیں دیکھیں گے چشمِ رُوح سے ہم — ان آنکھوں سے تمہارا دیکھنا کیا
سب اسکی راہ تکتے ہیں چمن میں — شمیمِ لالہ و گُل کیا، صبا کیا
جنونِ بندگی کا عکس ہیں سب — خودی کیا، بیخودی کیا اور خدا کیا
شکستِ آرزو ہے اور مسلسل — ہماری زندگی کا پوچھنا کیا

غمِ آغازِ اُلفت ہی مرن ہے
حمیدہ شوقِ مرگِ انتہا کیا

بدرجہاں قریشی بدرؔ

فنا کیا ۔ زیست کیا ۔ رازِ بقا کیا ؟ — جب اُس کے ہیں۔ پھر اس کا پوچھنا کیا ؟
نہیں منت کشِ سحرِ مسیحا — دیا ہے اُس نے دردِ لا دوا کیا!
ہوئی مدہوش اک ساغر میں محفل — یہ مے شیشے میں تھی ۔ نورِ خدا کیا!

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۶۰ء

نہیں دُنیا میں کوئی محرمِ راز ۔۔۔ سُناؤں حالِ دل اپنا بھلا کیا!
سمجھ لو دولتِ کونین پالی ۔۔۔ مِلا ہے یہ دلِ درد آشنا کیا
نگاہیں لڑ رہی ہیں رازِ دل فاش ۔۔۔ ترے خاموش رہنے سے ہوا کیا
فنا میں ہے بقا کا رازِ پنہاں ۔۔۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

وفا ہی اُٹھ گئی دُنیا سے جب بدرؔ
پھر اپنے اور پرائے کا گلہ کیا!

آمنہ عفت

صلہ پائے گی آہِ نارسا کیا ۔۔۔ ہٹے گا پردۂ عرشِ علا کیا
میں ہر ذرّہ میں تجھ کو پا رہا ہوں ۔۔۔ مجھے دیر و حرم سے واسطہ کیا؟
جو غنچے سے جُدا جو گل انوکھا ۔۔۔ یہ ہے نیرنگیوں کی انتہا کیا
جھلک اُن کی کہیں دیکھی تھی دل نے ۔۔۔ اسی دن سے نہ جانے ہو گیا کیا
جبل اور دشت اک جلوہ نے پھونکے ۔۔۔ کرے چشمِ طلب پھر حوصلہ کیا؟
مرے اعمال نے کشتی ڈبو دی ۔۔۔ شکایت ہائے دستِ ناخدا کیا؟

ہر اک آنسو ہے روحِ عشق عفتؔ
دُر و گوہر سے اس کو واسطہ کیا

بلقیس جمال

اُسے پاتی بھلا عقلِ رسا کیا ۔۔۔ ہماری فہم و ادراک و ذکا کیا؟
گریباں چاک اور پلکوں پہ آنسو ۔۔۔ سحر ہوتے ہی پھولوں کو ہوا کیا؟
معاذ اللہ یہ دزدیدہ نظریں!؟ ۔۔۔ نظر کے سامنے دل کی خطا کیا
یہاں تو نذر کر دی جاں سی شے ۔۔۔ وہاں سے دیکھئے اب ہو عطا کیا
بجھا جاتا ہے میرے دل کی صورت ۔۔۔ چراغِ شامِ غم تجکو ہوا کیا

نہیں ہے جو اُسی کو ڈھونڈتی ہو
جمالہ اس جنوں سے فائدہ کیا؟

رابعہ پنہاں

مری مجبوریوں کی ہے خطا کیا ۔۔۔ نباہا تم نے بھی عہدِ وفا کیا
نیاز و ناز نامقبول دونوں ۔۔۔ نہ سمجھی میں کہ ہے تیری رضا کیا

ایشیا دسمبر ۱۹۳۰ء

مری چپ میں ہیں سو رازِ تمنا
کروں تمہیدِ شرحِ مدعا کیا

جبینِ حسن پر سرخی سی دوڑی
نگاہِ آرزو نے کہہ دیا کیا

نہ جانے کیا سمجھ کر ہنس پڑے ہیں
یہ ہے تمہیدِ ذوقِ اعتنا کیا

نہ تھا بھی بقدرِ یک نفس ہے
ہماری ابتدا کیا - انتہا کیا

شرارِ زیست ہے جہدِ عمل میں
سبق دیتا ہے دورِ آسیا کیا

ہے لرزاں صبحدم بابِ اجابت
اُٹھایا دل نے پھر دستِ دعا کیا

جفا و ناز کی خوگر ہوں پنہاں
خدا معلوم ہے رسمِ وفا کیا

نظم

"اُردو مری زباں ہے"

ہاں باغ پُر خزاں ہے
ہاں دل میں غم نہاں ہے

ہاں ہر طرف زیاں ہے
امید ابھی جواں ہے

اُردو مری زباں ہے

بدلے گا پھر زمانہ
کہدینگے پھر فسانہ

گونجے گا پھر ترانہ
اُردو ابھی جواں ہے

اُردو مری زباں ہے

آئے گی پھر مسرت
جائے گی پھر مصیبت

چھائے گی پھر محبت
ہر ذرہ شادماں ہے

اُردو مری زباں ہے

اب ہے ہراس تو کیا
ہے دل کو یاس تو کیا

میں ہوں اُداس تو کیا
موسم تو کامراں ہے

اُردو مری زباں ہے

ہمت سے کام لوں گی
اُردو کا نام لوں گی

گرتوں کو تھام لوں گی
جرأت ابھی جواں ہے

اُردو مری زباں ہے

بدلیں گی پھر ہوائیں
پلٹیں گی پھر فضائیں

برسیں گی پھر گھٹائیں
اللہ مہرباں ہے

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

اُردو مری زباں ہے

دل شاد ہے اثر کا روشن ہے مُنہ سحر کا
جائے گا غم قمر کا میرا بیاں۔ بیاں ہے
اُردو مری زباں ہے

قمر سلطان بیگم دہلوی

اُردو زبان

دلربائے ہند اے اُردو زباں نغمۂ شعر میں ہوا رطب اللّساں
یادگارِ سطوتِ اسلامیاں نورِ چشمِ مادرِ ہندوستاں
بادۂ مے خانۂ جنّت نشاں بادۂ رنگینِ جانِ مے کشاں
حاصلِ شیریں کلامیٔ زباں مایۂ صد نازشِ اہلِ جہاں
تجھ سے ہے آباد اپنا بوستاں

تجھ میں دلآویزیٔ گلزار ہے تجھ میں رنگینیٔ لالہ زار ہے
ہر گل جو عنبر بار ہے اس لئے گلشن ترا تاتار ہے
تیرا ہر غنچہ دہانِ یار ہے تیرا جو گل ہے گُلِ بے خار ہے
تیرا دامن بحرِ گوہر بار ہے تیرا سینہ معدنِ اسرار ہے
قبلۂ ہر شاعر و نثّار ہے

ہے سراپا کیف تیرا ہر سخن باعثِ وارفتگیٔ انجمن
نازشِ نغمہ سرایانِ چمن یعنی فخرِ نکتہ سنجانِ وطن
روح پرور قاطعِ رنج و محن شاہدِ اربابِ علم و اہلِ فن
ترا ہر نکتہ عروسِ سیم تن ماہ وش، حجلہ نشیں غنچہ دہن
اور تو اُس کا مناسب پیرہن

روشن آرا دہلوی

چشمہ

آکاش کے نیلے دامن کے تاریک و منوّر سایوں میں
سر سبز زمیں کے سینے پر قدرت کے حسیں کہساروں میں
پھولوں کی رنگین بستی سے کھیتوں کے حسین میدانوں میں

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۳ء

فطرت کے حسین ایوانوں میں
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

کہسار کے سنگین سینے کا — بے چین سا رازِ سربستہ
رخسار پہ کوہی میدان کے — اک اشک ہوں چشمِ فطرت کا
قدرت کے دوش پہ گیسو ہوں — بکھرا سا اور بکھرایا سا

فطرت کے حسین ایوانوں میں
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

کل دُنیا سپنوں میں گم ہے — اور سانس کی بھی آواز نہیں
سوتے ہیں نواسنجانِ چمن — مصروفیّت پرواز نہیں
کچھ محفل سونی سونی ہے — وہ نغمہ نہیں، وہ ساز نہیں

میں چپکے چپکے بہتا ہوں
تاروں کی چپ چپ چھاؤں میں

اس وقت فضا کی مدہوشی — پُرکیف ہوا کے جھونکوں سے
مہتاب کی زرّیں کشتی کو — تاروں کی چمکتی آنکھوں سے
پوشیدہ زمیں پر لاتی ہے — کہنے کو سُنہری کرنوں سے

ہر ذرّہ رشک سے تکتا ہے
میں چپکے چپکے بہتا ہوں

عائشہ حسین ثریّا کاکوروی

خزاں (کشمیر میں)

ہر طرف پیلے پڑے ہیں لالہ زار — شعلۂ جوالا ہے ہر اک چنار
یہ خزاں ہے یا کہ تکفینِ بہار؟

پتّوں کے آنچل پھنسے کانٹوں میں ہیں — اور چمن کا پیرہن ہے تار تار
کس قدر ظالم ہیں یہ لیل و نہار؟

بوڑھے بوڑھے پیڑ دولہا کی طرح — پہنے بیٹھے ہیں قبائے زرنگار
ہائے پیری میں جوانی کی بہار؟

سرفروشی کا یہ عالم باغ میں — ایک جھونکا لاکھ پتّے گُل ہزار
کر رہے ہیں اپنا اپنا سر نثار

برگِ لرزاں ہیں درختوں پہ کہ گل — موت کی آغوش میں ہیں بے قرار

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

اوڑھ کر پیلا کفن ہے سبزہ زار
مردہ پھولوں سے چمن دامن بھرے جیسے ماں کی گود میں بیٹا مرے
کیوں نہ ہو بجلی فلک پر بے قرار
ہے سفیدہ دور ہی سمٹا ہوا زرد ہے......ہیں وہ بے قرار
بزمِ یاراں پہ ہے ماتم کا مدار
آسماں پر ہیں صدائیں بے قرار اور زمیں پر خامشی ہے اشکبار
مر رہا ہے ایک ، اک زیرِ مزار
میٹھے میٹھے گیت گائے آبشار یا سُنائے قصہ ہائے دل فگار
ہم بھی روئیں وہ بھی روئے زارزار
ایسے روئیں رونے میں کھو جائیں ہم رواں رواں ہو ہمارا اشکبار
ہائے دل کو کس طرح آئے قرار
ایک جھولا آنسوؤں کا ڈال کر سسکیاں لے لے کے جھولیں بار بار
نالہ آئے گیت میں لب پہ یوں
برقرار اے بے قراری برقرار

منورما کول غمخوار۔ دہلوی

غفلت کا خواب

سنہری کرن نیلگوں آسماں پر ہویدا ہوا نور سارے جہاں پر
ہوا فرش گستردہ اب سیم و زر کا کہ شبنم پہ ہوتا ہے دھوکا گہر کا
وہ کوئل درختوں پہ کرتی ہے کوکو ہے قمری بھی گلشن میں کہتی تو ہی تو
اذانوں کا ہے شور اب مسجدوں میں اُٹھا شورِ ناقوس بھی مندروں میں
وہ دیکھو چلے مسجدوں کو نمازی جگاتا ہے دیوی کو ان کا پجاری
سُہانا سماں صبح کا تو نے کھویا بہاریں مناظر کا بھی لطف کھویا
کہاں تک تجھے اظہری کہہ سنائے
جو سوئے سو کھوئے جو جاگے سو پائے

اظہر سلطانہ معظم اظہری بھوپالی

دلی لکھنؤ کا مِلاپ

(محترمہ دل آرا بانو صاحبہ)

یاد ہیں وہ دن کہ جب آپس میں اک سنجوگ تھا
کوئی صدمہ تھا نہ غم تھا اور نہ کوئی روگ تھا

یاد ہیں وہ دن کہ تھی گلزارِ اُردو پر بہار
اور چلا کرتی تھی اترا کر نسیمِ مشکبار

یاد ہیں وہ دن کہ اُردو کی ترقی کیلئے
لکھنؤ اور شاہجہاں آباد دونوں ایک تھے

تھی انہیں دونوں کے دم سے جوئے اُردو کی بہار
اور انہیں دونوں سے تھا جادوئے اُردو کا نکھار

ان کے ہاتھوں ہی بنی سنوری تھی اُردو کی دلہن
ان کی کوشش سے ہی تھی آباد اس کی انجمن

لکھنؤ دلی سے ہی اُردو کی آرائش ہوئی
متحد کوشش سے ہی اُردو کی افزائش ہوئی

ایک دو دن سے نہیں صدیوں سے تھا یہ میل جول
یہ خدا جانے کہ بولے کس نے تھے بڑھ بڑھ کے بول

جن سے چرخِ فتنہ پرور کو بہانہ مل گیا
تیرِ فرقت کے لئے عمدہ نشانہ مل گیا

ہوگئی دونوں میں رنجش پڑگئی دونوں میں پھوٹ
چرخ نے دستِ خزاں سے کہدیا "گلشن کو لوٹ"

جاگ اُٹھے فتنے کرم پرور فرشتے سو گئے
لکھنؤ دلی کے دل جو ایک تھے دو ہو گئے

لیلیٰ اُردو تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
ہاں تری رنگیں شعاعیں نذرِ زنداں ہو گئیں

دل فسُردہ ہو گیا چہرہ فسُردہ ہو گیا
ہائے وہ ایک رشکِ جنت پھول مُردہ ہو گیا

ہائے وہ صدیوں کا دلی لکھنؤ میں اتحاد
ہائے وہ مدت کا کیفِ رنگ و بو میں اتحاد

کیا خبر تھی حادثوں کے ہاتھ سے لُٹ جائیگا
ساتھ جو مدت سے تھا وہ یک بیک چھُٹ جائیگا

لکھنؤ کو گھر سمجھ کر شاعرانِ دہلوی
جاکے رہتے اور بستے تھے بصد جوشِ دلی

متحد آپس میں تھے اک نیک مقصد کے لئے
ہو نہ سکتے تھے جُدا وہ ایک مقصد کے لئے

ہائے یہ کس کی فسوں سازی کا قابو چل گیا
کیا فلک تیری نگاہِ بد کا جادو چل گیا

ہے زباں بھی ایک رنگِ شاعری بھی ایک ہے
غور سے دیکھو تو طرزِ زندگی بھی ایک ہے

پھر بھی دونوں کے دلوں میں ہے جدائی ہائے ہائے
گلشنِ اُردو پہ کیسی آفت آئی ہائے ہائے

کاش اب پھر درمیاں سے رنگِ باطل دور ہو
کاش پھر دونوں دلوں سے حدِّ فاصل دور ہو

کاش صنفِ نازنیں کا دل ذرا جرأت کرے
مرد جس کو کر نہ سکتے ہوں اسے عورت کرے

یہ زنانہ شاعری کی محفلِ شعر و سخن
پھر بسا دے کوششِ پیہم سے اپنی انجمن

ہاں یہ بزمِ شاعری ہے نیک فالِ اتحاد
اب ہوئی حاصل ہمیں روحِ کمالِ اتحاد

ایک ہو جائیں گی دلی لکھنؤ کی راحتیں
ایک ہو جائیں گی دونوں خلوتیں اور جلوتیں

ہاں یہی محفل ہے دلی لکھنؤ کا وہ ملاپ
جس سے دونوں کے دلوں سے دور ہو جائیگا پاپ

ایشیا - دسمبر ۱۹۴۰ء

میری ماں دلّی کی ہیں ، والد کا گھر تھا لکھنؤ
حق نے ان دونوں کے صدقے میں مجھے دی آبرو

ہاں مرے نانا تھے دلی کے وہ خواجہ میر درد
جن کے آگے شوخ رنگِ شاعری ہوتا تھا زرد

خوش نصیبی سے مری شادی بھی دلّی میں ہوئی
کیوں نہ ہو جاتی جواں میری امیدوں کی کلی

لکھنؤ دلّی سے میری والدہ بیاہی گئیں
جن سے ساری بیگماتِ لکھنؤ دل شاد تھیں

اور ہم پھر لکھنؤ سے چل کے دلّی آ گئی
اس میں جو کچھ بھی کرامت تھی مری شادی کی تھی

خوش نصیبی سے وہاں ہے میرا سسرالی مکاں
خانِ دوراں خاں کا دلکش پاک مرقد ہے جہاں

خاں صاحب تھے مرے نانا کے جدِّ نامدار
اپنی رحمت سے مجھے بخشا ہے حق نے یہ وقار

کوئی بی بی اس کہانی کو نہ سمجھیں بے محل
یہ نہ سمجھیں دب گیا قصّہ سے کیوں رنگِ غزل

بات یہ ہے میرا قصّہ ہے مسرت کی دلیل
میرا قصّہ اتحادِ باہمی کی ہے سبیل

لکھنؤ دلّی کے دل آپس میں پھر مل جائینگے
از سرِ نو غنچہ ہائے آرزو کھل جائیں گے

حق تعالیٰ سے دل آرا کی ہے روز و شب دعا
دونوں مرکز ایک کر دے دونوں بچھڑوں کو ملا

پھر دلوں سے لے خدا زنگِ کدورت دور کر
اب جو ناخوش ہیں انہیں پھر شاد کر مسرور کر

عورت

(باجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

حلقہ ظلمات میں شمعیں جلا سکتی ہے تو
آرزوؤں کے خنک موتی لُٹا سکتی ہے تو

اللہ اللہ تیرے حُسن و رنگ کی تابانیاں
حاملانِ عرش کو حیراں بنا سکتی ہے تو

یاس کی شکلیں، الم کی صورتیں، آہوں کی آگ
ایک ہلکی مُسکراہٹ سے مٹا سکتی ہے تو

اہلِ ثروت کی کُلاہیں سینکڑوں شاہوں کے تاج
بارگاہِ حُسن میں اپنے جُھکا سکتی ہے تو

اک تبسّم کی لپک سے اک نظر کے نور سے
ساری دُنیا کو بہشتِ نو بنا سکتی ہے تو

اک عجب رنگیں کرشمہ اک انوکھی شے ہے تو
کون ہے، اپنی حقیقت کیا بتا سکتی ہے تو؟

مُسکراہٹ سے ستاروں کے اُڑا سکتی ہے ہوش
قدسیوں کے عزم کی تعمیر ڈھا سکتی ہے تو

بُجھ رہے ہیں دِل شرر خانوں میں کچھ باقی نہیں
آج بھی احساس کا خرمن جلا سکتی ہے تو

اک اشارے میں بدل سکتی ہے ماحول و نظام
اک صدا سے ساری دُنیا کو جگا سکتی ہے تو

خون سے سینچا ہے تو نے اپنے ارجن کا شباب
آج بھی ہر فرد کو ارجن بنا سکتی ہے تو

کانپ اُٹھیں آفاق کے دِل تھرتھرا جائے زمیں
عزم ہمّت سے کرشمے وہ دکھا سکتی ہے تو

ایشیا۔ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

کون کہتا ہے تجھے کمزور اے تکمیلِ زور
قصرِ استبداد کی بُنیاد ڈھا سکتی ہے تو
آہنی تیرے ارادے عزم طوفانی ترے
گود میں مایوسیوں کے مُسکرا سکتی ہے تو
نوجواں اکبر کی رَن میں بھینٹ دے سکتی ہے تو
طورِ قربانی کے دُنیا کو دکھا سکتی ہے تو
وقتِ شورش ایک طوفاں بن کے بل کھاتی ہے تو
راہِ ہمت میں بھلا کب ہچکچا سکتی ہے تو
دستِ نازک سے اُلٹ سکتی ہے دُنیا ظلم کی
دھجیاں سرمایہ داری کی اُڑا سکتی ہے تو
جو زمیں سے کوہساروں سے نہ ہرگز اُٹھ سکے
بوجھ وہ کمزور شانوں پر اُٹھا سکتی ہے تو
ماہِ حیدر جب تیری آغوش میں طالع ہوا
کیا کرشمہ پھر وہ دُنیا کو دکھا سکتی ہے تو

خاک میں فرسودہ رسموں کو ملا سکتی ہے تو
ہوش میں سوئی ہوئی دُنیا کو لا سکتی ہے تو

صفیہ شمیم ملیح آبادی

وعدہ

وہ شاہکار اور یادگار نظم جو ۲۳ نومبر ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے تاریخی اور عظیم الشان مشاعرہ میں "ساغر" نے براڈکاسٹ کی اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ نشان زدہ بند براڈکاسٹ کئے گئے۔

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ص
نہ پھوٹ پھوٹ کے رو، لوٹ آؤں گا اِک دن
شرارِ عشق کو بجلی بناؤں گا اِک دن
چراغِ جبرِ مشیّت بُجھاؤں گا اِک دن
جہانِ عہدِ وفا جگمگاؤں گا اِک دن

میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ص
کبھی میں آؤں گا کلیوں کی آبرو بن کر
حجابِ گُل میں کبھی کاروانِ بُو بن کر
چمن کی خاک سے پھوٹوں گا میں نمو بن کر
ترے شباب کی نوخیز آرزو بن کر
نسیم و نکہت و شبنم پہ چھاؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

۴ سکوتِ شام میں اُمید و بیم بن کے کبھی
سکوتِ شب میں سحر کا ندیم بن کے کبھی
نمودِ صبح میں روحِ نسیم بن کے کبھی
گلوں سے پھوٹ پڑوں گا شمیم بن کے کبھی

ترے مشام کی جنّت بساؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

جگاؤں گا تجھے ہمرازِ خامشی بن کر
تمام رات محبّت کی زندگی بن کر
سجاؤں گا تری راتوں کو چاندنی بن کر
برس پڑوں گا ستاروں سے روشنی بن کر

جمال و نور کے دریا بہاؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

۵ عنانِ شوق کسی سمت موڑتی ہی نہیں
کسی سے رشتۂ جذبات جوڑتی ہی نہیں
تعلقات کے بندھن کو توڑتی ہی نہیں
تری نظر مرے دامن کو چھوڑتی ہی نہیں

یہ ضد، یہ جبر!؟ میں کیوں کر نہ آؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

۶ نہ دیکھ جابر و مجبور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ تشنۂ و مخمور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ رشکِ صد انگور انکھڑیوں سے مجھے
نہ دیکھ اپنی طرح چور انکھڑیوں سے مجھے

خود اپنے ہاتھ سے تجھ کو پلاؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

۷ جو تیرے لب میں ہے اس نطقِ بے زباں کی قسم
تری زباں میں جو ساکت ہے اُس بیاں کی قسم
تری نگاہ کی غمّاز داستاں کی قسم
جو تیری روح میں ہے اُس فسانہ خواں کی قسم

تمام رات کہانی سُناؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

——ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

انھیں حسین کناروں کے سایہ میں شب بھر
انھیں جمیل نظاروں کے سایہ میں شب بھر
انھیں جوان بہاروں کے سایہ میں شب بھر
انھیں بلند چناروں کے سایہ میں شب بھر
بہارِ جشنِ شگوفہ مناؤں گا اِک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دِن

۵
شعاعِ مہر جھجھک کر نظر جھکا دے گی
بہارِ طرّۂ گل ہائے تر جھکا دے گی
نسیم دوڑ کے تاجِ سحر جھکا دے گی
شگفتِ گل ترے قدموں پہ سر جھکا دے گی
کنول کی اوٹ سے یوں مسکراؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دِن

یہ کوہسار، یہ چشمے، یہ آبشارِ رواں
شگوفہ زار کا یہ عکس، یہ بہارِ رواں
یہ موج موج سرِ آب جو دیارِ رواں
یہ شاخسارِ مقیم اور یہ شاخسارِ رواں
اِسی ہجومِ بہاراں میں آؤں گا اِک دِن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ربابِ عشق ہے برسوں سے بے صدا ہر چند
ہے مدّتوں سے مرا ساز بے نوا ہر چند
بنا دیا ہے زمانہ نے بے وفا ہر چند
میں آج قدرت و آدم سے ہوں خفا ہر چند
نہ سوچ تجھ سے بھی آنکھیں چُراؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

ترے قریب بہ ہر رنگ و طور آؤں گا
میں رات بن کے شبستاں میں بار پاؤں گا
میں خواب بن کے تری آنکھ میں سماؤں گا
لباس و رنگ کے پردے میں جگمگاؤں گا
ترے وجود کی خوشبو چُراؤں گا اِک دِن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء

یہ شعلہ زارِ محبت ہے یا جمالِ فریب
ہوا ہے دِل سے کئی بار اتّصالِ فریب
جنونِ عشق کی دولت ہے یا وبالِ فریب
جنونِ عشق حقیقت ہے یا کمالِ فریب
جنونِ عشق کو پھر آزماؤں گا اِک دِن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اِک دن

۴
جبیں پہ صبح لئے، بازوؤں پہ رات لئے
نظر نظر میں غمِ عشق کا ثبات لئے
جلو میں اپنے کرم ہائے کائنات لئے
کبھی یہ دیکھتا ہوں تو ہے شش جہات لئے
کبھی یہ سوچتا ہوں کچھ نہ پاؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

۵
مدام بارِ محبت اُٹھا نہیں سکتا
وفا کا نغمۂ جاوید گا نہیں سکتا
قریب و دور کا مدفن بنا نہیں سکتا
تجھے یہ ڈر ہے کہ میں جا کے آ نہیں سکتا
مجھے یہ خوف ہے تجھ کو نہ پاؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

۶
نہ پوچھ لالہ رُخ و جنّتِ جمال نہ پوچھ
لرز نہ جائے ترا عالمِ خیال نہ پوچھ
میں جا رہا ہوں جہاں اُس جہاں کا حال نہ پوچھ
شروع بھوک ہے اور بھوک ہی مآل نہ پوچھ
فسانۂ غمِ آدم سناؤں گا اک دن
میں جا رہا ہوں مگر پھر بھی آؤں گا اک دن

۷
شگفتِ تیز کو نکہت کچل نہیں سکتی
شمیم حجلۂ گل سے نکل نہیں سکتی
نزاکتوں سے یہ گاڑی سنبھل نہیں سکتی
حیات صرف محبت سے چل نہیں سکتی
عجیب راز ہے لیکن بتاؤں گا اِک دن

ساغر

(باجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

ایشیا دسمبر ۱۹۴۰ء

کیفیات

(دوسرا رُخ)

محبّت کا یہ انقلاب اللہ اللہ — سزا دے رہے ہیں سزا پانے والے

زمانے کی گردش کا اعجاز دیکھو — کہ خود یاد کرتے ہیں یاد آنے والے

مرے سامنے آج حیراں کھڑے ہیں — وہ دامن بچا کر گذر جانے والے

قیامت ہے آنکھوں سے آنسو گرائیں — نگاہوں سے انوار برسانے والے

اُنھیں التجاؤں سے فرصت نہیں ہے — جو تھے التجاؤں کے ٹھکرانے والے

خرابِ محبّت بنے پھر رہے ہیں — جنونِ محبت سے گھبرانے والے

فریبِ محبّت سے بھی مطمئن ہیں — حقیقی محبّت کو جھٹلانے والے

کیف مرادآبادی

مرزا نظام شاہ لبیب دہلوی

نہ رونق رنگ و بُو سے ہے نہ رتبہ ہے بہاروں سے
زمیں کو عزتِ فکر و عمل ہے دل فگاروں سے
ہزاروں دل بہ شکلِ گل ہیں پیدا لالہ زاروں سے
روئی کے پھوئے دست و گریباں ہیں شراروں سے
فلک پر پاؤں دھرتی ہے زمیں ان کردگاروں سے

کثافت برق کی مغز و غدود و شحم بنتی ہے
مریض عشق بنتی ہے، بتِ بے رحم بنتی ہے
لطافت برق کی انساں میں عقل و فہم بنتی ہے
منقّش ہو کے ذہنوں میں خیال و وہم بنتی ہے
تڑپ اُٹھتی ہے جو بجلی لہو کے آبشاروں سے

ارادہ جنبشیں دیتا ہی اور ارماں مچلتے ہیں
نفس کی ڈور تھامے ہوش گرتے اور سنبھلتے ہیں
یکایک عالمِ بے لفظ کے چشمے اُبلتے ہیں
نہ جانے کس طرح لفظوں کے سانچے میں یہ ڈھلتے ہیں
برستے ہیں جو خطرے دل پہ قدرت کی پھُواروں سے

زباں کیا ہے، نفس کی اونچ نیچ اور اس کا پیچ خم
وگرنہ تھا جہانِ اسم و جسم اک کاکلِ برہم
نسیم جستجو ٹپکا رہی ہے دمبدم شبنم
بہارِ گل بداماں ہوگیا الفاظ کا عالم
برستے ہیں سماعت پر یہی گُل شاخساروں سے

ضمیر اک ایک کو تعلیم کوشش دیتی جاتی ہے
اُجالا صبحِ نورانی کا دانش دیتی جاتی ہے
نصیحت کرتی جاتی ہے، نکوہش دیتی جاتی ہے
اثیری موج اک اک دل کو جنبش دیتی جاتی ہے
بڑھاتی جارہی ہے صورتوں کو برق پاروں سے

یہ سارا شکل کا عالم ہو سب پتلے ہیں صورت کے
پجاری ہیں حواس و ہوش کس نادیدہ لذت کے
کہ گویا یہ بھی کوئی بول ہیں مطرب کی دُھرپت کے
فضا میں گونجتے جاتے ہیں نغمے سازِ فطرت کے

نوائیں جُوں کی تُوں لپٹی ہوئی ہیں پھر بھی تاروں سے

نہ ماہیت میں معنی ہیں، نہ ہیں معنی حقیقت میں
نہ ہیں حسنِ تخیّل میں، نہ ہیں حسنِ طبیعت میں ۱۱۴
نہ ظاہر میں نہ باطن میں، نہ صورت میں نہ سیرت میں
اچھوتے ہیں معانی جُوں کے تُوں آغوشِ فطرت میں

زبان و دل مرقّع کھینچتے ہیں بس اشاروں سے

مگر معنی کے وہ سائے جو دل کے دل میں رہتے ہیں
وہ طوفاں ہیں کہ جو دریائے بے ساحل میں رہتے ہیں
ہمیشہ مستعد فرقِ حق و باطل میں رہتے ہیں
مثالِ تیغ چشمِ مردمِ کامل میں رہتے ہیں

یہی چشمے ہیں جاری لامکانی شہسواروں سے

نظر سے گفتگو

عقل کا اور مدّعا عشق کی اور آرزو
اُس کو شکیب کی تلاش اس کو تڑپ کی جستجو

گرمیٔ انجمن تری میرا مذاقِ ہائے ہُو
خندۂ دل کشا ترا میرے چمن کی آبرو

جذب و کشش ہے زندگی پیکرِ کائنات کی
دعوتِ عشق شش جہت جلوۂ حُسن چار سو

عرضِ نیازِ عشق سے نطق بھی آشنا نہیں
ہم نے حضورِ یار میں کی ہے نظر سے گفتگو

ٹوٹ چکے ہیں سلسلے گرچہ تعلّقات کے
تجھ سے جُدا ہوئے نہ ہم، ہم سے جدا ہُوا نہ تو

کِس کی بہارِ حُسن کا مجھ کو خیال آگیا
آج مری نظر میں ہے ایک جہانِ رنگ و بو

میرا مذاق معصیت، تیرا کرم کا مشغلہ
میری سرشت میں گناہ، عفوِ گناہ تیری خو

عہدِ تعلّقات کا دیکھئے کیا مآل ہو
فطرتِ عشق مضطرب، حسن کی طبع جنگجو

واقفِ کفر و دیں نہیں بیخبرانِ میکدہ
دیر و حرم سے پاک ہے مشربِ ساغر و سبو

گر کے رہے گی بزم پر برقِ جمال دیکھنا
اُٹھ کے رہے گا ایک دن رُخ سے نقابِ مشکبو

نازشِ زہد و معصیت کوئی بھی معتبر نہیں
تیرا عتاب بے سبب، تیرا کرم بہانہ جو

گرچہ اُمید و آرزو روحِ روانِ عشق ہیں
کاش رہے نہ عشق میں کوئی اُمید و آرزو

تاباںؔ دہلوی

آج تک

فراقؔ گورکھپوری

کچھ مضطرب سی عشق کی دنیا ہے آج تک
جیسے کہ حسن کو نہیں دیکھا ہے آج تک

مدّت ہوئی کہ حسن سے مانوس ہو چکے
دل بے قرارِ عرضِ تمنّا ہے آج تک

افلاک سے دبے ہیں کب افتادگانِ عشق
پستی حریفِ اوجِ ثریا ہے آج تک

اُس ایک دورِ جام کو مدّت گذر گئی
دل کو تری نگاہ کا دھوکا ہے آج تک

یوں تو اداس غمکدۂ عشق ہے مگر
اس گھر میں اک چراغ سا جلتا ہے آج تک

تصدیق تو نہیں مگر افواہ سی ہے کچھ
تیری کسی سے رنجشِ بیجا ہے آج تک

مدّت ہوئی کہ عشق مٹا کوئے یار میں
رہ رہ کے کچھ غبار سا اٹھتا ہے آج تک

اس راز کی خود اہلِ وفا کو خبر نہیں
جس طرح تیرے غم نے نباہا ہے آج تک

ہم بیخودانِ عشق تو کچھ شادماں سے ہیں
سنتے ہیں دل میں درد سا اٹھتا ہے آج تک

پورا ابھی کرکے ہم جسے پورا نہ کر سکے
دل سے وہی نظر کا تقاضا ہے آج تک

ویرانیاں جہان کی آباد ہو چکیں
جز اک دیارِ عشق کہ سونا ہے آج تک

پرچھائیاں نشاط و الم کی ہیں درمیاں
اے دوست وصل و ہجر کا پردا ہے آج تک

ساری رگوں میں ہیں غمِ پنہاں کی کاوشیں
جاری کشاکشِ غمِ دنیا ہے آج تک

یہ عمر بھر فراقؔ بجا دل گرفتگی
پہلو میں کیا وہ درد بھی رکھّا ہے آج تک

ایشیا

سب کچھ تھا پر نہ پلٹی رُوٹھی ہوئی جوانی!

ٹھہر ٹھہر، کہ دو عالم ہلائے دیتی ہے
ترے لبوں پہ نہیں تیرے اختیار کی لے
نشاط میں کہیں سامانِ غم نہ ہو جائے
بدل گئی ترے نغمے سے آبشار کی لے

کچھ یاد ہے کشمیر میں سبزے پہ لبِ جو
ساغر میں بھری تھی مئے انگور بہا دی
اتنا کسی انساں نے پیا ہوگا نہ پانی
جتنی مجھے کافر تری آنکھوں نے پلا دی

کشمیر میں جمی تھی اک دوپہر کو محفل
احساسِ زندگی جب قسمت مٹا چکی تھی
سبزے کا فرش تھا اور پھولوں کا شامیانہ
چشمے کی بے قراری جذبے جگا چکی تھی
اک سُرخ سُرخ شے پر تھیں مضطرب نگاہیں
کچھ جام میں تھی اور کچھ آنکھوں میں آ چکی تھی
مسحور ہو رہی تھی دل کی طرح فضا بھی
اک مطربہ ستمگر نغمہ سُنا چکی تھی
سب کچھ تھا پر نہ پلٹی رُوٹھی ہوئی جوانی
ہم نے بہت پکارا وہ دُور جا چکی تھی

نجم آفندی اکبر آبادی

جوہی کی کلیاں

عزیز جہاں بیگم اداؔ بدایونی
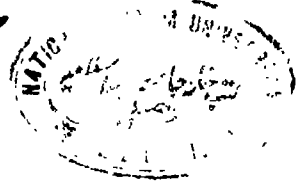
بہارِ خلد منظر جلوہ گر ہے — ہجومِ سبزہ تا حدِّ نظر ہے
ہوائے مست ہی بہکی ہوئی سی — فضائے عنبریں مہکی ہوئی سی
سکوتِ شب تحیّر آزما ہے — جمالِ ماہ کیفیّت فزا ہے
ہوائے نرم و نازک جیسے آہیں! — کہ خوابِ ناز کی بے ربط سانسیں
سپہرِ نیلگوں اور نورِ اختر — کہ اوڑھی ہو حسیں فطرت نے چادر
فلک سے مہ کی بے تابانہ کرنیں — وفورِ شوق سے مستانہ کرنیں
برائے سیرِ گل آئی ہوئی ہیں — زمیں تا آسماں چھائی ہوئی ہیں
ستارے آسماں سے گر پڑے ہیں — کہ جوہی کے شگوفے کھل رہے ہیں
نزاکت آفریں رعنا سمن بر — تخیّل کے نشاط انگیز پیکر
کتابِ حسن کا عنوانِ رنگیں — جوانِ فطرت کا ارمانِ بہاریں
جبینِ غنچہ پر شبنم نہیں ہے! — عرق آلود روئے نازنیں ہے
یہ کلیاں ہیں کہ ماضی کی وہ یادیں — جنھیں ہنگامہ ہائے غم بھلا دیں
بڑے نازوں کی یہ پالی ہوئی ہیں — مئے عشرت کی متوالی ہوئی ہیں

برائے نذرِ شاعر خونِ دل سے
یہ گلدستہ بنایا ہے زمیں نے

——— ایشیا

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

کسوٹی

(چند نئے رسالے اور کتابوں پر رائے)

(مسلسل)

داستان (لاہور)

سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ اڈیٹر خلیل احمد بشیر ہندی۔ سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۶ر ۲۵ ٹیمپل روڈ لاہور

اِن حالات میں ہر اُس شخص کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے جو قلم یا زبان سے فضا میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کچھ لینے کے یہ معنی ہیں کہ وہ فضا کو اپنے کہنے کے مطابق بنانا چاہتا ہے۔

داستان میں مکتوب ابراہیم میں وہ نئے اخلاقی رجحانات ہیں جنکو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے اور جو واقعی نئی زندگی کے بنیادی اجزا و عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، ان اجزاء کے ساتھ ساتھ ملّا صاحب مابعد الطبیعات کا مضمون کوئی مناسبت نہیں رکھتا جنکو فلسفہ کے جھٹلانے کی ضرورت اس بیسویں صدی میں آپڑی ہے۔

اس سائنٹفک عہد میں وہ بدوی دَور کے روایات کو زندہ کرنا چاہتے ہیں اور انقلابی لٹریچر کے خالقوں کو کوستے ہیں یہی نہیں بلکہ وہ درصنعت کا اقتباسی مضمون لکھ کر یہ یقین رکھتے ہیں کہ اُنھوں نے انقلاب کا بند باندھ دیا اور اس کے بعد "رشد و ہدایت" کے سلسلے کو بذریعہ خط و کتابت جاری کرنے کا اعلان فرماتے ہیں۔

ہم ایسے لوگوں سے دریافت کرتے ہیں کہ کارواں کو لے کر رہبر کا منزل پر نہ پہنچنا اِدھر اُدھر ویرانوں میں بھٹکتے رہنا کیا اس کی گمراہی پر کافی دلیل نہیں ہے!؟

اگر کافی دلیل ہے تو نسلِ آدم کا کارواں جن اصولوں کی رہبری میں صدیوں سے بھٹک رہا ہے کیا یہ مسلسل اور مستقل گمراہی اُن اصولوں کی تردید کے لئے ناکافی ہے۔

ماہر صاحب کے مضمون فلسفہ و مذہب کے ساتھ ہی بعض مضامین مثلاً بیاکفسکی "ادب میں نیا نقطۂ نظر" افسانہ نگار کی نیت کا افسانوں میں کمزوری لکھ دا آتا خوب ہیں، بشیر ہندی صاحب کا باغی ابھی نامکمل ہے اس لئے اس کے متعلق رائے دینا قبل از وقت ہے

نظموں میں مائل لطیف، اس کی سہیلی اچھی نظمیں ہیں لیکن ان تمام اچھائیوں میں زیادہ کشش پیدا کرنے کا امکان باقی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ بشیر اور خلیل کی مساعی داستان کو اس کے نام کی نسبت سے زیادہ بلند کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔ موجودہ حالت میں بھی رسالہ ترقی یافتہ عناصر اپنے اندر رکھتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں اور اُس کے احساسات کا دُوربینی کے ساتھ مطالعہ و مشاہدہ کیا جائے اور داستان کے لفظ لفظ میں وہ حقیقت پیدا ہو جو ہزار کرب کے ساتھ واقعی ہندوستانی نوجوانوں کی رگ و پے میں تشنج پیدا کر رہی ہے۔

آخر میں ایک بات اور اپنے دوستوں سے کہوں گا کہ نظموں کے حصّے کو "مفلوج رومانیت" سے محفوظ رکھیں اور آزاد نظموں کی بہتات سے بھی بچیں "آزاد نظم" کی حیثیت محض تجربات کی ہے اس کی تخلیق و ترویج کو خود اس کی اہلیت ہی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ لیکن ان نظموں میں بھی معیار قائم رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

ناظرین ایشیا داستان کو ضرور منگا لیں اور دیکھیں، وہ پڑھنے اور دیکھنے کے قابل ہے۔

چاند (سہارنپور)
مدیر اعزازی ناز صاحب انصاری
مالک و مدیر، ایم اسلم غزالی
مدیر ذکیہ خاتون نکہت شاہجہانپوری
قیمت سالانہ (عـہ)

۱۹۳۶ء میں جاری ہوا، سیدھا سادھا عوام کے پڑھنے کے لئے رومانی رسالہ ہے جس میں ترقی اور سنورنے کے جراثیم معلوم ہوتے ہیں ایسے رسالے میں تنقید اور عوام کے دکھوں کے بارے میں بھی کچھ ہونا ضروری ہے اگر اس کو محض "واقعیاتی رومانی ادب" ہی کا آرگن بنا دیا جائے تو یہ ادبی طور پر مفید اور تجارتی طور پر کامیاب ہو سکتا ہے۔

نظموں اور غزلوں کا کوئی معیار نہیں ہے مگر اتنا معیار ضرور ہے کہ نگاہ کو کھینچ لیتی ہیں، مگر پڑھتے ہیں تو اغلاط سے پُر، ضرورت ہے کہ ناز صاحب اس پر وقت صرف کریں اور ذکیہ صاحبہ مزید توجہ دیں، آج جب انسانی دنیا میں زندگی قیمتی ترین چیز ہو گئی ہے، ذہانت اور وقت کا بیجا استعمال نہیں ہونا چاہئے!؟

سہیل (گیا) چندہ سالانہ ۳ سے ہششماہی ۱۲؍
ادارہ عارف سنبھاردی، قیصر عثمانی

صوبۂ بہار سے نکلنے والے رسائل میں یہ بھی ایک رسالہ ہے جس کی خواہش ہے کہ اُن اہلِ قلم اور شعراء کی پشت پناہی کرے جو اپنے اندر جوہر رکھتے ہیں اور اُردو زبان کے لئے آگے چل کر بہت مفید ہو سکتے ہیں، مگر اپنے اس مقصد میں اس کو ابھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ ادب اور اس کے معیار کے متعلق ادارہ ایک روشن راستہ اختیار کرے

ہر چند کہ سہیل کے کرتا دھرتا ترقی پسند ادب سے ناواقف معلوم نہیں ہوتے مگر سہیل بھی اپنی شکل اور کام کے لحاظ سے یکسانیت کے ساتھ ترقی پسند رسالہ معلوم ہونا چاہئے۔

اس کے سرورق کی مصوری کا کونسا "اسکول" ہے؟ کم از کم میں تو یہ [illegible] قاصر ہوں، اس سے تو زیادہ بہتر ہے کہ سرورق سادہ ہو۔ مضامین و [illegible] ہو سکتے ہیں لیکن آج جو شخص کسی ادارہ میں شریک ہوتا ہے اُس کے لئے لازمی ہے کہ وہ وقت اور ماحول کے مطابق ادب پیش کرے، اب بے روح غزلوں اور بے جان کہانیوں کا زمانہ نہیں رہا۔ بہار میں سہیل جیسے افسانہ نگار حسین امام صاحب اور جمیل مظہری جیسے شاعر، اختر جیسے ادیب اور ترقی پسند ادیبوں کا پورا ایک گروہ موجود ہے۔ صاحبانِ جرائد کو چاہئے کہ وہ ان اصحاب کی ہمدردیاں حاصل کریں اور ان حضرات کو چاہئے کہ اگر کوئی گوشۂ عافیت سے ان کو اُٹھانے کے لئے نہیں آتا تو یہ از خود میدانِ عمل میں آئیں اور بہار کی ادبی قیادت کا فرض پورا کریں۔

مارچ و اپریل ۱۹۴۲ء میں سہیل نے ایک خاص نمبر بھی شائع کیا تھا۔ عام نمبروں سے اس کا معیار یقینی بلند تھا۔ مقالات میں نواب نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی مرحوم کا خط "طلسم ہوش رُبا" فردوسی اور اسدی، رباعی نگار اور شاد عظیم آبادی مسلمانوں کے زمانہ حکومت میں ہندوستان کا نظام تعلیم فرقہ بندی کی نفسیات، ہندوستان میں دستوری حکومت کا ارتقا، نہایت معیاری مقالے تھے۔ مقالات کے علاوہ چند افسانے اور کئی نظمیں بہت خوب تھیں، افسانوں میں سہیل کا افسانہ رات کی ہنسی، وہ رات اور نظموں میں سعی خام اور فکرِ جمیل خوب چیزیں تھیں۔ لیکن بہرحال یہ تو طے شدہ حقیقت ہے کہ سہیل کے اس نمبر کا علمی حصہ ادبی حصے کے مقابلے میں کہیں وزنی تھا۔

سہیل میں ترقی اور کمال کی بکھری ہوئی اہلیت موجود ہے۔ کوشش کرنی چاہئے کہ منتشر امکانات سے فائدہ اُٹھا کر اس کا معیار قائم کیا جائے اور پھر ہمیشہ اسی معیار پر جاری رکھا جائے۔

رسالہ میں تصاویر کی اشاعت نیرنگِ خیال کے قائم کردہ ۱۹۲۵ء کے کلچر کو پیش کرتی ہے، لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ چند سال بعد کاروان لاہور نے اس کلچر کو دفنا ہی بنا دیا تھا اور اب نئے ادب میں تصویر تو نہیں مگر مضمون نگار کی تصویر کی اشاعت کے معنی تو صرف ایک ہی یعنی چھیچھورپن ..... اگر اعلیٰ ترین آرٹ کی اشاعت ممکن نہیں ہے تو کم درجہ کے آرٹ کی تصاویر کی اشاعت ہرگز معیاری چیز نہیں۔

سہیل کے خاص نمبر میں بھی تصاویر تھیں، ان تصاویر نے سہیل کی علمی و ادبی خوبصورتی کو ہمارے خیال میں کم کر دیا تھا۔

ہماری رائے میں رسالے کو ہمیشہ ادنیٰ درجہ کی تشہیر سے محفوظ رکھا جائے تو وہ ایک عظمت اور حسن رکھتا ہے، پھر لوگوں پر تصاویر کا کیا نفسیاتی اثر پڑتا یا پڑ سکتا ہے۔ لوگ اس بھید کو بیسویں صدی میں بھی نہیں سمجھتے!؟ میں بہار اور اہلِ بہار کا ہمیشہ سے قائل ہوں اور اُن سے محبت کرتا ہوں

— الیشیا دسمبر ۱۹۴۲ء

اس لئے اُن کی ترقّی کا خواہاں بھی ہوں۔ اُن کے رسائل اور اُن کے ادب کو بلند اور کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں، ہمارے بہت سے دوست ترقّی اور حسن کا مخزن ہیں۔ مگر صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اُن کے اندر سے وہ القوامیت غائب نہیں ہوئی جو اوّل تو بدھ ازم کی تعلیمات کے نتیجہ میں غیر شعوری طور پر اُن کی زندگی کا جزو بن کر رہ گئی اور دوسرے عظیم آباد کی نوابی کا ہیولہ بن بھی ان شریف لوگوں کے مزاج میں رس بس کے رہ گیا ہے۔

میری خواہش ہے کہ سہیل ترقّی کرے اور اس کے ارباب حل و عقد چاہیں تو اُسے بہ آسانی نیا جنم دے سکتے ہیں۔!؟

موجودہ حالت میں بھی وہ ایک اچھا رسالہ ہے اور ناظرین آلیشیا کو اس کے مطالعہ سے ضرور فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔

مسلم لیگ اور کانگریس

مرتبہ، ظہیر الاسلام قریشی بی۔ اے (علیگ) ۸ بلاک کوٹھی نمبر ۴۱ ماڈل ٹاؤن

آنریری سیکرٹری مجلس ہمدردین آل انڈیا مسلم لیگ لاہور

جب سے ملک میں کانگریس برسر اقتدار آئی مسلم لیگ اور کانگریس کے متعلق کافی لٹریچر اُردو زبان میں پیدا ہوا...... اس سلسلے میں عبید الوحید خاں بی۔ اے نے جو دو کتابیں لکھیں وہ واقعات اور تاریخ کی غلط تعبیر پر مبنی ہیں، انہیں مسلم عوام کی عام جہالت سے خطیبانہ اپیل کی گئی ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کے اسلامی احساسات کو چھیڑ کر بھڑکایا گیا ہے۔ یہ اور ایسی بہت سی کتابیں مسلم پریس سے شائع ہوئی ہیں جن میں کوئی معقول دلائل نہیں ہیں سوائے اس کے کہ روایتی طور پر مذہبی احساسات کو وقتی اور بے بنیاد طور پر چھیڑ دیں، لیکن چند صفحے پڑھ کر "مسلم لیگ اور کانگریس" کے متعلق مجھے یہ رائے قائم کرنی پڑی کہ یہ چھوٹی سی کتاب گو مسلم لیگی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا لہجہ نسبتاً نرم ہے پہلے مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کی مجمل تاریخ ہے۔ جس میں اُن کا ذکر سیاسی نہیں مذہبی انداز میں کیا گیا ہے:

لیکن، ہندوستان پر بیرونی حملہ آوروں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے ہرگز اسلام کا پیامی اور "شراب معرفت سے مخمور" بہادر کہہ دینا درست نہیں ہے جن جن مسلم قوتوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اُن کو ایک زرخیز میدان کی ضرورت تھی اور بس —— اور کیونکہ وہ اس تجسس اور تلاش کیساتھ ساتھ ایک عقیدہ بھی رکھتے تھے اس لئے اُس فورس کو جس میں موجودہ فوج کی طرح فوجی انضباط نہ تھا اسی طرح مذہب کے نام پر جان بازی کی صلاح دیتے تھے۔ جس طرح آج مسلم لیگ یا خاکسار دیتے ہیں۔ لیکن مقصد اصل میں سیاسی غلبہ تھا اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ مسلمان مسلمانوں پر ایک دوسرے کا ملک چھیننے کے لئے حملہ آور ہوتے تھے۔ افغانوں اور ایرانیوں کی جنگ، خود اسلامی بادشاہوں کی سینکڑوں آپس کی لڑائیاں، اس اصول ملک گیری کی شاہد ہیں۔ ہندوستانی قوم کی رو میں "عرفان الٰہی کیلئے کیا مضطرب ہو سکتی تھیں جو اپنی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکے وہ "عرفان الٰہی کا خیال کیا کر سکتے تھے!؟

چھوٹا طبقہ روٹی کے لئے مسلمان ہوا اعلیٰ طبقہ عزّت و جاہ کے لئے، کوئی شک نہیں ایک طبقہ افراد کا ایسا بھی تھا جو تعلیمات اسلام کے سماجی اعلیٰ ا[illegible] اُس کی آزادیوں یا وسعتوں کو دیکھ کر مسلمان ہوا۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گی کہ ان اسلامی حملہ آوروں کا ہندوستان میں آ[illegible] سیاسی حیثیت رکھتا ہے،

[illegible]

یہ خیال، کہ لوئی خیال ہے کہ کیا مسلمان اُس اچھوت کو جو قبول اسلام نہیں کرتا مگر پاکیزہ ہے، اپنے دسترخوان پر جگہ دے سکتے ہیں، ہم اچھوتوں کو مسلمان دیکھنا چاہتے ہیں ....

لیکن کیا یہ دینی فرض کی بنا پر یا سیاسی پالیسی کی بنا پر ——

کیا خفتہ بختی ہے کہ دوسرے جب جاگتے ہیں اور چیزوں کو بناتے ہیں تو ہم خواب ہی میں پکار اُٹھتے ہیں اور جھولنے میں بیٹھے بیٹھے بچّوں کی طرح ضد کرتے ہیں!

اچھوتوں کے مسئلے کے بعد ریاستوں کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے،

کانگریس فیڈریشن میں ہندوستانی ریاستوں کی شرکت اس لئے نہیں چاہتی کہ برطانیہ ان کو شریک کرکے کانگریس کی اکثریت باقی رکھنا نہیں چاہتی:

والیانِ ریاست کی نمائندگی کا اصول اُسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ اپنی ریاستوں میں نمائندہ حکومت قائم کرلیں، والیانِ ریاست کوئی

حیثیت و قوت سیاسی اہمیت اور روایات نہیں ہیں سوائے اس کے کہ ان کا وجود محض برطانیہ کی وجہ سے قائم ہے، جس روز انگریزی حکومت کا ہندوستان میں خاتمہ ہوا، یہ ریاستیں بھی ختم ہو جائیں گی۔

ترقی یافتہ مزاج اس مسئلہ پر اس لئے زور دیتے ہیں کہ بیسویں صدی میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غریب و محکوم نسل انسانی آج بھی اتنی ہی ننگی بھوکی ہے جتنی جاگیردارانہ نظام کے ماتحت تھی۔ لاتعداد انسانوں کے پاؤں میں راہ کے کانٹوں، تپتے ہوئے پتھروں اور بارش کے پانی سے بچنے کے لئے جوتے بھی نہیں اور شخص واحد کے پاس دولت اور موسم کے لحاظ سے نہ صرف جوتوں کی ایک فیکٹری ہو بلکہ وہ ایک نہیں تین چار موٹریں بھی رکھتا ہو۔

ہندو مہا سبھا کے متعلق ظہیر صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اس کے جھنڈے تلے ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت جمع ہے۔

اِن تمام فرقوں کے اختلافات کا ذکر کر کے ہمارے دوست نے یہ ثابت کیا ہے کہ کانگریس ہر طرف مردود ہے اور نمائندہ اسمبلی کا مطالبہ محض ڈھونگ ہے لیکن مستقبل میں ہم بتائیں گے کہ مرکزی اقتدار کس جماعت کو حاصل ہے اور صوبہ جاتی حکومتیں یا جو بھی نظامِ حکومت آئندہ آئے گا اس پر کونسی جماعت چھا جائے گی، حکومت کے ارکان اور حکام کے اعلیٰ دجل و فریب نے اس وقت ملک میں جو کچھ کیا ہے، ہم نے اس کو نوٹ کر لیا ہے اور وقت آنے پر ہم جو کچھ کریں گے اُسے ابھی نہیں بتا سکتے۔

جیسے جیسے ہی اس کتاب کو پڑھتے جائیے یہ اپنا مقصد خود ہی پورا کرتی جاتی ہے۔ یعنی قومی ارتقاء اور انقلابی روح کی تکذیب، البتہ یہ ضرور ہے کہ اندازِ تحریر اور دلائل کی نوعیت اور اُن کا استعمال کہیں کہیں سیاست دانوں کا سا ہے، زبان رواں اور سلیس ہے، بیان خوب ہے، مگر ایسے شخص سے جو سیاسی تاریخ کہہ رہا ہو، ہم ان فقروں کی امید نہیں رکھتے تھے ——

غدر کا ذکر کرتے ہوئے ظہیر صاحب لکھتے ہیں:-

"ہندوان حالات سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کے منظورِ نظر بن گئے اور مسلمانوں کو مٹانے کا جو مقصد وہ خود اب تک پورا نہیں کر سکتے تھے انگریزوں کے ہم نوا بن کر اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔"

مسلمانوں کی حکومت تھی، اسلامی تمدن اور اسلامی حکومت کے اثرات کو مٹانا انگریزوں کا مقصد تھا تاکہ وہ مغربی تمدن، اس کے اثرات اور اپنی حکومت کی بنیاد کو مضبوط تر کر سکیں، ہندوؤں سے وہ اور ہندو اُن سے تجارتی اور اقتصادی تعاون کے لئے اسی طرح تیار ہو گئے جس طرح مسلمانوں سے ہو گئے تھے اور انگریزوں نے نہایت حسنِ تدبیر کا ثبوت دے کر مسلمانوں کی پیاری ایک قوم کے مقابلے میں ۵۰ سال پیچھے کر دیا، ان کا مقصد حاکم قوم کو بالکل مفلوج کر دینا تھا۔ اس میں ہندوؤں نے کیا کیا ——!؟

بہرحال کتاب شروع سے آخر تک مسلم لیگ کی قصیدہ خوانی اور کانگریس کی مذمت پر مبنی ہے اور انہیں حالات پر بحث کی گئی ہے جو ملک میں تین سال سے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہم منکرین مسلم لیگ کو تو کوئی سیاسی بصیرت عطا نہیں فرماتی، اس کے بجائے ہمارے دوست اگر کوئی "ادبِ لطیف" کی کتاب شائع کرتے تو اُردو لٹریچر میں اضافہ ہوتا!؟

ہاں اُن خواتین اور اُن منفعل مردوں کے لئے جو کانگریس کو نرم موقوں سے کوسنے دینے کے عادی ہیں یہ کتاب مفید اور جرأت افزا ہے، بہرحال اس کو ہمارے دوست نے محنت سے لکھا ہے، اچھے کاغذ پر چھپوایا ہے، مفت تقسیم کیا ہے اور اس طرح لکھا بھی ہے کہ بس ہم ہی اس کو بُرا بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی جس شخص کو خدا اور رسول کا خوف ہے اور جو ذرا بھی اسلام کا درد دل میں رکھتا ہے وہ اس کتاب کو نہایت حضورِ قلب سے پڑھے گا! اور مصنف کی تعریف کرے گا، میں بھی دل پر پتھر رکھ کر تعریف کرنے پر مجبور ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ نوجوان جن کی رگوں میں گرم خون ہے، جدت اور انقلاب کے علمبردار ہوں، خاص کر تعلیم یافتہ نوجوان جو مغربی زبانوں کے ماہر ہیں اور جنہوں نے انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کی تاریخ پڑھی ہے جو سیاستِ عالم اور اس کے جزر و مد کو سمجھتے ہیں، حقائق کی تہ میں سونے والے واقعات اور انسانی نسل کی بڑھتی ہوئی روح آزادی کو جانتے ہیں سائنسی ارتقاء اور اس ارتقاء کے پھیلاؤ کا اندازہ کر سکتے ہیں، اُن نوجوانوں کو تو رجعت پسندی سے گریز ہی کرنا چاہئے۔

سالِ نو کا پیام، نوجوانانِ ہند کے نام

از محمد حسام الدین خان غوری صدر جمعیت مسلم نوجوانان سکندرآباد (دکن)۔

یہ آٹھ صفحات کا ٹریکٹ ہے، جس میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے نہایت ہمت افزا اور صالح خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، غوری صاحب نے اُن کو

دا فر کلام میں الفاظ اور اُن کی بندش کا جو بنیادی اصول ہو اس کا انجام شاعری کے مذاہب میں کلاسیکل ہو جانے ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔

عرشِ بریں سے بھی ہے پرے کچھ دلِ عشق — سجدہ گہِ جمال مرا آستاں ہے آج
انوارِ حُسن سے ہے در و بام کو فروغ — یہ خاک تیرہ غیرتِ ہفت آسماں ہے آج
بکھرے ہوئے ہیں روش پہ گیسوئے نرم نرم بال — موجِ شمیم کاروانِ دکارواں ہے آج
قبضے میں ہے کلیدِ درِ عیش و انبساط — ہاتھوں میں میرے لطفِ طرب کی عناں ہے آج
اے شوقِ ناصبور ذرا بڑھ کے اک قدم — اے جراتِ حریص ترا امتحاں ہے آج

ایک جگہ پنڈت جی منظور صاحب کے گیتوں اور ان کی زبان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :-

" اب اردو والوں کے خلاف یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے کہ ان کا کلام دیسی روایات سے معرّا اور غیر ملکی تلازموں اور تلمیحوں سے بھرا ہوا ہے"

" اب" پر جو زور ہے اس کے متعلق پنڈت جی اگر برا نہ مانیں تو اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اب سے بہت پہلے اُردو شاعری دیسی روایات اور غیر ملکی تلازموں اور تلمیحوں سے آزاد ہو چکی تھی، منظور صاحب کے اُن پیشرؤں نے اس فرض کو ادا کیا، جن سے متاثر ہونے کا نتیجہ " دیر و حرم " ہے۔ ایک دوسری جگہ پنڈت جی اشتراکی اور انقلابی شعراء پر ہلکا سا حملہ کرتے ہیں اور اُن کے جوش کو ناقص اور منظور صاحب کے اعتدال کو مستحسن قرار دیتے ہیں :-

" آج کل جوان عمر (یہ ترکیب اُسی وقت استعمال کی جاتی ہے جب کسی کا بچکانہ پن ظاہر کرنا ہو) شعراء میں ایک موضوع بہت زور شور سے چل رہا ہے وہ ہے عوام کا افلاس اور مزدور" غیر معتدل اور وہم و دماغ نگارش پسند کرنے والے اسے اشتراکیت محض کی حد تک پہنچا دیتے ہیں لیکن منظور صاحب کے یہاں یہ محض "ہمدردیٔ عامّہ" کی حد تک محدود رہتا ہے"۔

ان سطور کو پڑھ کر غالب کا مشہور شعر یاد آگیا ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

رومانی عہدِ شاعری کے بعد جس اسکول کا آغاز ہوا اور " جوان عمر شعراء " نے جس مدرسۂ شاعری کی بنیاد رکھی ہے وہ زندگی کی واقعیت اور مسائلِ حیات پر حقیقت کی روشنی میں تنقید پر مشتمل ہے " ہمدردیٔ عامّہ " سے آپ سماج کے ناسور افلاس کا علاج نہیں کر سکتے۔ لفظ " ہمدردی " خود اک بورژوا اصطلاح ہے۔ جس وقت تک سماج میں یکسر انقلاب نہیں ہو جاتا یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور اس نظامِ تمدن کے تمام تر اثرات مٹ نہیں جاتے اُس وقت تک نئی دنیا پیدا نہیں ہو سکتی " جوان عمر شعراء " قسمت کے قائل نہیں حقیقتوں کو مانتے ہیں، اسی لئے اُن کے کلام میں ان عناصر کے خلاف باغیانہ جوش ہے، جنھوں نے " ہمدردیٔ عامّہ " " تحریکِ امدادِ باہمی " " تخیّر، علم دوستی " ادب نوازی اور ایسے لاکھوں بے معنی اور ذلیل سٹّے سماج میں ایجاد کر کے مشتہر کر دیئے ہیں، لیکن انسانوں کی بڑی تعداد جن میں قصیدہ خواں اور غزل گو فرشتے " بھی شامل ہیں، بھوک اور افلاس میں ایڑیاں رگڑ رہی ہے اس لئے اشتراکیت محض ہی ان کے خیال میں ان بیماریوں کا علاج ہے اور ان کی کوشش ہے کہ وہ اُسی طرح ادب کو حقیقی اور ذی روح بنا دیں جس طرح انقلابِ روس سے پہلے روسی ادیبوں اور شاعروں نے روسی ادب کو حقیقی اور جاندار بنا دیا تھا۔

منظور صاحب نے ان مسائل کو معلوم ہوتا ہے ابھی چھوا نہیں ہے، اس لئے اس قسم کی نظمیں محض جوش کی " بیوہ سہاگن " اور ضعیفہ وغیرہ سے متاثر ہونے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، ان نظموں میں وہ اثر اور جوش نہیں جو ان کی دوسری رومانی نظموں کی جان ہے۔

بہرحال پنڈت جی نے اپنے دیباچے میں صاف نہیں بتایا کہ منظور کے یہاں جو بھی رنگ ہو وہ اس کے پیشرؤں کا پرتو ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ لوگ اس بات کو عیب خیال کرتے ہیں کہ آدمی کی صحیح پوزیشن بتائی جائے شاعر اور شاعر کے پسند کرنے والوں کو بھول بھلیّوں میں ڈال دینا تنقید کی کونسی قسم ہے !؟

اُنیسویں صدی کے درمیانی حصے میں ٹالسٹائی، ترجنیف، دستوفسکی نے روسی ادب کے ارتقاء کے لئے میدان تیار کیا اس کے بعد میکسم گورکی نے جو روس کا ادیبِ اعظم ہے سر بفلک عمارت کھڑی کر دی۔ یہ سب کچھ اُنیسویں صدی کے ربع آخر میں ہوا۔ یعنی میکسم گورکی نے اپنے پیشروؤں کی تیار کی ہوئی زمین پر اپنے ادب کے گل کھلائے۔ لیکن اس اظہار سے گورکی کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسی طرح یہ کہہ دینے سے کہ منظر نگاری میں منظور جوش کے متبع گیتوں کی زبان، شعری نزاکت تخلیقِ حسن و رومان اور اسالیب (mannerism) میں بادۂ مشرق سے متاثر اور عام رومانیت میں اختر شیرانی سے بہت کچھ

متاثر ہیں تو یہ نہ حقیقت کے خلاف ہوگا نہ منظور صاحب کی حقیقی پوزیشن کو منافی،
کیونکہ اس حقیقت کے اظہار کے باوجود دیر و حرم کے شاہکاروں پر کوئی
اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ ہمارے دل میں اُسکی زیادہ قدر رہ جاتی ہے ۔

پنڈت جی کے بعد نجمہ صاحبہ کا پیش لفظ ہے ۔ یہ دیباچہ محنت اور پوری
شگفتگی کے ساتھ لکھا گیا ہے، مگر یہ دراصل گلدستۂ تاثرات ہے جو منظور صاحب
کی شاعری کی بارگاہ میں پیش کیا گیا ہے۔ تنقید سے اسے کم تعلق ہے اور جو
تنقیدی نکتۂ نظر ہے وہ قدیم مغربی نکتۂ نظر ہے، اب خود یورپ میں ادب
کے جدید نظریئے کے مطابق تنقیدی اصولوں میں بہت کچھ ردّ و بدل ہوگیا ہے
اور ادب کو محض جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ۔

اس مضمون میں جس قدر اقتباسات ہیں وہ سب پرانے نقادوں
کے نقطۂ نگاہ کو پیش کرتے ہیں، بجنوری وغیرہ اگر آج زندہ ہوتے تو حیران رہ
رہ جاتے کہ تغیّر نے اُردو شاعری کو رومان اور تخیّل کی اندھیری کوٹھڑی سے نکال کر حقیقت
کے کھلے میدان میں کیسی دیدہ دلیری سے لا بٹھایا ہے ۔ (باقی)

معاصر (بانکے پور پٹنہ)
(ماہانہ)

مدیر عظیم الدین احمد، پبلیشر نیا سنسار کتاب گھر (بانکے پور پٹنہ)
چندہ سالانہ للعہ، فی پرچہ ۶ر، سائز ۲۰×۳۰/۸، سادہ، خوبصورت

صوبۂ بہار میں اُردو ادب سے دلچسپی تو ہمیشہ لی جاتی رہی لیکن چند
برسوں میں اس نے عملی طور پر جو قدم اٹھائے ہیں اس سے اندازہ ہوتا
ہے کہ بیداری کی لہر بہار میں بھی دوڑ گئی، یقیناً یہ بات مسرت ناک اور مبارکباد
کے قابل ہے۔

معاصر کے دو نمبر ہماری نگاہ کے سامنے ہیں اس کے اداریہ ہی سے
مدیر کی اصابت رائے اور ٹھوس قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ معاصر کے مقاصد
کو مدیر معاصر ہی کے الفاظ میں سنئے۔

"معاصر میں مختلف اثرات اور نئے معیار نظر آئیں گے، لیکن کورانہ
تقلید کے عوض، ان اثرات اور ان معیار کو اپنے ماحول اپنے مذاق کا صحیح
لحاظ رکھتے ہوئے ایک نئے قالب میں تبدیل کیا جائے گا ۔ ایسا قالب جو
زندگی کا حامل ہو اور جس میں اجنبیت نظر نہ آئے"

پھر ایک جگہ قدامت اور جدت کے ایک معقول امتزاج کے متعلق اچھے
دلائل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :۔
" معاصر کی کوشش ہوگی کہ تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے ان اہم تغیرات
کو عملی صورت میں ظاہر کیا جائے اور اُردو ادب کو نوع کی زندگی اور اس کے
شعور سے قریب تر بنا دیا جائے"۔

بہرحال معاصر کوئی محض غزلوں نظموں اور ادھر اُدھر کے مقالات
کا تجارتی مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب میں فکر کو دخل ہے اور جس قدر
مضامین ہیں ان میں اعتدال کے ساتھ تغیّر کی جھلک پائی جاتی ہے، اس
رسالہ کی زندگی اہلِ بہار کو مستقل بنا دینی چاہئے یہ ایک نہایت ضروری
چیز ہے جس کو باقی اور جاری رہنا چاہئے۔ آئندہ میں اس کے متعلق مفصل
اظہار رائے کروں گا ۔

بزمِ ادب گونڈہ

چند سالوں پہلے صرف مشاعروں میں ہندو مسلمان اسی طرح شریک ہوتے تھے، جس طرح آجکل مل جل کر بیٹھتے ہیں، باوجود سیاسی اختلاف اور ہزار دوری کے یہ اسٹیج ایک ایسا اسٹیج تھا اور ہے کہ یہاں ہندو مسلم عیسائی، سکھ، عیسائی کا کبھی سوال نہیں اٹھایا گیا مگر ہماری بدبختی کی انتہا ہے کہ ہم اس اسٹیج کو بھی گرا دینا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں ۵-۶ سال سے کوی سمیلن (ہندی مشاعرہ) کی بنیاد ڈالی گئی ہے، جس میں صرف ہندو ہندی شاعر ہی شریک ہوتے ہیں، ان جلسوں کو ابھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن بہرحال ان کا چلن ہو گیا ہے۔

ہندو مسلم ملاپ، اور ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں کوئی ایسی بات میرے علم میں نہیں ہے جس کو میں نے بہلاوہ جھ دیا ہو، میری سمجھ میں یہ چیز بالکل نہیں آتی کہ ایک طرف ہندو مسلمان رہا کر ہندو بھائی آپس میں ملنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف بنیادی چیزوں میں علیحدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ملاپ کی آرزو جھوٹ ہے یا یہ علیحدگی پاگل پن ہے!؟ ہندوستانی ادب کا صرف ایک مرکز ہونا چاہیئے۔ بغیر اس مرکزیت کے اردو ہندی ادب میں اعتدال ہرگز پیدا نہیں ہو سکیگا۔

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ گونڈہ نے اس حقیقت کو محسوس کیا اور وہاں خواجہ مسعود علی ذوقی بی اے (علیگ) کے انتظام میں ایک ایسا آئیڈیل جلسہ ہو رہا ہے۔

ادبی دنیا خواجہ مسعود علی ذوقی بی اے علیگ کی ادیبانہ اور شاعرانہ کارناموں سے اچھی طرح واقف ہے، وہ سکون گذار سہی، لیکن خاموش کبھی نہیں رہے اور کبھی کبھی وہ جوش و خروش ان کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ادبی دوستوں کی مایوسی کو بری طرح ہار تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

خواجہ صاحب نے ۲۶ جنوری ۱۹۴۲ء کو ایک بالکل انوکھی ادبی سبھا رچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ چیز ہندوستان کی ادبی تاریخ میں بالکل انوکھی ہوگی یہ اجتماع اعلیٰ پیمانہ پر ایک ایسے "یوم ادب" کو پیش کرے گا جس کی مثال اب وقت تک دیکھنے میں نہیں آئی ہوگی۔

ملک کے تمام مشاہیر شعراء کو مدعو کیا گیا ہے: دن کی پہلی مجلس میں تمام حضرات اپنی شاعری کے متعلق خود نوشتہ تنقیدی مقالے پڑھیں گے، رات کو عظیم الشان مشاعرہ ہوگا۔ جس میں ہندوستان کے مشہور اردو شعراء کے علاوہ ہندی کے نامی شاعر بھی شریک ہوں گے۔

دن کو جو مقالے پڑھے جائیں گے وہ ۲۰ منٹ میں ختم ہونے والے ہوں گے، مقالے کے بعد ہر شاعر اپنی ایک ایسی نظم یا غزل سنائے گا جسے وہ اپنے جذبات معتقدات اور مزاج شعری کا بہترین ترجمان تصور کرتا ہے۔

اسی دن دوسری نشست میں ادب کی دوسری اصناف کے متعلق [illegible] کسی قدر طویل مقالے پڑھے جائیں گے۔ مقالہ نگار حضرات اور مقالوں کی فہرست یہ ہے۔

مقالہ نگار	مقالہ
رشید احمد صدیقی	طنزیات
نیاز فتحپوری	ادبیات
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	ہندی اور اردو شاعری کا ملاپ
آل احمد سرور	تنقید ادب
سید سلیمان ندوی	ارتقائے زبان
مجنوں گورکھپوری	زندگی اور ادب
مسعود حسن رضوی ادیب	مرثیہ کی ادبی اہمیت

دن کی مجلس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق صاحب فرمائیں گے اور مشاعرہ کی صدارت حضرت جگر مرادآبادی۔

اس یوم ادب کی اہمیت ظاہر ہے، اس کے نظام کی بنیادی روح تجسس، تجربہ اور ترقی کی طرف نئے اقدامات پائے جاتے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ یہ خود ادیبوں اور شعراء کے لئے مفید نہ ہو۔

اردو زبان کا بانکپن ہے، یہاں سب سے زیادہ تنقید کا کال ہے۔ جو حضرات بزعم خود نقاد بنتے ہیں ان کی روحیں نفرت اور محبت سے خالی نہیں ہیں، وہ جانب داری اور پارٹی پالیٹکس اور سب سے زیادہ ذلیل شے یعنی "ذاتی پسندیدگی" کے جذبے سے خالی نہیں ہیں۔ اس ادبی دنائت سے جو سب سے بڑا نقصان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ خود شعراء میں ناقدانہ نظر پیدا نہیں ہوئی اور وہ اپنی صحت و ارتقاء کا پیمانہ نہیں بنا سکے۔ بلاشک اس یوم ادب کو کامیاب بنانا چاہیئے اور جو شعراء نثر لکھ سکتے ہیں یا تنقید کر سکتے ہیں ان کو اپنے معائب اور محاسن آزادانہ بیان کرنے چاہئیں اور جو نثر نہیں لکھ سکتے ان کو ہمت کر کے لکھنی چاہیئے۔

عجیب دعوت و پیغام ہے۔ اگر ذرا بھی اس تحریک کی چولیں ڈھیلی ہوتیں تو ہم اس کو خواجہ صاحب کی فطری شوخی پر مبنی کرتے لیکن یوم ادب کی ہیئت

ایشیا دسمبر ۱۹۴۱ء

[illegible] نمبر ٹھیک اس وقت شائع ہوگا۔ جب کبھی رسالہ نکل [illegible] کوشش کی جا رہی ہے [illegible] التماسوں کے ساتھ [illegible] [illegible] سکیں۔

[illegible] تمام اطلاع [illegible] [illegible] [illegible] حضرات ایشیا [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] ہوگی۔

نمونہ پارسل

[illegible] آپ کو بالکل عجیب [illegible] [illegible] مسلمان [illegible] [illegible] [illegible] دماغ سے عاری [illegible] [illegible] اس کو کوئی تعلق ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] رکھا جا سکتا ہے۔ [illegible] خوب [illegible] ہے۔

[illegible] مختلف ناموں اور طرح طرح کے [illegible] خطوط [illegible] نمونہ [illegible] رہتے ہیں اور آپ کبھی ان کو گرفت نہیں کر سکتے [illegible] ماہ ایشیا کو مطالعہ سعرت کے تمام ماہرین اقتصادیات کے تجربوں اور نظریوں سے فائدہ اٹھا کر بھی ممکن نہیں۔

اب اس نظام کو ذرا پھیلا کر دیکھئے کہ [illegible] پیسے کے حساب سے ایک "نمونہ باز" ایک روپیہ میں بیس رسائل دیکھ سکتا ہے؛ یا دو پائی کے اخراجات کو بھی شامل کر لیجئے تو ۱۵ سہی۔

لیکن اقتصادیات میں شاید اس سے بہتر نظریہ اور کوئی نہ ہوگا کہ ایشیا اب ان حضرات ہی کو نمونہ ارسال کرتا ہے جن کا لفافہ ٹکٹوں سے گلزار بنا ہوا آئے۔ اس لئے اس قسم کے حضرات جو محض نمونہ مفت حاصل کر کے رسائل پڑھنا چاہتے ہیں، ایشیا کا دروازہ اپنے اوپر بند خیال کریں۔

زبان کا معیار اور صحت

مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ہندو قوم سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرتی ہے، اور اس طرح وہ اُردو کے مروجہ اسلوب کو مٹا دینے کی کوشش کرتی ہے۔ سمپورنانند جی کو "آداب عرض" سے ضد ہے؛ اور وہ اس زبان کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کرتے بلکہ مٹا کر رکھ دینا چاہتے ہیں، تاکہ اُن کو قدوائی صاحب کے سامنے کیبنٹ میں "آداب عرض" نہ کرنا پڑے۔

بعض ہندوؤں کو فارسی اور عربی کے لفظوں کے استعمال پر اعتراض ہے، لیکن ہمارا کوئی ہندو بھائی انگریزی سے نفرت نہیں کرتا۔ مسلمانوں کو ہندی لفظ اچھے معلوم نہیں ہوتے مگر انگریزی لفظ، گویا قرآن کی زبان کے الفاظ ہیں۔

بہرحال ہر طرف ایک نفرت اور فضول جاہلانہ شور و شر ہے کہ ہم میں ایک دوسرے کے کلچر اور تمدن کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اسی شور و شر میں بعض اوقات سنگین قدم بھی اٹھ جاتے ہیں، جیسے کہ سمپورنانند جی کا خطبۂ صدارت!

ہندی سے تو اس وقت بحث نہیں۔ لیکن میں ان دوستوں کو متوجہ کرتا ہوں جو ایشیا کے صفحات پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہتے ہیں کہ زبان کا معیار مزید لطیف اور آسان بنائیں: ہماری ایک دیدی صاحبہ کا مضمون نہایت سخت زبان میں ہے؛ اس کو وہ شخص نہیں سمجھ سکتا جس کی نگاہ سے مذہبی لٹریچر نہ گذرا ہو؛ اور اس میں شدید الفاظ کی سخت بھرمار ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور ایشیا کے تمام نامہ نگاروں کو اس پر توجہ دینی چاہیئے کہ وہ آسان اُردو لکھیں جو ہندو، مسلمان، بچوں، نوجوانوں غرضکہ سب کی سمجھ میں آئے۔ آئندہ سے ایشیا ایسے مضامین کو شائع نہ کر سکے گا جو سادہ اور صاف زبان میں نہ ہوں گے۔

اُردو میں اس آسان اسلوب کی کمی نہیں ہے؛ پختگی کا اظہار شدید الفاظ سے نہیں ہوتا، آسان الفاظ کے خوبصورت استعمال سے ہوتا ہے۔

ایشیا دسمبر ۱۹۳۲ء

مینیجر اور ایڈیٹر کی ضرورت

م۔ک۔م متین الحق صاحب کیفؔ مراد آبادی اپنی شدید علالت کی وجہ سے میرٹھ قیام نہ کر سکے اور انھیں ایشیا سے تعلق ترک کر دینا پڑا اس قدرتی مجبوری پر انھیں بھی افسوس ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ؎

کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

ایشیا کے تمام انتظامی اور ادارتی فرائض کا ادا کرنا میرے لیے ممکن تو ہے مگر میرے اندر جو شاعر ہے اسکی زندگی کی ضمانت میں نہیں لے سکتا پھر سرکارے اور ہر مردسے، کہاں میں اور کہاں انتظامی معاملات" اسکے لئے علیحدہ ایک ایسے صاحب کی ضرورت ہے جو قدرتی طور پر تجارتی ذہنیت رکھتے ہوں اور اقتصادی طور پر ایشیا کی ترقی کی ضمانت دیں۔ ایشیا کی ادارت کے علاوہ میرے پیشِ نظر، اپنی کتابوں پر نظرِ ثانی اور نئی کتابوں کی ترتیب و تحریر بھی ہے، جس کو میں جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہونچانا چاہتا ہوں۔ اس لئے ایک ایسے صاحب کی بھی ضرورت ہے جو ترجمہ سے لیکر ادارت اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام امور پر درک و مہارت رکھتے ہوں

قوم و مذہب کی کوئی شرط نہیں ہے۔ لیکن چند باتیں لازمی ہیں جو میں اپنے ساتھیوں میں دیکھنا چاہتا ہوں: (۱) شاعر اور عاشق نہ ہوں، صوفی اور فرقہ پرست نہ ہوں۔ اور مجھے آقا اور خود کو ملازم خیال نہ کریں، یعنی محض ملازمت نہیں مقصد کی امداد کے لئے میرا ساتھ دیں۔ اور اگر انھیں میرے خیالات سے اتفاق نہ ہو تو خط و کتابت کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

کم از کم اڈیٹر کو تو میرا ہم خیال ہونا ہی چاہیئے۔ انگریزی، ہندی، اُردو وغیرہ جاننا ظاہر ہے کہ اس کے لئے ضروری ہے، ورنہ ایک علمی ادارہ کا کاروبار نہیں چل سکیگا۔!؟

میں جانتا ہوں کہ میرے احباب میں ایسے افراد کی کمی نہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جس طرح میں اپنی جان کھپا رہا ہوں، احباب میری صحت و درستی ہی کے لئے کوئی میرا ہاتھ بٹاتا، لیکن یوں ہی یہ ایسا خیال کرنا، محال اور جنوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

مینیجر اور اڈیٹر صاحبان کو ماہانہ معقول معاوضہ پیش کیا جائیگا۔ لیکن میں اس معاوضہ کی قیمت صرف یہ وصول کرنا چاہتا ہوں کہ ایشیا کے ادارتی اور انتظامی معاملات سے بے نیاز ہو جاؤں اور میری عدم موجودگی میں تمام کاموں کی تکمیل کے کلی ذمہ دار مینیجر اور اڈیٹر صاحبان ہوں۔

اس سلسلے میں جنوری ۱۹۴۱ء کے آخر تک آئے ہوئے خطوط، مکاتیب، اور ذاتی ملاقاتوں سے میں یہ نتیجہ نکالوں گا۔ کہ کون صاحب مینیجری اور ایڈیٹری کے فرائض خوبصورتی اور تن دہی سے ادا فرما کر مجھے ممنون کر سکتے ہیں۔!؟

ہر چند کہ یہ معاہدہ معاملاتی ہوگا، مگر جہاں کسی مقصد کی تکمیل پیشِ نظر ہوتی ہے وہاں صرف معاملاتی معاہدات کام نہیں آیا کرتے کوئی قلبی لگاؤ بھی مقصدِ ادب سے ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بغیر ہم آہنگی کے ہو نہیں سکتا۔

ساغر

ایشیا

(سنہ ۱۹۳۹ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمہ تعلیمات حکومت صوبہ متحدہ

محکمہ تعلیمات حکومت صوبہ بہار

ایڈیٹر

ساغر

زیر سرپرستی

ڈاکٹر سید محمود

اسسٹنٹ ایڈیٹر

قیصر بی۔ اے

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)

قیمت فی نمبر ۸ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)

ایجنسیوں کو ۲۵ فیصدی کمیشن

فہرست مضامین "ایشیا" جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

ایشیا

جلد ۶ | جنوری ۱۹۴۱ء | نمبر ۶

آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کے انتیسویں اجلاسِ پُونا کا خطبۂ صدارت

اور اُس پر ایک نظر

(مسلسل)

انقلابی تصوّرات اور اُردو شاعری

"عوام' پر جایا جنتا میں ہوش پیدا کرنے اور انہیں اُبھارنے کی کوشش کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ پرجا کی اصل بولی میں صفائی اور نرمی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تمام وہ بات دن کے سوال لائے جائیں جو اُن کی اصلی بیماریوں کا علاج ہیں۔ بھوک' بھوک کی جڑوں سے اس نظم یا کویتا میں بحث کی گئی ہے۔ اس بولی کو بھی جو اس دیس کی اصلی بولی ہے' بولیوں کے اکھاڑے میں مقابلے کے ڈھنگ پر نہیں بلکہ نمونے کے ڈھنگ پر پیش کیا گیا ہے۔"

اس نظم میں کسانوں کی زندگی کا ایک خاص رُخ دکھایا گیا ہے۔ جس میں بنیے کی سنگدلی اور بدذاتی اور کسان کی بیکسی اور بربادی کا عبرت انگیز نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے' یہ ایک المناک داستان یعنی ٹریجڈی کا سا ہے جس میں ایک طرف جہالت اور بے بسی ہے' اور دوسری طرف مکّاری اور دنیا داری' مکّاری کی جیت ہے اور جہالت کی ہار اور نتیجہ دونوں کا برباد ی۔ ادھر بنیہ مارا جاتا ہے اُدھر کسان پھانسی پر چڑھتا ہے اور اُس کی بیوی تالاب میں ڈوب کر جان دیدیتی ہے' گاؤں والے ہزار جتن کرتے ہیں مگر اس غریب کسان کو نہیں بچا سکتے۔"

آپ پہلے "پنہاری" کا آغاز ملاحظہ کیجئے۔ اس کے بعد "ہیرو" کا پھانسی کے لئے جانا۔

"پنہاری"

پنگھٹ کو پنہاری چالی[1]	باندھے پیلی ساری جالی
سر پہ کلسے کلسے پہ گاگر	ہاتھ میں ڈوری[2] موبخہ کی گھابر[3]
کالی اُنڈوئی[4] میں کوڑی چمکیں	ناگن کی جوں بند کی دمکیں
ہٹا ہٹا گھونگٹ کو جھلکے	آتے جاتے سے مُنہ ڈھانپے
گھونگٹ میں کمھڑاتیوں ڈھکے	بادل میں جوں چندا چھپکے
مرگ سی نینوں میں ٹھڈی کالی	ہونٹوں پہ تاگر پان سی لالی

[1] چلی [2] رسّی [3] بھابر و مونجھ کی بنی ہوئی [4] ایڈوا جس پر گھڑا رکھتے ہیں۔

ناگوری ناکالی ابلا   بھوری پتلی بالی ابلا
چال ابلا متوالی چالے   گھونگرو بولے جھومر ہالے
پتلی کمر لچکاتی جاوے   کمر ملک ناگن لہراوے
کہیں کہیں ٹھوکر بھی کھائی   لپک جھپک پنگھٹ پر آئی

(ہیرو "کالا" نامی پھانسی کے لئے جا رہا ہے)

جیل داروغہ جیل میں دھایا   بیس سپاہی واں سے لایا
بندوقیں کندھوں پر لائے   اک اور کو پرے جمائے
چھن چھن، کی جب آہٹ آئی   کالے آوے گیل سپاہی
ویسا ہی ٹھیکھا، ویسا ہی کالا   گاؤں کو دیکھ کڑک کر چالا
ہاتھ جوڑ کر ہو گیا ٹھاڑا   سب کرے رام رام کالا
"کیوں بھیا تم سگرے آئے   کیوں نارن کو گیل میں لائے"
"کیوں بیٹر کو آج ستایا   کیوں بوڑھن کو لا کے ہرایا"
"تہارے پریم پہ بل بل جاؤں   نا بھولوں چاہے کل مر جاؤں"
"تم نے کسر نا چھوڑی بھیا   بیل[1] میری ہے تھوڑی بھیا"
"کال کے جی میں بھی نہیں ہو   کال کا کوئی ٹیم نہیں ہے"
گھیر ڈال سنیں اکی باتیں   کچھ روئیں، کچھ منہ کو ڈھانپیں
کوئی تو ڈکر شکھیا بھلی   کنول کا رلئے وہ اِکلی
ہار کنول کا ناڑ میں ڈالا   پہلے گیندوں کی پھر مالا
پڑن لگی پھر مالا پہ مالا   ہو گیا پیلا، دھولا، کالا
اک چھوری نے باندھی راکھی   راکھی پہ بندھنے لگی راکھی
ہتھکڑی ہی ہاتھ کی چھپ چھپ جاویں   چھوری اس ڈھب راکھیں باندیں
پھر ماتھے پر تلک لگایا   رَن کا کالے کو دولھا بنایا
چھب اس دولھا کی سب بناوی   چتون تیکھی بھواں کٹاری
ہنس ہنس سب کو یوں بتلاوے   "جیو ہمارا کل تک جاوے"
"کہو تو من کی ساری بتلاؤں   جو من مانی وہی سناؤں"
بڈھو بولا "کیوں نہ سنا دے   پھیر سنانے تو کب آوے"
"جو ترے من میں کہنے کو آئے!   بات وہ ساری کہہ سنائے"
"سب نا تیرے جی کی جی میں   نا ہی کھٹک ہے ہمارے جی میں"

[1] عمر [2] موت [3] حلقہ

کہنے لگا "ہر ورے میں بھیا!   رات سی تھی بڑی ہوکنے دیتا"
"یا سنسار سے کل کہلاج   من کی گانٹھ میں کھولوں گی آج"
"چودسوں میں نے گاؤں کو چھوڑا   پایا بہت اور کھو یا تھوڑا"
"کئی تو مانس ایسے پائے   جن کے بلن سے سب بل پائے"
گاؤں کے اور گھر کے تیاگی   دیش کی سیوا اُن کی بھاگی"
"مزدور کسان [illegible]   انھوں نے جیون اپنے وارے"
"اُن سے بل کر وہ کچھ پایا   جیون اپنا میں نے بھلایا"
"سنا دی سب اپنی کہانی   ہٹیا جو کی ساری کہانی"
"اس لئے سب نا ہاری ہارو   مجھ ہی سے سب کام سنوارو"
"ہزار میں مانس چار ملیں گے   دیس میں اپنے بوہرے بنیے"
"باقی سب مزدور ہیں بھائی!   ان کے لئے سب کریں کمائی"
"چاروں کے مارے کا منہ چالے   کرد ہجاروں[1] ایکا کالے"
"رات دنا پھر پھر سمجھاؤ   سمجھا سمجھا کر بتلاؤ"
"ملاّں، پنڈت، پوپ پجاری   بوہروں کے ساتھی اتیاچاری"
"سارے لوٹا سارے کھاوا   مزدور کا ناڑ ہے ان کا دھاوا[2]"
"کھون ہے ہمارا ان کا تیوہار[3]   ہمارا مرنا ان کا جیون"
"ہاڑ سنبھالو، کھون بچاؤ   جوٹ ملاؤ، ایک ہو جاؤ"

٥

یہ وہ دیہاتی بولی ہے، جسے گاؤں والے سمجھ سکتے ہیں، اس بولی کو ہم جنتا کی بولی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ شہروں کے درمیانی اور اونچے طبقے کی بولی نہیں بن سکتی نہ یہ مہذب شاعری کی بولی بن سکتی ہے۔ سخت فارسی آمیز اور سنسکرت آمیز زبان اگر اس بولی والوں میں بولی جائے تو سمجھے اور سمجھ نا سمجھ دونوں کو گاؤں والے پاگل کہہ کر گاؤں سے نکال دیں، لیکن آج کی غزلیں اور اردو منظومے مقبول ہونے گاؤں گاؤں میں جنتا کی زبان پر ہیں۔ تانگہ والوں کی زبان پر یہ مصرعے تو ہیں کہ "دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے" "وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے" لیکن موجودہ ہندی شاعری کی کوِتا کی ایک پنکتی "جنتا (پرولتاریا ہی سے آپ کی مراد ہے نا!؟) کی جیب" پر نہیں ہے ——!؟

آپ اور آپ کے ہم خیالوں نے پرانی بھاشا کی ہندی کوِتا کی بھی چِتا بنا کر دی اور نئی شاعری کو مقبول ہونے سے بھی روک دیا۔ جو لوگ ایک ایسی زبان

ایشیا جنوری ۱۹۵۱ء

کو "ہندوستانی" کہتے ہیں جس میں ہر اُردو فارسی اور عربی لفظ کا ترجمہ سنسکرت میں کر دیا جائے۔ میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ یہ سائنٹفک طور پر غلط ہے، صدیوں سے بولے جانے والے فارسی و عربی الفاظ سنے سنسکرت الفاظ سے زیادہ سمجھے جاتے ہیں اور دماغ و خیال میں رس بس گئے ہیں، تمام ہندو قوم، یہاں تک کہ میری ہندو بہنیں اور مائیں بھی اسی طرح میری بات کو سمجھتی ہیں جس طرح میری مسلمان بہنیں اور مائیں۔

اک نازک سا کچھ فرق ہے سو وہ ہونا ہی چاہئے۔ سوشل میل جول سے یہ بھی دور ہو سکتا ہے۔

بیتے ہوئے سال سنہ ۱۹۴۰ء میں ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جتنی کوششیں سمجھوتے کی ہوئیں، میں اُن کے ناکام انجام پر کبھی اتنا مایوس نہیں ہوا جس قدر کہ آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کا خطبۂ صدارت پڑھ کر

میرے منہ میں خاک، موجودہ رجعت پرست ہندو مسلمانوں کی رہنمائی میں تو ہندوستان آزادی حاصل نہیں کر سکتا یعنی ہمیں ہندوستان کی آزادی کے لئے اُس مقدس وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ جب لامذہب، تمدن اور تہذیب کی قید سے آزاد، غیر دل آزار باتیں بازو والے ہندوستانی سیاسیات پر نہ چھا جائیں اور اُن بوڑھے اور بوڑھے دیش پریمیوں سے ہندوستان پاک نہ ہو جائے، جو ملک اور یہاں کے رہنے والوں کے مسئلے حل نہیں کرنا چاہتے بلکہ ایک خاص آئیڈیالوجی کے بارے ہماری زندگیوں کو دبا دینا چاہتے ہیں!؟

ایک خاص "آئیڈیالوجی" یعنی مغربی نیشنل ازم کی تقلید میں قوم پرستی اور اُس کے لوازمات کی داغ بیل ڈالنا، ان لوازمات میں زبان اور کلچر دو بڑے اور اہم لوازمے ہیں۔ غلام قومیں جن کی تہذیب و تمدن اور جملہ انفرادیت اجنبی غلبہ سے دب کر رہ جاتی ہے، جب قوم پرستی کے جذبے سے سرشار ہوتی ہیں تو وہ صدیوں کی دبی ہوئی روایات کو از سر نو زندہ کرنا چاہتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ زبان اور کلچر ان قومی روایات کی دو بڑی شقیں ہیں لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ خود اسلامی ممالک نے جب مغربی نیشنل ازم کو اختیار کیا تو بطور خاص اپنی زبانوں کو اُن زبانوں کے مقابلے میں ترجیح دی جو جغرافیائی اور اقتصادی یا دوسرے اسباب کی بنا پر ان کے ملک پر چھا گئی تھیں، مثلاً ترکی میں عربی، اور ایران کے اندر فارسی میں عربی عناصر کی شدید ملاوٹ کے خلاف احتجاج کیا گیا۔

یہ ممالک آزاد اور خود مختار تھے۔ ترکی نے صدیوں اسلامی بھائی چارہ کی زنجیر کے حلقوں کو مضبوط رکھا۔ لیکن جب خود عربوں نے انگریزوں سے سازش کر کے اُن کی آزادی ختم کر دینی چاہی تو ترکوں کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے اُن تمام ذرائع کو اختیار کیا جو اُن کو آزادی اور ترقی کی منزل تک پہنچانے کے ضامن ہو سکتے تھے۔

لیکن لاطینی رسم الخط اور ترکی زبان کی واحد ترویج محض عربوں سے نفرت کرنے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ لاطینی رسم الخط یورپ سے اقتصادی ربط و ضبط کے امکانات پیدا کرتا تھا۔ اسی طرح ایرانی زبان سے عربی عناصر کو کم کرنے کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ محض قوم پرستی کے لوازمات اور اُن کی مبادیات کی تکمیل ایران کے پیش نظر تھی، بلکہ مقصد یہ تھا کہ فارسی ادب جو محض امراء اور سلاطین کے لئے وقف تھا اب ایسی زبان میں ہو جس کو عوام سمجھ سکیں اور سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

آریہ قوم ایک ہزار سال سے اجنبی غلبہ سے دبی ہوئی ہے، اس غلبہ کی تاریخ افغانوں سے شروع ہو کر انگریزوں پر ختم ہوتی ہے، ہندوستان میں اسلامی حکومت کی قطعی تباہی کے بعد ایک نیا عہدِ غلامی شروع ہوا جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے غلام تھے، پرانے حاکم بھی غلام تھے اور محکوم بھی، ایک پنجرے میں دو چڑیاں تھیں، ہم جلیسی نے غلامی میں محبت اور اتحاد کا نیا سنگ بنیاد رکھا۔ نیا رہن سہن، نئی بولی ٹھولی، نئے خیلات اور ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

اس نئی زندگی کی نئی زبان "اُردو" تھی جو امانت دار تھی ایک نئے ہندوستانی کلچر کی، ایک نئی ہندوستانی سماج کی، جس میں گھریلو اجزا بھی تھے اور بدیشی بھی، لیکن جو شخص فارسی عناصر کو بدیشی ساز و سامان سے تعبیر کرتا ہے وہ ایک تاریخی حقیقت سے انکار کرتا ہے یعنی ہندو مغل عہد میں فارسی زبان کو اپنا چکے تھے اور اس زبان میں مغلوں کے دفتری کاروبار کو چلا رہے تھے۔ ان روابط اور حقائق کی موجودگی میں ہم قدرتی طور پر مغربی نیشنل ازم کی کلیتاً تقلید نہیں کر سکتے، بلکہ ہمیں صرف اُسی منزل سے شروع کرنا پڑے گا جس منزل تک ہم قدرتی طور پر آ چکے ہیں۔

یعنی ہم نظریاتی اور واقعیاتی متحدہ قومیت کی منزل پر ہیں؛ یہ محض ایک ایسی حقیقت نہیں ہے جسے میں وقتی دلیل کے طور پر استعمال کر رہا ہوں یہ تو وہ دعویٰ ہے جو قومی ترقی اور وطنی جدوجہد کی اصل بنیاد ہے؛

"مسلم لیگ کے حکما،" اور کانگریس کے فلسفیوں نے اس نظریہ پر مدتوں قلم فرسائی اور دماغ زنی کی ہے اور بالآخر اس کو ایک محاذ بنا کر قومی ارتقاء کی ریڑھ کی ہڈی پر ضرب کاری لگانے کے لئے دو جداگانہ قوم کے نظریہ کو وضع کیا گیا ہے۔ کچھ زیادہ زمانہ نہیں ہوا جب "پاکستان" کا خیال لیگ کی طرف سے مطالبہ کی شکل میں پیش ہوا تو مہاتما گاندھی نے اسی متحدہ قومیت کی حقیقت کو دہرایا؛

یعنی کوئی شخص جو واقعات اور مسائل کو حقیقت اور تاریخ کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہے ہماری اس منزل سے انکار نہیں کر سکتا، یہ خود ایک ترقی یافتہ منزل ہے اور اس منزل سے پیچھے کی طرف کو لوٹنا ہندوستانی نیشنل ازم کے لئے سخت مضر ہے

اس منزل کا سب سے بڑا نشان ہندوستانی فرقوں کا مضبوط دلی اور سیاسی اتحاد ہے اور اردو اس اتحاد کی نیو ہے؛

اس بنیاد کو اکھیڑ کر جو شخص عربی اور سنسکرت ملک میں جاری کرنا چاہتا ہے وہ قومی عمارت کو یقیناً گرا دینا چاہتا ہے؛

اس خاص آئیڈیالوجی کے اجزا میں ایک جزو یہ ہو کہ چھ ہزار برس پہلے کے کلچر کو بیسویں صدی میں اختیار کرنے پر زور دیا جائے، زبان کو سنسکرت اور انسانوں کو "رشی منی" بنا دیا جائے، وہی فلسفہ جس کی بلندی میں کوئی شک نہیں لیکن جس کا تجرباتی نقص بھی مسلم ہے پھیلا جائے، جس نے آریوں کی اولاد کو ایک ہزار سال عملی قوموں کا غلام بنائے رکھا اس سائنٹفک عہد میں اجاگر کیا جائے؛

پھر متحدہ قومیت کو ہم ہمالہ کی کس کھوہ میں تلاش کریں؛!؟

قومیں دو، زبانیں دو، تہذیبیں دو، ادب دو، شاعری کی بولیاں دو، ایک قورمہ و کباب کھانے والی، ایک کنول سونگھ کر زندہ رہنے والی تو پھر وہ سیاسی اور کلچرل وحدت کہاں تلاش کریں جو ہمارے امراض کا اصل علاج ہو سکتی ہے؛!؟

اردو شعراء نے اپنی ذہانت اور محنت اور سچے جذبات سے انقلابی تصورات کو اپنی بساط کے مطابق ایک ایسا فارم ضرور دے دیا جو دیکھنے والوں کی نگاہ کو بھاتا ہے، اور سننے والے جس سے متاثر ہوتے ہیں؛ —

پرانے خیال کے بزرگوں کا ذکر نہیں (یعنی حالی اسکول کے مقلدوں کا ذکر نہیں) لیکن نئے اوب کے لکھنے والوں نے اپنی وسیع الخیالی سے ثابت کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک "زبان" اصل چیز نہیں "انقلاب" اصل مقصد ہے، چند کالم پہلے سید مطلبی فرید آبادی (جو آجکل ڈسٹرکٹ ملتان جیل میں ہیں) کی نظم "پنہاری" آپ نے پڑھی!؟ اس نظم کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے ہندوستانی گاؤں کا مشاہدہ کیا، نظم پڑھتے پڑھتے ریت سے بھرے ہوئے رستے، جھونپڑے، مٹی کے مکان، الاؤ، پنگھٹ، غربت کا افلاس اور ان سب میں دبی ہوئی فطرت کی چنگاری سورج کی طرح روشن معلوم ہوتی ہے۔

یہ اور مطلبی کی ایسی درجنوں نظمیں ان انقلابی تصورات کو پیش کرتی ہیں، جو پرولتاری انقلاب کی بنیاد ڈالنے والے ہیں؛

مثلاً گاؤں کے اجڈ عوام میں انقلابی روح دوڑانے کے لئے مطلبی ایک گیت میں انھیں اس طرح مخاطب کرتا ہے:—

جاگ اناڑی جاگ ترے کھلجا بنیکے بھاگ

"دیس کے سارے دھنمت ٹھالے — بنے پھریں ترے رکھوالے"
"ناگ یہی ہیں پہلے کالے — ان سے اپنی جان بچالے"
" سب ان کے جھوٹے بیراگ، جاگ اناڑی جاگ، ترے کھلجا بنیکے بھاگ

"راجے بوہرے پوپ پجاری — سب ترے کھاوا تو دکھیاری"
"ان کے گھروں میں بجلی جھماری — تم پر ٹوٹ پڑی اندھیاری"
سارے انڈے کھاوا گاگ، جاگ اناڑی جاگ، ترے کھلجا بنیکے بھاگ

"دین دھرم کے یہ ادھیکاری — جن پر تو جاوے بلہاری"
"تو باندرا، وہ ہیں مداری — بیری سب ہیں تیرے شکاری"
توڑ دے ان کے سب کھٹراگ، جاگ اناڑی جاگ ترے کھلجا بنیکے بھاگ

چندا بکھے تارے کھو جائیں — تو جاگے تو یہ سب سو جائیں

ایشیا جنوری ۱۹۴۱ء

اِن نظموں کو تنقلبی کی زبان سے ہزاروں دیہاتی بھائیوں کے سامنے پڑھتے سنا گیا ہے، ان کو سنکر گاؤں کی مظلوم جنتا تپتے ہوئے لوہے کی طرح گرم ہو جاتی ہے، ایک اور جگہ تنقلبی جدید انقلاب انگیز رومانی نظم میں نہایت مدبرانہ انداز میں کہتا ہے ؎

جدائی کا گیت

جیل چلا ہے دیس سپاہی رانی تجھ کو چھوڑ

سورج، بادل، چند، تارے — سب ہونے دی کھیں کارے کارے

برہیت ریت، سینہی پیارے — کوئی نہ دیکھے گھورے اندھیارے

دیس بلی کی گیل تو چھوڑ — مت دگدا میں منہ کو موڑ

چلا ہوں تجھ کو چھوڑ

گذشتہ تحریکاتِ آزادی کے نقشوں سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ شہری اور متمدن عوام انقلاب پیدا کرنے میں مدد معاون تو ہو سکتے ہیں مگر وہ خود حقیقی انقلاب پیدا نہیں کر سکتے، خود ملوں کے مزدور جو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہیں اور سرمایہ داروں پر دنیا تنگ کر سکتے ہیں ابھی تک اپنی ہستی کی اہمیت سے ناواقف ہیں، سچ پوچھئے تو ان میں کوئی کام بھی نہیں ہو سکا ہو رہے اِن کے نام نہاد لیڈر تو وہ ابھی سرمایہ کے سائے میں سوتے جاگتے ہیں خود ہر کا کوئی راستہ مقرر نہیں، کارواں کدھر جائے —!؟

مزدور کی طرح کسان بھی ہیں، یہ زراعتی مزدور ابھی تک زمیندار کو خدا سمجھتا ہے اور اس وقت تک جہالت و مفلسی نے صدیوں کے زنگ آلود دماغ کو حقائق کی روشنی میں ابھی تک اقتصادی مسئلوں کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا ہے، تعلیم کے عام ہونے کے بعد یہ درجہ آ سکتا ہے کہ کاشتکار طبقہ اقتصادی مسئلوں کو سمجھ کر اپنی، زمیندار اور ساہوکار کی صحیح پوزیشن کو معلوم کرے، مگر تعلیم کا جہاں تک تعلق ہو، شہروں میں عام نہیں بلکہ تناسبِ آبادی کے لحاظ سے یہاں کی اکثریت تقریباً جاہل ہے، بغیر ایک مضبوط قومی جمہوری حکومت کے ہندوستان میں عوام کی تعلیم و تہذیب ممکن نہیں لیکن جس وقت تک خود انقلاب کی باگ ڈور اعلیٰ طبقے کے ہاتھ میں رہی، یہاں وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی جو عوام کے لئے مفید ہو سکے، کانگریس سوشلسٹ گروپ اور اُس کے ہمخیال اس حقیقت کو جانتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ خود پرولتاری طبقے سے انقلاب کی چنگاری بھڑکے تنقلبی نے اسی بنیاد پر دیہاتی زبان میں جو اصل میں برج بھاشا ہی کی ایک شکل ہے، جنتا کے لئے ایسی کوتائیں لکھیں جو جس طرح اُن کی سمجھ میں آتی ہیں اور اُن کا خاطر خواہ اثر بھی ہوتا ہے؛

اس نے "انقلابِ روس" کی منظوم تاریخ لکھ کر اہم ترین انقلابی مسائل کو دیہاتیوں سے روشناس کرانے کی کوشش کی، اور ان تمام اسباب سے جو روس میں تبدیلی کی اصل بنیاد تھے، دیہاتی جنتا کو خود اُن کی زبان کے ذریعے آگاہ کر دیا؛

اگر غور کیا جائے تو یہ کوئی معمولی کام نہیں، اور یہ غیر معمولی کام ایک اُردو شاعر ہی نے کیا ہے، اقبال و جوش کو چھوڑ کر شہری عوام اور اعلیٰ طبقے میں جن نوجوان شعراء نے انقلابی تصورات کو پھیلایا اُن میں مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری، احسان، .... وغیرہ ہیں، اگر اِن تمام شعراء کے دیوانوں اور نظموں میں سے میں اقتباسات پیش کروں گا تو شاید [illegible]ء میں تو سمپورنانند جی کو جواب نہیں دیا جا سکیگا، مجاز اور احسان کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور جاں نثار وغیرہ کی نظموں سے تقریباً ہر سننے والا لطف اندوز اور متاثر ہوتا ہے؛

انقلابی شاعری کے فرائض میں محض اک رواجی انقلاب کی نغمہ خوانی ہرگز فرض نہیں کرنی چاہئے، کوئی شک نہیں کہ ملک میں سینکڑوں شاعر ایسے بھی ہیں جو انقلاب کا لفظ نظم میں لکھ دینا انقلابی شاعری کی تکمیل خیال کرتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہی، زندگی کی ایک ایک جزئیات میں تغیر و تبدیلی کی روح پھونک دینا اور کُل زندگی کا نفسیاتی اور تعمیراتی تجزیہ، یہی نہیں سخت تنقید کیا جائے[۲۲] — گویا اس مقام پر آنا اور آ کر ایک نظم سنا جانا کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے؛ یہ مقام عشقیہ شاعری کی نغمہ ریز منزل سے کہیں سخت اور بلند ہے، یہاں پہونچکر بتانا پڑے گا کہ واقعیت نگاری کی رُو سے محبت اور زندگی کا کیا ساتھ ہے!؟ محبت اور روٹی کا کیا ساتھ ہے؛ یعنی ساری زندگی پر ایک نئے عقیدے کے نقطۂ نگاہ سے نظرِ ثانی کرنی ہوگی!؟ یہ مقابر، یہ مجاور، یہ چادریں، یہ قبے، یہ پیر، یہ اولیا، یہ تعویذ، یہ گنڈے، یہ جلالی اور جمالی وظیفے، یہ برہمن اور سادھو، یہ مندر، یہ پجاری، یہ سر کی پیٹری، یہ پانڈے، یہ اُن کا آماسِ جسمی، اور یہ سائلوں کے سوکھے ہوئے جسم، یہ تدبیر، یہ تقدیر، یہ سزا و جزا، یہ خیر و شر، یہ نیکی و بدی، یہ حیات اور حیات بعد الممات، غرضکہ یہ تمام مسائل کیا ہیں اور کیوں ہیں!؟ اور آیا یہ انسانی زندگی کے دُکھ درد، یعنی ٹھوس الفاظ میں روحانی اور جسمانی بھوک کا علاج بھی ہیں یا نہیں!؟ (باقی)

مساغر

[۲۲] [illegible] انقلابی شاعری کے فرائض [illegible] —

ایشیا

پہلا باب

ادبیات سیاسیات

جنوری ۱۹۴۱ء

ولی کے سنہ وفات کی تحقیق

رسالہ "ادبی دنیا" لاہور بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں جناب مختار الدین صاحب آرزو نے ایک مضمون بعنوان "تاریخ ادبِ اردو" از رام بابو سکسینہ شائع کرایا ہے اور دوسرا مضمون بعنوان "سطحیاتِ سید سلیمان ندوی" رسالہ "نگار" لکھنؤ بابت ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں م۔ ا کے مختصر حروف کے نام سے چھپوایا ہے۔ ان دونوں مضامین کا مقصد ہمارے تذکرہ نویسوں کی غلطیوں کو طشت از بام کرنا معلوم ہوتا ہے۔ فی الحال ہم کو دیگر اغلاط سے سروکار نہیں ہے، ہم صرف ولی کے سنۂ وفات کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔

عنوانِ مندرجہ بالا پر ایک مختصر مضمون رسالہ "اردو" اورنگ آباد دکن بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا تھا جس میں ظاہر کیا تھا کہ ولی کی وفات سنہ ۱۱۱۹ ہجری میں ہوئی اور مؤلف تذکرۂ شعرائے دکن نے جو سالِ وفات سنہ ۱۱۵۵ ہجری لکھا ہے، وہ غلط ہے اور وہ قطعۂ تاریخ جس پر یہ استدلال کیا گیا ہے، کسی قلمی دیوانِ ولی کے خاتمہ پر درج ہے جس کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

مطلعِ دیوانِ عشق، سیّدِ اربابِ دل
والیِ ملکِ سخن، صاحبِ عرفاں ولی

سالِ وفاتش خرد از سرِ الہام گفت
بادہ پناہِ ولی، ساقیِ کوثر علی

۱۱۱۸ + ۱ = ۱۱۱۹ ہجری

ہم نے رسالہ "زمانہ" کانپور بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۴ء میں ولی کے سالِ وفات کے متعلق اپنے شکوک ظاہر کئے، اور قابل مدیر رسالہ "اردو" کی تحقیقِ سالِ وفاتِ ولی کو سرسری اور سطحی قرار دیا اور مولوی عبدالجبار خاں مرحوم مؤلف تذکرۂ شعرائے دکن کی تحقیق کو کہ ولی نے سنہ ۱۱۵۵ ہجری میں انتقال کیا، زیادہ قرینِ قیاس اور صحیح خیال کیا۔

ہمارے جوابی مضمون کی تردید مولوی عبدالحق صاحب یا کسی اور صاحب نے آج تک کہ چھ سال سے زائد ہو گئے نہیں کی تھی، اب کہ جناب مختار الدین صاحب آرزو نے قلم اٹھایا ہے اور دیگر امور کے ساتھ اس امر کی بھی تردید کی ہے کہ ولی نے سنہ ۱۱۵۵ ہجری میں انتقال کیا، ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا فرماتے ہیں اور سالِ وفاتِ ولی سنہ ۱۱۱۹ ہجری کے متعلق اُن کی کیا تحقیقات ہے۔

رسالہ "ادبی دنیا" مذکورہ بالا میں آپ تحریر فرماتے ہیں:-

"ولی کا سالِ وفات صحیح قول کی بنا پر مولانا عبدالحق کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۱۱۹ ہجری ہے"۔

معلوم ہوا کہ آپ نے کوئی تحقیقات نہیں کی، جو کچھ مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ "اردو" بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء میں لکھا تھا اُسی کو آمنّا و صدّقنا کہہ کر تسلیم کر لیا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ آپ نے جابجا اُسی مضمون کے اقتباس سے کام لے کر دلائل پیش کئے ہیں اور خود غور و خوض نہیں کیا ورنہ آپ ہرگز اس نتیجہ پر نہیں پہنچتے اور سالِ وفاتِ ولی سنہ ۱۱۵۵ ہجری مان لیتے۔

رسالہ "نگار" میں آپ تحریر فرماتے ہیں:-

صفحہ ۱۲ "یہ بھی صحیح نہیں کہ ہاشم علی ولی کا معاصر تھا، ہاشم علی گیارھویں صدی کے آخر یا بارھویں صدی کی ابتدا میں پیدا ہوا...... برخلاف ولی کے کہ وہ تقریباً سنہ ۱۰۹۳ ہجری میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۱۱۹ میں فوت ہوا"

اگر بقول آنجناب، ولی سنہ ۱۰۹۳ھ میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۱۱۹ھ میں فوت ہوا تو ولی کی عمر صرف چھبیس سال ہوئی، اس کم سنی اور عالمِ جوانی کی موت پر کسی تذکرہ نویس نے کوئی افسوس ظاہر نہیں کیا؟ حالانکہ عرفی تیس سال کی عمر

میں مرا تو ابوالفضل نے بھی جو اُس کا مخالف تھا اِن الفاظ میں اُس کی جواں مرگی کو بیاں کیا " وغنچۂ استعدادش ہنوز ناشگفتہ پژمُرد " اور ہمارے تذکرہ نویسوں نے یقین کی جواں مرگی پر کافی اظہارِ رنج و ملال کیا ہے اور میر عبدالحیٔ تاباں کی جواں مرگی پر تو میر جیسے لوگ بھی دل کھول کر روئے ہیں۔ پھر وَلی جو ابو الشعراء ہے اُس کے جوان مرنے پر کیوں نہ افسوس کیا جاتا۔ لیکن لوگ افسوس تو اُس وقت کرتے جب وَلی عمر طبیعی کو پہونچ کر نہ مرتا۔ اس خاموشی سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وَلی یقیناً ۱۱۵۵ھ ہجری میں فوت ہوا اور آپ کے سالِ ولادتِ وَلی کے مطابق ۳۲ برس کی عمر میں رہگرائے عالمِ فانی ہوا۔

علاوہ ازیں وہ صرف چھبیس ۲۶ سال کی عمر کے دوران میں دہلی بھی چلا آیا اور یہاں کے لوگوں سے خراجِ تحسین بھی وصول کر لیا بلکہ اپنے کلام کا دالہ و شیدا اور اپنا مقلد بنا لیا۔ دنیا میں ممکن سب کچھ ہے مگر یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے۔

رسالہ "ادبی دنیا" صفحہ ۱۷ پر آپ خود لکھتے ہیں :-

" (۲۶) صفحہ ۸۱ وَلی دکنی کی " روضتہ الشہداء " ۱۱۱۹ھ میں لکھی گئی۔ روضتہ الشہداء کے تین نسخے یورپ میں ہیں، دو انڈیا آفس اور ایک ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں ہے۔ سبھوں میں سالِ تصنیف ۱۱۳۰ھ درج ہے۔ میرے دعویٰ کی دلیل میں اس کا آخری شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

کیا ہوں ختم جب یو درد کا حال ۔۔۔ اگیارہ سو اوپر تھا تیسواں سال

بلوم ہارٹ نے بھی یہی لکھا ہے۔ یہ مثنوی بمبئی میں ۱۸۷۵ء و ۱۸۷۹ء میں طبع ہو چکی ہے۔

اگر وَلی دکنی کی " روضتہ الشہداء " ۱۱۳۰ھ ہجری کی تصنیف ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کم از کم ۱۱۳۰ھ ہجری تک زندہ تھا۔ اُس کی تاریخ وفات ۱۱۱۹ھ ہجری قرار نہیں دی جا سکتی۔ اور یہ شہادتیں (کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیوان وَلی کا مکمل نسخہ ۱۱۳۸ھ ہجری کا لکھا ہوا ہے اُس میں کاتب نے دلی کو مرحوم لکھا ہے یا مولانا ظفر الدین صاحب نے بانکے پور کے کتب خانہ میں دیوانِ وَلی کا ایک مختصر نسخہ دیکھا۔ ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وَلی کے کسی دوست نے ان کے انتقال کے بعد اپنے لئے کچھ پسندیدہ غزلیں الگ کر لی ہیں، تاریخ کتابت ۲۵ صفر المظفر ۱۱۲۲ھ ہے اور کاتب کا نام درج نہیں) بیکار ہیں۔ ۱۱۳۸ھ کے نسخے میں لفظ مرحوم کو غور سے دیکھنا چاہیئے۔ ممکن ہے آئندہ قارئین میں سے کسی نے یا خود کاتب نے لفظِ مرحوم یقیناً ۱۱۵۵ ہجری کے بعد اضافہ کر دیا ہو۔ مختصر نسخے کی عبارت تحریر نہیں کی گئی جس سے ہم بھی اندازہ کر سکتے کہ وَلی کے کسی دوست نے اُن غزلوں کا انتخاب واقعی اُن کے مرنے کے بعد ہی کیا ہے۔

رسالہ "ادبی دنیا" صفحہ ۱۷

" (۲۹) صفحہ ۸۵ " وَلی دو مرتبہ دہلی آئے " کسی معتبر تذکرے سے وَلی کا دو بار دہلی آنا ثابت نہیں "

قائم کا بیان کہ " وَلی در سن چہل و چہار از جلوس عالمگیر بادشاہ ۔۔۔۔۔ در شاہجہاں آباد آمد " مسلمہ ہے اور کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہے۔ آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ وَلی سنہ ۲ جلوسِ محمد شاہی یعنی ۱۱۳۲ ہجری میں دہلی آیا تھا۔ اس بیان کی کوئی تردید نہیں کی جا سکتی وَلی کا دیوان بے شک سنہ ۲ جلوسِ محمد شاہی میں دہلی پہونچا۔ جیسا کہ مصحفی کے تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے اور اس کے بعد خود ولی نے دہلی کا سفر اختیار کیا تذکرہ نویسوں کو اس بیان سے قطعی دھوکا نہیں ہوا۔ یہ صرف مولوی عبدالحق صاحب کا قیاس ہے۔ اگر آزاد سنہ ۱ جلوسِ محمد شاہی میں وَلی کا دہلی آنا لکھتے تو دھوکا کہا جا سکتا تھا لیکن سنہ ۳ جلوسِ محمد شاہی میں وَلی کا دہلی میں وارد ہونا اور بات ہے۔ شاہ سعد اللہ گلشن سے وَلی کی ملاقات اس دوسرے سفرِ دہلی میں ہوئی ہے، جیسا کہ آبِ حیات میں درج ہے۔ میر نے نکات الشعراء میں اور قائم نے مخزنِ نکات میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے اور مجموعۂ نغز میں حکیم ابو القاسم نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ " وے (وَلی) عزیزے بود از سکنۂ دیارِ دکن و مریدانِ سعد اللہ گلشن علیہما الرحمت و الغفران و امرہما اللہ تعالےٰ فی روضات الجنان۔ گویند نسبتِ تلمذ ہم بجناب ایشاں داشت و در آخر ہا باستصواب شاں ہمت بہ سخن طرازی می گماشت "

رسالہ " ادبی دنیا " صفحہ ۱۸

" وہ مجلس سرے سے وَلی کی ہے ہی نہیں۔ وَلی نے وہ مجلس کے نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی، یہ غلطی جناب احسن مارہروی سے بھی ہوئی اُنھوں نے ستم یہ کیا کہ کلیات ولی میں اسے بھی ٹھونس دیا۔ وہ مجلس اصل

میں ولی ویلوری کی تصنیف ہو، ولی دکنی سے کوئی لگاؤ نہیں اس لئے کہ دہ مجلس کا سالِ تصنیف سنہ ۱۱۴۱ھ ہے، جیساکہ کتاب کے خاتمہ سے پتہ چلتا ہے ؎

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال
تھا گیارہ سو پہ اکتالیس سال
کہا ہاتف نے یوں تاریخ معقول
ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

اور ولی کا سالِ وفات صحیح قول پر سنہ ۱۱۱۹ھ ہے۔ آخری شعر میں ولی تخلص موجود ہے جو اس عہد میں ولی ویلوری کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

عبارت متذکرہ بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ولی کا سالِ وفات سنہ ۱۱۱۹ھ صحیح مان کر استدلال کیا گیا ہے۔ اگر سنہ ۱۱۱۹ ہجری کو غلط مان کر استدلال کیا جائے تو ولی کی دہ مجلس کے اِن اشعار سے یہ تائید ہو جائے گی کہ ولی سنہ ۱۱۴۱ ہجری تک زندہ تھا۔ چنانچہ نصیر الدین ہاشمی سنہ ۱۱۴۳ھ کو اسی بنا پر زیادہ صحیح سالِ وفات ولی سمجھتے ہیں۔ احسن مارہروی نے دہ مجلس کو کلیاتِ ولی میں نہیں ٹھونسا جیساکہ آپ کا خیال ہے۔ اُنھوں نے اس کے متعلق کلیاتِ ولی کے صفحہ ۸۷ پر حسبِ ذیل عبارت تحریر کی ہے :۔

"بعض صحیح روایتوں اور مشاہدوں سے پتہ چلتا ہے کہ شہادت کربلا کے بیان میں دہ مجلس ولی کی مثنوی کا نام ہے جس کی تاریخ اختتام اس دیوان کے آخر میں درج ہوئی ہے۔ اس روایتی مثنوی کے سوا موجودہ کلیات میں صرف ۸۷ شعر مثنوی کے وزن میں دستیاب ہوتے ہیں..... ممکن ہے کہ حصّۂ اوّل دہ مجلس کا ٹکڑا ہو، اور یہ قیاس اس لئے ہوتا ہے کہ مثنوی کی تاریخ اختتام بھی اسی بحر میں کہی گئی ہے۔"

دہ مجلس، ولی ویلوری کی تصنیف کس طرح بتائی جا سکتی ہے؟ کسی تذکرہ نویس کی عبارت کا حوالہ دینا چاہئے تاکہ معلوم ہو کہ ولی ویلوری نے دہ مجلس تصنیف کی تھی۔

مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں ہے جو اُن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ولی کے کسی دیوان میں جس کے بارہ نسخے اُن کے پاس ہیں، یہ شعر نہیں پایا گیا۔ بلکہ یہ شعر مضمون کا ہے اور صاحب تذکرۂ گلشنِ گفتار اور مصنّف چمنستانِ شعراء کا حوالہ دیا ہے کہ اُنھوں نے بادنیٰ تغیر اس طرح لکھا ہے۔

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اگر دیوانِ ولی میں یہ شعر نہیں ہے تو نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ فرد کے طور پر یہ شعر کہہ دیا گیا ہو اور دیوان میں داخل نہ کیا ہو۔ کیونکہ ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے۔ غزل کا کوئی شعر نہیں ہے۔ چونکہ اس بحر اور ردیف و قافیہ میں ولی کی کوئی غزل نہیں ہے اس وجہ سے ممکن ہے کہ یہ شعر داخلِ دیوان ہونے سے رہ گیا ہو اور زبانوں پر چلا آتا ہو۔ اور مضمون نے ممکن ہے کہ آخر مصرع ولی کا لے کر پہلا مصرع اپنے حسبِ حال چسپاں کر دیا ہو، اکثر شعراء دیگر شعراء کے مصرعوں پر تضمین کرتے رہتے ہیں اور اب تک یہ قاعدہ چلا آتا ہے لہذا مضمون کے شعر سے ولی کے شعر کی ہرگز تنسیخ نہیں ہو سکتی، یہ عجیب بات ہے کہ جو اشعار ولی کے دیوان میں داخل ہیں، مثلاً دہ مجلس کی تاریخ اختتام وہ ولی ویلوری کے بلا وجہ اور بلا کسی حوالے کے بتا دیئے جاتے ہیں اور جو شعر دیوان میں داخل نہیں اور زبانوں پر چلا آتا ہے اُسے مضمون کا کہہ کر خارج از آہنگ کر دیا جاتا ہے۔ یہ طریقۂ استدلال ہرگز مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ ہم کو یقین ہے کہ مندرجہ بالا شعر ولی کا ہے۔ کیونکہ شہر سورت کی تعریف میں ولی مثنوی لکھ دے اور دہلی میں آکر اُس پر اتنا اثر بھی نہ ہو کہ وہ کم از کم شہر دہلی اور بادشاہِ وقت کے متعلق ایک شعر ہی کہہ دے۔ ہمارے نزدیک ولی نے ضرور یہ شعر کہا اور وہ بلاشبہ محمد شاہ کے زمانہ میں بھی دہلی گیا تھا۔

سیّد صاحب ولی کو دکنی سمجھتے ہیں، حالانکہ ولی گجراتی تھے۔ آزاد نے غلط لکھا ہے "احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے آبِ حیات صفحہ ۹۷) آزاد کے بیان اکثر غلط بھی ہوتے ہیں لیکن بعض مرتبہ بہت اہم بات کہہ جاتے ہیں۔

میر حسن نے بھی یہی لکھا ہے، خواجہ حمید خاں اورنگ آبادی "گلشن گفتار" اور قائم "مخزنِ نکات" میں اسے گجراتی بتاتے ہیں۔ کتاب خانہ مولانا ظفر الدین قادری میں دیوانِ ولی کا ایک قدیم قلمی نسخہ نظر سے گزرا، لوح پر لکھا ہوا تھا "دیوانِ ولی محمد گجراتی" اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ وہ گجراتی تھے۔ دوسری بات یہ کہ ان کا صحیح نام "ولی محمد" تھا"

اگر آزاد ولی کو گجراتی بتاتے ہیں اور آپ اُن کے قول کو ہم سمجھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ آزاد کے اِس بیان کو بھی تسلیم نہ کریں کہ ولی سنہ جلوسِ محمد شاہی یعنی سنہ ۱۱۳۲ھ میں دہلی آیا تھا۔ لیکن آپ نے اِسی احتیاط سے یہ فقرہ بھی لکھ دیا ہے کہ آزاد کے بیان اکثر غلط بھی ہوتے ہیں، لہٰذا آپ کو آزادی ہے کہ آزاد کا جو بیان چاہیں تسلیم کرلیں اور جو بیان آپ کے خلاف منشا ہو، اُس کو نہ مانیں۔ بہرحال میں آپ سے یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ احسن مارہروی نے ان کو دکنی بتایا ہے اور اُن کے پاس بھی بارہ قلمی نسخے دیوانِ ولی کے موجود تھے جو غالباً مولوی عبد الحق صاحب کے قبضے میں آگئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں (کلیاتِ ولی صفحہ ۱۶)

"جن تذکرہ نویسوں نے ولی کو گجراتی یا احمد آبادی سمجھ لیا ہے وہ نہ صرف اُن کے قیامِ احمد آباد سے دھوکا کھا گئے ہیں بلکہ اُن کی وفاتِ احمد آباد نے اس وہم کو جامۂ یقین پہنا دیا ہے۔ بغیر کسی تاویل و تامل کے ولی کا دکنی ہونا اُن کے متعدد اشعار سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً:-

یو تکّہ کی شمع سے روشن ہو صفتِ انسلیم کی مجلس
ولی پروانگی کرتا تری ملکِ دکن بہیتر

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے

ایسے اشعار پڑھنے کے بعد اُن کے وطن کی مزید تحقیقات عبث ہے"

خود آپ نے "ادبی دنیا" مضمون میں ولی کو دکنی لکھا ہے اور "نگار" والے مضمون میں اُن کے وطن اور نام کی بحث چھیڑ دی ہے۔

علاوہ ازیں بعض محاورات جو خاص دکن (حیدرآباد) کے ہیں اُن کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:-

کتابِ حسن کا یو کھہ صفا تیرا صفا (دستا)
(نظر آتا)
ترے ابرو کے دو مصرع سے اس کا ابتدا (دستا)

تجھ قد و قامت اگے سرو ہوا سرنگوں
تجھ سے رواں سرو اگے سرو کو شل (بولنا)

یہ (بول کے بولنا) خاص دکنی روز مرہ ہے۔

ترے آنے کی بات او پر بچھایا ہوں انکھاں اپنی
تو بیگی آکر تجھ بن مجھ کو یہ گھر بار کیا کرنا

"بیگی" جلدی کے معنی میں خاص وہاں کی بولی ہے۔

تمیں ملنے سے اپنے گر سہاگن نا کروگے مجھ
تو جوڑا گجگری کا ھور کریلا دھار کیا کرنا

(گجگری جوڑا) اور (کریلا دھار) جوڑے اور چوٹی کی خاص بناوٹ اور وضع کو صوبۂ دکن میں کہتے ہیں۔

غرض اِس قسم کے الفاظ اور محاورات ولی کے دکنی ہونے پر شاہدِ عادل ہیں۔ ولی کے دکنی ہونے کی بحث یہاں اِس وجہ سے چھیڑی گئی کہ کبھی آپ روضۃ الشہدا کو کسی (دُوسرے) ولی کی تصنیف نہ کہہ دیں۔ "ادبی دنیا" میں اُسکو آپ ولی دکنی کی تصنیف کہہ چکے ہیں اور ولی جس کو آپ "نگار" میں گجراتی کہتے ہیں، دکنی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہمارے قدیم تذکرہ نویسوں نے شعراء کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تاریخ ولادت و وفات کے متعلق بہت بے اعتنائی سے کام لیا ہے یہی وجہ ہے کہ نام، وطن، سالِ ولادت و وفات، غرض جملہ خصوصیاتِ ولی خلطِ مبحث ہوکر رہ گئی ہیں۔

جب کسی صاحب کے ہاتھ میں دیوانِ ولی کا کوئی قلمی نسخہ آجاتا ہے تو وہ اِن امور کے متعلق اپنے قلمی نسخے کی روشنی میں رائے زنی شروع فرما دیتے ہیں، حالانکہ ضرورت اِس امر کی ہے کہ جملہ تحریرات کو جواب پبلک کے سامنے آچکی ہیں، نظرِ امعان سے دیکھ کر رائے قائم کی جائے۔

محمد یحییٰ تنہا

۲۱؍ دسمبر ۱۹۴۰ء

بالشویت کے مقاصد

ترجمہ از "بالشویزم و پان اسلامزم"

مصنفہ
شیخ مشیر حسین قدوائی

یہ ایک مشہور کہاوت ہے کہ اس آسمان کے نیچے کوئی چیز نئی نہیں ہے، اس کہاوت میں صداقت پائی جاتی ہے۔ سب سے بڑے اجازی مصلح (نبی آخر الزماں) نے بھی ایک نئے مذہب کے لانے کا دعویٰ نہیں کیا تھا انھوں نے اعلان کیا تھا کہ "ہر بچہ اپنے فطری مذہب پر پیدا ہوتا ہے" اس فطری مذہب کو دوسرے الفاظ میں اسلام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ہر انسان مسلم ہے چاہے وہ کسی عہد میں پیدا ہوا ہو اور چاہے وہ کسی ملک اور نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ بالشویت نے بھی کسی نئی چیز کے نفاذ کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ جاسف اسٹالن نے جو بالشویک ریاست کا موجودہ سوار یا آمر ہے، بالشویت یا لینیت کی یوں تعریف کی ہے:-

"لینیت شہنشاہیت اور مزدوروں کے انقلاب کے دور کی مارکسیت کا دوسرا نام ہے، زیادہ واضح طور پر لینیت کی یوں تعریف ہوسکتی ہے کہ یہ عموماً مزدوروں کے انقلاب اور خصوصاً مزدوروں کی آمریت کے تدابیر نظریات کا نام ہے۔"

اس سے یہ معلوم ہوا کہ مارکسیت اور لینیت دونوں ایک ہی چیز ہیں لیکن جب اس نے اپنی قابل یادگار کتاب "سرمایہ" میں اپنی اشتمالی ذہنیات کو دنیا کے سامنے پیش کیا تو کسی کے موئے جسم کو جنبش تک نہ ہوئی۔ لیکن لینن کی بالشویت نے جو کہ ابھی مارکسیت کے اصل کی فرع ہے تمام عالم میں ہیجان پیدا کر دیا۔ مارکس نے بھی افلاطون، کوبرٹ اور آومن (Omen) کی طرح مثالی .... خواب دیکھا تھا لیکن جب تک وہ محض خواب و خیال رہا اس وقت تک معدودے چند حضرات نے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی ہوگی۔ لیکن دول یورپ اس وقت خوف زدہ ہوئیں۔ جب علمبرداران بالشویت نے عسکری انقلاب سے مکمل فائدہ اٹھاکر ان مثالی ذہنیات کی کہانیوں کو حقیقت میں تبدیل کردیا اور جب انھوں نے زار نکولس دویم کے ہاتھوں سے تمام روسی حکومت کو چھین کر اس بدبخت اور بدقل خودمختار مطلق کو اس کے خاندان کے ہمراہ ایکٹرنبرگ (Ekterinburg) بھیجدیا — ایک ایسا مقام جو ان مقامات سے زیادہ دور نہ تھا، جہاں ہزاروں انقلاب پسندوں کو اس نے ذلیل موت مرنے کے لئے جلاوطن کردیا تھا آخر یورپ کی حکومتیں خوف سے کیوں نہ کانپنے لگتیں جبکہ ان کی سرحد پر ایک ایسی حکومت نے اقتدار پالیا ہے جو ہر حیثیت سے ان کی مخالف ہے، بالشویکی پروگرام کی خوفناکی اس امر میں مضمر ہے کہ مطلق العنان شہنشاہیت، سرمایہ داری اور پارلیمنٹ کے ذلیل و پست نظام کو مٹاکر ایک عالمگیر انقلاب سے دنیا کو آشنا کرانا چاہتا ہے، مزدوروں کو روٹی، کاشتکاروں کو زمین اور تمام انسانیت کو امن و سلامتی"، یہ بالشویکوں کا نعرہ تھا۔ گویا یہ تمام حکومتیں اور سارے اصولوں کے خلاف ایک دعوت جہاد تھی۔ دونوں اصولی جماعتوں کو جو اس وقت باہم دست و گریباں تھیں ایک وہ جو اپنے وجود کو دستانہ معاہدوں سے بچائے ہوئے تھیں اور دوسری مرکزی طاقت والی جماعت۔ بالشویت ان فوری اصلاحات پر منحصر ہے جو کہ کمیونسٹ منشور، میں مذکور ہیں۔

(۱) ملکیت آراضی کی ضبطی اور حکومت کے اخراجات کے لئے زمین کی مالگذاری کا استعمال۔

(۲) شدید اور ترقی پذیر محصول مالیت (آمدنی) جو حسب مراتب لگایا جائے۔

(۳) انسداد حق وراثت۔

(۴) تمام باغی اور تارک وطن کی جائداد کی ضبطی۔

(۵) ایک ریاستی بنک کا قیام جس میں ریاست کا سرمایہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ریاست کو بلا شرکت غیرے پورا اجارہ حاصل ہو تاکہ ریاست کی ضرورت کے لئے منافع کو مرکز میں جمع کیا جا سکے۔

(۶) ریاست کے ہاتھوں میں نقل و حمل کی مرکزیت حاصل ہو۔

(۷) ایک عام تدبیر کے ماتحت زراعتی املاک کی اصلاح اور دوبارہ تقسیم۔ آلات پیداوار اور فیکٹریوں پر ریاست کی حق ملکیت میں اضافہ۔

(۸) کام کرنے کی عالمگیر پابندی اور خصوصاً زراعت کے لئے مزدوروں کی جماعتوں کا قیام۔

(۹) صنعتی اور زراعتی محنت میں اتحاد۔ شہر اور دیہات کے باہمی اختلافات کا تدریجی انسداد۔

(۱۰) بچوں کی عام تعلیم۔

(۱۱) بچوں کے لئے فیکٹری میں مزدوری کرنے کی موجودہ طریق کا انسداد۔

وہ منشور اس خلاصۂ تحریر پر جا کر ختم ہوتا ہے:-

"انتہا پسند کمیونسٹ اپنے خیالات اور ارادوں کو پردۂ راز میں رکھنا جہل اور جرم سمجھتے ہیں وہ کھلے طور پر اعلان کرتے ہیں کہ وہ موجودہ نظام معاشرت کی بنیادوں کو تشدد سے ڈھا کر صرف اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہونچا سکتے ہیں، حکومت کرنے والے طبقے اشتمالی انقلاب سے کانپا کریں مگر مزدوروں کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا، سوا اس کے کہ وہ غلامی کی زنجیروں سے رہا ہو جائیں گے۔ مزدوروں کو ساری دنیا پر قبضہ کرنا ہے اور چاہئے کہ تمام ممالک کے مزدور رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو جائیں۔"

"اعلانِ حقوق، طبقۂ مزدور" جو ۱۰ جولائی ۱۹۱۸ء کو شائع ہوا تھا حسب ذیل ہے۔

"روس مزدوروں، سپاہیوں اور کسانوں کے نمائندوں کی حکومت خیال کی جائے گی جس کا نام جمہوریۂ سوویٹ ہوگا۔ تمام مرکزی اور مقامی اختیارات ان کے سوویٹ کو حاصل ہوں گے۔

روسی سوویٹ جمہوریہ آزاد قوموں کے آزادانہ اتحاد پر قائم ہوگی جس کی صورت قومی سوویٹ جمہوریہ کے وفاق کی سی ہوگی۔

ان کے بنیادی مقاصد میں حسب ذیل نکات شامل تھے:-

اول یہ کہ اس ناجائز وتیرہ کو جو ایک انسان محض اپنے بازوؤں کی طاقت کے سہارے اپنے دوسرے بھائی سے اٹھاتا ہے فرو کیا جائے گا۔ دوم سماج کی طبقہ وار تقسیم ابد تک کے لئے ممنوع قرار دی جائے گی۔ سوم سارے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کو کچل دیا جائے گا اور اشتراکیت کے اصولوں پر سماج کو منظم کیا جائے گا۔ چہارم یہ کہ تمام ممالک میں اشتراکیت کی فتح کا جھنڈا لہرایا جائے گا۔

تیسرے "ہمہ روس اجتماع سوویٹ" All Russia Soviet congress نے ذاتی حق ملکیت اراضی کو ممنوع قرار دے دیا۔ اور اعلان کیا گیا کہ ساری زمین قوم کی ملکیت ہے۔ یہ زمین مزدوروں میں تقسیم کر دی گئی، مگر انھیں صرف حق کاشت ہی حاصل تھا۔ اس نے مزدوروں کے قانون سوویٹ کی بھی تصدیق کی جو صنعتی کارگاہوں کی نگرانی اور اختیارات سے متعلق تھا۔

اس کانگریس نے تمام قرضوں کی تردید کر دی، تمام بنکوں کو مزدوروں کی ملکیت قرار دے کر کسانوں کی حکومت کے نام منتقل کر دیا۔ یہ بین الاقوامی مالی سرمایہ داری پر پہلی یلغار تھی جس نے اسے سخت نقصان پہونچایا۔

طبقۂ مزدور کے کروڑوں نفوس کو سرمایہ داری کے جوئے سے رہا کرانے کے لئے کام کرنا ہر کس و ناکس پر لازم کر دیا گیا جو قوم کے حق میں مفید تھا۔ تمام انسانیت کو مالی شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے آہنی چنگل سے چھڑانے کا انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا اور اس غایت کی تکمیل کے لئے کانگریس نے "خفیہ معاہدوں" کو تسلیم نہ کیا۔ امن و آشتی کی تحصیل کے لئے انقلابی ذرائع کے استعمال پر بہت زور دیا گیا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ نکات بھی واضح کر دیئے گئے کہ دوسرے ممالک کو نہ تاوان ادا کرنا پڑے گا اور نہ مملکت روس میں ملحق کئے جائیں گے۔ بلکہ انھیں اپنی قوم کے تحفظ کی آزادی حاصل ہوگی۔ انھیں مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کانگریس نے مزید برآں سرمایہ داروں کی تہذیب کی وحشیانہ پالیسی کے مکمل استیصال پر زور دیا ہے کیونکہ اس طرح چند اجارہ دار قوموں کے دو چار سرمایہ دار ایشیا، نوآبادیات اور چھوٹے چھوٹے مقبوضات کے کروڑوں مزدوروں کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ڈال کر ان کا سارا مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں۔

ایک آئی سی۔ ایس بالشویت کی مخالفت کرتے ہوئے، اس کے مقاصد کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:-

"بالشویت کا مقصدِ اوّلیں یہ ہے کہ وہ سرمایہ کے قلع قمع کو لئے ایک عالمگیر انقلاب پیدا کرے، دوسرے یہ کہ وہ ملکیت کو قومی رنگ دے اور تیسرے یہ کہ مزدوروں کی عالمگیر برادری کو عمل میں لے آئے"

"اس معیاری حکومت میں وہ تمام سیاسی رکاوٹیں اور موانع قلع قمع کر دیئے جائیں گے۔ جو قوموں میں تفریق پیدا کرنے کے باعث ہیں، وجود جنگ و جدل ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے گا اور اوطان کی علیحدگی اور تفریق صفحۂ ہستی سے مٹا دی جائے گی۔ دنیا کے گوشے گوشے کے لوگ ہمہ گیر انسانیت کے رشتہ میں بلا امتیاز وطنیت منسلک ہو جائیں گے اور اس طرح سب متحد ہو کر انسانیتِ عظیم کی بنیاد ڈالیں گے۔ سکہ کا وجود متروک ہو جائے گا اور مالیات بھی معدوم ہو جائیں گی محصولات کا سوال ہی ختم ہو جائے گا۔ اس حکومت میں نہ کوئی سرمایہ دار ہوگا نہ زمیندار اور نہ کوئی مالک ملکیت ہوگا نہ انفرادی تاجر تمام آبادی کو بلا اجر ضروریات زندگی کی تحصیل کا حق ہوگا، صرف اسے اس کے بدلے میں محنت کرنی پڑے گی۔ آخر کار ریاست کی ضرورت بھی جاتی رہے گی، تمام لوگ ہم مرتبہ بھائی بھائی ہو جائیں گے اور اس طرح آہستہ آہستہ سماج کی طبقہ وار تقسیم کا خیال بھی ہم لوگوں کے ذہن سے معدوم ہو جائے گا۔"

ایک ہندو نامہ نگار جو منو کی قانونی اہلیت کا معتقد ہے بالشویت کی نمایاں خصوصیات کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے

"مجوزہ اسکیم کے ماتحت صنعتی اور زراعتی پیداوار بلا منافع کے تقسیم پیداوار ہر لڑکے اور لڑکی کے لئے ایسی تمدنی تعلیم جس میں کوئی نہ کوئی پیشہ ضرور سکھایا جائے۔ طبی امداد۔ ایسے عام پارک جہاں ہر خاص و عام کی رسائی ہو، ایسا عدالتی نظام جہاں سستا اور فوری انصاف مل سکے، درجنوں نئے خاکے کے بسائے ہوئے شہر، سوویٹ اور مجالس مقننہ میں پیشوں کے لحاظ سے سرکاری اور اثر انداز نمائندگی، جہالت کا انسداد، بے روزگاری، عصمت فروشی، انتہا افلاس، اور بھیک منگوں کا انسداد"

چونکہ نامہ نگار ہندو مذہب کے پیرو کار ہیں اس لئے سرمایہ داری کا انسداد، اور غیر طبقہ وارانہ سماج کے قیام کی سعی ان کی آنکھوں میں جچ نہ سکی، اسی لئے بالشویت کے خصوصیات حسنہ کی فہرست میں اس کو شمار کرنا بھول گئے۔ منو بھی غالباً ان دو چیزوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتا۔ ایک ہندو جس کی تربیت فرقہ وارانہ نظامِ معاشرت میں ہوتی ہے وہ اشتمالی غیر طبقہ وارانہ سماج پر برہمنیت زدہ نسل ایسے لوگوں کے پسندیدہ نظامِ معاشرت کو ترجیح دیگا۔ اس موخر الذکر نظام کا نام "ہم پیشہ نظام سعی" Guild Saystem ہے۔

اس کے برعکس ایک مسلمان جو بالشویت کا سخت ترین دشمن ہے اس کے چند مقاصد کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ "بالشویت کا مطمح نظر یہ ہے کہ وہ مختلف ممالک رنگ اور نسل کے لوگوں میں مکمل آزادی اور مساوات کو قائم کرے، ایک غیر طبقہ وارانہ معاشرت کی تعمیر کرے اور سرمایہ داری کو دنیا سے محو کر دے"

یہ حریف بالشویت اس حد تک کہنے کو تیار ہے کہ صرف سائبریا اور ترکستان کے مسلمانوں نے ان پیشوایانِ بالشویت کے دلوں میں یہ بلند مقاصد پیدا کئے ہیں

نوٹ Guild System اس نظام معاشرت کو کہتے ہیں جس کا دائرۂ رکنیت محض ہم پیشہ لوگوں تک وسیع ہو، مثلاً ہندوؤں کا نظام جس میں معاشرت کی تقسیم چار ذاتوں میں کی گئی تھی جس تقسیم کی بنیاد پیشہ پر ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

17

کہ جب نفی دین و تشکیک مذہب اور اشتمالیت نے روس کے دماغوں پر پورے طور پر غلبہ پالیا اور اس نے عوام کو حکومتِ زار کے خلاف بغاوت کے لئے للکار للکار کر پکارا تو ایشیائی اور یورپی روسی مسلمانوں کو بھی اس زنجیر کو جس سے جکڑے ہوئے تھے کاٹ ڈالنے کی فکر دامنگیر ہوئی اور انھوں نے روسی اشتمالیت میں انسانیت کی مکمل آزادی، مساوات اور ضد سرمایہ داری کے مین اسلامی نظریئے کو شامل کر دیا تاکہ مسلمانوں کے لئے جاذبِ نظر بنجائے اس کا خیال ہے کہ وہ اسلام کے عناصر کو اس میں رائج کرنے سے اس لئے قاصر رہے کہ روس کے نصرانی پادریوں نے زار کے عہد میں اشتمالی مصلحین کو اپنے غلط اور تنگ رویہ سے نصرانیت کی طرف سے بدظن کر دیا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ وہ تمام ادیان کے دشمن ہو گئے تھے، اس کی نظر میں عیسائیت کی معقولیت جس کی روس میں اشاعت کی جاتی تھی خود اس بدظنی کا سبب ہوئی۔

لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ بالشویت اور اشتمالیت دنیا کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ اپنی بدترین شکل میں اسلام سے قبل ایران قدیم میں مزدک کے

ہاتھوں رونما ہو چکی تھی، جبکہ مزدک نے شادی بیاہ کے رواج کو مٹا دیا تھا اور اس نے اعلان کر دیا تھا کہ جس طرح پانی اور ہوا میں ہر شخص حصہ دار ہے اسی طرح عورتوں میں بھی ہر شخص کا حصہ ہے . . . .

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ روسی بالشویت کو پندرہ برس گزر گئے مگر وہ ابھی اپنے آزمائشی دور میں ہے۔ اسکیم در اسکیم تیار کی گئی ہیں۔ پہلے پنج سالہ اسکیم کے ماتحت صنعتی کارخانوں کے کھولنے کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے، اس وقت Kolhozy (مشترکہ کاشت) کا لوگوں کو خبط سوار ہو گیا تھا۔

ایک دوسرے مصنف مارکس ہنڈس Marcus Hindus نے Kolhoizatoni (مشترکہ کاشت کاری) کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے: مشترکہ کاشت کے تین اقسام ہیں جس میں دو قابلِ ذکر ہیں، اوّل commune کمیون۔ دوسرا artel ہے۔ کمیون وسیع ترین معاشرتی نظام ہے اس میں انفرادی جائداد جو بذریعۂ آمدنی ہو رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور تمام پیداوار کے ذرائع مثلاً زمین، آلات، ذخیرہ، سرمایہ اور عمارات سب مشترک ہوتی ہیں، ایک کمیون میں کوئی شخص گھر، باغ، بکری اور مرغی کا مالک نہیں بن سکتا، ایک شخص کو صرف نجی اور ذاتی سامان رکھنے کا حق حاصل ہے، مثلاً کپڑے، کبھی کبھی گھر کے فرنیچر کی بھی اجازت دے دی جاتی ہے، اور جو کچھ بچت وہ سال کے دوران میں اپنی مزدوری یا اپنے حصہ کے منافع سے کرتا ہے وہ اختتام سال پر تمام ممبروں میں تقسیم کر دی جاتی ہے

Artel آرٹل کی صورت میں (جس کی حکومت زیادہ اشاعت کرتی ہے) کسان اپنی زمین، ذخیرہ، آلات، محنت، کھیت سے ملحق مکانات اور وہ بچت جو انھوں نے غلہ یا سکۂ رائج الوقت کی شکل میں رکھی ہے، مشترک کر دیتے ہیں، لیکن اس حالت میں انھیں اپنے ذاتی مکانات، گائے، مرغیاں، بط، بھیڑ، بکری اور سور کی انفرادی ملکیت کی اجازت ہوتی ہے لیکن اتنی ہی تعداد میں جو اُن کی ضروریات کے لئے کافی ہو، وہ اپنے ذاتی باغ بھی رکھتے ہیں، وہ اپنی پیداوار کو انجمن امدادِ باہمی کے ہاتھوں فروخت کر سکتے ہیں اور کھلے بازار میں بھی،

جب ایک نیا ممبر اپنی جائداد (Kolhozy) انجمن کاشت مشترک کے ہاتھوں سپرد کرتا ہے تو اس جائداد کی قیمت کا تخمینہ لگایا جاتا ہے (اس نرخ سے جو بازار میں مل سکتی ہے) یہ رقم تین حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

(۱) فیس داخلہ (۲) غیر تقسیم پذیر فنڈ (۳) فیس ممبری۔

پہلے حصہ کی مقدار کل سرمایہ کے دو فی صدی سے دس فی صدی تک مقرر کی جا سکتی ہے، دوسرا حصہ دسویں حصے سے لے کر نصف تک، اور بقیہ رقم اس کی فیس ممبری خیال کی جاتی ہے۔ پہلے دو حصے انجمن کاشت مشترک کی دائمی ملکیت خیال کئے جاتے ہیں، تیسرے حصے کی رقم پر اسے منافع ملتا ہے، اخراج کے وقت وہ اسے واپس لے سکتا ہے۔

مترجمہ

ملک حامد حسین متعلم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی شاعری

(مکتوب ناظر صاحب کاکوروی) عرصۂ دراز کے بعد ایشیا ملا، دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ خدا نے تم کو ادب اُردو کی خدمت کرنے کا عجیب سلیقہ عطا کیا ہے خدا کرے کہ اُردو والے تمہاری بے لوث خدمت کی قدر کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ دور حاضرہ میں ایسا بے نظیر رسالہ نکالنا معجزہ سے کم نہیں ہے
آجکل رسالہ نکالنا تو مشکل نہیں ہے، لیکن اچھا ادب لوگوں تک پہونچانا یقیناً مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، میں نے سارا رسالہ پڑھ ڈالا کہیں بھی کوئی سقم محسوس نہ کیا

ناظر کاکوروی

(یہ مقالہ انجمن بہار ادب لکھنؤ کے اجلاس منعقدہ ۲۸ فروری ۱۹۳۸ء قیصر باغ بارہ دری میں مخدوم ادب رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں پڑھا گیا جو بیحد پسند کیا گیا، اس کی نقل خود جناب صدر نے طلب کی تھی اور ایک صاحب نے اجلاس کے اختتام پر سپرو گولڈ میڈل کا اعلان کیا تھا، اب یہ مقالہ کتابی شکل میں حضرت خواجہ حسن نظامی کی جانب سے اردو کلب دہلی کی طرف سے عنقریب شائع ہونے والا ہے، یہ مقالہ اس کتاب کا پہلا باب ہے

لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کا سنگِ بنیاد صحیح معنوں میں شاہانِ اودھ کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا تھا اور اس کی آبیاری شاہزادگانِ اودھ اور اُمرائے سلطنت نے ہر موقع پر کی تھی، لیکن یادش بخیر جب اسلامی دنیا کا مغلئی پرچم ابھی ہوا میں لہرا رہا تھا اور جب شہنشاہ محمد شاہ رنگیلے کی

مُنہ بولی بیٹی نواب اُمت الزہرہ بیگم بیاہ کر فیض آباد آئیں تو اکبری دبدبہ، شاہجہانی طنطنہ اور عالمگیری سطوت مغل اعظم کے دربار کی نفاست اور تہذیب محلات کی معاشرت، بیگمات کی بول چال اور قلعہ کی شاعری سخن سنجوں کی طرز ادا اور سخن فہموں کی طرز نگارش اپنے ہمراہ لائیں اور فیض آباد میں

ایک باضابطہ ادبی سبھا قائم کی، یہی نہیں بلکہ جملہ ادبا، علما اور اہلِ کمال کی قدر دانی کر کے ادب کے سرپرستوں کی تاریخ میں رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑا۔ اور آج بھی اجودھیا کی گلیوں سے لے کر مشہدِ مقدس کے کوچہ و بازار تک اس عابدہ اور مخیرہ کے نام سے آشنا ہیں۔ لکھنؤ اسکول کی نشو و نما میں بہو بیگم کا بڑا ہاتھ ہے جب مقدر سے اودھ کی تاجداری ایک ایسے مخیر اور سخی ان داتا کو ملی جس کی سخاوت کی داستانیں کل کی بھولی بسری کہانیاں نہیں ہیں بلکہ آج بھی لکھنؤ کے کوچہ و بازار میں مشہور ہیں کہ "جس کو نہ دے مولا اس کو دلائیں آصف الدولہ" تو لکھنؤ میں اجد مالی قائم ہوئی اور لکھنؤ اسکول کی باضابطہ بنا پڑی دلی سے رشتۂ مواخات قائم تھا، برابر اہلِ کمال لکھنؤ آتے اور آصفی نذر پاشیوں سے دامنِ مراد بھرتے اور دولت اقبال کی چڑھتی ہوئی دھوپ میں آصفی دربار کے بقا و عروج کے ترانے گاتے تھے:

نواب آصف الدولہ خود بے نظیر شاعر تھے، ان کے دیوان کا انتخاب ابھی حال میں شائع ہوا ہے اور ملک کو ماننا پڑا ہے کہ پہلا جذباتی شاعر لکھنؤ اسکول ہی نے پیدا کیا ہے۔ دلی اور لکھنؤ کے درمیان ہنوز رشتۂ اتحاد قائم تھا اور میر تسیم ممنون مصحفی فغاں قائم سوز ضیا حزیں حسن انشا نصیر سودا اور مختلف شعرا دلی سے برگشتہ ہوکر یہاں آئے اور آصفی دربار سے فیضیاب ہوکر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ یہ مہاجرین کرام کی جماعت دنیائے ادب میں ایک جدید عمارت کے ایسے ستون کی حیثیت رکھتی تھی جو آئندہ دور میں لکھنؤ اسکول کے نام سے تعمیر کی جانے والی تھی، مہاجرت کا سلسلہ تقریباً نواب غازی الدین حیدر ۱۸۱۴ء تک قائم رہا۔ حتیٰ کہ لکھنؤ دربار نے دلی کے دولت اقبال کے حضور میں پرچم اقبال بلند کیا (۱۸۱۹ء) لیکن اس انقلابی جذبہ سے لکھنؤ اسکول کی شاعری میں کچھ چاند اور لگے لکھنؤ کی شاعری نے جو اس دور میں کلیتاً دلی شاعری کی آوازِ بازگشت تھی جدید راہیں اختیار کیں اور خدائے سخن انیس و دبیر مداحِ رسول محسن و شہید اور تصوف کے بادشاہ شاہ تراب نے اس دور میں خوب نام پیدا کیا اور اپنی زمزمہ سنجیوں سے اردو ادب کی نشر و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دیں، اس دور میں تغزل کے میدان میں، نصیر برق امیر نے شہرت حاصل کی، لیکن آفتاب تیز تر اس وقت چمکا جب واجد علی شاہ اختر سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ لکھنؤ کے گلی کوچوں سے اردو شاعری کے چھپے ہوئے چشمے ابل پڑے، سلام، مرثیہ، غزل، قطعات، ریختی، رباعیات کن کن چیزوں کا ذکر کیا جائے۔ جن پر اس دور میں دربار اختری سے مہر تصدیق ثبت نہ ہوئی۔ جانعالم خود شاعر تھے اور شاعروں کے استاد بھی وہ مستقل ادبی مرکز تھے اور جس جگہ رونق افروز ہوتے اہلِ کمال ان کے گرد سیاروں کی طرح شبانہ روز نثار ہوتے تھے، جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ مشرق ہوا اور دربار لکھنؤ مٹا اس وقت لکھنؤ کی حالت ناگفتہ بہ تھی، نفسی نفسی کا عالم تھا، اہل کمال تاراج تھے، علم و فن کے میکدے ویران تھے بقیۃ السیف روپوش تھے، اس دور میں بھی شاعری چمکی اور شہر آشوب تصنیف ہوئے۔ تعیش و ریا عیش و عشرت کی کہانیاں تھیں، اب شام غربت آئی تو جذبات نے جگہ لی، اس دور کا جو شاعر آیا وہ ہمنشینوں کو رلا کر اٹھا، دل پژمردہ تھے، طبیعتوں پر ہراس غالب دنیا آج کی دنیا نہ تھی، جو دل میں تھا وہ زبان پر نہ آسکتا تھا، دل کی گہرائیوں میں جو خیالات پوشیدہ تھے، ان کے اظہار کے لئے "حزنیہ شاعری" ہی بہترین ذریعہ ثابت ہوئی، اس لئے اس دور کی شاعری میں یاس و حرماں، بے ثباتی و تاراجی و عبرت کی داستانیں سنائی دیتی ہیں لیکن سچ پوچھئے تو دبی زبان سے اس امر کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کام کی بات کوئی نہ تھی اور ہو بھی کیا سکتی تھی جبکہ کوئی شخص صبح سے شام تک اپنی جگہ پر مطمئن نہ تھا، اس دور کی شاعری میں کچھ عناصر ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے لکھنؤ اسکول کو داغ بدنامی اٹھانا پڑا، لیکن غضب ہوا کہ شمس العلما محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے تذکرے کو لکھ کر لکھنؤ اسکول کا رہا سہا بھرم بھی کھو دیا۔ اس سے بھی زیادہ کاری ضرب شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی کے اس مشہور مقدمہ سے پہنچی جس میں انھوں نے دل کھول کر لکھنؤ شاعری کے معائب کو پیش کیا، وہ حکیم تو تھے، نسخہ تیز تر تجویز کر گئے۔ لیکن لکھنؤ کا مرد بیمار اس سے کچھ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ دونوں محترم بزرگ یعنی آزاد و حالی وقتی جوش میں یہ بھول گئے کہ جو اعتراضات وہ لکھنؤ شاعری پر کرتے ہیں ان کا دلی اسکول بھی اس سے خالی نہیں ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلی اسکول کے اس دور کے نامور شعرا کے کلام سے بھی اس قسم کے پست و بے مزہ شعر پیش کئے جاسکتے

ہیں جس کے لئے آج لکھنؤ اسکول بدنام ہے، اصل وجہ یہ ہے کہ مشاہیر شعراء نے لکھنؤ چھوڑا، اور لکھنؤ تاراج ہو گیا، لکھنؤ دربار کے اجڑتے ہی رام پور کے دربار نے مشاہیر ادبا علما، اور شعراء کی سرپرستی شروع کی، چنانچہ آسیر امیر قائم منیر تسلیم تجر جلال، غرضکہ سبھی باری باری سے رام پور پہونچ گئے اور اپنی ادبی نغمہ سنجیوں سے رام پور اسکول کی شہرت کو ماہ تا ماہی پہونچاتے رہے۔ کچھ لوگ دکن گئے اور کچھ لوگ پٹنہ عظیم آباد گئے، غرضکہ لکھنؤ ویران ہو گیا جس کا انجام یہ ہے کہ آج لکھنؤ کے اس دور کے نامور شعراء کے کلام سے ہمارے تذکرے خالی ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے "لکھنؤ کی ایک خوش ذوق جماعت" نے ادبی خدمت کے لئے کروٹ لی اور متفقہ اردو ادب کی خدمت کرنا اپنا فرضِ منصبی تصور کیا۔ اس جماعت میں ریاست محمود آباد کے مرحوم ادب پرست راجہ امیر الامراء امیر الدولہ خان بہادر راجہ سر امیر حسن خان، سید حامد علی بیرسٹر، راجہ نوشاد علی اور اودھ پنچ کے مشہور اڈیٹر سجاد حسین کاکوروی کے نام بہت نمایاں ہیں، ان حضرات نے ایک ادبی سبھا قائم کی اور بے ضابطہ یا باضابطہ ایک جدید لکھنؤ اسکول کا سنگ بنیاد رکھ کر مولانا حالی کے مشہور مقدمہ کا جواب دیا، سرشار، شرر، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، پنڈت بشن نراین در، خان بہادر اکبر حسین اکبر، احمد علی کسمنڈوی، احمد علی شوق قدوائی، واحد علی آبر، منشی جوالا پرشاد برق، نواب سید محمد آزاد مرزا محبوب بیگ عاشق (ستم ظریف) نے امداد کی، منشی نولکشور نے اردو کی سرپرستی میں ایک قدم اور بڑھایا، متقدمین اور متاخرین کے دواوین کو حیاتِ نو بخشی، نتیجہ یہ ہوا کہ شعراء کی قدر افزائی شروع ہوئی اور باقاعدہ مشاعروں کا رواج ہوا۔ مشاعرے پہلے بھی ہوتے تھے لیکن اب نئے عنوان سے مشاعروں کی ترتیب دی گئی، اس عام ہمت افزائی نے پژمردہ شعراء کا دل بڑھایا (یہ ایک مجمل تاریخ تھی جو بیان کر دی گئی) اس کی درمیانی کڑیاں میں نے مصلحتاً چھوڑ دی ہیں اور وہ مفیدِ مطلب بھی نہ تھیں اس ابتدائی تاریخ کا بیان کرنا ناگزیر تھا، کیونکہ بغیر اس کے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کا پورا مفہوم پورا نہیں ہو سکتا تھا)

وہ ہے جو محمد شاہ رنگیلے کے عہد سے شروع ہوتا ہے اور نصیر الدین حیدر کے وقت میں ختم ہوتا ہے، اس کو تاریخ ادب میں "نصیری عہد" سے یاد کیا جا سکتا ہے [illegible]ء سے دوسرا دور انتزاعِ سلطنت پر ختم ہوتا ہے اس دور کو "عہدِ امجدی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ سنہ ۱۸۵۶ء سے تیسرا دور وہ ہے جو بیسویں صدی کے آغاز پر ختم ہوتا ہے اور اس کو "برطانوی عہد" سے ہم نامزد کر سکتے ہیں، چوتھا دور وہ ہے جو سنہ ۱۹۰۱ء سے شروع ہوتا ہے جو آج تک قائم ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ لکھنؤ کے اس چوتھے دور کو آسانی سے ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، پہلا تو وہ جو ہنگامۂ مغرب (سنہ ۱۹۱۴ء) پر ختم ہوتا ہے، دوسرا جس کو دورِ حاضرہ کہہ سکتے ہیں، (سنہ ۱۹۳۶ء) (واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول کے گزشتہ تین ادوار سے ہم کو کوئی تعلق نہیں ہے، ہم کو اس وقت چوتھے دور سے مطلب ہے لیکن بغیر ایک مجمل نقشہ پیش کئے ہوئے ان ادوار کی تفصیل سمجھ میں بھی نہیں آ سکتی تھی، اس لئے ان ادوار کا ذکر کیا گیا)

دورِ چہارم کے طبقۂ اولیٰ کے آغاز سے لکھنؤ اسکول کی شاعری میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ کچھ طبقاتی جھگڑے بھی شعراء میں رونما ہوئے۔ آپس کے اختلافات نے اس دور کی شاعری کو کچھ زیادہ مقبول نہ بنایا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس عہد کے شاعر "تاریخ ادب" میں تو نام چھوڑ گئے لیکن کام کی باتیں بہت تھوڑی تھیں، اس دور کے نامور شعراء میں امیر، تسلیم، افسوس، منیر، حسرت، ریاض، جرأت، جلال، وسیم، آہ، اسیر، شوق، عاشق، ہوس، شرر، شہیدی، سرشار، نزاب، برق، ناسخ، خلیل، آتش، قدر، نادر، حمد، سرور جہان آبادی، نیتر، مضطر، ہاشمی، شمشاد، نوبت رائے نظر، رضا، ارشد تھانوی علیگ، بے نظیر شاہ وارثی،

لکھنؤ اسکول کو چار طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور

ایشیا جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

سلہ یہ دونوں حضرات اپنے عہد کے ترقی پسند شاعر سمجھے جاتے ہیں اور شاعری کے جدید اسکول (نظم) سے متاثر ہوئے۔

ساغر

احمد علی شوقؔ، واحد علی ابرؔ، اور امید امیٹھوی کے نام ممتاز طور پر نظر آتے ہیں، اس دَور میں حاشیہ پر شمس العلماء مولانا شبلیؔ، مولانا وحید الدین سلیمؔ اور مولانا بشیر الدین جالبؔ کے نام بھی لئے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اس دَور میں لکھنؤ ہی میں موجود تھے اور ان کی شاعری ایک بڑی حد تک لکھنؤ شاعری سے متاثر ہے۔ خواہ آج اُن کے متبعین اس واقعہ سے انکار کریں اور اُن کے حوارین اپنے تذکروں میں لکھنؤ اسکول کی برائیاں ہی برائیاں پیش کریں لیکن اس میں غریب لکھنؤ کا کوئی قصور نہیں۔

اصل یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول کے" اس دَور کی شاعری کو ورثہ میں" ناسخؔ و آتشؔ کی شاعری ملی تھی، اس لئے اس بات کی کوشش کرنا کہ ان کے کلام میں زبان کی سلاست، جذبات کی صداقت اور ادب کی چاشنی ہو تو یہ ناممکن ہے دیکھئے آپ بھول نہ جائیے کہ شاعر انسانوں کی جماعت ہی سے بنتے ہیں، آپ ان کو خدا کا اکلوتا بیٹا نہ تصور کریں، وہ ہر صحبت میں بیٹھتے ہیں اور اپنے جواہر پارے ملک کے ماحول کو دیکھ کر پیش کرتے ہیں جس مذاق کی اُس دَور میں مانگ تھی اُن کے دواوین اس قسم کی شاعری سے پُر ہیں، اُس دَور میں آج کی طرح تہذیب کی نئی حدیں قائم نہ ہوئی تھیں، آج اگر "ٹوائیلیٹ" "اونچی ایڑی کا جوتا" "جمپر" اور نفیس بنارسی ساری آرائش میں شامل ہیں تو اُس دَور میں "کنگھی" "سرمہ" "مسی" "تلک" "پشواز" اُس تہذیبِ قدیم میں داخل تھی۔ اگر اس دَور کی شاعری اپنے ماحول سے متاثر نہ ہوتی، ناقدین کرام کی سرکار گہر آبدار سے لقائی کا صداقت نامہ ملتا۔ اُس دَور میں "ریڈیو" "ٹیلی وژن" نہ تھا نشر و اشاعت کے ذرائع محدود تھے، مطابع اور اخبارات کی فراوانی نہ تھی۔ سب سے بڑی تاسیس جہاں مقبولیت کی سند حاصل ہوتی تھی، آپ مجھ کو معاف کریں آپ تہذیب سے آنکھیں نیچی کریں گے وہ ارباب نشاط کی جماعت تھی، جہاں ایک غریب شاعر کی سحر کاریاں فنی حیثیت سے پرکھی جاتی تھیں۔ تال و سُر سے جو شعر پورا نہ اترتا تھا وہ ٹکسال باہر تصور کیا جاتا تھا اور سخن فہموں اور سخن سنجوں کے دربار سے بھی خراج تحسین حاصل نہ کر سکتا تھا۔ آپ خفا نہ ہوں اس دَور کے ہر بادشاہ کے دربار میں ہر امیر کی محفل میں ہر رئیس کی مجلس میں اس طبقہ کے مہذب افراد ملازم ہوتے تھے اور شاعر کی محنتوں کا صلہ طبلوں کی تھاپ ارباب نشاط کے گلے، اور پازیب کی جھنکار سے ملا کرتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھئے بہت سے امیرزادے تربیت کے لئے ارباب نشاط کے پاس جاکر زانوئے ادب تہ کرتے تھے اور علم مجلس کی سند لے کر دربار میں جگہ پاتے تھے لیکن آج دنیا بدل گئی ہے، بجلی نے قندیل کی جگہ لے لی ہے۔ جو صنف لطیف کل تک "شمع خانہ" تھی اب وہ گھر سے باہر آئی مردوں کے دوش بدوش دنیا کی تگ و دو میں شریک ہوکر ایوان ہائے فلک بوس کی زیبائش کے ساتھ ہی مجلس کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بھی مردانہ وار نظر آنے لگی، تو بھلا آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ اُنیسویں صدی کی شاعری کو بیسویں صدی کی عینک سے دیکھنا کہاں تک درست و جائز ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس دَور کی شاعری میں لطف نہیں ہے، جذبات سے معرا ہے، تصنع اور ریا سے پُر ہے لیکن (گستاخی معاف) کیا یہ دَور لکھنؤ اسکول کے لئے ہی مختص ہے؟ آپ تذکروں کو دیکھئے، شاعروں کا کلام پڑھئے، مشاعروں کے گلدستوں کو ملاحظہ کیجئے، اُس وقت یہ معلوم ہوگا کہ ہر شے جو چمکتی ہے وہ سونا نہیں ہے

آج ناقدین کرام کی بدولت اس دَور کی لکھنوی شاعری دفتر لایعنی سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ان کے خیال میں لکھنؤ کی تمدن و معاشرت میں لغویت موجود ہے، فارسی تراکیب کا فقدان ہے۔ سیر حاصل غزلیں رائج ہیں، ابتذال کا رنگ نمایاں ہے، روحانیت کا فقدان ہے، خارجی اوصاف اور لوازم کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے، لیکن اس دَور کے دہلی اسکول کے نامور اساتذہ کا کلام بھی ان معائب سے پاک نہیں ہے حتیٰ کہ مومنؔ [1] اور غالبؔ کا کلام بھی رعایتِ لفظی اور ایہام سے خالی نہیں ہے، ابتذال اور سخافت کے اشعار ان کے یہاں بھی ملتے ہیں اور سب کا رنگ یکسر جذبات نگاری نہیں ہے۔

[1] یہ لکھنؤ پرستی کے سلسلے میں انتہا پسندی ہے، مومنؔ و غالبؔ کے کلام میں رعایت لفظی اور ایہام ہو لیکن محض رعایت لفظی او ایہام ہی نہیں ہے، "بلکہ جان" بھی ہے۔ ساغرؔ

شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ تو حقیقتاً غیر فطری شاعر ہیں اس لئے خالی از بحث۔ آپ کو اختیار ہے کہ امیرؔ کو ایک سرے سے شاعر ہی نہ تصور کیجئے، ان کے کلام کو دفتر بے معنی سے تعبیر کیجئے اور اُن کے حریف مرزا داغؔ [2] کے شوخ مقطعوں کی دل کھول کر داد دیجئے، جن کو سُن کر اہل مجلس شرم سے آنکھیں نیچی کرلیں۔ لیکن آپ کو یہ تسلیم

[2] مرزا داغ کے ساتھ ان کے احول نے سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ ان کا تمام و کمال کلام شائع کردیا۔ اگر ان کے دواوین کا انتخاب شائع ہوتا تو

رائے دوسری ہوتی۔ اصل میں وہ اپنا ایک دربار رکھتے تھے، اُن کے چاروں طرف مصاحبین اور مداحوں کا مجمع رہتا تھا، مصاحب شاگردوں نے ان کو غارت کردیا۔ شوخی اُن کے کلام میں بھی مگر وہ اپنے اندر جذباتی سوز رکھتی ہے جس سے لکھنؤ اسکول کی شاعری قطعی خالی ہے۔ ساغر

کرنا ہوگا کہ اس دور میں بھی لکھنؤ اسکول نے جو کارنمایاں انجام دیئے ہیں اُس کا جواب دلّی اسکول تو کیا دیگا، تمام ہندوستان میں کوئی اسکول آج تک نہ دے سکا۔ پہلے دوسرے اور تیسرے دَور نے اگر محسنؔ، انیسؔ، دبیرؔ، میر حسنؔ، نسیمؔ، مصحفیؔ، محسنؔ، امیرؔ و جلالؔ کو پیش کیا تو لکھنؤ اسکول کی بقاء شہرت دوام کے لئے کافی ہے اور یہ دعویٰ بے دلیل نہیں ہے کہ جب کبھی اُردو ادب کی تاریخ کسی متعصب قلم سے بھی نکلے گی تو وہ مجبور ہوگا کہ ان شعرائے کرام کے ذکر سے اپنے تذکرے کو رونق بخشے۔ کیا یہ کوئی کم کامیابی ہے۔

بیسویں صدی کے اِس ابتدائی دَور میں لکھنؤ نے نعت گوئی میں جو درجہ حاصل کیا اُس کا جواب ہندوستان کے کسی اسکول نے نہیں دیا ہے اور نہ دے سکتا ہے۔ اِس سلسلے میں محسنؔ اور شہیدؔ کو کسی طرح سے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا اور دیگر مدارس شعری کو بھی مجبوراً اُن کی سحر طرازیوں کی داد دینی پڑتی ہے، صوفیانہ شاعری میں اگر دلّی نے دردؔ اور شاہ نیازؔ پیدا کئے تو لکھنؤ اسکول اِس میں بھی پیچھے نہیں رہا اور آج بھی حضرت غوثِ ملت شاہ تراب جناب آسی غازیپوری کے دواوین یکسر صوفیانہ شاعری کے بے نظیر ذخیرے ہیں، جن سے ارباب بینش خاطر خواہ مستفید ہوتے ہیں اور اہل سخن ادبی شہ پاروں کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ چوتھے دور کے ابتدائی حصے کے ختم کرنے سے قبل یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ اسکول نے مراثی، سلام، قطعات، مسدس، مثنویات و قصائد میں اس قدر کافی سرمایہ چھوڑا ہے کہ جس وقت شام اودھ[2] کا تذکرہ شائع ہوگا اُس وقت دنیا کو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول نے کس قدر کافی ادبی ذخیرہ چھوڑا ہے جو آئندہ نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیگا[3]

[3] اُردو شعر و ادب بار تقاء اور انقلاب کے جس راستے پر آگے چلا جارہا ہے وہ ایسی منزل کی طرف جاتا ہے جہاں واقعیت نگاری، زندگی کے حقائق، انسانی نفسیات، نئے تصورات اور اک قیامت خیز انقلاب کھڑے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہیں، یہ منزل اک نئے نور کا مخزن ہوگی، جہاں لکھنؤ کی "شمع ہدایت" جگنو کی طرح بھی نہ چمک سکیگی۔ البتہ صرف زبان کے وہ نمونے جو "آثار صنادید" کی فہرست کے ذیل نوادر کی حیثیت میں عجائب خانوں اور لائبریریوں میں رکھے ہوں گے؛ انہیں آئندہ نسلیں دیکھنے اور واقفیت حاصل کرنے کے لئے آیا کریں گی، جس طرح قطب شاہی اور مغل عہد کی شاعری کے نمونے دیکھنے کے لئے ہم لائبریریوں میں جاتے ہیں۔ ساغر

لکھنؤ کے نامور اساتذہ سخن میں طبقہ متوسطین کے دور اول میں میرؔ، سوزؔ، قائمؔ، سوداؔ، حسرتؔ اور دور دوم میں مصحفیؔ، مسرورؔ، انشاؔ، راسخؔ، حیرتؔ، جرأتؔ، نسیمؔ، آتشؔ، رنگینؔ، ہوسؔ، لطفؔ، افسوسؔ و شہیدیؔ بہت مشہور ہوئے اور متاخرین کے دَورِ اوّل میں ناسخؔ، آتشؔ، برقؔ، بحرؔ، جلیلؔ، شرقؔ، رندؔ، صباؔ، وزیرؔ، اشکؔ اور دور ثانی میں اسیرؔ، امیرؔ، جلالؔ، منیرؔ، ریاضؔ، نظمؔ، دبیرؔ، محسنؔ و انیسؔ نے کافی شہرت حاصل کی۔ لیکن دنیا اس واقعہ کو شاید بھولی جاتی ہے کہ اُردو کے پہلے شاعر مخدوم شیخ سعدی[1] نے کاکوری ہی میں آنکھیں کھولیں، اس حیثیت سے بھی لکھنؤ

---

[2] شام اودھ (مخطوطہ) ناظر کاکوروی امیر محل لائبریری نصیر باغ کاکوروی لکھنؤ۔

[1] حضرت مخدوم شیخ کمال الدین محمد سعدی ابن حضرت مخدوم بندگی مِن اللہ صدیقی چشتی کاکوروی اسم گرامی مصنفات میں محمد اور فرامین شاہی میں کمال الدین اور تعمیم نامہ جائداد میں جو اپنی اولاد کے لئے لکھا تھا سعدی محمد مرقوم ہے، اور مخدوم شیخ سعدی کے نام سے مشہور ہیں اور یہی کتب تاریخ میں بھی درج ہے، ان کے والد حضرت مخدوم سعد خیرآبادی کے اجلہ خلفاء میں تھے انھوں نے اپنے پیر کے نام پر اُن کا نام رکھا۔ تلمذ ان کو قاضی جمال خضر سے تھا تعلیم و تربیت و اجازت و خلافت اپنے والد حضرت بندگی مِن اللہ سے تھی۔ آپ عالم۔ جید صوفی بے دل قاری بے مثل تھے، فن قرات میں بہت ملکہ تھا۔ متن شاطبی کی شرح بہت نفیس قریب ستر جزو کے لکھی، جس کا نام نافع سکندر شاہی رکھا، یہ نادرالوجود شرح کتب خانہ انوریہ میں موجود ہے، غالبًا یہ کتاب سلطان سکندر لودی کے زمانے میں لکھی گئی۔ وفات آپ کی بتاریخ ۳ ر ماہ ذی الحجہ سنہ ۹۲۰ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار قصبہ کاکوری میں شیخ سعدی کے محلّے میں ہے، وہ بابرکت بزرگ ہیں جو موسوم خیر کی عنایت سے سعدی دکھنی کے نام سے تذکروں میں مشہور رہے، جو اُردو کے اوّلین شاعر ہیں (تذکرۂ مشاہیر کتب خانۂ انوریہ کاکوری صفحہ ۱۸۷)

ایشیا جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

اسکول کے احسان سے ملک عہدہ برآ نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر یورپ ہوتا تو سعدی کا کلام تلاش کیا جاتا، مزار کے قریب خانقاہ بنتی۔ اہلِ کمال وہاں جاکر اپنی ادبی تشنگی بجھاتے۔

دَورِ چہارم کا طبقہ "دوم ہنگامۂ مغرب (جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء) سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں لکھنؤ اسکول کا لب و لہجہ بدل چکا تھا۔ ملک میں مختلف سیاسی جماعتیں پیدا ہوگئی تھیں، تہذیب کی جدید حدیں قائم ہورہی تھیں اور سیاسی لٹت ولی تحریکوں نے شاعروں کی سوئی ہوئی جماعت میں بھی انقلاب پیدا کردیا تھا مچھلی بازار کان پور کے واقعے نے خصوصیت سے شاعروں کی جماعت میں ہیجان پیدا کردیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسوں نے عوام میں بیداری پیدا کی اور مغربی تعلیم نے دماغوں میں جلا کی ظاہر ہے کہ اس سموئی ہوئی تہذیب اور سماجی عمرانی اور معاشرتی ماحول کے انقلاب کی دہکتی ہوئی آتش فروزاں سے لکھنؤ اسکول کی شاعری بھی متاثر ہوئی اور جدید تہذیب نے لکھنؤ اسکول کی شاعری کے لئے نئی شاہراہیں کھول دیں۔ اب شاعر کا نصب العین بدل چکا ہے، وہ خیال کے بدلے عمل پر نظر رکھتا ہے۔ غزل گوئی کے بجائے نظم نگاری کی جانب توجہ کی جارہی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک بہت بڑا خوشگو طبقہ جو صحیح معنوں میں لکھنؤ شاعری کا علمبردار ہے وہ آج بھی یکسر غزل گو ہے۔

اس دَور کے نامور شعرا میں مولانا محشر اور مرزا ثاقب کا درجہ بہت بلند ہے۔ مرزا ثاقب لکھنؤ اسکول کے بہت کامیاب شاعر ہیں اور ان کی شاعرانہ نازک خیالیاں بہت ارفع ہیں، ابھی حال میں ان کا دیوان شائع ہوا ہے۔ افسوس کہ ثاقب کا کوئی جانشین نہیں ہے۔

حسن کی ایک فصل ہے عشق کا ایک باب ہے
دیکھ چکے ہیں ہم اسے دہر تماکتاب ہے

رسم وہ قدیم ہے، شرعِ صنم نئی نہیں
جس میں وفا گناہ ہے، راحتِ دل عذاب ہے

راہ بری نہیں ہے چل، سیر میں کیا مضائقہ
سارے جہاں کو دیکھ ڈال پر یہ سمجھ کہ خواب ہے

اس رُخِ آتشیں کو اب دیکھ کے میری آنکھ دیکھ
آب ہے ایک ہی طرف ایک طرف سراب ہے

اک کفنِ خاک کی بساط کیا جو ہو راہِ سیل میں

جب سے بہے ہیں اشکِ غم خانۂ دل خراب ہے

طاقتِ دید ہو تو خیر ورنہ وصال کچھ نہیں
جلوۂ طور سے کھلا حسن خود اک نقاب ہے

حُسنِ سخن سے ہے عیاں جلوۂ وارداتِ نفس
ثاقبِ دل حزیں تری ہر غزل انتخاب ہے

۵۲ !؟!

۵۲ مقالہ نگار کے فیصلے کے مطابق یہ لکھنؤ کی وہ شاعری ہے جو "ہنگامۂ مغرب" کے بعد اُس وقت ظہور پذیر ہوئی جب کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسوں نے عوام میں بیداری پیدا کردی تھی اور "سموئی ہوئی تہذیب اور سماجی عمرانی و معاشرتی ماحول کے انقلاب کی دہکتی ہوئی آتشِ فروزاں سے لکھنؤ اسکول کی شاعری بھی متاثر ہوئی"۔

ساغر ؟! ——————

مرزا کاظم حسین محشر بھی لکھنؤ کے اچھے شاعر ہیں۔ لیکن اب عرصے سے غزل گوئی ترک کردی ہے، یہ دونوں حضرات اگلے وقتوں کے بزرگ ہیں ان کی شاعری میں قدامت پرستی موجود ہے لیکن لکھنؤ اسکول اپنے محسنین کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتا ——

رات کی رانی ہے گلشن میں عروسِ نوبہار
سبز جوڑا پہنے بیٹھی ہے میانِ لالہ زار

دستِ قدرت کا بنایا عطرداں کہئے جسے
چھوٹے چھوٹے پھولوں کے گچھے میانِ شاخسار

پرتوِ مہتاب سے ہنگامِ شب کھلتے ہیں پھول
کوسوں لے جاتی ہے خوشبو کو ہوائے عطربار

جس قدر گرمی پڑے اتنی ہی خوشبو تیز ہو
باعثِ جمعیتِ خاطر ہے زورِ انتشار

بس گئے اجزا ہوا کے دور گلشن بس گیا
شام ہوتے ہی کھلے یوں نافۂ مشکِ تتار

چشم بد دور اس قدر ہے حسنِ ذاتی کا عروج
رات کو مہتاب دن کو آفتاب آئینہ دار

محشر آنکھیں کہتی ہیں ہر وقت دیکھا کیجئے دن کو حد کی سادگی اور رات کو سولہ سنگار

سلہ عہدِ حاضر کے شعراء میں لسان القوم مولانا صفی لسان الہند مولانا عزیز۔ مرزا رسوا۔ احسن۔ آزاد۔ عشرت۔ گہر۔ فاضل۔ عالم۔ پیارے نواب کوکب۔ برق۔ طاہر۔ فرخ۔ یولس۔ گہر جائیسی۔ ننھو صاحب شفیق۔ واقف۔ نواب عسکری۔ مرزا آبلیغ۔ پیارے صاحب رشید مولانا انور حسین آرزو۔ پنڈت برج نراین چکبست۔ مرزا جعفر علی اثر۔ مقبول حسین ظریف۔ محمد صاحب بہار۔ پنڈت آنند نراین ملا۔ اشرف الحکماء حکیم آشفتہ۔ منشی سراج الحسن سراج۔ قدیر احمد خاں قدیر۔ نانک چند نانک حضرت آرم حضرت طیش۔ حضرت اصغر۔ حضرت عرش۔ حضرت خمار کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

سلہ اگر لکھنؤ اسکول نہیں، لکھنؤ کے تمام شعرائے گرامی کے نام لکھنے منظور تھے تو شاید ناظر صاحب نے "فیاضی" نہیں بخل سے کام لیا ہے اور ان سب حضرات کو کسی "لکھنؤ اسکول" کا نمائندہ کہنا قطعی غلط ہے،

چکبست۔ لکھنؤ اسکول کے نمائندے ہرگز نہ تھے، وہ جدید شاعری سے متاثر تھے، اور جدید شاعری کا مرکز تخلیق ہرگز لکھنؤ نہیں ہے۔ مرزا داغ کی شاگردی کی بنا پر اقبال کو دہلی اسکول میں شریک کیا جائے گا۔ اور غالب کے رشتہ سے حالی کو دہلی اسکول یعنی نئی اردو شاعری کے جدید اسکول کا بانی تسلیم کرنا پڑے گا۔

حضرت آرزو۔ لکھنوی سہی لیکن انھوں نے جو رنگ اختیار کیا وہ ان کی ایک انفرادیت ضرور قائم کرتا ہے مگر وہ لکھنؤ اسکول ہرگز نہیں۔ اگر لکھنؤ اسکول سے مراد، ایک مستقل "انفعالیت" ہے تو ہاں یہ اُن کے کلام کی بھی خصوصیت ہے ——— ! ؟

نواب جعفر علی خاں اثر۔ نظموں میں جدید اسکول کے مقلد ہیں اور غزل میں وہ میر دہلوی سے متاثر، اس لئے اُن کو بھی لکھنؤ اسکول سے کوئی تعلق نہیں، اور اُن کی غزل میں کوئی عنصر ایسا نہیں جس کو ہم لکھنؤ اسکول کی نمائندگی کہہ سکیں،

مقبول حسین ظریف تو کھلے بندوں اکبر کے مقلد تھے، خیالات میں وہ اکبر کی طرح رجعت پسند اور طنز میں انھیں کی طرح شگفتہ و پُر مزاح، اُن کو ہم لکھنؤ اسکول میں اُس وقت شریک کر سکتے تھے جب وہ انشا کے راستے پر چلتے،

آنند نراین ملا کو تو لکھنؤ اسکول سے کوئی تعلق نہیں ہرچند کہ شاید وہ مولانا صفی سے مشورہ لیتے تھے یا لیتے ہیں، لیکن اُن کی نظمیں جدید شعراء سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہیں، اور اُن کی غزل ترقی یافتہ غزل سے اثر پذیر ہے،

خیالات میں وہ ضرور چکبست کے مقابلے میں ترقی پسند ہیں اور اُن کو بلا شبہ ہم آنے والے شعراء کی صف میں بٹھا سکیں گے لکھنؤ والوں کے ساتھ نہیں،

سراج و قدیر صاحبان گو لکھنوی ہیں لیکن اِن کی بیشتر نظمیں اور غزلیں نئے اسلوب شاعری سے متاثر ہیں،

خمار صاحب جن کا نام ابھی ابھی سنا گیا ہے اپنی غزلوں میں اُسی رنگ کو اختیار کرتے ہیں جو تقریباً عام ہو گیا ہے، میں یہاں پھر اپنے خیالات کو دہراتا ہوں یعنی اگر ہم کسی شے کو "شئے مشترک" کہہ سکتے ہیں تو وہ صرف اک "انفعالی کیفیت" (Pessimism) ہے جو تمام لکھنوی شعراء میں پائی جاتی ہے جو عام تقلیدی جذبہ کے علاوہ مذہبی معتقدات کا پرتو بھی ہے،

ساغر

لکھنؤ میں ایک ایسی جماعت بھی موجود ہے جو لکھنؤ کے رہنے والے تو نہیں ہیں لیکن لکھنؤ کی شاعری سے متاثر ضرور ہیں سلہ جس میں نمایاں طور پہ صوفی دنیا مولانا عبدالباری آسی، مولانا وصل بلگرامی، مولانا حسرت موہانی انقلابی حضرت جوش ملیح آبادی، سید آل رضا صاحب رضا، مولانا نیاز فتحپوری، حضرت بدر غازی پوری، حضرت شوکت تھانوی، حضرت امین سلونوی، خواجہ عزیز الحسن مجذوب اشرفی، پروفیسر حامد اللہ افسر میرٹھی، سید کلب احمد ملنی اور سجاد حیدر یلدرم کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

سلہ میں مقالہ نگار کے اس بنیادی خیال ہی سے متفق نہیں کہ وہ موجودہ دور کے لکھنوی شعراء کو کسی ایک اسکول کا بانی قرار دیتے ہیں۔ یہ قطعی غلط ہے، کہ آج کوئی لکھنؤ اسکول موجود نہیں،

یہ بھی حقیقت کے قطعی خلاف ہے کہ جو غیر لکھنوی شعراء لکھنؤ میں آجکل رہتے ہیں وہ لکھنوی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں، موجودہ لکھنوی شاعری کا کوئی اپنا طرز نہیں، بلکہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے

کہ لکھنؤ کے تمام موجودہ شعراء پر اُس خورشید کی کرنیں پڑ رہی
ہیں جو مجموعی طور پر ادب و شاعری کے آسمان پر "جدید شاعری
اور نئی نظم و نئی غزل" کی صورت میں چمک رہا ہے۔

۵۳ یہاں میں نام وار یہ بتاؤں گا کہ ہمارے دوست ناظر کاکوروی
نے ان مہمانوں پر جو بدقسمتی سے لکھنؤ میں آئے یہ کہہ کر کتنا
شدید ظلم کیا ہے کہ وہ "نام نہاد لکھنؤ اسکول" سے متاثر ہوئے
عبدالباری آسی یہ میرٹھ کے ایک قصبہ الدن کے رہنے
والے ہیں اور (میں ذاتی طور پر رشتہ داریوں کا قائل نہیں)
مرزا داغ کے سلسلے میں ہونے کی وجہ سے دہلی اسکول سے تعلق
رکھتے ہیں۔ یہ اپنی پختہ کاری زود گوئی، مہارتِ فن اور روانیت
کے لحاظ سے مستند ہیں اور ان کے کلام میں موجودہ مروجہ
غزل کے عناصر پائے جاتے ہیں، ہر چند کہ یہ ترقی پسند نہیں اور
اپنے شعر میں کسی خاص نظریہ پر زور نہیں دیتے مگر شاعرانہ طور پر
جو ان کا طریق یا اسلوب ہے وہ ہرگز لکھنوی نہیں۔
نیاز فتحپوری نام پڑھتے ہی ہنسی آ گئی، اوّل تو ان حضرت
کو شعراء کی صف میں بٹھانا ہی ناظر صاحب کی ستم ظریفی ہے۔ خدا
جانے یہ کس مذاق کا جواب ہے!؟ اور اگر یہ نیاز صاحب سے کوئی مذاق
نہیں ہے تو جن شعراء کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے اُن کے ساتھ
ایک چھیڑ ضرور ہے۔ سوال یہ ہے کہ نیاز صاحب کی وہ کونسی شاعری
تھی جو لکھنؤ اسکول سے متاثر ہوئی، وہ شاعری تو دکھایئے"
یہ غریب تو آج تک شعر کہنے اور سمجھنے میں کامیاب ہی نہ ہو سکے
جو شخص نیاز کو جانتا ہے وہ اس راز سے اچھی طرح واقف ہے کہ
وہ "راندۂ بارگاہِ شاعری" ہیں۔ یہی نہیں ان کی ساری زندگی
اور ادبی جدوجہد کے سلسلے میں تمام کردار و عمل بتاتا ہے کہ وہ محض
مصلحت پرست انسان ہیں، ظاہر ہے کہ آرٹسٹ اپنے آرٹ کی
انانیت کے مقابلے میں مصالح کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ مگر شاعری
میں ترقی اور جلبِ منفعت کا امکان نہ دیکھ کر نیاز صاحب نے
نثر کی طرف توجہ کی، پھر بھی ہزار کوششوں کے بعد وہ "ابوالکلام"
نہ بن سکے۔ کامیاب تو کیا ناکام تقلید بھی ایک سانچہ چھوڑ جاتی

ہے چنانچہ نیاز "ابوالکلام" کی ناکام تقلید کا ایک نامکمل پرتو
ہیں۔ اس پرتو کو لکھنؤ اسکول نے کس طرح متاثر کیا —
ناظر صاحب بتائیں!؟
حسرت موہانی انقلابی شاعر حسرت موہانی کو
تسلیم سے کوئی تعلق ہو، یہ بات الگ ہے، لیکن حسرت موہانی کی
شاعری لکھنؤ اسکول سے متاثر نہیں، ان کے کلام کی خوبی حضرت
"قومیت" ہے، اور یہ کہ وہ انقلابی شاعر ہیں!؟ یا انقلاب کے
معنی کچھ اور ہیں یا وہ انقلابی نہیں، ٹھیک عہدِ انقلاب یعنی آجکل
میں اُن کے جو تازہ افکار ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔
انقلابی نقطۂ نگاہ سے دیکھ رہا ہوں، ورنہ ان اشعار کے دلدوز
ہونے میں کیا شک ہے!؟

مولانا حسرت موہانی بی۔ اے (علیگ)

یہ غزل جہاز اسپرونزا از پریو تا پنڈری پر ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لکھی گئی

رعنائی میں حصہ ہے جو قبرص کی پری کا
نظارہ ہے مسحور اُسی جلوہ گری کا

رفتار قیامت یونہی کیا کم تھی پھر اُس پر
اک طرّہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

پوشاک میں کیا کیا شجری نقش ہیں دلکش
باعث نہ یہی شوق کی ہو جامہ دری کا

لاریب کہ اُس حسنِ ستمگار کی سُرخی
موجب ہے مرے زہد کی عصیاں نظری کا

با وصف تلاش اُن کی خبر کچھ بھی نہ پا کر
کیا کہیے جو ہے حال مری بے خبری کا

جب سے یہ سُنا ہے کہ وہ ساکن ہیں یہیں کے
عالم ہے عجب شوق کی آشفتہ سری کا

ساتھ اُن کے جو ہم آئے تھے بغیرت سے حسرت
یہ رد گ نتیجہ ہے اُسی ہم سفری کا

(یہ غزل بمقام سوم ۱۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لکھی گئی)

ہم رات کو اٹلی کے حسینوں کی کہانی
سنتے رہے رنگینیٔ ثروپا کی زبانی

آنکھوں کا تبسم تھا مرے شوق کا موجب
چتون کی شرارت ہے مری دشمن جانی

ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر
جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی نہ مانی

ہوتی جو خبر اس کی تو کیا کیا نہ بگڑتی
ثروپا نے غنیمت ہے کہ یہ بات نہ جانی

اٹلی میں تو کیا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ حسرت
دنیا میں نہ ہوگا کوئی اس شکل کا ثانی

حضرت جوش ملیح آبادی۔ ملیح آباد، لکھنؤ کی ایک تحصیل ہے اس لئے ضلع بھی لکھنؤ ہی ہوگا۔ جوش ملیح آباد میں پیدا ہوئے اس لئے ہم اُن کو لکھنؤ کا باشندہ ہی خیال کریں گے۔

شاعری کے جدید اسکول میں جوش کی جو مصدقہ پوزیشن ہے وہ ظاہر ہے اور اُن کا کلام جتنی جدتوں اور عظمتوں کا حامل ہے اُس سے بھی آپ واقف ہیں، لیکن ناظر صاحب کا دعویٰ ہے کہ جوش صاحب باہر سے آئے ہیں اور اُس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جن کی شاعری "لکھنؤ اسکول" سے متاثر ہوئی!؟

ان تمام کوششوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناظر لکھنؤ اسکول یعنی "لکھنؤ کے شعراء کو" غلط طور پر ادب میں وہ مرتبہ دینا چاہتے ہیں جو بدقسمتی سے تاریخی اور واقعیاتی طور پر اُن کو ابھی حاصل نہیں ہے۔

جب مورخِ ادبِ اُردو شاعری اور ہمارے عہد کے شعراء کا ذکر کرے گا تو لکھنؤ کے منفعل ماحول میں جوش جیسے باغی شاعر کی پیدائش پر سخت حیران ہوگا۔

ناظر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ ادب میں اگر لکھنؤ کو کوئی کریڈٹ دیا جا سکیگا تو حضرت جوش کی وجہ سے، وہ لکھنؤ میں تنہا شاعر ہے جس کی غزل میں بھی انفعالی اور تقلیدی اثرات نہیں پائے جاتے۔

سید آل رضا۔ میں اس وقت تک رضا صاحب کو لکھنوی ہی خیال کرتا تھا وہ لکھتے بھی لکھنوی ہی ہیں، مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن کا وطن کہاں ہے!؟ وہ آرزو صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور اُن کے کلام میں آرزو صاحب کی کامیاب تقلید پائی جاتی ہے، لکھنؤ مزاج کی کامل انفعالیت اُن کے کلام کا خصوصی عنصر ہے، اُن کا متاثر ہونا تو لکھنؤ کے شاگرد ہونے سے ظاہر ہے اس لئے یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔

بدر غازیپوری۔ بدر صاحب نظم و غزل دونوں کہتے ہیں اور اُن کی غزل پر لکھنؤ کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، مروجہ طرز و رنگ میں وہ غزل کہتے ہیں اور نظم پر تو خیر لکھنؤ کا اثر ہونے کے معنی ہی کیا ہیں!؟

شوکت تھانوی۔ یہ آسی صاحب الدنی کے شاگرد ہیں اور جو اُن کے کلام کا رنگ ہے، وہی اِن کا رنگ ہے، پھر شوکت گو ابھی غزل کہتے ہیں، مگر اِن کا اصلی میدان مزاح نگاری ہے اور اس میدان میں وہ سرپٹ جاتے ہیں، بہرحال اُن کی غزل مروجہ غزل کی طرح ہے۔

امین سلونوی۔ یہ بھی آسی الدنی کے شاگرد ہیں اور ان کی غزل کی نوعیت بھی شوکت جیسی ہے، ہاں میں پھر کہوں گا کہ اگر "لکھنوی اسکول" ابتذال اور الم نگاری کا نام ہے تو اِن دونوں کی غزل میں یہ بات کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔

مجذوب اشرفی۔ مجذوب کی غزل کے لئے یہ کہنا کہ وہ لکھنؤ اسکول سے متاثر ہوئی، شدید ظلم کرنا ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں بے ساختہ اور والہانہ، اور اگر وہ اپنا کلام انتخاب کر کے سنائیں اور کم سنائیں تو سامع کو زیادہ متاثر کرتے ہیں، انتخاب نہ کرنے کی وجہ سے اُن کا اخلاصِ شعری دب جاتا ہے۔ مجذوب کے کلام میں بے ساختگی، جوانی، اخلاص اور کیف کی موجودگی ہی اس کی دلیل ہے کہ لکھنؤ اسکول کا اس پر مطلق اثر نہیں۔

حامد اللہ افسر میرٹھی۔ اس فہرست میں افسر میرٹھی کا نام لکھ کر تو ناظر صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ افسر کی شاعری اور اُس کی شاعرا

کہ لکھنؤ کے تمام موجودہ شعراء پر اُس خورشید کی کرنیں پڑ رہی ہیں جو مجموعی طور پر ادب و شاعری کے آسمان پر "جدید شاعری اور نئی نظم و نئی غزل" کی صورت میں چمک رہا ہے۔

سات یہاں میں نام وار یہ بتاؤں گا کہ ہمارے دوست ناظر کاکوروی نے ان جہانوں پر جو بدقسمتی سے لکھنؤ میں آئے یہ کہہ کر کتنا شدید ظلم کیا ہے کہ وہ "نام نہاد لکھنؤ اسکول" سے متاثر ہوئے

عبدالباری آسی یہ میرٹھ کے ایک قصبہ الکدن کے رہنے والے ہیں اور (میں ذاتی طور پر رشتہ داریوں کا قائل نہیں) مرزا داغ کے سلسلے میں ہونے کی وجہ سے دہلی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اپنی پختہ کاری زود گوئی، مہارتِ فن اور دردِ تغیت کے لحاظ سے مستند ہیں اور ان کے کلام میں موجودہ مروجہ غزل کے عناصر پائے جاتے ہیں، ہرچند کہ یہ ترقی پسند نہیں اور اپنے شعر میں کسی خاص نظریہ پر زور نہیں دیتے مگر شاعرانہ طور پر جو ان کا طریق و اسلوب ہے وہ ہرگز لکھنوی نہیں۔

نیاز فتحپوری نام پڑھتے ہی ہنسی آگئی، اول تو ان حضرت کو شعراء کی صف میں بٹھانا ہی ناظر صاحب کی ستم ظریفی ہے۔ خدا جانے یہ کس مذاق کا جواب ہے!؟ اور اگر یہ نیاز صاحب سے کوئی مذاق نہیں ہے تو جن شعراء کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے اُن کے ساتھ ایک چھیڑ ضرور ہے۔ سوال یہ ہے کہ نیاز صاحب کی وہ کونسی شاعری تھی جو لکھنؤ اسکول سے متاثر ہوئی، وہ شاعری تو دکھائیے' یہ غریب تو آج تک شعر کہنے اور سمجھنے میں کامیاب ہی نہ ہو سکے جو شخص نیاز کو جانتا ہے وہ اس راز سے اچھی طرح واقف ہے کہ وہ "راندۂ بارگاہِ شاعری" ہیں۔ یہی نہیں ان کی ساری زندگی اور ادبی جدوجہد کے سلسلے میں تمام کردار و عمل بتاتا ہے کہ وہ محض مصلحت پرست انسان ہیں، ظاہر ہے کہ آرٹسٹ اپنے آرٹ کی انانیت کے مقابلے میں مصالح کو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ مگر شاعری میں ترقی اور جلبِ منفعت کا امکان نہ دیکھ کر نیاز صاحب نے نثر کی طرف توجہ کی، پھر بھی ہزار کوششوں کے بعد بھی "ابوالکلام" نہ بن سکے۔ کامیاب شے کی ناکام تقلید بھی ایک سانچہ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ نیاز "ابوالکلام" کی ناکام تقلید کا ایک ناتمام پرتو ہیں۔ اس پرتو کو لکھنؤ اسکول نے کس طرح متاثر کیا — ناظر صاحب بتائیں!؟

حسرت موہانی انقلابی شاعر، حسرت موہانی کو تسلیم سے کوئی تعلق ہو، یہ بات الگ ہے، لیکن حسرت موہانی کی شاعری لکھنؤ اسکول سے متاثر نہیں، ان کے کلام کی طرح حسرت "قومیت" ہے، اور یہ کہ وہ انقلابی شاعر ہیں!؟ یا انقلاب کے معنی کچھ اور ہیں یا وہ انقلابی نہیں، ٹھیک عہدِ انقلاب (یعنی آجکل) میں اُن کے جو تازہ افکار ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔ انقلابی نقطۂ نگاہ سے دیکھ رہا ہوں، ورنہ ان اشعار کے دلدوز ہونے میں کیا شک ہے!؟

مولانا حسرت موہانی بی۔ اے (علیگ)

یہ غزل جہاز اسپرودزا از پریو تا ہندڑی پر ۲۶ ستمبر ۱۹۳۷ء کو لکھی گئی

رعنائی میں حصہ ہے جو قبرص کی پری کا
نظارہ ہے مسحور اُسی جلوہ گری کا

رفتار قیامت یونہی کیا کم تھی پھر اُس پر
اک طرہ ہے فتنہ تری نازک کمری کا

پوشاک میں کیا کیا شجری نقش ہیں دلکش
باعث نہ یہی شوق کی ہو جامہ دری کا

لاریب کہ اُس حسنِ ستمگار کی شوخی
موجب ہو مرے زہد کی عصیاں نظری کا

با وصفِ تلاش اُن کی خبر کچھ بھی نہ پا کر
کیا کہئے جو ہے حال مری بےخبری کا

جب سے یہ سُنا ہے کہ وہ ساکن ہیں یہیں کے
عالم ہے عجب شوق کی آشفتہ سری کا

ساتھ اُن کے جو ہم آ گئے تھے بہ غیرت حسرت
یہ رنگ نتیجہ ہے اُسی ہم سفری کا

(یہ غزل بمقام روم ۱۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو لکھی گئی)

ہم رات کو اٹلی کے حسینوں کی کہانی
سنتے رہے رنگینیٔ ثروپا کی زبانی

آنکھوں کا تبسم تھا مرے شوق کا موجب
چتون کی شرارت ہے مری دشمنِ جانی

ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر
جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی نہ مانی

ہوتی جو خبر اس کی تو کیا کیا نہ بگڑتی
ثروپا نے غنیمت ہے کہ یہ بات نہ جانی

اٹلی میں تو کیا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ عشرت
دنیا میں نہ ہوگا کوئی اس شکل کا ثانی

حضرت جوش ملیح آبادی۔ ملیح آباد، لکھنؤ کی ایک تحصیل ہے اس لئے ضلع بھی لکھنؤ ہی ہوگا۔ جوش ملیح آباد میں پیدا ہوئے اس لئے ہم اُن کو لکھنؤ کا باشندہ ہی خیال کریں گے۔

شاعری کے جدید اسکول میں جوش کی جو مصدقہ پوزیشن ہے وہ ظاہر ہے اور اُن کا کلام جتنی جدتوں اور عظمتوں کا حامل ہے اُس سے بھی آپ واقف ہیں، لیکن ناظر صاحب کا دعویٰ ہے کہ جوش صاحب باہر سے آئے ہیں اور اُس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جن کی شاعری "لکھنؤ اسکول" سے متاثر ہوئی!؟

ان تمام کوششوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناظر لکھنؤ اسکول یعنی "لکھنؤ کے شعراء کو" غلط طور پر ادب میں وہ مرتبہ دینا چاہتے ہیں جو بدقسمتی سے تاریخی اور واقعیاتی طور پر اُن کو ابھی حاصل نہیں ہے۔

جب مورخِ ادب اُردو شاعری اور ہمارے عہد کے شعراء کا ذکر کرے گا تو لکھنؤ کے منفعل ماحول میں جوش جیسے باغی شاعر کی پیدائش پر سخت حیران ہوگا۔

ناظر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ تاریخ ادب میں اگر لکھنؤ کو کوئی کریڈٹ دیا جا سکیگا تو صرف جوش کی وجہ سے، وہ لکھنؤ میں تنہا شاعر ہے جس کی غزل میں بھی انفعالی اور تقلیدی اثرات نہیں پائے جاتے۔

سید آل رضا۔ میں اس وقت تک رضا صاحب کو لکھنوی ہی خیال کرتا تھا وہ لکھتے بھی لکھنوی ہی ہیں، مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ اُن کا وطن کہاں ہے!؟ وہ آرزو صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور اُن کے کلام میں آرزو صاحب کی کامیاب تقلید پائی جاتی ہے، لکھنؤ مزاج کی کامل انفعالیت اُن کے کلام کا خصوصی عنصر ہے، اُن کا متاثر ہونا تو لکھنؤ کے شاگرد ہونے سے ظاہر ہے اس لئے یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔

بدر غازیپوری۔ بدر صاحب نظم و غزل دونوں کہتے ہیں اور اُن کی غزل پر لکھنؤ کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا، مروجہ طرز و رنگ میں وہ غزل کہتے ہیں اور نظم پر تو خیر لکھنؤ کا اثر ہونے کے معنی ہی کیا ہیں!؟

شوکت تھانوی۔ یہ آسی صاحب الدنی کے شاگرد ہیں اور جو اُن کے کلام کا رنگ ہے، وہی اِن کا رنگ ہے، پھر شوکت گو اچھی غزل کہتے ہیں، مگر اِن کا اصلی میدان مزاح نگاری ہے اور اس میدان میں وہ سرپٹ جاتے ہیں بہرحال اُن کی غزل مروجہ غزل کی طرح ہے۔

امین سلونوی۔ یہ بھی آسی اُلدنی کے شاگرد ہیں اور اِن کی غزل کی نوعیت بھی شوکت جیسی ہے، ہاں میں پھر کہوں گا کہ اگر "لکھنوی اسکول" الناکی اور الم نگاری کا نام ہے تو اِن دونوں کی غزل میں یہ بات کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔

مجذوب اشرفی۔ مجذوب کی غزل کے لئے یہ کہنا کہ وہ لکھنؤ اسکول سے متاثر ہوئی، شدید ظلم کرنا ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں بے ساختہ اور والہانہ، اور اگر وہ اپنا کلام انتخاب کرکے سنائیں اور کم سنائیں تو سامع کو زیادہ متاثر کرتے ہیں، انتخاب نہ کرنے کی وجہ سے اُن کا اخلاصِ شعری دب جاتا ہے۔ مجذوب کے کلام میں بے ساختگی، جوانی، اخلاص اور کیف کی موجودگی ہی اس کی دلیل ہے کہ لکھنؤ اسکول کا اس پر مطلق اثر نہیں۔

حامد اللہ افسر میرٹھی۔ اس فہرست میں افسر میرٹھی کا نام لکھ کر تو ناظر صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ افسر کی شاعری اور اُس کی شاعرا

جو ہرکے بارے میں کسی کی کوئی رائے کیوں نہو۔ لیکن ان کے
مزاجِ شعری کے تقاضوں اور ان کی افتادِ طبع کو دیکھ کر ایک
نقاد آسانی سے اس نتیجے پر پہونچ سکتا ہے کہ وہ اسمٰعیل میرٹھی
سے متاثر ہیں اور اُن کے کلام میں وہی سادگی اور بانکپن پایا
جاتا ہے جو اسمٰعیل میرٹھی کی نظموں کی جان ہے۔ افسوس کہ
ان کو شاعری نے اور شاعری کو اُنھوں نے بالکل چھوڑ دیا، ورنہ
وہ اردو زبان کے پہلے شاعر تھے جن کے سر بچوں کے لئے
تعمیری شاعری پیدا کرنے کا سہرا بندھتا۔ لیکن آنسر نے جو کچھ اپنی
یادگار چھوڑی ہے اُس کی نفاست اور دلنوازی سے انکار نہیں
کیا جاسکتا۔ بہرحال یہ دلّی اسکول کی گود میں پلنے اور جدید اسکول
کی فضاؤں میں پروان چڑھنے والا سپوت ہرگز لکھنؤ اسکول
سے متاثر نہیں۔

سیّد کلب احمد مآنی جائسی۔ اِن کا مولد وطن (جائس)
سہی، مگر ان کے کلام کی بندش، اسلوب، الفاظ کی تراش، تراکیب
کی توضیع، تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لکھنؤ میں "لالۂ صحرا" کی
حیثیت رکھتے ہیں۔

سجّاد حیدر یلدرم۔ ان کی بھی ایک ہی رہی "آہو" کا
شاعر اور لکھنؤ سے متاثر !؟

اِن دلائل کی روشنی میں کون شخص کہہ سکتا ہے کہ لکھنؤ میں آنے
والے یہ مسافر، اپنا زادِ سفر خود نہیں رکھتے تھے، ان بیچاروں پر
"فرضی لکھنؤ اسکول" سے متاثر ہونے کا اتہام ناظر صاحب کو
دوسرا مقالہ لکھ کر واپس لینا چاہئے۔ ورنہ مستقبل کے ادبی مورّخ
کے لئے اس مقالہ کے ساتھ ساتھ یہ حواشی کچھ کم ضروری اور
دلچسپ نہیں!

میرے دوست مجھے معاف فرمائیں، جانبدارانہ قصیدہ خوانیوں اور
وہ "بورژوا تنقیدی عہد" گزر گیا۔ جب تنقید کے نام پر دلّی لکھنؤ
کی بے بنیاد ناجائز و جائز کشش محض پارٹی پالٹکس کی بنیادوں
پر چھیڑی جاتی تھیں اور آنکھ بند کرکے اُن کو تسلیم کر لیا جاتا تھا آج
دنیائے ادب میں نہ دلّی اسکول ہے نہ لکھنؤ اسکول نہ میرٹھ اسکول

ہے نہ آگرہ اسکول، اور اگر ہیں تو صرف دو اسکول ہیں،
"قدیم" اور "جدید"۔ جدید میں وہ تمام نظم نگار شعراء ہیں جو ترقی
پسند شاعری کے علمبردار ہیں، یعنی جن کی شاعری مصنوعی نہیں
حقیقی اور واقعیاتی، نفسیاتی اور فکر کا نتیجہ ہے اور قدیم میں بغیر
استثنیٰ وہ تمام غزل گو حضرات شامل ہیں جن کی شاعری غیر شعوری
ومبہم ہے اور کوئی مرکزی خیال نہیں رکھتی

ساحل

لکھنوی شعراء میں غلطی سے حکیم سعید احمد ناطق کا نام رہ گیا تھا اور ایک
کو قصداً چھوڑ دیا گیا ہے جو کہ "لکھنؤ اسکول" کا ساختہ پرداختہ ہے اگر تعصب
اور تنگ نظری کو چھوڑ دیا جائے خود پرستی اور خود نمائی سے وہ بھی پرہیز
تو یقیناً لکھنؤ اسکول کا بہت کامیاب شاعر کہلائیگا لیکن وہ بزعم خود دیگر
ہے اور باوجود بہترین جذباتی شاعر ہونے کے افسوس ہے کہ لکھنؤ اسکول
کبھی مقبول نہ ہوسکا[1]

[1] اِن سطور کو کوئی شریف اڈیٹر اپنے رسالہ میں شائع کرنا گوارا نہیں
کرسکتا، لیکن دل پر پتھر رکھ کر میں صرف اس لئے شائع کر رہا
ہوں کہ دنیا اس ترقی اور جمہوری عہد میں میرے دوست ناظر
صاحب اور اُن کے پس منظر میں پوشیدہ "لکھنؤ اسکول" کے ڈکٹیٹر
کی ذہنیت کا اندازہ کرلے!

"... اور ایک شاعر کو قصداً چھوڑ دیا گیا ہے"۔ الفاظ کی دنائت
درشتی، انصاف کشی اور تنقید نگاری کے موضوعہ اصول سے بغاوت
اور سرکشی ملاحظہ فرمائیے گویا ناظر صاحب نے یہ مقالہ لکھ کر "قرآنِ کریم"
لکھ دیا۔ کیا ایسا کوئی مضمون جس میں مندرجہ بالا شخصی اور اجتماعی تنگ
دلی کا مظاہرہ ہو تنقیدی مضمون کہلایا جاسکتا ہے !؟
میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون تھا جنھوں نے اجلاس کے اختتام پر سپرد گولڈ میڈل
کا اعلان کیا، کیونکہ یہ تو لکھنؤ کے شعراء اور ادبی ماحول میں ہر
دل عزیزی حاصل کرنے کا محض ایک ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔
میرے دوست ناظر کا کوروی اس سے زیادہ اچھے مضامین لکھ
سکتے ہیں اور میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ تعصب سے بری اور اونچے
ہیں، مگر یہ مقالہ نہ جانے کیوں اُن کی ادبی و اخلاقی روایات کے

خلاف تعصب کا شاہکار بن کے رہ گیا ہے: !؟

جس شاعر کو انھوں نے قصداً چھوڑا ہے وہ واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی اور حال مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی ہیں!

مرزا یگانہ کو جو لوگ قریب سے جانتے ہیں وہ خوب واقف ہیں کہ اُن کی روح میں برداشت، اُن کی طبیعت میں فرو اور اُنکی سیرت میں عفو و درگذر کرنے کا مادہ نہیں، اُن کی "انانیت" میں خشکی ہی، رنگینی نہیں، یگانہ اور جوش کی "شاعرانہ انانیت" کا اگر موازنہ کیا جائے تو مثال اُن دو سوداگروں کی سی ہوگی، جن میں ایک تو بڑھ کر خریدار کے سامنے اپنے بیش قیمت موتی پیش کردے اور کہے، گھر لے جائیے خوب دیکھ بھال لیجئے، دوسرا منہ پھلائے ہوئے ایک طرف کھڑا رہے، آخر خریدار اُس کی طرف خود متوجہ ہو اور پوچھے جناب کیا ——— !؟

بولنا کس طرح ہے ——— !!؟ جانتا نہیں میں فارس کا سب سے بڑا سوداگر ہوں ——— !؟

مرزا یگانہ "فارس کے سب سے بڑے سوداگر" ہیں، اور شاعری کے سلسلے میں اُن کا توازن دماغی ہر وقت غیر یقینی رہتا ہے، لیکن جوش (ہر چند کہ میں اُن کے عمل و کردار سے کُلّی طور پر متفق نہیں) اپنی شخصیت کو شاعری سے بھی بلند تصور کرتا ہے اور اس شخصیت میں پوشیدہ فرد کو شخصیت سے بلند تر!

اس لئے باوجود نہایت ناگوار باتوں کے لوگ اس کی ذات سے محبت کرنے کے لئے مجبور ہیں؛ اور جہاں تک مرزا یگانہ کا تعلق ہے، اُنکا ذوق شعرا میں "وحدہٗ لاشریک" بنتا ہے۔ اگر آپ ان کی "وحدت" کا اعتراف کرتے رہیں گے تو شاید کسی وقت وہ آپ کو "پوسٹ مین" (اس لفظ کے محلِ استعمال کی معنویت سے ضرور لطف اُٹھائیے) کا خطاب دیدیں - !؟

جوش کے دل میں بھی لطیف بخلات کی صورت میں یہ فاسد جذبات ضرور اُٹھتے ہیں. مگر وہ ہمیشہ اُن کو دباتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن سے ملک کے نوجوان دوستوں کی طرح ملتے ہیں اور اُن کے اس اخلاق سے جس میں وہ اپنی شاعرانہ انانیت کو مغلوب کردیتے ہیں، اکثر نقصان دہ نتائج پیدا ہوجاتے ہیں!

اِن دوستوں کو میں کامل اٹھارہ سال سے جانتا ہوں۔ اِن کی فطرت، اِن کی طبیعت، اِن کی جودت، ان کی محبت، اِن کی منافقت تمام باتوں کا مجھے خوب اندازہ ہے، اور سچ پوچھئے تو مجھے اِن کے مطالعۂ فطرت میں بڑا مزہ آیا ہے اور میں نے اس مطالعے سے بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے -

مرزا یگانہ کو میں اگست سنہ ۱۹۲۳ء سے جانتا ہوں، یہ وہ زمانہ ہے کہ میری ادبی زندگی شروع ہوئی اور میں نے "پیمانہ" کی ادارت شروع کی، میں اُس وقت کو ابھی بھولا نہیں ہوں، جب اگست یا ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء کی اک شام کو امین آباد میں فانی صاحب بدایونی کے مکان پر مرزا یگانہ، لکھنؤ والوں کی شاعرانہ ستم رانیوں اور رفاقتی انتقام سے تنگ آکر آنسو بہا رہے تھے۔ دنیا لکھنؤ کے شعرا اور اُن کی فطرت کو نہیں جانتی، اُن میں مقابلے کی ہمت نہیں، جو مضبوط آدمی چاہے اُن کے گھر میں گھُس کر اُن کی ساری نقدی چھین سکتا ہے، مگر لکھنؤ میں یا اس کے خلاف ہر قسم کا انتقام لینے سے پرہیز نہیں کریں گے۔ تڑپا دینے والے اشعار پر مُت بنتا کوئی اِن سے سیکھے مرزا یگانہ غریب کو اتنا پریشان کردیا کہ اُن کو لکھنؤ چھوڑ کر لاہور اور پھر لاہور سے حیدرآباد جانا پڑا اور اُن کے جانے کے بعد اُن کی یاد اس مقالہ میں جس طرح کی گئی ہے، وہ آپ نے دیکھ ہی لیا۔ !؟

قطع نظر اس کے کہ مرزا یگانہ کے ادبی اعمال و کردار اور ذاتی افتادِ مزاج کیا ہے کوئی شخص اِس سے انکار نہیں کرسکتا کہ وہ اس عہد کے "جیّد شاعر" ہیں اور اُن کے مزاج میں جو تخلیقی مادّہ ہے وہ لکھنؤ کے کسی غزل گو شاعر میں نہیں وہ اپنی جودت اور ذہانت سے آگے بڑھے، اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ وہ "لکھنؤ کے ساختہ و پرداختہ" ہیں

مجھے ہنسی آتی ہے اِن فقروں پر کہ :-

"خود پرستی و خودنمائی سے وہ بھی پرہیز کرے تو یقیناً لکھنؤ اسکول کا بہت کامیاب شاعر کہلائیگا"

بھئی مشیر (ناظر) یہ تنقید نگاری ہے یا کسی علم مضر کا "سالگرہ" یا "لیس"

ہے — ! ؟ مجھے حیرت ہے کہ ڈاکٹر سپرد نے اس کی نقل
تم سے کیوں طلب کی ! ؟ —— غالباً وقتی واہ واہ سے متاثر ہو کر۔
مزہ یہ ہے کہ "بہترین جذباتی شاعر" یگانہ کو ناظر صاحب بھی تسلیم
کرتے ہیں "مگر لکھنؤ اسکول میں وہ کبھی مقبول نہ ہو سکا"

صفی

اس وقت لکھنؤ اسکول کی شاعری میں مولانا صفی مولانا آرزو اور مولانا آسی کے مدارسِ شعری کو بہت فروغ ہے۔ لسان القوم مولانا صفی کا وجود بہت مغتنمات سے ہے، جو کچھ کہتے ہیں خوب کہتے ہیں، اُردو ادب اِن کی ادبی نوازشوں کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اِن کے شاگردوں میں مولانا عزیز نے بہت کافی شہرت حاصل کی، افسوس ہے کہ آخر حصۂ عمر میں اُستاد و شاگردوں میں صفائی نہ رہی اور ستم ظریفوں نے ایک جدید عزیزیا اسکول کا سنگِ بنیاد رکھ دیا لیکن مولانا صفی نے کبھی اپنی زبان سے اپنے عزیز شاگرد کی بُرائی نہ کی بلکہ ہمیشہ ہمت افزائی کرتے رہے۔

نمونۂ کلامِ صفی۔

وضعِ صفی نہ پوچھو اک رندِ پارسا ہے
لب پر صنم صنم ہو دل میں خدا خدا ہے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

کچھ نہیں اور وعظ کے سلسلۂ دراز میں
نہرِ شراب موجزن جنتِ خانہ ساز میں

جا کے جب تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا
ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

دل سے دل تک نزع میں کچھ نامہ و پیغام تھا
آمد و رفتِ نفس کا ورنہ پھر کیا کام تھا

غمزدوں کا یہ اشارہ نزع کے ہنگام تھا
وہ اگر آتے تو کہتے کچھ اُنھیں سے کام تھا

وہ فروغِ بزمِ عشرت وہ طلوعِ جامِ جم
کچھ نہ تھا، خالی فریبِ گردشِ ایام تھا

تڑپ کے رات جو کاٹی تو اک مہم سر کی
چھری تھی میرے لئے جو شکن تھی بستر کی
مجھے گماں ہُوا اُس شوخِ سُست پیماں کا
اگر ہوا سے بھی زنجیر ہل گئی در کی
کہے گا کون، سُنی جائیگی صفی کس سے،
تمھاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

کس دیدۂ گریاں نے لُٹائے تھے یہ موتی
شبنم نے جو ٹانکے ہیں گریبانِ سحر میں

یارب پڑی رہے مری میت اسی طرح
بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کئے ہوئے

مری لاش کے سرہانے وہ کھڑے یہ کہہ رہے ہیں
اِسے نیند یوں نہ آتی اگر انتظار ہوتا

شیشوں کی طرح ٹوٹے توبہ سر میخانہ
ساقی پھر اُسی کُن سے اک لغزشِ مستانہ

تو بھی مایوسِ تمنا مرے انداز میں ہے
جب تو یہ دردِ پپیہے تری آواز میں ہے

مرزا محمد ہادی عزیز خوش نصیب تھے کہ اُن کو شاگرد بے نظیر ملے اور اُن کی حیات ہی میں اُن کے نامور شاگردوں کا درجہ بہت بلند ہو گیا، یہ سعادت تھی جو مقدر سے عزیز کو ملی۔ عزیز کی شاعری قدیم و جدید لکھنؤ اسکول کی شاعری ہے۔ روداد محبت مزے لے کر بیان کی ہے اور حسن و عشق کی چاشنی نے "گلکدہ" کو ہر مجلس کے لئے مقبول بنا دیا ہے۔ عزیز نے عمر بھر اُردو ادب کی خدمت کی اور کسی شخص نے یہ نہ جانا کہ عزیز نے کس حال میں بسر کی۔ محمود آباد ریاست کی ادب پرستی کا یہ ادنیٰ نمونہ ہے کہ جوان بخت و جواں سال راجہ[؎] نے عزیز کے اُجڑتے ہوئے گھر کی لاج رکھی اور اُن کے پسماندگان کے لئے تا حینِ حیات وظیفہ مقرر کر کے اپنے اجداد کی لافانی سرپرستی کے کارناموں میں ایک مزید شاندار اضافہ کیا۔

؎ خان بہادر راجہ امیر احمد خاں والیٔ ریاست محمود آباد

نمونۂ کلامِ عزیز

حادثے دونوں یہ گذرے ہیں اِسی عالم میں
میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھُولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

لو آگئی عزیز شبِ ہجر آگئی
سامانِ موت کہدو مہیا کرے کوئی

بیمارِ غم پر آپ نے احسان تو کیا
اتنا مگر کہوں گا کہ غفلت ضرور کی

دل تابعِ کشش تھا کشش تابعِ جمال
ہاں ہاں محبت آپ نے کی اور ضرور کی

رگیں کھینچنے لگیں اب نزع کا ہنگام آتا ہے
وہ جائیں، ورنہ اُن کے سر یہ بِ الزام آتا ہے

عزیز باوفا نے دیر میں کچھ چوٹ کھائی ہے
حرم میں آج باندھے جامۂ احرام آتا ہے

لسان القوم مولانا صفی کے حقیقی بھائی سید مقبول حسین ظریف (افسوس آج اُن کے وجودِ گرامی سے ہماری سبھا خالی ہے اور آج ہر شخص کی آنکھیں پُرنم ہیں اور اِس مجلس میں اُن کی زبردستی کمی کو محسوس کر رہا ہے) وہ لکھنؤ کے مشہور طنز گو شاعر تھے۔ اُن کی نظمیں گو تعداد میں زیادہ نہیں ہیں لیکن جو کچھ بھی ہیں اُس میں ہماری عمرانی معاشرتی اور سماجی مروجہ مظالم دہوسناکیوں کا خاکہ اُڑایا گیا ہے اور آج اُن کی طرز پر کہنے والا ہماری جماعت میں دوسرا نہیں ہے۔ کسی بڑی حد تک ہم رفیع احمد خاں ایم۔ اے و شہاب الدین کرمانی کے نام لے سکتے ہیں۔ لیکن اِن حضرات کی خلقی شرم نے آج تک ملک کو ان کے بے نظیر شہ پاروں سے محروم رکھا، اِن کی شاعرانہ نازک خیالیاں بجائے خود ایک صحبت کی محتاج ہیں۔

نمونۂ کلامِ ظریف۔

اونٹ جب بھاگا تو بھاگا نجد سے قبلہ کے رُخ
دُم کے پیچھے قیس تھا آگے خدا کا نام تھا

پنہانے وقت کرتا یہ دعا تھی قیس کی ماں کی
الٰہی خیر کرنا میرے بچے کے گریباں کی

دلِ عاشق کے پتھر اس لئے منگوائے جاتے ہیں
سڑک بنوائے گی میونی سپلٹی کوئے جاناں کی

ڈاڑھی مونچھیں صاف ہیں مثلِ قلندر دیکھئے
مادہ رُو ہیں مغربی تہذیب کے نر دیکھئے
دل کو گر منظور ہو نظارۂ حُسنِ فرنگ
چاہے شلجم دیکھئے چاہے چقندر دیکھئے

وحشت میں ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

جب اک گنوار کا لٹھ لیلیٰ کا سارباں ہو
مجنوں کو کیوں نہ ڈانٹے ٹھاٹے رہبیاں ہو،

کچھ تو آثارِ قدیمہ کی حفاظت چاہئے
اے نئی تہذیب کے پُتلے پُرانوں کو نہ چھیڑ

سرکس کا تماشا ہے بدمستوں کا میخانہ
اک اور قلابازی اے لغزشِ مستانہ
فیشن کی محبت میں تقلیدِ زنانوں کی
کیا یہ تجھے لازم ہے اے ہمتِ مردانہ

مرزا عزیز کے شاگردوں میں اشرف الحکما حکیم سید علی آشفتہ خان بہادر دہلوی، مرزا جعفر علی خاں اثر، انقلابی شاعر جوش ملیح آبادی، منشی جگت موہن لال رواں، اور چودھری رحم علی ہاشمی بہت مشہور ہوئے، اور حق یہ ہے کہ آشفتہ علیگ، اثر اور جوش نے اُردو ادب میں جو درجۂ اختصاص حاصل کیا ہے وہ عزیز کے لئے باعثِ صد ہزار نازش ہے۔

لـه گویا ناظر صاحب کے نزدیک جوش کی صرف ایک ہی پوزیشن تھی اور اسی نہج سے اُن کا ذکر کیا جاسکتا تھا !؟ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جوش نے اُردو شاعری میں جس قدر تخلیقی ادب پیش کیا عزیز اگر ایک زندگی اور بھی پاتے تو اتنی اور ایسی شاعری خلق نہ کرسکتے۔ یہ بالکل ایک حادثاتی بات ہے کہ جوش نے عزیز لکھنوی سے مشورہ لیا ورنہ جوش کی بجائے خود ایک انفرادیت اور زبردست

حیثیت ہے۔

س۵۲ آشفتہ صاحب نے اُردو ادب میں کیا تخلیقی لٹریچر نظم و نثر میں پیدا کیا۔ اس سے یا آشفتہ صاحب واقف ہوں گے یا خود ناظر صاحب۔ ہم لوگ بدقسمتی سے واقف نہیں، البتہ وہ غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

ساغر

رواں نے عمر کم پائی لیکن جو کچھ کہا ہے وہ خوب کہا ہے۔ وہ رباعی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کیا ہے محبت کی داستانیں ہیں اور بڑے مزے میں بیان کی گئی ہیں۔

س۵۳ صرف محبت کی داستانیں نہیں، حقائق حیات سے پردہ اُٹھانے والی بھی!

ساغر

نمونۂ کلام رواں

کوئی آزاد ہستی بزم دنیا میں نہیں ملتی،
جسے دیکھیں گے بس فریادیٔ زنجیر دیکھیں گے

اپنے وطن سے چھُٹ کر آوارہ پھر رہا ہوں
بانگ غریب منزل نامحرم درا ہوں

۴

دیوانگی سمجھئے یا میری کم نگاہی
اپنا نشانِ منزل اوروں سے پوچھتا ہوں
اللہ رے دلفریبی ایوانِ آرزو کی
ہر منظرِ فنا کو باقی سمجھ رہا ہوں
آتا ہوں فاصلے سے جانا ہے دُور مجھ کو
دلچسپ تھے مناظر دم بھر ٹھہر گیا ہوں

ہنسے بھی روئے بھی لیکن نہ سمجھے
خوشی کیا چیز ہے دنیا میں غم کیا

کل کہتے تھے جس کو دل کی راحت یہ ہے
ہے آج جدا وہ کیا قیامت یہ ہے
یہ جان کے بھی کہ موت سر پہ ہے کھڑی
انسان ہے محوِ عیش حیرت یہ ہے

کل صبح نے مسکرا کے تاروں سے کہا
ہو جائیں گے اب تمہارے انوار فنا

خان بہادر مرزا جعفر علی خاں ایم-بی-ای آثر کی شاعری میں لطیف طنز ہے۔ موسیقی ہے۔ زبان ہے۔ میر کی سیاست ہے اور غالب کی بلند آہنگی، پڑھیے س۵۱ اور لطف اُٹھائیے اور سر دُھنئے۔ یہ ناممکن ہے کہ آثر کا شعر پڑھا جائے اور دل پر چوٹ نہ لگے، معلوم ہوتا ہے کہ آثر نے جو کچھ کہا ہے دل سے کہا ہے اس لئے بے آثر نہیں۔ انھوں نے بڑی سرگرمی اور عرق ریزی سے فن شاعری کی تحصیل کی اور ایک صناع کی طرح اُن کو اپنے سازوں کے استعمال پر بجا ناز ہے۔ خوش نما جملوں کی تخلیق، تجربہ کا شوق بحور و اوزان کے انتخاب میں احتیاط و سلیقہ، وہ کاوش جو شاعری کو دل پذیر بنا دیتی ہے، ان امور سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ نادر صناعی کے مالک ہیں، اُن کی شاعری بھی حسین ہے اس کی پیشانی پر شباب کی رعنائی ستارے کی طرح چمک رہی ہے اور اس کا ملبوس زرق برق ہے اور خود نور کا بُقعہ ہے، لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ متانت خیال اور لطافت مزاج اس حد تک ہے کہ روح خوش ہو جائے۔ آثر نے کامیاب فطرت نگاری کی ہے اور غزل میں لفظوں میں کسی فطری منظر کی خوبصورت مصوری بار بار ہمارے دامن دل کو کھینچتی ہے۔ تشبیہات کی تازگی، ندرت اور برمحل صرف قابل داد ہے۔ آرٹ میں مکمل محویت اور آرٹ کو اپنی زندگی سے اس قدر متحد کر دینا آثر کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

س۵۴ پھر لکھنؤ اسکول کا نمائندہ آپ انھیں کیونکر کہہ سکتے ہیں!؟

ساغر

آثر کی شاعری میں محبت ذہنی بلکہ بسا اوقات روحانی ہے۔ انکی محبت انسانیت کے دائرے سے خارج نہیں ہوتی، اس محبت میں خواہش ہے مگر نفس پرور تسکین کی جگہ صرف تمنا ہے۔ مقصد براری تباہی کا پیش خیمہ ہے، عاشق و معشوق میں ہمیشہ ایک پردہ ایک حجاب حائل رہے گا۔

عشق ساقی عشق مطرب عشق مستی عشق مے
عشق ہی پیمانۂ میخوار ہونا چاہیے

آگاہ نہیں عشق کے آغاز سے کوئی
کیا راز ہے، واقف نہیں اس راز سے کوئی

مجھ کو جواب صاف نہ دے التماس کا
آباد رہنے دے چمن اُمید و یاس کا

نہ گھبراؤ اسیرو پھر چمن میں آشیاں ہوگا
گل اپنے، باغ اپنا اور اپنا باغباں ہوگا

مذاقِ عشق ہو کامل تو صورتِ شبنم
کنارِ گل میں رہے اور پاکباز رہے

بیٹھا ہوں رہگذر میں لئے جنسِ عاشقی
اس سے غرض نہیں کہ خریدار کون ہے

ہجر میں راحت سی راحت ہے نصیب
دردِ دل میں لب پر اُن کا نام ہے

کچھ بھی نہ نظر آئے یوں محوِ تماشا ہو
پھر دیکھ آثرؔ تجھ کو کیا کیا نظر آتا ہے

میں کیا سناؤں دردِ محبت کا ماجرا
حد ہوگئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی

آثرؔ کے یہاں متعدد اشعار ہیں جن میں زندگی کے دیگر اہم مسائل کا تجزیہ ہے[1]

یہ سُنکر خوشی ہوگی کہ آثرؔ صاحب کا نیا دیوان "بہاراں" شائع ہوگیا ہے، ضرورت یہ ہے کہ "بہاراں" کا ایک عمدہ انتخاب شائع کیا جائے، اُمید ہے کہ آثرؔ صاحب اس مسئلہ پر کبھی غور فرمائیں گے؛ ناظرؔ

اور ایسی رائے زنی ہے جو اُن کے مضبوط عقیدۂ رجائیت کا آئینہ ہے[2] ان کے مطابق زندگی عمل سے تنوع سے آگے بڑھتا ہے، اُن کے اظہارِ خیال کا طریقہ تحکمانہ یا بلا استناد نہیں ہے بلکہ ایسے الفاظ میں بیان ہوا ہے جو تناسب کے ساتھ نشاط انگیز ہیں۔ وہ اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ اُن کے ایک ایک لفظ اور جُملے میں زور اور سحر کارانہ دلکشی ہوتی ہے۔
آثرؔ کے لئے اگر صبح و عدوں سے لبریز ہے، تو شام ملکوتی نغمے سناتی ہے۔

ناظرؔ کاکوروی

۱ اسقدر متضاد اور گذری ہوئی تعریف تنقید سے تعلق نہیں رکھتی؛
یا اللہ صاف ہی کیوں نہیں کہہ دیتے شاعری کے خدا ہیں — !؟
۲ یہ صحیح ہے کہ آثرؔ صاحب کامیاب غزل گو ہیں لیکن مسائل اور اُن کی غزل سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش میں آپ اُن کو کوئی کریڈیٹ نہیں دیتے، اُن پر ظلم کرتے ہیں۔ کیونکہ غزل کو نہ مسائل سے تعلق ہے اور نہ فلسفے سے، وہ خاص ( ) عشقیہ شاعری کی ایک صنف ہے اور آثرؔ صاحب کے کلام میں ایک یاس انگیز کرب ( ) تکمیل کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

ساغرؔ

پریم چند کا تخیّلی ارتقاء

(وہ تقریر جو ۸ ستمبر ۱۹۳۸ء کو "پریم چند ڈے" کے سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے براڈ کاسٹ کی گئی)

کسی کامل اور سچے ادیب کے خیالات کی درجہ بدرجہ ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اُس کے ماحول زندگی اور مذہبی اعتقاد پر نظر ڈالتے ہوئے اُس کے زمانے پر بھی نظر ڈالیں۔ کیونکہ خیالات کی پیدائش اور اُن کی بڑھوتی کا بہت کچھ تعلق ادیب کی زندگی، ماحول اور زمانے سے ہوتا ہے۔ وہ ادیب اور شاعر جو زمانے کے ساتھ ساتھ نہیں چلتا وقت کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔ پریم چند ہندوستان کے دیہات، غریب اور دکھی سماج کے دُکھ سُکھ کا مصوّر پریم چند، جس کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا، بنارس کے ایک گاؤں مڈہوا لہی کے ایک غریب اور شریف کائستھ خاندان میں ۱۹۳۷ سمبت کو پیدا ہوا۔ ساتویں سال موت نے اُسے ماں کی گود سے محروم کر دیا اور پندرہ سال کی عمر میں اس کے سر سے باپ کا سایہ بھی اُٹھ گیا۔ اس محرومی کے بعد دنیا کی سختیوں اور مشکلوں کا اُس نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ماں باپ سے دائمی مفارقت اور دنیاوی مصیبتیں گویا قدرت نے کھلے بندوں زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں سے اُسے آشنا ہونے کا موقع دیا۔ قدرت کا یہ سلوک پریم چند کے ساتھ کچھ نیا نہیں تھا دنیا کے ہر بڑے انسان پر وہ اسی طرح مہربان ہوتی آئی ہے۔ بہرحال جہاں پریم چند نے آنکھ کھولی، جن چیزوں کو دیکھا اور اپنی زندگی میں جن کٹھن راستوں سے پریم چند کو گزرنا پڑا۔ اُنھیں راستوں سے پریم چند کے ادب کی شاندار سواری آئی یعنی پریم چند کی افسانہ نگاری داخلی تاثر کے پس منظر پر لطیف اور گوناگوں انسانی نفسیات اور ہندوستان کی دُکھ بھری زندگی کی سچی تصویر ہے۔

پریم چند انقلابی نہ تھے وہ مادّہ پرستی پر بھی وشواس نہیں رکھتے تھے، وہ زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر بات کو حق اور صداقت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تھے، اُن کے ادب میں جابجا ہندو فلسفہ اور ہندو تمدّن کا رنگ اُن کے ذاتی خیالات کا عکس ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۱۵ء تک اُنھوں نے اُردو ادب میں وہ قیمتی اضافے کئے جن کی مثال نہیں۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۶ء تک کامل اکیس سال اُنھوں نے ہندی زبان کی سیوا کی۔ ۱۹۰۷ء میں پریم چند نے افسانہ نگاری شروع کی تھی۔ سب سے پہلی کہانی کا عنوان تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن"، کہانیوں کا سب سے پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" ۱۹۰۹ء میں کانپور سے شائع ہوا۔

"سوزِ وطن" کی تمام کہانیاں، کہانیاں کیا ہیں، دیش پریم کی ہلکی ہلکی چنگاریاں ہیں مگر ایک کہانی بھی آرٹ اور ادب کی حدوں سے نکلی ہوئی نہیں ہے۔ ان کہانیوں نے پریم چند کو شہرت کے آسمان پر آفتاب کی طرح چمکا دیا۔ کچھ "سوزِ وطن" ہی کی نہیں اُن کے دوسرے شروع کے افسانوں میں بھی کردار نگاری، پلاٹ، پس منظر اور طرزِ نگارش کی انفرادیت اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے۔ پریم چند کے ادب کا رُخ شروع ہی سے بیداری، اصلاح اور خود شناسی کی طرف تھا۔ رانی سارندھا و کرما دت، راجہ ہردول ۱۹۱۰-۱۱ کی لکھی ہوئی کہانیاں اس بات کی دلیل ہیں۔ اس قسم کی کہانیوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ شعریت کی چاشنی نے حقیقت نگاری کو مدھم کر دیا ہے۔ لیکن اس منزل سے ہر افسانہ نگار کو گزرنا ہی پڑتا ہے اور دنیا کے ہر شاعر اور ادیب کو پہلے پہلے لفظوں کے گورکھ دھندے میں اُلجھنا پڑتا ہے اور فوق العادت باتوں سے اس کی ادبی زندگی کا کم از کم چوتھائی حصّہ

تباہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پریم چند کی شروع کی کہانیوں کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ لفاظی اور فوق العادت باتوں سے اُن کے ادب کا بچپن بڑی حد تک محفوظ رہا۔ پہلے پہلے ان کا ادب گویا ان کے ماضی و حال کے محدود مشاہدوں اور تجربوں اور ہندوستانی زندگی کی سادہ لطیف تصویر کشی تھی۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں پریم چند کا سب سے پہلا ناول "سر" اور سنہ ۱۹۰۴ء میں دوسرا ناول "پریما" ہندی بھاشا میں شائع ہوا۔ گویا پریم چند نے ناول نگاری کہانی لکھنے سے پہلے شروع کی، لیکن ایک دو ناول کے بعد یکایک اُن کا مختصر کہانیوں کی طرف رجحان اس کی دلیل ہے کہ اس باب میں اُنھیں اوّل اوّل کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر بالآخر عمر کے آخری حصہ میں اُنھوں نے ناول نگاری کی سخت منزل کو بھی طے کر ہی لیا۔

دراصل کسی ایسے ملک میں جو پُرانی روایتوں کا چولا اُتار کر جدت اور تبدیلی کا بانا پہن رہا ہو ادب کی تبدیلی اور تبدیلی کے ساتھ کامیابی ایک معجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پریم چند جس زمانے میں پیدا ہوئے اُس وقت ہندوستانیوں کے ذہن ورد مانغ سرشار کی سحر آفرینیوں سے مسحور تھے، اور نثر ہو یا نظم، ہر صنفِ کلام میں غیر حقیقی باتوں اور ایک قسم کی بازاری رومانیت کا غلبہ تھا۔ سماج تو سماج ادیبوں اور شاعروں کی آنکھیں زندگی کی طرف سے بند تھیں۔

شعراء اور ادیب زندگی نہیں بلکہ ایک خاص طبقے کی زبان تھے ان کے پیشِ نظر عیش وطرب کی محفلیں تھیں، زرق برق لباس تھے کرّوفر تھا، شان وشوکت تھی، شب باشیاں تھیں، درباداریاں تھیں کہ اس ہنگامے میں ایک دبلے پتلے انسان نے زندگی کے رُخ سے آہستگی کے ساتھ پردہ اُٹھایا اور نگاہوں کے سامنے ایک بالکل نیا سین کھینچ گیا، ایک طرف اخلاق واخوت کی تعلیم تھی، دیش پریم تھا، انسانی زندگی اور نفسیات کی کبھی جھوماوٹ پیدا کرنے والی اور کبھی رُلانے والی تصویریں تھیں، کہیں دُکھیا بیوہ ہے اور کہیں نئی نویلی دلہن، کہیں کسان ہے اور اُس کے ہل بیل، کہیں چوپال ہے اور گڑگڑی، دوسری طرف شہری زندگی اور اُس کا طوفان، اس طوفان میں مجبوراً زندگی کی کشاکش اور کشمکش، گھریلو زندگی اور اُس کی چہل پہل، ماں باپ بیٹے بہو سب کی صحیح نفسیات نگاری، پھر اس پر زبان کی سادگی اور لوچ، جس کیریکٹر کی زبان سے بول رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہی کیریکٹر خود ہیں۔ غرضکہ پریم چند نے انسانی زندگی کے بیشتر تاثرات کو ہمارے سامنے آئینہ کر دیا، تمام سماج کے لئے اُس کی کہانیاں قیمتی چوکھٹے میں لگی ہوئی تصویریں ہیں۔ زندگی تصویر ہے اور چوکھٹا اس کا فنی کمال۔

نثر میں وہ تاثیر اور زور ہے کہ روزانہ زندگی کے نہایت ہی معمولی سین نگاہوں میں اس طرح کھچ جاتے ہیں گویا ہم بیٹھے ہوئے کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔

ٹیگور کی کہانیاں بنگال میں بڑا درجہ رکھتی ہیں، زندگی کے تمام خارجی تاثرات کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور شاعر ہونے کی وجہ سے جو رنگ بھرتے ہیں اس کا کوئی جواب نہیں۔ پریم چند دراصل ٹیگور ہی سے متاثر ہیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی کہانیاں شاعرانہ رنگینیوں سے خالی ہیں تاہم وہ سرمستی جو شاعرانہ دماغ ہی کا حصہ ہوتی ہے، زیادہ نہیں پائی جاتی، مگر جذبات، جوش اور توازن کی کہیں کمی نہیں، اگر ہم ذرا اور غور سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ پریم چند درجہ بدرجہ تکمیل کی طرف رجوع ہوئے، یہ خیال زیادہ صحیح نہیں کہ ادیب زمانے کو پیدا کرتا ہے بلکہ زمانہ ادیب کو خلق کرتا ہے، پریم چند کے ادب کا پس منظر، مغربی تمدن یا ملا جلا مغربی کلچر نہیں ہے بلکہ اُن کی افسانہ نگاری کا پس منظر غریبوں کے جھونپڑے روزمرہ کی زندگی، اور درمیانی درجہ کے ہندوستانیوں کی حیات ہے اور وہ ان میں حسنِ تناسب کے ساتھ قدیم ہندوستانی تمدن کا رنگ بھرتے ہیں اور اسی لحاظ سے وہ اخلاق کی سادگی، اور مشرقی تہذیب کے مستقل علمبردار ہیں۔ ان کا ادب یکسر ماحول یعنی (Environment) سے متعلق ہے۔ ان کے ادب کی روش اور یہ فطری تقاضا، نتیجہ ہو اُن ملکی تحریکوں کا جو سماجی بیداری سے پیدا ہوئیں اور جن اثرات نے حالی اکبر اور اقبال جیسے عظیم الشان شاعر پیدا کئے۔ جس طرح اکبر اور اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی اور مشرقی تصوّرات پیش کئے۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ ہندوستانی روایات میں ایک نئی روح دوڑا دی، اور جس طرح اکبر نے طنزیہ نظم کے ذریعہ اصلاح کا فرض ادا کیا، پریم چند نے مسکراہٹوں اور آنسوؤں سے بھری ہوئی نثر کے ذریعے اس فرض کی

ادائیگی کی۔ اوّل اوّل اُن کی کہانیاں بلاواسطہ بچپن کے تاثرات اور دیہاتی زندگی کی آئینہ دار تھیں، اِس کے بعد جب وہ سرکاری ملازمت سے علیحدہ ہوئے تو جس زندگی سے اُنھیں واسطہ پڑا اور جو تجربے ہوئے اُن کو بھی پریم چند نے کہانی کا خوبصورت لباس پہنا کر ایسا سنوارا کہ دنیا دیکھتی رہ گئی۔ گویا اُن کا ادب اسی طرح ترقی کرتا گیا۔ جس طرح اُن کا مشاہدہ اور اُن کی نگاہ۔

سنہ ۱۹۱۰ء تک اُنھوں نے جو کچھ لکھا ظاہر ہے کہ وہی اُن کی شہرت کی اصلی بنیاد ہے۔ لیکن وہ مشہور ہونے کے باوجود اپنے اسٹائل کی طرف سے مطمئن نہیں تھے، اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اُنھوں نے اپنی اس بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا ہے کہ کونسا طرزِ تحریر اختیار کروں، کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں کبھی آزاد دہلوی کے پیچھے چلتا ہوں، آجکل کاؤنٹ ٹالسٹائی کے قصّے پڑھ چکا ہوں تب سے طبیعت کچھ اسی رنگ کی طرف مائل ہے۔ یہ اپنی کمزوری ہے اور کیا ہے"

شہرت اور کامیابی اپنے عیبوں پر نظر ڈالنے سے روکتی ہے لیکن دوسروں سے زیادہ اپنے ادب پر پریم چند کی خود اپنی نظر رہتی تھی وہ خود سونا تھے اور خود ہی کسوٹی، اپنا کھوٹا کھرا خود پرکھتے تھے، مگر سنہ ۱۹۱۲ء تک اُن کے اسلوب (اسٹائل) کی جو کچھ حالت ہو لیکن اُن کے خیالات میں بتدریج پختگی اور ثبات پیدا ہو رہا تھا، خیالات اسٹائل کی تخلیق اور اسٹائل خیالات کی ترتیب میں لازمی طور پر معاون ہوتا ہے، بہرحال خود پریم چند کے الفاظ میں "ان کی طرزِ تحریر پر کچھ کچھ اثر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور کشن پرشاد کا ہے" مگر میں اس خیال کو ایک حد ہی تک تسلیم کرتا ہوں، پریم چند کی ایک جُدا راہ ہے اور اِس راہ کے برگ و گیاہ اور خار و گل نے ان کا چمن الگ ہی کھلا دیا ہے۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں اُن کا سب سے پہلا ناول "ہم خرما و ہم ثواب" شائع ہُوا۔ جو خامیوں سے خالی نہیں لیکن سنہ ۱۹۱۲ء میں "جلوۂ ایثار" شائع ہُوا، اِس ناول میں پرانے زمانے کی افسانہ نگاری کا کچھ کچھ رنگ پایا جاتا ہے، آغاز میں قدیم زمانے کی فنّی اور اصول منظر نگاری کا رنگ جھلک رہا ہے تاہم یہ ناول جدّت اور قدامت کا بہترین امتزاج ہے ایک عجیب اثر انگیز سیرت نگاری پائی جاتی ہے۔ البتہ زبان میں یکسانیت نہیں ہے مگر مثالیت (Idealism) اور حقیقت پرستی (Realism) دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے ہوئے ہیں۔

چند سال کے بعد سنہ ۱۹۱۸ء "بازارِ حسن" یا "سیوا سدن" کی اشاعت وہ ترقی اور بلندی پیش کرتی ہے جو اتنے طویل زمانے کی غور و فکر اور مشق کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیے "بازارِ حسن" ایک نہایت دلچسپ ناول ہے جس میں بازاری عورتوں کے متعلق اصلاحی خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ کردار نگاری اور دوسری خصوصیتوں کو دیکھتے ہوئے یہ ناول پریم چند کا غیر فانی شاہکار ہے۔ اس ناول میں پریم چند کے ادبی خیالات نے دیہات اور زندگی کے دوسرے گوشوں سے نظر ہٹا کر سماج کے دل کو اپنی جولانگاہ بنایا ہے وہ خیال جو چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے اندر زندگی کے مختصر گوشوں میں چکر لگایا کرتا تھا سماج کے رِستے ہوئے ناسوروں کی طرف متوجہ ہُوا۔ پریم چند کے خیالات کا یہ وہ ارتقا ہے جسے ہم آفاقیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

افسانے کے بارے میں یہ ایک مستقل سوال ہے کہ آخر اس کا منتہیٰ کیا ہے!؟ ایک طبقہ کہتا ہے کہ افسانے کا ماحصل اصلاح ہرگز نہیں دوسرا کہتا ہے کہ جب افسانہ انسانی دنیا سے تعلق رکھتا ہے تو اُسے زندگی پر موثّر بھی ہونا چاہیے۔ دونوں میں سے کوئی سچّا ہو لیکن اِس حقیقت سے شاید کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بڑے سے بڑا تمثیل نگار (Idealist) بالآخر حقیقت نگار (Realist) ہو جاتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ادب کو بے مقصد نہیں بلکہ زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے۔ خصوصاً موجودہ زمانے میں جب زندگی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور خیالات میں ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔

پریم چند کی اکثر کہانیوں میں مثالیت (Idealism) موجود ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ وہ حقیقت نگار تھے اور اُن کے ادب کا مقصد انسانی زندگی اور اُس کی حقیقتوں کو عریاں کرنا تھا۔ وہ اپنے ہر افسانے میں حیاتِ انسان کے گوناگوں اور متضاد مناظر پیش کرتے ہیں۔ اُنھوں نے سماج کی اصلی تصویر کھینچ کر سماج کے سامنے رکھ دی تاکہ سوسائٹی کو اپنی بھلائی بُرائی کا احساس ہو جائے اور اُن کے پیغام کی روشنی میں وہ اپنی منزل پر پہنچ سکے سنہ ۱۹۲۳ء میں الہ آباد سے "نرملا" شائع ہُوا۔ خیالات کی ارتقائی

ج کو دیکھتے ہوئے یہ توقع بیجا نہیں کہ ہم اُس کو گزشتہ ناولوں سے
ماہوا دیکھیں، لیکن اُس میں وہ آگ نہیں پائی جاتی جو پریم چند کی ایمٹی
، میں مِل سکتی ہے، اس کے مقابلے میں سنہ ۱۹۰۶ء میں ہندی زبان میں
، کا سب سے پہلا ناول "پرتگیا" شائع ہُوا، جس کا اُردو ترجمہ "بیوہ" کے
سے چھپا ہے، وہ اپنی خصوصیّات میں بہت بلند چیز ہے۔

اس ناول میں پریم چند اک حقیقت نگار کی حیثیت سے خوب نمایاں
ئے ہیں، معمولی ہندوستانی گھرانے کی ہو بہو کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے
ریم چند کے قلم کی سحر نگاری کا یہ عالم ہے کہ معمولی سے معمولی جُزئیات
ں دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ بیوہ کی ترغیبات کو نہایت کامیابی کے ساتھ
ماظ کا زیور پہنایا گیا ہے، اور زبان خالص ہندوستانی ہے۔

"میدانِ عمل" بھی جو سنہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہُوا ان کا شاہکار ناول
ر، یہ ناول نہیں بلکہ ہندوستان کے سیاسی تمدّن کی تصویر اور ملک کی
سیاسی تاریخ ہے، اس میں پریم چند کا تخیّل اپنی تمام خصوصیّات کے ساتھ مقامی
اور ہنگامی رُوپ میں ظاہر ہوا ہے، سیرت نگاری چوگانِ ہستی کے مقابلے میں
معمولی درجہ کی ہے، غالباً اُن کی ذکی الحس فطرت ملک میں بکھرے ہوئے
مسائل سے اتنی متاثر ہو جاتی تھی کہ وہ اُن کے اظہارِ خیال میں فن کی پرواہ
نہیں کرتے تھے،

سنہ ۱۹۲۸ء میں پریم چند کا چوتھا ناول "رنگ بھومی" یا "چوگانِ ہستی"
لکھنؤ سے شائع ہوا، کوئی شک نہیں کہ "رنگ بھومی" میں پریم چند کا ادبی
ارتقاء پایۂ تکمیل کو پہونچا ہُوا نظر آتا ہے، یہ ناول اس درجہ مقبول اور مستند
ہُوا کہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے مصنّف کو گراں قدر انعام دیا۔

پریم چند کی ادیبانہ عظمت کے ثبوت میں اُن کا ایک یہی ناول
کافی ہے، اس کے مطالعہ کے بعد دنیا کے بڑے سے بڑے افسانہ نگار
کے مقابلے میں پریم چند کو بٹھایا جا سکتا ہے، لفظ لفظ اثر میں ڈوبا ہُوا، حرف
حرف میں نفسیّاتی باریکیاں، اور ہر سطر میں قوّتِ بیان کا ایسا مظاہرہ
کہ عقل حیران، زبان سادہ اور سلیس، لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوراق پر
موتی بکھیرے ہوئے رہے ہیں۔

پریم چند کا تخیّل زندگی کی کسی فلسفیانہ تعبیر کرنے اور کسی خاص
انقلابی جدّت میں اُلجھنے کا عادی نہ تھا، وہ سماج میں پرانے طرزِ فکر کی

سیدھی سادھی اصلاح کے طالب تھے، جو کچھ دنیا میں آجکل ہے اُس کو
وہ کافی سمجھتے تھے اور انسانی زندگی میں عدل قائم ہونے کے آرزومند تھے
دنیا کے بڑے مصنّفین کی طرح فرقہ پرستی اور تنگ دلی سے بلند تھے، ہر مذہب
میں اُن کو نیکی اور حقیقت کی جھلک نظر آتی تھی۔ روحانی طور پر وہ سچے
ہندوستانی اور حقیقی دیش بھگت تھے۔ وہ ایک ذکی الحس انسان تھے
اور ساتھ ہی ساتھ قدرت نے اُن کو اظہار و بیان پر بھی مکمل قابو دیا تھا
اُن کی تحریر میں درد، سوز، دلکشی اور ظرافت سبھی کچھ موجود ہے،

پریم چند نے آخر دم تک اُردو اور ہندی ادب کی زبردست خدمت
کی، ہندو مسلمان اپنے اس ادبی ہیرو کو کبھی دلوں سے نہیں بھلا سکتے،
جس نے بیش از بیش قومی ادب پیدا کیا،

اپنی جیون کہانی ختم کرنے سے پہلے، مرنے سے قبل اُن کے افکار
میں بلندی اور انداز تحریر میں استادانہ تراش اور بانکپن پیدا ہو چلا تھا
اب پڑھنے والوں کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی نئی چیز آنے والی ہے،

آخر میں ان کے فکر کا رُخ کُلّیتاً حقیقت نگاری کی طرف ہو گیا
تھا۔ لیکن اُن کے خیالات کی ارتقائی شان بتا رہی تھی کہ اگر وہ دس
سال اور زندہ رہتے تو وہ براہِ راست سماج کے دُکھوں کو مٹانے کے
بجائے اسباب پر غور کرتے اور کیا عجب ہے کہ مرض سے پہلے وہ مرض کے
سبب کو ختم کرنے کے لئے کوئی نسخہ تجویز کرتے۔ یعنی سماج اور اُس سے
تعلق رکھنے والے معاملات کی وہ کوئی نئی فلسفیانہ تعبیر کرتے، جس سے
اِن مسائل کا کوئی نیا حل نکل سکتا۔ لیکن اُن کی موت نے تمام آرزوؤں
کا خاتمہ کر دیا۔

بہرحال ہندوستان کو یہ فخر ہے کہ اُن کی خاکِ پاک سے بھی
ایک ایسا افسانہ نگار پیدا ہوا کہ وہ جس پر اس طرح فخر کر سکتا ہے جس طرح
دوسرے ممالک اپنے زندۂ جاوید افسانہ نگاروں پر۔

ساغر نظامی

(باجازت ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو دہلی)

اقبال کا نظریۂ خودی

اقبال کی شاعری کا ایک مہتم بالشان موضوع، جس کی ابھی تک کوئی مکمل اور اطمینان بخش تشریح نہیں ہو سکی، "خودی" ہے۔ یہ موضوع اس قدر مشکل ہے کہ اس کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکا۔ بالفاظ غالب ع

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

خودی اور اس کا مفہوم

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر آفاقی یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی دنیا کی اشیاء کے خواص و صفات جاننے میں کی ہے جس سے سائنس کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ وسیع ایک دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے جس کو قرآن نے "انفس" کہا ہے، یہی اندر کی دنیا جو اس کی تمام ترقیوں کا سرچشمہ ہے، خودی کی دنیا ہے جس کا تعلق قدرتی جذبات اور روحانیات سے ہے۔

انسان کے جسم میں سینکڑوں اعضاء جوارح و اعصاب ہیں، مگر وہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے بلکہ انسان میں کوئی اور قوت ہے جو ان تمام اعضا کی جداگانہ قوتوں سے بالاتر ہے اور جس کی ماتحتی میں یہ سب بالاتفاق کام کرتے ہیں۔ اسی قوت کا نام مذہب کی زبان میں "نفس" اور اقبال کی زبان میں "خودی" ہے

صوفیائے کرام نے اسی حقیقت کا دوسری صورت سے اظہار کیا ہے، ان کے نزدیک انسان میں دو قسم کے نفس ہیں۔ ادنیٰ نفس اور اعلیٰ نفس، ادنیٰ نفس کو تصوف کی زبان میں "انانیتِ شخصی" اور اعلیٰ نفس کو "انانیتِ حقیقی" کہتے ہیں۔ انانیتِ شخصی عبارت ہے ہمارے مادی جسم اور حواس خمسہ سے اور "انانیتِ حقیقی" تغیر و تبدل سے بے نیاز ایک حقیقت کا نام ہے جو انسان کے جسم میں ہے اور جو لامتناہی ممکنات کی امین ہے

یہ صفاتِ ایزدی کا پرتو ہے جو انسان کے صفات و اخلاق سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور جس سے انسان کے تمام اعمالِ حسنہ کا تعلق ہے۔

سرمدؔ نے ذیل کی رباعی میں اسی انانیتِ حقیقی کی طرف اشارہ کیا ہے؛

اے بے خبر ز ہستیٔ خود ہمچو کتاب — در جلد تو آیاتِ الٰہی بحجاب
یعنی ز تو حق پدید و تو از اثرش — آگاہ نۂ چو شیشۂ از بوئے گلاب

اسی چیز کو اقبال نے خودی کہا ہے، بلکہ دراصل اقبال کا تمام اجتہادِ خودی سرمدؔ کی اسی رباعی کی تفسیر ہے۔

غرضکہ ہستی کا احساس اور اپنے نفس کی حقیقت سے آگاہی کا نام "خودی" ہے، عربی مقولہ ہے "مَا هَلَكَ امْرُءٌ عَرَفَ قَدْرَهٗ" یعنی جس شخص نے اپنی قدر و منزلت کو (کما حقہٗ) جان لیا وہ کبھی ہلاک برباد نہ ہوگا" انسان میں حقائق و معارف اور عروج و صعود کے بہت سے کمالات مضمر ہیں اور وہ اپنی حقیقت سے جس قدر زیادہ واقف ہوگا اور اُسے اپنی مخفی قوتوں کا جس قدر زیادہ احساس ہوگا اُسی قدر وہ اُن پوشیدہ کمالات کو بروئے کار لا سکے گا اور اپنی زندگی کو زیادہ پختہ و استوار بنا سکیگا۔ یہی اقبال کی تعلیمات کی روح ہے۔ حدیث شریف میں خودی کے اسی وصف کی طرف اشارہ ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ" یعنی "جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا" یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی تعلیمات میں آگہی نفس پر بہت زور دیا ہے۔ اقبال کا انسان کو سب سے زبردست پیغام یہی ہے کہ "تو اپنے آپ کو پہچان"

اب اسی حقیقت کو اقبال کی زبان سے سُنئے:۔ بانگ درا میں کہا ہے ؎

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے — نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

ایشیا جنوری [illegible]

خودی میں ڈوب جا غافل کہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے بیکراں ہو جا
درازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

"بالِ جبریل" میں کہا ہے :-

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے	خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات	خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند	سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

"ضربِ کلیم" میں کہا ہے :-

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے مقام اس کا
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات

"اسرارِ خودی" میں ہے :-

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

"جاوید نامہ" میں کہا ہے :-

اے خدا ہیں خویشتن را ہم نگر
بحر را در قطرۂ شبنم نگر

ہم ز خدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

"زبورِ عجم" میں بھی یہی نغمہ ہے :-

منزل گہہ من از من برون نیست
من بے نصیبم راہے نہ یابم

سر راس مسعود کی وفات پر جو اقبال نے مرثیہ لکھا تھا اور جو رسالۂ اردو دکن بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا[1] تھا اس میں خودی پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے :-

خودی ہو زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات	کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ حیات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہِ پیشِ نسیم	خودی ہو زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

اس ضمن میں بے محل نہ ہوگا اگر ہم اقبالی فلسفہ کے اس اجمالی خاکہ پر بھی نظر ڈال لیں جو انھوں نے ڈاکٹر نکلسن کی فرمائش پر لکھا تھا اس میں علامۂ ممدوح فرماتے ہیں :-

"ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی ہے، حیاتِ کلی کا خارج میں کہیں وجود نہیں، خود خدا بھی ایک فرد ہی ہے، وہ فردِ یکتا ہے، کائنات افراد کے مجموعہ کا نام ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس مجموعے میں نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے، وہ بذاتہٖ کامل نہیں، بہرحال جو کچھ ہے وہ افراد کی جبلی کوششوں کا نتیجہ ہے"

غرضکہ علامۂ اقبال کے الفاظِ بالا سے ظاہر ہے کہ انسان کا مذہبی اور اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے، اور اپنے اندر زیادہ سے زیادہ یکتائی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

حدیث شریف میں ہے "تخلقوا باخلاق اللّٰہ" یعنی اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرو، اس لئے انسان جس قدر اس فردِ یکتا (یعنی خدا) سے مشابہ ہوگا اسی قدر خود بھی یکتا ہو جائے گا۔ ذیل کے شعر میں اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

ترقی کے اصول اور خودی

خودی کے خصوصیات و لوازم بیان کرنے سے پہلے ہمیں دو ایک اور باتوں پر نظر ڈالنا ضروری ہے، زندگی اقبال کے نزدیک عمل اور ارتقا کا نام ہے اور تربیتِ خودی، ترقیٔ حیات کا موثر ترین ذریعہ، ہمیں دیکھنا ہے کہ اقبال نے خودی کے ضمن میں کہاں تک اس امر کو پیشِ نظر رکھا ہے؛

(۱) انسان کی ترقی کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ اس کو یقین ہو کہ اس کے خیر و شر، عروج و زوال کا دار و مدار تمام تر اس کی سعی و کوشش پر ہے۔ اقبال نے کہا ہے :-

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی،
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے،

یہی عمل مظہرِ خودی ہے؛

[1] یہ مرثیہ اقبال کی آخری کتاب ارمغانِ حجاز میں شائع ہو گیا ہے

(۲) انسان کی ترقی کی بنیاد یہ ہے کہ وہ خیال کرے کہ وہ اعلےٰ ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے فائدہ اٹھائے، اقبال نے "بانگِ درا" میں کہا ہے۔

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کے سازِ فطرت میں نوا کوئی

"بالِ جبریل" میں ہے:-

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ نظریہ خالص اسلامی نظریہ ہے۔

(۳) کسی قوم کی ترقی کا اب تک بڑا اصول یہ ہے کہ اس کے ہر فرد کو اپنی عزت کا خیال دلایا جائے، اقبال نے "اسرارِ خودی" میں کہا ہے:-

اے ز آدابِ امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر

"بالِ جبریل" میں ہے:-

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر تو نے اپنی نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی
یا راہبی کر یا بادشاہی

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی

(۴) ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ افراد یا قوم کو اس کی قوتِ اہلیت اور امکانات کا یقین دلایا جائے۔ اس سے جذبۂ عمل کو حرکت ہوتی ہے جس کا نتیجہ ترقی ہے، اقبال کا پیغام ہے:-

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

"بالِ جبریل" میں خودی کی قوت اور ممکنات کی طرف اشارہ کیا ہے:

خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

"ضربِ کلیم" میں ہے:-

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی

لوازم و خصائصِ خودی

(۱) اقبال کا خیال ہے کہ نظامِ عالم کی اصل خودی ہے، خودی اپنے حریف و مدِ مقابل خود پیدا کرتی رہتی ہے اور ان سے ہر وقت برسرِ پیکار رہتی ہے کہ کشمکش و تصادم ہی زندگی ہے اور انسان کی پختگی کا ذریعہ۔

سازد از خود پیکرِ اغیار را   تا فزاید لذتِ پیکار را

حیاتِ عالم قوتِ خودی کی بدولت ہے اس لئے جس قدر یہ قوت پختہ و استوار ہوگی اسی قدر زندگی مستحکم اور مکمل ہوگی اور جس قدر یہ قوت خام ہوگی اسی قدر زندگی بھی خام ہوگی

رائی زورِ خودی سے پربت   پربت ضعفِ خودی سے رائی

(۲) حیاتِ خودی، تخلیق و تولیدِ مقاصد سے ہے۔ تمنا بقائے حیات کا راز ہے، زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس جستجو کا راز آرزو میں پنہاں ہے۔ آرزو ہر فعل کی محرک ہے اور چونکہ زندگی تسلسلِ افعال کا نام ہے اسلئے تخلیقِ تمنا سرِ حیات ہے، "اسرارِ خودی" میں کہا ہے۔

از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا   سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
آرزو ہنگامہ آرائے خودی   موجِ بیتابے ز دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند   دفترِ افعال را شیرازہ بند

یہاں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ایسے موقعوں پر اقبال کے یہاں "آرزو" کا مفہوم بہت بلند ہو جاتا ہے یعنی ترقی و برتری کی تمنا یا زیادہ صحیح لفظوں میں خدا کی تمنا جو تمام حیاتِ انسانی کے ارتقاء کی غایت و انتہا ہے، چنانچہ ذیل کے شعر میں اقبال نے اس امر کو خود ہی صاف بھی کر دیا ہے،

مقصدِ مثلِ سحر تابندۂ   ماسوے را آتشِ سوزندۂ
باطلِ دیرینہ را غارتگرے   فتنہ در جیبے، سراپا محشرے

(۳) خودی عشق سے استحکام و پختگی حاصل کرتی ہے،
بالِ جبریلؔ میں کہا ہے :-

عشق تری انتہا، عشق مری انتہا — تو بھی ابھی ناتمام، میں بھی ابھی ناتمام

اقبالؔ کے یہاں عشق کا مطلب صرف عشقِ حقیقی ہے، ذیل کے شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

عاشقی! محکم شو از تقلیدِ یار — تا کمندِ تو شود یزداں شکار

بالِ جبریل میں اسی عشق کی مثال اس طرح دی ہے :-

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق

یہی عشق ہے جس سے خودی میں پختگی و استواری پیدا ہوتی ہے چنانچہ کہا ہے :-

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است — زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبّت می شود پائندہ تر — زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر
از محبّت اشتعالِ جوہرش — ارتقائے ممکناتِ مضمرش

(۴) جس طرح عشق سے خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے سوال سے اس میں ضعف و کمزوری لازم آتی ہے۔

از سوال آشفتہ اجزائے خودی — بے تجلی طورِ سینائے خودی

جو شے کوشش و عمل کے بغیر حاصل ہو جائے یا جس سے جذبۂ غیرت و خودداری کو صدمہ پہونچے وہ سوال کے قبیل سے ہے۔ اگر کسی شخص کو میراث میں آباو اجداد کی دولت ملتی ہے تو اقبالؔ کے نزدیک وہ بھی گداہی ہے کہ وہ دولت اُس کی قوّتِ بازو کا نتیجہ نہیں، انسان کی فطرت بلند بارِ احساں سے پست ہو جاتی ہے۔ غرضکہ

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

یہی خیال "بالِ جبریلؔ" میں اس طرح ادا کیا ہے :-

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرو فالِ محمودؔ سے درگذر — خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر

(۵) جب خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے تو نظامِ عالم کے ظاہری و مخفی قوار کو مسخّر کر لیتی ہے۔

از محبت چوں خودی محکم شود — قوّتش فرمانِ دہِ عالم شود
پنجۂ او پنجۂ حق می شود — ماہ از انگشتِ او شق می شود
در خصوماتِ جہاں گردد حَکَم — تابعِ فرمانِ او دارا و جَم

تربیتِ خودی کے مراحل

تربیتِ خودی کے تین مراحل ہیں (۱) اطاعت (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الٰہی۔

(۱) اطاعت، اطاعت کا مطلب ہے پابندیٔ فرائض۔ اقبالؔ کا خیال ہے کہ اعلیٰ اور سچّی حرّیت، اطاعت یعنی پابندیٔ فرائض سے پیدا ہوتی ہے؛ نظامِ کائنات میں خدا نے ہر ایک چیز کی پیدائش و ترقی کے لئے اسباب و اصول مقرّر فرما دئے ہیں، انھیں اسباب و اصول کے ماتحت ہر ایک چیز پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے۔ ستارے ایک آئین کے مطابق فضا میں سرگرمِ رفتار ہیں۔ سبزہ اصولِ نمو کے مطابق اُگتا ہے۔ آئینِ وصل کی بنا پر قطرہ سمندر میں مِل کر سمندر اور ذرّہ صحرا میں مِل کر صحرا بن جاتا ہے۔ غرضکہ

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی — تو چرا غافل ازیں ساماں روی
باز اے آزادِ دستورِ قدیم — زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم
شکوہ سنج سختیٔ آئیں مشو — از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو

(۲) ضبطِ نفس۔ اسلام نے نفسِ انسانی کے تین درجے مقرّر کئے ہیں۔ (۱) نفسِ امّارہ (۲) نفسِ لوامہ اور (۳) نفسِ مطمئنہ۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے نفسِ امّارہ کو نفسِ مطمئنہ میں تبدیل کر لے یا بالفاظِ دیگر اپنے خودسر نفس کو اپنے قابو میں لے آئے۔ انسان کی تعمیر میں تخریب کے اسباب بھی پوشیدہ ہیں انسان کے خمیر میں خوف و محبّت کی آمیزش ہے یعنی دنیا، عقبیٰ، جان و مال کا خوف اور مال و دولت وطن، عزیز و اقربا کی محبّت، یہی دو وہ جذبے ہیں جو ضبطِ نفس و استحکامِ خودی کے منافی ہیں، اِن دونوں کا علاج صرف توحیدِ خالص سے ممکن ہے۔ خوف کا اس لئے کہ اس ذاتِ واحد کے سوا اور کسی میں نفع و نقصان پہونچانے کی قدرت نہیں اور محبّت کا اس لئے کہ اس ذاتِ احدیت کے مقابلے میں کوئی ہستی قابلِ محبّت نہیں، توحید کی بنا پر خوف سے جو رستگاری حاصل ہوتی ہے اُس کی بابت اقبالؔ نے کہا ہے۔

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نہ گردد پیشِ باطل گردنش

خوف را در سینۂ او راہ نیست　　خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

اسی طرح توحید کی بنا پر دنیاوی محبت سے جو چھٹکارہ ملتا ہے

اس کی بابت کہا ہے

ہر کہ در اقلیمِ لا آباد شد　　فارغ از بندِ زن و اولاد شد

می کند از ماسوا قطعِ نظر　　می نہد ساطور بر حلقِ پسر

با یکے مثلِ ہجومِ لشکر است　　جاں بچشمِ او ز بادارزاں تر است

غرضکہ ضبطِ نفس وہ مقام ہے جہاں خودی ارتقا کے مراحل طے کرنے کے بعد اپنی اعلیٰ شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

(۳) نیابتِ الٰہی۔ یہ تربیتِ خودی کا آخری اور اعلیٰ ترین مرحلہ ہے، ارتقائے انسان کی اعلیٰ ترین منزل وہ ہے جہاں وہ زمین پر خدا کی نیابت یا خلیفہ کی حیثیت حاصل کرلے۔ نائب خدا (یعنی مردِ مومن) ربعِ عالم ہے، اس کی ہستی ظلِ اسمِ اعظم ہے، وہ رموزِ جزو و کل سے آگاہ ہوتا ہے، اس کی فطرت معمورِ نمو کی متمنی ہوتی ہے، اس کی قوت تائیدِ غیبی ہے، اس کا علم قدرتِ کاملہ سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ گویا علم و عشق کے اختلاف اس کی ہستی میں ہم آہنگ ہوتے ہیں، اس کی زندگی ہمہ تن عمل ہوتی ہے۔ وہ کتابِ زندگی کی ایک نئی تفسیر پیش کرتا ہے، وہ خودی اور انسانیت کی انتہائی منزل ہے۔ اس کی ذات میں دعوتِ الٰہی اور سیاستِ ملکی کی سرحدیں آکر مل جاتی ہیں، غرضکہ۔

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر　　ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر

مدعائے عَلَّمَ الْاَسْمَا ستے　　سرِّ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْریٰ ستے

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

آخر میں اس نکتہ کا صاف کردینا بھی ضروری ہے کہ خودی اپنی عملی اور اکتشافی صورت میں جوہرِ انسانیت کا نام نہیں بلکہ جوہرِ انسانیت کی اس خاص صورت کا نام ہے جو کسی فرد یا ذات کے ساتھ مخصوص ہے بالفاظِ دیگر خودی جوہرِ انسانیت نہیں بلکہ جوہرِ انانیت کا نام ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زہد و تقویٰ، شجاعت و شہامت، ادب، فنونِ لطیفہ، سپہگری اور جنگ آزمائی وغیرہ وغیرہ سب جوہرِ انسانیت ہیں، مگر ہر شخص سب کچھ حاصل کر سکتا ہے، ہر شخص میں کچھ نہ کچھ انفرادی و شخصی خصائص و رجحانات ہوتے ہیں، انہیں کو بجا طور پر بڑھانے کا رستہ اور ترقی کرنے کا نام خودی ہے، ایک مصور ہونے کی حیثیت سے یہ امید کرنا کہ وہ سکندر و نپولین کی طرح میدانِ کارزار میں شمشیر بکف تنہا سب کے جوہر دکھائے گا، عبث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے معتقدات میں تقلید کا شدید ترین دشمن ہے، چونکہ تقلید سے خودی کی بے پناہ جولانگاہ وابستہ حدود و جہات ہوکر رہ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لکھتا ہے، ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی

رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اقبال نے اسی حقیقت کی طرف ضربِ کلیم کی نظم "تیاتر" میں اشارہ کیا ہے:

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ　　دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے　　رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات

دوسرے شعر میں انفرادی حیثیت قائم رکھنے کی تعلیم ہے، مگر پہلا شعر خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہے۔ اگر خودی، جوہرِ انسانیت کا نام ہے، جیسا کہ اکثر ناقدین کہہ دیا کرتے ہیں، تو پھر اس میں "میرے" اور "تیرے" کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے، انسانیت کے جوہر تو سب کے لئے یکساں حکم رکھتے ہیں۔ صدق، واخلاص و صفا، نیکی کی خواہش، کذب سے احتراز، معائب سے اعراض، ایفائے عہد اور تمام دوسرے اعمالِ حسنہ تو خاصۂ انسانیت ہیں اور سب کے لئے یکساں طور پر قابلِ وقعت اور لائقِ خواہش ہیں۔ پھر آخر یہ بات "کاروبارِ لات و منات" کیوں ٹھیرے، یہ اشکال محض اس غلطی کا نتیجہ ہے کہ خودی جوہرِ انسانیت کے مترادف ہے۔

اصل یہ ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں اور قابلیتیں پائی جاتی ہیں اور انھیں کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں، ان کی استعداد اور میلانِ طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جاکر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام خودی ہے، اسی بات کو ہم انگریزی میں ایک لفظ میں اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ خودی ایک Subjective یا ذاتی حقیقت ہے Objective نہیں ؎

حریم تیرا خودی غیر کی معاذ اللہ　　دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

یہی وجہ ہے کہ میرے نزدیک خودی جوہرِ انسانیت نہیں بلکہ جوہرِ انانیت، جوہرِ شخصیت یا جوہرِ انفرادیت کے قریب قریب ہم معنی ہے۔

جمیل احمد بی اے بریلوی

ایشیا

دوسرا باب

افسانے و ڈرامے

جنوری سنہ ۱۹۴۱

گڑیوں کا کھیل (ترجمہ ہنرک ابسن)

جوہن ہنرک ابسن

۱۸۲۸ء - ۱۹۰۶ء

ہنرک ابسن ناروے کا قابلِ فخر شاعر اور تمثیل نگار، ۲۰ مارچ ۱۸۲۸ء کو اسکائن میں پیدا ہوا۔ ۱۸۴۴ء میں اس نے شاعری شروع کی، اس کا مطالعہ ہمیشہ گہرا اور وسیع رہا اور دینیات اور شاعری سے اُسے خاص دلچسپی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں وہ طالب علم کی حیثیت سے کرسچنا گیا۔ اور وہاں اسی سال اس کا ایک منظوم المیہ ڈراما شائع ہوا۔ ۱۸۵۱ء میں وہ برجن چلا گیا اور وہاں برجن تھیئٹر کا مخصوص شاعر مقرر ہوا۔ یہ تھیئٹر نارویں ڈرامے کو فروغ دینے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ابسن اپنے اس عہدہ پر ۱۸۵۷ء تک قائم رہا اور اس عرصہ میں وہ شاعر ہونے کے علاوہ منیجر، مشیر اور مرتب کے فرائض بھی ادا کرتا رہا۔ اس زندگی نے اس کو اپنے فطری ذوق تمثیل نگاری میں پختہ کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں وہ کرسچنا کو لوٹ آیا۔

سرکار سے پنشن شاعری نہ ملنے کی وجہ سے بددل ہو کر ۱۸۶۴ء میں ابسن اٹلی چلا گیا۔ اور پھر ۱۸۶۸ء میں جرمنی کو مستقل وطن بنا لیا۔ اور ۱۸۹۱ء تک ڈریسڈن اور پھر میونخ میں مقیم رہا۔ ۱۸۶۹ء میں اس کا سب سے پہلا نثر کا ڈرامہ شائع ہوا۔ اس کا نام "لیگ آف یوتھ [illegible]" تھا۔ یہ سماج پر ایک زبردست طنز تھا۔

۱۸۷۱ء میں اُس کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ۱۸۷۷ء میں ایک اور طنزیہ شاہکار "پلرس آف سوسائٹی" Pillars of Society شائع ہوا۔ ۱۸۷۹ء میں اسی قسم کا ایک اور ڈراما "اے ڈالس ہاوس" "A Doll's House" شائع ہوا۔

۱۸۹۱ء میں ابسن کرسچنا کو واپس چلا گیا۔ اور ہر دو سال کے بعد ایک ڈراما دنیا کے سامنے پیش کرتا رہا۔ موت سے چار سال قبل اُس کی جسمانی و دماغی صحت نے بالکل جواب دیدیا تھا۔

ابسن طبعاً تنہائی پسند تھا۔ لیکن ایسی فطانت کا حامل کہ کوئی معمولی سی بات، کوئی اتفاقی ملاقات، اس کے تخیل کی گہرائیوں میں اتر جاتی اور ایک بڑے ڈرامے کا سنگِ بنیاد بن جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ابسن کی تمثیلوں میں سانس لینے والے افراد کی نبضوں میں تمثیل نگار کے دل کی آواز صاف سُنی جاتی ہے۔ ابسن کی شاعری کی تمام موسیقی اور رنگینی بھی اُس کی تمثیلوں میں نمایاں ہے۔

ابسن موجودہ ڈرامے کا موجد اور پیش رو ہے۔ اس دور کا کوئی تمثیل نگار اس کے اثر سے باہر نہیں۔

لیکن ابسن کو یہ مرتبہ بڑی جد و جہد کے بعد ملا۔ تمثیل نگار کی خاص دقت یہ ہوتی ہے کہ اُس کے ڈرامے جب تک اسٹیج پر کامیاب نہ ہوں اور عوام میں مقبول نہ ہوں وہ کامیاب فن کار نہیں مانا جا سکتا۔ ابسن نے زندگی کے اُن پہلوؤں پر روشنی ڈالنی شروع کی جنھیں سماج بے نقاب دیکھنے کا روادار نہیں۔ اوّل اوّل اسکو رسم و رواج کا دشمن ہی نہیں بلکہ بے شرم اور سودائی سمجھا اور کہا گیا۔ لیکن ابسن اپنی جگہ قائم رہا اور مزید ثبوت دیتا رہا کہ سماج کے بیوقوف کثرت آرا سے حقیقت کے انکشاف کو حماقت کہنے

کے مجاز نہیں اور ایک آزاد رائے شخص کا فرض ہے کہ وہ خودی کو اتنا بلند کرے کہ اُسے جو چیز صداقت معلوم ہو اُس کو نہ صرف خود صداقت سمجھے بلکہ دوسروں کو دعوت دے کہ اس کا نظریہ قبول کریں۔

انسان کی انفرادی اہمیت اور کردار کی بلندی کی ضرورت ہی اِبسن کی خصوصیت اور اس کا پیغام ہے اسی ارتقا میں اُسے ایک خوشحال اور بلند نظر سوسائٹی کی تعمیر کا راز نظر آتا ہے۔ اِبسن کی دوسری خصوصیت اُس کا یہ نظریہ ہے کہ دنیا کی تمام مصیبتوں میں سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا جرم تکفیر محبت ہے۔

"اے ڈالس ہاؤس" A Doll's House (۱۸۷۹ء) میں پہلی مرتبہ اپنے اس "اہمیت فرد" کے نظریئے کو پیش کیا اس تمثیل میں دراصل دو واقعات منسلک ہیں۔ ایک نورا کے لئے یہ انکشاف کہ وہ برسوں سے ایسے شخص کے ساتھ ازدواجی زندگی گذار رہی ہے جس سے وہ اچھی طرح واقف نہیں۔ دوسرا اہم تر واقعہ ٹوروالڈ ہیلمر کے اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ سوسائٹی کے خلاف جرم محبت کے خلاف گناہ سے بدتر ہے۔

اِبسن کے نزدیک تمثیل نگار کا فرض کسی مسئلہ کا حل نہیں ہے بلکہ خود سوال پیدا کرنا ہے۔ "ڈالس ہاؤس" میں بھی اس نے سماج سے ایک استفسار کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب لوگ تھیٹر سے اُٹھ کر جائیں تو صرف اُس کے کمال سے محظوظ ہو کر ہی نہیں بلکہ اپنے سینوں میں ایک تجسس کی خلش محسوس کرتے ہوئے (گالسوردی ایک دوسری مثال ہے جس نے سوسائٹی کو اس طرح آگاہِ گناہ کیا)۔ دراصل اِبسن کوئی نئی بات نہیں کہتا اور نہ کوئی بات خلافِ معمول رنگ میں پیش کرتا ہے۔ وہ صرف حقیقت کو پیش کرتا ہے اور ایسے زاویے سے کہ وہ حقیقت ہی نظر آتی ہے۔ پہلے اس قدر مجلّی کہ نظر خیرہ ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ نگاہ کو مانوس کر لینے والی اور پائدار۔

"گڑیوں کا کھیل" "ڈالس ہاؤس" کا ترجمہ ہے جو ایک انگریزی ترجمے سے لیا گیا ہے اور شروع سے اخیر تک بالکل لفظی ہے تین ایکٹ ہیں۔ پہلا نذر ہے۔"

سعید

افرادِ تمثیل

ٹوروالڈ ہیلمر
نورا ۔۔۔ ہیلمر کی بیوی
ڈاکٹر رینک
مسز لین

ہیلمر کے تین چھوٹے بچے
نلس کروگسٹاڈ
این ۔۔۔۔ بچوں کی آیا
ہیلن ۔۔۔۔ ایک نوکرانی
ایک مزدور

منظر:-

ہیلمر کا مکان

ہیلمر کے مکان کا ایک کمرہ جس کی آرائش سے خوشحالی و خوش مذاقی عیاں ہے اِس کمرے کا ایک دروازہ ہال میں کھلتا ہے اور دوسرا ہیلمر کے مطالعہ کے کمرے میں۔ دروازوں کے درمیان دیوار کے سہارے ایک پیانو باجہ رکھا ہوا ہے۔ کمرے کی دوسری دیوار میں ایک اور دروازہ ہے اور اس کے آگے ایک کھڑکی، کھڑکی کے قریب ایک آرام کرسی پڑی ہے، ایک میز اور ایک سوفہ، سیدھے ہاتھ کی دیوار میں بھی ایک دروازہ ہے اور اس طرف آتشدان ہے اور ایک جھولے کی کرسی پڑی ہے۔

سردی کا موسم ہے، آتشدان روشن ہے۔

ہال میں گھنٹی بجتی ہے اور نورا داخل ہوتی ہے۔ وہ ہلکی آواز میں کوئی گیت گا رہی ہے اور بظاہر بہت ہی خوش معلوم ہوتی ہے۔ نورا دروازہ کو کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ سامنے ایک مزدور نظر آتا ہے جو نورا کے ہمراہ سامان اٹھا کر لایا ہے (نوکرانی داخل ہوتی ہے) نورا سامان کو میز پر ترتیب دیتے ہوئے نوکرانی سے کہتی ہے۔

نورا ... "دیکھنا ہیلن بچے ابھی ان چیزوں کو نہ دیکھیں، کل بڑا دن ہے۔ ہماری خوشی کا سب سے بڑا دن۔ میں چاہتی ہوں کہ بچے کل سے پہلے ان تحفوں کو نہ دیکھیں ... (مزدور سے مخاطب ہوکر) تمہاری مزدوری کیا ہوئی؟!

مزدور ... نصف شلنگ

نورا ... لو یہ ایک شلنگ، نہیں سب تم رکھو

(مزدور شکریہ ادا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے، نورا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ وہ فرطِ مسرت سے خود بخود ہنس رہی ہے۔ احتیاط کے ساتھ جیب سے مٹھائی نکالتی ہے اور ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لیتی ہے۔ پھر دبے پاؤں اپنے خاوند کے مطالعہ کے کمرہ کے دروازہ تک جاتی ہے اور دروازہ سے کان لگاتی ہے) "ہاں ہاں پیارا ہیلمر اندر ہے۔

ہیلمر (اپنے کمرے میں سے) "کیا میری تیتری واپس آگئی؟

نورا (سامان کی ترتیب میں مصروف) "ہاں آگئی"

ہیلمر "کیا میری گلہری اپنے گھونسلے میں گھوم رہی ہے؟

نورا "ہاں تورووالڈ تمہاری گلہری

ہیلمر "میری گلہری کب واپس آئی؟

نورا "ابھی ابھی، تورووالڈ، ابھی (مٹھائی جیب میں رکھ لیتی ہے اور منہ خوب صاف کرتی ہے) تورووالڈ یہاں آؤ۔ دیکھو میں کیا کیا خرید کر لائی ہوں!

ہیلمر "میرا وقت خراب نہ کرو (کچھ دیر بعد دروازہ کھلتا ہے اور ہیلمر کمرے میں داخل ہوتا ہے) کیا کچھ خرید کر لائی ہو! کیوں؟ شریر، میری ننھی فضول خرچ بیوی، تم پھر اپنے روپیہ کو پھینک آئیں؟

نورا "ہاں تورووالڈ۔ مگر اس سال تو ہم تھوڑی سی فضول خرچی کر سکتے ہیں۔ کیوں؟ تورووالڈ اس سال بڑے دن پر ہمیں زیادہ کفایت شعاری کی ضرورت نہیں، اوہ، شکر ہے خدا کا، یہ پہلا موقعہ ہے کہ ہمیں روپیہ کی زیادہ پروا نہیں۔"

ہیلمر "لیکن نورا، عزیز ہم فضول خرچی تو پھر بھی نہیں کر سکتے۔"

نورا "ذرا سی فضول خرچی تو جائز ہے، کیوں، ہے نا تورووالڈ بہت ذرا سی، بہت ہی ذرا سی، - - - - - - -
-- دیکھو نا، اب تمہاری تنخواہ بہت بڑی ہو جائیگی، اور تم بہت سا روپیہ لایا کرو گے۔"

ہیلمر "یہ تو ٹھیک ہے نورا لیکن یہ بات تو سال نو کے بعد ہو گی۔ اور تنخواہ تو ابھی ایک سہ ماہی بعد ملے گی۔

نورا "تو پھر کیا بات ہے اتنے عرصہ قرض سے کام چل سکتا ہے"

ہیلمر "نورا قرض! قرض نورا (قریب آکر مذاق سے نورا کا کان پکڑتا ہے) پھر وہی بے خیالیاں فرض کرو آج میں نے پچاس پونڈ قرض لے لیا اور کل میں مر گیا تو ....."

نورا (ہیلمر کے منہ کو اپنے نازک ہاتھوں سے بند کرتے ہوئے) "بس بس تورووالڈ، کیسی باتیں کرتے ہو، خدا نہ کرے۔

ہیلمر "پھر بھی فرض کرو ایسا ہو تو کیا نتیجہ ہوگا؟"

نورا "اگر ایسا ہو، خدانخواستہ، تو میں پروا نہ کروں گی کہ مجھ پر قرض ہے بھی یا نہیں"

ہیلمر "تم تو پروا نہ کرو گی، مگر وہ قرضخواہ"

نورا "اور میں قرضخواہ کی بھی پروا نہ کروں گی"

ہیلمر "وہی عورتوں کی فطرت ... لیکن نورا تمہیں میرا اصول یاد ہوگا۔ قرض ہرگز نہ لو، قرض ہرگز نہ لو۔ اس گھر کی زندگی میں کوئی خوشی کوئی راحت نہیں جو مقروض ہو، اب تک ہم اس راستہ پر قائم ہیں اور اگر اور تھوڑے دن اسی طرح مجبور رہے تو صبر ہی بہتر ہے۔

نورا (آتشدان کی طرف بڑھتے ہوئے) جیسی تمہاری مرضی تورووالڈ

ہیلمر (نزدیک جاکر) برا نہ ماننا، میری لال، میری کیک، پہنے

بازو تنے رکھو۔ کیوں کیا ہوا، کیا میری گلہری کو غصہ آگیا (جیب سے بٹوہ نکال کر) نورا بتاؤ اس بٹوے میں کیا ہے!

نورا (جلدی سے متوجہ ہوکر) روپیہ

ہیلمر " ٹھیک (روپیہ نورا کو دے کر) نورا کیا میں واقف نہیں کہ بڑے دن پر اخراجات بڑھ جاتے ہیں؟

نورا (گنتے ہوئے) دس شلنگ، ایک پونڈ، دو پونڈ، شکریہ ٹوروالڈ، یہ تو بہت دن کو کافی ہوگا۔

ہیلمر " ہاں ہونا تو چاہیئے"

نورا " اور ہوگا بھی، لیکن آؤ تمہیں یہ تو دکھا دوں کہ خرید کر کیا لائی ہوں اور کیسی سستی چیزیں ملیں۔ یہ تو آئیور کے لئے نیا سوٹ ہے اور یہ ننھی سی تلوار ہے۔ اور یہ گھوڑا اور باجہ باب کے لئے ہے اور یہ گڑیا اور مسہری ایمی کے لئے ہے۔ یوں تو یہ ساری معمولی چیزیں ہیں، مگر بچے تو فوراً توڑ ہی ڈالتے ہیں۔ اور دیکھو یہ نوکروں کے لئے کپڑا اور رومال ہیں۔ آئن کیلئے اس سال کوئی بہتر چیز ہونی چاہیئے تھی"

ہیلمر " اور اس پارسل میں کیا ہے؟

نورا " دیکھو اس کو نہ کھولنا، تمہیں آج شام سے پہلے نہیں بتایا جائے گا۔

ہیلمر " اچھا اچھا فضول خرچ، لیکن یہ تو بتاؤ تمہیں اپنے لئے کیا تحفہ پسند ہوگا۔

" اپنے لئے؟ میری فکر نہ کرو۔ مجھے اپنے لئے کوئی چیز نہیں چاہیئے"

" نہیں نہیں تمہیں ضرور کوئی فرمائش کرنی ہوگی"

" نہیں ٹوروالڈ مجھے کچھ درکار نہیں، البتہ ...

" ہاں کیا؟ چپ کیوں ہوگئیں؟

(ہیلمر کے کوٹ کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے، نیچی نظر سے) البتہ اگر تم ضد کرتے ہو تو پھر ... "

" تو پھر کیا، بتاؤ نا، کیا؟"

" تو پھر مجھے کچھ روپیہ دیدو، جو کچھ بھی تم دے سکتے ہو اور میں پھر کبھی اپنے لئے کچھ خرید لوں گی"

" لیکن نورا"

" بس اب انکار نہ کرنا، اور میں تمہارے روپیہ کو عمدہ سنہری کاغذ میں لپیٹ کر تحفوں میں شامل کرلوں گی۔ کیوں کیا خیال ہے؟!

" کیوں نورا، لوگ روپیہ برباد کرنیوالوں کو کیا کہتے ہیں؟

" فضول خرچ، مجھے معلوم ہے۔ دیکھو اس ترکیب سے مجھے سوچنے کا وقت مل جائیگا اور میں اپنی ضرورت کی چیز خرید سکوں گی"

ہیلمر " ترکیب تو اچھی ہے۔ اگر اس رقم میں سے تم کچھ پس انداز بھی کرسکو، یا اپنی ضرورت ہی کی چیز خریدو۔ لیکن تم گھر کے انتظام میں خرچ کر دو گی یا فضولیات میں اور مجھ پر پھر تقاضہ ہوگا"

نورا " لیکن ٹوروالڈ"

ہیلمر " دیکھو نورا، تم فضول خرچ ہونے سے انکار نہیں کرسکتیں (شانے پر ہاتھ رکھ کر) ننھی سی نورا کس قدر پیاری ہے۔ مگر کیسی فضول خرچ، کون یقین کرے گا کہ یہ چھوٹی چھوٹی پیاری چڑیاں اس قدر فضول خرچ ہوتی ہیں"

نورا " ٹوروالڈ تمہیں ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے، جو کچھ ہوسکتا ہے میں ضرور پس انداز کرتی ہوں"

ہیلمر (ہنس کر) ہاں جو کچھ ہوسکتا ہے لیکن تم سے کچھ پس انداز ہو ہی نہیں سکتا"

(خاموشی سے، مگر مسرت اور فخر کیساتھ) تمہیں معلوم نہیں ٹوروالڈ کہ ننھی لبک اور گلہریوں کو کتنے اخراجات کی ذمہ داری ہوتی ہے"

ہیلمر " عجیب آدمی ہو تم، نورا بالکل اپنے باپ کی طرح، کسی نہ کسی طرح روپیہ وصول کر ہی لیتی ہو"

" آہ، کاش مجھ میں اپنے باپ کی سی بہت سی صفات ہوتیں"

" مگر میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم جیسی ہو ویسی ہی رہو، میری پیاری چکور، لیکن میرا خیال ہے کہ آج تم کسی قدر پریشان نظر آتی ہو"

" واقعی!"

" ہاں واقعی، میری طرف دیکھنا"

(ہیلمر کی طرف رخ کرکے) " کہو"

(ہنسی سے) کیوں آج شہر میں جاکر تم نے کوئی بے عنوانی تو نہیں

کی؟

"نہیں تمہیں کیوں خیال ہوا؟"

"مٹھائی والے کی دوکان پر تو نہیں گئیں؟"

"نہیں نہیں، نورا اللہ، یقین کرو، میں یقین دلاتی ہوں۔"

"خیر میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

نورا: "میں تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات کیوں کرتی؟"

ہیلمر: "نہیں نورا، مجھے بالکل اطمینان ہے۔ تم خیال نہ کرو اور پھر تم نے وعدہ بھی کر لیا ہے (قریب ہو کر) تم اپنے تحفوں کو شوق سے راز میں رکھو، رات کو تو سب کھل ہی جائیگا۔"

نورا: "کیا تم نے ڈاکٹر رینک کو مدعو کیا ہے؟"

"نہیں، لیکن ضرورت بھی کیا تھی، وہ تو شب کو کھانے پر آئیں گے ہی، اگر ایسا ہی ہے تو کل صبح کہہ بھی دوں گا۔ اور میں نے عمدہ شراب بھی منگائی ہے۔ نورا تمہیں معلوم نہیں آج شام کا میں کیسے شوق اور بے چینی سے منتظر ہوں؟"

"اور میں، اور نورا اللہ بچے کس قدر خوش ہوں گے!"

"کیسی شاندار بات ہے نورا۔ میں کس قدر خوش ہوتا ہوں جب سوچتا ہوں کہ ہر وہ آدمی بڑا خوش نصیب ہے جس کی ملازمت مستقل ہے اور آمدنی معقول۔ کیوں نورا ہے نا خوشی کی بات!"

"بڑی خوشی کی، بہت عمدہ، نہایت شاندار۔"

"ایک پار سال کا بڑا دن تھا کہ تین ہفتہ تک تم نے خود دن رات محنت کر کے تحفے تیار کئے تھے - - - - - - - - - - -

- - - اُف! وہ تین ہفتے مجھے کبھی نہ بھولیں گے، کیسی کوفت کا زمانہ تھا"

نورا: "مجھے تو زیادہ کوفت نہیں ہوئی"

ہیلمر: "لیکن نتیجہ بھی تو کچھ نہ نکلا (مسکراتا ہے)

"اوہو۔ تم ہمیشہ مجھے اس معاملہ میں چھیڑتے ہو۔ میں کیا کرتی اگر بلی میری کمرے میں جا گھسی اور تمام چیزوں کو خراب کر دیا۔"

"ہاں ہاں تمہاری کیا خطا ہوتی۔ تم نے تو ہم سب کی خوشی کا سامان کیا تھا مگر نورا خدا کا شکر ہے کہ وہ زمانہ ختم ہو گیا اور اب ہم خوشحال ہیں۔"

نورا: "ہاں یہ بڑی بات ہے۔"

اس سال نہ تو مجھے گھر میں بند رہنا ہوگا اور نہ تمہیں اپنی آنکھوں اور ہاتھوں کو تھکانے کی ضرورت ہے"

"(تالی بجا کر) نہیں نورا اللہ اس سال کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ سُن کر کیسی مسرت ہوتی ہے۔ اچھا اب میں تمہیں بتاؤں کہ کیا کیا انتظام کریں گے۔ دیکھو بڑے دن کے بعد - - - - - - - - - - -

- - - (ہال میں گھنٹی بجتی ہے) وہ گھنٹی بجی (کمرے کو ٹھیک کرتے ہوئے) دروازہ پر کوئی ہے۔ فضول لوگ پریشان کرتے ہیں۔"

"اگر کوئی مجھے دریافت کرے تو کہنا میں نہیں مل سکتا۔ میں موجود نہیں۔"

(ہیلن داخل ہوتی ہے) "میڈم آپ سے ملنے ایک لیڈی تشریف لائی ہیں، کوئی اجنبی عورت ہیں۔"

نورا: "اندر بلاؤ"

ہیلن (ہیلمر سے) ڈاکٹر صاحب بھی اسی لمحہ تشریف لائے ہیں

ہیلمر: کیا وہ سیدھے میرے کمرے میں چلے گئے؟

ہیلن: جی جناب۔

(ہیلمر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ مسز لین داخل ہوتی ہے وہ سفری لباس میں ہے۔ دروازہ بند کر دیتی ہے)

مسز لین (بیکسی کے انداز میں، ذرا لجائی ہوئی آواز میں) نورا کیسا مزاج ہے؟

نورا (ذرا جھجک کر) آپ کا مزاج کیسا ہے؟

"شاید نورا تم مجھے پہچانتیں نہیں!"

"نہیں، بالکل نہیں۔ مگر ٹھہرئے، میرا خیال ہے (دفعتاً) ارے تم ہو کرائسٹین، کیا واقعی تم ہو؟"

"ہاں میں کرائسٹین ہی ہوں"

نورا: "اف، خیال تو کرو میں اور تمہیں نہ پہچانوں! (آہستہ سے) مگر تم کس قدر بدل گئی ہو!

کرائسٹین: "ہاں، تم پہچانتیں بھی کیسے، میں بے حد بدل گئی ہوں۔ نو سال، دس سال، طویل دس سال۔"

"ہاں تم سے ملے اسی قدر عرصہ ہوا گزشتہ آٹھ سال میرے لئے

بڑی مسرت کا زمانہ رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ لیکن اس موسم میں تمہارا سفر کرنا بڑی بہادری کا کام ہے۔"

"میں آج ہی صبح جہاز سے آئی ہوں۔"

"بڑے دن کی تفریحات کیلئے ۔۔ بہت اچھا خیال ہے، ہم دونوں ملکر خوب خوشیاں منائیں گے۔ مگر اطمینان سے بیٹھو سردی معلوم ہو رہی ہوگی، آؤ انگیٹھی کے قریب آ بیٹھو اس آرام کرسی پر میں ادھر بیٹھ جاؤں گی۔ بس ٹھیک، اب تم پہلی سی کرائسٹین معلوم ہوتی ہو مگر تم کسی قدر زرد ہو گئی ہو اور دبلی۔"

"اور بہت زیادہ عمر رسیدہ بھی۔"

"ذرا عمر رسیدہ، بہت ہی تھوڑی سی، بہت نہیں۔ مگر میں خود ہی باتیں کئے جاتی ہوں، کرائسٹین معاف کرنا۔"

"کیا مطلب نورا؟"

"پیاری کرائسٹین، مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہارے شوہر کا انتقال ہو گیا۔"

"ہاں تین سال گذر گئے۔"

"میں نے اخبار میں دیکھا تھا۔ میں تمہیں لکھنے کا ارادہ کرتی تھی مگر عادت سے مجبور ہوں، روز کل ہی ہوتا رہا۔"

"میں خوب سمجھتی ہوں تم خیال نہ کرو۔"

"نہیں کرائسٹین، میری سخت غلطی تھی، اف تم نے کیسا صدمہ اٹھایا اور پھر اس نے تمہیں کچھ چھوڑا بھی نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

نورا "اور نہ بچے؟"

کرائسٹین "نہیں۔"

"کچھ بھی نہیں، واقعی کچھ بھی نہیں؟"

"سچ کچھ بھی نہیں، رنج و غم بھی نہیں جس سے زندگی کچھ آسان بنتی۔"

"بے یقینی سے، کرائسٹین کیا یہ ممکن ہے؟"

"(غمگین تبسم کیساتھ) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے نورا۔"

"تو اب تم بالکل تنہا ہو؟ کیسا افسوس ہے ۔۔۔ میرے تین بچے ہیں۔ اس وقت وہ نرس کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ لیکن اب تم مجھے سارا حال سناؤ۔"

"نہیں میں تو تمہارا حال سننا چاہتی ہوں۔"

"نہیں تم شروع کرو، مجھے ایسا خود غرض نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن ایک بات تمہیں بتادوں، کرائسٹین ہم پر آج ہی ایک رحمت نازل ہوئی ہے"

"وہ کیا؟"

"میرا خاوند بینک کا منیجر مقرر ہو گیا ہے۔"

"تمہارا خاوند بینک کا منیجر! کیسی خوش نصیبی ہے۔"

"ہاں بڑی خوش نصیبی ہے، بیرسٹری کے پیشہ میں کچھ زیادہ آمدنی کا یقین نہیں ہو سکتا خصوصاً جب واہیات مقدموں کی پیروی سے احتراز کیا جائے۔ اور تورو الڈ ہمیشہ ایسے مقدموں کی پیروی سے بچتا ہے۔ سوچو تو ہم کیسے خوش ہیں۔ تورو الڈ کو نئے سال سے اسکا عہدہ مل جائیگا اور پھر چین ہی چین ہے۔ بڑی تنخواہ اور کمیشن، بس اب سب پریشانی دور ہو جائے گی، بالکل روپیہ ہوگا اور افراط میں، پھر کس چیز کی احتیاج ہوگی؟"

کرائسٹین "ہاں پھر کیا احتیاج ہوتی، تمہاری سب ضرورتیں پوری ہوں گی۔"

نورا "ضرورتیں ہی نہیں کرائسٹین، روپیہ، بہت سارا روپیہ، بہت سا۔"

(مسکراتے ہوئے) "نورا، نورا، کیا تمہیں ابھی تک ہوش نہیں آیا! اسکول کے زمانہ میں تم بڑی فضول خرچ تھیں۔"

"(ہنس کر) ہاں اب بھی تورو الڈ مجھے فضول خرچ کہتا ہے لیکن تمہاری نورا ایسی نا سمجھ نہیں ہے۔ ابھی تک تو ہمیں فضول خرچی کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب تک تو ہم دونوں کو بڑی محنت کرنا پڑی ہے۔"

"دونوں کو! کیا تم نے بھی کچھ محنت کا کام کیا؟"

"ہاں کبھی کبھی ۔۔۔ یہی سینا پرونا، کشیدہ اور اسی قسم کا کام اور (ذرا آہستگی سے) اور چیزیں بھی ۔۔۔ تمہیں تو معلوم ہوگا کہ شادی کے وقت تورو الڈ نے ملازمت چھوڑدی تھی اس جگہ ترقی کا زیادہ موقعہ نہ تھا اور تورو الڈ کو زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی۔ لیکن پہلے سال اس نے اس قدر محنت کی کہ اس کی صحت خراب ہو گئی۔ اس نے دن رات اس قدر

کام کیا کہ آخر وہ اسکی تاب نہ لا سکا اور بہت بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے
کہا کہ اگر وہ جنوب میں تبدیل آب وہوا کیلئے نہ چلا گیا تو جان کا خطرہ ہے۔"
"ہاں تم لوگوں نے پورا ایک سال اٹلی میں گذارا، کیوں؟"
"ہاں۔ وہاں جانا آسان نہ تھا۔ اسی زمانہ میں آئیوار پیدا
ہوا تھا۔ مگر ہمارا جانا ازبس ضروری تھا۔ سفر نہایت دلفریب تھا اور
ٹوروالڈ کی جان بھی بچ گئی لیکن خرچ بہت ہوا۔"
"ضرور ہوا ہوگا، ضرور ہوا ہوگا"
"قریب ڈھائی سو پونڈ۔ بڑی رقم، کیوں ہے نا؟"
کرائسٹین "ہے تو، اور ایسے موقعوں پر روپیہ اندوختہ ہونا
بھی بڑی خوش قسمتی ہے"
"میں تمہیں بتاؤں، روپیہ ہمیں ابا سے ملا تھا۔"
"اچھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی زمانہ میں ان کا انتقال بھی ہوا"
"ہاں اسی زمانہ میں، افسوس یہ ہے کہ میں ان کی تیمارداری کو
بھی نہ پہونچ سکی۔ میں آئیوار کی پیدائش کی منتظر تھی اور ٹوروالڈ کی
بیماری سے پریشان۔ میرا پیارا باپ ۔۔۔ میں نے پھر بھی اس کو نہ
دیکھا۔ ہماری زندگی میں وہ وقت انتہائی پریشانی کا تھا"
"مجھے خیال ہے تمہیں اپنے باپ سے بڑی الفت تھی اور پھر
ایسے وقت میں تم اٹلی کو چلدیں"
"ہاں اس زمانہ میں ہمارے پاس روپیہ تھا اور ڈاکٹروں کے
اصرار پر ہمیں اٹلی جانے کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا"
"اور تمہارا خاوند بالکل تندرست ہوگیا؟"
"بالکل تندرست و توانا"
"لیکن ڈاکٹر؟"
"کون ڈاکٹر؟"
"میرا خیال ہے کہ ابھی جو شخص تمہارے ہاں آیا ہے کوئی ڈاکٹر ہے"
"ہاں، ڈاکٹر رینک۔ لیکن وہ یہاں طبی مشورہ کیلئے نہیں
آتا۔ وہ تو ہمارا دوست ہے، ہمارا بہترین دوست اور دن میں کم
از کم ایک مرتبہ ضرور یہاں آنکلتا ہے ۔۔۔ ہاں تو اس کے بعد ٹوروالڈ
کبھی بیمار نہیں ہوا، اور ہمارے بچے بھی بالکل تندرست ہیں۔ اور

میں بھی۔ کرائسٹین، کرائسٹین (تالی بجاتے ہوئے) زندگی
اور خوشحالی کیسی دولت ہے، لیکن معاف کرنا کرائسٹین، میں اپنا ہی
راگ الاپے جارہی ہوں، ابھی کرائسٹین معاف کرنا ۔۔۔ تو کیا واقعی
تمہیں اپنے خاوند سے محبت نہ تھی۔ پھر تم نے اس سے شادی کیوں کی؟
کرائسٹین "میری ماں زندہ تھی اور بہت بیمار اور مجبور اور
مجھے اپنے بھائیوں کی پرورش بھی کرنا تھی ایسے میں کہاں سوچنے
کا موقعہ تھا کہ محبت کے بغیر شادی کی جائے یا نہیں؟"
نورا "ہاں تم نے ٹھیک ہی کیا، غالباً اس زمانہ میں وہ مالدار تھا؟"
"ہاں اسوقت وہ کافی خوشحال تھا۔ لیکن اس کی تجارت کی بنیاد
مضبوط نہ تھی اس کے مرتے ہی تمام شیرازہ بکھر گیا"
"اور پھر؟"
"پھر مجھے اپنی کشتی خود کھینی پڑی۔ پہلے ایک چھوٹی سی دوکان
کھولی، پھر ایک اسکول چلایا۔ اسی طرح کچھ نہ کچھ سلسلہ جاری رہا۔ گذشتہ
تین سال میں نے بڑی مشقت میں گذارے ہیں۔ لیکن اب وہ دور
ختم ہوگیا۔ میری ماں کو اب میری ضرورت نہیں رہی چونکہ وہ غریب
چل بسی۔ اور نہ میرے بھائیوں کو اب میری مدد درکار ہے وہ اب
ملازم ہوگئے ہیں اور اپنی خبر خود رکھ سکتے ہیں"
"اوہ، تمہیں کیسا اطمینان ہوا ہوگا؟"
"نہیں، بالکل غلط اب مجھے اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس
ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں گھر کی خاموش زندگی کی تاب نہیں لا سکی
مجھے امید ہے کہ یہاں کوئی ایسا کام مل جائیگا جس سے میرے خیالات
کو یکسوئی حاصل ہو، کاش مجھے کوئی ایسا کام مل جائے۔ کسی دفتر میں
کوئی جگہ؟"
"لیکن کرائسٹین، دفتر کا کام آدمی کو کس قدر تھکا دیتا ہے
اور تم تو پہلے ہی تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو، تمہیں تو کسی پر فضا مقام
کی سیر کو جانا چاہیئے"
"(حسرت سے) مگر نورا میرا باپ کہاں ہے جو مجھے روپیہ دیدے؟"
نورا "دیکھو مجھ سے ناراض نہ ہو"
کرائسٹین "یہ تو میں تم سے کہوں کہ نورا مجھ سے ناراض نہ ہونا

میری جیسی حالت ذرا آدمی کو ترش زبان بنا دیتی ہے۔ میں کسی کے لئے کام نہیں کرتی اور پھر برابر کام تلاش کرتی رہتی ہوں۔ زندگی کے لئے کام ملنا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے اس حالت میں آدمی خود غرض ہو جاتا ہے۔ جب تم نے اپنی خوش بختی کا ذکر کیا تو میں نہایت خوش ہوئی لیکن معاف کرنا نورا میری خوشی تمہاری وجہ سے نہ تھی بلکہ خود غرضی پر مبنی"

"کیا مطلب۔ آہ میں سمجھی، شاید تمہارا یہ خیال ہوگا کہ اب ٹوروالڈ تمہیں کہیں کام دلا دے"

"ہاں یہی میں نے سوچا تھا"

"اور ایسا اُسے چاہئے بھی، بس اب مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ضرور اُس سے کہونگی اور خدا نے چاہا تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی ذریعہ تمہاری معاش کا نکالیگا"

"تمہاری نوازش ہے نورا۔ تمہاری ہمدردی اس لئے اور بھی قابل قدر ہے کہ تمہیں خود کبھی زندگی کے آلام سے دوچار ہونا نہیں پڑا"

"کیا کہا، میں نے گویا زندگی میں کوئی مصیبت ہی نہیں دیکھی"

"اور کیا! عزیز لڑکی، تم نے معمولی خانگی تفکرات کے علاوہ کونسی مصیبت اٹھائی ہوگی --- نورا تم تو ابھی بالکل بچہ ہو۔"

"دیکھو کرائسٹین تمہیں اس قدر بڑھ بڑھ کر باتیں نہیں کرنا چاہئیں"

"کیوں نورا؟"

"تم بھی اور لوگوں کی طرح ہو، سب یہی کہتے ہیں کہ مجھ میں سنجیدہ معاملہ فہمی کی لیاقت ہی نہیں"

کرائسٹین "تو تم ناراض کیوں ہوتی ہو، کہنے دو"

نورا "اور یہ کہ میں نے تو اس مصیبت کی دنیا میں راحت ہی راحت دیکھی ہے"

"نہیں نہیں، نورا، تم نے بڑی بڑی مصیبتیں بھی اٹھائی ہیں، ابھی تو سنا ہی چکیں"

"اوہ، وہ کیا مصیبتیں تھیں (آہستگی سے) میں نے تم سے خاص بات تو کہی نہیں

"خاص بات، خاص بات کیا؟"

"کرائسٹین، تم بھی مجھے حقیر ہی سمجھتی ہو، لیکن ایسا نہیں چاہئے تمہیں فخر ہے نا کہ تم نے مدت تک اپنے ماں کی خدمت کی اور نہایت تندہی کیساتھ!"

"نورا میں کسی کو حقیر کیوں سمجھتی، لیکن مجھے بیحد ناز ہے کہ ماں کے اخیر دنوں میں میری کوششوں سے اس کو کوئی تکلیف نہ رہی اور وہ مطمئن اس دنیا سے سدھاری"

"اور تمہیں اپنے بھائیوں کیساتھ سلوک پر بھی فخر ہے؟"

"ہاں ہے، اور بجا طور پر"

"مجھے بھی تمہاری محنتوں کا اعتراف ہے، لیکن سنو مجھے بھی اپنی دو ایک باتوں پر فخر ہے اور مسرت اور بجا طور پر"

"ہونا چاہیئے لیکن تمہارا اشارہ کس طرف ہے!"

"آہستہ بولو کہیں ٹوروالڈ نہ سُن لے۔ میں نہیں چاہتی کہ دنیا میں تمہارے علاوہ کوئی میرا رازدار بنے"

"لیکن آخر کیا بات ہے ایسی؟"

"میرے قریب آؤ میں تمہیں اپنے فخر و مسرت کی بات بتاؤں سنو، ٹوروالڈ کی جان بچانے والا ہاتھ میرا ہاتھ تھا"

"تمہارا ہاتھ، کیوں تم نے کیسے اُس کی جان بچائی؟"

"اٹلی کا سفر، میں نے بتایا تو، اگر ٹوروالڈ اٹلی نہ جاتا تو جان بچنا محال تھا"

کرائسٹین "ہاں لیکن تمہارے باپ نے خرچ دیا"

نورا "ہاں ٹوروالڈ اور دوسرے لوگوں کو یہی معلوم ہے (مسکراتے ہوئے) لیکن حقیقت۔۔"

کرائسٹین (تعجب سے) "لیکن حقیقت کیا؟"

نورا "میرے باپ نے ہمیں ایک پائی نہیں دی۔ روپیہ میں نے بہم پہونچایا میں نے، کرائسٹین"

"تم نے!! اتنی بڑی رقم؟"

"ہاں دو سو پچاس پونڈ۔ اب کہو"

"مگر نورا تم نے یہ رقم کہاں سے حاصل کی؟ کیا کہیں لاٹری میں

انعام مل گیا تھا؟

" (حقارت سے) لاٹری۔ لاٹری کا روپیہ دیدینا کون فخر کی بات تھی؟
"تو پھر کہاں سے یہ رقم ہاتھ آئی؟"
" (اپنے معمہ سے خوش) ہاہا۔ آہا۔ کرائسٹین"
"چونکہ تم نے قرض تو لیا نہ ہوگا"
"کیوں۔ میں قرض کیوں نہ لے سکتی تھی؟"
"ہرگز نہیں، کیونکہ کوئی عورت اپنے خاوند کی مرضی کے بغیر قرض نہیں لے سکتی"
"اوہ، اگر بیوی ذرا ذہین ہو؟ اگر ذرا عقل کو استعمال کر سکتی ہو؟"
"نورا، میں بالکل نہیں سمجھی"
"سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں نے کب کہا کہ روپیہ میں نے قرض لیا۔ اور بھی تو طریقے ہیں۔ شاید اور کسی قدر دان نے دیدیا ہو۔ مجھ جیسی حسین عورت . . . ."
واہیات نہ بکو، سچ سچ بتاؤ"
نورا "کیوں اب تو تمہیں اشتیاق بے چین کئے دیتا ہے!"
کرائسٹین "سنو نورا" کیا تم نے کوتاہ اندیشی سے کام نہیں لیا؟
"کیا؟ کیا اپنے خاوند کی جان بچا لینا کوتاہ اندیشی اور ناسمجھی ہے؟"
"مگر اس کی واقفیت بغیر . . ."
"لیکن کرائسٹین ضرورت کو تو دیکھو۔ اُسے ہرگز معلوم نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اُسے ہرگز نہ بتانا چاہیئے تھا کہ وہ خطرناک حالت میں پڑا ہوا ہے۔ ڈاکٹر تو مجھ سے آکر کہتے تھے کہ اگر وہ جنوبی ملکوں کی سیر کو نہ گیا تو جان بچنا محال ہے۔ کیا تم خیال نہیں کر سکتیں کہ پہلے تو میں نے ایسا ظاہر کیا گویا اپنی صحت کی خاطر اٹلی جا رہی ہوں اور ٹوروالڈ کو محبت کا واسطہ دیا مگر وہ راضی نہ ہوا۔ میں نے رائے دی کہ وہ قرضہ لے مگر اس رائے سے وہ ناراض ہوگیا کہنے لگا تم بہت ناسمجھ ہو اور میں تمہاری فضول ضدوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نے اس کو بچا لینے کا عہد کر لیا تھا اور بس میں نے وہ ترکیب استعمال کی"
"اور کیا تمہارے خاوند کو آج تک پتہ نہیں کہ وہ روپیہ تمہارے باپ نے نہیں دیا تھا"
"نہیں، میں باپ کو رازدار بنا لیتی مگر وہ اسی عرصہ میں مر گئے اور اس کی ضرورت نہ پڑی"
"اور اس کے بعد تم نے اپنا راز اپنے شوہر کو نہ بتایا"
"کبھی نہیں، پناہ بخدا، ایسا ہو ہی کیسے سکتا تھا۔ اس کے اصول کا آدمی ایسی بات کو کیسے برداشت کرتا، اور پھر اس کی مردانہ خودداری کو بھی تو ٹھیس لگتی کہ اس کی جان ایک عورت کے ہاتھ سے بچی۔ اس راز کے افشا سے ہماری زندگی تلخ ہو جاتی اور ہمارا گھر جنت سے جہنم ہو جاتا۔
کرائسٹین "تو کیا تمہارا ارادہ ہے کہ ہمیشہ اس راز کو راز ہی رکھو؟"
نورا (سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ) ہاں شاید بہت دن بعد میں اسکو بتا سکوں۔ بہت دن بعد جب میں آج کی طرح خوبصورت نہ رہوں گی، ہنسو مت کرائسٹین یہ میری زندگی میں بہت اہم بات ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت آئیگا کہ ٹوروالڈ کی محبت میں سرد مہری آجائے گی۔ جب میرے اس کی رنگینی، میری آرائش، میرا ناچ اور گانا اسکی دلچسپی نہ رہیں گے۔ اس زمانہ کے لئے یہ ایک قیمتی راز ہوگا، اوہ مگر میں کیا خرافات بکنے لگی۔ ایسا وقت کبھی نہ آئیگا۔ لیکن کرائسٹین، میرے اس راز کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا تم اب بھی یہ سمجھتی ہو کہ میں کوئی کام کی بات نہیں کر سکتی! میں تمہیں بتاؤں اس معاملہ نے مجھے کافی پریشان رکھا ہے۔ مجھے اپنے معمولی اخراجات کو بہت کم کرنا پڑا ہے۔ اور میں کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے حساب وقت پر صاف نہیں کر سکی ہوں۔ دیکھو روپیہ کے لین دین میں ایک چیز سہ ماہی سود ہوتی ہے اور ایک قسط وار ادائیگی۔ اور ان چیزوں سے دوچار ہو کر انسان بڑا ہی پریشان ہوتا ہے۔ مجھ سے جہاں بھی کچھ پس انداز کیا گیا میں نے کیا ہے۔ میں گھر کے خرچ میں سے تو زیادہ بچا نہیں سکی، کیونکہ بہر حال ٹوروالڈ کو کھانا تو عمدہ ملنا چاہیئے اور میں نے بچوں کو خراب سلے ہوئے کپڑے بھی کبھی نہیں پہنائے جو کچھ ان کے لئے ملا، میں نے ہمیشہ انھیں پر خرچ کیا اور کیوں

نہ کرتی میرے اپنے ہی تو پیارے بچے ہیں؟
تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی ہی ضروریات کو کم کر کے
جو ہو سکا پس انداز کیا ہے۔"

"بیشک۔ اور ذمہ داری بھی تو میری ہی تھی جب بھی تور والڈ
نے مجھے نئی پوشاک کے لئے کوئی رقم دی میں نے نصف سے زیادہ
خرچ نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ سستے سے سستا کپڑا خریدا۔
خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر معمولی کپڑے بھی بھلے معلوم ہوتے
ہیں۔ لہذا تور والڈ کو کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں ہوا۔ لیکن مجھے
تکلیف ضرور ہوئی، کرائسٹین، کیونکہ عمدہ بڑھیا کپڑا پہننا بہت ہی
اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

کرائسٹین "بیشک یہی بات ہے"

نورا "اور میں نے اور بھی طریقے اختیار کئے۔ گزشتہ
سردی کے موسم میں مجھے نقل کرنے کو بہت مصالحہ مل گیا تھا۔ شب کو
میں مقفل ہو بیٹھتی اور بہت دیر تک نقل کرتی رہتی۔ میں اکثر بے حد
تھک جاتی۔ لیکن اس محنت میں مجھے بڑی مسرت ملتی اور اس خیال
سے بڑا فخر حاصل ہوتا کہ میں روپیہ کما رہی ہوں، بالکل مردانہ وار"

"اس طرح تم نے کتنی ادائیگی کر دی"

"حساب رکھنا تو مشکل ہے، میں ٹھیک نہیں بتا سکتی۔ میں
تو بس یہ جانتی ہوں کہ جو پیسہ بچا سکی وہ بچایا اور ادا کیا۔ اکثر میں
اکتا بھی جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں ایسی جگہ آ بیٹھتی اور یہ
سوچا کرتی کہ کوئی بوڑھا رئیس مجھ پر عاشق ہے۔"

"کیا! کون؟ وہ کون ہے"

"چپکی رہو۔ ۔ ۔ اور یہ کہ وہ مر گیا اور جب وہ مرا اور اس کا
وصیت نامہ کھولا گیا تو اس میں جلی حروف سے لکھی ہوئی یہ عبارت
ملی "میرا تمام ترکہ نقدی کی صورت میں خوبصورت مسز نورا ہیلمر
کو دیدیا جائے"

"لیکن پیاری نورا وہ کون بوڑھا رئیس ہے؟"

"توبہ توبہ، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتیں! بوڑھا کہاں سے آیا
جب ادائیگی کی صورت نہ نظر آتی تو میں بیٹھی بیٹھی اس بات کو سوچا کرتی
تھی اور بس۔ لیکن اب میری بلا سے وہ بوڑھا رئیس جب تک چاہے
زندہ رہے۔ اب میں اس کی اور اس کے وصیت نامہ کی ذرا پروا
نہیں کرتی۔ کرائسٹین۔ کیسا خوش آئند خیال ہے کہ میں ایک بڑے
فکر سے آزاد ہو گئی۔ آزاد۔ پریشانیوں سے آزاد۔ اپنے بچوں کے
ساتھ کھیلنے کیلئے آزاد۔ اب اپنے گھر کا انتظام بالکل بے فکری
کے ساتھ کروں گی۔ اور تور والڈ کو ہر چیز پسندیدہ نظر آئے گی
اور جلد ہی موسم بہار بھی آئیگا اور آسمان نیلا نیلا نظر آیا کرے گا۔
اور شاید ہم تھوڑے دن کو سفر کے لئے بھی جائیں۔ شاید میں پھر
سمندر دیکھوں۔ آہ" زندگی اور پھر زندگی میں خوشی کیسی نعمت ہے"

(ہال میں گھنٹی بجتی ہے)

کرائسٹین "گھنٹی بجی۔ اب مجھے چلا جانا چاہیئے"

نورا "نہیں نہیں یہاں کوئی نہیں آئیگا۔ کوئی تور والڈ
کے پاس آیا ہوگا" (نوکرانی داخل ہوتی ہے)

ہیلن "معاف کیجئے' میڈم ایک آدمی آقا سے ملنا چاہتا
ہے اور ان کے پاس ڈاکٹر صاحب موجود ہیں"

نورا "کون آدمی ہے؟"

کروگسٹاڈ "(دروازہ میں) میں ہوں مسز ہیلمر' (مسز لین
ایک دم چونکتی ہے اور کھانسنے لگتی ہے اور اپنا رخ کھڑکی کی طرف کر لیتی ہے)

نورا "(آگے آتی ہے اور ذرا پریشانی سے بولتی ہے) تم ہو تم
تم کیوں آئے تمھیں میرے خاوند سے کیا کام ہے"

"بینک کے متعلق کچھ۔ ہاں بینک کے متعلق، میں بینک میں
ایک معمولی عہدہ پر ہوں اور میں نے سنا ہے کہ آپ کا شوہر اب بینک کا منیجر
بنا دیا گیا ہے"

نورا "تو اسی کے متعلق"

کروگسٹاڈ "ہاں قطعی طور پر صرف اسی کے متعلق"

نورا "تو مہربانی فرما کر مطالعہ کے کمرے میں چلے جائے (اس
کے جانے کے بعد ہال کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ پھر آگ کو روشن کرتی ہے)

کرائسٹین "یہ کون آدمی تھا"

نورا "کروگسٹاڈ" نام' ایک وکیل"

"اچھا تو یہ وہی تھا" کیا تم اسے جانتی ہو؟"
"ہاں ایک زمانے میں میں اسے جانتی تھی، وہ ہمارے ہاں ایک وکیل کا کلرک تھا"
"ہاں تھا"
"دراصل وہ بہت بدل گیا ہے"
"اس کی شادی بہت بری ہوئی، بڑا خراب انجام ہوا"
"اس کی بیوی تو مر چکی ہے نا؟"
"ہاں، اور بیچارے کے کئی چھوٹے بچے ہیں"
"سنا ہے وہ مختلف قسم کے کاروبار میں حصہ لیتا ہے"
"لیتا ہوگا، کاروبار کی باتیں نہ کرو، دماغ پریشان ہوگا"
(ڈاکٹر رینک ہیلمر کے کمرے میں سے نکلتا ہے اور اسی سے گفتگو کر رہا ہے)
"نہیں نہیں عزیز، میں تمھارے کاروبار کی گفتگو میں مخل نہیں ہوں گا۔ میں اتنے عرصے تمھاری بیوی کے پاس بیٹھوں گا (دروازہ بند کر دیتا ہے اور پھر کرائسٹین مسز لین کو دیکھتا ہے)
اوہ، افسوس ہے کہ میں یہاں بھی مخل ہوا (جانا چاہتا ہے)
نورا "نہیں نہیں، کوئی مضائقہ نہیں (تعارف کراتی ہے) ڈاکٹر رینک یہ مسز لین ہیں"
ڈاکٹر "میں نے مسز لین کا ذکر اکثر سنا ہے، میرا خیال ہے کہ ابھی ابھی زینہ پر آپ میرے ہمراہ تھیں"
کرائسٹین "جی ہاں، میں زینہ پر آہستہ آہستہ چڑھتی ہوں کچھ کمزور ہوں"
ڈاکٹر "میں سمجھا، کوئی اندرونی کمزوری"
کرائسٹین "نہیں، حقیقت یہ ہے کہ میں نے کچھ عرصہ برداشت سے زیادہ محنت کی ہے"
"بس تو میرا خیال ہے کہ آپ ہمارے قصبہ میں تفریح کی غرض سے آئی ہیں"
"نہیں میں کام تلاش کرنے آئی ہوں"
"کیا یہ تکان دور کرنے کی بہترین ترکیب ہے؟"
"ڈاکٹر یہ زندگی سب کو عزیز ہے"
"ہاں عام رائے تو یہی ہے کہ زندہ رہنا بہرحال ضروری ہے"

نورا "دیکھو ڈاکٹر تمھارا بھی تو یہی خیال ہے، تم بھی تو زندہ رہنا ہی چاہتے ہو"
ڈاکٹر "ہاں کیسی ہی مصیبت میں ہوں میں بھی اس کو طول دینا ہی پسند کروں گا۔ میرے سب مریض اسی خیال کے ہیں اور جن لوگوں کو اخلاقی بیماریاں لاحق ہیں وہ بھی اسی خیال کے ہیں ایسا ہی ایک خطرناک بیمار ہیلمر کے پاس اسوقت موجود ہے"
مسز لین "آہ"
نورا "کیا مطلب ڈاکٹر!"
ڈاکٹر "میرا مطلب ایک وکیل کروگسٹاڈ نامی سے ہے وہ ایک سخت اخلاقی جرم کا مجرم ہے۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ زندگی اس کے لئے بھی ضروری ہے۔ وہ ہیلمر سے بھی کہہ رہا ہے"
"کیا سچ! لیکن توروالڈ سے وہ کس معاملہ میں گفتگو کر رہا ہے؟"
"مجھے معلوم نہیں لیکن بینک کے متعلق کچھ ہے"
"مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کروگسٹاڈ کا بینک سے کچھ تعلق ہے"
"ہاں، وہ وہاں ملازم ہے، میں کہہ نہیں سکتا کہ آپ کے ہاں بھی ایسے لوگ ہیں یا نہیں جو ایسے مجرموں کو تلاش کرتے ہیں اور جب کوئی مل جاتا ہے تو اس کو بہت آرام کی جگہ رکھتے ہیں اور اچھے تندرست آدمی بیکار ہی پھرتے ہیں"
کرائسٹین "لیکن ڈاکٹر بیماروں کو ہی تو تیمارداری کی ضرورت ہوتی ہے، تندرست تو خود ہی اپنی خبر رکھ سکتا ہے"
ڈاکٹر "ہاں یہی تو خیال ہے جس نے ہماری سوسائٹی کو ہسپتال بنا رکھا ہے"
(نورا جو ذرا خاموش تھی، آہستہ ہنستی ہے اور تالی بجاتی ہے)
ڈاکٹر "تم اس بات پر ہنستی کیوں ہو، کیا تمھیں ذرا بھی خیال ہے کہ ہماری سوسائٹی کی آج کیا حالت ہے؟"
نورا "اونھ، ڈاکٹر میں سوسائٹی کی پروا کیا کرتی ہوں، میں تو کسی اور بات پر ہنس رہی ہوں، ایک نہایت دلچسپ بات پر، یہ بتاؤ ڈاکٹر کیا بینک میں اب جتنے لوگ ہیں سب تورواالڈ کے ماتحت ہیں؟"
"بس یہی بات ہے جسے تم بہت دلچسپ اور سامانِ تفریح سمجھتی ہو"
"یہ میرا ذاتی نکتۂ نگاہ ہے، آہ کیسا شاندار خیال ہے، کیسی فخر کی

بات ہو کہ لورڈ والڈ کو اس قدر طاقت اور اقتدار حاصل ہے (جیب سے پیکٹ نکال کر) ڈاکٹر ایک ٹکڑا مٹھائی۔"

ڈاکٹر "کیا؟ مٹھائی؟ میرا تو خیال تھا کہ مٹھائی کھانے کی اجازت نہیں ہے؟"

نورا "لیکن یہ مٹھائی کرائسٹین نے لا کر دی ہے۔"

کرائسٹین "کیا میں نے؟"

نورا "اوہ، ڈر مت، تمھیں کیا معلوم تھا کہ لورڈ والڈ کی اجازت نہ تھی۔ میں تمھیں بتاؤں کہ لورڈ والڈ کا خیال ہے کہ مٹھائی سے میرے دانت خراب ہو جائیں گے، کیوں ڈاکٹر رینک ہے نا؟ اچھا ڈاکٹر آج تو اجازت دے ہی دو، اور کرائسٹین ایک ٹکڑا تم لو، آہ آج تو ایک بات ایسی ہے جس کے کرنے کے لئے میری طبیعت بہت بیتاب ہے۔"

ڈاکٹر "وہ کیا"

نورا "میں کہوں تو، اگر لورڈ والڈ سننا گوارا کرے۔"

ڈاکٹر "تو تم کہتی کیوں نہیں۔"

نورا "میری ہمت نہیں ہوتی وہ اس قدر غیر معمولی بات ہے۔"

ڈاکٹر "تب تو میری رائے ہے کہ تم نہ کہو، لیکن ہم سے کہہ تو سکتی ہو، ایسی کیا بات ہے جسے تم کہنا چاہتی ہو، اور لورڈ والڈ کے سامنے کہنے کی ہمت نہیں رکھتیں۔"

"میں کہنا چاہتی ہوں بے حد، میرا دل چاہتا ہے کہ ضرور ضرور کہوں"

"آخر کیا بات ہے ایسی؟"

مسز لین "اب کہو، لو لورڈ والڈ آ گئے۔"

نورا "چپ چپ (مٹھائی کو جلدی سے چھپا لیتی ہے۔ لورڈ والڈ داخل ہوتا ہے۔ اس کا کوٹ اس کے شانے پر پڑا ہے، اور ہیٹ ہاتھ میں ہے)

نورا "لورڈ والڈ، تم نے اپنا پیچھا چھڑا لیا؟"

ہیلمر "ہاں وہ ابھی ابھی گیا ہے۔"

نورا "میں تمھارا تعارف اپنی دوست سے کراؤں، یہ کرائسٹین ہے جو ابھی ہمارے قصبہ میں آئی ہے۔"

ہیلمر "کرائسٹین، لیکن معاف کرنا میں۔۔۔"

نورا "مسز لین یہی ہیں، کرائسٹین لین۔"

ہیلمر "میں سمجھا، میری بیوی کی اسکول کی دوست۔"

کرائسٹین "جی ہاں، اس زمانے سے ہم ایک دوسرے واقف ہیں۔"

نورا "اور ذرا سوچو تو انھوں نے اتنا طویل سفر تم سے ملنے کے لئے اختیار کیا۔"

ہیلمر "کیا؟ میں سمجھا نہیں۔"

کرائسٹین "نہیں یہ امر واقعہ نہیں ہے۔"

نورا "کرائسٹین حساب بنانے (Book Keeping) میں بہت ہوشیار ہیں اور یہ کسی ہوشیار آدمی کی ماتحتی میں کام کرنا چاہتی ہیں، تاکہ ان کی شوق کمتل ہو جائے۔"

ہیلمر "یہ تو بہت ہوشیاری کی بات ہے، مسز لین۔"

نورا "اور جب انھوں نے سنا کہ تم بینک کے منیجر ہو گئے ہو جس قدر جلد ممکن ہوا یہاں آ پہونچیں۔ لورڈ والڈ مجھے امید ہے کہ تم کرائسٹین کے لائق کوئی جگہ نکالو گے۔"

ہیلمر "ہاں ایسا ناممکن تو نہیں ہے۔ مسز لین آپ کے شوہر کا انتقال ہو چکا نا؟"

کرائسٹین "جی"

ہیلمر "اور آپ کو حسابات بنانے کا کچھ تجربہ بھی ہے؟"

کرائسٹین "ہاں، اچھا خاصہ۔"

ہیلمر "تو بہت ممکن ہے کہ آپ کے لئے کوئی جگہ"۔۔

نورا (تالی بجا کر) دیکھا میں نے کیا کہا تھا؟"

ہیلمر "مسز لین آپ بہت اچھے وقت پر آئیں"

کرائسٹین "میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

ہیلمر "شکریہ کی ضرورت نہیں لیکن کچھ معاف کیجئے (جاتا ہے)

ڈاکٹر "ٹھیرو، میں بھی چلتا ہوں" (اپنا لبادہ روشندان پر گرم کرتا ہے)

نورا "لورڈ والڈ، زیادہ دیر باہر نہ رہنا۔"

ہیلمر "قریب ایک گھنٹہ، بس"

نورا "کرائسٹین کیا تم بھی جا رہی ہو؟"

کرائسٹین "ہاں میں قیام کے لئے کوئی کمرہ ڈھونڈوں گی۔"

ہیلمر" آیئے تو ساتھ ہی چلتے ہیں۔"

نورا" بڑا افسوس ہے کرائسٹین، کہ ہمارے مکان میں بالکل گنجائش نہیں، سچ بالکل ممکن نہیں کہ ۔۔۔"

کرائسٹین" اوہ، اس کی پروا نہ کرو، اچھا رخصت اور بہت بہت شکریہ۔"

نورا" شام کو تو ضرور آؤ گی نا، اور تم بھی ڈاکٹر رینک کیوں ہاں ہاں ضرور، خیریت کیوں نہ رہے گی، اپنا لبادہ اچھی طرح لپیٹ لو (سب لوگ دروازہ تک جاتے ہیں باہر سے بچوں کی آوازیں آتی ہیں)

نورا" وہ آگئے (بچے اور نرس داخل ہوتے ہیں) آؤ! آؤ! (جھک کر بچوں کو بوسہ دیتی ہے) کیوں کرائسٹین، ہیں پیارے بچے یا نہیں؟"

رینک" یہاں کھڑے نہ ہو، ہوا سخت ہے۔"

ہیلمر" آیئے مسز لینن اب موقع نہیں کہ ہم یہاں ٹھیریں (یہ سب باہر چلے جاتے ہیں، ہال کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے)

نورا" کیسے ترو تازہ معلوم ہوتے ہو، کیوں؟ کیسے لال لال رخسار ہیں، جیسے سیب یا گلاب (بچے سب باتیں کر رہے ہیں) خوب تفریح کر کے آئے ہو، اچھا اچھا۔ کیا کہا تم نے ایمی اور باب دونوں کو بٹھا کر گاڑی چلائی، دونوں کو ساتھ بٹھا کر خوب، بہت خوب۔ آیور تم بہت تیز لڑکے ہو، ایّن ایمی کو ذرا مجھے دو، میری پیاری بچی، میری گڑیا (ایمی کو نرس سے لے لیتی ہے اور اچھالتی ہے) ہاں ضرور باب کو بھی اچھالوں گی، تم برف میں کھیلے؟ اچھا، میں بھی وہاں ہوتی، لاؤ میں تمھارے کپڑے بدلوں، ایّن تم اندر جاؤ تمھیں سردی لگ رہی ہوگی، جاؤ تمھارے لئے گرم کافی رکھی ہے۔" (نرس بائیں جانب کے کمرے میں چلی جاتی ہے سب بچے بیک وقت نورا سے باتیں کر رہے ہیں)

نورا" کیا واقعی ایک بڑا کتا تمھارے پیچھے دوڑا، لیکن اس نے تمھیں کاٹا نہیں؟ نہیں اچھے بچوں کو کتے نہیں کاٹتے۔ دیکھو آیور ان پارسلوں کو نہ دیکھو، ان میں کیا کیا چیزیں ہیں! ہوں ہوں تم ضرور معلوم کرنا چاہتے ہو، کھیل۔ آؤ ہم سب کھیلیں، کیا کھیل کھیلیں، آؤ آنکھ مچولی کھیلیں، باب پہلے چھپے گا۔ میں چھپوں؟ اچھا پہلے میں ہی چھپتی ہوں، (کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ نورا چپکے سے ایک میز کے نیچے چھپ جاتی ہے، بچے اس کو تلاش کرتے ہیں مگر پا نہیں سکتے، آخر اس کے ہنسنے کی آواز آتی ہے بچے میز پوش اٹھاتے ہیں اور نورا نکل آتی ہے، سب زور زور سے ہنستے ہیں۔ اس عرصہ میں ہال کے دروازہ پر کھٹکا ہوتا ہے کوئی نہیں سنتا، دوبارہ کھٹکا ہوتا ہے اور کروگسٹاڈ داخل ہوتا ہے)

کروگسٹاڈ" معاف کیجئے گا مسز ہیلمر۔۔"

(نورا کی حیرت کی کوئی انتہا ہے نہ پریشانی کی، اپنا کھیل ختم کر دیتی ہے اور سہمی ہوئی آواز میں بولتی ہے)

نورا" مسٹر کروگسٹاڈ، میرا شوہر باہر گیا ہوا ہے"

کروگسٹاڈ" مجھے یہ بات معلوم ہے"

نورا" پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟"

کروگسٹاڈ" آپ سے کچھ باتیں کرنا"

نورا" مجھ سے" (بچوں سے نرمی کے ساتھ) جاؤ تم نرس کے پاس چلے جاؤ، جب یہ چلے جائیں گے تو ہم پھر کھیلیں گے (کروگسٹاڈ سے) "ہاں تمھیں مجھ سے باتیں کرنا ہیں؟"

کروگسٹاڈ" ہاں مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"کیا آج ہی، آج مہینے کی پہلی تاریخ تو ہے نہیں؟"

"نہیں، آج بڑے دن کی شام ہے اور آپ کے اختیار میں اس امر کا فیصلہ ہے کہ کل آپ کا تہوار کیسا رہے گا؟"

"تم کیا چاہتے ہو، میرے لئے آج تو بالکل ناممکن ہے کہ ۔۔۔"

"ہم اس معاملہ پر گفتگو نہ کریں گے، میں تو بالکل ہی مختلف موضوع پر باتیں کرنا چاہتا ہوں، کیا تھوڑا سا وقت آپ مجھے دیں گی؟"

نورا" ہاں ضرور، اگرچہ ۔۔۔"

کروگسٹاڈ" بہت خوب، سنئے، میں نے آپ کے شوہر کو جاتے دیکھ لیا تھا"

"کیا کہا؟"

"ہاں ایک عورت کے ساتھ"

"پھر کیا؟"

"کیا میں استفسار کی جرأت کر سکتا ہوں، آیا وہ عورت مسز لینن ہے؟"

"ہاں، وہ آج ہی آئی ہے"

"ہاں کچھ ہی"

"غالباً میرا یہ خیال بھی ٹھیک ہو کہ وہ آپ کی بڑی دوست ہو کیا یہ حقیقت ہو؟"

"ہاں، ایسا ہی ہے، لیکن میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس بات سے تمھارا..."

"ایک زمانہ تھا کہ میں اس عورت سے واقف تھا"

"مجھے معلوم ہے"

"اچھا آپ کو معلوم ہے؟ تو پھر آپ کو سارا واقعہ بھی معلوم ہوگا میرا بھی یہی خیال تھا اب تو میں اپنا مدعا صاف طور سے بیان کرسکتا ہوں، کیا مسز لین کو بینک میں کوئی ملازمت دی جارہی ہو؟"

"مسٹر کروگسٹاڈ، تم میرے شوہر کے ماتحت ملازم ہو تمھیں ایسے سوالات کا کیا حق حاصل ہے، لیکن خیر تم پوچھتے ہو تو بتائے دیتی ہوں ہاں مسز لین کو ایک جگہ مل رہی ہے اور یہ بھی کہ ایسا میری سفارش سے ہوا ہے"

کروگسٹاڈ "تب تو میں اپنے قیاس میں بالکل ہی صحیح نکلا"

نورا (کمرے میں ٹہلتے ہوئے) کبھی کبھی تو ہر شخص کا اثر کچھ نہ کچھ کام کر جاتا ہے، اور عورت ہونے کا مطلب یہ نہیں) اور مسٹر کروگسٹاڈ، جب آدمی کسی جگہ ماتحت کی حیثیت سے ہو تو اُس کو احتیاط رکھنا چاہئے کہ کہیں ایسے شخص کی دل آزاری نہ ہو جو کہ..... جو کہ" جو کہ کچھ اثر رکھتا ہو"

"بالکل یہی بات ہو، (اپنے لہجہ کو بدل کر) مسز ہیلمر، اگر آپ اپنا اثر میری موافقت میں کام میں لائیں گی تو مہربانی ہوگی"

"کیا؟ کیا مطلب تمھارا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ ذرا خیال رکھئے گا کہ میری ملازمت برقرار رہے"

"تمھارا مدعا کیا ہو؟ تمھاری جگہ چھینتا کون ہے؟"

"اس حیلہ سازی کو رہنے دیجیے، آپ کی دوست میرے دوش بدوش کام کرنا پسند ہی نہیں کرسکتی، اور مجھے معلوم ہوگیا کہ میری ملازمت کس کی عنایت سے میرے ہاتھ سے جارہی ہے"

"لیکن میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ....."

"ہاں ہاں، بہت ممکن ہے لیکن اب وقت کا تقاضا یہی ہو کہ آپ اپنا اثر میرے حق میں کام میں لائیں"

"لیکن مسٹر کروگسٹاڈ! میں تو بالکل اثر نہیں رکھتی"

"کیا واقعی؟ ابھی تو آپ نے کچھ ایسا ہی تذکرہ کیا تھا"

"لیکن میرا مقصد وہ نہ تھا جو تم سمجھے، کہاں میں اور کہاں اس قسم کا اثر تمھیں کیسے خیال ہوا۔ بینک کے معاملات میں تو میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتی"

کروگسٹاڈ "بس رہنے دیجئے، میں آپ کے شوہر سے بچپن سے واقف ہو وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جن پر بیوی کا کوئی اثر نہ ہو"

نورا "میرے شوہر کو بُرا کہا تو میں تمھیں گھر سے نکال دوں گی"

کروگسٹاڈ "آپ کی جرأت بہت بڑھی ہوئی ہے"

نورا "اب میں تم سے نہیں ڈرتی ہوں، نیا سال آنے دو تمام جھگڑا صاف کردونگی"

کروگسٹاڈ (غصہ ضبط کرتے ہوئے) "غور سے سُنو، مسز ہیلمر! اگر ضرورت ہوئی تو میں اپنی ملازمت کے لئے ایسی جدّوجہد سے بھی باز نہ آؤں گا جیسی اپنی زندگی بچانے کے لئے کرتا"

"ہاں ظاہر ہے"

"اس وقت سوال روپیہ کا نہیں ہے، درحقیقت یہ تو بالکل ہی غیر اہم بات ہے، بات ایک اور ہے اور آپ کو بتانے میں کیا ہرج ہے، میری حالت یہ ہے کہ اب سے بہت دن پہلے میں ایک بددیانتی کا مرتکب ہوا تھا"

"ہاں کوئی ایسی بات سُنی تو میں نے بھی تھی"

"وہ معاملہ عدالت کے سپرد تو نہیں ہوا، لیکن اُس کی تشہیر نے میرے لئے سارے دروازے بند کردیئے، بس میں نے یہ بینک کی ملازمت اختیار کی۔ کچھ نہ کچھ مجھے کرنا ضرور تھا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے ایسا گناہ نہ کیا تھا جس کی تلافی ناممکن ہو، لیکن اب مجھے اس بدنامی سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے، میرے لڑکے اب بڑے ہوگئے ہیں اور اُن کی خاطر مجھے اپنی کھوئی ہوئی آبرو دوبارہ حاصل کرنا چاہئے تاکہ وہ دنیا کے سامنے شرمسار نہ ہوں، بینک کی یہ ملازمت اس چڑھائی کی پہلی منزل تھی اور اب سامنے کیا آیا؟ بس یہی کہ تمھارا شوہر میری رہی سہی عزت کو بھی خاک میں ملا دے..... مجھے میری ملازمت سے برطرف کردے"

نورا "لیکن یقین رکھئے مسٹر کروگسٹاڈ، یہ بالکل میری طاقت سے باہر ہے کہ میں اس معاملہ میں آپ کی مدد کرسکوں"

کروگسٹاڈ "آپ میری مدد کرنا دراصل چاہتی ہی نہیں ہیں، مگر میرے پاس

آپ کو مجبور کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔"

"کیا تم میرے شوہر کو یہ بتا دو گے کہ میں تمھاری مقروض ہوں؟"

"ہاں فرض کرو کہ میں اُسے بتا دوں؟"

"تو تم سے زیادہ ذلیل کون ہوگا (رونے لگتی ہے) خیال تو کرو یہ راز میری خوشی اور میرے فخر کا باعث ہے اور تم اسے یوں ذلیل اور کمینے طریقے سے فاش کر دو گے اور میری حالت کیسی ناخوشگوار ہوگی۔"

"حالت صرف ناخوشگوار؟"

"(تنک کر) اچھا جو تمھارا جی چاہے کرو، میرے شوہر کو تمھارے کمینے پن کا اور یقین ہو جائے گا اور تمھاری ملازمت تو جائیگی ہی۔"

"میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا آپ کی مصیبت صرف دو چار ناخوشگوار جملوں پر ہی ختم ہو جائیگی، ذرا سوچئے کہ اس معاملے کی اہمیت کیا ہے۔"

"بیشک، حالات معلوم ہوتے ہی میرا شوہر تمھاری باقی رقم ادا کر دے گا اور پھر ہمیں تم سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔

(ذرا قریب آکر) "مسز ہیلمر ذرا غور سے سنو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ کی یادداشت بہت ہی کمزور ہے اور یا آپ لین دین کے کاروبار کی نسبت بالکل واقفیت نہیں رکھتیں، اگر اجازت ہو تو میں چند واقعات کی تفصیل دہراؤں۔"

نورا "کیا مطلب؟"

کروگسٹاڈ "جب آپ کا شوہر بیمار تھا تو آپ مجھ سے دو سو پچاس پونڈ قرض لینے آئیں۔"

"میں کسی اور شخص کو جانتی نہ تھی۔"

"میں نے وہ رقم بہم پہونچانے کا وعدہ کرلیا۔"

"ہاں، اور تم نے بہم پہونچا بھی دی۔"

"میں نے اس رقم کی بہم رسانی بعض شرائط پر طے کی تھی، آپ کا دماغ شوہر کی بیماری سے اس درجہ پریشان تھا اور آپ روپیہ حاصل کرنے کے لئے اس قدر بیتاب تھیں کہ شاید آپ نے وہ شرائط سنیں ہی نہیں، اور سنیں تو یاد نہیں رکھیں، اب موقع ہے کہ میں آپ کو وہ سب باتیں یاد دلاؤں، اوّل یہ کہ میں نے یہ رقم مہیا کرتے وقت ایک دستاویز تیار کی تھی۔"

"ہاں، اور میں نے اُس پر دستخط کئے تھے۔"

"ہاں، ٹھیک، لیکن آپ کے دستخط کے نیچے کچھ سطریں اور تھیں جن کی رُو سے آپ کا باپ آپ کی طرف سے ادائیگی کا ضامن تھا، ان سطروں کے نیچے آپکے باپ کے دستخط ضروری تھے۔"

"ضروری تھے، اور انھوں نے دستخط کر بھی دیئے تھے۔"

"میں نے تاریخ کا خانہ خالی رکھا تھا تاکہ آپ کا باپ دستخط کرتے وقت خود ہی تاریخ ڈال دے، کیا آپکو یاد ہے؟"

"ہاں، مجھے یاد ہے"

"اور میں نے وہ دستاویز آپ کو دی تھی کہ بذریعہ ڈاک اپنے باپ کے پاس بھیج دیں اور وہ دستخط کر کے واپس کر دیں۔"

نورا "ہاں"

کروگسٹاڈ "اور آپنے ایسا ہی کیا، کیونکہ پانچ چھ روز بعد آپنے وہ دستاویز مکمل مجھے لا دی تھی اور میں نے رقم مذکورہ آپ کو دے دی تھی"

"ہاں ہاں، تو کیا میں باقاعدہ ادائیگی نہیں کرتی رہی ہوں؟"

"ہاں، پابندی سے، لیکن معاملہ کی گفتگو یہ نہیں، مسز ہیلمر وہ زمانہ آپکے لیے نہایت سختی کا زمانہ تھا۔"

"درحقیقت بڑی سختی کا۔"

"آپ کا باپ سخت بیمار تھا۔"

"ہاں بہت بیمار، قریب المرگ تھا۔"

"جلد ہی مر بھی گیا۔"

"ہاں"

"مسز ہیلمر کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ کا باپ کس روز مرا؟ یعنی مہینے کی کس تاریخ کو؟"

"ستمبر کی انتیس کو"

"بالکل صحیح، میں نے بھی تحقیق کی تو یہی پتہ چلا۔ اب اگر یہ بات ٹھیک ہے تو اُس دستاویز میں ایک غلطی ایسی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتی (کاغذ جیب سے نکال کر پیش کرتا ہے)

"کیا غلطی مجھے معلوم نہیں؟"

"غلطی یہ ہے مسز ہیلمر کہ اس تحریر کی رُو سے آپکے باپ نے مرنے کے تین روز بعد دستخط کئے"

"کیا مطلب، میں بالکل نہیں سمجھی۔"

کروگسٹاڈ "آپ کا باپ ۲۹ ستمبر کو مرا، اور یہ دستخط دوم اکتوبر کو کئے گئے، یہ غلطی ہے یا نہیں؟" (نورا خاموش رہتی ہے) اور یہ بھی عجیب بات ہے، کہ یہ دستخط اور تاریخ آپ کے باپ کے خط میں نہیں ہیں اور اس دوسری تحریر کو میں پہچانتا ہوں، اس کی توضیح بھی کچھ مشکل نہیں، آپکے باپ نے تاریخ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہوگی اور کسی اور نے جلدی میں غلط تاریخ لکھ دی لیکن تاریخ کی کوئی اہمیت نہیں، معاملہ تو در اصل ان دستخطوں کا ہے کیوں مسز ہیلمر! یہ دستخط تو اصلی ہوں گے، آپکے باپ کے ہاتھ کے؟"

نورا "نہیں یہ دستخط میرے باپ کے نہیں ہیں، میں نے خود کئے تھے۔"

"کیا آپ کو علم ہے کہ آپ ایک خطرناک اخلاقی گناہ کا اعتراف کر رہی ہیں؟"

"وہ کس طرح، بتاؤ کس طرح، تمھارا قرض تو جلد ادا ہو ہی جائیگا۔"

"مجھے ایک سوال کی اجازت دیجئے، آپ نے یہ دستاویز اپنے باپ کے پاس کیوں نہیں بھیجی؟"

"کوئی امکان نہ تھا، میرا باپ موت کے منہ میں تھا۔ اگر میں اُس کو بتاتی تو یہ بھی بتاتی کہ اس رقم کا ہوگا کیا اور اس سلسلے میں یہ بھی بتانا پڑتا کہ میرا خاوند خطرناک طور پر بیمار ہے، اور جب میرا باپ خود اتنا بیمار تھا میں یہ خبر اُس کو نہیں سُنا سکتی تھی۔"

"بہتر تو یہی تھا کہ آپ اپنا سفر ترک کر دیتیں۔"

"نہیں یہ کیسے ممکن تھا۔ اس سفر پر میرے شوہر کی زندگی کا مدار تھا۔"

"لیکن آپ نے کبھی یہ نہ سوچا کہ آپ میرے ساتھ جعلسازی کر رہی ہیں۔"

"نہیں میں نے کبھی یہ بات نہیں سوچی، مجھے پروا نہ تھی، مجھے تمھاری ذرا پروا نہ تھی، تم برابر مشکلات میری راہ میں حائل کر رہے تھے، اور میرے شوہر کی جان خطرے میں تھی۔"

کروگسٹاڈ "مسز ہیلمر، آپ کو اپنے جرم کی اہمیت کا بالکل احساس نہیں، لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میرا وہ جرم جس نے میری تمام عزت برباد کر دی، آپکے اس جرم سے زیادہ تھا نہ کم۔"

نورا "کم، کیا میں یہ یقین کروں کہ تم نے اپنی بیوی کی جان بچانے کے لئے ایسی ہی ہمت اور جان جوکھوں کا کام کیا تھا۔"

"قانون ان باتوں کی متعلق پروا نہیں کرتا۔"

"تو قانون نہایت ناکارہ چیز ہے۔"

"ناکارہ ہو یا نہ ہو، لیکن اگر میں یہ کاغذ عدالت میں پیش کر دوں تو آپکی قانون کے مطابق آپ کے لئے فیصلہ ہوگا اور آپ جانتی ہیں کہ کیا فیصلہ ہوگا۔"

"میں نہیں مانتی، کیا ایک لڑکی کو یہ حق نہیں حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مرتے ہوئے باپ کو پریشانی سے بچائے کیا ایک عورت کو یہ حق نہیں ملنا چاہیئے کہ وہ اپنے عزیز شوہر کی جان بچائے، میں قانون سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتی لیکن یہ سمجھتی ہوں کہ قانون کو ان باتوں کی اجازت دینا چاہیئے، کیا تمھیں بھی معلوم نہیں؟ تم بتاؤ تم تو وکیل ہو۔ تم بتاؤ۔ تم تو بہت ہی ردّی وکیل معلوم ہوتے ہو۔"

"ممکن ہو، لیکن کم از کم ایسے معاملات سے تو میں خوب واقف ہوں، اب آپ کو اختیار ہے جو چاہے کیجئے۔ لیکن آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اگر میری ملازمت دوبارہ چھینی گئی تو آپ بھی اپنے اقتدار پر قائم نہ رہ سکیں گی۔"

(تسلیم بجا لاتا ہے اور ہال سے چلا جاتا ہے)

نورا (خیال میں غرق رہتی ہے، پھر ایک دم) ہشت، مجھے دھمکی دیتا ہے میں اتنی بیوقوف نہیں (بچوں کی چیزیں قرینے سے رکھتی ہے، پھر کچھ خیال آتا ہے) لیکن شاید..... نہیں کچھ نہیں، ناممکن ہے، میں نے جو کچھ کیا محض محبت کی خاطر۔

(بچے داخل ہوتے ہیں) "اماں، اماں! اجنبی آدمی صدر دروازے سے ہو کر باہر گیا ہے۔"

نورا "ہاں مجھے معلوم ہے، لیکن میرے عزیزو کسی اور سے نہ کہنا۔ ابا سے بھی نہیں۔"

بچے "نہیں نہیں ہم نہ کہیں گے، لیکن اب ہمارے ساتھ کھیلوگی؟ آؤ"

"نہیں اب نہیں"

"لیکن اماں تم نے تو وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں، لیکن اب نہیں، مجھے کام یاد آگیا، جاؤ اندر جاؤ (بچوں کو اندر گھر میں پہونچا دیتی ہے، پھر کچھ سینے پرونے کا کام اُٹھاتی ہے اس میں دل لگانے کی کوشش کرتی ہے مگر بیکار، سامان ایک طرف رکھ دیتی ہے پھر ہال کے دروازے پر جاتی ہے اور نوکر کو آواز دیتی ہے) ہیلن، ہیلن! تختوں کو یہاں لے آؤ (میز پر جاتی ہے دراز کھولتی ہے مگر فوراً بند کر دیتی ہے) نہیں نہیں، ناممکن، بالکل ناممکن۔"

ہیلن "لیجئے یہ تختے میڈم، کہاں رکھوں؟"

"یہیں فرش پر رکھ دو"

(باقی صفحہ ۹۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

نیا راگ

ایشیا میں

تیسرا باب

تنزّل و زوال

جنوری ۱۹۳۱ء

غزل

جنرل والاشان نوابِ معظم جاہ بہادر شجیع شہزادۂ دولتِ آصفیہ، دکن

اور ہے زمانے میں کون رازداں اپنا
یا نگاہِ نازان کی یا غمِ نہاں اپنا

جستجو محبّت میں بے اثر نہیں رہتی
اُن کو ڈھونڈنے نکلے مِل گیا نشاں اپنا

میرا حال سُن سُن کر مسکرا رہے ہیں وہ
یوں بڑھا رہے ہیں وہ لطفِ داستاں اپنا

کچھ اثر نہیں کرتا جذبۂ نہاں اُن پر
رہ نہ جائے غم بن کر جذبۂ نہاں اپنا

آپ دل میں رہ کر بھی دل سے بےخبر کیوں ہیں
دل ہی راز ہے اپنا دل ہی رازداں اپنا

پھر گئی ہے کچھ کہہ کر وہ نگاہِ جاں پرور
اب سکوں نہ بنجائے اضطرابِ جاں اپنا

یوں بھی جا نہیں سکتا دل سے رنجِ تنہائی
عالمِ تصوّر میں اُن پہ ہے گماں اپنا

رائیگاں نہ ہو جائیں نقش میری سجدوں کے
وہ بدل بھی سکتے ہیں سنگِ آستاں اپنا

ابتدائے خاموشی آپ کی کہانی تھی
انتہائے خاموشی بن گئی بیاں اپنا

اُن کی مہربانی سے مِٹ رہی ہیں اُمیدیں
لُٹ رہا ہے منزل پر آج کارواں اپنا

بزمِ ناز میں اُن کی ہے کچھ اور ہی عالم
اب کسے یقیں ہوگا دل بھی تھا یہاں اپنا

ضبطِ غم ضروری تھا غم شجیع کیوں ہوتا
لے لیا محبّت نے خود ہی امتحاں اپنا

اے نگارِ دلفروز اے رشکِ نورِ خاوری
جاگتا جادو ہے ترے حُسن کی ضَو گستری
چھاگئی سیمائے شب پر تجھ سے کیسی دلبری
حور کا پرتو تجھے سمجھوں کہ تمثالِ پری

مثل تیرا دہر میں عنقا ہے اے دُرِّ یتیم
چھوٹ پڑتی ہے کہ لہریں مارتا ہے بحرِ سیم
تیرے صدقے میں خنک ہے یاسمن پرور نسیم
تو وہ گُل ہے چاندنی بن کر اُڑی جس کی شمیم

چرخ کا میداں ترے بن ہُو کا منظر بن گیا
تو کئی شب کس کی آغوشِ تمنّا میں رہا
ہاں سُنیں ہم بھی ترے مُنہ سے وہ کافر ماجرا
کِس حریمِ شوق میں تھی نازکی محفل بپا

کِس کے شوقِ وصل کی تصویر ہے تیرا جمال
کِس کی لطف اندوزیوں نے کردیا اتنا بحال
پڑ گیا ہے چہرۂ زیبا میں رنگِ انفعال
اس پہ یہ عالم کہ مُنہ تکتے ہیں سب دیوانہ وار

تو چمکتا ہے کہ کوئی لعبتِ سیمیں عذار
فرشِ نیلم پر خراماں ہو بصد ناز و وقار
سادگی سے دستِ قدرت نے کیا تیرا سنگھار
اس پہ یہ عالم کہ مُنہ تکتے ہیں سب دیوانہ وار

دُرِّ یکتا کی صباحت ہو ترے چہرے کا نو
کرمکِ شب تاب تابندہ ہو یا دُنیا سے دو
ساغرِ الماس سے چھلکا ہے یا مُل کا سرو
یاسمن کے کنج میں روحِ طرب کا ہے ظہو

چار سُو تیری جھلک سے تازگی سی آگئی
روئے موجودات پر آسودگی سی چھاگئی
حُسنِ سیمیں کی طراوت نشّہ سا برسا گئی
رمز کا عالم، نظر کو خواب سا دکھلا گئی

تیری صورت دیکھ کر ہر اہلِ دل بیتاب ہے
کروٹیں لیتا ہے کوئی اور کوئی بیخواب ہے
آسماں کے کس صنم خانے کا تو جلباب ہے
دل ربائی کا یہ عنواں دہر میں کمیاب ہے

سحر کا عالم ہے تیری جلوہ فرمائی کی رات
کیا عقیدت ہو کہ سجدے میں ہیں سارے ذی حیات
گیت بن بن کر نکلتی ہو زباں سے دل کی بات
سازِ خاموشی کی گت پر رقص میں ہے کائنات

مخمور اکبر آبادی

ایشیا جنوری ۱۹۴۱ء

ذوقِ نظر

جن کی فطرت میں ودیعت ہی مذاقِ تگ و تاز
ہیں پر و بال بھی اُن کے لئے ننگِ پرواز

کیوں نم آلود نہ ہوں اہلِ نظر کی آنکھیں
چھوڑ کر دامنِ دریا کو کہاں جائے گداز

غم نہیں کچھ بھی ہو انجامِ محبّت یارب!
ہاں محبّت کا مگر یاد نہ آئے آغاز

چشمِ آگاہِ تماشا جنھیں بخشی تو نے
پردۂ رخ بھی ترا ان کے لئے جلوہ طراز

ایک ہستی نظر آتی ہے تماشا فرما
ہم کو ادراکِ حقیقت ہے نہ احساسِ مجاز

عام ہے مبدأ موسیقیٔ فطرت کی عطا
بخشے جاتے ہیں مگر نغمے باندازۂ ساز

جلوۂ حسن پہ موقوف نہیں گرمیٔ دل
اس سے پہلے بھی یہی تھا مری فطرت میں گداز

تیری عزّت کے لئے رند فنا ہو بھی چکے
شیخ ہے اب بھی تری یاد میں مصروفِ نماز

حُسن اس درجہ دلآویز کہاں اے تاباںؔ
یہ بھی ہے ایک مرے ذوقِ نظر کا اعجاز

تاباںؔ دہلوی

ایشیا جنوری ۱۹۴۲ء

سراج

پیرِ میخانہ

سرِ مینائے سے جھکاتے ہوئے — پیرِ میخانہ کو ہوا الہام
مردِ آزاد کے لئے یہ جہاں — ہے فقط ایک عالمِ اوہام
سطوت و جاہ اک فریبِ نظر — زر و دیہیم ایک شئے بے نام
ہے اگر خواہشِ بقا تجھ کو — آسمانوں پہ ڈھونڈ اپنا مقام

لے ہواؤں سے درسِ آزادی
کر ستاروں کے جھرمٹوں سے کلام

دولتِ فقیر

جانے کیا تھا میرے پیشِ نظر — بے طرح حسرتوں کی آنچ تھی تیز
مفلسی اک بلائے بے درماں — بیکسی اک عذابِ رستاخیز
میرے مرشد نے دیکھ کر یہ کہا — ہر طرح چاہئے ہوس سے گریز
دل سرافرازِ دو جہاں ہو جائے — بادۂ فقر سے جو ہو لبریز

فقر وہ شے ہے جسکے قدموں پر
سر جھکاتی ہے سطوتِ پرویز

اہلِ ذوق

میں نے فطرت سے یہ شکایت کی — کیا ہے یہ اے نواطرازِ الست
مہ و انجم کو اوجِ ہفت افلاک — اور میرے لئے نشیمنِ پست
مسکرا کر دیا جواب اُس نے — اے اسیرِ فریبِ عالمِ ہست
تجھ کو حاصل ہو سرفرازیٔ عرش — تو مئے ذوق سے جو ہو سرمست

زمرۂ اہلِ ذوق کے آگے
آسماں کیا ہے، دوری یک جست

سیلِ بے پناہ

روح بیدار تھی مری کل رات — ولولہ خیز تھی چراغ کی لَو
راہ پیما تھا کاروانِ سپہر — آگے آگے تھی مشعلِ مہِ نَو
میں تھا اور میری فطرتِ آزاد — دل تھا اور دل میں ولولے سَو سَو
ناگہاں یہ کہیں سے آئی ندا — زندگی ہے مسلسل اک تگ و دَو

اٹھ زمان و مکاں کو ٹھکراتا
تو ہے اک سیلِ بے پناہ کی رَو

سراج الدین ظفر

تنہا مجھے رہنے دے!

دل میں غمِ الفت کو مستور ہی رہنے دے
مجبورِ محبّت کو مجبور ہی رہنے دے
اُمّید کی دُنیا کو بے نور ہی رہنے دے
معصومِ محبت کو مسحور ہی رہنے دے

جس حال میں بھی میں ہُوں تنہا مجھے رہنے دے

دل پھُول کی صورت ہی مُرجھا کے نہ رہ جائے
آغوشِ تمنّا میں لہرا کے نہ رہ جائے
ڈر ہے نگہِ حیراں شرما کے نہ رہ جائے
ترسا کے نہ رہ جائے تڑپا کے نہ رہ جائے

جس حال میں بھی میں ہُوں تنہا مجھے رہنے دے

ایشیا جنوری ۱۹۴۱ء

محدود ہی رہنے دے، معصوم کی دُنیا کو
ناشاد ہی رہنے دے، مغموم کی دُنیا کو
برباد ہی رہنے دے، مظلوم کی دُنیا کو
پامال ہی رہنے دے، محروم کی دُنیا کو
جس حال میں بھی میں ہُوں، تنہا مجھے رہنے دے

اک پریم پجارن کو سنسار سے کیا مطلب!
مدہوش محبّت کو ہُشیار سے کیا مطلب!
بیگانۂ دنیا کو آزار سے کیا مطلب!
دیوانۂ فطرت کو افکار سے کیا مطلب!
جس حال میں بھی میں ہُوں، تنہا مجھے رہنے دے

ایوانِ محبت میں رہزن کا گزر کیوں ہو؟
تقدیس کی جنّت پر ظلمت کا اثر کیوں ہو؟
اک طائرِ بیکس کو صیّاد کا ڈر کیوں ہو؟
ناداں گلِ صحرا پر گلچیں کی نظر کیوں ہو؟
جس حال میں بھی میں ہُوں، تنہا مجھے رہنے دے

اُمّید کے خرمن کو آہوں سے جلانا کیا!
شمعِ رہِ منزل کو اشکوں سے بجھانا کیا!
خوابیدہ تمنّا کو نالوں سے جگانا کیا!
معیارِ محبّت کو نظروں سے گرانا کیا!

جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے

عزیز جہاں بیگم ادا

دہر آشوب

ابتری، عام و زمیں گیر نظر آتی ہے — عافیت بستۂ زنجیر نظر آتی ہے
خوابِ ابلیس کی تعبیر نظر آتی ہے — زندگی موت کی تفسیر نظر آتی ہے

امن کے جسم پہ ہے جنگ کا خونیں قالب — روحِ اقوام پہ ہیں مرگ و تباہی غالب
خاک اور خون میں لتھڑی ہوئی ارضِ مغرب — نعشِ عریاں، پئے تشہیر نظر آتی ہے

طرب آموز تھا آغازِ جمالِ پیرس — درد انگیز ہے تصویرِ مآلِ پیرس
نازکِ اندام و سیہ چشم غزالِ پیرس — خوں میں ڈوبا ہوا نخچیر نظر آتی ہے

لٹ گئی رونق و تمکینِ شبستانِ نظر — مٹ گئی زینت و آرائشِ ایوانِ نظر
لعبتِ چین کہ تھی حاصلِ ارمانِ نظر — زخمی و خستہ و دلگیر نظر آتی ہے

موجۂ نیل پھر آمادۂ طغیانی ہے — چین پرور پھر ابوالہول کی پیشانی ہے
مصر پھر منتظرِ ہادیٔ عمرانی ہے — روحِ فرعون عناں گیر نظر آتی ہے

دلِ جاپاں کہ نظر روس سے ہے آز آلودہ! — درِ غارت پہ جبینیں ہیں نیاز آلودہ!

ترکی و روم و فلسطین و حجاز آلودہ! آتشِ جنگ جہانگیر نظر آتی ہے
فتنہ در سر، ہیں شر راہِ ہوا، آج مگر! حشر در بر، ہیں قدر اور قضا آج مگر!
قہر بر دوش، ہیں بشر اور خدا، آج مگر! صور پھنک جانے میں تاخیر نظر آتی ہے

انقلاب آیا ہے یوں چاند کی ہر منزل پر چھا گیا ہے شفقی رنگ فلک کے دل پر
اک نئے دور کی آئینۂ مستقبل پر دیکھ! وہ سرخی تحریر نظر آتی ہے

جان باقی ہو سکتی ہوئی تہذیب میں بھی شر و صدق ہی خاکسترِ تکذیب میں بھی
یعنی اس سلسلۂ غارت و تخریب میں بھی اک نئے عہد کی تعمیر نظر آتی ہے

شرحِ صدرِ حرم و دیر ہوا چاہتی ہے! فاشِ تزدیرِ شر و خیر ہوا چاہتی ہے!
عقلِ آزاد و سبک سیر ہوا چاہتی ہے! پائے اوہام میں زنجیر نظر آتی ہے!!

ہے بدلنے ہی کو نظم و نسقِ چرخِ کبود! باغ بن جانے کو بیتاب ہے نارِ نمرود!
خنکیٔ قلبِ براہیم ہے سرگرمِ شہود! آگ میں برف کی تاثیر نظر آتی ہے

پھر نم آگیں ہے شرر، شعلے ہیں شبنم آلود! پھر دلِ آہن و خارا میں ہے نرمی کی نمود!
شاعرِ شرق کو بخشا گیا لحنِ داؤد! سنگ میں موم کی تاثیر نظر آتی ہے

حق ہوا چاہتا ہے پردۂ باطل سے عیاں! کفر کے دل میں ہے تابندہ شرارِ ایماں!

مژدہ اے دہر! ضمیرِ شبِ غم میں غلطاں! "صبحِ نوروز" کی تنویر نظر آتی ہے!!

"صبحِ نوروز"

ظلمتِ یاس سے پھوٹی وہ شعاعِ اُمید
اُٹھ! کہ ہر شب ہے شبِ قدر، ہر اک روز ہے عید
دلِ ہر ذرّہ ہے آذر کدۂ صد خورشید
خاک میں عرش کی تنویر نظر آتی ہے

اب نہ کر اے دلِ مایوس تمنائے ممات
زندہ رہکر بھی غمِ زیست سے ممکن ہے نجات
بات کل کی ہے، سمِ آلود تھی تلخیٔ حیات
آج شہد و شکر و شیر نظر آتی ہے

چھا گئے سبزہ و گل سے در و بام و دیوار
ہائے کلیوں کا یہ روپ اور یہ پھولوں کا نکھار
پھوٹ نکلا ہے وطن میں اثرِ جوشِ بہار
ہر گلی وادیٔ کشمیر نظر آتی ہے!!

رنگِ الفت میں ہیں ڈوبے ہوئے نسرین و سمن!
نل کی تصویر صنوبر ہے تو ہے سرو دمن!
جذبۂ عشق سے سرشار ہے سارا گلشن!
پھول رانجھا تو کلی ہیر نظر آتی ہے!!

سروش عسکری طباطبائی

عورت

بہارِ بزم ہے تو رونقِ ایاغ ہے تو
جہاں کے خانۂ تاریک کا چراغ ہے تو

شرارِ عشق و محبت خمیر ہے تیرا
خود اپنی آگ کے شعلوں سے داغ داغ ہے تو

سمومِ تند کے جھونکے نسیم تیرے لئے
بہار تیرے لئے ہے خزاں وہ باغ ہے تو

نہاں ہے دیدۂ آدم سے جو مقام اب تک
اُسی مقامِ محبت کا اک سُراغ ہے تو

تجھی سے کارگہِ حسن و عشق کا ہے نظام
ہے تیرے دم ہی سے محفل میں دَورِ ساغر و جام

چمن میں لالہ و گُل کی وہ بزم افروزی
نظر رُبا سی وہ برق و شرار کی شوخی

گلوں کا خندۂ دنداں نما بوقتِ سحر
قمر کی خندہ جبینی، شفق کی رنگینی

ملیح شام کے چہرے پہ وہ جلالِ سکوت
سحر کا حُسنِ صباحت، بہار کی مستی

بساطِ سبزہ پہ دوشیزگانِ گلشن سے
وہ دھیمی دھیمی نسیمِ سحر کی اٹکھیلی

کلی کلی پہ وہ جوشِ بہار کا عالم
روش روش پہ وہ موجِ صبا کی بے چینی

وہ ندّیوں کا خم و پیچ برسرِ کہسار
وہ آبشار کے باجوں کی مست موسیقی

وہ کیفِ بادہ میں ڈوبے ہوئے شباب کا رنگ
رُخِ نگار پہ شرم و حجاب کی سُرخی

ستم کشانِ محبت کے دل کا سوز و گداز
سمن کی روح لطافت، حریر کی نرمی

یہ کائنات کے بکھرے ہوئے حسیں اجزا
ملے بہم تو ترا پیکرِ لطیف بنا

تو اے کہ راز ہے اپنی نگاہ میں اب تک — تری نظر میں نہیں آہ کیوں مقام اپنا

ترے مذاقِ تماشا طلب کی کاوش نے — نقابِ روئے منوّر اُلٹ دیا تو کیا

تری نظر پہ جو ڈالا ہے ابنِ آدم نے — وہ پردہ تیری نزاکت سے اُٹھ سکے تو اُٹھا

تجھے خبر نہیں اے غیرتِ بہار و چمن — کہ کس حسین چمن زار کا ہے تو پودا

جو آج کل سرِ ہر رہگزار جلتا ہے — حریمِ خانۂ ویراں میں وہ چراغ جلا

رواج و رسم کے قلعوں کو منہدم کر کے — حصارِ حرّیتِ دل کو استوار بنا

یہ شوقِ انجمن آرائی تابکے آخر — دلوں کے خطۂ ویراں کو لالہ زار بنا

یہ "گھر" یہ عشق و محبّت کا مامنِ رنگیں — ترے ہی حُسنِ شمائل سے ہے بہار افزا

اُٹھا کے رسمِ من و تو کو اپنے گلشن سے — نگاہِ عشق کو یک رنگیِ جمال دکھا

خیال و وہم کی تاریک وادیوں سے گزر — قیودِ مذہب و ملّت کے بتکدوں کو گرا

خزاں کی نذر ہی صدیوں سے جس چمن کی بہار — پھر اس چمن کو بنا رشکِ جنّت الماوا

پھر اپنے تازہ نہالوں کو دے کے فرّ و فروغ — وطن کی خفتہ نصیبی کو ایک بار جگا

نفاق و کفر کا دل اب بھی توڑ سکتی ہے — ترے رَبابِ محبّت کی دل گداز صدا

دلِ حجر میں اُتر جائے جو شرر بن کر — اثر وہ رکھتی ہے اب بھی تری نظر کی ادا

جہاں میں تیرے حریفوں کی تنگ نظری سے — ترے مذاق کی رعنائیاں ہیں گو رُسوا

تری تجلّیٔ فطرت کا راز ہے پھر بھی — فنونِ علم کی ہر یادگار سے پیدا

پہونچ سکے نہ جہاں قدسیوں کی فکرِ بلند
تو پھینک سکتی ہے اب بھی وہاں نظر کی کمند

رزمی میرٹھی

ایشیا جنوری ۱۹۴۲ء

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

کسوٹی

چند نئی کتابیں، اخبار و رسالوں پر رائے

منظور اور اُن کی شاعری (مسلسل)

"دیر و حرم" ایک جگہ نجمہ صاحبہ تحریر فرماتی ہیں:-

"منظور صاحب کے ہاں دوسرے رومانی شعرا کی طرح نامانوس ماحول اور غیر ملکی رنگ آپ کو نہیں ملیگا۔ منظور صاحب ہندوستان میں رہ کر دجلہ و فرات جیحون و سیحوں، شیریں و فرہاد، وامق و عذرا کے خواب نہیں دیکھتے وہ جیحون و سیحون اور دجلہ و فرات کی جگہ گنگا و جمنا، جہلم اور پنجاب کی وادیوں میں گلگشت کرتے ہیں"

کوئی شک نہیں کہ منظور صاحب کے کلام میں زیادہ سے زیادہ آفاقیت پائی جاتی ہے اور اس آفاقیت میں ایک قسم کا اخلاص بھی موجود ہے یعنی مقامی رنگ دکھاوے کا نہیں، روح کا پرتو ہے۔ لیکن آگے چل کر محترمہ نجمہ صاحبہ نے جو فیصلہ دیا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے۔

"علاوہ ازیں آپ کو اُن کی نظموں میں کہیں فارسی کی لمبی لمبی ترکیب اور ادق الفاظ جو کانوں پر گراں گزریں، ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں گے بلکہ نہایت پیارے پیارے اور دلکش الفاظ ملیں گے جن میں ہندی کی چاشنی ہے، اس طرح منظور صاحب نے الگ راہ قائم کرلی ہے۔ انھوں نے اپنے سارے کلام کو اسی خاص رنگ میں رنگا ہے اور نہایت کامیاب رہے ہیں۔ امید ہے کہ آنیوالے شعرا منظور صاحب کے نقش قدم پر چلنا اپنے لئے فخر سمجھیں گے۔"

ان مباحث پر جی کھول کر لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن یہ آپ سمجھ سے ہوں گے کہ زبردستی کی تردید اور مخالفت مقصود نہیں ہے۔ بلکہ واقعتاً میں تنقیدی زاویۂ نگاہ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مداحین کو ہمیشہ حقیقی بات کہنی چاہیئے اور اپنے موضوع کو غلط پیش کرکے خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ منظور صاحب نے جو کچھ دیر و حرم میں پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ اتنی جان خود رکھتا ہے کہ اُن کو بزم شعرا میں اپنا مقدر مقام حاصل کرنے کا مستحق بنادے۔

نجمہ صاحبہ نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ رسوائی کے خطرے سے خالی نہیں یعنی یہ طریقہ اُن کی اچھی خاصی متاع نقد و نظر اور مطالعہ کو مشکوک بنا دے سکتا ہے

فروری نمبر سے میں" ہندوستانی روایات اور اردو شاعری" کے عنوان سے ایک مقالہ شروع کرنیکا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس کے مطالعہ سے نجمہ صاحبہ اندازہ کرسکیں گی کہ قطع نظر متقدمین اور متاخرین کے کلام کے نہایت واضح طور پر ہندوستانی روایات نگاری اور صاف و آسان ہندی آمیز گیتوں کی زبان بہت پہلے بن کر رائج ہو چکی ہے اور اس کی شہادت میں عظمت اللہ خان کی یک رنگ نظمیں، حفیظ کے گیت، بادۂ مشرق کے پہلے اور دوسرے حصّے کی خالص ہندوستانی کلچر اور زبان کی نظمیں بہت پہلے شائع ہو کر ملک میں ترغیب اور تقلید کی بنا ڈال چکی ہیں اس لئے یہ غلط ہے کہ منظور صاحب نے ایک الگ راہ قائم کی ہے، بلکہ یہ کہنا ضرور ایک بدیہی حقیقت ہے کہ منظور صاحب نے وہ راہ نہایت کامیاب طور پر طے کی ہے جو اُن کے پیشرو بنا چکے تھے اور اس رنگ میں انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ نہایت رواں، حسین اور بلند ہیں۔

منظور صاحب کی شاعری کے دو اسلوب ہیں، ایک اسلوب گیتوں پر مبنی ہے جس میں پجارن کی زبان اور کلچر کی جھلک ہے، دوسرا استعاریہ اسلوب منظریہ اور رومانی نظموں پر مبنی ہے۔

شاید منظور کے دوسرے اسلوب کے متعلق یہ کہنا اُن کے لئے سب سے بڑا کریڈیٹ ہوگا کہ اس اسلوب کا مرکز آغاز کیف و کم کے ساتھ وہی ہے جو جوش کی رومانی اور منظریہ شاعری کا روح ادب کی نظموں میں پایا جاتا ہے، ان نظموں کی بندش الفاظ، بحور، استعارات اور تشبیہات اور اسپرٹ بالکل وہی ہے جو روح ادب میں بڑی تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مثلاً اُن کا

یہ قطعہ ؎

مینہ سے بن کر فلک پر چھا گیا ابرِ بہار — اس کا دامن چیر کر نکلی ہو بگلوں کی قطار
نیند سے بیدار ہو کر جس طرح وقتِ سحر — توجہ کرتی ہو باغ میں حسین پھولوں کی ہار

اس قطعہ کا معیار کوئی معمولی معیار نہیں ہو، یہ ایک ایسا قطعہ ہے کہ بڑی سے بڑی دولت اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتی،

دوسرے اسلوب میں فارسی تراکیب کی تراش خراش کا وہی انداز ہو جو آجکل کے رومانی شعراء کا انداز ہے، البتہ موضوع کی مجبوری کے لحاظ سے دوسروں کے ہاں شوکت الفاظ کی نوعیت دوسری ہے، اور منظور کی منزل کیونکہ خالص رومانی منزل ہے اس لئے اُن کی ترکیبیں دلنواز ہیں۔ اس دلنوازی کے اجتماع نے وہی کیفیت پیدا کر دی ہے جو زعفران کی کیاریوں میں کیسر کے پھولوں سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کے کلام میں نشہ ہے، مستی ہے اور اس مستی میں ایک اُس باظرف بادہ کش کی سی شان ہے جس نے جی بھر کر پی ہو مگر قدم میں لغزش نہو، اُن کی مستی میں گہرائی اور پاکیزگی ہے،

اُن کے گیتوں کے مقابلے میں دوسرے اسلوب میں زیادہ پختگی سلاست اور روانی ہے اور اس میدان میں وہ آزادانہ سفر کرتے ہیں، گیتوں میں بھی کافی مٹھاس، رنگینی اور ایجاد کی کیفیت ہے مگر ان کی زبان پر اتنی قدرت نہیں جتنی دوسرے اسلوب کی زبان پر ہے،

رومانی شعراء میں جوش، حفیظ، اختر ان حضرات کے کلام میں تو نہ نامانوس ماحول ہے اور نہ غیر ملکی رنگ، لیکن منظور کی رومانی نظمیں ضرور اپنی تراکیب کی غرابت کے لحاظ سے مختلف ہیں، اُن کی نظموں کا کوئی ماحول ابھی تک متعین نہیں ہو سکا ہے، البتہ فارسی شوکت لفظی پورے طمطراق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ جوش کی رومانیت کا ماحول اور حفیظ و اختر کی رومانی فضا قطعی مقامی ہے،

البتہ ایک حیرت کی بات ضرور ہے کہ منظور اقبال سے قطعی متاثر نہیں ہیں اور ہلکا سا پرتو بھی ان کی شاعری پر اقبال کی زبان اور تصورات و نظریات کا نہیں ہے۔ مگر نجمہ صاحبہ اقبال کی روح کا اعادہ بھی منظور صاحب میں دیکھتی ہیں، صرف ایک "روح القدس" باقی رہ گیا ہے غالباً وہ اس "پیش لفظ" کے لکھتے وقت خیال میں نہیں تھا،

آخر میں نجمہ صاحبہ تحریر فرماتی ہیں کہ :-

"منظور صاحب نے فارسی کے حسین و جمیل الفاظ میں ہندی کے پیارے پیارے لفظوں کو اس طرح کھپایا ہے کہ ان کے ملاپ سے ایک تیسری دلکش اور منزہ زبان پیدا ہو گئی ہے جسے "ہندوستانی" کہتے ہیں اور جس پر ہندوستان کی آئندہ قومی زبان کی بنیادیں اُستوار کی جائیں گی"

مسز سروجنی نائیڈو نے ۵ سال پہلے "بادۂ مشرق" کا دیباچہ لکھا تھا جس کے یہ الفاظ تھے :-

"ساغر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کے لئے ہندوستانی زندگی، ہندوستانی تجربات، اور ہندوستانی جذبات کے عام عنوانات کو منتخب کرتا ہے، اور ان کی ادائیگی کے لئے ایسے سلیس اور دلکش الفاظ استعمال کرتا ہے جو عوام الناس کی روزمرہ بول چال سے بیشتر مشابہت رکھتے ہیں، اس کا تخیل تمام تر ہندوستانی مناظر اور ہندوستانی روایات سے ماخوذ ہوتا ہے، اور نظموں کے اوزان نے ہندوستان کے قدیم گیتوں کے اوزان کو ایک دل خوش کن انداز میں اپنے اندر قبول کر لیا ہے،

ساغر نے زمانۂ حال کی اردو شاعری میں زبان کی نرم اور دل فریب شیرینی پیدا کر دی ہے جس میں ہندی الفاظ بے ساختگی کے ساتھ بغیر کسی تصنع کے فارسی منظومات کی مشکل ترین مقررہ بندشوں میں گھل مل جاتے ہیں، ساغر کا ریشہ ریشہ ہندوستانی ہے اس کی شاعری مادرِ وطن سے ماخوذ ہے اور مادرِ وطن ہی سے اس کا انتساب ہے"

سروجنی دیوی

اِن دونوں دیباچوں کے اقتباسات کی ہم آہنگی اور مضمون کی یکسانیت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، خدا جانے مسز نائیڈو نے نجمہ تصدق کا خیال اُڑا لیا ہے یا نجمہ صاحبہ نے مسز نائیڈو کا، لیکن بہرحال نجمہ صاحبہ کے دیباچہ کو تنقیدی مقالے کے بجائے محض ہدیۂ تاثر کہنا زیادہ مناسب ہے۔

آئیے، اب اِن باتوں سے بلند ہو کر منظور کی شاعری پر ایک نظر ڈالیں

جس کے جلوے دیر و حرم کو تماشا گاہ بنائے ہوئے ہیں

منظور کی تصویر

دیباچوں کے بعد منظور صاحب کی تصویر ہے، اور اس کے بعد مختلف نظمیں، کتاب کی ترتیب میں کسی خاص تنظیم کا خیال نہیں رکھا گیا، اس بے ترتیبی کا میں قائل نہیں لیکن اس بے

ترتیب سے پیدا شدہ حسن کا منور قائل ہوں جیسے سنبرے پر مالن کے ہاتھ سے سبدِ گل گر جائے، جیسے جوہری کے سامنے موتی بکھیر دیئے جائیں!؟

منظور کی غزل

فارسی اور اردو شاعری میں غزل ایک ایسی صنف ہے جو اپنے فارم کے لحاظ سے شعرگوئی کی مشق اور شاعری کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لئے موزوں ترین چیز ہے۔ اردو کے ہر مجتہد سے مجتہد شاعر کا آغاز غزل ہی سے ہوا ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ منظور نے غزل پہلے کہی یا نظم، مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ غزل ہی سے انہیں آغازِ شاعری کرنا پڑا ہوگا، کیونکہ فنی طور پر نظم تجربا اور مشق چاہتی ہے۔

یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ منظور جدید رومانی شاعر ہیں، غزل اُن کا میدان نہیں، غزل میں کبھی اُس وقت تک شیرینی اور جاذبیت نہیں پیدا ہوتی جب تک کہ غزل کے متعارف عناصر غزل میں نہ ہوں، ان جانے بوجھے عناصر کا مرکب مومن و غالب کا تغزل ہے، یا پھر مرزا داغ کی غزل، مگر منظور کی غزل میں خود ان کی نظم ہی کا رنگ ہے ؎

کرنوں کا قلم لے کر خورشید کے پردے پر — اے برقِ نظر تیری تصویر بنائی ہے
آ دیدے پھولوں کی دامانِ نظر بھر لیں — خوش رنگ مناظر ہیں اور صبح سہانی ہے

مثلاً یہ شعر ایک مستقل تخلیقی شان رکھتا ہے، مگر غزل کا شعر نہیں ہے ؎

شفق میں مئے لالہ گوں کی جھلک ہے — فلک نے کوئی توڑ دی ہے گلابی

نئے شعراء نے ضمائر کے متعلق فیصلہ کرلیا ہے اور اکثر اپنی نظموں میں ضمیر تانیث استعمال کرتے ہیں، یہ ایک ابداعِ جمیل سہی لیکن فطری ضرور ہے اور اُردو شاعری سے اس منافقت کو دور کرتا ہے جس نے اس کو صرف واقعیت سے دور رکھا، بلکہ جو سماج میں صحیح شاعری کو غلط پیش کرتا رہا۔ منظور صاحب نے نظموں میں بیشتر اور غزلوں میں کہیں کہیں ساتھ ضمیر تانیث کا استعمال کیا ہے، اور خوب کیا ہے ؎

ضبط کا دعویٰ غلط یکسر غلط — نام میرا سُن لیا شرما گئیں
شوق تھا جن کو نمودِ حسن کا — میری چشمِ شوق سے گھبرا گئیں

اِن اشعار میں نسوانی فطرت کی لطیف ترین صناعی نظر آتی ہے اس کو پڑھ کر ہم کم از کم یہ تو سمجھ جاتے ہیں کہ مخاطب اپنی ایک صنف رکھتا ہے۔

منظور کا تخیل

منظور کا تخیل اس درجہ دل نواز اور لطیف ہے کہ کوئی رنگ ہو مگر ہر جگہ ردم (Rythm) پیدا ہو جاتا ہے ہر چند کہ اُن کی غزل کی کوئی انفرادیت نہیں اور نظم کے مقابلے میں ہم ہرگز اُن کی غزل کو ترجیح نہیں دیں گے لیکن اُن کی غزلیں ایسے بلند اشعار سے خالی نہیں ہیں ؎

ہزاروں حسرتِ ارماں کے گل بوٹے لگاتا ہوں
مگر منظور میرے گھر کی ویرانی نہیں جاتی

جگر نے اسی قافیئے کو بڑے دلدوز طریقے سے لکھا ہے ؎

جسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
ہزار آباد ہو اُس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

"دیر و حرم" کے مطالعہ سے ایک خاص خیال میرے دل میں پیدا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ منظور اگر دوسروں کی زمینوں، دوسروں کے خیالات اور کلی طور پر تمام مروجہ اسٹائل اور متعارفہ اسالیب سے اپنے دامن کو بچالے جائیں (اور یقیناً بچالے جائیں گے) تو اُن کے اندر خود وہ تخلیقی روح موجود ہے جو سب کچھ پیدا کرسکتی ہے، میں پھر کہوں گا کہ متعارف غزل سے اُن کے مزاج کو کوئی تعلق نہیں ہے، ضمیر تانیث کے بعد اُن کی غزل ایک دوسری چیز ہو جاتی ہے، اس اسٹائل میں کافی دلکشی ہے، کہتا ہے کہ ؎

کیا جانے کس چیز کی ہیں تشنہ نگاہیں — کچھ اُن کو نگاہوں سے پلا اور چلی جا
دل بھولتا جاتا ہے پھر آدابِ کلیمی — اس شوخ کو آداب سکھا اور چلی جا

اس غزل میں گذری ہوئی شوخی بھی ہے اور متوازن لطافت بھی، گذری ہوئی شوخی کی جھلک دیکھئے ؎

ڈر ہے نہ کہیں کھائے نظر چاند کی اس کو — گستاخ ہے "جوبن" کو بچا اور چلی جا

متوازن لطافت کا رنگین پیمانہ دیکھئے ؎

آ پہلی کرن بن کے تو خورشیدِ سحر کی — سوتی ہوئی کلیوں کو جگا اور چلی جا
تاروں کی چمک چاند کی ضو اوس کی ٹھنڈک — بن کر مری نظروں میں سما اور چلی جا
جس طرح صبا لوٹتی سی محراب گذرے — غمخانۂ منظور میں آ اور چلی جا

بے ساختگی، سادگی، دل نوازی اور صداقت منظور کے کلام کی جان ہے، ایک غزل کا آخری شعر ہے ؎

اے رازداں نہ تجھ کو اگر ناگوار ہو — کہہ دوں بہت ستایا ہے تو رازداں کا ہو

وہ ذہانت اور قوتِ تخیل جو ایک رومانی شاعر کی پرواز کا پتہ دیتی ہے منظور کی شاعری میں جابجا جھلکتی ہے، صفحہ ۱۹۴ پر ایک غزل ہے گو وہ روایتی تغزل اور ساز و سامان سے خالی نہیں، لیکن اسی غزل میں ایک

شعر عجیب و غریب نظر آتا ہے ؎

ترا پاسبان جمال ہے، مرا تجھ سے ملنا محال ہے
مری کائنات لرز اٹھے، جو نظر بچا کے بھی دیکھ لے

یعنی اگر کوئی معمولی پاسبان و دربان ہوتا اور مجھے دیکھنا ہوتا تو کیا مشکل تھا، لیکن خود اُس کی خوبصورتی اُس کی محافظ ہے میرا دیکھنا تو ممکن ہی نہیں، اگر وہ نظر بچا کے بھی دیکھ لے تو میری کائنات لرز اُٹھے، کائنات کے لفظ میں جو جامعیت ہے وہ منظور کے شعور علمی اور صناعت کے اعلیٰ ذوق کی دلیل ہے۔ کیونکہ ان کی فکر رومانی غزل کے متعارفہ میدان کے لئے نہیں پیدا ہوئی اس لئے اُن کی اکثر غزلیں وہ اثر اور قوت نہیں رکھتیں جو اُن کی نظموں کی خصوصیت ہے۔ مثلاً ؎

لجا کر اور بہت مدھم سُروں میں
سُنا ہے میری غزلیں گا رہے ہیں

منظور کی رومانی نظمیں غزلوں کے مقابلے میں اُن کی رومانی نظمیں اپنے فارم، سادگی، تاثیر اور کیف کے لحاظ سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں، اس سے پہلی قسط میں میں ان کے اسلوب، استعاراتی ذوق، منظر نگاری اور نزاکت الفاظ، یعنی ان کے اسٹائل کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ منظور جوش ملیح آبادی کے اوّلین اسلوب سے بہت کچھ متاثر ہیں اور اس میں اُن کی اپنی جودت و ذہانت ایک نیا ماڈل پیش کرتی ہے،

گذری ہوئی جوانی، طلوعِ قمر، اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر، مشاہدہ، ایک مستِ ناز کو دیکھ کر، اور دوسری متعدد نظموں میں گہرا احساس اور اعلیٰ مصوری پائی جاتی ہے۔

"نقشِ اوّلیں"

طلبۂ کلیۂ ورنگل کا ششماہی رسالہ،
مدیر، سیّد اختر حسن ایم۔ اے ورنگل کالج حیدرآباد دکن،

ورنگل کالج حیدرآباد دکن کے طلبہ کا یہ ششماہی رسالہ "علیگڑھ میگزین" سے کہیں بلند و ارفع ہے، اس کے ایڈیٹر سیّد اختر حسن ایم۔ اے لکچرار کلیۂ ورنگل ہیں، اختر کا جمالیاتی ذوق ادبی معیار اور علمی وقوف ہی اس کی پوری ضمانت تھی کہ وہ نقش کو بہترین ترتیب دیتے، چنانچہ ایک یکسانیت رسالے کے مضامین میں پائی جاتی ہے، صرف ایک دو مضامین کے علاوہ باقی تمام مضامین مفید، بلند اور ذی مقصد ہیں۔!؟

نظموں کے حصہ میں بھی سوائے ایک دو نظموں کے تمام نظمیں اچھی ہیں، البتہ تنقید و تبصرہ کا حصہ بہت ہی کم ہے سو امید ہے کہ دوسرے نمبر سے اس کمی کو پورا کردیا جائے گا۔

نقش کا اردو حصہ تقریباً ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ انگریزی حصہ کے محض ۲۴ صفحات ہیں، لیکن دو حصوں کی چھپائی نہایت روشن اور اعلیٰ درجہ کی ہے۔ کتابت اور مجموعی حسنِ ظاہری بھی اتنا ہی دلکش ہے جس قدر کسی نقش کی روح ہے۔

احمد حسن خان صاحب پرنسپل کلیۂ ورنگل کا خطبۂ صدارت نہایت جامع، دلچسپ اور درس آموز ہے، اگر آپ نے دوسرے تعلیمی مسائل پر اظہار خیال کیا تو یقیناً کلیۂ ورنگل کے طلبہ کے لئے کافی امکانات ہدایت کے نکل سکتے ہیں

"سب رس"

ادارۂ ادبیات اُردو
زیرِ نگرانی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
اڈیٹر، صاحبزادہ میر محمد علی خان میکشؔ

جو مقاصد اس رسالہ کے پیشِ نظر ہیں وہ ہمارے لئے انتہائی مسرت بخشنے والے ہیں، اب تک جو نمبر ہماری نظر سے گذرے ہیں اُن سے ہم نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ یہ آرگن ایک ایسے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا ہے اور جو ادب کو صرف چند بے ربط شیرازۂ اجزائے حواس کے افسانوں پر مشتمل نہیں سمجھتا۔ اس طبقے نے اس انقلاب کے لئے بیڑا اُٹھایا ہے جو تمام انقلابوں سے بلند اور دقت طلب ہے اور وہ انقلاب ذہنی ہے، ہماری قوم کے ماؤف اور تعیش پسند ذہن کو زندگی کی حقیقتوں اور برق رفتار زمانے کی روش کی طرف اُن کی توجہ کو منعطف کرنا ایک بہت بڑی خدمت ہے۔

ڈاکٹر محی الدین زورؔ کی ناقدانہ حیثیت روشن ہے اور ایک ایسے شخص کی نگرانی ہی جو "تنقیدِ حیات"، یعنی شاعری پر تنقید کرتا رہا ہو، اس رسالہ کی معیاری ہونے کی کلیتہً ضامن ہوسکتی ہے۔

زیرِ نظر نمبر "ریڈیو نمبر" ہے، ریڈیو نمبر اس لئے کہ اس میں آواز

کی دنیا" ہی کا ذکر ہے، اس ذکر میں بھی تنوع کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، مضامین کو مندرجۂ ذیل ابواب پر تقسیم کر دیا گیا ہے:

(۱) آواز کی دنیا	(۲) زبان اور ادب
(۳) علومِ عمرانی	(۴) پیشے
(۵) ادبِ لطیف	(۶) مشاعرے
(۷) حیوانات	(۸) تعلیم اور نئی نسل

پہلے باب میں سب کچھ آواز اور ریڈیو کے متعلق ہے۔ پڑھنے والے کے ذہن میں اُن مسائل کا جنکا انحصار دقیق نکتوں پر ہے اور جن کی تعریف سائنس کی اپنی اصطلاحات ہی میں ممکن ہے ایک قابلِ فہم خاکہ سا آجاتا ہے، اس سلسلے میں "ایتھر" کے عنوان سے جو مضمون ہے، اس کو پڑھنے کے بعد صاحبِ مضمون کو داد دینا پڑتی ہے کہ انھوں نے کس خوبصورتی سے اس شاعرانہ لطافت کو الفاظ کے جامے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب کے دوسرے مضامین ریڈیو کے سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اور یہ صرف ہنگامی اور وقتی دلچسپیوں کے نہیں، بلکہ مستقل طور پر اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ "سب رس" نے یہاں پر اپنی حیثیت کو رسالہ کی حیثیت سے بالاتر بنا لیا ہے۔ ریڈیو کی زبان کے متعلق جو شکایت ہے وہ بہت پُرانی ہو چکی ہے۔ مگر آل انڈیا ریڈیو کے اربابِ حل و عقد اپنی جگہ کان بند کئے ہوئے ہیں، ضرورت اس بات کی مقتضی ہے کہ ہم اپنی شکایت کے لئے پُر زور طریقہ اختیار کریں۔

"زبان اور ادب" عنوان کے ماتحت جو مضامین ہیں اُن میں عبدالحفیظ صاحب صدیقی کا مضمون "ادبیات کا مستقبل" نہ صرف یہ اُن رجحانات کو، جنسے ادب اپنے فطری دورِ ارتقا میں دو چار ہو رہا ہے، ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ اُن لوگوں کے لئے، جو ادب کو محض اپنی اُپج کی خاطر ایک ہیچ لانگا بنائے ہوئے ہیں ایک فہمایش ہے۔ ہم یہ کہنے میں مصنف کے ہم زبان ہیں کہ "تصنیف و تحریر کا مستقبل جماعت کے مستقبل پر منحصر ہے لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا بھی صحیح ہو گا کہ کوئی نظامِ اجتماعی بھی بروئے کار آئے، ادب کی حیثیت روز بروز زندگی کی رہبر ہوتی جائے گی اور ادب و اخلاق کی عارضی مغائرت ختم ہو جائے گی، ادب میں انقلاب شروع ہو چکا ہے لیکن جماعتی زندگی کا انقلاب، ادبی انقلاب سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اگر یہ نہو تو اس کا ہونا نہ ہونا ایک ہے"۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ادب میں انقلاب شروع ہو چکا ہے اور جماعتی زندگی ابھی تک انقلاب آشنا نہیں ہوئی، ادب صرف اُسی وقت ادب کہلانے کا مستحق ہو گا جب یہ مغائرت ختم ہو جائے گی۔ ہمیں تلاش کرنا چاہئے کہ اس مغائرت کے اسباب کیا ہیں!؟ یہاں یہ اشارہ کافی معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف لکھنے والوں کی وہ جماعت ہے جو اپنے "فرضی تصورات" میں گم ہے اور زندگی کی تلخیوں سے بے نیاز۔ دوسری طرف وہ جماعت ہے جو بظاہر کچھ ایسے تصورات ضرور پیش کرتی ہے جو براہِ راست سماج پر اثر انداز ہیں مگر اُس کا تمام "زور" عبارت آرائی میں ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ پڑھنے والوں کے ذہن میں کوئی سوال پیدا نہیں کرتی، البتہ لغت میں دو چار الفاظ کا اضافہ ہو جاتا ہے اور بس... اور وہ الفاظ ہیں" سماج "،" بیسوا"، "مزدور" اور "گدال"... اس جماعت کا مشاہدہ ناقص ہے ان کا دل کوئی تڑپ محسوس نہیں کرتا اور ادبی ترقی کا دعوٰی اُس وقت تک عبث ہے جب تک یہ تمام مشاہدات خلوص کے حامل نہ ہوں، یعنی خلوص سے دیکھا جائے اور خلوص سے بیان کیا جائے۔

"علومِ عمرانی" کے ماتحت "سود" ایک مفید مضمون ہے، جس میں اس "خالق سرمایہ داری" کے متعلق تجزیہ کیا گیا ہے، مگر ہمیں مصنف سے اس امر میں اختلاف ہے کہ "اس طریقہ کو اُٹھا دیا جائے تو بڑے بڑے کاروبار چلانے کے لئے جو کثیر سرمایہ بہ آسانی فراہم ہو جاتا ہے، نہ ہو سکے گا اور اس سے دولت پیدا کرنے کے کاروبار کو سخت نقصان پہونچے گا" اور یہ کہ "محض سودی لین دین کے طریق کو اُٹھا دینے سے سرمایہ داری دنیا سے اُٹھ نہیں جائیگی" یہ اختلاف بنیادی ہے۔ صاحبِ مضمون نے سرمایہ دار اور سرمایہ داری کے الفاظ استعمال کرتے وقت یہ نظر انداز کر دیا ہے کہ اس نظام سے بغاوت کرنے والوں کی مراد یہ نہیں کہ سرمایہ کا وجود ہی نہ رہے، اُن کے خیال کو تو مختصراً یوں کہہ لیجئے کہ سرمایہ ایسے ہاتھوں میں ہو جو ہر ہر موقع پر عوام کے خون چوسنے کے متمنی نہ ہوں، انفرادی مفاد کی خاطر ان کی کھال کھینچنا چاہیں بلکہ سرمایہ کا وجود ایک قومی ادارے کی حیثیت میں باقی رہے اور یہ صورت اُس وقت ہی پیدا ہو سکتی ہے کہ اولاً سود کی لین دین کے طریق کو ناپید کر دیا جائے۔ خیر ہم نے یہ ایک ایسا سوال چھیڑ دیا جو اجتماعی انقلاب کی اصل ہے۔ اس کا جواب دورِ حاضرہ کے ادب میں ہر جگہ نظر آئیگا

"پیشے کے انتخاب کی خصوصیت" "پیشے کے انتخاب" کے عنوان میں نمایاں ہیں۔ دوسرے مضامین کا تعلق مختلف پیشوں سے ہے مگر ایک مضمون میں حبیب احمد صاحب فاروقی نے کچھ بنیادی سوالات قائم کئے ہیں، "ہمیں افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں "نفسیات میں فلسفیانہ تخیل کو ساری اہمیت حاصل" ہے اور ابھی ہمارے ملک کے ماہران نفسیات" نے فلسفہ کی اس گرفت سے چھٹکارا نہیں پایا اور وہ عملی پیرایہ میں کوئی انسانی خدمت نہ کرسکے۔" ہمیں تمنا ہے کہ ہم اس شعبہ میں جلد وہ دور دیکھیں جب نفسیات میں بھی طبعی علوم کی طرح تجربے کئے جائیں اور ان تجربوں کی روشنی میں ملک کے نوجوان افراد اپنے لئے مناسب مستقبل تجویز کریں، افراد کو یہ موقع بہم پہونچانا قومی خدمت کا سب سے زیادہ نمایاں کارنامہ ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد "ادب لطیف" کا باب ہے۔ باب کا یہ عنوان ہزاروں بدگمانیاں پیدا کرسکتا ہے کیونکہ مطالعہ کے ماتحت ہم مجبور ہوگئے ہیں کہ "ادب لطیف" کی تعریف یوں کی جائے "ادب لطیف" ادب کی وہ صنف ہے جسے لکھنے والا خالی الذہن ہو کر خلا کی عبارتیں پڑھے اور کچھ اس طرح لکھے کہ ہر فقرہ ختم ہونے سے پہلے چند مرتبہ ختم ہوجائے۔" اس کے بعد مشاعرہ اور حیوانیات سے متعلق دو باب ہیں، ہم اس کو ستم ظریفیٔ ترتیب کہیں یا کیا۔ مشاعرے کے بعد حیوانیات دیکھ کر کچھ گمان سا ہوتا ہے کہ مشاعرے کا انجام حیوانیت کے آغاز پر! ؟

مشاعرہ کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ بہرحال یہ رسالہ از اول تا آخر بڑی حد تک کامیاب رسالہ ہے میں ناظرین "ایشیا" سے اس کی خریداری اور مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتا ہوں "سب رس" کا سالانہ چندہ للعہ

مشرق و مغرب

مصنفہ حمیدہ سلطان صاحبہ دہلی۔

انیس النسواں سیریز کے سلسلے کا یہ ایک افسانہ ہے جس میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا ایک ممکن امتزاج پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے زیادہ تر کرداروں کو سیرت و اخلاق کا وہ لباس پہنایا گیا ہے جو حمیدہ صاحبہ خود پسند کرتی ہیں بعض جگہ تو وہ صفیہ کے پیکر میں خود جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً

"اس کا ڈرائنگ روم مغربی طرز آرائش کا ایک بہترین نمونہ تھا اور اس کی زینت کو خود صفیہ کے ہاتھوں کی پینٹ کی ہوئی تصاویر اور سلمہ ستارے سے بنی ہوئی رباعیات عمر خیام نے دوبالا کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ اس کے چھوٹے کمرے میں اس کی نماز کی چوکی بچھی ہوئی تھی"

کلب کی زندگی سے عدم دلچسپی کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتی ہیں۔

"قومی اور اصلاحی کاموں میں حصہ لینا اس کا نصب العین تھا"

اس کے بعد بعض آئیڈیل پیش کئے گئے ہیں جن میں مذہبی پابندی اور "روشن خیالی" کو بیک وقت سمو دیا گیا ہے۔

اس افسانے کا پلاٹ، کردار اور ماحول اکثر اسی قسم کا ہے جس قسم کا راشد الخیری صاحب کے یہاں پایا جاتا ہے، البتہ وہ المناکی نہیں ہے جو انہیں کا حصہ تھی، ماحول (2.0.9) ہی فضا رکھیانہ ہے۔ مگر صفیہ کی بہن زہرہ کے کردار کی جو خصوصیتیں دکھائی گئی ہیں وہ گمراہ ترین شریف مسلم عورتوں میں کہیں نہیں پائی جاتیں۔ یہ تباہ شدہ سوسائٹی گرلس کی خصوصیات ہوسکتی ہیں نہ کہ گھریلو بہو بیٹیوں کی !؟ کچھ نہیں تو اس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ حمیدہ صاحبہ مغرب کو جیسے کی طرح نہیں سمجھتیں اور اس کی مخالفت میں انتہا پسند ہوگئی ہیں آخر میں زہرہ کو ایک آوارہ ترین عورت دکھا کر امراض مزمنہ میں مبتلا دکھایا گیا ہے، اس کے بعد توبہ کے بعد بے چاری کو ملانی بنا دیا گیا ہے۔ اگر ان باتوں کی بجائے زہرہ کو بوڑھا کر دیا جاتا تو ہم یقین کرسکتے تھے کہ اس کی لذت پسند فطرت، جو شراب، آوارگی، رقص و سرود، اور طرح طرح کی اعلیٰ ترین رنگین زندگیوں کی عادی تھی، جو گناہ کی شیرینی کی اسیر تھی اور جسے معصیت کی لذتوں کا چسکا تھا، وہ ایک ساتھ بدل جاتی ہے !؟ اور اس تبدیلی کے بعد سماج اُسے مقدس بھی سمجھنے لگتی ہے !؟ مگر محض ایک مزمن مرض میں مبتلا ہوجانا تبدیلیٔ فطرت کا سبب نہیں ہوسکتا۔ اصل میں یہ کہانی ایک طبقے کے فطری اور ذہنی تقاضوں کا آئینہ ہے اور بغیر کسی نفسی تحلیل کے جو رائے خود حمیدہ صاحبہ کی "افراد اور سیرت" کے بارے میں ہے اسی کے مطابق کرداروں کو تحریر کیا گیا ہے۔

لیکن بہرحال افسانہ اس لئے دلچسپ ہے کہ حمیدہ سلطان کے قلم سے لکھا گیا ہے ہم ان کی قدامت پرستی کے کتنے ہی شاکی ہوں مگر ان کے ادب کے قدردان ہیں، یہ کتاب انیس النسواں دہلی کے دفتر سے طلب کی جاسکتی ہے۔

"کوئی اور چیز درکار ہے"
"نہیں، شکریہ (نوکرانی چلی جاتی ہے)
نورا (تحفوں کے درخت کو سجاتی ہے) "یہاں ایک موم بتی
جلاؤں گی، یہاں پھول رکھوں گی،
"اوہ خوفناک آدمی .... واہیات سب واہیات ...
ٹوروالڈ میں تمھیں خوش کرنے کے لئے کام کروں گی۔ تمھارے لئے گاؤں گی
ناچوں گی"
(ہیلمر اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذات لئے داخل ہوتا ہے)
نورا "اوہ ٹوروالڈ تم آ گئے، اتنی جلدی؟"
ہیلمر "ہاں، کیا یہاں کوئی آدمی آیا تھا؟"
نورا "یہاں، نہیں"
ہیلمر "خوب، عجب بات ہے میں نے ابھی کروگسٹاڈ کو صدر دروازے
سے نکلتے دیکھا"
"واقعی مجھے خیال نہیں رہا ہاں کروگسٹاڈ ذرا دیر کو آیا تھا"
"یقیناً وہ تمھاری سفارش کے لئے آیا ہوگا، کیوں؟"
"ہاں"
"اور تم اُس کی آمد کا حال چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں تاکہ یہ معلوم
ہو کہ تمھاری سفارش اُس کی خوشامد کا نتیجہ نہیں، کیوں، ٹھیک ہے نا؟"
"ہاں ٹوروالڈ، لیکن ...."
"ذرا غور کرو نورا، تم ایسے آدمی سے باتیں کرو، پھر اُس سے وعدہ
کرو اور اُس کے بعد جھوٹ بولو"
"جھوٹ؟"
"ہاں جھوٹ، کیا تم نے ابھی نہیں کہا تھا کہ یہاں کوئی آدمی نہیں
آیا تھا۔ دیکھو میری قمری پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔ قمری کی منقار صاف رہنی چاہئے
ورنہ اُس کا گانا پاکیزہ نہ رہے گا (کمر میں ہاتھ ڈال کر) اچھا جانے دو اس قصّے کو
(انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر) یہاں کیسی گرمائی اور آرام ہے پھر (کاغذات دیکھنے لگتا ہے)
نورا (تھوڑے وقفے کے بعد) ٹوروالڈ!"
ہیلمر "کیا؟"
نورا "ٹوروالڈ، پرسوں اسٹینرگ لوگوں کے ہاں بھیس والا ناچ
ہوگا، میں بہت بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں"
"اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب کی دفعہ تم کیا بھیس بدلوگی"
"میں نے جو اِس کے متعلق سوچا تو بیوقوفی ہی کی"
"کیوں"
"یہی کہ کوئی نئی چیز سمجھ میں نہیں آتی، ہر بات بیہودہ معلوم ہوتی ہے"
"آخر تم نے یہ بات مان ہی لی، کیوں نورا؟"
(کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھ کے) "ٹوروالڈ کیا تم بہت ضروری کام کر رہے ہو؟"
"دیکھو میں ...."
"یہ کیسے کاغذات ہیں؟"
"بینک سے متعلق"
"ابھی سے یہ جھگڑے؟"
"ہاں ہمارے بینک کے جانے والے منیجر نے مجھے اختیار دے دیا ہے کہ
بینک کے عملہ میں ضروری رد و بدل کر کے جسے جو کام مناسب سمجھوں دیدوں،
اور ضروری ہے کہ اسی ہفتے میں یہ کام ختم ہو جائے تاکہ نئے سال کے شروع میں
ہر چیز بالکل تیار ملے"
"اسی وجہ سے غریب کروگسٹاڈ ...."
"ہوں"
نورا (کرسی پر جھک کر اُس کے بالوں سے کھیلتی ہے) "اگر تم اس
قدر مصروف نہ ہوتے تو میں تم سے ایک بہت بڑا سوال کرتی"
ہیلمر "وہ کیا؟ بتاؤ"
"دیکھو تمھاری سی پسند اور تمھارا سا انتخاب کسی کا نہیں، میں
اس ناچ میں جانے کے لئے بیتاب ہوں کیا تم یہ نہیں کر سکتے کہ میرے لئے کوئی
بھیس اور مناسب پوشاک تجویز کرو"
"تو آخر میری ضدی بیوی کو سر جھکانا ہی پڑا"
"ہاں ٹوروالڈ، میں تمھاری مدد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی"
"اچھا تو میں سوچوں گا، کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکلے ہی گی"
"بڑی مہربانی ہوگی، پیارے ٹوروالڈ، دیکھو یہ پھول کیسے اچھے ہیں؟
لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس کروگسٹاڈ کا جرم کیا واقعی سخت تھا؟"
"اس نے جعلی دستخط کئے تھے تمھیں اندازہ ہے کہ یہ کس قدر بڑا جرم ہے؟"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایسا کرنے پر ضرورتِ وقت سے مجبور ہوا ہو"

"ہاں یعنی کوتاہ اندیشی سے مجبور، میں ایسا سنگدل تو نہیں کہ انسان کو ایک ہی غلطی کی وجہ سے راندۂ درگاہ قرار دیدوں"

"نہیں نورؔ واللہ تم ایسا نہ کروگے"

"بہت سے لوگوں نے کھویا ہوا نام واپس لے لیا ہے، غلطی کا اعتراف کرکے اور سزا بھگت کر"

"لیکن کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ....."

"ذرا سوچو تو نورا کہ ایک مجرم کو کس قدر جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا پڑتا ہے، وہ اپنے بیوی بچوں کے سامنے بھی اصلی بات کو چھپاتا ہے، خصوصاً بچوں کے سامنے، یہ جھوٹ اور دھوکے بازی کس قدر خطرناک ہے"

"وہ کیسے"

"چونکہ یہ فریب اور جھوٹ تمام گھر کی فضا کو زہرآلود کردیتا ہے بچوں کے لئے یہ بہت ہی مہلک زہر ہے"

نورا "کیا تمھیں اس کا یقین ہے؟"

ہیلمر "میری پیاری ایک وکیل ہونے کی حیثیت سے مجھے کافی تجربہ ہے، ایک مجرم کی ماں ہی اس کے جرائم کی ذمہ دار ہوتی ہے"

"مگر ماں ہی کیوں؟ والدین کیوں نہیں؟"

"باپ کا اثر بھی پڑتا ہے مگر بیشتر ماں ہی ذمہ دار ہے، یہ کروگسٹاڈ بھی ہمیشہ اپنے بچوں سے جھوٹ بولتا رہا ہے، اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ اس کا اخلاق بالکل فنا ہوچکا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ میری پیاری نورا اس کی سفارش نہ کرے۔ لاؤ ہاتھ وعدہ کرو کہ اب اس کی سفارش نہ کروگی۔ لاؤ لاؤ تکلف نہ کرو، بس اب طے ہوگیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کام کرنا میرے لئے قطعی ناممکن ہے، ایسے لوگوں کی صحبت میں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں بیمار ہوں"

نورا (اپنا ہاتھ چھڑا کر) اب تو یہاں گرمی ہوگئی اور مجھے کام بھی بہت کرنا ہے (کاغذات کو ترتیب دیتے ہوئے) ہاں اور مجھے انھیں ختم کرنا ہے اور تمھارے لباس کے متعلق بھی سوچنا ہے اور ممکن ہے کہ تمھارے لئے کوئی تحفہ بھی تیار کروں (سر پر ہاتھ رکھ کر) میری پیاری گانے والی چڑیا (چلا جاتا ہے)

نورا (کچھ توقف کے بعد) نہیں نہیں یہ سچ نہیں ہے، ایسا ناممکن ہے، بالکل ناممکن ہے۔

نرس (دروازہ کھولتی ہے) "بچے ضد کر رہے ہیں کہ آپ ان کے ساتھ کھیلیں، وہ آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں"

نورا "نہیں انھیں یہاں نہ آنے دو، اپنے پاس ہی رکھو"

نرس "بہت اچھا میڈم" (دروازہ بند کرکے چلی جاتی ہے)

نورا (نہایت خوف زدہ زرد رُو) اپنے بچوں کا اخلاق خراب کرنے والی، میں، گھر کی فضا کو زہرآلود کرنے والی، میں! (ایک دم سیدھی ہوکر) نہیں نہیں، یہ درست نہیں، ایسا ممکن نہیں، ہرگز نہیں"

(باقی باقی)

محمد سعید خاں متعلم ایم۔ اے
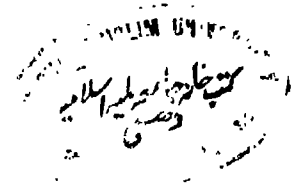
SAGHAR

IN ENGLISH

Saghar's entire attitude and approach towards life is of youth, richly endowed with a passion for the history, romance, hope and freedom of his country. He is in every fibre of him Indian and his art is both drawn from and dedicated to his motherland."

SAROJINI NAIDU

The Urdu knowing world is already familiar with the message of this young and buoyant poet of the East.

It is a message of independence and national pride.

The Hindi Edition of Saghar's poems is already in the market and eagerly sought by lovers of poetry and literature.

It is now translated into English for the benefit of English knowing world.

Price per copy Rs. 4-12 only. To those who order in advance it will be given for Rs. 3 only.

BOOK YOUR COPIES NOW TO AVOID DISAPPOINTMENT.

Manager, Adbi Markaz
MEERUT.

کامیاب صدا
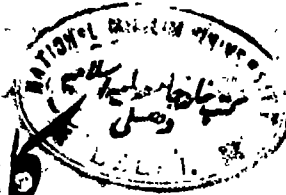
اپریل ۱۹۴۱ء کے ایشیا میں "جنگ کے خوفناک اثرات" کے عنوان سے جو اپیل ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی تھی وہ گویا اک پیمانہ تھی "ذات و صفات کی مقبولیت اور نامقبولیت کا"۔ ایسے خوفناک قدم اٹھا تو دیئے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کا ردِ عمل ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے، کبھی ناقابلِ برداشت کبھی ہولناک اور کبھی سودمند۔ میں ناظرینِ "ایشیا" اور اپنے دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے اقدام کا نتیجہ سودمندی ہی کی صورت میں رونما ہوا۔ یہ "سودمندی" بظاہر مادی [illegible] رکھتی ہے، لیکن اس کا نتیجہ واضح طور پر روحانی ہے!

آپ نے میری صدا کو کامیاب بنا کر اس روحانی تعلق کو اُجاگر کر دیا جو میرے اور آپ کے درمیان تھا۔ مگر ہم جس سے غافل تھے۔ آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ میری جدوجہد کو مفید اور ضروری خیال کرتے ہیں، آپ نے بیتابی میں یہ بھی [illegible] کہ آپ میرے ادب ہی سے نہیں، میری ذات سے بھی محبت کرتے ہیں۔

اور اس کے بعد وہ دبیز حجاب جسے یکسانیت اور ماہ و سال کے خلا نے بوجھل کر دیا تھا وقت کے دوش سے سرک کر گر پڑا ہے۔

اب مطلع نسبتاً پہلے سے روشن اور فضا صاف ہو گئی ہے۔ گو مایوسی اور پریشانی کا وہ عالم نہیں جو کل تھا تاہم ابھی وہ اطمینان پیدا نہیں ہوا جو کام کرنے کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔

اس ماہ میں ان حضرات کی توجہ فرمائی کی بھی ضرورت ہے جو اس اسکیم میں حصہ گیر نہیں ہو سکے۔

وقت کی نزاکت بحالہ قائم ہے۔ جنگ روز بروز خطرناک حیثیت اختیار کرتی جاتی ہے، اور اس سے پیدا شدہ گرانی برابر کارفرما ہے۔ ناظرینِ ایشیا اور احباب کی فوری توجہ نے مجھے جو ہمت اور قوتِ عمل بخشی ہے وہ ایک متحرک زندگی کی ضامن ہے۔ مگر برق و بلا کا امتحان برابر جاری ہے۔

موجودہ نمبر میں منی آرڈر فارم پھر منسلک کیا جارہا ہے۔ ہر سرپرست خریدار
اور ہر دوست اپنی حیثیت کے مطابق مرکز کی امداد کرسکتا ہے۔ مگر
عہ/ کے امدادی فنڈ الیشیا میں حصہ لینے کی نوعیت امدادی ہرگز نہیں ہے جو
صاحب ایک روپیہ کا منی آرڈر دفتر کو ارسال کرینگے ان کی خدمت میں
شاہکار تصنیف " وداعِ آخر " کی ایک جلد بھیجی جائیگی اس کتاب پر
یقیناً ۲/ ڈاک خرچ آئیگا لیکن ہمدردانِ الیشیا سے وہ محصول بھی نہیں
لیا جائیگا۔

عہ/

۲

الیشیا کے جن سینکڑوں خریداروں، دوستوں اور سرپرستوں نے اس اسکیم میں حصہ لیا ہے
ادارۂ ادبی مرکز ان کی اس ادب نوازی کا شکر گذار ہے، مجھے یقین ہے کہ اس مرتبہ وہ حضرات جنھوں نے
بالوجوہ ابتک توجہ نہیں فرمائی اس تحریک میں حصہ گیر ہوکر ادبی کاز کو تقویت بخشینگے۔ گو
میری ذات سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن یہ تعلق ضرور ہے کہ میں الیشیا کو زندہ دیکھنا چاہتا
ہوں، یہ لاگ کیا کم ہے کہ دل میں اس کی آگ ہے۔ اس آگ کی خاطر میں ذاتی طور پر
مجسم شکریہ ہوں۔

ساغر

(۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ بہار

ایڈیٹر
ساغر

زیر سرپرستی
ڈاکٹر سید محمود

اسسٹنٹ ایڈیٹر
قیصر بی۔اے

ناشر
مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۸ آنے

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)
ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست مضامین ایشیائی سنہ ۱۹۴۱ء

ایشیا

جلد ۶ | مئی سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۵

نیا ادب کیا ہے؟!

ہندوستانی زندگی اور اُس کے تمام تہذیبی شعبوں میں تبدیلی اور تغیر کی کس قدر اہلیت ہے!؟ اس کا جواب انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کی نئی ادبی تحریک کی سرعت انگیز مقبولیت میں پنہاں ہے۔!

اس انجمن کے پہلے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر پریم چند مرحوم تھے اور جس کی بنیاد اس بے سروسامانی کی حالت میں رکھی گئی تھی کہ اس کے پوسٹر رشید جہاں نے اپنے ہاتھوں سے لکھنؤ کے در و دیوار پر لگائے تھے میں بھی شریک ہوا تھا۔

اس اجلاس کے بعد انجمن نے اپنا اعلان نامہ شائع کیا جس کے الفاظ یہ تھے :-

"ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نت نئے روپ بدل کر یہ ہلاک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔

اس لئے ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں اُن کی ترجمانی کریں اور ان کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں ہندوستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی تلخ اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔ حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر و قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہمارا ادب میں عقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔

ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں کی ہلاک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دُکھ سُکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔

ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لئے زندگی کے جس شعبے میں ردِ عمل کے آثار پائیں گے اُنھیں افشا کریں گے۔ ہم اس انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔

ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لئے جا رہے ہیں۔

ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں۔ تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے :-

(۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشورتی جلسے منعقد کر کے، اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہلِ ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔"

یہ تھے وہ بنیادی مقاصد جن کو لے کر چند بے بضاعت لوگ کھڑے ہوئے تھے اور سنہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک یعنی ۵ سال میں ان لوگوں نے تمام اردو ادب کو متاثر کر دیا۔

پرانے بزرگ جو اپنی چال کو ہی صراطِ مستقیم خیال کرتے تھے اور

قدیم نقاد جنھوں نے تنقید کا ٹھیکہ لے رکھا تھا جدید زاویۂ تنقید اور ادب کے نئے نظریئے پرے سے کرنے لگے۔ یہاں تک کہ نئے ادب کو ایک گورکھ دھندا سمجھا جانے لگا، کہیں اس پر عریاں نگاری کا الزام لگایا گیا، کہیں اس کو کمیونسٹ لٹریچر سے تعبیر کیا گیا۔ اور کہیں خدا و مذہب کے خلاف اس کو بے دینی کی اشاعت سے تعبیر کیا گیا، یہ غلط فہمیوں کی سیلاب اس قدر موجزن ہوا کہ نئے ادب والوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ محض اس موضوع ہی پر ایک نمبر شائع کریں۔

چنانچہ "نیا ادب کیا ہے!؟" کے نام سے جنوری و فروری ۱۹۴۱ء کا ایک مشترک نمبر "نیا ادب لکھنؤ" نے شائع کیا ہے اور آغاز کے عنوان سے ادارہ نے اس طرح اپنے مطالب و مقاصد کی تشریح کی ہے:۔

"حیاتِ انسانی کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان بعض بنیادی ضرورتوں اور تقاضوں کی بنا پر اپنی زندگی میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرتا، نئے سماجی تعلقات قائم کرتا اور نئے ماحول پیدا کرتا رہتا ہے۔ ان تبدیلیوں کا اثر اس کے دل و دماغ، اس کی قوتِ فکر اور قوتِ عمل، اس کے ذہنی رجحانات اور جمالیاتی ذوق پر بھی پڑتا رہتا ہے اور ادب، اس کے موضوعات اور میلانات انداز بیان، اور لغت بھی جو بہر حال انسان کے ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں بدلنے لگتے ہیں۔

آج ہمارے ملک میں یہی ہو رہا ہے۔ زندگی میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں ان کے ساتھ ادب کی نئی قدریں قائم کی جا رہی ہیں، ادب کا مفہوم بدل رہا ہے، اس کے فرائض اور حقوق کی از سرِ نو جانچ ہو رہی ہے اور اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ادب کو سوسائٹی اور اس کے کلچر میں وہی جگہ دی جائے جس کا وہ مستحق ہے۔"

آگے چل کر ادارہ اپنی پوزیشن اور مقاصد کے متعلق اس طرح وضاحت کرتا ہے ا۔

"ہماری پوزیشن کیا ہے، ہم ادب سے کیا چاہتے ہیں ہمارا ادب کے بارے میں کیا تصور ہے، ان سوالات کے جواب آپ کو زیرِ نظر رسالے کے مضامین میں ملیں گے فرائڈ کی رائے میں آرٹ زندگی کے ان عناصر کے تصور کی از سرِ نو تخلیق کو کہتے ہیں جن سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے اور جن سے دلچسپی ہو، اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کی تحریریں خارجی حقیقتوں کے مطابق ہوں یا ان خارجی حقیقتوں کی حرکات" کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہوں نہ کہ سر سے پاؤں تک آپ کی ذاتی خواہش کا عکس۔

اس کے یہ معنی ہوں گے کہ جو کچھ ہم کہیں وہ ماحول کے ضروری عناصر، موقع و محل اور کردار کی مناسبت سے ہو اور ایسا معلوم ہو کہ اس ڈھانچہ میں صرف یہی تصویر بھی لگ سکتی ہے اور ان عناصر کے امتزاج سے صرف یہی نئی چیز پیدا ہو سکتی ہے۔"

اس تشریح میں ادب کی ترقی پسندانہ ذہنیت کی کافی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن لوگ اپنی جگہ ترقی کی تعبیر بہت غلط کرتے ہیں "ترقی پسندی" کے معنی میرے نزدیک انتہائی خود انتقادی یعنی اپنے پرکھنے کے ہیں۔ نئے ادیبوں اور شاعروں کی ذہنیت پرانے لوگوں کی طرح بر خود غلط نہیں ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ اپنی ذات اور کام پر تنقید کرنے کا ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ "ادارۂ نیا ادب" اس حقیقت کا اس طرح اعتراف کرتا ہے:۔

"ان دنوں جس طرح پرانے ادیب 'ادب برائے ادب' کے گول گنبد میں پناہ لئے ہوئے ہیں اسی طرح ہمارے بعض جوان ادیب مستقبل پرستی کے ہوائی محل میں بیٹھ کر اپنی ذاتی خواہشوں کی تسکین کیا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب وہ مزدور اور کسان اور انقلاب اور سوشلزم کے نعرے لگاتے ہیں تو ان لفظوں میں نہ گرمی ہوتی ہے نہ تڑپ پائی جاتی ہے اور نہ خلوص، انھیں سُن کر خواہ مخواہ اُبکائی آتی ہے حقیقت پسندی سے تو انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔"

اس اعتراف کے بعد ان کا یہ دعویٰ کہ "ان خرابیوں کے باوجود خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو ادب میں حقیقت پسندی کی تحریک بڑھ رہی ہے۔" یہی حقیقت ہے میں آپ کو وقتاً فوقتاً بتا چکا ہوں کہ نئے ادب کی نئی تحریک چند ہی سال میں

اتنی مقبول ہوئی ہو کہ اُردو کا کوئی رسالہ کوئی مشاعرہ کوئی اجتماع کوئی انجمن اور کوئی بزم ادب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی ہو اس تاثر کا عکس عوام اور خواص پر بھی پڑ رہا ہو اور آئندہ اس سے بھی زیادہ پڑے گا۔
ادبی تنقید کے بنیادی اصول کے ذیل میں ڈاکٹر عابد العلیم کی رائے ہے کہ :-

" ادبی تنقید کی خارجی یا معروضی اصول مقرر کئے جائیں اور ان کو سامنے رکھ کر نئے اور پرانے ادب کو پرکھا جائے اس کی صرف ایک ہی صورت ہو اور وہ یہ کہ تحقیق جدید کے اس طریقے کو جو سائنس میں استعمال ہوتا ہے ادب میں بھی رائج کیا جائے۔ احساس اور شعور کی ماہیت دریافت کی جائے اور ادیب کو سماج سے جو تعلق ہے اُس کو واضح کیا جائے "

اس تمہید کے بعد عبد العلیم صاحب نے ڈاروِن کے اکتشافات کو اُن موثرات سے کہ جنھوں نے انسانی علوم میں ایک عظیم تبدیلی پیدا کی موجودہ ارتقائی عہد کے اُن تمام تقاضوں سے بحث کی ہو جو تحریک ادب پر اثر انداز ہو گئے یا ہو سکتے ہیں۔

اپنے مقالہ میں ڈاکٹر صاحب نے ذہن انسانی اور فطرت انسانی کی نہایت عالمانہ تحلیل کی ہو اور مابعد الطبیعاتی فلسفہ کے ماخذ و منبع اور اس کے موثرات کی نفسیاتی تشریح کر کے نہایت آسانی سے یہ بتانے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ :-

"تجربے سے ماورا اور مادّی مظاہر سے الگ ایک آخری حقیقت کی تلاش نہ صرف تمام ادیان نے کی بلکہ افلاطون سے لے کر آج تک بیشتر فلسفیوں کا بھی یہی مشغلہ رہا ہو اس تلاش نے مختلف صورتیں اختیار کیں اور اس نے مختلف نام پائے۔ مثلاً (Idealism)
ماورائیت (Transcendentalism)
روحانیت (Spiritualism)
تصوّف (Mysticism) اور مظہریت (Phenomenalism)
وغیرہ ان فلسفیانہ مذاہب میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو ایک بات سب میں مشترک ہو۔ ان سب کی نظر میں فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ ظاہری حقیقت کے پیچھے جو باطنی اور اصلی حقیقت ہو اس کو تلاش کرے اس لئے ان سب کو عینیت کا مشترک نام دیا جا سکتا ہو "

اس بنیاد کو استوار کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے روحانی اور مادّی دنیا کے حقیقی تباین کو نہایت قابلیت سے واضح کیا ہو۔ فلسفہ و زندگی کے مابین جو ناقابل عبور خلیج حائل ہو جاتی ہو اور جس کی وجہ سے انسان کی عمولی زندگی، اخلاقی اور سماجی قدروں سے خالی ہو گئی ہے " اس پر روشنی ڈالی ہو عینیت پسندی اور جمالیات کا کیا تعلق اور سلوک ہو اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ :-

" اگر سماجی زندگی یکساں ہو تو حسن کا احساس بھی یکساں ہو گا اور اگر سماجی زندگی مختلف ہو تو اس اختلاف کی نسبت سے حسن کے احساس میں بھی اختلاف ہو گا "

اس کے بعد حسن اور افادہ کے باہمی ربط و تعلق پر بحث کرتے ہوئے وہ اس مرکز تک آئے ہیں جو اصل میں موضوع کی جان ہو یعنی آرٹ اور زندگی کا باہمی ربط،

اس مرکز پر آ کر انھوں نے جمالیات کی خوب خوب تحلیل کی ہو اور پھر آرٹسٹ کے روحانی و مادّی مطالبات سے بحث کرتے ہوئے پڑھنے والوں کی نوعیت، اور ان کے اقسام بیان کئے ہیں۔ آخر میں وہ خود لکھتے ہیں :-

" اس مضمون میں کوشش کی گئی ہو کہ فلسفہ اور جمالیات کی روشنی میں تنقید کے چند ابتدائی اور بنیادی اصول مرتب کئے جائیں جو علمی تحقیق کی کسوٹی پر پورے اُتر سکیں اور جن کو پیش نظر رکھ کر ہمارے ترقی پسند ادیب اپنے کارناموں کا خود مطالعہ کر سکیں "

اس مضمون کے علاوہ

ادب کی غرض و غایت	پریم چند
جدید ادب	ڈاکٹر عبد الحق
ترقی پسند ادب	پروفیسر فیض احمد

یہ تینوں مضامین اپنی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔
نیا ادب کیا ہے ـــــ !؟ اور نئے ادب کو کیا ہونا چاہئے ـــــ !؟

اس نمبر کے مضامین ان سوالات کا واضح اور نہایت مدلل جواب پیش کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نیا ادب کا یہ نمبر ۱۹۴۱ء کا وہ تخلیقی کارنامہ ہے جس کا مقابلہ کسی رسالہ کا خاص نمبر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کوئی خاص نمبر تقلیدی اور دقیانوسی عناصر سے خالی نہیں۔

ادب کی تاریخ حلقۂ ادب لکھنؤ کی اس معرکتہ الآرا خدمت کو کبھی فراموش نہیں کرے گی؛ وہ لوگ جو ادب کے نظریہ کو عام کرنے کے لئے کوشاں ہیں، اصل میں نئی دنیا کے خالق ہیں جنہیں زمانہ عزت و احترام سے یاد کرے گا۔

یہ نمبر حلقۂ ادب لکھنؤ سے بہ آسانی مل سکیگا۔

ساحر

جون نمبر "مکاتیب نمبر" ہوگا۔ اُردو میں اس قسم کی کوئی اچھی کتاب اس وقت تک شائع نہیں ہوئی جس میں ترتیب اور لطیف حواشی کے ساتھ سیاسی علمی ادبی شعری اور فن کارانہ خطوط بہ یک وقت شائع ہوئے ہوں؛ اکثر نامکمل اور ناقص مجموعہ پیش ہوئے ہیں؛ مگر یہ مجموعہ ان سب سے مختلف، مکمل نادر اور مفید ہوگا؛

جس وقت اس مجموعہ کا اعلان کیا گیا تھا اس کی ترتیب کی دقتوں کا اندازہ نہیں تھا؛ اب جو نگاہ ڈالی تو اس کی ترتیب مصیبت نظر آئی پھر یہ سخت موسم، یہ کڑی دھوپ اور یہ حبس، ۲۰ برس کے ذخیرۂ خطوط کی ترتیب کوئی مذاق نہیں لیکن بہرحال اب تو یہ کام کرنا ہی ہے؛ !؟

۸

اس نمبر میں خواتین کے خطوط شائع نہیں ہوں گے، اور جو ہوں گے ان کی کوئی نہ کوئی ادبی و علمی نوعیت ضرور ہوگی؛ یہ باب محض اس لئے حذف کیا جا رہا ہے کہ اسکی اشاعت انتظام چاہتی تھی؛ جب تک اجازت حاصل نہ کی جائے اخلاقی طور پر ان کی اشاعت ذرا اصولی طور پر مناسب نہیں؛ اور اگر کچھ خطوط ایسے نکل آئے، جن کی ندرت اور ادبی حیثیت "ناقابل برداشت" ہوئی تو ان کی اشاعت شاید ناگزیر ہو جائے۔

یہ نمبر کتابی صورت میں ۱۸×۲۲/۸ ایشیا کے نصف سائز پر کم از کم ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا؛ اور اس کی قیمت مع محصول ایک روپیہ ہوگی؛ نہایت بہتر چھپائی، بہتر کاغذ، اور مضبوط جلد، اس پر جدت نواز گرد پوش، غرضکہ یہ اتنی نئی، خوبصورت، اور اعلیٰ درجہ کا مجموعہ ہوگا؛ جس کی مثال شاید دُنیائے ادب میں نہ مل سکے گی؛

ہندوستان کا کوئی مشہور ادیب یا شاعر ایسا نہیں جس کے ایک دو خط اس نمبر میں نہ مل جائیں؛

ارادہ تھا کہ مکتوب نگار حضرات کی تصاویر بھی ہوں، لیکن وقت و سرمایہ کی کمی نے مجبور کر دیا۔ خیر کسی دوسرے موقع پر اس کمی کو ضرور پورا کیا جائیگا۔

خریدار حضرات کو یہ کتاب خریداری کے سلسلے ہی میں پہونچے گی؛ جو صاحب اس نمبر کے دیکھتے ہی ایشیا کے خریدار ہو جائیں گے؛ وہ اس کتاب کو مفت حاصل کر سکینگے

ایجنٹ حضرات اس نوٹ کو پڑھ کر اگر اپنے اپنے آرڈر بک کرا دینگے تو ان کو آسانی ہوگی؛ ورنہ یہ کوئی سالنامہ نہیں ہے کہ سال بھر تک کسی دفتر سے حاصل ہو سکے؛ ایجنٹ صاحبان کو بہرحال عجلت کرنی چاہیئے اور قیمت پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمانی چاہیئے؛ قیمت مع محصول عہ

منیجر

ایشیا مئی ۱۹۴۱ء

نئی صبح

ایشیا

پہلا باب

ادبیات، تاریخ و سیاست

مئی سنہ ۱۹۴۱ء

اُردو علمِ عروض کے نئے قاعدے

(انگریزی میں:- پنڈت برج لال نہرو۔ انگریزی سے ترجمہ:- وشوناتھ ورماہ بی۔ اے)

یہ مضمون پنڈت برج لال صاحب نہرو کے انگریزی مقالے کا ترجمہ ہے۔ پنڈت صاحب نہرو خاندان کے رکن اور پنڈت موتی لال صاحب نہرو کے سگے بھتیجے ہیں۔ آپ اکونٹنٹ جنرل پنجاب کے عہدہ جلیلہ سے پچھلے سال پنشن یاب ہوئے۔ چند ماہ سے ریاست جموں وکشمیر کے اکونٹنٹ جنرل کے رُتبہ عالی پر سرفراز ہیں۔ نہرو صاحب سے تعارف کا شرف مجھے کشمیر ہی میں حاصل ہوا۔ گذشتہ ستمبر میں حضرت ساغر نظامی اور روش صاحب صدیقی بزمِ اردو کے مہمان تھے۔ ان حضرات کی موجودگی ادبی چہل پہل کا موجب تھی، چنانچہ متعدد تقریبات میں آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

ایک تقریب کے موقع پر نہرو صاحب نے اُردو شاعری کے سلسلہ میں علم عروض پر کچھ گفتگو فرمائی جو علم عروض کے سلسلہ میں اجتہادی حیثیت رکھتی تھی۔ تبادلۂ خیال کے بعد معلوم ہوا کہ نہرو صاحب نے اس سلسلہ میں ٹھوس کام کیا ہے۔ میں اُردو زبان کے خدمت گذار کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ نہرو صاحب کے اس اچھوتے مقالہ کو اُردو زبان کے شیدائیوں تک پہنچاؤں۔ میں ہندی کا دشمن نہیں مگر ہندی کی بیٹی اُردو کو ضرور ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

کون نہیں جانتا کہ نہرو خاندان ہندو مسلم اتفاق کا سب سے بڑا حامی ہے۔ معزز ناظرین نہرو صاحب کی اُردو علم عروض کی اس خدمت کو اُسی ہندو مسلم اتحاد کی ایک مضبوط کڑی سمجھیں۔ یہ کھُلی حقیقت ہے کہ نہرو خاندان میں قومیت کا جذبہ انتہائی درجہ پر ہے۔ یہ خاندان تعصبات سے اتنا ہی دور ہے جتنا سورج تاریکی سے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اردو شاعری کی خدمت کا خیال نہرو صاحب کے دل میں آتا ہی کیوں؟!

اُردو علم عروض کے اس آسان ترین حل کے بعد اگر ناظرین کرام کچھ استفسارات نہرو صاحب سے کرنا چاہیں تو براہِ راست خط و کتابت فرمائیں آپ کا پتہ یہ ہے:- پنڈت برج لال صاحب۔ نہرو۔ اکونٹنٹ جنرل (جموں وکشمیر)

(ضروری نوٹ) میں کشمیر میں ہوں اور نہرو صاحب جموں میں۔ اغلب ہے کہ اس مضمون میں بالخصوص اس کے فرہنگ وضمیمہ میں کچھ نقائص رہ گئے ہوں۔ یہ کمی نہرو صاحب رسالہ "ایشیا" کے ذریعہ رفع کر دینگے۔

گو زیر کہ دیوانِ غالب میں تقریباً ۱۹ اوزان کے قریب انھیں مل چکے ہیں۔ اپنے جدید قواعد کے مطابق ان تمام کی تقطیع نہرو صاحب رسالہ ایشیا کی وساطت سے محترم ناظرین تک پہنچا دینگے۔ میں تہ دل سے ساغر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُن کی تحریک سے یہ مضمون اُردو دنیا تک پہنچ رہا ہے۔

وشوناتھ ورماہ بی اے
صدر بزمِ اُردو جموں وکشمیر۔ نہرو بلڈنگس متصل غار بگیڈ سری نگر کشمیر

اُردو علم عروض کے نئے قاعدے

تمہید

(از پنڈت برج لال صاحب نہرو)

اردو شاعری کی تقطیع کے موجودہ قواعد نہایت پیچیدہ ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مبتدی بڑی مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم اصحاب اسے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان سے بھی کم مہارت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

لیکن وہ سائنٹفک بنیاد جس پر میرے دئے ہوئے قواعد کا انحصار ہے۔ اسقدر سادہ اور سریع الفہم ہیں کہ ایک دفعہ ٹھیک طور پر سمجھ لئے جائیں تو تقطیع کے قواعد کو عملی جامہ پہنانا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ معمولی سمجھ کا انسان جسے اُردو شاعری سے اتنی واقفیت ہو کہ اشعار ٹھیک پڑھ سکے یا اُس کے کان شاعری سے کسی قدر آشنا ہوں یا اتنا بتا سکے کہ شعر میں سکتہ ہے یا نہیں۔ ان قواعد کو ہفتہ دس دن کے قلیل عرصہ میں روزانہ ایک آدھ گھنٹے کی مشق سے بخوبی سیکھ سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ اس سے بھی کم عرصہ کی ضرورت ہے۔ بشرطیکہ دل میں ذوق تحصیل ہو۔ عربی علم عروض اگر کچھ کچھ سکھایا بھی جاتا ہے۔ تو یونیورسٹیوں کی اونچی جماعتوں میں۔ یہ امر بجائے خود اس صداقت کا بدیہی ثبوت ہے علم عروض کو بہت مشکل مضمون سمجھا جاتا ہے۔ میری رائے ہے کہ ان قواعد کو کہ جو میں اس مختصر سے مضمون میں بہم پہنچا رہا ہوں۔ دسویں جماعت کا اوسط درجے کا طالب علم اچھی طرح سیکھ سکتا ہے۔ مجھے یہ حقیقت صاف صاف نظر آتی ہے کہ یہ قواعد نہایت آسانی سے قابل عمل ہیں۔ نہ صرف شاعری کے دلدادہ اصحاب کے لئے مفید ہیں بلکہ اُردو زباندانی کی ارتقا کے لئے ازبس فائدہ مند ہیں۔

شاید یہ کہنا بھی مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ ان قواعد کو عمل میں لانا اُردو زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔

قواعد

(نوٹ، عربی اور فارسی کے تمام اوزان پر نیز اُردو علم عروض کے بھی اُن تمام وزنوں پر (کیونکہ عربی علم عروض کے ماتحت ہیں) یہ قواعد حاوی ہیں۔ لیکن ہندی شاعری پر ان کا اطلاق نہیں نہ اُن اُردو اشعار پر جن کا وزن ہندی بحروں سے تعلق رکھتا ہے۔

تقطیع کی بنیاد اصل میں صرف ایک بات پر انحصار رکھتی ہے کہ syllable میں vowel کا لمبا ہے یا چھوٹا syllable ٹھیک طور پر جدا کئے جائیں اور vowel کا ٹھیک ٹھیک معلوم کئے جائیں تو تقطیع کا اصل کام ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد مختلف ارکان میں مصرعے کی تقسیم اور ارکان کو صحیح نام دینا (فرہنگ کی مدد سے) نہایت آسان کام ہے۔

ارکان کے نام مثلاً فاعلاتن۔ مفاعیلن۔ فعولن وغیرہ عربی علم عروض سے لے رہا ہوں۔ ہر ایک syllable میں vowel کا اتنا لمبا ہے جتنا رکن کے ہر ایک ویسے ہی syllables میں اسے وضاحت سے بیان کرتا ہوں۔ اگر اُفقی خط یعنی ـــ لمبے syllable کو ظاہر کرے اور عمودی خط ا چھوٹے syllables کو تو۔

(الف) رُکن فاعلاتن۔ یعنی فا۔ ع۔ لا۔ تن ـ ـ ا ـ ـ

(ب) رُکن مفاعیلن۔ یعنی مَ۔ فا۔ عی۔ لن ا ـ ـ ـ

یعنے فاعلاتن میں "فا" اور "لا" کے vowel لمبے ہیں۔ اسی طرح (ب) یعنی مفاعیلن میں "فا" اور "عی"۔۔۔ فاعلاتن میں "ع" چھوٹا ہے اور "مفاعیلن" میں "عی" لمبا۔

اب ایک خاص قاعدہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں (فاعلاتن) میں "تن"

(د) مفاعیلن میں "لُن" کو لمبے Syllables دکھایا گیا ہے۔ حالانکہ
ن میں Vowels چھوٹے ہیں۔ یہ قاعدہ بخوبی ذہن نشین کرنا چاہیے۔
قاعدہ۔ چھوٹے Vowel والے Syllables کے آخر میں اگر
Consonant ہو تو Syllable لمبا مانا جائے گا۔
ب۔ "تُن" اور "لُن" خط "——" یعنی لمبے Sy-
llable کے۔

اسی طرح اگر لمبے Syllable کے بعد Consonant آئے
پہلا Syllable بوجہ لمبے Vowel کے، تو لمبا ہوگا
لن اس کے بعد کا Consonant چھوٹے یعنی عمودی خط "۱" سے ظاہر
ا جانا چاہیے۔ مثلاً فاعلاتان میں "تان" ء "
اب مجموعی طور پر قواعد کو یکجا کیا جاتا ہے تاکہ مبتدی کے لئے انہیں
ل میں لانا آسان ہو جائے۔

(۱) مصرعہ کو Syllables میں تقسیم کیا جائے۔ یعنے
یسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں جن میں ایک Vowel سے زیادہ نہ ہو
س امر کا خاص لحاظ رکھنا چاہیے کہ Vowel آواز پر منحصر ہے نہ
، ہجوں پر۔

(نوٹ) یہ بھی خیال رکھیں کہ کسی Syllable کے آخر میں
Consonant نہ آئے جب تک کان اس حقیقت کو ظاہر نہ کریں کہ
یسا کرنا اشد ضروری ہے۔

(۲) یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ Syllable میں Vowel
با ہے یا چھوٹا۔ Syllable میں آواز کا لحاظ رکھا جائے یعنے ہجے
کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ دو مختلف مصرعوں میں ایک ہی لفظ میں
Vowel کا تلفظ لمبا یا چھوٹا ہو سکتا ہے مثلاً:

عمر بھر کا تونے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

(۳) الف۔ اگر Syllable کے خاتمہ پر Consonant نہ ہو تو
Syllable لمبا (——) یا چھوٹا (۱)
Vowel کے لمبے یا چھوٹے ہونے کے لحاظ سے ہوگا۔
(ب) اگر Syllable کے خاتمہ پر Consonant
نہ ہو Vowel چھوٹا ہے تو Vowel لمبا ہے۔

ہو اور اس میں Vowel چھوٹا ہو تب
بھی Syllable لمبا سمجھا جائیگا۔ یعنے (——) خط ہوگا۔
(ج) اگر Syllable کے خاتمہ پر Consonant ہو لیکن
Syllable کا Vowel لمبا ہو۔ تو پہلے نشان لمبا یعنے ——
اور آخری Consonant کا نشان چھوٹا "۱" ہوگا یعنے پورا نشان
"—۱" ہوگا۔

(۴) شعر کے ایک مصرعہ کو Syllables میں تقسیم کرنے کے بعد جو
نتیجہ نکلے اس کی دوسرے مصرعے سے مطابقت دیکھ لینی چاہیے۔ اگر
دونوں مصرعوں میں موافقت ہو تو تقطیع ٹھیک ہے۔

(۵) اس طرح مصرعہ آسانی سے ارکان میں تقسیم ہو جائیگا۔
(نوٹ) اردو شاعری میں عربی علم عروض کے جو ارکان عام استعمال میں
ہیں، فرہنگ میں دے گئے ہیں۔ ایک رکن دو Syllables سے لیکر
پانچ Syllables تک ہو سکتا ہے۔ چونکہ ارکان کی تقسیم غیر مستقل سی ہے
اس لئے کوئی سائنٹفک اصول نہیں دیا جا سکتا۔ چند عملی اشارے اس
تقسیم میں مدد دینگے۔ بحور یا اوزان کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ اس لئے
پیچیدہ مشکلات اس راستہ میں حائل نہیں۔

۴۷

(۶) الف۔ جب تقسیم مکمل ہو جائے تو ارکان کے ناموں کو فرہنگ سے
پختہ کر لینا چاہیے۔ اس طرح تقطیع کا تمام کام مکمل ہو جائیگا۔
(ب) ہر ایک رکن کے بعد ایک لمبا عمودی خط ڈال دینا چاہیئے۔ اس
سلسلہ میں اگر ترتیب ارکان ایک جیسی نظر آئے تو عمل نہایت آسان ہوگا۔
مثلاً مصرعہ:

ظہورِ ذاتِ حق سے ہوگئے سب اِنس و جاں پیدا

ظ ہُو رِ ذا	تِ حق سے ہو	گ ئے سب اِن	سُ وُ جاں پے دا
۱ — — —	۱ — — —	۱ — — —	۱ — — —
مَ فا عی لُن	مَ فا عی لُن	مَ فا عی لُن	مَ فا عی لُن
مفاعیلن	مفاعیلن	مفاعیلن	مفاعیلن

(ج) رکن مفعول (مف۔ عُو۔ ل — — ۱) بحر کے شروع میں ہی
پایا جاتا ہے۔ اگر تجزیہ کرتے وقت شروع میں ہی یہ Syllables یعنی
"—۱" آ جائیں تو ان کے بعد فوراً لمبا خط کھینچ دینا چاہیئے۔

ایشیا مئی ۱۹۳۵ء

(بحر: مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) کیونکہ اس کے بعد اُسی رکن میں چوتھا syllable نہیں ملے گا۔ باقی syllables جہاں تک ممکن ہو چار چار syllables کے ارکان میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ یہ ممکن ہے کہ آخر میں دو یا تین syllables والا رکن باقی رہ جائے۔

مندرجۂ بالا قواعد میں خفیف سے اختلاف ہو سکتے ہیں۔

(الف) مصرعہ کے آخری رکن میں کبھی کبھی ایک چھوٹا syllable زیادہ کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً:-

فاعلن -ا- کے بجائے فاعلات -ا-ا

مستفعلن - -ا- کے بجائے مستفعلاتان

فاعلاتن -ا- - کے بجائے فاعلاتان -ا- - ا

(ب) جب ایک شعر کے ایک یا دونوں مصرعوں کے آخری رکن میں دو لمبے syllables آئیں تو آخری syllables کے پہلے لمبے syllables کی جگہ دو چھوٹے syllables لائے جا سکتے ہیں

مثلاً فعلن (فع لن = - -) کی جگہ فعلن (ف ع لن = اا-)

(ج) جب اوپر کے دونوں قاعدے اکٹھے استعمال کئے جائیں

تو فع لن یعنی - -) فَ عِ لات (اا-ا) میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

مفصلہ ذیل ارکان تمثیلاً دئے جاتے ہیں

خط — لمبا اور خط ا چھوٹا

(۱) مفاعیلن = مَ - فا - عی - لن = ا- - -

(۲) مفاعیل = مَ - فا - عی - ل = ا- - ا

(۳) مفاعِلن = مَ - فا - عِ - لن = ا-ا-

(۴) فعولن = فَ - عو - لن = ا- -

(۵) فعول = فَ - عو - ل = ا-ا

(۶) فعو = فَ - عو = ا-

(۷) مفاعلاتن = مَ - فا - عِ - لا - تن = ا-ا- -

(۸) فاعلاتن = فا - عِ - لا - تن = -ا- -

(۹) فاعلات = فا - عِ - لا - ت = -ا-ا

(۱۰) فاعلن = فا - عِ - لن = -ا-

(۱۱) فعِلن = فَ - عِ - لن = اا-

(۱۲) فعلن = فع - لن = - -

(۱۳) مفعول = مف - عو - ل = - -ا

(۱۴) مفعولن = مف - عو - لن = - - -

(۱۵) مفعولات = مف - عو - لا - ت = - - -ا

(۱۶) مستفعلن = مُس - تف - عِ - لن = - -ا-

(۱۷) مفتعلن = مف - تَ - عِ - لن = -اا-

(۱۸) متفاعلن = مُ - تَ - فا - عِ - لن = اا-ا-

چند مثالیں

(نوٹ) مصرعہ کو پہلے ایک ایک syllable میں تقسیم کیا جائے اس کے بعد ارکان نکالے جائیں۔

(۱) خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خودی کو کر	بلندا تنا	کہ ہر تق دی	رسے پہ لے
ا — — —	ا — — —	ا — — —	ا — — —
مفا عی لن	مفا عی لن	مفا عی لن	مفا عی لن

(۲) وگرنہ پیلے بود در سیستاں

و گر نہ	پی لے بو	د در سی	ستا ں
ا — —	ا — —	ا — —	ا — —
فعو لن	فعو لن	فعو لن	فعو لن

(۳) پلا دے لے ساقی حقیقت وہ مے کہ اٹھوں نہ حشر کو بھی

پلا دے اے سا	قیٔ حقی قت	وہ مے کہ اٹھوں	نہ حشر کو بھی
ا-ا — —	ا-ا — —	ا-ا — —	ا-ا — —
مفاعلاتن	مفاعلاتن	مفاعلاتن	مفاعلاتن

(۴) نہ مکاں ترا ہے لامکاں تو عیاں بھی ہو کے رہا نہاں

نہ مکان تے	را ہے لامکاں	تو عیان بھی ہو	کے رہا نہاں
اا-ا-	اا-ا-	اا-ا-	اا-ا-
متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن	متفاعلن

ہندی ادب میں تصوّف

ہماری تمام تر تہذیب روحانی رہی ہے۔ ہمیشہ سے روح کی شکتی۔ تزکیۂ نفس، زندگی میں کمال اور ارتقائے روحانی کے عرفان کیلئے مادّی دنیا کے مخصوص (...ces) کی بہ نسبت اپنی روح کی عظمت ہی کو ہم نے زیادہ بلند خیال کیا ہے۔

اس ذہنیت نے ہمیں انسان، انسان، اور نسلِ آدم اور قدرت کے مابین، اور عالم کے مختلف شعبوں میں یکسانیت کی جستجو کا سبق دیا ہے۔ ہمیں دُکھ میں سُکھ اور سُکھ میں دُکھ، نامکمل کو مکمل اور بیرونی اختلاف میں اندرونی یکسانیت کے مشاہدہ کی نظر بخشی ہے۔ جب تک یہ نظر نہیں ملتی ہمیں زندگی میں سکون حاصل نہیں ہوتا۔ ہماری پیاسی روح کی پیاس نہیں بجھتی۔

ہماری اختراعات بھی زیادہ تر روحانی دنیا ہی سے تعلق رکھتی ہیں گرمی، روشنی، بجلی اور ایسی ہی طاقتوں کی یکسانیت دکھاکر (Conservation of energy) کے اصول کے ذریعہ موجودہ سائنس مادّیت کی جس حد تک پہونچی ہے، ہم اس سے کہیں آگے بڑھ سکے ہیں۔ ہم نے ان طاقتوں کے حصول۔ روح اور خدا کی یکتائی کی تلاش کی اور اُسے ثابت بھی کر دیا۔ اور اُس کے ذریعہ فلسفے کے مختلف شعبوں کا ظہور ہوا، لیکن صرف فلسفہ ہی ہمیں وہ روحِ تکمیل عطا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے ہم نے صرف ذہنی طاقتوں پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے تجربات اور حقائق کی وسیع دنیا میں بھی جستجو کی جو فلسفہ کے خشک ریگستان میں نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ رُوحِ تکمیل جس کی ہمیں تلاش تھی ہمیں شاعری کی (Fountain) میں ملی اور جس صورت میں ملی اُسے ہم "رہسواد" کہتے ہیں۔ جس کی دھندلی اور (Mysticism ...) ہیئت کی وجہ سے؛

شاعری، لطیف احساسات و جذبات سے بھرے اس تصوّف کا ایک فلسفیانہ پس منظر بھی ہے۔ رُوح، قدرت، اور خدا کے مابین رشتے کی بنیاد "رہسواد" کا موضوع جو یکتائی ہے۔ اس کی ابتدائی شکل توحید" کی شکل میں ظاہر ہوئی؛

"Formerly it was propounded that Soul, Nature and God is all one – but latter it was made out they exist separately but are inter dependant."

دراصل ترک (بھکت، اور گیان (عرفان) کے سہارے شاعر جو "ادوئیتہ واد" (توحید) پیش کرتا ہے۔ اسی کو تخیل اور جذبات کا سہارا لے کر اپنے تجربات کی بنیاد پر بیان کرتا ہے اسی بیان کو "رہسواد" کہتے ہیں۔

اسی لئے "رہسواد" فلسفیانہ یعنی اصطلاحی توحید سے بلند ہے شاعری کی دنیا میں جسے ہم "رہسواد" کہتے ہیں اُسے کبیر نے سب سے پہلے دنیا کے سامنے پیش کیا اس لئے کبیر ہی ہندی کے سب سے پہلے "رہسوادی" (صوفی) شاعر ہیں۔ کبیر نے اپنشیدوں کی (... Dimensi...) میں خدا کو انسان اور قدرت کو عورت کے روپ میں پیش کیا ہے اور اس طرح لطیف جذبات یا جنسی محبت کے احساسات کو روشناس کر کے شعر میں رہسواد کو جنم دیا ہے۔

کیونکہ شیام سندر داس کے الفاظ میں "رہسواد" ۔ لطیف خیالات کا جذباتی پرتو ہے، جس میں خدا کو محبوب کی شکل میں دکھلایا اور فطرت کو عورت کے روپ میں دیکھا جاتا ہے" (کبیر گرنتھاولی صفحہ نمبر ۵۰)

کبیر نے بھی اُس محبوب کی بارگاہ میں رُوح کو عورت ہی فرض کیا ہے

لالی میرے لال کی جت دیکھوں تت لال
لالی دیکھن میں گئی، میں بھی ہو گئی لال

یا

"پیا ملن جب ہو گیا آگن بھیا بدیس

یا

کہیں کبیرا بیاہی جیہیں ہیں پُرش اک اَوناشی

اس آخری مصرع میں ہم "سانکھیہ درشن" کا اثر پاتے ہیں، شاعر کے روحانی درد کی شدت بھی کم نہیں، اس کے لئے محبوب کی جدائی ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے ؎

کے برہن کے میچ دے کے آپا دکھلائے
آٹھ پہر کا دا جھنا مو پئے سہا نہ جائے

وہ اپنے پیا کے درشن کیلئے سب کچھ کر سکتا ہے ؎

ہو ایسے ہی تن کا دیو لا کروں بالی، میں لوں جیو
لوہو سینچوں تیل جیوں، کب مکھ دیکھوں پیو

اس کی مثال "عودی لکڑی" کی سی ہے ع

ہن عودی لاکڑی سب چلے رود ہند آئے

لیکن یہ حالت اس کے سوا اور کون جانتا ہے۔ ع

"ہرشے بہتر دری۔ جلنے دہوان پہ مرگھٹ ہوئے،
جالکے لاگی سو لکھے کی جن لائی سوئے

تاہم شاعر کو اپنے اس درد سے محبت ہے۔ وہ فراق کی قیمت جانتا ہے ؎

براہ براہ مت کہو براہ ہے سلطان
جا گھٹ براہ نہ سنچرے سو گھٹ جان مسان

کبیر کو اپنے محبوب کا وصل نصیب نہیں ہوتا؛ شاید محبوب نے فراموش کر دیا ہو اسلئے شاعر اُسے یاد دلاتا ہے ؎

سُرتی کرو مرے سائیاں، ہم ہیں بھو جل ماہیں
ہم سے تم سے بہت ہیں، تم سے ہمرے ناہیں

کبیر اپنے محبوب کو "رام" کے نام سے بھی پکارتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے .... کہ اس کے "رام" دشرت کے بیٹے رام نہیں ہیں۔ اس کا "رام" "ہمہ اوست" Absolute، پرماتما کا دوسرا نام ہے ؎

نرگن، نرنکار کے پار پر برہم ہے
تا سو کو نام انکار جبانی

روپ بن، ریکھ بن، نگم استوتی کرے
سنت کو راہ ان کت کہانی

کبیر کا رام، کبیر کا محبوب خارجی شئے نہیں، اک داخلی وجود ہے، وہ تو دل کے اندر ہی رہتا ہے۔ اس کے لئے بیکار بھٹکتے پھرنے کی کیا ضرورت ہے!؟ ؎

تیرا سائیں تجھ میں، جیون پھوہ پن میں واس
کستوری کا مرگ جیوں، پھر پھر ڈھونڈے گھاس

ریکھ روپ جیہی ہے نہیں، ادھر دھر د نہیں وہ
گگن منڈل کے مدھیہ میں رہتا پرش وہ دے

Shapeless درمیان

کبیر اس کے حاصل کرنے کے ذریعوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے "پلکوں کی چک ڈاری کے" کہ "مراقبہ" کے عالم ہی میں محبوب کو اپنایا جا سکتا ہے۔

آئیے، کبیر کے "راہسواد" پر ذرا گہری نظر ڈالیں؛ کبیر کی شاعری میں سنجیدہ ترتیب اور فلسفیانہ حقائق کی تصویر ہوتے ہوئے بھی زیادہ تر اُن کی شاعری فلسفہ کے بار سے اس درجہ دبی ہوئی ہے کہ اُن کے کلام میں جذبات کی وہ بلندی نہ آسکی جو ان کے عہد سے آگے نظر آتی ہے۔ شریمتی مہادیوی ورما کے الفاظ میں "یوگ کا راہسواد اعضائے جسم کو پوری طور سے قابو میں کر کے کچھ خاص ذریعوں اور ریاضت کے سہارے روح کا اتنا بلند ہو جانا ہے جہاں وہ "شدھ چیتن" (وصلِ حقیقی) حاصل کر لے۔

— ایشیا مئی سنہ ۱۹۶۶ء

"یوگ کی ریاضت سے لبریز، کبیر کا رہسواد، اور آتما اور پرآتما کے انسانی رشتۂ محبت کی وجہ "دلیشنو دور" کے سب سے بلند مرتبہ تک پہنچی ہوئی "محبت"، دو مختلف چیزیں ہیں۔

تصوف سے بھرے ہوئے کبیر کے دوہے اور چند ہمارے دل کو چھو کر سیدھے دماغ سے ٹکراتے ہیں۔ ان کی شاعری میں زیادہ تر کبیر کے خیالات گونج اٹھتے ہیں، جذبات نہیں، جو گیت کی روح ہیں۔"

(سانہیہ گیت کا دیباچہ)

ان وجوہ کی بنا پر ہم کبیر کو بلند رہسوادی (متصوف) شاعر نہیں کہہ سکتے کیونکہ کبیر میں وہ غنائیت اور مکمل طور پر وہ شگفتہ دلکشی نہیں جو رہسوادی (متصوف) شاعری کی جان ہے۔ میرا میں محبت کا درد اپنی انتہا کو پہونچا ہوا ہے۔

ع۔ "ہیلی میں تو پریم دوانی ری"

وہ اپنی محبت کی مستی میں کہہ اٹھتی ہے۔ لیکن کبیر کے خلاف اسکی پوجا مرتی خدا کی تھی وہ کہتی ہے کہ ع۔

"میرے تو گردھر گوپال دوسرا نا کوئی"

اور یہ گردھر گوپال، نند کے گھر میں رہنے والے، راس ناچنے والے، کنہیا ہی تھے، اس لئے ہم میرا کو رہسوادیوں (متصوفین) کے گروہ میں نہیں رکھ سکتے۔

کبیر کے بعد نرم و شیریں جذبات سے بھرے رہسواد کے تدریجی ارتقا میں اگر کسی کو جگہ دی جاسکتی ہے تو وہ محبت کی راہ میں چلنے والے صوفی شاعروں کو۔ کبیر کا رہسواد، آدرد ([illegible])، تھا لیکن جائسی وغیرہ صوفی شعرا کے رہسواد میں جذبات کی خوبی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں یوگ کی ریاضت نہیں ہے صرف محبت کی جھلک ہے۔ روح اور خدا کے مابین اس محبت کے رشتہ کو شعرا نے دنیاوی افسانوں کے روپ میں پیش کیا اور ان کو خاص طرز میں ڈھالا، ان ہندوستانی محبت کے راہگیر رہسوادی (متصوفین) شعرا پر ہندوستانی فلسفہ اور صوفی مت کے عشق دونوں باتوں کا اثر پڑا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری دونوں طرح کے اثر سے رنگی ہوئی ہے، اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ ان رومانی شاعروں کو بھی صوفی منش شعرا کی طرح "اللہ بھی مجنوں کو لیلیٰ نظر آتا ہے" کے مصداق ان کا محبوب، پرآتما نظر آیا یا ہندوستانی روایات کے مطابق خدا کو عاشق اور بھگت کو محبوبہ کا روپ دیا ہے۔ تو اس بات کی صداقت اور بھی واضح ہو جائے گی۔ کیونکہ ان افسانوں کے پڑھنے سے دونوں قسم کے جوابات ([illegible]) کئے جاسکیں گے۔ ان افسانوں میں محض محبوبہ (پریمکا) ہی اپنے عاشق (پریمی) کے پریم میں بے چین دکھائی گئی ہے۔ بلکہ پریمی بھی "محبت کی جھلک" میں ڈوب کر یوگی بنتا اور اپنی پریمکا کی تلاش میں شہروں شہروں اور جنگل جنگل خاک چھانا کرتا ہے۔

منجھن کی تصنیف "مدھومالتی" کی کتھا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب منوہر کو حوریں راجکماری مدھومالتی کی خواب گاہ میں رکھ آتی ہیں اور دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو منوہر کہتا ہے:۔

"میرا ان راگ محبت تمہارے اوپر کئی جنموں کا ہے"

اور جدا ہونے کے بعد دونوں ہی براہ کی آگ میں جلتے اور محبت کے درد سے بے کل ہوتے ہیں۔ منوہر کا مندرجہ بالا قول یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ محبت اک، ابدی اور لافانی جذبہ ہے جس سے (Divine Love) کی رنگا رنگی کا عکس ظاہر ہوتا ہے۔

موجودہ رہسوادی شعرا نے بھی یادِ ماضی سے انھیں تعبیرات کا کام لیا ہے۔

استمرتیاں جنم جنم کی کھلتی تھی شناولی بنیں (یادیں)

(نبشاکھ، پرشاد)

شری رامچندر شکل کہتے ہیں کہ:۔

"صوفیوں کے تصور کے مطابق تمام دنیا محبت کے ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہے۔ جس کا سہارا لے کر روح اس "رہس" سے بھری پریم مورتی تک پہونچ سکتی ہے۔ تمام عالم تشکیل میں اس کا چھپا ہوا جلوہ ہے۔ خدا کی جدائی بھی ان صوفی شعرا کی میراث قرار دی گئی ہے۔"

وپراہ اودھی اوگاہ اپارا

(جدائی بہت گہرا اور اتھاہ ساگر ہے)

دیراہ کی جگت ادھتا جاہیں
دہراہ روپ یہ سرشٹی سبھا ہیں
(مدھو مالتی)

پدماوت میں بھی محبت کی چسک اور اس کے حصول کیلئے جو مشکلات پیش ہیں اس کی مکمل تصویر اور پوری نظم میں اک صندلی فنکارانہ جاذبیت اور دلکشی موجود ہے۔ نظم کے آخری بند ملاحظہ ہوں۔

"تن جیت اُرمن راجا کی ناہ　　یہ سنگل بدہی پدمنی جی ناہ
گردشو آج ہے بنیتہ دکھاوا　　بن گرد جگت کو ہر گن باوا
ناگھ متی یہ دنیا دہندا　　بانچا سوئی نہیں چیت باندہا
راگھو دوت سوئی ستیانو　　مایا علاؤ دین سلطانو

رام کمار ورما کے الفاظ میں تمام کہانی کا لیس منظر صوفیانہ اصول ہیں۔ لیکن جائسی اس روحانیت کو تکمیل کے ساتھ نہیں نباہ سکے۔ کہانی کے بہت بڑے ہونے سے جگہ جگہ عیاشی کا بیان اور کہانی کی روانی میں روحانیت کی دبی ہوئی سی لہر گم ہو کر رہ گئی۔

یہ اعتراض اس لئے وزن رکھتا ہے کہ حقیقی رہسوادی شاعری کا اصلی روپ گیتی گاؤ ہی میں مکمل لطافت کیساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ رہسواد روح کے احساس کی چیز ہے۔ ذاتی زندگی کے تجربوں کا موضوع ہے۔ اس لئے اُسے پربندھ گاؤ کی شکل دینے میں اس کی حقیقی صورت منتشر ہو جانے کی ہمیشہ ذمہ داری رہیگی۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رہسواد کا پورا (Evolution) گیتی گاؤ یعنی عشقیہ شاعری کے اس دور ہی میں ممکن ہوا ہے۔

البتہ جہاں شخصی (Description) کی باتیں ہیں ان مقامات پر جائسی کے قلم سے بھی رہسواد کی اصلی شکل ظاہر ہوئی ہے۔ پدمنی کے حسن و جمال کے بیان ہی میں دیکھئے کہ اس لامحدود حسن کی طرف جس کے فراق میں کل کائنات بے کل ہے نہایت لطیف اشارے ہیں جیسے۔

بھون کا بیان

بَرُونی کا بَرنون امی بانی　　سادہے بان جانو دوئی آنی
ان بانن اُسّ کو جن مارا　　بیدہ رہا سگرو سنسارا

سگرو سنسارا" غور کیا جائے تو ان الفاظ کی اپنی علیحدہ ایک انفرادیت اور اہمیت ہے اور بھی سُنئیے

بَرُنی بان اَس ادپھاں، بیدہے ٹلن بن ڈہانک
سُو جیس تن سب روآن بنکھی تن سب بھانک

لیکن دیکھئے کسی خاص آدمی کا کردار دکھانا، کا ایسا بیان "پدماوت" یا دوسری نظموں میں کم ہی ہے زیادہ تر رزمیہ ہی پایا جاتا ہے۔

اس لئے یہ نظم بھی حقیقی تصوف کی اعلیٰ مثال نہیں کہی جا سکتی ہاں اس میں رہسواد ضرور ہے۔ اور معیاری ہے۔

حقیقی اور پایۂ تکمیل کو پہونچا ہوا رہسواد، یعنی نکھرے ہوئے تصوف کا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہندی کے نوجوان شعراء نے دروازے پر کھڑے ہوئے نئے زمانے کی پکار سنی۔

اس پکار نے اور ترقی پسندی کی ہوا نے ان کی نیند میں ڈوبی ہوئی پلکیں کھول دیں۔ بنگلہ ادب میں ٹیگور کی رہسوادی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ ادہر انگریزی تعلیم کے پرچار نے اور (Romanticism) ورڈزورتھ جیسے رومانی شعراء کی تصانیف نے ایک نیا دروازہ ہندوستانی شعراء کے لئے کھول دیا۔

ہندی شاعری میں جدید دور کا بلند تصوف (رہسواد) انھیں کی شاعری کے اثر سے پیدا ہوا۔

بنیاد پرانی ہی رہی لیکن اس پرانی بنیاد پر شاعری کا ایک نیا رنگ محل تعمیر کیا گیا۔ وہی (اادوَیتہ وادی) موحدانہ اصول وہی فلسفہ، وہی محبت کا درد نئے طرز سے نئے روپ میں سجا کر رکھے گئے۔

کبیر مبلغ تھے۔ ان کے رہسواد میں بدھی واد کی آمیزش تھی۔ صوفی شاعر تھے مگر Epic Poetry کے لکھنے والے تھے اور کہیں کہیں ان کی شاعری میں رہسواد جیسے ضرور

رزمیہ Epic　　(عشق) Lyric

ایشیا مئی سنہ ۱۹۶۱ء

ملتے ہیں، لیکن آج کی رہسوادی شاعری غنائی ہوگئی ہے۔ اس میں آورد نہیں، بلکہ جذبات اور احساسات کی جھلک ہے لطیف اور سرس لی خیالات آزادی کیساتھ غنائی شاعری میں بیساختہ بیان کئے گئے ہیں۔

آج بھی جدائی کا درد ہے۔ آج بھی محبت کی کسک ہے۔ لیکن اسکی خلش دل میں گھر کر لینے والی ہے۔ آج کا شاعر صدیوں کی غزل پار کرکے بلندی کے اُس درخشاں مرکز پر پہونچ گیا ہے جہاں جدائی اس قدر شاق ہو جاتی ہے کہ ہجر و وصال کے امتیاز کا احساس تک جاتا رہتا ہے روشنی کی زیادتی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ جدائی کی حد بھی تو وصال ہی بدل جاتی ہے۔ شری مہادیوی ورما جو خود موجودہ دور کی (مصوّر درد، رہسوادی شاعرہ ہیں۔ خود اپنی شاعری کے بارے میں کہتی ہیں۔ "نیرجا" اور "ساندھیہ گیت" میری اس دماغی حالت کو ظاہر کرسکیں گے جسمیں خود میرا دل دُکھ سُکھ کے (synthesis) کا احساس کرنے لگا ہے .... آخر میں اب میرے من میں نہ جانے کیسے باطن و ظاہر میں ایک (synthesis) سی ڈھونڈ لی ہے کہ ایک کے (clear feeling) کے ساتھ دوسرے کی دُھندلی سی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے:"

آج کا شاعر سُکھ اور دُکھ دونوں کو یکساں چاہتا ہے۔

جگ پیڑت ہے اتی سُکھ سے
جگ پیڑت ہے اتی دُکھ سے
جیون میں ہل مل جاویں
سُکھ دُکھ سے، دُکھ سُکھ سے
(پنت)

سُکھ دُکھ میں یکسانیت ہی تو کامیاب زندگی کی دلیل ہے۔ یہی تو رُوح کی پیاس بجھانے کیلئے امرت کی ایک بوند ہے۔

انسان جسے صدیوں سے ڈھونڈ رہا تھا وہ آج دنیائے شاعری میں رہسواد کی شکل میں حاصل ہوگیا۔ مہادیوی ہی کے الفاظ میں آج گیت میں ہم جسے رہسواد کے روپ میں حاصل کر رہے ہیں۔ اُس نے ([illegible]) کی روحانیت لی۔ ویدانت سے عکس لیا۔ دنیاوی محبت سے شدت مستعار لی۔ اور ان سب کو کبیر کی اشارتاً جنسی محبت کے ڈورے میں پروکر ایک نرالی محبت کو جنم دیا۔ جو انسان کے دل کو پوری تسلّی بخش سکا۔ اُسے دنیاوی محبت سے بلند کرسکا۔ دماغ کو دل، اور دل کو دماغ بنا سکا"۔ مثال کے طور پر انھیں کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اطمینان:- ایک کروں ابھاؤ میں چرترپتی کا سنسار
ایک گھونٹ میں نے پا نروان کے وردان

"دیا لیا میں نے کسے اس ویدنا کے مدھر کرنے میں
کون تم میرے ہردے میں"

یا:-

"بین بھی ہوں میں تمہاری، راگنی بھی ہوں
لے سدا دور ہوں تم سے اکھنڈ سہاگنی بھی ہوں
تار بھی آگھات بھی، جھنکار کی گتی بھی
پاتر بھی، مدھو بھی، مدھپ بھی
مدھر وسمرتی بھی
ادھر بھی ہوں اور اسمتی مسکراتی چاندنی بھی ہوں"

رائے کرشن داس "نیرجا" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعرہ کی آتما مانو اس دُنیا سے بچھڑی ہوئی محبوبہ کی طرح خود کو یاد کرتی ہے۔ اس کی نظر سے دنیا کی ساری قدرتی رعنائی و ہرنائی ایک لامحدود اور (sublime) حسن کی جھلک ہے۔ اس دُنیا کو دیکھ کر شاعرہ کا دل اُس کی لطیف جھلکیوں کے لئے للک اٹھتا ہے ..... اُس ایک کی یاد اور تصوّر کی بے چینی ہی مہادیوی جی کی جان ہے۔ دیکھئے اُس (sublime) حسن کی ایک بے مثال تصویر:-

لے گیت مدر گتی تال امر
اپسرا تیرا نرتن سندر
آلوک غیرت اُست چیر (سفید اور کالا)
ساگر گرجن رن جھن مجیر
اُڑتا جھنجھا میں الک جال

(پیدا کیا ہوا) سیکھوں میں نکھرے کن کن شر
(سورج اور چاند) رویّ ش ترے اوشش لول (سُندر)
سی منت جنٹ تارک امول
چیلا وو برہم اتی اندر دھنش
(آنسو) ہم کرن بن جھرے سو یدُ نکر (پسینہ)
اسپری ترا نرتم سندرا"

اگر ایسی لامحدود جھلک کے درشن کی بے کلی سے شاعر کی روح بیچین ہو کر کہہ اٹھے :-

نِردَد یہ جھنجھ بس بھی دیکھ لو اُس اُور کیسا ہے ؟
جارہے جس پنتھ سے یگ کلپ اُس کا چھور کیا ہے !
کیوں مجھے پراچیر بن کر
(سانس) آج میرے شواس گھیرے
(ساندھیہ گیت)

تو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ اور اس کے پانے کیلئے جتنی بھی تکلیف اٹھانا پڑے کم ہے۔ محبت کی راہ میں کانٹے بھی پھول بن جائیں گے۔

بریئے پتھ کے پر شول مجھے اتی پیارے ہی ہیں (کانٹے)
چل جو الا کے دیش جہاں انگارے ہی ہیں

شاعرہ کا دل دکھوں سے گھبراتا نہیں۔ جدائی کا اُسے خوف نہیں بلکہ اسمیں اتنی ہمت ہے کہ وہ کہتی ہے ؎

وِرہ کی گھڑیاں ہوئیں الی (بھنورا)
مدھر مدھو کی یامنی سی (رات)

بندھن بھی اُسے پیارا ہے :-

کیوں مجھے پریئے ہو بندھن
انتر کی ٹیل پر کر رہا اب وِ سویم نج (پردہ) (پیار)
چتر انکن
(تصویر بنانا)

لیکن یہ تو جدید رہسواد کی ایک شکل ہوئی کیونکہ ہماری شاعری مختلف روپوں میں پھلی پھولی ہے۔ گو کہ چیز ایک ہی ہے۔ دھارا وہی ہے۔

(Bent of minds) ایک سے ہیں۔ پھر بھی مختلف شاعروں نے جدید رہسواد کو مختلف اشکال میں بیان کیا ہے۔ کسی میں خدا کی جدائی کا درد ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کی روح آنسو بہایا کرتی ہے جیسے :-

آہ یہ میرا گیلا گان
ورن ورن ہے اُر کی کمپن
(دل یاد) شبد شبد ہے سُدھی کی دنشن (ڈنک)
چرن چرن ہے آہ
(پنت)

کیسا دل کو چھونے والا درد ہے ؟

(تکلیف) کرون ہے ہائے پریم (پریم)
(چھپتا) نہیں دُرتا ہی جہاں درآؤ
کروں تم بھگن ہردے (ٹوٹا ہوا)
نہیں بھرتا ہے جس کا گھاؤ
ہردے رو! اپنے دُکھ کا بھار
(پنت)

رام کمار جی کی یہ سطور
کرنا کا گہرا گنجار (اگونج)
جس میں گروت وشو پگھل کر
بہتا ہے آنسو کی دھار (دنیا)

کہیں اس درد نے "پریئے ملن" میں ناکامی کی وجہ سے قنوطیت پیدا ہو گئی ہے۔

(بگلی) اُدان مادی رو لینے دے اک چھن بھر مجھے اکیلا
اس پون کے اُدشا کال میں چھپی سانجھ کی بیلا (عروس سحر)
(چکوری)

کہیں دُکھ کا ہی زہر پیتے پیتے شاعر دُکھ کو ہی پیار کرنے لگا ہے۔

ویدنے تو بھی بھلی بنی!
پائی میں نے آج تجھی میں اپنی چاہ گھنی
الگ کرنا۔ × × ×

ایشیا مئی ۱۹۴۱ء

نہ کر دید نا سُکھ سے وچھنت (شاکیت)

بڑھا ہردے ہلّول (گپت)

اُرمِلا کی اوپر کہی ہوئی بات میں جدید شاعر کی رُوح بول رہی ہے۔ اسی طرح کہیں شاعر تجربات کی اس حد تک پہونچ چکا ہے جب سُکھ اور دُکھ، ہجر و وصال دونوں اس کے لئے برابر ہیں۔ اس کی مثال دیکھا چکی اور بھی دی جا سکتی ہیں

وہ ہنسی اور یہ آنسو
گھُلنے دے مل جانے دے
برسات نئی ہونے دے
کلیوں کو کھل جانے دے

(آنسو)

جے شنکر پرسے دنے اپنی بے داغ نظم کے ذریعہ جدید رہسواد کو بہت بلند کر دیا ہے اور یہ رہسواد معیاری ہے

پرشاد جی کا محبوب "مرد" ہے اور اپنے لئے بھی وہ تذکیر کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک ہی مثال کافی ہوگی۔

(چاند) ششی مکھ پر گھونگٹ ڈالے
آنچل میں دیپ چھپائے
جھٹپٹا جیون کی گودھولی میں
یک بیک تم تو ہل سے تم آئے

یہ رہسواد کی مختلف (stages) ہیں۔ دراصل ہم دیکھتے ہیں کہ رہسواد جدید دَور میں ہی اپنی منشا (stage) تک پہونچا ہے۔ یہ جدید دور کی بیش قیمت دولت ہے۔ اور مستقبل کے لئے اُمید کی سنہری کرن جوان دلوں کو یہ دھندلی کہکشاں ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہے گی۔

اکرام حسین بی اے۔ بریلی

گیت

توکاہے نابولے ؟
پیارے
توکاہے نابولے ؟
تورے پریم کو مارو چاتک ڈالی ڈالی ڈولے
ڈالی ڈالی ڈولے اپنے ہردے کے پٹ کھولے
ہردے کے پٹ کھولے دنیا نین ترازو تولے
واکی مدھر سہانی بانی کانن امرت گھولے
توکاہے نابولے ؟

پیارے
توکاہے نابولے ؟
تورے پریم کی ماری مچھریں جل میں ڈوبا کھائیں
جل میں ڈوبا کھائیں ڈوبا کھائیں اور رہ جائیں
ساگر سے اٹھ اٹھ کر لہریں تٹ سے سر ٹکرائیں
من کی مانجھی پریم بھنور میں انسون موتی رولے
توکاہے نابولے ؟
پیارے
توکاہے نابولے ؟

نثار اٹاوی

الشعاع مئی ۱۹۴۱ء

جرمنی اور فرانس کا انقلاب ۱۸۴۸ء

(سلسلہ کیلئے دیکھئے ایشیا ستمبر ۱۹۴۲ء)

شروع میں کاشتکاروں کی قانونی محنت کام میں لائی گئی۔ ہر چند کہ دساوریں مال کی فراہمی جاری تھی۔ مگر مالکانِ اراضی نے بہت جلد ہی یہ محسوس کرلیا کہ مزدوروں کی خریدی ہوئی محنت اُن کے لئے مفید نہیں ہے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ کسانوں کو یک گونہ آزادی دیدی گئی حالانکہ حقیقتاً پروشیا اور مشرقی جرمنی میں اس آزادی سے اُن کی حیثیت زرعی مزدوروں میں تبدیل ہوگئی۔ کیونکہ اُن کا حصۂ زمین بہت قلیل تھا اور وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہمسایہ جاگیروں کے دست نگر ہوگئے۔ اُن کی اپنی کاشت کی زمین اُن کے اخراجات کی کفالت نہیں کرسکتی تھی۔

اصلاحات کا نتیجہ اوائلِ صدی میں یہ تھا کہ مشرقی صوبجات میں انیسویں صدی کے آخری نصف میں تقریباً ۴۶ فی صدی سے ۸۰ فیصدی تک زمین۔ زمینداروں کے قبضہ میں تھی۔ بیگار اور نیم غلامانہ لعنت سے نجات حاصل کرنے کیلئے کسان نے نقد روپیہ کے ساتھ ساتھ اپنے مقبوضات میں سے ایک تہائی کے بجائے نصف دینا بھی منظور کرلیا۔ جاگیردارانہ اقتصادیات کا سرمایہ دارانہ کاشت کی ہیئت اختیار کرلینے کا (لینن نے پروشین کسان اور امریکہ کے کسان میں امتیاز کیا ہے) سلسلہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑتا رہا اور اس کی یہ ترقی کسانوں کے عام طبقہ کے لئے ہزار ہا پریشانیوں کا باعث رہی۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ جرمنی میں انقلاب کا اہم ترین مسئلہ اور سوال قبضۂ زمین اور کاشت سے متعلق تھا جیساکہ وہ فرانس کے انقلاب عظیم میں تھا۔ یا جیسے کہ وہ روس میں ۱۹۰۵ء سے پہلے تھا۔ سرمایہ دارانہ زراعت و کاشت کی بنیادیں جرمنی کے مشرق میں زیادہ تر بڑی بڑی جاگیروں کی ملکیت پر قائم تھیں۔ اور مغرب میں کاشتکاری اقتصادیات پر — اور اس کے ارتقاء میں سب سے بڑی رکاوٹ سیاسی یک جہتی کا فقدان تھا۔ کسانوں پر ابھی تک (Serfdom) جبریہ بیگار کے اصول کی پابندیاں بھی قائم تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اقتصادی اعتبار سے اختلاف ہونے کے باوجود ان میں ایک قسم کی یک جہتی تھی اور وہ ایک منظم کثیر التعداد جماعت کے نمائندے تھے۔ اور چونکہ وہ اپنے حالات کے تقاضوں کے ماتحت کوئی مرکزی طاقت اور باقاعدہ کام کرنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا اُن کو ایک ایسے طبقہ کی احتیاج تھی جو اُن کی راہ نمائی کرسکے۔

قدیم دور کے فرانسیسی امراء کے برخلاف جو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اس آمدنی پر گذارتے تھے جو دوسروں کی محنت کا نتیجہ تھی۔ پروشیا کا جاگیردار ان تھک اور بے پناہ کاروباری آدمی تھا۔ جو انقلاب کا دشمن تھا اور اپنی طاقت اور زرِ لگان کے حفاظت و حصول کیلئے لڑنے کو ہمیشہ کمربستہ رہتا تھا۔ اس کے باوجود بوژوا طبقہ کے انقلاب کی کامیابی قرین قیاس تھی۔ اس کی جدوجہد اتحادِ قومی کو استقامت دینے اور غلامی و سرداری کے امتیازات کو مٹانے کیلئے تھی۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے جرمنی کے بوژوا طبقہ کے ساتھ شہری اور دیہاتی آبادی کے مزدوروں اور غریب طبقہ کی کثیر تعداد کا ساتھ ہونا لازمی تھا۔

کاروبار چھوٹے پیمانے پر ابھی کافی وسیع طور پر جاری و ساری تھے اور دستکاروں اور فنکاروں کی تعداد کافی تھی ۱۸۴۶ء میں پروشیا کے ۴۵۰۰۰۰ آقاؤں کے لئے صرف ۳۸۵۰۰۰ سفری غلام تھے۔ مروجہ قسم کی جماعت صرف کام کرنیوالوں کی تھی۔ لیکن سرمایہ دار صناع سلیشیا اور سیکسنی جیسے اضلاع میں چھوٹے چھوٹے پیدا کرنے والوں کی بنیادیں کمزور کررہے تھے۔ اور ان کو جھونپڑی میں کام کرنے والوں کی حیثیت

ایشیا مئی ۱۹۷۲ء

ں تبدیل کر رہے تھے۔ مثلاً سلیشیا میں بننے والوں کی حالت قابلِ رحم
ی۔ (Rhenish) کے صوبہ میں جہاں اقتصادی حالت کچھ بہتر
چکی تھی۔ بڑی بڑی فیکٹریاں عالمِ وجود میں آئیں ۱۸۴۶ء میں پروشیا
ں بقدر ۹,۰۰۰ تجارتی صناعت گاہیں تھیں اور ان میں ۵۵,۰۰۰
م کرنے والے تھے۔ (Zollverein) کے حدود میں ۳۱۳
تنے والی ملیں تھیں اور ان میں ۵۰,۰۰۰ کاتنے والی چرخیاں تھیں
۱۸۴۳ء میں پروشیا میں ۹۴,۰۰۰ چرخیاں اون کاتنے کے لئے تھیں
در ملی ہوئی روئی اور اون کے بُننے کیلئے ۹۰۲۹ اڈے تھے جنمیں سے ۱۰,۰۰۰
ا رگیروں کے اپنے ذاتی تھے اور اُن کے گھروں پر تھے۔ اُسی سال پروشیا
ں ۱۱۳۹ دخانی مشینیں بھی تھیں اور اُن کی مجموعی طاقت ۲۱,۰۰۰ گھوڑوں
، برابر تھی۔ ان میں سے زیادہ تر کانوں میں مستعمل تھیں۔ ان تمام مشینوں
اور فیکٹریوں کی پیداوار زیادہ نہ تھی — جرمن کے چار بڑی روئی کے
کپڑے کی ملیں بیسویں صدی کے شروع میں اس قدر مال تیار کرسکتی تھیں
جتنا کہ ۱۸۴۳ء کے ۳۱۳ کارخانے۔ لیکن بہر صورت جرمنی اس وقت
فرانس کے اس حالت کے مقابلہ میں جو ۱۸۴۹ء میں تھی بہت زیادہ
ترقی یافتہ تھا۔ بڑے پیمانے پر صنعت اور تجارت جاگیردار کے خلاف
ایک سخت اور فیصلہ کن جدوجہد کے لئے اپنے اندر کافی زور و توانائی
رکھتی تھیں۔

صنعتی ارتقاء کے اس طریقہ میں یہ راز بھی مضمر ہے کہ بورژوا
طبقہ مؤثر طریقۂ کار اختیار کرنے سے کیوں باز رہا ۱۷۸۹ء کا فرانس آقا
اور غلام کی کشمکش سے آشنا تھا۔ حاکم طبقہ اور سوداگر طبقہ کی کشمکش
سے بھی لیکن وہ اس طرزِ کار سے محض بیگانہ تھا جو کام کرنیوالوں
کی جماعت اور سرمایہ دار آقا کے درمیان ایک نزاعی صورت
میں پیش آتی ہے۔ اور جرمنی میں ۱۸۴۸ء میں کام کرنیوالوں اور
سرمایہ داروں میں تیز تیز جھڑپ ہو چکی تھیں۔ جیسے کہ ۱۸۴۴ء میں
سلیشیا کے بننے والوں کی بغاوت جس میں بورژوا طبقہ حکومت کی
امداد کا طالب اور محتاج ہو گیا تھا۔ بورژوا طبقہ بھی دو حصوں میں
نمایاں طور پر تقسیم ہو چکا تھا۔
ایک وہ جو اپنی ممتاز حیثیت کی وجہ سے بے نیاز اور بےخوف
تھا۔ اور دوسرے وہ جو مشین اور بڑے پیمانے پر پیداوار میں اپنی
یقینی موت متصور کرتا تھا اور خود کو اس سے بچانا چاہتا تھا۔ ان دونوں
گروہوں کے آپس کے تعلقات بھی خطرناک حدود تک ناخوشگوار
ہو گئے تھے۔ چھوٹے پیمانہ پر پیداوار کرنے والے آزاد طبقہ کا وجود
معرضِ خطر میں تھا۔ اُس کو بالکل روندا جا رہا تھا۔ جیسا کہ اس امر
سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ایک غیر معمولی تیزی سے امریکہ کی طرف ہجرت
کر رہے تھے ۱۸۴۸ء کے قریب ۳۰۰,۰۰۰ لوگ وہاں چلے گئے اور
پہلے تیس سال میں صرف ۱۵۰,۰۰۰ آدمیوں نے ہجرت کی تھی۔
جرمن کی وہ بورژوا جماعت جو اصولاً انقلاب کی ترقی میں
دلچسپی رکھتی تھی۔ جرمنی کی حدود سے باہر جو طبقہ دارانہ لڑائی جاری
تھی اُس سے متاثر ہوئی۔ انگلستان میں چارٹسٹ ہنگامہ۔ فرانس
میں سوشلزم اور کیمونزم کی بڑھوتری جو تھی ریاست "(Fourth
estate) کے ظاہر ہونے نے بورژوا طبقہ کو خائف کر دیا۔ یہ
سچ ہے کہ وہ طاقت کا متمنی ضرور تھا۔ مگر وہ اس کو صلح جویانہ طریقوں
پر کاربند ہو کر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ۱۸۴۸ء میں پیرس کی پرولتاری
فتح اُن کے لئے ایک آتشیں اشارہ تھا۔ عوام کی انقلاب پسند حرکات
نے برلن میں یکایک پروشین بورژوؤں کو طاقت بخش دی۔
جرمنی کے جنوب مغرب میں انقلابی تحریک اوائل مئی میں آغاز
ہوئی۔ (کولون جیسے صنعتی مرکزوں میں کام کرنیوالے حد سے زیادہ
تیزی سے بڑھے اور انھوں نے اپنے مطالبات پیش کر دیئے)۔
۱۳ مارچ کو وائنا میں کامیاب بغاوت ہوئی۔ اُس ہی دن برلن میں
فوج اور کام کرنیوالوں میں ٹکر ہوئی۔
۱۸ مارچ کو برلن کے جنگ آزما فتح مند ہوئے "کام کرنے
والا طبقہ جس کو بورژوں نے ہمیشہ پیچھے ڈھکیلے رکھا تھا۔ آگے بڑھ
آیا تھا نبرد آزما ہوا تھا اور فارغ ہو چکا تھا اور وہ ایک ہی لمحہ میں
اپنی طاقت کو سمجھ گیا تھا۔ Engels, Revolution
(and counter Revolution)
بادشاہ پولیس کو قصبات سے ہٹانے پر مجبور ہوا۔ اور اس کو
(Constitution) کا اعلان کرنا پڑا۔ اس کو یہ وعدہ

کرنا پڑا کہ وہ ایک آزاد (Liberal) وزارت رامتن کے دوریش تجار (Camphausen, Hansem ann) کے ماتحت قائم کرے گا۔

بورژوں کی دغابازی اور کم اثر رکھنے والے بورژدوں کے تذبذب نے مارکس کو جو انقلاب کے ظاہر ہونے پر فوراً ہی ....

(Brussels) برسل سے براہ پیرس کولون کو روانہ ہوگیا تھا اور جہاں اُس نے یکم جون ۱۸۴۸ء سے ۱۹ مئی ۱۸۴۹ء تک (Neue Rheinische Zeitung) نکالا۔ (Rheinsh-) (Democratic Association-) کی کمیٹی سے مستعفی ہونے پر مجبور کیا۔ اس ہی زمانہ میں کولون کے (Working Men -) Association- کا جس کا مارکس کو صدر منتخب کرلیا گیا تھا۔ خاتمہ ہوگیا۔

"جمہوری انقلاب کے تجربہ سے مارکس نے یہ عملی نتیجہ اخذ کیا۔ کہ پرولتاری طبقہ کی آزادانہ تنظیم کی غایت درجہ ضرورت ہے۔

(لینن)

۱۸۴۸ء کے حاصل کئے ہوئے سبق کو مارکس نے ۱۸۵۰ء

۲۴ میں واضح طور پر اپنے مشہور خطبہ میں جو اُس نے کیمونسٹ لیگ میں دیا، بیان کردیا ہے۔ اور وہ سبق یہ تھا کہ اگر بورژدی انقلاب کو کسی خوش آئند انجام تک پہونچانا ہے۔ تو پرولتاری طبقہ کی تنظیم باقاعدہ ہو اور انقلاب کو اتنا آگے بڑھایا جائے کہ وہ پرولتاری ہیئت اختیار کرلے۔

اُس نے ۱۸۴۸ء میں (Neue Rheinische Zeitung-) میں لکھا

اگرچہ فروری کے انقلاب کو پروشین بورژوا طبقہ نے خوش آمدید کہا کیونکہ اس سے اُن کو حکومت میں اثر و رسوخ کا موقعہ ملا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس نے اُن کے تمام اندازوں کو غلط کردیا۔ کیونکہ اُس نے ان کی حکومت کا انحصار ایسی صورتوں پر رکھا اور اُن کے سامنے ایسی شرائط رکھدیں جو نہ وہ چاہتے تھے نہ چاہ سکتے تھے اور جن کو پورا کرنا اُن کے لئے ناممکن العمل تھا۔ پروشا۔ آسٹریا اور جرمن کی دوسری ریاستوں کے مارچ کے انقلاب نے آزاد خیال بورژوں کو قوت و اثر دیا۔ اور اس طرح اُن کو پرانے فیوڈل طریقہ حکومت کو ختم کرنیکا موقع ملا

ایشیا مئی [illegible]ء

جرمن بورژدوں کا طریقہ کار فرانسیسی بورژدوں سے بالکل مختلف تھا۔ فرانس پر کم از کم یہ تو ہوا کہ ۱۸۳۰ء میں قدیم شاہی خاندان تخت و تاج سے محروم ہوگیا جبکہ ۱۸۴۸ء میں عوام کے تقاضوں کے ماتحت ملوکیت ختم کردی گئی اور اس کی جگہ جمہوریت قائم ہوئی۔ مگر جرمن کی کسی ریاست میں بھی بورژدوں کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ بادشاہ کی مخالفت کرسکیں اور پروشا میں تو اس قسم کی کوئی لہر ہی پیدا نہ ہوسکی۔ سلطنت کے پرانے نظام کو جوں کے توں برقرار رکھا گیا جب برلن میں آتشِ جنگ بھڑک رہی تھی۔ بورژدوں نے مزدوروں کے خلاف رجعت پسندوں کے سامنے مصالحت کا ہاتھ بڑھا دیا۔ نہ کوئی فوجی افسر اور نہ ہی کوئی سول افیسر اپنی جگہ سے برطرف کیا گیا۔ بورژدا میں وہ خود اعتمادی نہ تھی جو فیوڈل سسٹم کی بیخ و بنیاد اکھیڑ ڈالے۔ انقلاب کے روز اولیں سے بورژدے پیرس میں پیش آئے ہوئے واقعات کے تصور سے لرزاں تھے۔ انھیں خوف تھا کہ عوام کا انقلاب ان کے مالکانہ حقوق پر بھی ضرب کاری لگادے گا۔

مارکس نے اپنے اخبار ۔ Neue Rheinische Zeitung میں لکھا:۔

"جرمن بورژوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ ایک طبقہ ان کا پشت پناہ ضرور ہے۔ مگر شہنشاہی نظام کے خلاف ان کا کوئی اقدام ملوکیت پسند یورپ کو اُن کا دشمن بنا ڈالے گا۔

وزارت پر قابو پالینے کے بعد بورژوں نے خود کو قدیم شاہی خاندان کا محافظ۔ اور حلیف قرار دیا۔ اور اپنی امکانی طاقت کو ملوکیت کے برقرار رکھنے میں صرف کر ڈالا۔ اور رجعت پسند طبقے سے جارحانہ اور مدافعانہ سمجھوتہ کرلیا۔ اس خوف سے کہ انقلاب کی آگ تمام نظام کو برہم نہ کردے۔ انھوں نے اپنی حقیقی اور مخلص ساتھی زراعت پیشہ طبقہ کو چھوڑ دیا۔

"پروشیا کسان طبقہ نے بھی آسٹریا کی طرح لیکن اس ملک سے کم جوش کیساتھ دکیوں کہ یہاں پر فیوڈلزم عام طور سے اس قدر جابرانہ شان نہ رکھتا تھا، اس موقعہ کو غنیمت جانا اور فیوڈلزم کی قید و بند سے خود کو آزاد کرنے کی سعی کی لیکن اس ملک میں متوسط طبقہ فوراً اپنے ان قدیم حمایتوں کو چھوڑ کر الٹا ان کے خلاف ہوگیا۔ اور بالآخر

تین ماہ کی آزادی، خونریز جدوجہد اور انتہائی ستم کوشیوں کا صرف یہ انجام ہوا کہ کل جو طبقہ فیوڈلزم کے خلاف تھا اسی کے ہاتھوں پھر ملک میں فیوڈلزم کا ڈنکا بجنے لگا۔ (ریوالیوشن اینڈ کاؤنٹر ریوالیوشن)

اگست ۱۸۴۸ء میں پروشیا کی لینڈ ٹاگ میں قانونی بیگار کو ختم کر دینے کے متعلق ایک بل پیش کیا گیا جو مسترد کر دیا گیا۔

عوام نے ابھی "سدِ راہ" کو ہی دور کیا تھا کہ بورژوا طبقہ بھی مزدوروں کے خلاف ہو گیا۔ یہ غریب نہتے اور بے یار و مددگار رہ گئے۔ جون ۱۸۴۸ء میں انھوں نے ہتھیار حاصل کرنے کے لئے اسلحہ خانہ پر چھاپا مارا۔ لیکن سول گارڈ اور فوج نے پسپا کر دیا۔ جرمن بورژوا داہنی طرف کو برابر ہٹتا رہا۔ مارکس نے ۱۵ دسمبر ۱۸۴۸ء کو لکھا۔

"ملوکیت طبقۂ اشرافت کو بورژوا طبقہ کی خاطر قربان کر دے گی اور بورژوا طبقہ ملوکیت کی راہ میں عوام کو قربان کر دیگا۔"

لیکن آزاد خیال بورژوا کا اندازہ غلط نکلا۔ بادشاہ نے بورژوا طبقہ کے بل پر عوام کی زد سے خود کو بچا لیا۔ لیکن اس قدم نے ملک کو پھر اسی جگہ جا ڈالا جہاں وہ مارچ سے پہلے تھا۔

اسی طرح جرمن سوشل ڈموکریٹ بھی، جو نومبر ۱۹۱۸ء میں برسرِ اقتدار آئے۔ سوشلسٹ دنیا اور سوویٹ روس سے خائف رہتے تھے بالکل جیسے کمپازن اور ہانسی مان انقلاب پسند پیرس سے خائف تھے۔ اُن کی ہر امکانی کوشش سرمایہ داری کی حیات و استحکام کے لئے وقف تھی۔ انھوں نے بورژوا طبقہ سے سمجھوتہ کر لیا۔ پرانے فوجی افسروں کو اُن کے عہدوں پر قائم رکھا۔ اور عنانِ سیاست پہلے ہی افسروں کے ہاتھوں میں رہنے دی۔ ۱۸۴۸ء کے بورژوا طبقے کی طرح ۱۹۱۸ء کے سوشل ڈموکریٹ لوگوں نے بھی فرسودہ نظام کو بدلنے کی بجائے ظالم حکمرانوں کے بقا کے لئے ہر سعی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بورژوا طبقہ نے جس کی حیات سوشل ڈموکریٹ لوگوں کی ہی مرہونِ احسان تھی۔ جب وقت پکڑ لی تو انہیں اپنے محسنوں کو نکال باہر کیا جیسے کہ خاندانِ ہانیزالرن نے جنھیں آزاد خیال بورژوا نے ۱۸۴۸ء کے موسمِ بہار میں فنا سے بچا لیا تھا۔ اُسی سال سرما میں ان آزاد خیال بورژوا کو نکال باہر کیا۔ نتیجہ دونوں حالتوں میں ایک سا رہا۔ یعنی انقلاب اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا۔ ایک صورت میں یعنی ۱۸۴۸ء میں ملوکیت پھر واپس آگئی۔ اور دوسری صورت میں وائمر کانسٹی ٹیوشن والی جرمنی میں بورژوا طبقہ کا سیاسی اقتدار پھر قائم ہو گیا۔

جرمنی میں قومی یک جہتی، کی کوشش میں پروشین بورژوا طبقہ آگے آگے نہیں رہا۔ اس یک جہتی کو قائم کرنے کی مختلف صورتیں تھیں مثال کے طور پر پروشین سکوڈگی میں بہ استثنائے آسٹریا جرمنی کی تشکیل۔ دوسری جانب مارکس اینجلس (Engels) اور دوسرے بلند حوصلہ جمہوریت پسند لوگ جرمنی میں ایک ایسی جمہوریت دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کے ماتحت پروشیا اور آسٹریا دونوں کو ایک جا کر دیا جائے۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اس عظیم الشان اسکیم کی ابتدائی ضروریات ہی یہ تھیں کہ انقلاب مارچ پایۂ تکمیل کو پہونچے۔ پروشین ملوکیت ناپید ہو جائے۔ اور جاگیرداروں کی طاقت افسانۂ ماضی بن جائے

جرمنی کی جنوبی ریاستوں کے کم استعداد بورژوا ڈیموکریٹ شروع ہی سے ایسے جمہوری نظام کے عادی تھے جو ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو محفوظ رکھے۔ یہ ریاستیں پرانی کچھ کچھ فیوڈل قسم کی حکومت کی آخری نشانی تھیں۔ اس ذاتی حفاظت کے خیال سے یہ ریاستیں پروشیا کی ملوکیت کے اقتدار کے خلاف تھیں۔ اور چونکہ پروشیا کا بورژوا طبقہ اس ملوکیت کا ساتھ چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوا۔ اس وجہ سے ان ریاستوں نے اتحاد جرمنی کی جدوجہد میں پیش پیش رہنے سے انکار کر دیا۔

مارچ ۱۸۴۸ء میں ان جنوبی ریاستوں نے متفقہ طور پر ایک عارضی پارلیمنٹ کا اجلاس فرانکفورٹ کے مقام پر کیا۔ جس میں ایک قومی اسمبلی بنانے کی تجویز طے ہوئی۔ اس اسمبلی کا پہلا جلسہ ۱۸ رمئی کو ہوا۔ اس میں تعداد کا جزو اعظم آزاد خیال اور روشن طبع بورژوا لوگوں پر مشتمل تھا۔ نیو رائنش زائٹنگ میں مارکس اور اینجلس نے مستقل طور اور بڑے شد و مد سے اس پارلیمنٹ کی کارروائیوں پر تنقید کی۔ اس قومی اسمبلی نے بہت سے اجلاس تو ایجنڈے پر بحث کی نذر کئے اور پھر ایک طاقتور جماعت بننے کی کوشش کے بجائے کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب میں بہت وقت گنوایا۔ اور اس طرح مخالف قوتوں کو ابھرنے کا خوب موقع دیا۔ فرانکفورٹ میں اس لیت و لعل نے اس پارلیمنٹ کے ناکارہ

ہونے کا پورا پورا ثبوت دیدیا۔ آزاد خیال بورژوا طبقہ کے سیاسی لیڈروں نے کچھ کام کرنے کی بجائے لمبی لمبی تقریروں میں وقت گذارا اور ادھر مخالف طاقتیں از سرِ نو حملہ کی تیاری کرتی رہیں۔ قومی اسمبلی عوام کے انقلاب سے بیحد مخالف تھی اور فرانکفورٹ کی پارلیمنٹ نے مسلح رعایا کو اپنا مددگار بنانے کیلئے کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اُس نے کسی شہزادے کو تخت سے نہیں اتارا اور نہ ریاستوں کے اتحاد کے لئے کوئی اور عملی کوشش کی۔ اور جب برلن اور وائنا کی پارلیمنٹ ختم ہو چکی تھی فرانکفورٹ کی پارلیمنٹ اس وقت بھی ایک کانسٹی ٹیوشن ترتیب دینے کے متعلق غور کر رہی تھی۔

آسٹریا میں انقلاب کی لہر

پروشیا میں جرمنی کا اتحاد اہم سوال تھا لیکن آسٹریا کے لئے جہاں کی آبادی متعدد قومیتوں پر مشتمل تھی۔ نیم فیوڈل نظام جو وہاں پروشیا کے مقابلہ میں زیادہ مضبوطی سے جڑ پکڑے ہوئے تھا ختم کرنے سے بھی زیادہ اہم سوال وہاں کی قومیتوں کو علیحدہ علیحدہ کرنا تھا۔ یعنی ہنگرین آبادی واٹیلین آبادی۔ جنوبی سلاوز آبادی۔ پول آبادی اور چیکس آبادی وغیرہ کو علیحدہ علیحدہ کرنا اور اُن کو آزادی دینا۔ مسائل کے اس اختلاف نے جو اُن دونوں ملکوں کو حل کرنے تھے جو تحریک میں پیش پیش تھے۔ جرمنی کے انقلاب میں اور زیادہ مشکلات حائل کردیں۔

وائنا میں انقلاب نے برلن سے زیادہ نمایاں صورت اختیار کرلی مارچ کے انقلاب کے بعد۔ رجعت پسند یورپ کے سیاسی رہنما۔ (Metternich) کے نکالدئے جانے کے بعد مئی ۱۸۴۸ء میں وائنا میں دو بغاوتیں ہوئیں۔ ایک عام آزادی کی جدوجہد کے موقع پر اور ایک اسوقت جب طالب علموں کی جماعت کو نہتا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان تحریکوں کی باگ ڈور انقلابی بورژواؤں کے ہاتھ میں تھی اور مزدور اُن کے پشت پناہ تھے۔ ۲۵ مئی کی کامیاب جنگِ آزادی کے بعد عوام کو رائے دہندگی کا حق دیا گیا۔ اور بادشاہ اور اُس کے درباری وائنا سے فرار ہوگئے۔

جون میں پیرس کے مزدوروں کی شکست ۱۸۴۸ء کے انقلاب کا ایک نیا زاویہ پیش کرتی ہے۔ فیوڈل طاقتوں کے انتقامی حملہ کا آغاز یہاں سے ہوا۔

آسٹرین شہنشاہیت پہلی ٹکر سے سنبھل چکی تھی۔ میانہ رو بورژوا طبقہ سے مصالحت نے اس کو اطمینان کا سانس لینے کا موقعہ دیدیا۔ اب اس نے قومی اختلاف کو اپنے مفاد کی خاطر اُجاگر کرنا شروع کیا بوہیمیا کے (Slave) ہیجان کو جرمن اور ہنگرین لوگوں کی مدد سے ختم کردیا گیا۔ اطالیہ والوں کو ہنگرین اور (Slaves) نے شکست دی (اس وقت لمبارڈی (Lombardy) میں آسٹرین حکومت تھی اور متحدہ اطالیہ کا وجود نہ تھا) شاہِ وقت نے (Slaves) کے مضبوط دستوں کو ہنگرین انقلاب اور وائنا کی انقلابی لہر کچلنے کیلئے میدانِ جنگ میں اُتار دیا۔

(Slavs) رقبہ میں (پولینڈ کے استثنا سے) سرمایہ داری بہت معمولی طور پر صورت پذیر ہوئی تھی۔ آسٹرین شہنشاہیت نے ان (Slaves) لوگوں کو جو اقتصادی اور سیاسی طور پر پست تھے یہ کہہ کر ابھارا کہ دوسری قومیں (Slavs) کاشتکاروں کا خون چوس رہی ہیں۔ اُس کا یہ حربہ کارگر ہوا اور اُن کی امداد اس کے شاملِ حال ہوگئی۔ اس طرح ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں پولس (Poles) کے استثنا سے (Slavs) لوگ رجعت پسندوں کے گروہ کے شریک کار رہے۔ اور انھوں نے آسٹرین شہنشاہیت کو یہ قوت بخشی کہ وہ بورژوا انقلاب اور قومی انقلابی لہر جو عموماً آسٹریا کے ترقی یافتہ افراد اور خصوصاً ہنگرین لوگوں کی پیدا کی ہوئی تھیں بالکل ختم کردے۔

مارکس اور اینجلز نے انتہائی خلوص سے ان تحریکوں کا ساتھ دیا جو مختلف لوگوں میں قومی اتحاد پیدا کرنا چاہتی تھیں اور جو انقلابی عنصر رکھتی تھیں پولینڈ اور ہنگری کی آزادی کے لئے جدوجہد۔ یہ ہی وجہ ہے کہ انھوں نے پُر زور طریقے پر کہا کہ ۱۸۴۸ء کے ہنگامہ میں جنوبی (Slavs) کے لوگ رجعت پسندوں کا کردار اختیار کر رہے ہیں اور یہ کہ (Slavs) اضلاع جرمن انقلاب کے مشتری بن گئے ہیں۔ اینجلز (Engels) نے لکھا:

"انقلابی ہنگامہ کے دوران میں یا جبکہ بیرونی جنگیں جاری ہوں کوئی ملک بھی اپنے اندر اُن غداروں کے وجود کو نہیں برداشت کرسکتا جو ملک کی آزادی کا سودا کر رہے ہوں۔"

(۲/۱/۱۲)

ڈاکٹر نذیر احمد اور تحریکِ آزادی

۱۸۵۷ء کی جدوجہد ہندوستان کی تاریخ میں ہر لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ دنیا کی تاریخ میں شاید گنتی کی چند مثالیں ایسی مل سکیں جو واقعات کے قبل اور بعد کی تاریخ میں اس قدر ہمہ گیر تغیر پیدا کردیں۔ اقتصادیات سیاست، معاشرت، مذہب، ادب غرض کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں جس کی تاریخ میں اس وقت سے ایک نیا اور اہم باب شروع نہ ہوتا ہو۔

اس زمانہ میں ہندوستانی سماج اپنی انتہائی پستی کو پہونچ چکا تھا۔ علم وفن کے جو چراغ مغلوں کے عروج کے زمانہ میں روشن کئے گئے تھے اب خاموش ہو چکے تھے۔ زمام سیاست پورے طور پر دوسرے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی، شریف خاندانوں کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ آمد کے ذرائع محدود تھے۔ اور اخراجات بدستور۔ قدیم امیر گھرانوں نے ہنوز وضعداری ترک نہیں کی تھی جس کی وجہ سے حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ عام سماج کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اب نہ زیادہ تحصیل علم کی قدر تھی نہ فرصت۔ فضا کی عام بے چینی اور کس مپرسی نے عام طبیعتوں کو ذہنی کلچر سے منحرف کر کے عشرت پرستی میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ وہم پرستی کا تصرف روزانہ زندگی سے بڑھ کر مذہبی، سیاسی اور اقتصادی مسائل تک پہنچ چکا تھا۔ ادب کا بھی یہی حال تھا۔ نثر میں قدیم اخلاق سوز قصے کہانیاں اور نظم میں معاملہ بندی کے شرمناک جذبات نظم کرنا معیار کمال سمجھا جاتا تھا۔ صاحب ذوق ہونے کی یہی دلیل تھی کہ زندگی کی ہیبتناک اصلیتوں سے منہ موڑ کر اسی قسم کے ادب کو مزے لے لے کر پڑھا جائے۔

شمالی ہندوستان میں انگریزوں کو آئے ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا۔ کمپنی کے افسر خودسر اور مغرور تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مقامی باشندوں (Natives) سے ربط ضبط بڑھانا سفید قوموں کے لئے کسرِ شان تھا۔ ہندوستانیوں سے اُن کا کوئی واسطہ تھا تو محض یہ کہ ان کی منڈیوں پر قبضہ کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیا جائے۔ اگر حکومت مقصد میں سہولت پیدا کرسکتی تھی تو وہ اس ذمہ داری سے بھی اپنے میزبانوں کو سبکدوش کرنے کے لئے پوری طرح تیار رہتے۔ ملکہ وکٹوریہ کے یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے مشہور اعلان کے بعد سے ہندوستان کی حکومت صحیح معنوں میں برطانوی حکومت سے منسلک ہوئی ہے۔ گویا اس روز پہلی مرتبہ انگریز کو ہندوستانی سلطنت کی چند ذمہ داریوں کا احساس ہوا۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ یہاں کے باشندوں کے حالات کا حتی الوسع جائزہ لیا جائے اور ایک حد تک ہندوستانیوں کو بھی حکومت میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دی جائے۔ خواہ وہ ادنیٰ کلرکوں ہی کی حیثیت سے کیوں نہ ہو۔ دستور العمل میں کچھ تغیر وتبدل ہوا اور رسمی امید افزا لہجہ میں ہندوستان کے سدھار کی پوری پوری کوشش برطانوی سامراج کا نصب العین قرار دی گئی۔

اس نئی پالیسی اور نئے تمدن سے اثر پذیر ہو کر اگر ایک طرف ہندوستانیوں نے بہت کچھ کھویا تو دوسری طرف بہت کچھ حاصل بھی کیا۔ اونچے طبقہ کے کچھ لوگ غیر ملکوں میں، اور خصوصاً انگلستان میں، علم حاصل کر کے واپس آنے لگے۔ ان میں سے اکثر نے انگریزوں کے احساسِ برتری، ان کی تہذیب کے نقائص اور اپنے وطن کی ابتری کو نہایت شدت کیساتھ محسوس کیا اور اپنی پیچ در پیچ الجھنوں کو سلجھانے کی فکر میں رہنے لگے۔ بنگالی ایک زمانہ پہلے اس نئے تمدن سے روشناس ہو چکے تھے۔ اب وہ علانیہ روزناموں اور جریدوں میں حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے اور اپنے حقوق کو مبارزانہ لہجہ میں حکومت کے گوش گذار کر رہے تھے۔ شمالی ہندوستان نے بہت جلد اس

ایشیا [illegible]

\

اثر کو قبول کر لیا۔ ابھی سامراج ناکافی ہندوستانی تعاون حاصل کر سکا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ نئی جماعت خود ایک انگریز نے قائم کی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس کے ذریعہ جدید سلطنت کے نیچے ہندوستانیوں کے دلوں میں گرماوے جا سکیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے سرکار کی امیدیں زیادہ بارآور نہ ہو سکیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلافات پیدا ہو کر رفتہ رفتہ بڑھتے گئے اور روز بروز راج اور پرجا کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

حکومت نے ۱۸۵۷ء کی شورش کی بنیادی وجہ حال ہی میں مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکلنا سمجھی۔ چنانچہ ہندوؤں کی حوصلہ افزائی میں مصلحت سمجھ کر دلّی کے قدیم مسلمان گھرانے اُجاڑ کر وہاں ہندو آباد کئے گئے۔ اور انھیں زیادہ ذمّہ دار عہدوں پر تعینات کیا گیا۔ مذہبی آزادی کا اعلان کرکے فرقہ پرستی کا احساس پیدا کرایا گیا۔ جس سے ہندوستانی قوم دو بڑے کیمپوں میں منقسم ہو گئی جو انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ شروع شروع میں یہ کوشش خفیہ طور پر ہوئی لیکن جلد پلیٹ فارم پر آ گئی۔ اس مرتبہ ہندوستانیوں کو دوبارہ شورش کرنے کے ناقابل بنانے میں بڑی دور اندیشی سے کام لیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ ہتھیار بھی چھین لئے۔ اب ہندوستانیوں کے لئے سوائے دستور العمل میں اصلاح کے لئے کوشش کرنے کے اور چارہ ہی کیا تھا!

دلّی کے قرب و جوار میں پہلی دفعہ ہندوؤں ہی کو مہذب اور سمجھدار بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس لئے مخالفت کی تحریک میں بھی انہی کی تعداد زیادہ تھی۔ اس زمانہ کے لیڈروں کے پیش نظر آج کے اشتراکیوں کی طرح کسی سماجی انقلاب کا تصور نہیں تھا۔ اور نہ ان حالات میں ایسا تصور پیدا ہو سکتا تھا۔ وہ اونچے طبقہ کے شریف زادے اور صاحب اثر لوگ تھے۔ ان کے ذہنوں پر یورپ کی نئی قسم کی تحریک وطنیت اور ہندوستانیوں کی تحقیر اور افلاس کے جانگزا تصورات پر توفگن ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی سماجی ابتری میں سرمایہ اکٹھا کرنے کی عام اجازت، لین دین اور زمینداری کا ہاتھ ان کی نظر میں کوئی خاص وقیع امر نہ تھا۔ ہندوؤں کا ایک معاملہ فہم طبقہ مسلم امیری کے گرتے ہوئے تمول سے برابر مستفید ہو کر غیر ملکی تجارت کا بالواسطہ اور بلاواسطہ ایجنٹ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی مالی

حالت نسبتاً زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ جاگیرداری ٹوٹ پھوٹ کر زمینداری کی شکل میں نئے ہاتھوں میں پہنچ رہی تھی۔ لیکن یہ حالت کچھ زیادہ عرصہ تک برقرار رہنے والی نہ تھی۔ جلد مسلمانوں کو اپنی عسرت کا احساس ہو گیا۔

اب تک کانگریس کے تیور صاف صاف دکھائی دینے لگے تھے باوجود اس کے مسلمان کانگریس کی تحریک میں زیادہ تعداد میں شریک ہوئے گورکھ دھندا جتنا پیچیدہ ہے اتنا ہی سہل بھی ہے۔ اس زمانہ میں مذہب کو زندگی میں سب سے پہلی جگہ دی جاتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ صوفیوں اور جوگیوں کی مادیت کے خلاف آوازیں ابھی ہندوستانیوں کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ جو یورپ کی مادی تہذیب کے خلاف ردعمل بن گئیں۔ اس لئے سیاسی بیداری کے ساتھ مذہبی اصلاح کا احساس پیدا ہونا ضروری تھا۔ ہندوؤں میں شمالی ہندوستان میں آریہ سماج، بنگال میں برہمو سماج اور دکن میں برہمنوں کے خلاف اصلاحی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ مسلمانوں میں تھوڑے ہی عرصہ بعد علی گڑھ کالج کی تحریک ظہور میں آئی۔ یہ سب تحریکیں اپنے گوناگوں اختلافات کے باوجود ایک بات میں یک زبان تھیں۔ اور وہ یہ کہ معاشرتی سہولت کیلئے مذہب پر مستعدی کیساتھ قائم رہنا نہایت ضروری ہے، ہاں مذہب میں جو مرورِ ایام کیساتھ ساتھ خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کی اصلاح کر لینا چاہیئے۔ ان تحریکوں کے لیڈر سماج کو اپنے اپنے مذہب اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نئی منطق کی روشنی میں نئے حالات کی دوربینوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یقین اور برتری کا اٹل احساس شاید مذہب کی سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ اصلاح کے سلسلہ میں مذہب کے مختلف مسئلے معرضِ بحث میں آنے لگے۔ مسلمانوں نے مذہبی اصلاح کی دوڑ میں زمانی اعتبار سے پیچھے رہ جانا شدّت کے ساتھ محسوس کیا اور اسی لحاظ سے زیادہ جوش کے ساتھ تحریک شروع کی۔ یقینِ برتری اور بحث! نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔

ایسی صورت میں سیاسی تحریک میں رکاوٹ پیدا ہونا حالات کا یقینی نتیجہ تھا۔ سر سید اور محسن الملک نے خیال کیا کہ انگریزوں کی مخالفت کے بجائے اگر انھیں مسلمانوں کی وفاشعاری کا احساس کرایا جائے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل

نہ کرلیں۔ انگریز یاب کانگریس سے کافی بدظن ہو چکا تھا۔ اسے ہندوستانی پبلک کی مدد کی بے انتہا ضرورت تھی۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کیلئے یہ موقع غنیمت تھا۔ اس لئے انھوں نے افلاس زدہ اور پریشان عوام کی رہبری کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سرکار برطانیہ کی نیک نیتی کا یقین دلایا اور اس کے صلہ میں سرکار سے ان کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ رعایتوں کی پُرزور اپیل کی۔ نئی تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں متحدہ قومیت پر یہ پہلی ضرب کاری لگی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد ڈالی گئی اور ۱۸۸۸ء میں ڈاکٹر نذیر احمد کا کانگریس کے خلاف پبلک میں لکچر ہوا۔ شاید یہ کہنا بے سود ہے کہ ان کارناموں کے پیچھے قریب قریب ہمیشہ سرکار کا ہاتھ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دوران تقریر میں فرمایا:۔

"انڈین نیشنل کانگریس۔ اپنے منہ میاں مٹھو۔ لیکن ایک طفل مکتب جس کو ہندوستان کے جغرافیے اور تاریخ سے کچھ بھی مناسبت ہے۔ ہندوستان کے نام کیساتھ لفظ نیشنل سُن کر کان کھڑے کرے گا کہ کجا ہندوستان کجا نیشنلٹی، من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید۔ تمام روئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں کہ جس میں اس کثرت سے مختلف العقائد، مختلف المراسم، مختلف العادت اور مختلف الاغراض قومیں رہتی ہوں جیسے ہندوستان میں۔ پس ایسے اجزائے متضاد کو یک جا جمع کرکے ایک معجون مرکب قوم واحد قرار دینا صریح مغالطہ دہی ہے۔"

شاید پاکستان کے ہوائی قلعہ کا سنگِ بنیاد اسی زمانہ میں گھڑا جارہا تھا۔ آج تک ہندوستان میں انسانی زندگی پر مادی حالات کے اثرات کو کما حقہٗ نہیں سمجھا گیا ہے۔ اسی لئے ہمارے وطن والوں میں قومیت کا صحیح احساس کم ہے۔ مختلف طبقوں اور فرقوں کے آدمی لفظ "قوم" کے ساتھ مختلف قسم کے تصورات وابستہ کرتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قومیت کے جدید تصور کی طرف بھی اشارہ کردیا جائے۔ وہ تمام افراد ایک ہی قوم میں شامل ہیں جو ایک ہی مادی ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ سیاست اور سماج کا ماحول پیدا کرنے میں سب سے بڑا حصہ ہے اور اشخاص کی ذہنی ساخت اور تہذیب و تمدن کو یکساں بنانے میں بڑی بڑی مشینوں کا کام کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مستثنیات بھی ممکن ہیں۔ اور انفرادی حیثیت سے لوگوں میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔ پھر بھی کسی قدر سطح سے بلند ایک عام تمدن کی لہر فضا میں محسوس کی جاسکتی ہے اسی کا نام قومی تمدن ہے۔ ایسے فردوں کا سماجی اور سیاسی مقصد مشترک ہونا ناگزیر ہے۔ ان بڑے مقاصد کے سامنے گائے اور باجے کے تفرقے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ جو قومیں سمجھدار اور زندہ دل ہیں وہ مابعد الطبعی اور چھوٹے چھوٹے اختلافات سے گذر کر اپنے وطن کی آزادی کے لئے مستقل جدوجہد کرتی ہیں اور آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کی پروا نہیں کرتی۔ آج جب کہ ہر طرف سے استبداد کی ہیبتناک صدائیں آرہی ہیں۔ دنیا میں اتحاد اور سنگھٹن کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ موجودہ حالات میں قوموں کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا اور "بلقانی ریاستوں کا حشر" بالکل مترادف ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ سنِ بلوغت میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھیں اکثر ہموطن اور انگریز نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک شریف اور با اثر مسلمان ہونے کی حیثیت سے، قومی مصلح ہونے کی حیثیت سے، عالم اور ادیب ہونے کی حیثیت سے، اکابر ملک کی صف اولیں میں جگہ حاصل تھی۔ فی الحال اور سب باتوں سے قطع نظر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ کن اسباب سے ان کی ذہنی تشکیل عمل میں آئی۔ آپ نے ملک کی معاشرتی سدھار میں کیا حصہ لیا اور اس کا قوم پر کیا اثر پڑا۔

جیسا اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ ان کے زمانہ میں ہندوستان پر مغربی اثرات پرتو فگن ہو رہے تھے۔ ہندوستانی مجبوراً کسی قدر متحیر اور ایک حد تک خوفزدہ نئے حالات کے نتائج دیکھنے کیلئے اس معمولی تماشائی کی حیثیت سے تھے جس پر مسمریزم کا تجربہ کیا جارہا ہو۔ خود عوام کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ انھیں اطمینان دلانے والے ہادیوں اور پیشواؤں کی اشد ضرورت تھی۔ روز بروز مفلسی کا بڑھنا سونے پر سہاگہ تھا۔ یورپ میں نئی قسم کی پبلک زندگی کا آغاز ہوچکا تھا لیکن ہندوستانیوں کی نگاہ کو عام طور پر خاندانی حدود سے باہر نکلنے کی عادت نہ تھی۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے اس مغربی اثر کو قبول کیا وہ یا تو مذہب کے پیدا کئے ہوئے سماج میں اصلاح چاہتے تھے۔ یا حکومت کے دستور العمل میں۔ انہی لوگوں سے ہندوستان کی پبلک زندگی کا

آغاز ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی نذیر احمد کو کسی طرح نظر انداز نہیں
کیا جاسکتا۔ ان کی پبلک زندگی کا جائزہ لیتے وقت اس امر کا لحاظ ضروری
ہے کہ ان کی اصلاحی کوششیں زیادہ تر دلی کے اوسط درجہ کے اُن مسلمان
گھرانوں تک محدود ہیں جو وقت کی طوفانی ہواؤں سے بے قرینہ ہو گئے
تھے۔ اسی لئے ان کی نظر بھی محدود کہلا سکتی ہے۔ لیکن اس میں کسی شک
وشبہ کی گنجائش نہیں کہ انھوں نے اپنے موضوعِ عمل کا نہایت غور اور
خلوص کیساتھ مطالعہ کیا تھا۔ وہ اپنے زمانہ کے اچھے خاصے سمجھدار آدمی
تھے۔ چنانچہ ایک بڑی حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوئے۔
لیکن برطانوی سیاست کی پیچ در پیچ الجھنوں کو سلجھانے اور سماج کی
زیادہ گہری لہروں کا پتہ چلانے کے لئے ان سے زیادہ بعیر رہناؤں کی
ضرورت تھی یا یوں کہہ لیجئے کہ ہندوستانی سیاست اور سماج کا زیادہ سائنٹفک
اور وسیع مطالعہ کرنے کے لئے وہ قبل از وقت پیدا ہو گئے تھے۔

قانون کی کتابوں کے ترجموں کو چھوڑ دیجئے تو یہ کہا جاسکتا ہے
کہ ڈاکٹر نذیر احمد کی ادبی سرگرمیاں ۱۸۶۷ء سے شروع ہوتی ہیں جب
انھوں نے مراۃ العروس تصنیف کی جو وفات سے کچھ زمانہ بیشتر تک
برابر جاری رہیں۔ حالات کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات میں بھی کسی قدر
تبدیلی ہوتی رہی۔ مثلاً مراۃ العروس لکھتے وقت وہ حکومت کے قصیدہ
خواں تھے۔ ابن الوقت کی تصنیف تک ان کی نگاہ کبھی کبھی کمزوریوں پر
بھی پڑ جاتی تھی۔ شروع شروع میں وہ محض معاشرتی اور خانگی اصلاح
کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی توجہ ملّی تنظیم کی طرف زیادہ
منعطف ہوتی گئی اور روز بروز ہندوؤں کے کردار مذہب اور معاشرت
پر اعتراضات میں تلخی آتی گئی۔ اب وہ علانیہ حکومت سے اپنے فرقہ کیلئے
اپیل کرنے لگے۔ اس سب کے باوجود ان کے خیالات کا مجموعی اندازہ لگانا
کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ یوں تو ان کی قریب قریب ہر تصنیف کچھ نہ کچھ
مواد فراہم کرتی ہی ہے۔ لیکن ناول اور لکچر خاص طور پر کارآمد ہیں۔
لکچروں میں صاف بیانی ہے اور صفحے کے صفحے ایک ہی خیال کو ادا کرنے
کے لئے رنگین کئے گئے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ایک خاص دور کی پیداوار ہیں
اس لئے ذہنی ارتقا کا پتہ نہیں دے سکتے۔ برخلاف اس کے ناول ان کی
تقریباً تمام تصنیفی زندگی پر حاوی ہیں۔

وہ نئی تہذیب اور حکومت سے کیوں اس قدر متاثر تھے۔
اس کی خاص وجہ خود اس وقت کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں
پنہاں ہے۔ انگریزی حکومت سے بیشتر دلّی کی مرکزی سلطنت محض برائے
نام رہ گئی تھی۔ سرکاری آمدنی کم ہونے کے سبب ملازمین کی تنخواہ ٹھیک
وقت پر نہیں مل سکتی تھی۔ ایک تو قلیل تنخواہ اور پھر ٹھیک وقت پر نہ ملنا
چار و ناچار مہاجنوں کا دست نگر ہونا پڑتا۔ لہذا رشوت کا بازار گرم تھا
ایسی حالت میں بااثر ارکین سلطنت حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں
لے ہی لیتے ہیں۔ یہی دلّی میں ہوا۔ اندوختہ دُرّانی اور ابدالی کی نذر ہو ہی
چکا تھا۔ ادھر دار السلطنت میں بدنظمی بڑھتی گئی۔ ادھر رعایا کی پریشانیوں
میں اضافہ ہوتا رہا۔ اب سوائے چند نمک خواروں کے حکومت کے ساتھ
ہمدردی کا احساس ہر ایک کے قلب سے معدوم ہوتا جا رہا تھا اور لوگ سیاسی
تبدیلی کے لئے بیقرار تھے۔

افلاس اور بے روزگاری کے زمانہ میں اخلاقی انحطاط نہ
ہونا عجائبات میں ہے۔ سرمایہ سماج کا سب سے بڑا پُرزہ ہے۔ اس کی خرابی
تمام مشین کی خرابی ہے۔ لیکن فطرت کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ تعیش پسندی
کی مثالیں جتنی سرمایہ کی زیادتی کی حالت میں ملتی ہیں اتنی ہی کمی کی حالت
میں۔ پہلی حالت میں اگر اس کی وجہ بے فکری اور اطمینان ہے تو دوسری
حالت میں بے اطمینانی سے پناہ لینے کے لئے وقتی اطمینان کی مصنوعی
فضا پیدا کرنے کی کوشش۔ اس وقت دلّی میں بھی عشرت پرستی کی تند
ہوائیں ہندوستانی تمدن اور اخلاق کے سفینے کو نامعلوم اور بے پناہ
گہرائیوں میں لیجانے کیلئے اپنی پوری تیزی کیساتھ چل رہی تھیں۔

یورپ میں سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں کی پود پہلے پہل
انگریزوں ہی نے ہندوستان میں لگائی اس پر تھوڑا سا ردِ عمل ہوا
اور ہو کر رہ گیا دلوں سے خوف دور ہوتے ہی عوام اپنی مداخلت بیجا
اور بے بنیاد وہموں پر پشیمان ہو کر خاموش ہو رہے۔ شورش فرو ہونے
سے انھیں اپنی کمزوری اور نتیجۃً لازمی محکومیت کا پورا پورا احساس ہو چلا
تھا۔ بادشاہ وقت کی اطاعت کا مذہبی حکم موجود ہی تھا ایسے میں ملکۂ
معظمہ کا معرکۃ الآرا اعلان! اور کیا چاہیئے تھا لوگوں کے دل ایک دفعہ
پھر حکومت کی وفاداری کے مقدس جذبہ سے مملو ہو گئے۔

ایشیا مئی ۱۹۴۱ء

ڈاکٹر صاحب اس عصری رجحان کے صحیح ترجمان ہیں۔ وہ انھی
ں سے نئے تعلق کو فالِ نیک سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں
دہ ہندوستان کو بہشت کا نمونہ بنانے کا ہے اس لئے انھیں پورا پورا
ے کر ہندوستانیوں سے اطاعت قبول کرائیں جس کا اندازہ ذیل کے
قتباسات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ناولوں میں مصنف کے نقطۂ نظر
زہ لگانا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو پھر بھی اس کی ہمدردیاں ظاہر ہوئے
ہں رہ سکتیں اور مولوی صاحب کے یہاں تو سطح ہی پر نظر آجاتی ہیں۔

"اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی تمام عظمت
لوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں اور جن
کے ذریعہ سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزارہا قسم کی
آمد کلیں بنا ڈالی ہیں اور بناتے چلے جاتے ہیں اور ہر طرح کی کاریگری
دوسرے ملکوں کے لوگوں پر سبقت لے جا کر روئے زمین کی دولت
ملک میں گھسیٹ لے گئے اور گھسیٹے لئے جا رہے ہیں۔ جس جس
کے ہنر اہل یورپ میں ہیں ان کے ہوتے ممکن نہ تھا کہ ان کی سلطنت
یسلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں ہے بلکہ رد کمن میں ہے اور
لاحق لازمی ہے" (ابن الوقت)

"خدا نے انگریزوں کو سلطنت کے ذریعہ سے عزت اور دولت کا
بنادیا ہے اور اب اس عذر نے بخوبی ثابت کر دیا کہ جس سلطنت کو
یزوں نے بزورِ شمشیر حاصل کیا ہے۔ اس کو بزورِ شمشیر قائم رکھنے پر بھی
ر رہیں۔ ہندوستانی جس قدر انگریزوں سے بھاگتے ہیں اسی قدر
سے محروم اور دولت سے بے نصیب ہیں"

(ابن الوقت)

"انگریز جس دن سے اس ملک میں آئے ہیں اسی دن سے اس بات کے
چلے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ لکھیں پڑھیں لیاقت حاصل کریں کہ
کا افلاس دور ہو۔ ظلم زبردستی کرنا تو انگریزوں کا دستور نہیں مگر جہاں
سمجھانے سے لالچ دکھانے سے ہو سکتا ہے علم کو ترقی دے رہے ہیں"

(مراۃ العروس)

"اب زمانہ کا رنگ بالکل بدل گیا ہے خدا نے سلطنت پر مسلط کر دیا
ان لوگوں کو جو ہر طرح اس کے شایان ہیں۔ اس عملداری میں ملک نے

بڑی نمایاں ترقی کی ہے اور کر رہا ہے" (ایامیٰ)

"ڈاکٹر صاحب میرے حال پر حد سے زیادہ مہربانی فرماتے
ہیں اور میں ان کا ادب بھی کرتا ہوں اور نہ صرف ان کا بلکہ کل حکامِ
انگریزی کا کیونکہ میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ برتری ان کو خدا نے دی ہے
اور خدا کے کلام پاک میں حاکمِ وقت کی اطاعت کا حکم صریح ہے"

(ابن الوقت)

"جس طرح ملکہ کی وفاداری کی شرط یہ ہے کہ ہم اس کے انتظام
میں رخنہ انداز نہ ہوں اسی طرح ہمارے بندہ ہونے کی شرط یہ ہے کہ
ہم خدا کے انتظام میں فتور نہ ڈالیں" (رویائے صادقہ)

ابن الوقت کے الفاظ ذیل ڈاکٹر صاحب کے کردار کو پوری
طرح ظاہر کرتے ہیں۔

"میں آپ صاحبوں کے روبرو اس بات کو ظاہر کرتا ہوں کہ
میں اپنا دل گورنمنٹ کی نذر کر چکا خدا نے چاہا تو میری تمام عمر اسی میں
بسر ہوگی کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا گورنمنٹ کی فلاح میں، گورنمنٹ
کے قیام و ثبات میں، گورنمنٹ کے عام پسند ہونے میں کوشش کرتا
رہوں گا۔ اے خدا تو میرا مددگار رہ"

ان کی مذہبی ہمدردی، وسیع ہونے کے باوجود حکومتِ ہند
کی فرماں برداری کے جذبہ سے مغلوب تھی۔ ان کے لئے انگریزوں
کے ہاتھوں ریاستوں کا فنا ہونا اتنا ہی دلچسپ تھا جتنا بچے کیلئے
تتلیوں کے پر اکھاڑ پھینکنا۔

"فارس اور روم کے انتظام کے نمونے دیکھ کر آیا ہوں۔ میں
تم سے سچ کہتا ہوں کہ انگریزی عملداری کو دنیا کی بہشت سمجھتا ہوں۔
روم اور فارس کی عملداری تو خیر دور ہے اس ہندوستان ہی میں کسی
مسلمان نواب یا ہندو راجا کی عملداری میں جا کر رہو تو قدرِ عافیت
معلوم ہو اور پھر بھی ان ریاستوں میں انگریزوں کی نگرانی اور سرپرستی
کی وجہ سے بڑا امن ہے" (ابن الوقت)

"اس کے دولت آباد میں چند روز پہنچنے سے پہلے یہاں بساط
الٹ چکی تھی۔ بدنظمیٔ ریاست کی خبریں صاحب ریزیڈنٹ کو پہونچیں
اور انھوں نے بذاتِ خاص دولت آباد پہونچ کر رئیس کے کل اختیارات

ہنر ع کرامور ریاست کا اہتمام ایک کمیٹی کو تفویض کیا جس میں ریاست چند قدیم نمک خوار تھے کہ وہ رئیس کی بے اعتدالیاں دیکھ کر ترک خدمت کے گھر بیٹھ رہے تھے" (توبۃ النصوح)

ڈاکٹر نذیر احمد کی نظر سے انگریزوں کا انفرادی کردار بھی ملاحظہ مایئے:-

"خواجہ آزاد کی لڑکی کے پاؤں میں زینے سے گرنے سے سخت ٹ آگئی ہے وہ ایک لیڈی ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہے: خواجہ آزاد پہونچا یم صاحب اپنے کمرے میں سو رہی تھیں اس نے آیا سے کہہ کر جگوایا سنتے کے ساتھ ہی شب بی کے کپڑے پہنے ہوئے اوزاروں کی کسبت، دواؤں کا بکس بغل میں دبا ساتھ ہولیں"

ابن الوقت کے ایک عزیز کا بیان:-

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے کسی مرتشی انگریز سے معاملہ نہیں پڑا نہ میں نے کسی انگریز کو رشوت دی۔ نہ کسی سے سنا کہ اس نے انگریز کو رشوت دی"

"ابن الوقت کی بعض باتیں حقیقت میں سخت بیجا تھیں مگر واہ ہی شرافت۔ نوبل صاحب شروع سے آخر تک گردن جھکائے بیٹھے ہے گویا کچھ خبر ہی نہیں"

اوپر جو جملے نقل کئے گئے ہیں مصنف کے ناولوں پر ایک سرسری ظر کا نتیجہ ہیں۔ اگر اسی غرض سے بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کی اور ینکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں تین باتیں اپنی طرف زیادہ توجہ کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ اہل یورپ علم و ہنر میں ہندوستانیوں سے بیحد آگے ں۔ اس لئے ہندوستانیوں کو یورپ والوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے دوسرے لہ ہندوستانیوں کے مقابلہ میں انگریزوں کا اخلاق بہت بہتر ہے اور یسرے یہ کہ انگریزوں نے ہندوستان کو بزور شمشیر فتح کیا ہے۔ وہ ارے ملک کے جائز فرمانروا ہیں ان کی نیت اور کوشش یہی ہے کہ ہندوستان تاریکیوں کو دور کرنے کیلئے یہاں علم و ہنر کے چراغ روشن کئے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں خیالی الجھاؤ ہونے کی وجہ سے تینوں باتیں اس قدر مشترک ی ہو جاتی ہیں کہ بادی النظر میں لازم و ملزوم محسوس ہونے لگتی ہیں۔ وہ نگریزوں کے انفرادی کردار کے محاسن اور ان کے علم و کمال میں کھو کر اجتماعی ندگی کی پیچیدگیوں کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ انہی کے زمانہ میں نہیں لکہ آج بھی ہندوستان کا سمجھدار طبقہ یورپ والوں کی جدید تحقیقوں اور ایجادوں پر خراج تحسین ادا کرنے کیلئے پوری طرح تیار رہے۔ وجہیں کچھ بھی کیوں نہ ہوں، آج بھی ہندوستانی بہت سی باتوں میں اپنے وطن کے مقابلہ میں یورپ کی سماجی اور اخلاقی بھلائیوں کا گرویدہ ہو کر بہت کچھ سیکھنے کی تمنا رکھ سکتا ہے۔ لیکن آج کا ذی ہوش ہندوستانی آزاد زندگی بسر کرنا ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھتا ہے وہ کسی بیرونی طاقت کا ہندوستان کو مغلوب و محکوم رکھنے کا حق تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ یہی ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ وہ اپنے عہد کی غبار آلودہ فضا میں یہ نہ دیکھ سکے کہ ہندوستانی قوم کی مالی، علمی اور صنعتی ترقی کے لئے سب سے پہلی شرط بیرونی غلبہ کا معدوم ہونا ہے۔ اور خاص طور پر ایسی قوم کا غلبہ جس کے سرمایہ داروں کو حیوانی طاقت سے تمام دنیا کی عموماً اور محکوم ممالک کی خصوصاً، منڈیاں لوٹنے کی کھلی اجازت ہے۔ وہ یہ حقیقت کبھی نہ سمجھ سکے کہ جدید سامراج میں اعلانوں اور بیانوں کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ چند ذہین آدمیوں کو اونچی اونچی جگہ دے دینا یا اُن کے ساتھ غیر متوقع رعایتیں برتنا لازمی طور پر ساری قوم کیساتھ بھلائی کرنا نہیں یہ حکومت کا بہت بڑا فریب بھی ہو سکتا ہے۔ چار روپئے مہینے کے وظیفے سے معدودے چند کی زندگی شروع کرا کر سات ہزار روپئے تک پہنچا دینا۔ دو دو ڈاکٹری آنریری ڈگریاں دینا خطاب اور انعامات کی گنگا بہا دینا۔ قوم کی ناسمجھ اور بھوکی مچھلیوں کیلئے کانٹے میں ٹکڑا لگانا بھی ہو سکتا ہے۔ کاش وہ جانتے کہ اپنی حالت سے نتیجے اخذ کر کے کلیات بنانا اکثر اوقات محض بے وقوف کی جنت کا حکم رکھتا ہے۔

لیکن اس بات سے انھیں کیا غرض تھی جب وہ اور ان کے ساتھی مسلمانوں کی طرف سے سرکار کو وفاشعاری اور فرماں برداری کا یقین دلا چکے تو ملت پر مخصوص رعائتوں کے لئے بھی دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی زندگی نسبتاً کم عملی ضرور تھی اسی لئے وہ ملکی سیاست سے اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں کسی قدر کم واقف بھی تھے تاہم ان کے یہاں اُس ماحول کی اسپرٹ تلاش کرنا کسی طرح سعی رائگاں نہیں ہو سکتا۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ انصاف میں، انسانی ہمدردی میں، رعایا کی آزادی میں، رعایا کو مہذب بنانے میں، ملک کی فلاح و بہبود میں ملک کی ترقی میں، کوئی گورنمنٹ، انگریزی گورنمنٹ کو نہیں پاتی۔ انگریزی

گورنمنٹ میں جو نقصان ہیں عملی قسم کے ہیں۔" (ابن الوقت)

"گورنمنٹ انگریزی نے مسلمانوں کی بڑی دلشکنی کی، اس نے ہندو مسلمانوں کو ایک نگاہ سے دیکھا اور دونوں قوموں کی حالتوں کے اختلاف پر نظر نہ کی وہ کیا عمدہ ایک مثال دیتے ہیں کہ حکومت یعنی سلطنت بمنزلہ ماں کے دودھ کے ہے مسلمان بجائے اس کے بچے کے ہے جس کا دودھ حال ہی میں چھڑایا گیا ہے ...... ہندو ایسے ہیں جیسے دو ڈھائی برس کے بچے کے آگے سوبرس کا بڈھا۔" (ابن الوقت)

اس قسم کے خیالات نے کس طرح مسلمانوں کی اکثریت کو قومی جدو جہد سے الگ کرکے ایک جداگانہ اسٹیج پر تنظیم کرنے کی کوشش کی۔ اس گورکھ دھندے کو سلجھانے کیلئے ہمیں اسوقت کے سامراجی مدبّروں کی مساعی جمیلہ سے مدد لینا پڑے گی جن کے برتے پر مٹھی بھر انگریز دنیا کی ⅕ افلاس زدہ آبادی پر آج تک کامیابی کیساتھ حکومت کررہے ہیں۔

شروع ہی سے برطانوی حکومت نے مذہبی غیر جانبداری کا اعلان کردیا۔ خاص طور پر مسلمان کو غدر کا اصل محرک قرار دیا گیا۔ اور ہندو کے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا کرانے کیلئے مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں پر مظالم کی داستانیں دہرائی گئیں اور یقین دلایا گیا کہ موجودہ حکومت میں اسے اپنے مذہب پر مستعدی کیساتھ قائم رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ ہندوؤں کے تعاون سے ہندوستان پر حکومت کرنے کی کوشش ہندوستانیوں پر رحمتوں کی پہلی قسط تھی ان میں سے اکثر کچھ ہی سال میں موقع اور سہولت پاکر کسی قدر سمجھدار ہوگئے اور خود حکومت پر ہندوستانیوں کے ساتھ رعائتوں کے لئے دباؤ ڈالنے لگے مسلمانوں کو ابھی انگریزوں کی صحبت اور برکت سے زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ چونکہ ہی انھوں نے دیکھا کہ ہراول دور نکل گئے ہیں۔ انگریز اسوقت تک مسلمانوں کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا اور غیر مسلم لیڈروں کی نت نئی مانگوں سے عاجز آچکا تھا۔ اسلئے مسلمانوں سے تعاون کرکے بڑھتی ہوئی مخالف طاقت کو توڑنے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اسوقت کے اسلامی سماج پر مولویوں کا بہت اثر تھا، لہذا جو مولوی، یا لوگوں کے جذبات کو نئے سانچوں میں ڈھالنے والے افراد، ہاتھ آسکے۔ ان سے پروپگنڈا کرایا گیا کہ انگریز صاحب کتاب ہے۔ اس کے ساتھ کھانا اور شادی بیاہ کرنا شرعاً جائز ہے۔ مذہبی اعتبار سے ہر صورت میں اسلئے کافر ہندو پر ترجیح ہے اسی قسم کے نفرت پیدا کرنیوالے خیالات مشتہر کرنیکی عام اجازت دیدی گئی۔ ہندو اور مسلمان دونوں پر مذہبی آزادی کا جادو چل گیا۔ اس فرقہ دارانہ کشاکش کا اندازہ لگانے کے لئے دو چار اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ اسوقت کا انگریز جو کام خود ڈاکٹر صاحب سے ناول لکھا کر اور تقریر کرا کرلے رہا تھا ڈاکٹر صاحب وہی کام نہایت ہنرمندی کیساتھ ایک انگریز کردار نوبل صاحب سے گفتگو اور تقریریں کرا کر لے رہے ہیں۔

"ہندوؤں کا کفر تو شاید مدتوں میں جاکر ٹوٹے گا کیونکہ ان بیچاروں کے پاس رسم و رواج کے سوائے مذہب کوئی چیز نہیں مگر ہاں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر بڑا ناز ہے اور جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اُن کے مذہبی اصول اکثر اچھے ہیں بلکہ بہت اچھے ہیں ان میں اور انگریزوں میں ارتباط اور اختلاط کا ہوجانا چنداں دشوار نہیں معلوم ہوتا۔"

"میں نے مختلف اضلاع میں بہ تعلق خدمتِ سرکاری ہندوستانیوں کی اکثر قوموں کا تجربہ کیا ہے خدمتگار، چپراسی، عملہ کچہری، حکام، پیشہ ور، تاجر کوئی حیثیت کیوں نہ ہو میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو بہتر پایا ہے بمقابلہ دوسری قوم کے، یہ لوگ سختی اور مصیبت کو بڑے استقلال کیساتھ برداشت کرتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں جودت، ان کی عقلوں کی رسائی دوسری قوموں سے بہت زیادہ ہے، راست بازی، راست گوئی، دیانت، حمیت اور غیرت میں یہ لوگ اپنے ہموطنوں سے ضرور سر برآوردہ ہیں۔"

۴۳

"ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی صحبت نے بڑے بڑے نقصان پہونچائے ہیں اور منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ یہاں کے مسلمان انہی کی طرح شکلی اور وہمی ہوگئے ہیں۔ پس جو نفرت ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں سے ہے ہرگز مذہبی نہیں بلکہ ایک رسم ہے جو انھوں نے ہندوؤں سے اخذ کی ہے اور جتنے مسلمان اپنے مذہب سے بخوبی آگاہ ہیں ہرگز اس نفرت میں شریک نہیں۔"

"اب دیکھو کہ اس ملک میں اسلام کے کتنے مخالف ہیں۔ اوّل سب سے زیادہ ہندو جن میں ہم کو چار و ناچار رہنا ہے ان کی طرف سے تو ہم کو پورا اطمینان ہے کہ ڈرا کر یا لالچ دلا کر کسی طرح ہم کو اپنے مذہب میں لے ہی نہیں سکتے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہندوؤں نے ہماری کونسی رسمیں اختیار کرلی ہیں، ہم تو ان کے ساتھ رہ کر آدھے ہندو ضرور ہوگئے ہیں۔ خوف نہیں لالچ نہیں اور ہم آدھے ہندو بن گئے تو خوف اور لالچ کی صورت میں کیا عجب تھا کہ کھلم کھلا بتوں کو

ایشیا مئی ۱۹۷۱ء

پوچھنے لگتے :   (ایامیٰ)

"یہ خاص کر کچھ ہندوستان ہی کے مسلمانوں کی شامت ہے کہ انھوں نے بیوہ کے دوسرے نکاح کو عیب سمجھ رکھا ہے۔ یہ ان پر ہندوؤں میں رہنے کی پھٹکار ہے :   (ایامیٰ)

"ہندوؤں کے پاس نہ لٹریچر ہے اور نہ علم ان کو انگریزی کا اختیار کر لینا کیا مشکل تھا۔   (ابن الوقت)

زندگی کی اصلیتوں سے بچکر بھاگنا ہمیشہ مفید ہی نہیں ہوتا کبھی کبھی اس کے نتیجے درسِ عبرت ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہمیں تاریخ کے اس ناخوشگوار باب کے چند اوراق الٹنا پلٹنا پڑے۔ اپنے سیاسی رہنماؤں کی غلط بیانیوں کے باوجود آج ہم ہندوستان کی سیاسی فضا میں اتحاد کے عناصر اس وقت کے مقابلے میں کہیں زیادہ پاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو بہتر پہچاننے کے علاوہ دونوں بڑے فرقے میں ایک اچھا خاصا بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو سماج کی مشکلوں اور سہولتوں میں مادی اسباب کو بخوبی سمجھتا ہے، جو غیر ملکی غلبہ، نامناسب نظامِ حکومت، اور سرمایہ کی غلط تقسیم کو ملک کی سیاسی اور تمدنی ترقی میں حائل سمجھتا ہے اور فرقہ دارانہ کشاکش کو طبقاتی جد وجہد میں تبدیل کرکے ایک طرف ہندوستان کو ہندو مسلم فسادوں سے نجات دلانا چاہتا ہے اور دوسری طرف سرمایہ کو صحیح طور پر تقسیم کرکے موجودہ انسانی زندگی کی بے اطمینانی اور حاسدانہ مقابلہ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ جو اپنے وطنِ عزیز کو سامراجی پنجوں سے چھڑا کر اس میں قومی دولت پیدا کرنے والوں کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ ہندوستان جلد از جلد ضروری منازلِ ترقی طے کرتا ہوا دنیا کے زیادہ سے زیادہ متمدن ممالک میں شمار کیا جانے لگے جسے ہر اُس ہندو اور ہر اُس مسلمان سے پوری ہمدردی ہے جو کسی بھی ہندو یا مسلمان یا عیسائی سرمایہ دار کے پنجوں کے نیچے بیدردی سے کچلا جا رہا ہے۔ جو مہاجنوں کے ہاتھوں دلی کے شریف مسلمان گھرانوں کا لٹنا ڈاکٹر نذیر احمد کی طرح محسوس کرتا ہے لیکن ان کی طرح خود اپنا روپیہ قرض پر چلا کر ایک بڑا مہاجن بننے کی فکر میں نہیں۔

اصل میں ڈاکٹر نذیر احمد کے وقت میں طبقاتی تقسیم کا تصور مشہور رہبروں کے ذہنوں میں بھی نہیں تھا۔ قوم اوسط طبقہ تک محدود سمجھی جاتی تھی موصوف کو تو اس طبقہ کے ساتھ اس قدر ہمدردی ہے کہ شرافتِ نسل کے مقابلہ میں نچلے طبقہ والے رذیل اور کمینے دکھائی دیتے ہیں۔ مراۃ العروس میں محمد عاقل اکبری کو سمجھا رہے ہیں۔

"تم کو ان لڑکیوں کا کچھ حال بھی معلوم ہے۔ چنیا تو بھٹیاری ہے زلفن شاید بخشو قلعی گر کی کوئی ہے، رحمت سقنی ہے، اور اس کالی کالی کلٹی کو میں نے اکثر موتن کنجڑے کی دوکان پر دیکھا ہے میں سمجھتا ہوں ضرور اس کی بیٹی ہوگی۔ موتن سے اس کا نقشہ بھی ملتا ہوا ہے۔ بھلا پھر یہ لوگ اس قابل ہیں کہ تم ان کو اپنی سہیلیاں بناؤ"

جان نثار انگریزوں میں نسلی امتیاز کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

"جو جو امتحان پاس کرتا ہے اس کو نوکری مل جاتی ہے شریف اور رذیل کا امتیاز نہیں ہوتا۔ اکثر عوام، بلکہ دھوبی، حجام، موچی، بھٹیارے وغیرہ پیشہ وروں کے لڑکے جن کی ولایت میں کچھ بھی عزت نہیں محنت کرکے امتحان پاس کر لیتے ہیں اگرچہ ان کے تعلیم یافتہ ہونے میں کچھ شک نہیں مگر تاہم ع - اصل بد از خطا خطا نکند۔"

خود نوبل صاحب کا عذر پر تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔

"اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ باغیوں میں بہت سے مسلمان بھی ہیں۔ مگر کون مسلمان؟ اکثر عوام الناس۔ پاجی کمینے، رذیل"۔ افسوس ڈاکٹر صاحب یہ نہ سمجھے کہ اول تو عوام الناس کا پاجی پن کمینہ پن اور رذالت شریف زادوں کے غرور ظلم اور عیش کے مقابلہ میں سماج کی ابتری کے بہت کم ذمہ دار ہیں دوسرے وہ قریب قریب ہر حالت میں موخر الذکر کی نوازشوں کا نتیجہ ہیں۔

حقیقت اکثر روشنی کی تاریک سے تاریک کوٹھری میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ ڈپٹی صاحب اپنی محدود نظر کے باوجود زندگی کے نئے رجحانات محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ برطانوی حکومت کی مداحیوں کے ساتھ ساتھ وہ کبھی کبھی یہ کہنے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔

"یہ مصیبت کس کے آگے روئیں کہ انگریزی عملداری نے ہماری دولت، ثروت، رسم و رواج، لباس، وضع، طور طریقہ، تجارت، مذہب علم، ہنر، عزت، شرافت، سب چیزوں پر تو پانی پھیر ہی تھا ایک زبان تھی اس کا بھی یہ حال ہے:"   (ابن الوقت)

(باقی مضمون صفحہ ۸۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

دکھ

ایشیا

دوسرا باب

افسانے و ڈرامے

مئی سنہ ۱۹۴۱ء

پریمی

رائے سینا جو اپنی شہرت کی وجہ سے اب محتاج نہیں۔ غدر سے پہلے ایک آباد گاؤں تھا۔

جہاں اب سرکاری دفاتر حکام و روسا کی عالیشان نظام پیلس اور گورنمنٹ ہاؤس کی سر بفلک عمارتیں اہل لسان کو اپنی چمک سے مرعوب کرتی ہیں۔ یہاں کبھی بے فکر، فاقہ مست کسانوں کی .ں اور کوسوں تک سر سبز کھیت لہلہاتے نظر آتے تھے۔

موٹروں کے ہارن کی آوازوں کے گونجنے کے بجائے پنگھٹ بھرنے والی دوشیزاؤں کے سُریلے نغمے دلوں کے پار ہوا کرتے تھے۔ اس گاؤں میں ڈیڑھ سو کے قریب گھر تھے۔ ان میں سب سے نمایاں رائے گلاب سنگھ کا گھر نظر آتا تھا جو نصف کے قریب پختہ اور تمام گاؤں میں واحد عالیشان مکان تھا۔

رائے گلاب سنگھ اس گاؤں کے مکھیا تھے۔ ان کے باپ اس گاؤں کے سب سے بڑے کاشتکار تھے۔ لیکن رائے صاحب نے اپنی جوانی میں بہت سارا روپیہ اپنی تماش بینی کی نذر کر دیا پھر بھی اُن کی ٹکر کا کوئی تمام گاؤں میں نہ تھا۔ بیس گائیں اور بارہ بھینسیں اب بھی اُن کے ہاں بندھی تھیں چار جوڑیاں ہل کے بیلوں کی تھیں اور بہلی اور ایک گھوڑی سواری کے لئے تھے۔ تمام گاؤں میں شادی کے موقع پر دولہا دلہن کے لئے ان کے ہاں کی گھوڑی اور بہلی جایا کرتی تھی۔ چالیس بیگھے پختہ کے وہ واحد مالک تھے۔ ان کے کھیتوں پر کئی نوکر کام کر رہے تھے اور ان کی حیثیت اس گاؤں میں خود مختار بادشاہ سے کم نہ تھی۔ گاؤں کے تمام مقدمات کا فیصلہ کرنا بھی ان کے فرائض میں سے تھا۔

ان کے گھر کی روشنی صرف ایک لڑکی چندراوتی تھی۔ یہ تیرہ سالہ دوشیزہ تھی۔ اس کا رنگ کھلتا ہوا سانولا تھا اور یہ رنگ جوانی میں، اگر خط و خال دلکش ہوں تو گورے رنگ پر بھی سبقت لے جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ چندراوتی کے من موہنے والے مکھ پر نظر ڈالنے کے بعد ہر کوئی اسکو دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور غزالی تھیں۔ ان سے بجائے شوخی کے معصومیت ٹپکتی تھی۔ اپنے ملکوتی حسن کی وجہ سے چندراوتی ایک دیوی معلوم ہوتی تھی اس کے حسن میں شکنتلا یا سیتا جیسی پاکیزگی جھلکتی تھی۔ رائے صاحب چندراوتی کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس لئے ہندوانی رواج کے مطابق اس کی ابھی تک شادی بھی نہیں کی تھی۔

ان کے ساتھ ایک یتیم لڑکا ششیش چندر بھی رہتا تھا۔ ششیش کے باپ بہادر سنگھ اور رائے صاحب کا گہرا دوستانہ تھا اور وہ قریب کے گاؤں کے مکھیا تھے۔ مگر بہادر سنگھ جوانی میں بیکنٹھ باشی ہوئے تو چھوٹے بھائی نے زمینوں اور تمام چیزوں پر قبضہ کر کے دکھیاری بیوہ بھاوج کو گھر سے نکال دیا۔ اس غریب کا میکے میں بھی کوئی پوچھنے والا نہ رہا تھا بیچاری بیکس عورت کس سے کہتی سنتی اور کیونکر ظالم دیور سے سب چیزیں نکلواتی، ششیش ابھی صرف تین سال کا معصوم بچہ تھا۔ روتی دھوتی رائے صاحب کے ہاں آئی انھوں نے اس دکھیا کی بہت تسلی کی اور کہا بھابی یہ تمہارا گھر ہے اور یہ میرا بچہ، یہاں رہو اور چنتا نہ کرو اس پاپی سے سمجھ لوں گا۔" ابھی تک رائے صاحب کے ہاں بچہ نہ ہوا تھا اس لئے ششیش کے آجانے سے ان کے گھر میں رونق ہو گئی۔ رائے صاحب کی بیوی بھوجی تو ششیش پر قربان اور نثار تھیں اور ششیش کی ماں کہتی تھی "بہو جیسے تینے مجھ دکھیا کا دل ٹھنڈا کیا ایشور تیرا بھی کرے چندریاں جیسے پترسے تری گود بھرے۔"

بھوجی لمبا سانس لے کر جواب دیتیں۔ "بھلا بھابی اب نو برس گذر گئے۔ ایسا ہوگا۔ میرے کرموں میں ہی نہیں۔" ششیش اور اُس کی ماں کو اس گھر میں ہر طرح کا آرام تھا۔ رائے صاحب پوجا اشنان کے بعد ششیش کی ماں کے پاؤں چھو کر اس کو پرنام کرتے اور اس کی بہت عزت کرتے

تھے۔ ان کی بیوی کا ہر وقت بھابی کہتے کہتے مُنہ سوکھتا تھا۔ اور شیش کے لئے ہر میلے اور تہوار پر کھلونے، کپڑے مہیا کرنا رائے صاحب کا فرض تھا۔ وہ بھی اب ان کو ہی باپ سمجھتا تھا۔ خدا نے شیش کی ماں کی دعا قبول کی۔ ان لوگوں کو یہاں آئے تیسرا سال تھا کہ بھوجی کی گود مہ جبیں چندراوتی سے بھر گئی اور اُس نے مسکرا کر کہا۔ "لے بھو ایشور نے میرے نصیب سے من موہنی چھوری دے دی۔"

رائے صاحب دروازے کی اوٹ سے بولے۔ "ہاں بھابی ہمارے ایسے نصیب کہاں یہ چھوری تو تیرے کدموں کی برکت سے ہوئی ہے تیری ہی ہے۔ میرا بیٹا تو شیش ہے۔"

شیش کی ماں بولی "بھیا مجھے گریب سمجھ کر ان بولوں کو بھلا نہ دیجو یاد رکھیو۔"

رائے صاحب نے کہا "لے بھابی یہ بھلا کہیں ہو سکے ہے۔"

اور بھوجی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس طرح چندراوتی کے ہوتے ہی اُس کی سگائی شیش سے ہو گئی۔

زمانہ گزرتا رہا۔ چندراوتی اور شیش اپنے بڑوں کے قول و قرار سے بے خبر پلتے رہے مگر غریب شیش ازل سے بدنصیب تھا۔ ابھی پورے بارہ سال کا بھی نہ تھا کہ ماں ہیضے کے مرض میں مبتلا ہو کر تین دن میں چٹ پٹ ہو گئی اور وہ خدا کی اس وسیع دنیا میں بے یار و مددگار رہ گیا۔ رائے صاحب اور بھوجی کی شفقت اور چندراوتی کی بھولی رس بھری باتوں نے بہت جلد شیش کے دل سے ماں کا غم دور کر دیا۔ شیش بڑا ہونہار لڑکا تھا۔ بوڑھے پنڈت تلوک چند سے جا کر وہ رامائن پڑھا کرتا تھا گاؤں کے پٹواری سے ہندی اُردو سیکھتا تھا۔ اور چھوٹی سی عمر میں ایسا مشاق شکاری تھا کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر نشانہ لگاتا تو گولی کم خطا نہ کرتی تھی گھر میں زیادہ وقت پھلواری سنبھالنے اور چندراوتی کو پڑھانے میں صرف ہوتا تھا۔

نازنین چندراوتی کو گاؤں کے قاعدے کے مطابق ہر صبح پنگھٹ سے پانی لانے کے لئے جانا ہوتا تھا۔ ہر صبح وہ اپنی سہیلیوں پھول کنور اور بسنتی کے ساتھ پنگھٹ پر سورج نکلنے سے پہلے پہنچ جاتی تھی۔ ایک صبح کو اُس نے گاگر اپنی نازک کمر پر رکھ کر ادھر کھیت والے مکان کے دروازے پر جا کر سُریلی آواز سے "سکھی" اور جواب نہ ملنے پر دوبارہ آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور پھول کنور جو بڑی شوخ ڈھنگ سانولی سلونی تلیتی گھڑا لیے ہوئے نکلی اور چندراوتی کے چٹکی لےکر شوخ لہجے میں، "تجھے کیا کام ہے۔ بس صبح ہوئی اور گاگر لے دوڑ پڑی۔ یہ نا بڈھے پران ناتھ کو میں کیسے چھوڑ کر صبح سویرے نکل پڑوں۔ دا رکرے تیرا بھی جلدی بیاہ ہو جو تجھے کدر کھلے۔"

چندراوتی نے لجاتے ہوئے کہا "نہ سکھی مخول مت کرے" اور پھول سا بھلاتی ہوئی ساتھ ہو لی۔ پنگھٹ پر بسنتی بھی مل گئی اور تینوں نے رکھ کر ہنس ہنس کر باتیں کرنی شروع کر دیں۔ گاؤں کی پنگھٹ بس ایک اسمبلی سے کم نہیں ہے جہاں تمام واقعات پر بحث اور لے دے ہوتی ہے۔ پٹواری کی بہو کے ہاں بچہ کیوں نہیں ہوتا، رامو کے ہاں ہر سال لڑکیاں ہوتی ہیں، بشیشر ناتھ کو روپیہ کہاں سے ملا جو اُس نے نیا مکان بنوایا۔ منگلو کا گونا کس لئے ہوتے ہوتے رُک گیا۔ بدھوا کی بیوی کے بھاگ جانے میں کیا راز تھا، زمیندار کی کتنی بھینسیں ہیں۔

غرضکہ یہاں بیٹھ کر عورتیں تمام معاملات کی چھان بین کر ڈالتی ہیں یہ تینوں سکھیاں بھی پہلے تو اِس قسم کی باتیں کرتی رہیں پھر پھول کنور نے جو بہت چلبلی سولہ سالہ نازنین تھی اور جس کی شادی بارہ سال کی عمر میں خوش حال گھرانے میں ہو گئی تھی، اپنی بڈھی بہری ساس کی نقلیں اُتار کر دونوں سکھیوں کو ہنسانا شروع کر دیا۔ چونکہ پھول کنور کا خاوند نہال چند اس سے عمر میں پندرہ برس بڑا تھا اور یہ اُس کی دوسری شادی تھی اس لئے وہ مذاق سے اُس کو بوڑھا کہا کرتی تھی۔

جب خوب دھوپ پھیل گئی تو یہ تینوں گھروں کو واپس ہوئیں۔ چندراوتی کی نازک کمر ہر قدم پر گھڑے کے بوجھ سے لچکتی تھی۔ چندراوتی گھر آئی تو شیش پھلواری سنبھالنے میں مصروف تھا وہ بھی پھولوں میں پانی دینے لگی۔ پھر دونوں نے دودھ دلیے کا ناشتہ کیا۔ اس کے بعد شیش تو رامائن پڑھنے چلا گیا اور چندراوتی بھی شیش سے جو کل سبق لیا تھا اُس کو یاد کرنے بیٹھ گئی۔

اس وقت جب یہ دونوں اپنے مستقبل سے بے فکر اپنے مشاغل میں منہمک تھے، بھوجی اور رائے صاحب اندر کے کوٹھے میں ان کے متعلق

غور کر رہے تھے۔

بھوجی بولیں" ہاں تو کب تک چھوری کا بیاہ نہ کرو گے اس کی سکھیوں کے چھورا چھوری بھی ہوگئے اور یہ کنواری ہانڈے ہے زندگی کا کون بھروسہ ہے کوئی اچھا لڑکا دیکھو نا"

رائے صاحب حقہ گڑگڑا کر بولے "چھورا تو گھر میں موجود ہے اب کی فصل اُٹھنے دو، شادی بھی کردیں گے۔ کیا بھابی کو بچن دینا بھول گئی؟"

بھوجی مُنہ سکیڑ کر" میں اپنی چھوری ایسے کنگال کو نہ دوں گی"

رائے صاحب۔" تو بچن سے پھرتی ہے تو پھر میرا یہ دھرم نہیں ہے، چندراوتی کے ہونے پر تو نے بچن دیا اور اب بھابی سورگ باش ہوئی تو پھر گئی۔ ششیش جیسے چھورے ملتے کہاں ہیں۔ گبرو جی دار سیدھا سادھا دو حرف بھی جانتا ہے اس میں کیا برائی ہے۔ پیسے کی ہیں کیا جرورت ہے"

بھوجی بگڑ کر" چھوری ہماری ہے۔ تینکو کیا۔ میں اس پھلس کو نہ دوں گی"

رائے صاحب" بہو تو گستہ کر یا کچھ کر، مجھے جب تک ششیش جیسا چھورا نہ ملے گا میں چندراوتی کا بیاہ نہ کروں گا۔ اب تیرھویں پورن ماشی تک باٹ دیکھوں گا اگر کوئی چھورا دھیان میں آگیا تو کھیر، نہیں تو پھر ششیش سے ہی چندراوتی کے پھیرے کرا دوں گا۔ تو برا مان چاہے بھلا"

پورن ماشی کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھا۔ چندراوتی اور پھول کنور جھیل کے کنارے بیٹھی ہوئی پانی پر چاندنی کے لوٹنے کا منظر دیکھ کر لطف اُٹھا رہی تھیں، پھول کنور حسب عادت چہل کر رہی تھی اس نے اٹھلا کر کہا" بتا تو چندے تو مجھے کتنا چاہتی ہے؟"

چندراوتی مسکرا کر بولی۔" لے بھلا سکھی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ماتا پتا کے بعد اگر کوئی مجھے دنیا میں پیارا ہے تو وہ تو ہے"

پھول کنور۔ شوخی سے آنکھیں مٹکا کر" کیا ششیش سے بھی جیسا وہ ...."

چندراوتی لجا کر رہ گئی اور اُس کے نازک لبوں پر ہلکا سا تبسم آگیا۔

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد پھول کنور نے کہا" سکھی کل سانج (شام) میں نے ایک نئی بات سنی ہے۔ کیوں تجھے کچھ معلوم نہیں تیرے ماتا پتا کا کھیال بدل گیا ہے"

چندراوتی گھبرا کر بولی" نہ سکھی مجھے تو کچھ بیرا (خبر) نہیں کا بات بھئی جلدی بتا دے"

" تیری ماتا رائے صاحب سے جھگڑا کر رہی تھیں کہ میں چندے کا بواہ ششیش سے نہ کروں گی۔ رائے صاحب نے بہت سمجھائی پر وہ نہ مانی تو وہ بولے۔ اگر آج سے تیرھویں پورن ماشی تک کوئی ششیش سے اچھا چھورا نہیں ملا تو پھر ششیش سے ہی میں چندے کو بواہ دوں گا" پھول کنور نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

" بھلا یہ کتنے روج کی بات ہے" چندراوتی نے گھبرا کر دریافت کیا

" سکھیا کہتی تھی دھان کٹ چکے تھے اور پٹواری کے ہاں چھوتا ہوا تھا جب کا جکر (ذکر) ہے" پھول کنور نے جواب دیا۔

" سکھی اس کو تو بہت دن ہو گئے" چندراوتی نے سوچتے ہوئے کہا

" سکھیا نے تری ماتا سے کہا بہو اب تو چندراوتی جوان ہو گئی اسکا بواہ کیوں نہیں کرتیں تو اُنھوں نے یہ جواب دیا" پھول کنور نے ادائے مستانہ سے انگڑائی لے کر کہا۔

چندراوتی کے پھول کنور کی باتوں سے ہوش اُڑ گئے تھے اس لئے وہ مغموم اور خاموش سکتے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس کی حالت کا احساس کر کے پھول کنور مسکرا کر بولی۔" ہے تو دیوانی کیوں ہوئی جاتی ہے میرا جیجا تو ششیش ہی بنے گا۔ پیپل کی منت مان لے۔ بہت سا گڑ بانٹیو"

چندراوتی نے لجا کر کہا،" ہے پنوتی کیوں بات بنائے ہے میں تو یوں ہی تنک چپ ہوگئی تھی۔ چل کھڑی ہو میرا جیجا تیری باٹ دیکھتا ہوگا"

یہ دونوں چلنے کے لئے اٹھی ہی تھیں کہ پھول کنور کی نند چمپا نے آواز دی" بھابی جلدی آ بھیا بلاتے ہیں" پھول کنور نے شوخ لہجے میں کہا" اری جلدی چل۔ بڈھا آگیا" اور چھلاوے کی مانند چل دی۔ لیکن چندراوتی کے دل پر غم کا ایک بوجھ تھا۔ جس کے بار سے وہ دبی جارہی تھی اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی سوچ میں غرق چل رہی تھی بمشکل سے پندرہ قدم گئی ہوگی کہ جنگل کے سرکلوں میں آہٹ ہوئی اور اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ششیش جنگل سے نکل کر تیز قدم اُٹھاتا ہوا اس کی جانب آرہا تھا

وہ ٹھہر گئی اور حیرت سے اُس کا مُنہ تکنے لگی۔

ششیش قریب آکر بولا" چندے یہ پھول کنور کیا کہہ رہی تھی ذرا بتلاؤ تو "

چندراوتی، تینے کہاں سے سُنا؟

ششیش شہر سے واپس آکر میں گھر جا رہا تھا کہ پھول کنور کو اور تجھے یہاں باتیں کرتے دیکھ کر پھول کنور سے مخول کرنے کے کھیال سے درکھت کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ مگر یہ باتیں ایسی تھیں کہ جس سے مخول کا کھیال جاتا رہا اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے تو سپنے میں بھی یہ کھیال نہ آیا تھا کہ چاچی کی مت یوں پلٹ جائے گی "

چندراوتی " رام جانے ماتا کو کیا ہو گیا ہے "

ششیش لمبا سانس بھر کر بولا" چندے یہ ساری گھات ہرکشن کی ماں رامو کی ہے۔ اُس نے پہلے تو سونا روپا دکھا کر لالچ دیا مگر جب چاچا چاچی نٹ گئے اور کہہ دیا کہ چندراوتی کی سگائی تو بالے پن سے ششیش سے ہو گئی ہے تو اس نے اور چال چلی "

چندراوتی متفکرانہ لہجے سے " پٹواری کے ہاں دھیوتا ہوئے کتنے مہینے گزر گئے ؟"

ششیش چاند کو دیکھ کر، اُنگلیوں پر حساب کر کے " گیارھویں پورن ماشی ہے۔ خوش ہو کر، ایشور یہ دن بھی گزار دے تو پھر مری چندے ہمیشہ کے لئے میری ہو جائے گی "

چندراوتی کے پھول سے رخسار شرم سے عرق آلود ہو گئے اور وہ لجا کر بولی " ششیش بھیا مخول مت کرے۔ ہمیں تو تو ذرا بانسری سنا دے "

ششیش نے بانسری سنبھالی اور اپنے دل کی ملکہ کو خوش کرنے کے لئے تمام تر قوتِ نغمہ صرف کر کے ایک پریم کا رسیلا گیت دلکش انداز سے بانسری کی دُھن میں سُنانے لگا۔

چندراوتی ساکت، ہاتھ کا سہارا رخسار کو دیئے بیٹھی تھی اس کی سیاہ کنارے کی سفید ساری کا آنچل ہوا کے لطیف جھونکوں سے سر پر سے ڈھلک کر شانے پر آ رہا تھا۔ چند بال منتشر ہو کر رخسار کا بوسہ لے رہے تھے۔ اس کی صورت سے نزاکت کے علاوہ عصمت کا تقدس ظاہر ہو رہا تھا اور وہ مقدس سیتا کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

ششیش نے جب بانسری ہاتھ سے رکھی تو وہ چونکی۔ ساری کا آنچل سنبھالا اور جانے کے لئے اٹھی۔ ششیش بھی اُس کے ہمراہ چلا۔ چونکہ رات کافی آ گئی تھی اس لئے دونوں تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گھر کی جانب چل دیئے

برکھا رُت تھی اور گھنگھور گھٹائیں جذبات کو اُبھار رہی تھیں گاؤں کی بہو بیٹیاں وسیع میدان میں جھولا جھولنے کے لئے جمع ہو چکی تھیں برگد کے بڑے پیڑ میں دو جھولے پڑے تھے۔ جن میں باری باری سب جھول رہی تھیں۔ پھول کنور اور چندراوتی بھی باری آنے پر پاؤں جوڑ کر آمنے سامنے بیٹھ گئیں اور ایک خفیف اشارے کے ساتھ دونوں لڑکیاں ہوا میں متحرک ہو گئیں۔ جھولے کی رفتار بڑھتی گئی یہاں تک کہ ان کی ساریوں کے آنچل سروں سے کھسک کر شانوں پر آ گئے اور بال بھی چوٹی کی بندش سے آزاد ہو کر چہروں پر بکھر گئے۔ چندراوتی کی چنبئی اور پھول کنور کی گلابی ساریوں کا تصادم ایک دلچسپ منظر پیش کر رہا تھا دونوں کے کانوں میں بیلے کی کلیاں تھیں اور آنکھوں میں کاجل، صندلی کلائیوں میں سبز چوڑیاں تھیں اور ہاتھوں میں مہندی رچی تھی۔ ہاتھی دانت کی نفیس چوڑیاں اور ماتھے کی بندی پھول کنور کے شادی شدہ ہونے کا نشان تھی۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد پھول کنور بولی " چندے مرج کر تیرھویں پورن ماشی بھی اٹھواڑے میں ہو جائے گی۔ میرا جیجا تو اب ششیش ہی بنے گا۔ پھر اس سے کھوب مخول کروں گی "

چندراوتی نے اسکا نازک ہاتھ دبا کر آہستہ سے کہا" سکھی چپ رہ، کوئی سن لے گا تو بڑا بُرا ہو گا۔ تجھے تو ہر دکھت یہی دل لگی رہتی ہے " پھول کنور سے بھلا کب چپکا بیٹھا جاتا تھا آنکھیں مٹکا کر گانے لگی۔

" سکھی کہہ دو بلم سے ہمیں لے جائے رے "

چندراوتی بھی اس کا ساتھ دینے لگی۔ ان دونوں کی سُریلی آوازیں جوانی کے نشے سے بھرپور لیکن راگ کی قیود سے ناآشنا تھیں۔ ان کو دلکش بنانے والا صرف جوانی کا قدرتی جذبہ تھا۔ یہ گانا دل کا نغمہ تھا۔ دونوں کی بھنبیری آوازیں کانوں کے پار ہو رہی تھیں۔ یہ گیت ختم ہوا تو چندراوتی نے گیت شروع کیا۔ اس مرتبہ پھول کنور نے اُس کا ساتھ دیا

آیا ساون کا مہینہ سب سکھی کھیلیں کجری
کجری کھیلیں جھولا جھولیں نیر کی نگری ۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ مگر وہ جوانی ہی کیا جو لا پرواہ نہ ہو اور سب عورتیں چل دیں مگر یہ دونوں گاتی اور جھولتی رہیں۔ یکایک گھوڑے کی ٹاپ کی قریب ہی آہٹ ہوئی۔ پھول کنور نے جدھر سے آواز آئی تھی اُدھر مڑ کر دیکھا اور ایک دم جھولا ٹھیرا، گھونگٹ مار چل دی یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ چندرا تی واقعہ کی اہمیت پر ہی غور کرتی رہ گئی اس نے اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک نوجوان وجیہہ سوار کو دیکھا جو اودی دھاری دار بانکی پگڑی باندھے تھا اور اُس کی جانب اشتیاق آمیز نظریں ڈال رہا تھا۔ چند منٹ وہ سکتے میں رہی۔ پھر سنبھل کر جھولے سے اُتری اور بھاگ کر اپنے گھر میں ہو رہی جو یہاں سے ذرا ہی دُور تھا۔ گھر کے سامنے کا اکہرا پختہ دالان رائے صاحب کی کچہری اور دیوان خانہ دونوں کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس میں بیٹھ کر وہ مقدموں کا بھی فیصلہ کرتے تھے۔ اور دوستوں سے گپ بازی بھی۔

چنانچہ اس وقت بھی پٹواری دینا ناتھ اور پنڈت دیاکشن جگنا نائی اور دلیپ بنیا ان کے اِردگرد بیٹھے تھے اور دنیا بھر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر رائے زنی کی جا رہی تھی۔

رائے صاحب کی حیثیت صدر اسمبلی سے کم نہ تھی وہ ہر ایک کی بات کو غور سے سُنتے، تحقیق کرتے اور پھر ایک قطعی حکم لگا دیتے۔

قدموں کی آہٹ پر سب کی نظریں اُٹھیں اور ایک بانکے نوجوان نے رائے صاحب کی توجہ کو اپنی طرف کر لیا۔

نوجوان نے قریب آ کر رائے صاحب کو ڈنڈوت کی اور انھوں نے کہا "براج مانو ٹھاکر ان کہاں سے آنا ہوا؟"

نوجوان نے جواب دیا "قلعہ سے آتا تھا گھر جا رہا تھا کہ راستے میں برکھا نے آ لیا۔ یہ گاؤں کریب تھا اس لئے ٹھیر گیا۔"

"یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔ اب سنجا ہونے کو ہے تڑکے ہی چلا جائیو۔ مینہ بوندی کے دنوں میں رات کو گھر سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔ کون گاؤں کا چھورا ہے۔ اور کیا نام ہے" رائے صاحب نے مہربانی کے لہجے میں کہا۔

نوجوان ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "تمہاری کرپا ہے۔ رات یہاں گزار دوں گا۔ میرا نام اودے سنگھ ہے اور سونا ہمارا گاؤں ہے۔"

رائے صاحب "تو اندر سنگھ کا چھورا ہے کیا؟"

اودے سنگھ "میرے پتا اندر سنگھ ہی تھے۔"

رائے صاحب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے "ہے چھورے تینے مجھے بھلا دیا۔ تیرے پتا سے تو میری دانت کاٹی روٹی تھی جب سے اندر سنگھ بیکنٹھ باشی ہوئے میں نے سونے کا جانا چھوڑ دیا۔ ان کے سامنے دنوں وہاں رہا کردں تھا۔"

اودے سنگھ۔ "چاچا جی پتا کے مرنے کے دکھت میں نو برس کا تھا اس لئے کیا یاد رہتا۔"

رائے صاحب۔ "اودے تو بالکل اپنے باپ کی صورت ہے (ٹھنڈا سانس لے کر) وہ بھی ایسا ہی بانکا تھا۔ کلے (قلعہ) میں کیا کرتا ہے تو؟"

اودے سنگھ۔ "میں بیگمات کے محلات کی باہر کی ڈیوڑھی کے گارد میں نائب کیدان ہوں۔"

۴۱ رائے صاحب۔ "اور کتنے بہن بھیا ہیں تمہارے۔ کہیں سگائی تری ہوئی یا نہیں؟"

اودے سنگھ "مجھ سے بڑی ایک بہن ہے۔ اس کا بیاہ ہو گیا۔ میرا بھی بواہ ہو گیا تھا مگر ایک سال بعد بہو مر گئی۔"

رائے صاحب یہ سن کر بہت مسرور ہوئے اور بولے "چل تو اپنی چاچی کے پاس چل۔"

بہو جی نے جو رائے صاحب کے ساتھ ایک نوجوان کو آتے دیکھا ہندوانی رواج کے مطابق گھونگٹ نکال کر اور اس میں سے ایک آنکھ نکال کر آنے والے کو دیکھنے لگیں۔

اودے سنگھ نے پاؤں چھو کر بہو جی کو پرنام کیا۔

رائے صاحب بولے۔ "چندرا کی ماں اندر سنگھ کے بیٹے اودے سنگھ کو بھول گئی جو اتنا لمبا گھونگٹ نکال لیا۔"

بہو جی نے ایک نظر غور اس بانکے جوان پر ڈالی اور کہا "لے بھلا مجھے کیا بیرا کہ یہ اودے ہے۔ جرا سا اپنے پتا کے ساتھ آیا کرے تھا۔ جوان

ہوئے پیچھے تو آج دیکھا ہے۔"

اودے سنگھ کی جانب مخاطب ہوکر۔" بیٹھ جا لالہ، تیری ماتا تو اچھی ہے؟"

اودے سنگھ نے جواب دیا۔" ایشور کی کرپا سے ماں جی راجی ہیں۔"

چند رسمی باتوں کے بعد پیتل کے چمکتے ہوئے تھال میں گاؤں کے بہترین اور پر تکلف کھانے دودھ، گھی، مٹھائی رکھ کر بہو جی نے اودے سنگھ کے سامنے بھوجن پروسا۔ پانوں کے بیڑے بنا کر دیئے اس کے بعد ایک کوٹھے میں جو مہمانوں کے لئے مخصوص تھا اس کے لئے بستر بچھا دیا گیا اور جب وہ وہاں بستر پر دراز ہوگیا تو رائے صاحب پھر بہو جی کے پاس آکر بولے۔" چندے کی ماں تیری بات ایشور کو رکھنی تھی جو اس چھورے کو بھیجدیا۔ یہ بھی میرے مترکا چھورا ہے اور شیش سے ہر بات میں اچھا ہے۔ چار پیسے ویسے بھی کما لیتا ہے۔"

بہو جی بولی۔" مگر اس کا بیاہ ہوگیا ہوگا۔"

رائے صاحب۔" میں نے پہلے ہی پوچھ لیا ہے۔ بیاہ ہوا تھا۔ مگر بہو گجر گئی۔ اور ابھی کہیں بات چیت نہیں لگی ہے۔"

بہو جی نے خوش ہوکر کہا۔" جب تو بہت ہی بھلا ہے، ایشور نے بڑی کرپا کی۔ اب میری چندر ارانی بن کر رہے گی۔"

رائے صاحب۔" شیش سے جیادہ گبرو ہے۔ پر مجھے اس کا کھیال ہے کہ شیش کو بڑا الم ہوگا۔"

" اونہہ ہوا کرے، ہمیں اپنی چھوری کا کھیال کرنا ہے۔" بہو جی نے مُنہ بنا کر جواب دیا۔

" اچھا تو اب میں جگنا نائی کو اودے سنگھ کے پیر دابنے کو بھیجتا ہوں وہ اس کا کھیال معلوم کرے گا۔ بڑا چاتر ہے۔" یہ کہہ کر رائے صاحب باہر آگئے، اور کچھ دیر سرگوشی کرنے کے بعد جگنا کو اودے سنگھ کے پاس بھیجدیا۔

اودے سنگھ بستر پر لیٹ تو گیا تھا۔ مگر نیند اُس سے کوسوں دُور تھی اُس کا خیال ابھی تک چندراوتی کے رُخِ زیبا کی بلائیں لے رہا تھا جس کو آج وہ جھولے پر چند منٹ کے لئے دیکھ کر مبہوت ہوگیا تھا۔

جگنا دبے پاؤں آیا اور اودے سنگھ کی ٹانگوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیئے۔

اودے سنگھ نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور جگنا کو پیر دباتے دیکھ کر مہربانی کے لہجے میں بولا" میرے پاؤں میں تو کچھ دُکھ نہیں ہے پھر کیوں نا حق تکلیف کرتے ہو۔ آؤ بیٹھو۔"

جگنا نے زمین پر بیٹھ کر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔" میں نے کھیال کیا کنور جی تھنے تھکے کیا ہوگا۔"

اودے سنگھ نے مسکرا کر جواب دیا" ابھی تو نیند نہیں آئی تھی ہاں یہ تو بتلاؤ جگنا ہمارے چاچا جی کے کوئی بالک بھی ہے۔"

" ایشور کی کرپا سے ایک پتری ہے چندراوتی اور چندرماں کی طرح سندر بھی ہے۔" جگنا نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

اودے سنگھ۔" پھر بیاہ تو ہوگیا ہوگا چندراوتی کا جگنا۔"

" نا ہیں سرکار ابھی تو کہیں سگائی بھی نہیں ہوئی۔" جگنا نے دانت نکال کر کہا۔

اودے سنگھ یہ سُن کر دل میں تو خوش ہُوا مگر بظاہر تعجب سے کہا" کیوں؟"

" رائے صاحب تمہارا جیسا گبرو جوان چاہتے ہیں اسلئے۔" جگنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

اودے سنگھ۔" جگنا تم نے مجھ کو پسند کیا یہ تمہاری مہربانی ہے مگر چاچا چاچی بھی مجھے پسند کریں یہ تو جروری نہیں ہے۔ اگر چاچا چاچی بھی مجھے ایسا سمجھیں تو میں اپنے کو بھاگ کا دھنی سمجھوں گا۔"

جگنا۔" لے بھلا سرکار تمہارے کو اور رائے صاحب پسند نہ کریں کھیال تمہارا معلوم ہوگیا۔ جگنا نام نہ رکھنا جو ترکے ہی رائے صاحب سے ہاں نہ کرا دوں تو ....."

اودے سنگھ لجاتے ہوئے۔" تمہاری بڑی کرپا ہوگی (ایک روپیہ دیتے ہوئے) لو اس کی مٹھائی کھانا۔"

جگنا نے روپیہ اُنگلیوں کی گرفت میں دبا کر کہا" اسکی کیا جرورت تھی سرکار میں تو تمہارا گلام ہوں" اور پھر وہ کوٹھے سے نکل آیا اور رائے صاحب کے سامنے ساری باتیں دہرادیں۔

چندراوتی کی اودے سنگھ سے سگائی ہوگئی اور پھر تین مہینے بعد بسنت رُت میں بیاہ بھی ہوگیا اور وہ اپنی سسرال جاتی دھوتی سنگھ

چندراوتی کو شیش سے جو اُس کے لڑکپن کا ساتھی تھا، جدا ہونے کا بڑا غم تھا۔ اس لئے جس روز سے سگائی ہوئی اُس کی آنکھ سے آنسو نہ تھما تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ نرگسی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ اور شاداب و حسین چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک نوشگفتہ پھول کو بادِ سموم کے جھونکوں نے قبل از وقت پژمردہ کر دیا ہو۔

ماں باپ اُس کی حالت کو دیکھ دیکھ کر اب کڑھتے تھے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اب وہ اپنے کئے پر پشیمان تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے رائے صاحب بھوجی کو طعنے دیا کرتے "ہم منع کرتے تھے پر تم نے نہ مانا، دیکھا چھوری کو، کیسی گھل رہی ہے، اب روپے کی ہیکل گھر لا کر تو اپنے گلے ڈال لیجیو۔" سگائی بڑی دھوم سے ہوئی تھی اور دونوں گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر اس سگائی کا چرچا تھا۔ اب اس کے توڑنے سے برادری میں ناک کٹ جاتی اس لئے دونوں دل ہی دل میں نادم ہو کر رہ جاتے تھے۔ چندراوتی نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنے گھر کے در و دیوار کو اور اس پھلواری کو جو وہ اور شیش مل کر سینچا کرتے تھے، رخصت ہوتے ہوئے الوداع کہا۔ مقدس تلسی کے پیڑ کو جو ان کے لڑکپن کی شادمانی کی یادگار تھا، بہت دیر تک گلے لگا کر آنسو بہاتی رہی۔ آخر سب کچھ چھوڑ کر وہ چلی گئی۔

اودے سنگھ بھی بانکا ترچھا جوان تھا............ اور اپنی محبوبہ بیوی پر پروانہ وار فدا تھا اس کی خوشی کے لئے بڑی سے بڑی تکلیف گوارا کرنے کے لئے تیار تھا۔ جب نوکری پر دلی آتا اور یہاں سے گاؤں واپس جاتا، ہر مرتبہ نیا زیور، کپڑا، سنگھار کی چیزیں اس کے لئے لیکر جاتا۔ عورتیں نمائشی اور زینت کی چیزوں پر جان دیتی ہیں۔ چندراوتی بھی رفتہ رفتہ رام ہو گئی اور اپنے عاشقِ زار شوہر کو دل و جان سے چاہنے لگی۔ غریب شیش کی یاد اب اس کے دل کے ایک کونے میں گم کردہ چیز کی طرح پڑی ہوئی تھی اور وہ اپنی ازدواجی زندگی میں مگن تھی۔

شیش چندراوتی کے مانجھے کے دن مع اپنی گائے سندری کے جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، ایسا غائب ہوا کہ پھر کسی نے اُس کی صورت نہ دیکھی رائے صاحب نے ہر جگہ تلاش کرایا پر اُس کا پتہ نہ چلا۔ رائے صاحب شیش کے عاشق تھے پھر اُن کو اس بات کا احساس تھا کہ اُن کے مرحوم عزیز دوست کا اکلوتا لڑکا اُن کی بدعہدی کی بدولت زندگی کی خوشیوں سے محروم ہو گیا یہ خیال ہر دم اُن کے لئے سوہانِ روح تھا اور وہ اب اُٹھتے بیٹھتے سرد آہیں لیا کرتے تھے۔ جہاں کسی کے بانسری بجانے کی آواز سُنی اور وہ موقع محل کا لحاظ کئے بغیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے کہ کہیں شیش ہی نہ واپس آگیا ہو مگر ہر مرتبہ وہ مایوس ہو کر واپس آتے تھے۔ اس روحانی فکر نے ان کو اندر ہی اندر گھلا دیا اور طباق سا چہرہ سُت سُتا کر سیپی رہ گیا۔ قاعدہ ہے کمزوروں پر ہر مرض جلدی اثر کرتا ہے۔ ایک دن بارش میں بھیگ جانے سے ان کو نزلہ ہوا۔ ساتھ ہی بخار بھی ہو گیا اور پھر یہ بخار ایسا چڑھا کہ جان ہی لے کر ٹلا۔ اٹھواڑے کے اندر ہی اندر وہ شیش کی مفارقت کا داغ دل پر لے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ چندراوتی اب ایک بچے کی ماں تھی۔ اس کا حسن ازدواجی زندگی کی مسرتوں نے دوگنا کر دیا تھا اب وہ ایک شگفتہ و حسین پھول کی مانند تھی۔ چاہنے والے باپ کے غم سے اس کو دلی صدمہ ہوا اور کچھ دنوں کے لئے اس کے چاند سے چہرے پر رنج والم کی گھٹائیں چھا گئیں۔ لیکن یہ افسردگی زیادہ دن قائم نہ رہی۔ شوہر کی ناز برداریوں اور محبت بھرے برتاؤ نے اُس زخم پر جو یتیمی کے باعث دل پر لگا تھا مرہم رکھ دیا اور وہ پھر مسرور نظر آنے لگی۔

چندراوتی کی شادی ہوئے اب پانچواں سال تھا۔ غدر کی بدولت دہلی اور اس کے قرب و جوار کے اضلاع میدانِ حشر کا نمونہ بنے ہوئے تھے آدمیوں کی بیش بہا جانیں بھیڑ بکریوں سے بھی ارزاں تر تھیں اور ہر جنگل و آبادی میں انسانوں کا خون بیدردی سے بہایا جا رہا تھا۔ اس قیامت کے وقت میں اودے سنگھ بھی زنانے محلات کی حفاظت کرتا ہوا اپنی راجپوتی آن بان دکھا کر مارا گیا۔ "آہ بدنصیب چندراوتی کا سہاگ لُٹ گیا" اور اس کا عاشقِ زار شوہر ہمیشہ کے لئے اس سے بچھڑ گیا۔ ابھی اس نے اپنی زندگی کی بائیسویں بہار میں قدم رکھا تھا کہ اس بہار پر خزاں آگئی۔ اور اس کے باغِ حسن کا مالی نہ رہا۔ موت کے بیدرد ہاتھوں نے اس کی حسین آنکھوں کو خون کے آنسو رُلوائے۔ اب تک وہ ملکہ تھی لیکن اب بھکارن سے بدتر، اسی پر بس نہیں باغی کا گھر سمجھ کر کمبخت گوروں نے اس بدنصیب کا گھر بھی لُوٹ لیا اور آگ لگا دی۔ بدبخت چندراوتی جس کی اتنی عمر ناز و نعم میں بسر ہوئی تھی یہ خوفناک منظر دیکھ کر تاب نہ لا سکی، غش کھا کر

گر پڑی۔ جب اُس کو ہوش آیا تو آگ اس کے قریب پہونچ چکی تھی لڑکا سستر بیند ر پاس کھڑا رو رہا تھا اور لڑکی موہنی جھولے میں پڑی سو رہی تھی سوختہ نصیب چندرا نے ایک حسرت بھری نظر ان جلتے ہوئے گھر پر ڈالی جہاں وہ دلہن بن کر آئی تھی اور اس کا استقبال بہت ارمانوں سے کیا گیا تھا۔ پھر بچی کو گود میں لیا۔ لڑکے کی اُنگلی پکڑی اور لڑکھڑاتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ شام کے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ اپنی بدقسمتی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جوان چاہنے والے شوہر کی موت اپنی حسرت ناک بیوگی کا خیال۔ گھر کے لُٹنے کا دھیان، بیک وقت اتنے غموں کے پہاڑ اُس پر ٹوٹ گئے۔ رائے سینا کی بربادی کی خبر پہلے ہی سُن چکی تھی۔ حیران تھی کہ اب کہاں جائے کیا کرے۔ سسرال تباہ ہو چکی تھی اور میکہ لُٹ گیا تھا نہ ماں تھی نہ باپ نہ شوہر، ایک ٹوٹی ہوئی مسجد میں رات اُس نے روتے ہوئے بچوں کو بہلا کر اور خود آنسو بہا کر گذاری۔ صبح ہوتے ہی آگے کی راہ لی۔ مگر اُس کو یہ معلوم نہ تھا کہ کدھر جا رہی ہے۔ نازنین عورت، جنگل کا سناٹا اور تیز دھوپ، کڑا راستہ چل رہی تھی اور متواتر، لیکن کوئی آبادی نظر نہ پڑتی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی جنگل ہی جنگل نظر آتا تھا۔ ایک کنواں خدا خدا کر کے نظر پڑا اور وہ بیدم ہو کر اس کے پاس گر پڑی۔ جب ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو بمشکل ڈول سے پانی کھینچا دونوں بچوں کو پلایا پھر مُنہ دھویا اور پانی پیا اور لڑکی کو دودھ پلانے لگی۔ دودھ بھی برائے نام تھا۔ مگر خیر روتی بچی تو ذرا چپ ہو گئی، لڑکا دو وقت کا بھوکا تھا۔ روٹی کے لئے ضد کرنے لگا۔ مگر اس غریب کے پاس کیا رکھا تھا جو دیتی۔ خود بھی رونے لگی۔ آخر سستر بیندر روٹی کے لئے روتے روتے سو گیا اور غم زدہ مصیبت کی ماری چندراوتی پر بھی نیند کی دیوی نے اپنا رحم کیا اور پتھر سرہانے رکھ کر وہ بھی سو گئی۔ دن اس طرح گذرا شام کے قریب ایک مسافر نے جب بچے کو روٹی کے لئے روتے دیکھا تو اپنی پوٹلی کھولی۔ تھوڑے ستو اور روٹیاں اور ماش کی دال تھی تو تین وقت کے بعد ماں بیٹوں کی فاقہ شکنی ہوئی اور بچے کے آنسو تھمے بچے کو روٹی کھلا کر اُس نے بھی اُگل نگل کر آدھی روٹی کھائی اور پانی پیا۔

تمام رات اُس نے جانوروں کے ڈر سے اس وسیع جنگل میں آنکھوں میں گذاری۔ گھر میں پتا ہلنے سے ڈرنے والی چندراوتی اس وقت دو معصوم بچوں کو لئے تن تنہا اتنے بڑے جنگل میں تھی یہ سب زمانے کا انقلاب ہے۔ غرض جوں توں کر کے صبح ہوئی اور چندرا نے تھوڑے ستو رحم دل مسافر کے دیئے ہوئے کٹورے میں گھول کر سستر بیندر کو دئے اور خود بھی پیئے اور گرتی پڑتی آگے چلی۔ کچھ دُور چل کر اس کو دُور سے قطب مینار کی جھلک نظر آئی جس سے وہ سمجھی کہ مہرولی قریب ہے اور یہاں اس کی نند کا گھر تھا۔ بستی میں داخل ہونے کے لئے جلد جلد قدم اُٹھانے لگی۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ دو مسٹنڈے گوجروں نے اُسے آگھیرا اور کہا "لا رکھ دے جو پہنے ہے۔" اُس نے جو کچھ چھلّا باقی رہ گیا تھا اُتار کر رکھ دیا اور آگے بڑھنے لگی۔ بدمعاش گوجروں نے راستہ روک کر کہا
"کہاں جا رہی ہے۔ ہمارے ساتھ چل"

چندراوتی نے درد بھری آواز سے جواب دیا "پاپیو مجھ نصیبوں جلی کو مت ستاؤ۔ میں تو خود ہی دُکھی ہوں"۔ مگر گوجر چھیڑ خانی سے باز نہ آئے چندراوتی کا راجپوتی خون جوش میں آگیا اور اُس نے ان کی بیہودگیوں سے جل کر ایک بدمعاش کے طمانچہ رسید کر دیا۔ اُس نے غصے سے بھنّا کر ایک لاٹھی ایسی ماری کہ چندراوتی "ہائے مری" کہہ کر گر پڑی اُس کی آواز کے ساتھ ایک جوان سادھو لپکتا ہوا آیا اور دونوں گوجروں کو ڈانٹ کر کہا "پاکھنڈو! ایشور تمہارا ناش کرے اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے اس کو مارا۔ عورت پر ہاتھ اُٹھاتے شرم بھی نہیں آتی۔ مرد ہو تو جا کر ڈوب مرو"۔ گوجر تو سادھو کی پھٹکار سُن کر نو دو گیارہ ہوئے اور سادھو بیہوش چندراوتی کو ہوش میں لانے کے لئے اس پر جھکا۔ دوڑ کر کُٹی سے پانی لا کر اُس پر چھڑکا اور پھر تلوے سہلانے لگا۔ چندراوتی کو ہوش آیا اور اُس نے خوف زدہ آنکھیں کھولیں تو ایک جوان فرشتہ صورت سادھو کو اپنی تیمارداری میں مصروف پایا۔ حواس درست ہوتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور کہا "سائیں ایشور تمہارا بھلا کرے۔ تم نے مجھے آج ان پاپیوں سے بچا لیا۔ ورنہ بھگوان جانے میرا اور ان بچوں کا کیا بنتا"
سادھو نے غور سے چندراوتی کو دیکھا اور کہا "ہے رام چندرے تو یہاں کیسے آئی؟"

چندراوتی کے کانوں میں گم گشتہ شیش کی آواز گونج گئی اور اُس نے جلدی سے کہا "کون شیش بھیا۔ ارے رام تم تو ایسے گم

ہوئے کہ تمہارا پتہ ہی نہ ملا۔ پتاجی تمہارے چھوٹ جانے کے گم میں سُرگباش ہوگئے۔"

"چندے تو ہی مجھ سے جُدا کردی گئی تو میں کس دل سے ینہاں رہتا" شیش آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔

"آہ بھیا نصیب میں یوں ہی لکھا تھا" چندراوتی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"چاچاجی کو میں پیارا ہوتا تو تجھ کو مجھ سے الگ نہ کرتے چندے اس کا ذکر چھوڑ دو۔ مرے دل کو دُکھ ہوتا ہے" شیش نے جواب دیا۔

"تہارے جیجا بھی تو مارا گیا" چندراوتی نے سسکی لے کر کہا۔

شیش گھبرا کر "کب"؟

"جس دن فرنگیوں نے دلّی پر قبضہ کیا مرے مالک کو بھی ماریا وہ جب تک جیتے رہے ڈیوڑھی کے سامنے کھڑے رہے۔ ہائے مرے بہادر سپاہی کو فرنگیوں نے مار دیا۔ میں لُٹ گئی۔ شیش بھیا اور پھر گھر بھی لُوٹ لیا آگ لگادی" چندراوتی نے گھٹتی ہوئی آواز سے کہا۔

شیش، چندراوتی کے غم میں اپنا غم بھی بھول گیا اور اس کی بربادی پر بہت دیر تک آنسو بہاتا رہا اور پھر اُس کو تسلی دیتے ہوئے بولا "چل چندے مری جھونپڑی میں چل۔ رنج مت کرے۔ جب تک میں زندہ ہوں تجھ کو کیا گم ہے۔"

چندراوتی کو شیش کا مل جانا اور پھر اس وقت اس کے لئے غنیمت تھا اس کے سہارے سے جھونپڑی میں داخل ہوئی۔

شیش کی کُٹیا کیا تھی، ایک ہنرمند مالی کے ہاتھ کا لگایا ہوا باغ تھا۔ پھونس سے چھائی ہوئی جھونپڑی پر عشق پیچاں کی بیلیں چھائی ہوئی تھیں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے آنکھوں کو طراوت اور دماغ کو فرحت ہوتی تھی۔ ایک جانب اُس کی غم و خوشی کی رفیق سندر گائے بندھی ہوئی تھی جس کو دیکھ کر چندراوتی کو اپنا بالاپن یاد آگیا جب وہ بے فکر تھی اور شیش بھیا کے ساتھ کھیلنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ گائے پر ہاتھ پھیرا جو اس کو پہچان کر اپنی تھوتھنی ہلا ہلا کر محبت کا اظہار کر رہی تھی، وہ ہچکی باندھ کر رونے لگی۔ لاٹھی کی ضرب پسلیوں پر کاری آئی تھی رونے سے زور پڑا اور بہت زور سے اس کو خون کی قے ہوئی۔ ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے۔ ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ شیش گھبرا گیا۔ نرم گدے پر لٹا کر دودھ کے چند قطرے حلق میں ٹپکائے اور ہاتھ پاؤں سہلائے بہت دیر بعد وہ سنبھلی اور شیش کے حواس ٹھکانے ہوئے۔

چندراوتی کو شیش کے پاس رہتے ایک سال کے قریب ہو گیا۔ وہ اس کے لئے دوا اور اچھی غذا مہیا کرنے میں کسر نہ کرتا تھا مگر نازنیں چندراوتی کو لاٹھی کی چوٹ اور نازبردار شوہر کے غم نے مل کر موت کے قریب پہونچا دیا۔ کھنکار کے ساتھ اس کو خون آتا تھا۔ تھوڑی تکان سے بخار ہوجاتا اور خون کی قے کے لئے ذراسی بے احتیاطی بہانہ بن جاتی۔ ایک روز شریر نریندر کو پکڑنے کے لئے وہ بھاگی۔ چارپائی سے اُلجھ کر اوندھے مُنہ گری اور گرتے ہی بڑے زور سے خون ڈالا۔ اتنا خون پہلے اُس کو کبھی نہ آیا تھا۔ خون ڈالتے ہی اس کا سانس اُکھڑ گیا۔ شیش دوا لینے گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو چندراوتی کا یہ حال دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس کو کسی نہ کسی طرح اُٹھا کر بستر پر ڈالا اور مُنہ میں جل ٹپکانے لگا۔ چند لمحے بعد چندراوتی نے اپنی بے نور آنکھیں کھولیں اور اُکھڑے ہوئے لہجے میں رُک رُک کر کہا۔ آہ میں.... مرتی ہوں... شیش.... بھیا۔ (دم لے کر).... نریندر اور موہنی تمہارے حوالے ہیں۔ پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی اور دنیا سے رخصت ہوگئی۔

شیش کو محبوبہ کے غم نے نیم پاگل کردیا وہ سچا پریمی تھا گو چندراوتی نے اب ایک دن کبھی اُس سے محبت بھرے لہجے میں گفتگو نہ کی تھی، دکھوں میں مبتلا ہوکر وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ لیکن شیش کی محبت بے غرض تھی وہ تو چندراوتی کو والہانہ چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس کا قرب ہی بے اندازہ مسرت کا باعث تھا اور پھر اُس کی خدمت کرنے کا موقع پاکر تو اُس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ اس طرح اس کی فوری موت سے اُس کے دل و دماغ پر غم کی بجلی گری۔ اس کی آرزوؤں و ارمانوں کا مرکز، من مندر کی دیوی، اس کے سامنے ظالم موت کے ہاتھوں لُٹ کر ایک مرجھائے پھول کی مانند پڑی تھی۔ لیکن مرجانے پر بھی چندراوتی کے حسین رخساروں پر معصومیت کا نور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ سُکھ کی نیند سو رہی ہے۔ بہت دیر تک بت کی مانند شیش اس کو دیکھتا رہا

پھر فرطِ عقیدت و محبت سے اُس کے پاؤں پر جھک گیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینھ برسنے لگا۔ جب ذرا دل کی آگ آنسوؤں کے چھینٹوں سے بجھی تو اس حسین عورت کو چندن کی چِتا تیار کرا کر اس پر رکھا۔ چِتا میں آگ دیتے وقت اس کے دل کی یہ سب سے خواہش تھی کہ خود بھی چندراوتی کے ساتھ جل جائے لیکن اس کے بچوں کا خیال اور اس کی وصیت اس کو زندہ رہنے اور تمام عمر غم کی چِتا میں جلنے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔

آخر وہ نازک جسم جو بجائے عناصر کے پھولوں سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا، غم نصیب شیش کے سامنے جل کر راکھ ہو گیا اور وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ چند روز بعد اُس نے جھونپڑی بھی چھوڑ دی۔ دلّی میں ایک چھوٹا مکان لے لیا اور کئی ذی مقدرت ہندو لڑکوں کو رامائن کی تعلیم دینے لگا۔ اس سے اس کو اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ دونوں بچوں کو تعلیم و خوراک اچھی مل رہی تھی۔ اس کا ذاتی کوئی خرچ ہی نہ تھا۔ وہ زندہ ضرور تھا۔ لیکن مردے سے بدتر۔

نریندر بڑا ہو کر خوش رُو اور ہونہار نوجوان نکلا۔ میٹرک کر لینے کے بعد شیش کی کوششوں اور اپنی قابلیت سے وہ اب نائب تحصیلدار تھا۔

موہنی جو ماں کی طرح سندر اور کامنی تھی، شیش کے ایک ذہین شاگرد پرتاب سنگھ کی جو رائے بہادر شیشر سنگھ رئیسِ دہلی کے چھوٹے صاحبزادے تھے محبوبہ بیوی بن گئی۔

اِن دونوں کی جانب سے بے فکر ہو کر اور اپنا فرض پورا کر کے شیش ہردوار چلا گیا۔ چاندنی راتوں اور پُرسکون شب کے سنّاٹے میں وہ اب بھی بانسری کے ساتھ وہ گیت الاپا کرتا تھا جو کبھی چندراوتی کے ساتھ اپنے بالے پن میں اُس نے گائے تھے۔

حمیدہ سلطانہ

کامیاب عشق ہے جو تجھ سے جتنا دُور ہے

۴

کیا بتاؤں دل مزاجِ عشق سے مجبور ہے — ورنہ وہ نزدیک بھی اتنا ہی جتنا دُور ہے
مجھ کو مر جانا یونہی اے بیکسی منظور ہے — توبہ توبہ یہ کہے دنیا کہ وہ مغرور ہے
ہائے وہ حسنِ حزیں اُف وہ نگاہِ شرمگیں — آج سے ناشاد ہی رہنا مجھے منظور ہے
ڈال رکھے ہیں نگاہِ عشق نے یہ تفرقے — ورنہ اک جلوہ ہے جس سے کل جہاں معمور ہے
وہ وفا دشمن نہیں لیکن پھر اس کا کیا علاج — ہر ستم اک رسم ہر بیداد اک دستور ہے
اس گری حالت پہ بھی حاصل ہیں سب کچھ قدرتیں — یہ نہ سمجھیں وہ کہ دل مجبور ہی مجبور ہے
کیوں سمٹتی آ رہی ہے میری جانب کائنات — کیا کوئی میری نگاہِ شوق میں مستور ہے
شوقِ بعید کی قسم احساسِ قربت کی قسم — کامیاب عشق ہے جو تجھ سے جتنا دُور ہے
ہو گئے بے اصل افسوںؔ ان کی فرقت کے الم
کیا کہوں دل ان کو پا کر کس قدر مسرور ہے

افسوں بھوپالی

ایشیا مئی ۱۹۴۱ء

آبنوسی صندوقچہ

(اے۔ ای۔ ڈبلیو میسن)

(ایک مختصر جرمن کہانی)

" نہیں نہیں" کرنیل وان الٹرڈک نے جلدی سے بات کاٹ
رکہا " ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا!" گفتگو یکایک منقطع ہوگئی اور رو ۂ نیبٹ
لموزنٹن ہوٹل کی میز پر بیٹھے ہوئے حضرات میں سے ہر ایک اسے بنظر
شتیاق تکنے لگا وہ چند لمحوں تک کسی قدر سراسیمگی اور بوکھلاہٹ
ے عالم میں شراب کے گلاس کو میز پر گھماتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ مکمل
ماموشی اسے ناگوار گذری۔ کچھ دیر کے بعد سنبھل کر نہایت ملائم اور
ملسارانہ لہجے میں کہنے لگا۔ " بلاشبہ جنگ انسان میں کارہائے نمایاں
ا روح پھونک دیتی ہے اور ان لوگوں میں جن سے آپ کسی قسم کی توقع
میں رکھتے غیر معمولی صفات بیدار کر دیتی ہے۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا
خ بھی ہے جو فوراً ہی نہیں بلکہ چند مہینوں کی معرکہ آرائی کے بعد نظروں
ے سامنے آتا ہے۔ جب آپ کی جسمانی طاقت سے زیادہ سے زیادہ کام
یا جاتا ہے جب تکان اور ہر وقت کا خطرہ اثر دکھانا شروع کرتے ہیں جب
پ تہذیب و تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور بسا اوقات حیوانیت اختیار کر
یتے ہیں ـــــ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ پیرس کے محاصرے کو تیس سال
ذر گئے۔ لیکن آج بھی میں اپنی زندگی کے کسی اور حصہ پر اتنا رنجیدہ نہیں
وتا جتنا کہ ۱۸۷۰ء کی کرسمس کی رات کے ایک گھنٹے پر ـــ گیارہ سے
رہ بجے کے درمیان ـــ اگر کہیں تو مفصل طور سے سناؤں اگرچہ ہمیں
اوپرا " (غنائی تمثیل) میں دیر ہو جائے گی"

اس رات " فاؤسٹ کا " اوپرا" تھا جو ان میں سے بہت سے
مرات سن چکے تھے اور باقی پھر کسی وقت سن سکتے تھے۔ اس کے برعکس
رنیل وان الٹروک ایک خاموش طبع شخص تھا اور جو پیشکش اس نے پیش کی تھی وہ ایک ہی
وقت کی تھی۔ غالباً پھر آئندہ نہ کرتا۔ اس کے احباب کا خیال تھا کہ
یہ پیشکش بھی اس اتفاق کے باعث ہوئی کہ محاصرۂ عظیم کے بعد پیرس میں
یہ اسکی پہلی رات تھی۔

ان کی میزبان نے کہا " کوئی بات نہیں کیا ہوا اگر " اوپرا "
میں کچھ دیر بھی ہو جائے" اور سب نے اس سے پورا پورا اتفاق کیا۔

" سگار پینے کی تو اجازت ہے نا؟" کرنیل نے پوچھا۔ ایک لمحہ کے
لئے دیا سلائی کا شعلہ روشن ہوا اور اس کے لمبے سُتے ہوئے چہرے
کی جھریوں کو چمکا گیا۔ پھر کرسی میز کے قریب کھینچ کر اپنی کہانی یوں شروع کی

" میں رجمنٹ نمبر ۱۰۳ کی بٹیلین نمبر ۲ کی کمپنی نمبر ۵ لفٹنٹ تھا
جو انفنٹری ڈویژن ۲۴ Infantry Division سے
تعلق رکھتی تھی۔ یہ ڈویژن آرمی کورپس Army Corps نمبر ۱۲ کا
ایک حصہ تھی جو سیکسنی ولی عہد کے ماتحت تھی اور جس نے پیرس کے جنوب
مشرقی حصہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ کرسمس کی رات کو اتفاق سے میری ڈیوٹی
نائسی لی گراند Noisy-le-grand سے کچھ دور ایک چوکی پر
لگی۔ سردی اس غضب کی تھی کہ سنٹی گریڈ تھرمامیٹر کا پارہ صفر (درجہ انجماد)
سے ۱۲ درجہ نیچے تھا اور ہماری چھوٹی سی لکڑی کی جھونپڑی جو باورچی
خانہ بھی تھی اور سونے اور کھانے کا کمرہ بھی، ہمیں ایک آرام دہ جائے پناہ
معلوم ہوتی تھی۔ باہر چاروں طرف تاریکی اور خاموشی مسلط تھی اور
آس پاس کے گاؤں برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ جھونپڑی کے اندر ایک
طرف ہمارے بستر نہایت قرینے سے لگے تھے۔ وسط میں ایک بڑی سی
میز پڑی تھی جس پر ایک سفید کپڑا بچھا ہوا تھا۔ چونکہ کرسمس کی رات کو

ہم ضرورت سے زیادہ نفاست پسند ہو گئے تھے۔ آتشدان میں آگ دہک رہی تھی۔ میز کے ارد گرد ہر قسم کی کرسیاں — ایک قلعہ کے ملاقاتی کمرہ کی ہتھے دار سہک کرسیوں سے لے کر ایک کسان کے گھر کی بھدّی سی بنچ تک — پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں بوربن شراب کا ایک پیپا رکھا تھا جو اسی روز میری ماں نے کرسمس کے تحفہ کے طور پر بھیجا تھا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت ہم میں سے کوئی بھی باہر نکلنے کو تیار نہ تھا۔ لیکن ہم ان دنوں کرنیل تو تھے نہیں!

ہوپٹ مین میری ماں کا جام صحت پی رہا تھا کہ دروازہ زور سے کھلا اور ایک نوکر دروازے پر کھڑا فوجی سلام کر رہا تھا۔ "ہر اد بریٹ ہر لفٹنٹ ون الڑدک کو یاد فرما رہے ہیں" اس نے کہا اور اس سے پیشتر کہ مجھے بڑبڑانے کا وقت ملے وہ مڑا اور چل دیا۔

میں نے اپنا بڑا کوٹ پہنا، ٹوپی سر پر رکھی اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ ہوا ساکت تھی۔ برف بھی نہیں گر رہا تھا۔ لیکن سردی غضب کی تھی اور چونکہ میں اپنے زندہ دل ساتھیوں کے شور و غل سے نکل کر آیا تھا اس لئے رات مجھے فطری طور سے زیادہ خاموش اور ہولناک معلوم ہوئی۔ میں تاریکی میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی ہوپٹ مین نے ایک راگ چھیڑ دیا۔ جس کے بول مجھے صاف صاف سنائی دے رہے تھے۔

میرا بھی اک دوست تھا ایسا شاید تم کو ملے نہ جیسا

میں اسی سوچ میں تھا کہ آیا میں بھی اس فرضی دوست کی طرح صبح کو نعل ماضی کے ساتھ یاد کیا جاؤں گا۔ متعدّد بار سنتری برف میں جمے ہوئے پائے گئے تھے۔ ہمارا کرنیل خاص خاص ضروری کاموں کے لئے مجھے انتخاب کرنے کا کچھ عادی سا ہو گیا تھا اور حقیقتاً یہ اُسی کا کرم تھا کہ مجھے اس قدر ترقی ملی ورنہ میں ہنڈل برگ میں پڑھتا تھا۔ جولائی کی ایک شام کو اخبار بیچنے والا لڑکا دوڑا دوڑا آیا اور کہنے لگا کہ ایم بینڈ ٹی نے ایمز (Ems) کو خیرباد کہہ دیا ہے میں فوج میں بھرتی ہو گیا اور گریو لوٹ (Gravelot) کے معرکہ میں معمولی سپاہیوں کی طرح لڑا۔ لیکن بہرحال اس وقت میں نے کرنیل کا کسی قسم کا احسان محسوس نہ کیا۔ اس لئے کہ مجھے کرسمس کی رات کو نانسی لی گرانڈ سے چل کر اُس قلعہ تک پہونچنا تھا جہاں اس کا قیام تھا۔

میں جب پہونچا تو وہ ایک نیم روشن کمرے میں آتشدان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ میز پر ایک لیمپ جل رہا تھا اور وہ ایک تہ شدہ کاغذ کے پرزے پر نظر جمائے ہوئے تھا اور اس کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اس میں ایسا مستغرق تھا کہ کئی منٹ کے بعد اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور مجھے اپنے احکامات کا منتظر پایا۔

"لفٹنٹ ون الڑدک! تمھیں فوراً رینی جانا ہے"

رینی (Rainey) تخمیناً یہاں سے پانچ میل تھا۔ لیکن ہاں میں یہ تو بھول ہی گیا کہ فرانسیسیوں نے ۲۱ر دسمبر کو محصورین سے نکل کر دھاوا کیا تھا اور ہماری فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اور رینی اور نانسی لی گرانڈ کے درمیان والے ایورارٹ اور مین بلانچے پر قابض تھے۔ اس لئے اب مجھے چکر کاٹ کر جانا تھا اور اس طرح سے فاصلہ بجائے پانچ میل کے دس میل کے ہو جاتا تھا۔ پھر کرنیل نے کہا "تمھیں بڑا ہوشیار رہنا چاہیئے اس راستہ پر بہت سے جرمن سپاہی مارے جا چکے ہیں۔ تاہم تمھیں رینی تو جانا ہی ہو گا"، اس نے مجھے ایک زبانی پیغام دیا جو مجھے رینی کی بیٹری کے کمانڈنگ آفیسر کو جا کر پہونچانا تھا۔ جس کی اہمیت اس وقت معلوم ہوئی جب ۲ر دسمبر کو برف کے طوفان کے موقع پر ہمارے توپ خانے نے رینی اور نانسی لی گرانڈ کے ماؤنٹ ایورن پر واقع ایک فرانسیسی قلعہ کو اڑا دیا۔

کرنیل نے کہا "اصطبل میں تمھارے لئے ایک گھوڑا تیار ہے" اور سر جھکا کر پھر کاغذ کے پُرزے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے سلام کیا اور دروازہ تک چلا آیا۔ جوں ہی میرا ہاتھ دستے پر پڑا اس نے دوبارہ مجھے پکارا اور اپنا ہاتھ پھیلا کر کاغذ مجھے دکھایا اور پوچھنے لگا "تم اس سے کیا مطلب نکالتے ہو؟ ایک بند شراب کی بوتل سے نکالا گیا ہے۔" میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس پر صرف ایک فقرہ بہت بنا بنا کر اور قلم جما جما کر لکھا ہوا تھا۔ اگرچہ الفاظ کی املا غلط تھی۔ فقرہ کا مطلب کچھ ادق نہ تھا۔ بظاہر یہ کسی ایم۔ بونیٹ کا

نام اپنے بیٹے کے نام تھا جو پیرس میں رہتا تھا اور اس میں لکھا تھا
"کالی سورنی نے پندرہ بچے دیئے ہیں"
"اس سے تم کیا مطلب سمجھتے ہو" کرنیل نے دوبارا پوچھا۔
"بس یہی کہ ایم بونیٹ کی کالی سورنی نے پندرہ بچے دیئے ہیں"
میں نے کاغذ واپس کر دیا۔ کرنیل نے پھر اس پر نظر دوڑائی اور اپنے شانوں کو جنبش دی اور ہنس کر کہنے لگا۔ "ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ اس سے زیادہ اس کا مطلب ہو بھی کیا سکتا ہے؟"
میں شاید اس غلط سلط فقرے کو قطعاً بھول چکا ہوتا لیکن کرنیل کے شکوک کی وجہ میں سوچنے لگا کہ شاید ایم بونیٹ کوئی غریب کاشتکار ہوگا۔ بھیڑیں اور سور پال کر گذر اوقات کرتا ہوگا اس نے سوچا کہ پیرس میں محصور بیٹے کے لئے اس سے زیادہ اور تسلی بخش کونسی خبر ہوگی۔ کرنیل کے تردد نے خواہ مخواہ اسے میرے دماغ پر مرتسم کر دیا تھا۔
یہ سنا جاتا تھا کہ ہماری تمام کوششوں اور ہر قسم کے انتظامات کے باوجود خبریں مسلسل طور سے پیرس پہونچ رہی تھیں۔ جو ہم چاہتے تھے کہ نہ پہونچیں پیرس کے محصور لوگوں کے لئے ہم اس قسم کی معلومات مثلاً "لاطر کی فوج کی شکست"، اچھی سمجھتے تھے اور وہ ہم بڑی آسانی اور تیزی سے اُن تک پہونچا رہے تھے۔ لیکن قیدیوں کے ذریعے معلوم ہوکر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ پیرس والے غیر معمولی سرعت سے ان معاملات کو سنکر خوش تھے۔ جن کو ہم اپنے ہی تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ کرسمس کے دن انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ جنرل فیڈ ہرب نے ہماری فوج کے ایک دستہ کو پسپا کر دیا ہے۔ انھیں کیسے معلوم ہوا؟ ہماری تسلی کے لئے یہ بیان کافی نہ تھا کہ کبوتروں یا غباروں نے یہ راز افشا کر دیا تھا۔ بلکہ ہمیں یقین تھا کہ خبریں ہمارے دستۂ فوج کی لاپرواہی سے پہونچ رہی تھیں۔ یہ بھی خیال تھا کہ جس طرح امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں دَورِ غلامی میں زمیں دوز پیغام رسانی بلکہ سُرنگ کا باقاعدہ سلسلہ تھا۔ جس کے ذریعہ غلام پوشیدہ طور سے ایک مکان سے دوسرے مکان میں پہونچا دیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اُسے آزادی مل جاتی تھی۔ اسی طرح ممکن ہو کہ یہاں بھی پوشیدہ خبریں کسی نہ کسی ذریعے سے ہمارے پڑاؤ کے نزدیک کسی ایک مقررہ مکان تک لائی جاتی ہوں اور موقع ملنے پر وہاں سے پیرس پہونچائی جاتی ہوں۔
یہ محض افواہ تھی۔ ممکن ہے اس میں سچائی بھی ہو اور ممکن ہے یہ بالکل بے بنیاد ہو لیکن بہرصورت اس میں وہ عنصر موجود تھا جو ایک نوجوان آدمی کے سامنے قیاس آرائیوں اور پروازِ تخئیل کے لئے ایک جولانگاہ پیش کر دیتا ہے۔ جب تک میں اصطبل میں پہونچ کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ میں برابر اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہا کہ آیا یہ پیغام جو بظاہر سیدھا سادہ ہے اس زمین دوز راہ سے گزر چکا ہے اور اب اس نامعلوم قلعہ اور پیرس کے درمیان کی آخری منزل طے کر رہا تھا میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس پوشیدہ خبر میں "سیاہ سورنی" کس کو ظاہر کرتی تھی اور ایم۔ بونیٹ کے فرضی نام کی جگہ اصلی شخصیت کس کی تھی۔ یہی سوچتا ہوا میں نالسی کی گرانڈ کے ڈھلان سے اترا لیکن اس کے بعد یہ قیاسات میرے ذہن سے اتر گئے۔ سامنے تاریکی میں وے ایورارٹ اور سین بلانچے کے درمیان ہزاروں خطرات تھے جو جرمن سپاہی یہاں سے گزرے تھے واپس نہ آئے تھے۔ ہر طرف فرانسیسی سپاہی چھپے ہوئے تھے۔ تاہم مجھے رینتی پہونچنا تھا۔ علاوہ ازیں دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ مجھو لوٹ کر بھی جانا ہے۔ دیوار کے قریب لگے ہوئے بستر میری آنکھوں میں پھر گئے۔ میرے دل و دماغ پر ایک ہی خیال چھایا ہوا تھا کہ میں بھی اس رات ان میں سے ایک پر ضرور سوؤں گا۔ میں نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا اس لئے کہ مجھو اپنی زندگی برقرار رکھنی تھی۔ خواہ کچھ ہی ہو جائے۔ یہی خیال میرے خون کی گردش تیز کر رہا تھا۔ میں اس قدر جوش میں گھوڑے کو ایڑ لگا رہا تھا کہ اپنے عزیز ترین دوست کو بھی پستول کا نشانہ بنا دیتا اگر وہ مجھے ایک سکنڈ روکنے کی کوشش کرتا۔ مختصر یہ کہ تین مہینے کی جنگ و جدال اپنا اثر دکھا رہی تھی۔
میں مارن سے گزر گیا اور یہ سڑک جنگل میں سے جاتے ہوئے ایک راستہ میں مل گئی۔ وے ایورارٹ اور فرانسیسی بارود خانہ درختوں کے عقب میں میرے بائیں جانب واقع تھا۔ خوش قسمتی سے

اس رات چاند نہ تھا اور فضا پر کہر کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ زمین پر تہ در تہ جمی ہوئی برف نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ میں گھوڑا ابھی آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ ہر لمحہ کسی فرانسیسی سنتری کی للکار کی توقع کرتا۔ کبھی کسی جھاڑی میں سے کسی فرانسیسی سپاہی کی بندوق کے دھماکے کی آواز اور بارود کے دھوئیں کا تصور کرتا۔ اگر کسی درخت کی کوئی نرم شاخ میرے پہلو میں چبھتی تو خیال کرتا تھا کہ دشمن کا پاؤں میرے سینے پر رکھا ہے۔

میں جنگل کے اختتام پر آیا اور چینے Chesney کی طرف چلا۔ یہاں صاف کھلا میدان تھا۔ اگرچہ میں ولے ایورارٹ سے گزر چکا تھا پھر بھی زیادہ اطمینان محسوس نہ کرتا تھا۔ میں ایک قسم کے جنون میں بھرا ہوا تھا کہ کسی صورت سے یہ کام کر دوں اور زندہ رہوں — ہاں ہر صورت میں زندہ رہوں — چینے Chesney سے ایک میل چلکر ایک چوراہا آیا۔ دونوں سڑکوں کے درمیان جو زاویہ بنا تھا اس میں گھاس کے قطعہ پر ایک جھونپڑی بنی تھی میں ابھی سشش و پنج میں تھا کہ کونسی راہ لوں۔ کوٹھری میں بالکل اندھیرا تھا۔ اس کے دروازہ پر پہونچ کر میں نے پستول کی نال سے اسے کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلنے میں دیر لگی۔ لازمی بات ہے کہ مکین اپنے اپنے بستروں میں ہوں گے۔ بے شک کچھ نہ کچھ دیر ہونی چاہئے تھی، لیکن میں کسی قسم کے پاس یا لحاظ کے لئے تیار نہ تھا۔ میں آگے بڑھنا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ صرف آگے بڑھنا اور زندہ رہنا۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی میرے سامنے تھی۔ میں نے پستول کی نال سے اس کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ "ادھو! اب تو جاگو گے!" میں نے چلا کر کہا اور فقرہ ختم ہونے سے پہلے میں نے ڈگمگاتے قدموں کی مدھم سی چاپ سنی۔ دروازہ کھلا۔ ایک گٹھیا کی ماری غریب بڈھی کسان عورت دروازے میں کھڑی تھی۔ کپکپاتے ہوئے بھدے ہاتھ میں موم بتی کانپ رہی تھی۔ جلدی میں اس نے شب خوابی کے لباس پر کندھوں پر ایک پھٹی کوٹ ڈال لیا تھا۔ سردی سے کانپتی ننگے پیر ایک اسی سال کی کبڑی بڑھیا مجھ سے معافی چاہ رہی تھی۔ مجھے افسوس ہے موسیو! لیکن میں جلدی چل نہیں سکتی۔ میں تمہاری کیا خدمت کرسکتی ہوں؟"

میرے منھ سے اس کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے لئے ایک کلمۂ تاسف نہ نکلا۔ ایک سنگدل سے سنگدل آدمی بھی پشیمان ہوتا۔ میں نے اس کے معذرت کے جملے راستہ پوچھنے کے کرخت سوال سے کچل کر رکھ دیئے۔

"موسیو! تمہارے دائیں ہاتھ والی سڑک چینے کو جاتی ہے اور بائیں ہاتھ والی رینیی کو"

میں نے زبان سے ایک لفظ نہ کہا اور چل دیا۔ یہ سب زیب داستاں نہیں حقیقت ہے واقعہ ہے۔ کاش! یہ واقعہ نہ ہوتا کوئی من گھڑت افسانہ ہوتا! کاش! یہ حقیقت نہ ہوتی محض حاشیہ آرائی ہوتی! تو میرے دل کو کس قدر سکون اور میری روح کو کتنی تسکین ہوتی۔ لیکن آہ یہ ایک "واقعہ" ہے جسے میرا ضمیر نہیں جھٹلا سکتا۔ میں فوراً ہی بوڑھی کسان عورت کو بھول گیا۔ میں صرف لمبے لمبے درختوں کی دو رویہ قطاروں کے متعلق غور کر رہا تھا جو اس کھلے میدان میں پھیلی ہوئی تھیں اور جو فرانسیسیوں کی پوری فوج کو چھپا سکتی تھیں۔ میں نے آنکھوں پر زور ڈال کر آگے دیکھا مختلف رلی جلی ہوئی آوازوں کی طرف کان لگا دیئے۔ لیکن پہلی آواز جو صاف سنائی دی، میری اپنی ہی زبان میں تھی۔ یہ رینیی کی چوکی کے سنتری کی آواز تھی۔ ہو سکتا تھا کہ میں گھوڑے سے اتر کر اس سے بغلگیر ہو جاتا لیکن میں بے حسی کے عالم میں گدی پر بیٹھا رہا اور اسے اپنا نشان خصوصی دکھایا۔ وہ مجھے کمانڈنگ آفیسر کی جائے قیام تک لے گیا اور میں نے اپنا پیغام پہونچا دیا۔ اس نے کہا "تم بڑی جلدی آئے کون سے راستے آئے؟"

"چینے اور گیگ نی کے راستے سے"

کمانڈنگ آفیسر نے مجھے عجیب انداز سے دیکھا۔ "کیا واقعی؟ تم بڑے خوش قسمت ہو لفٹنٹ وان الٹروک! خیر اب تمہیں مانٹ فیسل اور چیلیز کی طرف سے واپس جانا ہوگا اور میں تمہارے ساتھ ایک امدادی دستہ بھیجوں گا۔ یہاں رینیی میں ہمیں خطرات کا زیادہ صحیح علم رہتا ہے"

"جناب! یہ تو میں بھی خوب جانتا کہ یہاں خطرہ ہے"
ں نے جواباً کہا۔

میں تین امدادیوں کی معیت میں واپس ہوا۔ چلتے وقت مانڈنگ آفیسر کے گھنٹے پر نظر ڈال لی تھی۔ اس وقت دس بجے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مانٹ قرمیل پہونچنے میں پون گھنٹہ لگے گا۔ نکہ یہاں برف گہرا تھا اور کہر بہت دھندلی۔ مانٹ قرمیل سے نکل کر ہم کسی قدر بلند میدان میں آئے۔ یہاں برف بھی کم تھا اور کہرا بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ ہم اس وقت اپنے پڑاؤ کے عقب میں تھے اور خطرہ صرف مسلح کسانوں کا تھا جن کے گروہ کے گروہ کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو اغوا کرنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر پھرا کرتے تھے۔ لیکن اب ہم چار تھے۔ اس لئے خطرہ زیادہ ہولناک نہ تھا۔ مجھے قدرے سکون تھا۔ اور پہلی بات جو دماغ میں آئی — آپ بتا سکتے ہیں کیا ہوگی؟ بوڑھی کسان عورت اور اُس کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی؟ — قطعی نہیں — بلکہ ایم۔ بونیٹ کی سیاہ سورنی — کیا سچ مچ ایم بونیٹ کی سورنی نے پندرہ بچّے دیئے تھے۔ یا پندرہ بچّے محض کسی پوشیدہ قاعدے سے پیرس والوں کو نئے رنگروٹوں کی اصلی تعداد بتانے کا ذریعہ تھے اور اس طرح اُن کی ہمّت افزائی کرنا اور محاصرہ کو زیادہ دنوں تک قائم رکھنا مقصود تھا؟ میں اسی مسئلہ پر اُلجھ رہا تھا کہ اس انتہائی سنسان میدان میں دُور فاصلے پر ایک قلعہ میں روشنی نظر آئی۔ میں نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ اور ٹھہر گیا۔ یہ واقعی تعجب خیز منظر تھا۔ اس وقت پیرس کے اِردگرد بہت سے قلعے تھے لیکن میں نے کسی میں بھی ایک آدھ محافظ کے سوا مکینوں کو آباد نہ دیکھا تھا۔ ان دنوں قلعے کا منہدم ٹوٹی ہوئی دیواریں۔ پامال باغیچہ ٹپکتی ہوئی چھتیں۔ خاموشی اور اُجاڑ پن تھا۔ لیکن اس قلعہ کی پہلی اور دوسری منزل کی کھڑکیوں سے روشنی باہر برف سے ڈھکی ہوئی زمین پر پڑ رہی تھی۔ گویا یہاں تک کبھی کوئی جرمن سپاہی پھٹکا بھی نہ تھا۔ عقب میں درختوں کا ایک گنجان جھنڈ تھا۔ یہ قلعہ کسی فرانسیسی خاندان کا مسکن تھا۔ بلاشبہ اس کی سادگی اور پُرسکون روشنی زبانِ حال سے مکینوں کی باقرینہ زندگی اور عورتوں کے شریفانہ مشاغل کی داستان سُنا رہی تھی۔ لیکن میں ایم۔ بونیٹ کی سورنی کی بابت سوچ رہا تھا یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہاں ہمارا کوئی افسر مقیم نہ تھا جو اس طرح کرسمس کی رات منا رہا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو سنتری کبھی کا للکار چکا ہوتا۔ لیکن جوں جوں میں اس قلعہ اور اس کی روشن کھڑکیوں کی طرف دیکھتا تھا۔ میرے دل میں ایم۔ بونیٹ کی سورنی کا خیال مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ کیا یہ قلعہ اس زمیں دوز راستہ کا آخری نامعلوم سٹیشن تھا۔ جس کے ذریعہ خبریں پیرس پہونچ رہی تھیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ اب تک آباد کیوں تھا؟ ہم نے باغیچہ سے گزر کر دروازے تک پہونچنے والی روش کا نصف حصہ طے کیا تھا کہ ایک پھاٹک نظر آیا وہاں ہم گھوڑوں سے اُترے اور تقریباً بیس گز کے فاصلے پر ایک درخت سے انھیں باندھ دیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے مکان کا ایک چکّر لگانے کو کہا اور خود سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن اس سے پیشتر کہ میں وہاں تک پہونچوں، سامنے کا دروازہ کھُلا اور ایک لڑکی لالٹین لئے ہوئے باہر آئی۔

اُس نے لالٹین سر سے اوپر اُٹھالی اور سامنے غور سے دیکھنے لگی۔ روشنی اس کے بالوں، چہرے اور لباس پر پڑ رہی تھی۔ وہ ایک دُبلی پتلی لانبی دوشیزہ تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور خوبصورت چہرہ دعوتِ نظر دے رہا تھا۔ اگرچہ چہرے کا رنگ زرد تھا اور بھویں سکڑی ہوئی تھیں وہ ایک سفید فراک پہنے ہوئے تھی جو لالٹین کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ اس کے شانوں پر ایک بھاری فوجی کوٹ پڑا ہوا تھا اور وہ لالٹین اِدھر اُدھر گھُما رہی تھی۔ گویا وہ تاریکی کو چیر کر دُور فاصلہ پر کسی چیز کو دیکھنا چاہتی ہے۔ روشنی اور سایہ سرعت کے ساتھ اس کے سفید فراک، فکرمند چہرے، اور خوبصورت بالوں کی لٹوں پر ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔

"مادام! تم اس وقت کس کا انتظار کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ میں اس سے نہایت قریب تھا لیکن اس نے مجھے اب تک نہ دیکھا تھا۔ میں نیچے کی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ وہ میرے سر کے اوپر سے کہیں دُور نظر دوڑا رہی تھی۔ پھر بھی وہ گھبرا کر چیخی چلائی نہیں، ہاں البتہ لالٹین اس کے ہاتھ میں کانپ رہی تھی وہ ایک لمحہ کے لئے بالکل ساکت و صامت کھڑی رہی

اور پھر اپنا بازو جھکایا تاکہ روشنی میرے چہرے پر پڑے۔ "تم جرمن ہو" اس نے کہا۔

"ہاں میں انفنٹری لفٹنٹ ہوں۔ لیکن تمہیں خوف زدہ نہ ہونا چاہئے،" میں نے جواباً کہا۔

اُس نے بڑی دھیمی آواز سے کہا "میں قطعاً خوف زدہ نہیں"

"پھر بھی مادام! تم کانپ رہی ہو۔ دیکھو تمہارا ہاتھ کپکپا رہا ہے،"

"یہ تو سردی کی وجہ سے ہے،"

"تم کس کا انتظار کر رہی تھیں؟"

"کسی کا بھی نہیں۔ میں نے گھوڑوں کی ٹاپوں اور لگاموں کے کھڑکھڑانے کی آواز سُنی اور یہی دیکھنے باہر آئی۔ ہمارے سب پڑوسی تو بھاگ گئے ہیں"

"مادام! تو پھر یہ لالٹین کسی قسم کا سگنل نہ تھا؟"

اُس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور میں نے خیال کیا کہ ادا کاری کا یہ نمونہ خوب تھا۔ بہت سے آدمی اس سے مسحور ہو گئے ہوتے لیکن یہ مجھ پر کارگر نہ ہو سکتا تھا۔ میں اس بھاری فوجی کوٹ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ اسے اس قدر نڈر ہو کر کیوں استعمال کر رہی ہے؟ یہ اسے کہاں سے ملا؟

"سگنل" اُس نے زور دے کر یہ لفظ دہرایا "کس کے لئے؟"

"مونٹ گنشٹ کے جنگل میں چھپے ہوئے کسی آدمی کے لئے کہ وہ آئے اور خبریں پیرس میں لے جائے۔۔۔ وہ خبریں جو اس مکان میں کبھی کی پہونچ چکی ہیں؟"

وہ آگے کو جھکی اور نظریں گاڑ کر مجھے دیکھنے لگی اور کوٹ کو اپنی گردن سے قریب تر کرنے لگی۔ اور کہنے لگی تم عجیب و غریب غلط فہمی میں مبتلا ہو موسیو! یہاں پیرس کے لئے کسی قسم کی خبریں نہیں لائی گئیں"

"کیا سچ مچ ایسا ہی ہے؟" میں نے کہا اور اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور فتحمندانہ انداز میں کہنے لگا "شاید اب تم کہوگی کہ تمہارے شانوں پر پڑا ہوا کوٹ بھی عورتوں ہی کے لئے ہوتا ہے" وہ ہنس پڑی۔ یہ توہین آمیز ہنسی تھی۔ کسی نوجوان آدمی سے سنجیدہ طور پر پیش نہ آنا ہمیشہ توہین آمیز ہوتا ہے اور خصوصاً جب کہ وہ فاتح ہو!

اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ میں نے خوب جال لگایا ہے اور وہ اس طرح ہنس رہی تھی گویا میری غلطی معاف کر رہی ہے یہ سچ ہے کہ ایک لڑکی اپنے ہم عمر نوجوان مرد سے زیادہ مُسن اور تجربہ کار بننے کا حق رکھتی ہے۔ لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اوپر کی سیڑھی پر کھڑی مجھے حقارت سے دیکھ کر ہنستی رہے گویا وہ عمر میں مجھ سے اتنے ہی سال بڑی تھی جتنی سیڑھیاں میرے اور اس کے درمیان تھیں وہ مجھے سمجھانے لگی "یہ کوٹ جو میں پہن رہی ہوں ایک زخمی افسر کا ہے جو قید کر لیا گیا تھا اور پھر حراست میں آجانے کے زبانی اقرار پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ ہمارے ہی مکان میں رہتا ہے"

"تب تو میں اس سے ضرور ملاقات کرونگا" میں نے کہا اور اپنے ایک ساتھی کو بلایا۔ جوں ہی وہ میرے نزدیک آیا لڑکی کا منہ فق ہو گیا "تم تنہا نہیں ہو"؟ اس نے کہا اور اچانک اس کا روشن چہرہ مغموم ہو گیا "تم اُسے واپس لینے تو نہیں آئے موسیو!؟ اس نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ اگر اس کے امکان میں بھی ہوتا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا اور آئندہ بھی نہ کرے گا اس لئے کہ وہ زبان دے چکا ہے سچ بتاؤ موسیو تم اُسے لینے کی غرض سے تو نہیں آئے ہو" اب اس کے لہجے میں خوشامد کا رنگ آگیا تھا۔

"مادام! یہ ہم سوچیں گے"

میں نے اپنے ایک ساتھی کو دروازہ پر چھوڑا اور دو ساتھیوں کو ہال میں ٹھہرنے کا حکم دیا اور میں لڑکی کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں پر چڑھ کر دوسری منزل پر پہونچا۔ اس کی تمام رعونت رفو چکر ہو گئی تھی وہ نہایت ادب سے مجھے راستہ دکھا رہی تھی جو میرے نزدیک میرے شکوک مٹانے کی ایک اور کوشش تھی۔ لیکن وہ اپنی جگہ قائم تھے مجھے اس کی باتوں پر قطعی اعتبار نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس افواہ کا ثبوت

---

۵ دقت یہ ہے کہ انگریزی کی فوجی اصطلاحات کے لئے اردو کا کوئی ایک لفظ نہیں ملتا۔ بمشکل تمام اس پورے جملے سے Parole کا مطلب واضح کیا ہے۔ مظفر

یرے ہاتھ میں تھا جو ہمارے خیموں میں اُڑ رہی تھی۔ وہ دروازے پر مڑی۔ اور ہینڈل گھما کر کہنے لگی "موسیو! یہ میرا ذاتی کمرہ ہے اسے ہم سب مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ یہ دوسرے کمروں کی نسبت ذرا زیادہ گرم ہے۔ اور دوسرے ہمارے سب نوکر بھاگ گئے ہیں۔ صرف ایک باقی ہے۔"

یہ ایک خوبصورت کمرہ تھا اور خصوصاً اس نوجوان کو جو برف اور تاریکی میں سے آیا ہو یقیناً آرام دہ نظر آتا تھا کونے میں ایک پیانو رکھا تھا۔ جس کے تاروں کو زنگ سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک کمبل ڈال دیا تھا۔ میز پر کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ گدے دار صوفے اور گہری گہری آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ آتشدان میں فرحت بخش آگ جل رہی تھی۔ یہ ساری جزئیات میں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیں۔ تب میں نے مکینوں پر نظر ڈالی۔ ایک نوجوان آتشدان کے قریب صوفے پر لیٹا تھا۔ اُس کی ٹانگیں کپڑے سے ڈھکی تھیں۔ اس کا چہرہ جو ..... میرا خیال ہے تندرستی کے زمانے میں غیر معمولی حسین ہوگا۔ اس وقت مرجھایا ہوا زرد رنگ کا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ چہرے کی زردی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں اور سیاہ بالوں کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہوگئی تھی وہ تکیہ کے سہارے لیٹا تھا۔ اور ایک بوڑھی عورت کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ جو ایک چھوٹی تپائی پر بیٹھی تھی۔

میں آتش دان کی طرف بڑھا اور ہاتھ سینکنے لگا۔ "آپ ہی وہ افسر ہیں جو زبانی اقرار پر رہا کئے گئے ہیں؟" میں نے کہا۔ افسر نے نہایت ادب کے ساتھ گردن جھکائی اور "آپ کی تعریف مادام"؟ میری وردی نے اس بوڑھی عورت کو دہشت کے مارے مفلوج کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ شطرنج کا مہرہ ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی اور ہکا بکا مجھے تک رہی تھی۔

"موسیو! تم نے انہیں ڈرا دیا" نوجوان دوشیزہ نے کہا "یہ میری چچی ہیں"

"ہاں کیا آپ براہ کرم بتائیں گی کہ اس کی کیا وجہ کہ آپ ابھی تک یہاں مقیم ہیں۔ جبکہ آپ کے سب پڑوسی بھاگ گئے ہیں؟"

"یہ بڑی سیدھی سی بات ہے میری ماں علیل ہے۔ وہ نہ یہاں سے جا سکتی ہے نہ ہم اسے تنہا چھوڑ سکتے ہیں۔"

"معاف کیجیے میں اس بیان کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

زخمی افسر اپنی کہنیوں کے بل اُٹھ بیٹھا۔ گویا میرے رویئے کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن مادام صوفیہ (نوجوان دوشیزہ کا نام تھا) نے ہاتھ بڑھا کر اُسے روکا اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ اگرچہ مادام صوفیہ کے چہرے پر بھی غصہ کی وجہ سے ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ تاہم اُس نے نہایت پُرسکون لہجہ میں کہا "میں خود آپ کو اپنی ماں کے کمرے تک لے چلوں گی" میں ہنسا اور کہنے لگا۔ "مجھے بھی یہی اُمید تھی کہ تم مجھے اپنی ماں کے کمرے تک لے چلوگی اور اپنے عزیزوں کو مشکوک خطوط جلا دینے کا موقع دوگی شکریہ میں اتنی جلدی دھوکے میں نہیں آ سکتا۔"

مادام صوفیہ کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔ تاہم اُس نے بڑی متانت سے کہا "نہیں تو یہاں کوئی بھی خط نہیں۔"

"خیر اس بیان کی بھی تصدیق کروں گا" میں دروازہ تک گیا اور اس طرح کھڑے ہو کر کہ کمرے کے اندر بھی نظر رکھ سکوں اپنے ساتھی کو پکارا اور اُس سے کہا "تم مکان کی جلدی سے تلاشی لو اور مجھے بتاؤ کہ اس میں کتنے آدمی ہیں" اور "ہاں! تم مادام ہمارے ساتھ اسی کمرے میں رہوگی!"

میں نے اپنے کندھوں کو جنبش دی اور دروازہ بند کر کے کمرے میں واپس آیا "موسیو! تم زخمی ہو؟ کہاں ہوئے تھے؟" میں نے اس فرانسیسی افسر سے دریافت کیا۔

"لی بور جیبٹ کے مقام پر"

"اور تم زبانی اقرار پر رہا ہونے کے بعد فوراً ہی یہاں چلے آئے؟"

فوجی افسر مسکرا کر مادام صوفیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "ہاں اس لئے کہ یہاں میرے عزیز ترین دوست رہتے ہیں۔" اس نے صوفیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرانسیسی رعنائی سے لب تک لے گیا اور چوم لیا۔ میں جلد ہی ان تعلقات سے واقف ہوگیا جو اس نوجوان اور دوشیزہ میں قائم تھے۔ مادام صوفیہ سیڑھیوں پر یہ سمجھ کر کہ میں اپنے قیدی کو واپس

لینے آیا تھا کس قدر بیتاب ہوگئی تھی وہ اب خاموش تھی۔ لیکن یہ خاموشی بھی گویائی سے کم نہ تھی۔ افسر کے نزدیک وہ بوسہ شکریہ ادا کرنے کا ایک خوبصورت طریقہ تھا اور بس۔ اس میں "عادت" کی جھلک پائی جاتی تھی یہ بوسہ اس قدر تکلف، اس قدر لاپروائی سے لیا گیا تھا کہ اس میں گرم جوشی نام کو نہ تھی۔ لیکن صوفیہ کی حالت بیر ہد ہی تھی۔ فوجی افسر اسے نہ دیکھ سکا چونکہ اس کا سر صوفیہ کے ہاتھ پر جھکا ہوا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے شانوں کو ہلکی سی جھرجھری دی۔ بوسے نے سے دُکھ پہونچایا تھا 'نہیں' بلکہ اس کمل شان و رعنائی نے جس سے بوسہ لیا گیا تھا اس ثبوت نے کہ یہ شکریہ ادا کرنے کے سوا کچھ نہ تھا — یہ ایک عورت تھی جو محبت کرتی تھی وہ ایک مرد جو محبت کا جواب محبت سے نہ دیتا تھا — اور وہ یہ بخوبی جانتی تھی۔ مجھ پر بھی جس نے صرف ایک نظر میں یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا یہ بات بالکل ظاہر ہوگئی تھی لیکن وہ افسر اس کے چہرے سے کچھ نہ پڑھ سکا اور صوفیہ کے لبوں پر یہ رسمی فقرہ تھا "اگر تم نہ آتے تو ہمیں دُکھ ہوتا"

میں نے اپنا سوال جاری رکھا "تمھارا ڈاکٹر اسی مکان میں رہتا ہے؟"

"اس وقت؟ .....اس وقت تو نہیں ہے"

"ہونھ"

نوجوان افسر نے تکیہ سے سر اُٹھایا اور مجھے سر سے پیر تک حقارت کی نظر سے دیکھا "میں سمجھا نہیں مونسیو! تم کیوں میرے لفظ لفظ پر شک کرتے ہو؟"

"کیوں نہ کروں؟" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ یہ بالکل ممکن تھا کہ یہاں کی ہر چیز ایک فریب ہو یہ گہوارہ یہ کمبل جو اس کی ٹانگوں پر پڑا ہوا تھا۔ یہ تکیہ سب مکمل فریب ہو۔

ان دنوں بہت سے سپاہی جو تھکے ماندے اور بیمار نظر آتے تھے جن کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں جن کا رنگ زرد تھا، لیکن پھر بھی ان کے اعضا صحیح و سالم ہوتے تھے اور وہ دن کے چوبیس گھنٹے کام کر سکتے تھے۔ یہ میرا ذاتی خیال تھا اور اب تک افسر کی ظاہرا حالت جو مجھے نظر آ رہی تھی اسے غلط ثابت نہ کر سکی، ہو سکتا تھا کہ یہ نوجوان افسر پیغام رسانی کا فرض انجام دینے کے لئے پوشیدہ طور پر یہاں رکھا گیا ہو۔ ممکن ہے۔ مادام صوفیہ دروازے پر لالٹین اسی لئے گھما رہی ہو کہ کسی اور پیغام رساں کو بلائے۔

"ہاں کیوں نہ تمھاری ہر بات پر شک کروں" میں نے پھر دہرایا۔ افسر نے میری طرف سے مُنہ پھیر لیا اور بوڑھی عورت سے کہنے لگا "اب تمھاری باری ہے" اور شطرنج کا مہرہ بساط پر رکھ دیا۔ مادام صوفیہ میز سے لگ کر کھیل دیکھنے میں محو ہوگئی اور کھیل اطمینان سے ہونے لگا۔ گویا کوئی کمرے میں خلل انداز ہی نہ تھا۔ یہ مجھے بہت ہی ناگوار گزرا۔ میں نے اپنے آپ کو نہایت بے تکلف ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے میرا دھیان بھی نہ کیا میں کسی غیر معمولی انکشاف کرنے پر تُلا ہوا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں یہ معلوم کر سکوں گا کہ خبریں کس طرح پہونچ رہی ہیں تو میری شہرت ہوگی اور میری ترقی ہو جائے گی۔ اتنے میں میرا ساتھی دروازہ کھول کر اندر آیا اور کہنے لگا "میں نے مکان کی تلاشی لے لی ہے لیکن تمام مکان میں سوائے ایک مریضہ اور ایک نوکر کے جو اُس کی تیمارداری کے لئے بستر سے لگا بیٹھا تھا، اور کسی کو نہ دیکھا"

"بہت خوب"، میں نے کہا۔ اور میرا ساتھی ہال میں واپس چلا گیا۔

مادام صوفیہ بساط سے اُٹھی اور میرے بالمقابل آن کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کا چہرہ غصہ سے تمتمار ہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔

"اب شاید آپ بتا دیں گے کہ آپ کے آنے کا منشا کیا تھا؟"

"ہاں ہاں ضرور"، میں نے جواباً کہا اور نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں اور پھر آہستہ سے کہا "میں ایم۔ بونیٹ کی سیاہ سورنی کے متعلق مزید معلومات بہم پہونچانے آیا ہوں"

مادام صوفیہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی گویا یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آیا میں پاگل تھا یا شرابی اسے یقین تھا کہ میرے دماغ میں ایک فتور تھا۔ نوجوان فرانسیسی اپنے صوفہ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا اس کی پیشانی کی رگیں اُبھر آئی تھیں اور چہرہ سُرخ انگارہ ہوگیا تھا "یہ ہماری کھلی توہین ہے" وہ دیوانہ وار چیخ اُٹھا اور میں نے بھی اسی

طرح چیخ کر جواب دیا "اپنی زبان کو لگام دو تم بار بار بھول جاتے ہو کہ تم ہمارے قیدی ہو اور یہاں زبانی پر رہا ہوئے ہو۔"

وہ صوفہ پر کراہ کر گر پڑا۔ صوفیہ دوڑ کر اُس کے پاس گئی "تمہاری ٹانگ دُکھ رہی ہے تمہیں حرکت نہ کرنا چاہیے تھی" اس نے کہا

"نہیں، کوئی خاص بات نہیں" اُس نے نیم بے ہوشانہ لہجے میں جواب دیا۔

اسی اثنا میں، میں کسی بکس یا صندوقچہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا لیکن مجھے اس قسم کی کوئی چیز نظر نہ آئی البتہ ممکن ہے کسی کتاب کے صفحوں کے درمیان پوشیدہ خبریں چھپا رکھی ہوں۔ میں میز تک گیا اور کتابوں کو جھاڑ جھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن ان میں سے کاغذ کا ایک پُرزہ بھی نہ گرا۔ کمرے میں کسی اور کمرے کا ایک دروازہ نظر آیا "مادام وہ کیا کمرہ ہے"؟ میں نے پوچھا۔

"میرے سونے کا کمرہ" اُس نے نہایت سادگی سے جواب دیا اور ایک متکبرانہ انداز سے دروازہ کھول دیا۔ میں اس صاف ستھرے خوبصورت کمرے میں داخل ہو گیا اور بغیر معذرت کا ایک لفظ کہے، راستے گرد و غبار اور برف سے بھرے ہوئے جوتوں سمیت بلا جھجک اندر چلا گیا۔ مادام صوفیہ میرے پیچھے پیچھے آئی۔ میں کپڑوں کی الماری اور میز کے خانے تلاش کرنے لگا۔ آخر کار میں نے سنگار میز کے ایک خانے کو ٹٹولا جو مقفل تھا۔ میں نے نوجوان دوشیزہ کی طرف نظر اُٹھائی۔ وہ کن انکھیوں سے مجھے تک رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے خون کی گردش تیز ہو گئی ہے "یہ دراز کھولو مادام!" میں نے کہا

"اس میں کچھ پرائیویٹ چیزیں ہیں۔"

"اسے کھول دو ورنہ میں توڑ ڈالوں گا۔"

"نہیں نہیں"

جونہی میں نے دستہ کو جھٹکا دیا وہ چلا کر کہنے لگی "ٹھہرو میں اسے کھول دوں گی۔" اُس نے دوسری دراز سے کنجی نکالی اور قفل میں گھمانے لگی۔ اس تمام عرصہ میں وہ مجھے برابر تکتی رہی۔ وہ شاید میرے ساتھ کوئی فریب کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں بھی غور سے دیکھتا رہا۔ اُس نے کنجی گھمائی، دراز کھولی اور غیر معمولی سرعت سے کوئی چیز نکالی اور دروازے سے انتہائی تیزی سے بھاگی۔ وہ نہایت صفائی سے دوڑی، نہ کسی کرسی سے ٹکرائی نہ کہیں گری نہ اٹکی۔ اِس کے تعاقب میں میں نے کئی ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن چونکہ اسے دوسرے دروازہ کا کھٹکا کھول کر بھاگنا تھا۔ اِس لئے میں نے اسے پکڑ لیا اور اپنے بازوؤں کی سخت گرفت میں لے لیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا نہایت نفیس "آبنوسی صندوقچہ" تھا جو اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور یہی وہ چیز تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے زور سے ہنس کر کہا "میرا بھی یہی خیال تھا مادام! بکس گرا دو.... اسے زمین پر پھینک دو" اس کشمکش کی آواز برابر کے کمرے میں پہونچ چکی تھی۔ اس کی چچی تیزی سے جھپٹی اور چلا کر کہا "کیا ہوا؟ موسیو کیا تم اسے جان سے مار دوگے؟"

"بکس زمین پر گرا دو" جیسے ہی یہ فقرہ میری زبان سے ادا ہوا اُس نے بکس دروازے سے باہر پھینک دیا۔ اس نے اسے زینے کے اوپر سے نیچے پھینکنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے بازو اُس کے گرد تھے اس لئے یہ دروازے کے سامنے روش پر گرا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور دوڑ کر صندوقچہ اُٹھا لیا۔ جب میں اسے لے کر واپس ہوا تو وہ اپنی گردن سے ایک سنہری زنجیر اُتار رہی تھی۔ زنجیر کے سرے پر ایک چھوٹی سی کنجی لٹک رہی تھی۔ اس نے یہ میری طرف بڑھائی "اسے یہیں کھول لو" اس نے دبی آواز مگر پُر درد لہجہ میں کہا۔

اس یک لخت تبدیلی نے میرے شکوک اور بڑھا دیئے۔ ایک لمحہ پہلے وہ صندوقچہ لے کر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اب کھولنے کے لئے میری خوشامد کر رہی تھی۔ "اگر تم اس کی چیزیں دکھانے کے لئے اس قدر بیتاب تھیں تو تم نے اسے پھینکا ہی کیوں تھا؟"

"میں نے اسے ہال میں پھینکنے کی کوشش کی تھی۔"

"لیکن وہاں بھی میرا ساتھی اُٹھا لیتا۔"

"آہ اس سے کیا ہوتا" اس نے بے چین ہو کر کہا "میں یہ چاہتی تھی کہ تم اسے ہال میں کھولتے خیر اب اسے یہیں کھول لو۔ میں درخواست کرتی ہوں کہ اسے یہیں کھول لو۔"

اس کے خوشامدانہ طرز نے مجھے اس کی درخواست ٹھکرانے

یں اور بھی سنگدل بنا دیا" "نہیں مادام تم شاید کوئی اور فریب کرنا چاہتی ہو" میں نے کہا۔ "شاید تم اپنے دوست کو قریب کے کمرے میں مہلت دینا چاہتی ہو۔ نہیں ہم وہیں چلیں گے اور اطمینان سے آتشدان کے پاس کھولیں گے"

میں نے صندوقچہ ہلایا اس کے اندر کاغذات معلوم ہوتے تھے۔ اب میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں نے آتشدان کے نزدیک کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ مادام صوفیہ تیزی سے میرے پیچھے لپکی اور جونہی میں نے وہ چھوٹی سی کنجی تالے میں ڈالی۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے میرے شانے پر رکھا اور کہنے لگی۔ "میں درخواست کرتی ہوں کہ اسے نہ کھولو۔ اگر تم نے اسے کھول لیا تو یہ میرے لئے ذلت کا باعث ہوگا۔ اور تمہارے لئے پشیمانی کا۔ اس میں تمہارے کام کی کوئی چیز نہیں۔ اس میں میرے کچھ سربستہ راز ہیں۔ موسیو! تم جانتے ہو کہ ایک لڑکی کو اپنے راز کتنے عزیز ہوتے ہیں" وہ مجھ سے لگی کھڑی تھی اس کی پشت فرانسیسی افسر اور بوڑھی عورت کی طرف تھی وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے اور انھوں نے بمشکل تمام اس کی گفتگو کا ایک آدھ لفظ سنا ہوگا۔ یہ سب کچھ اس نے بہت دھیمی آواز سے کہا تھا اور بعض جگہ تو وہ آواز سرگوشی کی شکل اختیار کر لیتی تھی حتیٰ کہ مجھے اس کے لبوں کی جنبش کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔ میں نے اس کا جواب یہ دیا کہ کنجی تالے میں گھمائی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے سے اٹھا کر اس کے ڈھکنے پر رکھ دیا کہ مجھے اس کے کھولنے سے باز رکھ سکے۔ اس نے پھر لجاجت اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "موسیو! میں نے کنجی گلے کی زنجیر میں ڈال رکھی تھی۔ کیا یہ تمھیں سمجھانے کے لئے کافی نہیں؟ اگرچہ تم ابھی جوان ہو کیا تم اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکالتے؟ میں نے ابھی تم سے کہا کہ اگر تم نے یہ صندوقچہ کھولا تو اس سے میری ذلت ہوگی میں نے یہ سمجھ کر کہا تھا کہ یہی تم کو باز رکھنے کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن اب میں دیکھتی ہوں کہ مجھے کچھ اور بھی کہنا چاہئے موسیو! خطوط شوق سے نکال لو۔ دل بھر کر پڑھ لو۔ ان کے متعلق مجھ سے خوب سوال کرو اور اس طرح میری زندگی کو سونا، سنسان اور بےکیف بنا دو۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم میری زندگی کو حقیقی خوشی سے محروم کر دو گے۔ لیکن تمہارا یہ تو منشا نہیں، موسیو! تم کبھی ایسا نہ چاہو گے؟ یہ سچ ہے کہ آج ہم دشمن ہیں۔ لیکن جب لڑائی ختم ہوگی تو اس کے بعد تو تم ہمیں نقصان پہنچانا پسند نہ کرو گے۔ لیکن اگر تم نے یہ صندوقچہ کھولا تو گویا تم تمام عمر میری ایک مصیبت کا باعث رہو گے جب تم اپنے گھر لوٹ کر جاؤ گے تو پچھتایا کرو گے کہ تمھارے ایک بلا ضرورت فعل کی وجہ سے ایک فرانسیسی لڑکی مصیبت میں مبتلا ہے ...... ہاں موسیو تم پچھتاؤ گے اگر تم نے اسے کھولا"

اب ایک شریف انسان کے لئے ناممکن تھا کہ اس کے بیان کے خلوص و صداقت پر شک کر سکے وہ یہ سب کچھ اتنی سادگی سے کہہ رہی تھی۔ ایسی مایوسی اس کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی کہ آج بھی میں اسے صاف طور پر تصور میں دیکھ سکتا ہوں۔ اس کا تمام خلوص حسب کا میں نے اعتراف نہ کیا۔ اس کی تمام دردآمیز فریاد جسے میں نے ٹھکرا دیا آج تک میری نظروں میں پھر جاتی ہے اور میرے سکون و کیف کو پہروں کے لئے برباد کر جاتی ہے۔ اس نے بڑی دوراندیشی سے بتایا تھا کہ مجھے بعد میں بہت پچھتاوا ہوگا وہ یہ سب کچھ خودداری کی وجہ سے کہہ رہی تھی اور اسی خودداری کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے مجھ سے التجا کرتے ہوئے اپنی خودداری کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ تاہم اس نے وقار و تمکنت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ اپنی زندگی کی خوشی کے لئے التجا کر رہی تھی۔ اس لئے کہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی زندگی کی خوشی ایک اجنبی کے ہاتھوں برباد ہونے والی تھی جو ایک لمحہ کے بعد اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ تاہم اس کے لئے اس نے فغان و فریاد نہ کی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اگر یہ فریب ہوتا تو میں خواتین سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز نہ ہوتیں؟!

لیکن اس وقت میں نے سوچا کہ یہ ایک فریب تھا۔ کھلا ہوا۔ وہ مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ صندوقچہ میں مکاتیب محبت تھے ــ مفاہمت آمیز مکاتیب ــ لیکن مجھے معاً خیال آیا کہ اس میں مکاتیب محبت ہو ہی نہیں سکتے۔ میں فرانسیسی افسر کے تشکریہ کا حسین طریقہ دیکھ چکا تھا۔ میں بھانپ چکا تھا کہ کس طرح اس نے صوفیہ کو تکلیف پہنچائی

تھی۔ وہ صرف دوست تھا محب نہیں ـــ وہ محبّت کرتی تھی۔ لیکن اس کا جواب محبّت سے نہ دیا گیا تھا ـــ اس میں محبّت نامے صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتے تھے کہ وہ خود انھیں لکھ کر رکھ لیتی۔ لیکن اس کی خود داری نے کبھی ایسا کرنے کی اجازت نہ دی ہو گی۔

میں نے صندوقچہ کھولا۔ مادام صوفیہ اُٹھ کر جلدی اور ایک کُرسی پر گر کر آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے۔ میں نے میز پر صندوقچہ اُلٹ دیا۔ اس طرح سے وہ خط جو تہ میں تھا سب سے پہلے میرے ہاتھ آیا۔ جب میں نے وہ خط پڑھا تو ہر وہ شک جو میرے دل میں تھا پختہ ہو گیا۔ اس نے محبّت ناموں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس نے کچھ مقدس رازہائے سربستہ کا ذکر کیا تھا۔ لیکن یہ خط اس کے نام کا بھی نہ تھا۔ یہ مادام دی ولے ٹینوز کے نام تھا یہ ایسا خط تھا جو ایک عرصہ ہوا تلف کیا جا چکا ہوتا۔ چونکہ اس کا مفہوم صرف اتنا تھا کہ مادام دی ولے ٹینوز کے شہری گھر یا پورنیٹ گرمین میں کسی نے ضیافت قبول کر لی تھی۔ اس پر آرمنڈ نامی شخص کے دستخط تھے۔ یہ خط چند فقروں پر مشتمل تھا۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ایم آرمنڈ مادام دی ولے ٹینوز کا دُور کا رشتہ دار تھا جو حال ہی میں پیرس میں اپنی تعلیم جاری رکھنے آیا تھا اور جو غالباً اب تک اس خاندان سے ناآشنا تھا۔ میں نے مادام صوفیہ کو ترش روئی سے دیکھا اور کہا۔

" یہ ساری جھنجھٹ صرف ڈنر کے ایک دعوت نامے پر تھی۔ اگر یہ کہیں افشا ہو جائے کہ ایم آرمنڈ مادام دی ولے ٹینوز کے ساتھ کھانا کھائے گا تو تمھاری ذلت ہوتی ہے۔ تمھاری زندگی کی خوشی کے موقعے برباد ہو جاتے ہیں اور مجھے بھی کبھی نہ کبھی پشیمانی کی خلش برداشت کرنا پڑتی ہے۔ چہ خوب؟"

اور میں نے حرف بہ حرف خط اسے پڑھ کر سُنا دیا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا وہ اپنے چہرے کو اُسی طرح ہاتھوں سے چھپائے بیٹھی رہی اور اپنے سر کو آگے پیچھے جنبش دیتی رہی۔ جیسے کہ کوئی بچّہ سخت دردِ سر کی حالت میں کرتا ہے۔ خط پر دو سال پیشتر کی تاریخ پڑی تھی۔ لیکن مہینہ دسمبر کا تھا لیکن غلط تاریخ ڈالنا تو پہلی احتیاط ہوا کرتی ہے میں نے اپنا لہجہ بدل کر کہا۔

" مادام! اِدھر آؤ میں نہایت سنجیدگی سے اس راز کو افشا کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں تمھارے ساتھ بُری طرح پیش آنا نہیں چاہتا۔ تاوقتیکہ اس کے لئے مجبور ہو جاؤں۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ یہ خط پیرس میں جنرل ٹروچو کو کیا خاص خبر پہونچاتا ہے؟

" کچھ بھی نہیں،" اُس نے جواب دیا " بہت اچھا" میں نے کہا اور دوسرا خط اُٹھایا " اوہ! آرمنڈ پھر ایک ہفتے کے بعد لکھ رہا ہے کہ یہ ایک اچھا ڈنر تھا اور ایم آرمنڈ اس کے لئے خاص طور پر ممنون ہے" شکریہ واقعی مبالغہ آمیز تھا۔ اس میں جذبات کا زور تھا جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ جب ایک نوجوان پیرس کی اعلیٰ ترین سوسائٹی سے روشناس ہونے کے بعد لکھتا ہے تو اس میں جوشِ جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ حقیقتاً خط و کتابت بڑے فن کارانہ انداز میں کی گئی تھی۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اس میں پوشیدہ کیا تھا؟ الفاظ کی سطح کے نیچے چھپا ہوا مطلب کیا تھا؟ میں یہی سلجھانے میں لگا رہا۔ میں نے تاریخ اور الفاظ پر غور کیا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ عنقریب کوئی زبردست انکشاف ہونے والا ہے۔ ڈنر پر بہت زور دیا گیا تھا۔ شاید یہ کسی خاص اہمیت والے واقعہ کی طرف اشارہ کناں ہو۔ پہلے خط میں آئندہ ڈنر کا تذکرہ تھا دوسرے خط میں ڈنر کے کامیاب ہونے کا ذکر تھا۔ میں سوچنے لگا کہ فرض کرو ڈنر سے مراد معرکہ آرائی ہے تب خط میں اس دھاوے کی طرف اشارہ ہوگا جو پیرس کے محصور سپاہیوں نے کیا تھا اور ولے ایورارٹ اور مین بلانچے پر قبضہ کر لیا تھا۔ مادام دی ولے ٹینوز نے ڈنر دیا یا جنرل ٹروچو نے دھاوا کیا تو مادام دی ولے ٹینوز سے مراد جنرل ٹروچو ہیں۔ پھر آرمنڈ سے کیا مراد ہے؟ ہاں ٹھیک ہے۔ پیرس سے باہر کے صوبجاتی لوگ۔

میں نے اس اظہارِ تشکر کا خوب مطلب نکال لیا تھا۔ اگرچہ اس وقت آپ کو یہ دُور از کار اور کھینچ تان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ آپ لڑائی کے ہنگامہ میں ہیں اپنی عمروں میں سے بیس سال منہا کر دیجئے۔ اپنے آپ کو بالکل جوان خیال کیجئے۔ جب کہ آپ ترقی کرنے پر تُلے ہوئے ہوں جب آپ کا دماغی توازن نیند پوری نہ ہونے، مکمل آرام نہ ملنے، پیٹ بھر کر کھانا نہ ملنے اور مختلف وجوہات کی بنا پر بگڑ چکا ہو اور لڑائی کے حادثات نے آپ کا دل پتھر کر دیا ہو اس وقت کوئی چیز ایسی نہ ہو گی جو آپ کو "دُور از کار اور کھینچ تان" معلوم ہو۔ اس وقت مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا گویا میں خط نہایت صحت کے ساتھ پڑھ رہا ہوں اور صحیح صحیح مطلب نکال رہا ہوں مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا میں ترقی پا کر جنرل شاف سے دوسرے نمبر پر

کپتان کے بلند منصب پر پہونچ گیا ہوں۔ ایم۔ آرمنڈ صوبجاتی فرانسیسیو کو ظاہر کر رہا تھا۔ بلاشبہ وہ لوگ اس دھاوے سے بہت شکرگذار ہوں گے۔ لیکن ایک دِقت اور آن پڑی تھی اور وہ یہ کہ ایم۔ آرمنڈ ڈنر کے موقع پر موجود تھا۔ لیکن ولے ایوزارٹ کے دھاوے کے موقع پر پیرس کے لوگ جنرل ٹروچو کی مدد کو نہ آئے تھے۔ میں نے اور خطوط دیکھے کہ شاید اس کی خاطر خواہ کوئی تشریح نکل آئے۔ تیسرا خط مادام دی دلے ٹنیوز کے نام تھا۔ اُس نے اپنی ماں کی طرف سے "اوپیرا" کے لئے ایم۔ آرمنڈ کو مدعو کیا تھا۔ لیکن ایم۔ آرمنڈ نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ وہ اتنا خوش قسمت نہ تھا کہ وہ مادام صوفیہ کے گھر پر آسکے اس لئے "اوپیرا" میں اِن کی ملاقات کا منتظر رہے گا۔ کیا یہ معذرت تھی ولے ایورارٹ پر فرانسیسی صوبجاتی لوگوں کی غیر موجودگی کی؟ کیا یہ آئندہ موقع پر موجودگی کا پیمان نہ تھا؟

"مادام" میں نے چیخ کر پوچھا "اوپیرا سے کیا مراد ہے؟" مادام صوفیہ ہنسی اور انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہنے لگی "اوپیرا سے مراد؟ — اوپیرا سے مراد ہے نغمہ، رقص، لطافتِ حسن اور بہت سی چیزیں جو تم نہیں سمجھ سکتے"

میں جوش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس کھُلی توہین کا کیا مطلب تھا؟" ٹھیک ہی میں اپنے دل کی تسکین کرنے لگا۔ ایم۔ آرمنڈ سے لاٹر کی فوج مراد ہے۔ یہ وہی فوج تھی جس کی ولے ایورارٹ کی لڑائی میں توقع کی جاتی تھی۔ یہ خط گویا ایک بیان تھا کہ آئندہ اطلاع پاکر یہ پیرس کے محصور دستے کی مدد کو آئے گی۔ یہ بڑی اہم خبر تھی اور ضرور انکشاف کرنے والے کی عزت و توقیر کا باعث ہوگی۔ میں نے جلدی سے دوسرے خطوط پڑھے اِدھر اُدھر سے کچھ حصے پڑھتا اور اوٹ پٹانگ سوال کرکے مادام صوفیہ کو بار بار چونکا دیتا۔ کہ شاید گھبراہٹ میں اس کا اعتراف کرلے۔ لیکن اس نے اپنا رویّہ نہ بدلا اور زبان سے ایک لفظ نہ کہا اس کا یہ رویّہ اور بھی اشتعال انگیز ہوتا جارہا تھا۔ چونکہ میں ان خطوط میں کچھ اصلیت کی رمق محسوس کر رہا تھا۔ یہ ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے تھے۔ ان سب پر آرمنڈ کے دستخط تھے اور وہ لڑائی سے دوسال قبل پیرس کے ایک نوجوان کی زندگی کی مختلف تصاویر پیش کرتے تھے ان میں ڈنر

پارٹیاں، عکاس خانے۔ امتحان کی کامیابیاں۔ انعامات کا حصول اور کبھی ناکامی۔ شہسواری اور اتوار کی دیگر سیر و تفریح مذکور تھیں۔ یہ تمام الفاظ۔ یہ ملاقات کے وعدے وعید کچھ نہ کچھ معنی تو ضرور رکھتے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تب تو میری قسمت میں کتنی بڑی کامیابی لکھی ہے حیرت ہوتی تھی کہ پوشیدہ خبریں پہنچانے کا کس قدر باقاعدہ نظام قائم تھا۔ لیکن مجھے تعجب تھا کہ یہ اب تک پیرس کیوں نہ پہونچ سکیں۔ بڑی مشکل سے میں اپنے قیاسات کو مشکوک سمجھنے لگا۔ میں نے کچھ خطوط اور پڑھے اور پھر یک لخت پہلے خط کی طرف متوجہ ہوا۔ ان کا بعد کے خطوں سے مقابلہ کیا۔ میرا یہ گمان آہستہ آہستہ یقین میں مبدل ہو رہا تھا کہ خط و کتابت جعلی اور مصنوعی نہ تھی۔ بلکہ اصلی اور سچی تھی۔ چونکہ خطوط کا طرز آہستہ آہستہ تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ یہ تبدیلی اس مبہم تاہم صاف طور پر جھلکتی تھی کہ بڑے سے بڑا ادبی فن کار بمشکل تمام سوچ سمجھ کر ایسا لکھ سکتا تھا۔ یہ صرف جذبات کی زبان تھی، ادائیگی جذبات کا فن تھا۔ مجھے رفتہ رفتہ ایم۔ آرمنڈ کی شخصیت میں تبدیلی نظر آنے لگی جو آہستہ آہستہ صوبجاتی بدمذاقی چھوڑ کر پیرس کی تہذیب و تمیز و شائستگی و لطافت قبول کر رہا تھا۔ اظہارِ تشکر میں وہ بے ساختگی وہ جوش و خروش نہ تھا۔ خواتین کی خوش ادائی پر پہلا سا احساسِ تحیر نہ تھا۔ اس کی آزادانہ رالیوں میں دنیا کی واقفیت اور تجربہ جھلکنے لگا تھا۔ ایم آرمنڈ زبان پر قدرت حاصل کر رہا تھا، اب اُس کی طرزِ تحریر میں سادے الفاظ اور خوش اسلوبی نمایاں تھی۔ آخری خطوط پر پیرس کی مہر تھی اور پہلے خطوط میں اوورین کی۔

تب کیا وہ اصلی تھے؟ لیکن تاہم وہ محبت نامے نہ تھے میں مادام صوفیہ کو کسی قدر گھبراہٹ سے دیکھ رہا تھا وہ کیوں۔ ایک بچہ کی طرح کسی اندرونی کاہش سے سر آگے پیچھے کر رہی تھی؟ اس نے کیوں ان خطوط کے پڑھنے سے باز رکھنے کے لئے اس قدر جدوجہد کی تھی؟ ان میں ایک نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکی کے درمیان آغازِ محبت اور آخرکار بڑھتے بڑھتے پاکیزہ دوستی کا ذکر تھا اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ یہ دوستی ممکن ہے کسی دن شادی سے اور مستحکم ہو جائے۔ اگر اسی طرح فطری طور پر ترقی کرتی رہے۔ لیکن ان میں

شادی کے متعلق ایک جملہ بھی نہ تھا۔ میں ابتک سخت تعجب میں تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

فرانسیسی افسر نے اپنے آپ کو صوفہ سے گرایا اور گھسٹتے گھسٹتے مادام صوفیہ کی کرسی تک آیا۔ اس کے پاجامے کا بایاں پائنچا گھٹنے سے ٹخنے تک لمبائی کے بل پھٹا ہوا تھا تاکہ پٹی باندھنے کی جگہ رہے وہ بڑی تکلیف سے کرسیوں کا سہارا لے کر وہاں تک پہونچا تھا۔ اب میں قطعی شک نہ کرسکتا تھا۔ اسکا زخم اتنا ہی اصلی تھا جتنا کہ وہ خطوط۔ وہ جھکا اور آہستہ سے صوفیہ کا ہاتھ چہرے سے ہٹا کر اپنے ہاتھ میں لیا

"صوفیہ میں یہ خیال کرنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا تھا کہ تم نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی۔ تم ذرا اور جسارت سے کام لیتیں تو میں نے عرصہ ہوا تم سے وہ کہہ دیا ہوتا جو اب کہہ رہا ہوں۔ اس معاملہ میں تمہاری اجازت چاہتا ہوں تاکہ پھر تمہاری والدہ مادام دی دلے ٹینو سے کل تمہاری شادی کے متعلق دریافت کرلوں؟"

میرا ہوائی قلعہ آناً فاناً میں زمیں بوس ہوگیا۔ فرانسیسی افسر ہی وہ آرمنڈ تھا۔ عورتوں کی فطرت ہے کہ ان سہانے حالات کی نشانیاں جو ماضی کی شیریں یاد بن چکے ہوں رکھنے کی شائق ہوتی ہیں اسی فطرت کے زیر اثر مادام صوفیہ نے ان تمام معمولی خطوط اور پرزوں کو بحفاظت رکھا۔ حتیٰ کہ اپنے ماں کے نام کے لکھے ہوئے خطوط بھی رکھ لئے تاکہ افسانہ مکمل ہوجائے۔ لیکن آرمنڈ کو اس کا علم نہ تھا وہ اسے بتانا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کی خودداری اس راز کو فاش کرنے میں مانع تھی چونکہ وہ حقیقت میں محب تھی اور وہ صرف دوست۔ اس مختصر سی گفتگو میں بھی جو اس نے ابھی کی تھی بہت کچھ تصنع اور بہت کم خلوص تھا۔ اب میں سمجھا کہ اس نے صندوقچہ ہال میں پھینکنے کی کیوں کوشش کی تھی تاکہ میں وہاں کھولتا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ واقعی میں اس کی ذلت کا باعث ہوا۔

آرمنڈ کو جواب دینے کے لئے اس نے اپنی نظریں بلند کیں اور سر ہلا کر کہنے لگی "تم مجھے شرمندہ کررہے ہو۔ میں تمہارا بہت بہت شکریہ ادا کرتی ہوں۔ لیکن یہ صرف خطوط کی وجہ سے تم نے ایسا کہا اور میں ہمیشہ یہ خیال کروں گی" "نہیں صوفیہ ایسا نہیں ہے" آرمنڈ نے بیتاب ہوکر کہا۔ "لیکن ہاں اگر موسیو نے وہ صندوقچہ نکھولا ہوتا تو شاید کسی دن ۔۔۔ آہ اب نہیں واقعی اب نہیں۔ بلکہ کسی نہ کسی دن تم خود اپنی مرضی سے آتے اور یہی کہتے جو تم نے اب کہا ہے میں کتنی خوش ہوتی لیکن اب ایسا نہ کہو۔ خدا کے لئے نہ کہو، اس لئے کہ میں ہمیشہ یہ خیال کروں گی کہ خطوط تمہیں اکسا رہے ہیں"۔ ایم۔ آرمنڈ نے اپنا سر جھکا لیا۔ میں نے اس کی خوشی کا موقع چھین لیا تھا۔ ممکن ہے یہ دوستی اگر یونہی فطری طور پر بڑھتی رہتی تو آخر کار شادی کی منزل مقصود تک پہنچ جاتی۔ لیکن میں نے اس کی فطری نشو ونما پر کاری ضرب لگائی تھی۔ مادام میں نے کہا۔ "مجھے دلی افسوس ہے" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "موسیو! میں نے تمہیں پہلے ہی آگاہ کردیا تھا۔ اب ندامت کا وقت نکل چکا"۔ میں اپنا پاؤں ایک لاابالیانہ انداز میں ہلا رہا تھا اس نے نہایت نرمی سے کہا "کیا اب بھی نہ جاؤگے؟ موسیو"

میں کمرے سے نکلا اپنے امدادیوں کو آواز دی گھوڑے پر سوار ہوا اور چلدیا رات آدھی گذر چکی تھی۔ مطلع صاف تھا مجھے نہ بستروں کا خیال آرہا تھا نہ سڑک پر کسی خطرے کا خوف تھا۔ پشیمانی کا جذبہ مجھ پر غالب تھا میں بغیر کسی پاس ولحاظ بغیر مردانہ پاک طینتی بغیر کسی قسم کے آداب کے پیش آیا تھا میں سچائی کو اس وقت بھی نہ جان سکا جب وہ ایک نسوانی پیکر میں مجسم ہوکر میرے سامنے موجود تھی میں صداقت پر اسوقت بھی اعتبار نہ کرسکا جب وہ ایک نوجوان دوشیزہ کی معصوم آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ میں نے مختصراً یہ کہ حیوانوں کا سا برتاؤ کیا۔ لڑائی کے چھ مہینے مجھے انسان سے حیوان بنانے کے لئے کافی تھے۔ میں ایک موہوم امید لئے ہوئے تھا کہ شاید کبھی مادام صوفیہ اور آرمنڈ کے تعلقات خوشگوار ہوجائیں اور اب بھی سوچا کرتا ہوں کہ خدا معلوم ابھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ صرف ایک واقعہ اور ہے جو میں کسی قدر طمانیت قلب کے ساتھ سنا سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ نانسی۔ لی۔ گرانڈ کو واپس آتے ہوئے ایک ایسے مقام پر آیا جہاں چیلیز کی سڑک مانٹ فرمیل کی سڑک کو قطع کررہی تھی دونوں سڑکوں کے درمیان بنے ہوئے زاویہ میں ایک گھاس کے قطعہ کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی تھی میں وہاں رکا اور وہ تمام روپیہ جو میرے پاس تھا ایک دستی رومال میں باندھ کر کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر ڈال دیا۔ ※

سید مظفر برنی

※ کرنیل نے سگار کا آخری جلا ہوا ٹکڑا راکھ دان میں ڈال دیا۔ کرسی پیچھے کھینچ لی اور گھنٹے پر نظر ڈال کر کہنے لگا "چلئے ہیں اوپیرا کے لئے دیر ہو رہی ہے"

"واردات"

میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ رہی ہیں۔ میں غور کر رہا ہوں
کہ میں کس کو یاد کروں۔
میں نے دنیا دیکھی ہے۔ مگر بند آنکھوں کی تاریکیوں میں
میں نے محبت کی ہے۔ میں محبت کر رہا ہوں
"رونق افروزِ جہاں" متحرک ہستیوں سے نہیں تخیل کے
خلا میں .... "غیر مرئی رقصاں مجسموں سے"۔
میں حسن دیکھتا ہوں۔ جب میری آنکھیں بند ہوتی ہیں۔
بند آنکھوں سے محبت بھری نگاہیں نکل جاتی ہیں۔ مگر
"رقصاں مجسمے"
رقص کرتے رہتے ہیں اور میری
نگاہیں اُن کے تعاقب میں آوارہ ہو جاتی ہیں۔ میں آنکھیں کھولتا
ہوں۔ محبت کی نگاہیں حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتی ہیں۔
میں حسن کو آغوشِ محبت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر بیگانۂ
محبت حسن نظر آتا ہے اور بس۔ میں نے مژہ ہائے خوابناک دیکھے
ہیں۔ ان کو موجِ شراب بھی تسلیم کر چکا ہوں۔ مگر "آلودۂ محبت"
مژہ کی دید کبھی نہ پورا ہونے والا ارمان بن گیا ہے۔
پردہ ہائے سیمیں پر "آلودۂ محبت نگاہیں" اکثر دیکھی ہیں
مگر فہم و ادراک نے بتایا ہے کہ وہ محض 'نقل' ہے۔ میں کہتا ہوں۔
نقل کی آفرینش اصل کے وجود سے ہوتی ہے
اگر میری کھلی ہوئی آنکھیں صرف نقل دیکھ پائی ہیں۔ تو اصل آسمانوں
کی بلندیوں میں گم ہے۔ دل کہتا ہے۔ "شاید ایسا ہو" مگر ہوش

کہتا ہے "یقیناً ایسا ہی ہے"
اکثر نغمات کے پردوں میں نالے بلند کئے گئے کہ فضائے محبت
میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ کاش محبت فضاء کے کاندھوں پر چھا جا
محبت ہی محبت ہو۔ محبت کی نگاہیں ہوں۔ محبت کی موسیقیاں
ہوں۔
میرے سازِ تمنا سے بھی یہ آوازیں بلند ہیں۔
زندگی میں۔ "محبت ہے۔ محبت کی نگاہیں ہیں۔ محبت کی موسیقیاں"
لوگ کہتے ہیں اعتبار کیسے کروں؟
میری زندگی میں۔ نہ محبت ہے۔ نہ محبت کی نگاہیں نہ محبت کی موسیقیاں
مجھے یاد کے لئے اُس مغنیِ آتش نفس کی تلاش ہے جس کا نغمہ
نغمۂ محبت ہو اور بس
میرے سازِ ہستی کو چھیڑنے کے لئے اُسکی تارِ نگاہ کی ضرورت ہو
ایسا ہو جائے تو
خوابِ دیوانگی افسانۂ ہستی ہو جائے
مگر
میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ رہی ہیں اور شاید ان کی
انتہائی منزل یہ ہو کہ
دل خاموش ہو جائے۔ میں خاموش ہو جاؤں۔ آنکھیں بند
ہو جائیں اور اُس جگہ جس کو میری کھلی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھ پائی
ہیں میں
حسن کو آغوشِ محبت میں مجسم دیکھوں۔

قیصر

نیا راگ

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

مئی سنہ ۱۹۴۱ء

من کی جھولی

من کی جھولی بھر دے داتا من کی جھولی بھر دے
داتا تیری دَیا نرالی
پھُول بھرے ہیں ڈالی ڈالی
میرے من کی گود ہے خالی ...... داتا
من کی جھولی بھر دے داتا من کی جھولی بھر دے
تاروں سے آکاش سجایا
انگاروں سے نرک بسایا
پریم سندیسا اِدھر نہ آیا ..... داتا
من کی جھولی بھر دے داتا من کی جھولی بھر دے
تھیلی تھیلی مایا بھر دی
مایا کی سب دنیا کر دی
من کی گود بسا بیدردی ..... داتا
من کی جھولی بھر دے داتا من کی جھولی بھر دے
سانجھ سویرے ترنت دوپہری
کوئی گھڑی تو سُن لے لہری
من کی جھولی بہت ہی گہری ..... داتا
من کی جھولی بھر دے داتا من کی جھولی بھر دے

نجم آفندی

ایشیا مئی ۱۹۴۱ء

"صبحِ بیداری"

رخصت اے محفلِ تاریک کہ ہے آمدِ نور
آگئی دھوم مچاتی ہوئی وہ بزمِ طیور
ہاتھ میں ہر گلِ شاداب کے ہے جامِ طہور
پستیوں سے وہ دمکتا مہِ تاباں نکلا

آگئی خستہ امیدوں پہ مسرّت کی بہار
اب نہ وہ بھوک کا نوحہ، نہ غریبی کی پکار
اے وطن جشن مَنا آگئی "صبحِ بیدار"
کھوج میں تاج کے جنگل کا نگہباں نکلا

اے خوشا ہو گئے آزاد اسیروں کے گروہ
ان فضاؤں کو بدل دینگے فقیروں کے گروہ
ہوشیار اپنی تباہی سے امیروں کے گروہ
بزمِ عشرت سے وہ بپھرا ہوا دہقاں نکلا

یہ نہیں وقت کہ دھومیں ہوں پریخانوں میں
یہ نہیں وقت کہ سرشار ہوں میخانوں میں
وہ اٹھا شورِ غریبوں کے الم خانوں میں
گیت گاتا ہوا وہ جشنِ غریباں نکلا

بے نواؤں کو مصیبت سے بچانے کے لئے
دہر سے شوکتِ چنگیز مٹانے کے لئے
ہر جواں ظلم کی بنیاد ہلانے کے لئے
اپنے سینے میں لئے فتح کا ارماں نکلا

وہ زر و مال کے بندوں پہ قیامت آئی
اہلِ ثروت کی کلاہوں کی وہ شامت آئی
خوں چھڑکتی ہوئی دنیا میں بغاوت آئی
میان کی قید سے ہر خنجرِ براں نکلا

صفیہ شمیم ملیح آبادی

ایشیا مئی سنہ ۱۹۴۱ء

"فراموشی"

اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے

ذوقِ نظر کی فتنہ سازی
دل کا شوقِ حسن نوازی
حسن کا طرزِ سحر طرازی
سحر طرازی دیوانہ سازی — اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے

دیکھا تھا اک حشرِ نظر کو
جانِ کشش کو رشکِ قمر کو
شام کی زینت حسنِ سحر کو
دھوکا ہوا تھا یا کہ نظر کو — اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے

ذرّے تھے فردوس بداماں
قطروں میں طوفان سی لرزاں
ماہ د انجم بے خود و حیراں
یہ بھی تھا اک خواب پریشاں — اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے

دُنیا پر اک رنگت سی تھی
ساری فضا میں نکہت سی تھی
دل کو کچھ اک وحشت سی تھی
خواب نما اصلیّت سی تھی — اب تو کچھ بھی یاد نہس ہے

ہر شئے آنکھیں کھول رہی تھی
گونگی دُنیا بول رہی تھی
شبنم موتی رول رہی تھی
رول رہی تھی تول رہی تھی — اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے

قیصر

آج ہی با دلِ رنجور چلا جاؤں گا تجھ کو جب یہ ہی منظور چلا جاؤں گا

میں بہت دُور، بہت دُور چلا جاؤں گا

اب خلش بن کے نہ جھلکوں گا نگاہوں سے تری نقشِ پا تک بھی مٹا جاؤں گا راہوں سے تری

میں بہت دُور ، بہت دُور چلا جاؤں گا

جب مرے اشک ترے ہار کے قابل ہی نہیں جب مرا پیار ترے پیار کے قابل ہی نہیں

میں بہت دُور بہت دُور چلا جاؤں گا

مجھ کو یاں اب مرا احساس نہ جینے دے گا زہر بھی نہ مجھے چین سے پینے دے گا

میں بہت دُور، بہت دُور چلا جاؤں گا

کشمکشِ غم کی کہاں روک سکیگی مجھ کو کون سی چیز یہاں روک سکیگی مجھ کو؟

میں بہت دُور، بہت دُور چلا جاؤں گا

میں چلا جاؤں گا تیری نگہِ قہر سے دُور تیری محفل سے، ترے در سے ترے شہر سے دُور

میں بہت دُور، بہت دُور چلا جاؤں گا

دور اتنا مری آہیں بھی نہ پہونچیں تجھ تک ہاں تصور کی نگاہیں بھی نہ پہونچیں تجھ تک

میں بہت دُور، بہت دُور چلا جاؤں گا

———— ایشیا مئی سنہ ۱۹۴۲ء

دور اتنا کہ جسے سوچ کے جی گھبرائے　　لوٹ آنا بھی جو چاہوں تو نہ لوٹا جائے

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا

اب نہ میں ہوں گا نہ ہر وقت تجھے ٹوکوں گا　　تیرا رستہ نہیں روکوں گا نہیں روکوں گا

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا

سب کی نظروں میں نمایاں نہ کروں گا تجھ کو　　اب یہاں رہ کے پریشاں نہ کروں گا تجھ کو

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا

سچ ہے اظہارِ محبت ہی خطا ہے انجم　　ہاں مری یہ ہی سزا، یہ ہی سزا ہے انجم

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا

کم سے کم یہ تو ملے گا مجھے آرام وہاں　　میرے آگے کوئی لے گا نہ ترا نام وہاں

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا

لوٹ کر اب تری محفل میں نہ آؤں گا کبھی　　یاد بن کر بھی ترے دل میں نہ آؤں گا کبھی

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا

روح میں تیر چلے یاس کے نشتر اب تو　　میرا دل بھی مری آنکھیں بھی ہیں پتھر اب تو

میں بہت دور، بہت دور چلا جاؤں گا

زندگی ہوگی محبت کی کہانی تیری　　مسکرائے گی دلہن بن کے جوانی تیری

میں مگر دور، بہت دور چلا جاؤں گا

اختر (علیگ)

"حرف و حکایات کی رات"

ہائے کیا رات تھی "وہ حرف و حکایات کی رات"
میرے پہلو میں جب اک شوخ رہا رات کی رات

میں بھی اپنے سے حقیقت میں اُسی رات ملا
آئینہ دارِ خودی تھی وہ ملاقات کی رات

رازِ سربستۂ کونین تھے روشن دل پر
ملہمِ غیب تھی وہ حُسن کے آیات کی رات

عشق کی شامِ سیہ تاب کی دامن میں سحر
رنگ میں ڈوبی ہوئی کشف و کرامات کی رات

طور کی شمع بجھاتے ہوئے انوار کی شب
آنکھیں تاروں سے لڑاتے ہوئے ذرّات کی رات

میری کشمیرِ تمنّا، مری فردوسِ مراد
دلِ پُر شوق کے پھُولے پھلے جذبات کی رات

میرے دیکھے ہوئے خوابوں کی سنہری تعبیر
مصحفِ حسن پہ بکھرے ہوئے آیات کی رات

حُسنِ یوسف بکف و دستِ زلیخا بہ کمیں
عشق اور حسن کے دیرینہ روایات کی رات

دولتِ وصل سے وہ گود کو بھرنے والی
ہجر کی رات سے وہ ترکِ ملاقات کی رات

لبِ خاموش کے مخصوص پیاموں کی امیں
نگہِ شوق کے بیتاب تقاضات کی رات

شوق کے مطلبِ رنگیں کی مکمّل تصویر
دل میں بیٹھی ہوئی آنکھوں سے کہی بات کی رات

وہ "شبِ قدرِ" محبّت "شبِ معراجِ" وفا
پردے پردے میں تلطّف کی مدارات کی رات

توبہ توبہ کسی کافر کی وہ اَلھڑ باتیں
اللہ اللہ وہ معصوم حکایات کی رات

نو بنو، تازہ بتازہ وہ خطاباتِ جمیل
اُف وہ دلچسپ سوالات و جوابات کی رات

ایشیا مئی ۱۹۴۲ء

شوق اور شرم میں ہے ہے وہ نزاعِ رنگیں
عشق اور حسن کے دشوار مقامات کی رات

اُف وہ اِنکار میں اقرار کے رنگیں پہلو
ہائے وہ نفی کی آغوش میں اثبات کی رات

وہ مداراتِ محبت، وہ پذیرائیِ شوق
التفات و کرم و لطف و عنایات کی رات

وہ بناوٹ کے گلے، اور وہ مزہ کی چھیڑیں
شکوہ و رنجشِ بے جا و شکایات کی رات

اُف وہ چبھتے ہوئے فقرے وہ پتہ کی باتیں
استعارات و اشارات و کنایات کی رات

رشتۂ شوق میں گوندھے ہوئے شعرِ منثور
ہائے وہ حسن کے منظوم خیالات کی رات

اُف وہ گاتی ہوئی آنکھیں، وہ رسیلی آواز
حسن کے ساز سے برسے ہوئے نغمات کی رات

شوقِ مجبور کو گستاخ بنانے کے لئے
نگہِ ناز کے درپردہ اشارات کی رات

اپنے داتا سے محبت کے بھکاری کے سوال
اور وہ حسن کی سرکار سے خیرات کی رات

اُف وہ بکھری ہوئی زلفوں کی گوارا خنکی
اللہ اللہ وہ بھیگی ہوئی برسات کی رات

زیرِ گیسو لب و رخسار کا عالم توبہ
آبِ حیواں لئے آغوش میں ظلمات کی رات

جگر و دل کو چھکاتی ہوئی اک جوئے شراب
روح کی پیاس بجھاتے ہوئے جرعات کی رات

اُف وہ چومی ہوئی آنکھوں میں گلابی ڈورے
اک سیہ مستِ طرب رندِ خرابات کی رات

الغرض ایسی تھی کچھ وہ شبِ ارضی میری
جس کی ہمپایہ نہیں عرش و سماوات کی رات

سروش عسکری طباطبائی

طلسمِ تصوّر
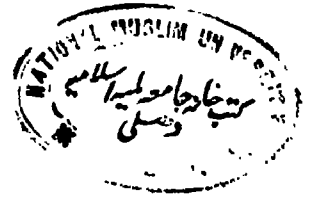
جب سرِ شام کلیسا میں جرس بجتے ہیں نغمۂ شوق سے ہوتی ہیں فضائیں معمور
ماہ و انجم سے جب ایوانِ فلک سجتے ہیں نکہتِ خلد سے ہوتی ہیں ہوائیں معمور
میری آغوش کی جنت کو سجاتی ہو تمھیں
میری خوابیدہ محبت کو جگاتی ہو تمھیں
چشمِ مشتاق میں آ آ کے سماتی ہو تمھیں
دلِ بیتاب میں اک حشر اٹھاتی ہو تمھیں
روز اک خواب سرِ شام دکھاتی ہو تمھیں

(۲)

یاد آتی ہے تمھاری، دلِ ناشاد میں جب مجھ کو کر دیتی ہے "صہبائے تصوّر" مدہوش
نظر آتا نہیں کچھ عالمِ ایجاد میں جب اپنے جلووں سے سجا دیتی ہو میری آغوش
میں سمجھتا ہوں کہ سچ مچ ہو تمھیں جلوہ طراز!
چھیڑتی ہو تمھیں رہ رہ کے مری روح کا ساز
اور بھڑکاتی ہو آتش کدۂ سوز و گداز
رقص کرتا ہے مرا قلب بصد ذوقِ نیاز
زندہ کرتا ہے تمنّا کو تمہارا اعجاز

(۳)

یاد آتا ہے جب ایسے میں تمھارا وعدہ چونک اٹھتا ہوں کہ اللہ! یہ غفلت کیسی؟
پھر نہ وہ تم، نہ تمھارا کوئی کافر جلوہ یہ مرے ذوقِ تصوّر کی شرارت کیسی؟
ہوش آتے ہی وہ آغوشِ محبت رخصت

ایشیا مئی ۱۹۳۰ء

جس پہ ہو عقل بھی قربان وہ غفلت رخصت
وہ خیالات کی بخشی ہوئی دولت رخصت!
ہاتھ آئی ہوئی افسوس وہ جنت رخصت!

دل سے ہر چیز بجز حسرتِ قربت رخصت

۴

الغرض روز یہی رہتا ہے انداز مرا
صبح تک شام سے کھاتا ہوں محبت کا فریب
تم پہ کیا مجھ پہ بھی کھلتا نہیں کچھ راز مرا
ہائے اب جرأت شکوہ ہے نہ یارائے شکیب

زندگی خوابِ تمنا میں بسر ہو کب تک؟
آہ و نالہ یونہی محرومِ اثر ہو کب تک؟
روز اس طرح سے ناکام نظر ہو کب تک؟
سوزِ دل، سوزشِ جاں، سوزِ جگر ہو کب تک؟

نامرادانہ مری جان بسر ہو کب تک؟؟

(ایک انگریزی نغمہ کا آزاد ترجمہ)

امجد علی امجد

غزل

رنگِ جہاں بہ رنگِ دگر دیکھتے رہے
حیران تھی نگاہ مگر دیکھتے رہے
تا صبح منتظر دیدۂ تر دیکھتے رہے
اشکوں میں رنگِ خونِ جگر دیکھتے رہے
کچھ یوں بھی انتظار کی گھڑیاں گذار دیں
آنکھیں لگائے جانبِ در دیکھتے رہے
ہمدم! نہ پوچھ برہمیِ حسن کا اثر
دونوں جہاں کو زیر و زبر دیکھتے رہے
آئیں تو کام بزم میں بیتابیاں مری
وہ اضطرابِ قلب و جگر دیکھتے رہے
کھلتے تھے پھول جس میں اسی آشیاں کو ہم
آماجگاہِ برق و شرر دیکھتے رہے
دیکھا کئے سب اُن کے تبسم کو بزم میں
ہم اشک ہائے شمعِ سحر دیکھتے رہے

تبسم نظامی

اُن کا خط آنے پر

ہنگامۂ نشاط کا ساماں ہے آج کیوں؟ — دورِ شراب گردشِ دوراں ہے آج کیوں؟

مفہومِ عیش، روح پہ عریاں ہے آج کیوں؟ — گریہ حریفِ شوقِ فراواں ہے آج کیوں؟

پھر چٹکیاں سی لیتی ہے کیوں دل میں آرزو — پیشِ نگاہ جلوۂ جاناں ہے آج کیوں؟

کیوں دامنِ نگاہ میں کانٹا بھی پھول ہے — رنگِ خزاں حریفِ بہاراں ہے آج کیوں؟

آزردگیٔ گل پہ تبسم کا ہے گماں! — خونِ ہزار زینتِ بستاں ہے آج کیوں؟

میرے لبِ خموش کو آئینِ ناز ہیں — عرضِ نیازِ شوق کا فرماں ہے آج کیوں؟

شرمندۂ خیالِ تمنا جو تھا وہ دل — دیوانگیٔ شوق پہ نازاں ہے آج کیوں؟

جو کشتۂ تغافلِ پیہم تھا وہ دماغ — آزردۂ ندامتِ جاناں ہے آج کیوں؟

محرومِ یک نگاہِ ترحم تھی جو وہ روح — لذت کشِ تبسمِ پنہاں ہے آج کیوں؟

وہ چشمِ انتظار کہ محرومِ جلوہ تھی — مژگانِ اشکبار پہ خنداں ہے آج کیوں؟

وہ نالہ جو ہنوز نہ تھا لب سے آشنا — حسنِ فروغِ شمعِ شبستاں ہے آج کیوں؟

جو بن گیا تھا کثرتِ اندوہ سے مجھے — برباد وہ سکونِ دل وجاں ہے آج کیوں؟

آمادۂ کرم ہے یہ کس کی نگاہِ ناز — دل شکوۂ ستم سے پشیماں ہے آج کیوں؟

اندازِ بے نیازیٔ جاناں کے میں نثار! — سرگرمِ کارِ غمزۂ جاناں ہے آج کیوں؟

کس کے پیامِ ناز کا یہ فیض ہے اداؔ
دل جلوہ گاہِ نرگس و ریحاں ہے آج کیوں؟

ع۔ جہاں ادا
بدایونی

امتحانِ نظر کرے کوئی

امتحانِ نظر کرے کوئی
خود کو پھر جلوہ گر کرے کوئی

اپنی ہستی کا ہوش بھی نہ رہا
مجھ کو میری خبر کرے کوئی

تم رہو اپنے حسن میں مشغول
نالہ و چشم تر کرے کوئی

دے رہا ہوں فریبِ ترکِ وفا
کاش یہ تو اثر کرے کوئی

سعیٔ ناکام آرزو ہی سہی
عمر آخر بسر کرے کوئی

لذتِ دید، دائمی ہو جائے
دل کو لیکن نظر کرے کوئی

وسعتِ جلوہ، کائنات بنی
اب کہاں تک نظر کرے کوئی

عشق اتنا سہا گراں تو نہیں
خون، دل کا، مگر کرے کوئی

سہا

نیا تخیل

نیا تخیل عہدِ بہار لایا ہوں
نئے چمن نئے نقش و نگار لایا ہوں

وہی حیات تجھے جس پہ اعتبار نہیں
اسی حیات کا میں اعتبار لایا ہوں

ہزار مہر درخشاں ہیں جس کے ذروں میں
وہ ایک پیکرِ مشتِ غبار لایا ہوں

فسردگی کا زمانہ گذرنے والا ہے
مذاقِ برق و مزاجِ شرار لایا ہوں

جو دل کو سینۂ انساں میں مرتعش کر دے
وہ ایک درد میں ڈوبی پکار لایا ہوں

مری نظر کے خزانوں پہ اک نگاہ تو ڈال
ہزار ہا گہرِ آبدار لایا ہوں!

نہ کر درازیٔ شب ہائے ہجر کے شکوے
نویدِ صبحِ شبِ انتظار لایا ہوں

مری نظر میں چراغاں مری نگاہ میں نور
فروغِ ظلمتِ شب ہائے تار لایا ہوں

مرے جلو میں نہیں تشنہ کامیوں کا گذر
پیامِ آمدِ ابرِ بہار لایا ہوں

مرے حضور میں مایوسیوں کو بار نہیں
نویدِ رحمتِ پروردگار لایا ہوں

مرے سکوں میں بھی ہے انتشار کا پہلو
مزاجِ طرۂ گیسوئے یار لایا ہوں

اگر بلند ہے سطحِ مذاقِ عصرِ جدید
فلک سے مسندِ عیسیٰ اتار لایا ہوں

فرازِ عرش ہے میری نگاہ کا مسکن
مذاقِ فطرتِ پروردگار لایا ہوں

ظفر تاباں

چپراسی کی موت

عبدالباری آسی

رات کا منظر ہر اک جانب سیاہی کی نمود
نیند کی تاریکیوں میں گم چراغ ہست و بود

گوشے گوشے سے سیاہی کا دھواں اٹھتا ہوا
روح کا تنہائی کے حلقوں میں دم گھٹتا ہوا

جگنوؤں کی جا بجا اڑتی ہوئی چنگاریاں
سہمناک آوازے جھینگر کی دل آزاریاں

تیرگی کا دیو کالی کملیاں اوڑھے ہوئے
سہمگیں لمبی جٹائیں دوش پر چھوڑے ہوئے

اہلِ دولت کے دروں پر پاسبانوں کی صدا
سونے والو! جاگنا، ہشیار رہنا دیکھنا!

موجزن ہر قطرے کے پیکر میں طوفانِ سکوت
کائناتِ حسن کے جامے میں ویرانی کا بھوت

اک شکستہ چار دیواری جو اب شورہ زار
مامنِ دورِ خزاں ناواقفِ فصلِ بہار

جھونپڑا انبار بے پایاں خس و خاشاک کا
مرتفع دولت سرا آلامِ عبرتناک کا

خاطرِ اہلِ ریاضت سے زیادہ منکسر
جنبشِ ابروئے جلادِ فنا کا منتظر

صحن اس کا گور کا فرش سے زیادہ تنگ و تار
غربت اس کی کارکن ادبار اس کا تاجدار

ٹمٹماتا سا چراغ اک مفلسی کی یادگار
زندگی و مرگ کے آثار کا سرمایہ دار

ایک لوٹا ٹین کا اور ایک مٹی کا گلاس
کھولتے تپتے ہوئے پانی میں شامل زہر یاس

اب نہ پنشن ہے رعایت ہے نہ اس غم کا قصاص
کیونکہ چپراسی حکومت کا نہیں ہے رکنِ خاص

ایک گارے کی گھڑونچی پر گھڑے ٹوٹے ہوئے
صحن میں کچھ ٹیڑھے پایوں کے پلنگ ٹوٹے ہوئے

ایک تکیہ بے غلاف اور اک شکستہ سی دری
صاف اجلی پھر بھی چادر کے تکلف سے بری

اس کے اوپر تلملاتا اک مریضِ ناتواں
غم سے کمہلایا ہوا شدت سے تپ کی نیم جاں

دست و پا پر آبلے چہرے پہ ہلدی کا سا رنگ
جانے والی زندگی کے دل میں مرنے کی امنگ

جسم صرفِ دردِ پیہم اور جان وقفِ طپش
پپڑیاں ہونٹوں کے اوپر اور زباں شاکِ عطش

گردِ بالیں رونیوالے بیوی بچوں کا ہجوم
گہن میں ماہِ درخشاں تیرہ سب چھوٹے نجوم

حدِ مرگ بے محابا سے ملا سوئے مزاج
بے زری کی وجہ سے ہونے نہ پایا کچھ علاج

اشکِ مایوسانہ آنکھوں سے نکلنے رہ گئے
چل بسا بیمار سب ہاتھوں کو ملتے رہ گئے

واقعہ یہ تھا کہ ماہِ جون کا آغاز تھا
چل رہی تھی ہر طرف دوزخ کے شعلوں کی ہوا

جو ہوائے تند لو کے نام سے موسوم ہے
جھونکا جھونکا جس کا زہرِ مرگ سے مسموم ہے

صاحب اٹھے لنچ پر جس وقت جانے کے لئے
اس کو بھیجا سوڈے کی بوتل کے لانے کے لئے

لو لگی اس طرح اس کو جیسے سایا ہو گیا
ایک کے مرنے سے گھر بھر کا صفایا ہو گیا

ایشیا مئی ۱۹۴۱ء

بغاوت

اگر ہم نغمۂ حبِّ وطن گائیں بغاوت ہے ۔ زباں پر شکوۂ جور و جفا لائیں بغاوت ہے

شکارِ غمزۂ خوں ریز ہو کر ہم سرِ مقتل ۔ اگر سینے پہ ہنس کر گولیاں کھائیں بغاوت ہے

کسی مظلوم کا افسانۂ ناگفتہ بہ سن کر ۔ اگر ہم فطرۃً بے چین ہو جائیں بغاوت ہے

دلِ اندوہ گیں اور نالۂ بیباک کیا معنی ۔ ذرا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئیں بغاوت ہے

اگر دامن بچا کر ہم فضائے خار ساماں سے ۔ نسیمِ صبح کی صورت گذر جائیں بغاوت ہے

وہ دستورِ ہمایونی وہ آئینِ جہانگیری ۔ اگر اب بھول کر بھی یاد آ جائیں بغاوت ہے

اگر شیخ و برہمن کو ہم آہنگِ وطن کر کے ۔ کوئی بھولی ہوئی تاریخ دہرائیں بغاوت ہے

نگاہِ سینہ چاکانِ چمن میں بجلیاں بھر کر ۔ چمن میں زندگی کی لہر دوڑائیں بغاوت ہے

چراغِ ہر گلِ تر کو فروغِ جاوداں دے کر ۔ فضائے گلستاں پر نور برسائیں بغاوت ہے

جبینِ لالہ و گل سے شرارِ رنگ و بو لیکر ۔ اگر ہم سینۂ شبنم کو گرمائیں بغاوت ہے

غرض وہ بجلیاں بھی ہم پہ برسائیں تو برسائیں
مگر ہم داغِ دل بھی ان کو دکھلائیں بغاوت ہے

فیض جھنجھانوی

۶۵

ایشیا مئی ۱۹۳۱ء

ساقی

کس قدر مقصدِ فطرت کے قریں ہوں ساقی
میں کہ اک رندِ خراباتِ نشیں ہوں ساقی

منکشف کیوں نہ ہوں اسرار و حقائق مجھ پر
کہ میں رو کردۂ اربابِ یقیں ہوں ساقی

چاہئیں مجھ پہ محبت کی نگاہیں ہر دم
اک امانت تری بالائے زمیں ہوں ساقی

عالمِ پاک بھی جھکتا ہے مرے قدموں پر
تیرے میخانے کا وہ خاک نشیں ہوں ساقی

اک نفس میں کبھی جاتا ہوں فلک سے آگے
اک قدم میں میں کبھی عرش نشیں ہوں ساقی

لب پہ لاتا نہیں شکوہ تری بے مہری کا
کس قدر اپنی میں فطرت کا حسیں ہوں ساقی

جھک کے آتا ہے مرے پاس وقارِ گردوں
ایسا منجملۂ اربابِ زمیں ہوں ساقی

اسقدر رندی و سرشاری و مدہوشی پر
مستقل اپنی جگہ شرعِ مبیں ہوں ساقی

کس لئے کرتا ہے اسرار کا مجھ سے اخفا
تیرے اسرار کا غماز نہیں ہوں ساقی

تھا نبوت کا جو خاتم اسی خاتم کے طفیل
میں بھی واللہ اسی خاتم کا نگیں ہوں ساقی

حکیم مخمور لکھنوی

ایشیا مئی ۱۹۴۱ء

دعوت نامہ

(ایک شخص اپنی محبوبہ کو اپنی شادی کے موقع پر آنے کیلئے یہ دعوت نامہ لکھتا ہے)

اے مری جانِ تمنا! کہہ نہیں سکتا ہوں میں
آہ لیکن بن کہے بھی رہ نہیں سکتا ہوں میں

کل جونہی کھولے گی گیسو دوش پر لیلائے شام
ٹوٹ جائینگے مئے الفت کے دو لبریز جام

چاند جب کل کر رہا ہوگا جہاں والوں پہ راج
چھین لیگا تجھ کو میرے ہاتھ سے ظالم سماج

چھوڑ دے گی مجھ کو کل تنہا بصد حرمان و یاس
تیری آنکھوں کی جوانی تیرے ہونٹوں کی مٹھاس

تیری باہیں میری گردن سے خفا ہو جائیں گی
آرزوئیں زندگی کا آسرا ہو جائیں گی

یعنی کل دیوار و در پر جب دھندلکا چھائیگا
مجھ کو اک نادیدہ لڑکی سے بیاہا جائے گا

اس قدر ہوگا عزیزوں کو مری راحت کا پاس
خانہ بربادی کو پہنائینگے شادی کا لباس

اس قدر آئے گی اپنوں کی محبت جوش پر
جائے گا میرا جنازہ حسرتوں کے دوش پر

ایشیا مئی ۱۹۴۱ء

کل جہاں میں جو بھی میرا ہے یہاں آئیگا وہ
ڈھا سکے گا جس قدر مجھ پر ستم ڈھائے گا وہ

تم بھی میری ہو تمہیں بھی مُنھ دکھانا چاہیئے
اتنے غیروں میں کوئی اپنا بھی آنا چاہیئے

میں تمہارا ہوں سمجھ لینا نہ بیگانہ مجھے
اپنے ہاتھوں سے کفن شادی کا پہنانا مجھے

ہاں مگر آنسو کسی صورت نہ آنکھوں سے بہے
تیری جیسی کو کوئی ننگِ محبّت کیوں کہے

آہ ہونٹوں پر ترے آئی اگر اچھّا نہیں
عشق والوں کا یہ شیوہ ہے مگر اچھّا نہیں

دل یہ کہتا ہے کہ کل تشریف لے آؤ گی تم
اس پریشانی میں مجھ پر رحم فرماؤ گی تم

الطاف مشہدی

— ایشیا مئی سنہ ۱۹۴۲ء

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

مئی سنہ ۱۹۴۱ء

کسوٹی

چند نئے رسالوں اور کتابوں پر رائے

"کمپنی کی حکومت"

مصنفہ باری، مکتبۂ اردو۔ لاہور

قیمت ۱۲

اصحاب مکتبۂ اردو لاہور تحسین اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو ادب کی خدمت کی نئے قدم بڑھایا ہے۔ اُن کی چند اشاعتوں کا ذکر ہمارے صفحات میں پہلے ہو چکا ہے۔ آج ایک نئی کتاب "کمپنی کی حکومت" پیشِ نظر ہے۔ جو ہندوستان میں انگریزوں کی "دلچسپ تجارت" کی دلچسپ داستان ہے۔

اِس داستان کی دلچسپیاں گوناگوں ہیں۔ بقولِ غالب "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"، ہاں، یہ اپنا بیان ہی سب سے بڑی خصوصیت ہے؛ کیونکہ "اس پری وش کا ذکر" تو برابر ہوتا ہی آیا ہے سبھی نے مغربی اقوام کی آمد پرتگیزوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کی قوت کے مدّ و جزر کا حال پڑھا ہے لیکن ہندوستان میں ان قوموں اور خصوصاً ہمارے تاجداروں کی "روشِ لطف و کرم" پر عرصہ تک کسی نے وہ نظر نہ ڈالی جس میں جراتِ رندانہ، ہوتی۔ اس لحاظ سے باری صاحب کی یہ کوشش ملک کے چند اور ہمت والوں کے ساتھ "این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند" کا مستحق بناتی ہے۔ اور باری اس صف میں ہر اُس حربے سے آراستہ نظر آتا ہے جس کی مورخ کو ضرورت ہوتی ہے۔ مدافعت کیلئے اس کے پاس مغربی و مشرقی تواریخ کی سندیں اور اکابر کے خطوط کے حوالے ہیں اور اپنے دعوؤں کے ثبوت میں صحیح نظر اور نظریے کیساتھ ساتھ تاریخ عالم اور خصوصاً تاریخ ہند و یورپ کا وسیع مطالعہ ہے مراد اس سے یہ نہیں کہ باری کی یہ کوشش سراسر صحیح نقطۂ نظر ہی کی توضیح ہے یا انگریز کمپنی کی حکمت عملی کی یہ داستان ایک انصاف پسند کی غیر جانبدارانہ نگارش ہے۔ نہیں، فن اور نظریئے کے اعتبار سے اس میں بہت سی خامیاں بھی ہیں۔ لیکن یہ تصنیف ایک شمع راہ ضرور ہے اور پیش رو وں کو پیش روی کا افتخار کیا کم ہے؟

بقول ٹیگور: "ہندوستان کے تخت کبھی ہندوستانیوں کے لئے زیادہ اہمیت کی چیز نہیں رہے" یہاں پر تاریخ کے ابتدائی دور سے مسلمانوں کے دور تک شمال اور شمال مغرب کی جنگ جو قومیں یلغار کرتی رہیں اور نئی راجدھانیاں قائم کرتی رہیں۔ وہ اپنا تمدن ساتھ لاتی تھیں جو ہندیوں کی زندگی پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ لیکن ہندیوں کا اپنا تمدن بھی اپنا رنگ لاتا تھا اور کچھ عرصے بعد یہ تاج و تخت والے، ستواں ناک اور سُرخ سفید رنگ کے لوگ، ہند کے سیاہ و زرد لوگوں سے ایسے گھل مل جاتے کہ پہچان مشکل ہو جاتی اور پھر یہ سب ہندی ہو جاتے اور پھر کسی تازہ وارد کے شکار؛ اس سلسلے کی آخری کڑی مسلمانوں کی آمد و حکومت اور ان کی ہم آمیزی پر ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخ کے یہ "بت شکن" جابر ہندوکش اور تلوار کی نوک کے زور سے کلمہ پڑھانے والے" ہندوستان آئے اور ہندوؤں میں ایسے مل گئے کہ ایک مشترکہ زبان اور مشترکہ تمدن کی راہ نکلی......

مسلمانوں کے بعد مغربی اقوام آئیں اور اپنی تہذیب ساتھ لائیں۔ کہنے کو ان کے ہاں فرقہ بندی تھی نہ ذاتیں، لیکن دراصل یہ تہذیب ایسی تھی کہ آج تک ہند کی تہذیب سے آمیزش اختیار نہ کر سکی۔ اس کے فطری اختلافِ طبع کے علاوہ مغربی اقوام کی جملہ حکمت عملیوں کی باگ ڈور ہمیشہ یورپ میں اُن لوگوں کے ہاتھ میں رہی جو ہندوستان سے ناواقف تھے جو حصولِ زر کے علاوہ کوئی دلچسپی کسی دور دراز ملک میں نہ رکھتے تھے۔ اور جو ہمیشہ خود کو خدا کے برگزیدہ بندے، مہذب ترین خلائق، اور حکمرانی کے پیدائشی حقدار سمجھتے تھے۔ اور جن کے نزدیک سندھ کی وادی میں آباد لوگوں کا ماضی یا مجموعی طور سے ہندیوں کی تہذیب و انسانیت کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ جو یورپ کے تئے "زہر" یعنی "قومیت" کو ہر ملک کی رگِ حیات میں دوڑانا چاہتے تھے: جو آزادی کے نام پر ملکوں کو غلام

کرتے تھے۔ جو خون کے دریا میں تیر کر سونے کے ساحل تک پہونچنا فخر جانتے تھے۔ جن میں اکثر علانیہ اور دل میں سب اطالوی مدبر، میکاؤلی کے پیرو تھے جو اپنی نئی دریافت یعنی بارود اور آتشیں اسلحہ کا مظاہرہ کرنے کیلئے کسی حیلہ کو بھی حیلۂ گرگ، بنا سکتے تھے .... اور سیلاب تو ہند کی زمین پر آتے اور باد و باران کی طرح نکل جاتے لیکن مغرب کا یہ سیلاب مختلف تھا۔ اس نے جو ڈیرہ ڈالا اُس کی طنابوں نے آخر تمام ہند کا احاطہ کر لیا اور اس کی میخیں ہندوستان کے دل میں اُتر کر روح میں پیوست ہو گئیں۔ اور پھر بھی اُنھوں نے اپنی بیگانگی کو اب تک اسی طرح قائم رکھا جیسے ہیرے کا ٹکڑا زیور سے علیحدہ رہتا ہے۔ مغربی ملوکیت کا نظریہ رڈیارڈ کپلنگ کے مشہور شعر میں مضمر ہے، جس کا ترجمہ ہے کہ "مغرب مغرب ہے، اور مشرق مشرق، اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکیں گے" کمپنی کی حکومت" دراصل اسی نظریہ کا مظاہرہ ہے۔ اگرچہ باری نے اسے سمجھا ہے لیکن جو زور اس پر دینا چاہیئے تھا نہیں دیا۔

آج کل جو ہنگامہ یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا کو پریشان کئے ہوئے ہے برطانوی راج کے لئے بے حد صبر آزما اور انگریز قوم کے لئے انتہائی تشویشناک ہے، انجام سے تو کوئی خبردار نہیں۔ اس پُرآشوب دور میں "کمپنی کی حکومت" کی اشاعت ....؟!

باری اور اقبال کے مقابلہ کی تو کوئی گنجائش نہیں لیکن ہاں جو جذبہ مرحوم کی نئے کہنہ کو "خم دل سے چھلکا دیتا تھا وہی جذبہ باری کے بیان کو روانی دیتا ہے۔ زبور عجم میں کنایتہ" فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ۔ موجود ہے۔

باری کی تمام کتاب اسی "چنگیزی" کے خلاف ایک شکوہ ہے۔ لیکن شاید یہی اس کی سب سے بڑی خامی ہے، "چنگیزیٔ افرنگ" سے انکار ممکن نہ سہی لیکن ان کی "دل آویزی" اور "شیرینی و پرویزی" سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ اس پہلو کو نظر انداز کر دینے سے تاریخی صحت کے باوجود "کمپنی کی حکومت" کہیں ایک مرثیہ بن کر رہ جاتی ہے اور کہیں ہجو۔ جسے ہجو ملیح بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اقبال ہی کی طرح اگرچہ زیادہ عام فہم صورت میں اس تمام بیان میں ایک تیز اور دور رس نظر کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور اکثر جگہ ایسے نشتر موجود ہیں جو رگ جاں بن جاتے ہیں۔ کہیں ایک پارہ اور کہیں ایک سطر یا مختصر جملہ میں ایسی حقیقتوں کا انکشاف کر دیا ہے اور ایسے اشارے کر دئے ہیں کہ یہ دو چار لفظ کبھی مظلوم کی زبان اور کبھی شرحِ داستان بن جاتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۹۲ و ۹۳ پر اصلاحات کا ذکر کس قدر دلچسپ ہے۔

"مظلوم اقوام کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کیلئے اصلاحات کا آلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اُن کے اذہان کو اس طرح مسحور کر دیا جاتا ہے کہ وہ اصلاحات کو قابلِ عمل بنانا اپنا اولین فرض خیال کرتی ہیں۔ اصلاحات کو قبول کرنیوالی قومیں اپنی مدتِ غلامی کو طول دیتی ہیں۔ اصلاحات ایک کھلونا ہے۔ جس سے غلام زادے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ اور آزادی پسند اس کی آوازِ شکست میں صدائے انقلاب پاتے ہیں۔ اصلاحات ایک جال ہے جو حسین الفاظ اور جمیل تراکیب سے تیار کیا جاتا ہے۔ زہر کی ایک گولی ہے شکر میں لپٹی ہوئی۔ زندان ہے جس کے دریچے نسبتاً بڑے ہوں ایک ستارہ ہے —— ٹوٹنے والا، ایک نغمہ ہے —— موت کی نیند سلانے والا، ایک پھول ہے زہریلے کانٹوں کو چھپائے ہوئے۔ آگ ہے! شفق کی صورت میں، موت ہے زندگی کے لباس میں۔

اصلاحات! طلائی زنجیریں!"

اگر شیلے کے نظریۂ شعر کو صحیح مان لیا جائے کہ "جذبات کا وفور زبان پر آ کر شعر بن جاتا ہے۔ اور نظم و نثر کی قید سے آزاد ہوتا ہے" تو یہ پارہ "خانم بدہن" ایسے ہی استعارات سے لبریز ہے۔ جیسی انگریز شاعر کی مشہور نظم "اسکائی لارک"۔

یہ دراصل "کمپنی کی حکومت" کی گوناگوں دلچسپیوں میں سے ایک کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جس چیز کو ادب کہتے ہیں آرٹ کی ایک شاخ ہے اور آرٹ خود ادب میں ایسے رہتا ہے جیسے پھولوں میں خوشبو۔ ادب کی اور شاخوں کی طرح "علم التواریخ" بجائے خود آرٹ نہیں ہے اور نہ تمام کتب تاریخ ادب میں شمار ہو سکتی ہیں۔ لیکن بعض لوگ تاریخ اس طرح

لکھتے ہیں کہ معلومات میں اضافہ کیساتھ ساتھ ادب کے سرمایہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے کہیں تاریخ ادب جیسی خشک چیز ادب کیلئے بے بہا موتی ہو جاتی ہے فرانس کے اہلِ قلم اس صنف میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ Taine ٹین اور کزامیاں (Cazamian) ایسے مصنفین ہیں جن کی "تاریخ ادب انگلشیہ" اور ان کے ترجمے اپنی اپنی جگہ ادب کے ذخیرہ میں گراں قدر اضافہ کرتی ہیں۔ باری کے لئے اس بلاغتِ نظر کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا جو ایسے کہنہ مشق اہلِ قلم کو میسر ہے، جو آزادی کی فضا میں پلے ہوں اور جن کے زیرِ نظر یورپ کے بہترین دماغوں کی بہترین کوششوں کے نتیجے رہے ہوں۔ ہاں جس راہ پر باری چلا ہے وہ اس کا سالک نہیں۔ لیکن راہ نئی اور روشن اور فراخ ضرور ہے۔ اور ہمت والے جوان اہلِ قلم کو ایک مستقل دعوتِ عمل۔ باری نے خود موجودہ دور کے ایسے اہلِ قلم کی طرف جا بجا اشارہ کیا ہے جنھوں نے حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ورنہ ہندوستان بیچارے کو تو آج تک مجبوراً یقین کرنا ہی پڑتا تھا کہ "بلیک ہول" کا سیاہ کارنامہ صحیح ہے۔ یہ داغ سراج کے دامن سے ابھی دھلا ہے اور ابھی ممکن بھی تھا۔ آج وہ زمانہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کو دبی زبان سے جنگِ آزادی کہا جا سکتا ہے اور "ہال دل مانومنٹ" کو علیحدہ کرنے کیلئے شورش بپا ہو سکتی ہے۔ بہت دنوں کی بات نہیں کہ ایسے احتجاج کے شرکیہ کار کسی غیر معروف "بلیک ہول" کی نذر ہو جاتے۔

دراصل برطانوی یا کمپنی کی حکومت ہی کوئی بہت پرانی کہانی نہیں ایک ملک کی تاریخ میں دو تین صدیاں کوئی بڑی مدت نہیں۔ اور یہ ایسا زمانہ ہے جب چھاپہ اور کاغذ آسانی سے میسر تھے۔ لہٰذا تمام واقعات و روایات مفصل طور سے محفوظ ہیں اور ہندوستان سے بہتر یورپی مصنفین نے ان کو قلم بند کیا ہے۔ اور وہ باوجود رنگ و نسل کے تعصب کے اس قدر جانبدار نہ ہو سکے ہیں کہ حقیقت کو بالکل چھپا دیتے۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں، تجارت کے بھیس میں ملک گیری کی ہوس رانیوں، کے قصے لندن کے کتب خانوں میں "اپنی کہانی اپنی زبانی" کی صورت میں موجود ہیں۔ کلائیو کے خلاف احتجاج۔ وارن ہیسٹنگز کے خلاف برک اور شیریڈن کی تقریریں کیا تھیں؟ آستین کے لہو کی پکار تھی، جس نے آخر کلائیو کو اپنی جان آپ لینے پر مجبور کر دیا۔ اور وارن ہیسٹنگز کی تمام دولت کو پانی کی طرح بہا دیا

کون کہہ سکتا ہے کہ حیدر اور ٹیپو کی طاقت ختم ہو گئی!؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اودھ کی بیگمات کے خونیں آنسو رائیگاں گئے سراج اور قاسم کی روحیں کیا آج بھی بے چین نہیں؟..... ہاں یہ تجسس فضول ہے لیکن ایک بات یقینی ہے۔ اقوام کے لئے۔ جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات ہے" زندہ و تابندہ اقوام کو حق حاصل ہے کہ وہ کمزور اقوام کو صرف ذلیل کرنے کے لئے زندہ رکھیں، بس سکتا ہوا، مگر زندہ۔ اُن کی رہی سہی صنعت و حرفت کو اُن سے لطائف الحیل سے چھین لیں۔ اُن کے ذہن کو پست کر دیں اُن کی روح کو گھن لگا دیں۔ ہاں آزاد لوگوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسروں کی غلامی پر آزادی کے قلعے تعمیر کریں۔ دوسروں سے تنفر اپنا شیوہ بنائیں اور پھر اخوت و مساوات کی تلقین کریں......

ذکر "کمپنی کی حکومت" کا تھا۔ عمدہ کتاب ہے۔ اس حکومت کی تاریخیں بہت لکھی جا چکی ہیں لیکن کچھ دن پیشتر تک یہ سب تاریخیں اسکولوں کے لئے درسی کتابوں کی شکل میں ہوتی تھیں اور سررشتۂ تعلیم اسی وقت انھیں نصابِ تعلیم میں داخل کرتا تھا جب یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ ان میں کوئی بات غلط تو نہیں۔ مثلاً کسی نے کلائیو کی برائی تو نہیں کر دی، یا ولزلی کی پالیسی کے خلاف زہر تو نہیں اگلا۔ دراصل یہی احتیاط تدبر کہلاتی ہے۔ یورپ کے بڑے مدبر چانسلر میٹرنک نے آسٹریا میں یہی حکمت برتی تھی اور آج ہٹلر بھی پریس اور وائرلیس کو حد سے نہیں بڑھنے دیتا۔ باری کی کتاب اس راہ سے گریز ہے۔ اُس نے ہندی حکمرانوں کو اُن کی شکست و فنا کے باوجود ہیرو بنایا ہے۔ اگر کتب تواریخ کے حوالے صحیح دیے گئے ہیں۔ تو باری کی بات بھی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اور بعض بعض کردار تو بہت ہی باتدبیر اور بلند نظر آتے ہیں۔ نانا فرنویس حیدر اور ٹیپو کی فرانس اور مشرقِ قریب کیساتھ تعلقات کے لئے سلسلہ جنبانی بہترین سیاسی نظر کا ثبوت ہیں۔ نانا فرنویس کی اتحادی مساعی ایک دور رس نظر کا مکمل ثبوت۔ ان تمام کرداروں کے متعلق باری نے جو کچھ لکھا ہے بڑی تلاش کا ثبوت دیتا ہے۔ اور ان لوگوں کو بہت سے الزامات سے بری کرتا ہے۔ مثلاً حیدر علی کو میسور پر غاصبانہ قبضہ کے الزام سے۔ لیکن ایک بات ضرور ہے۔ باری نے خاکے بہت سے پیش کئے ہیں اور اُن کے خد و خال بہت نمایاں بھی کھینچے ہیں۔ لیکن ان میں

زندگی کا آب ورنگ نظر نہیں آتا۔ اُن کے خصائل سے تعارف ضرور کرایا ہے لیکن ان انسانوں سے تعارف پورا نہیں کیا۔ اس کمی کے احساس کے لئے ایک استثناء پر غور کرلینا کافی ہوگا۔ ایسے ہی قومی ہیرو وزیر علی نواب اودھ کا ذکر ہو رہا ہے۔ وزیر علی انگریز کے ہاتھوں پریشان، جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ کرنل کالنز تعاقب میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔

"ایک روز کالنز اپنے خیمہ کے باہر سیر کر رہا تھا کہ اُسے دُور سے گرد اُٹھتی ہوئی دکھائی دی۔ کالنز نے سپاہیوں کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ اور خود اُسی سمت نگاہ لگائے رکھی۔ جب اُسے یقین ہوگیا کہ صرف ایک سوار سرپٹ گھوڑا دوڑائے اس کی طرف بڑھ رہا ہے تو اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُس سوار کی نقل و حرکت پر غور کرتے رہیں۔ اتنے میں سوار سپاہیوں کے قریب آ کر رُک گیا۔

"مجھے کرنل سے ملنا ہے" اُس نے کہا۔

"بہت خوب" سپاہی چلا اُٹھے۔

جب کرنل کو اس واقعہ سے آگاہ کیا گیا۔ تو اُس نے سوار کو طلب کیا۔ سوار کرنل سے آنکھیں ملاتے ہی پکار اُٹھا

"تنہائی، تنہائی"

"صاحب! یہاں کوئی غیر آدمی نہیں ہے۔ آپ رازِ دل کہہ دیں۔"

"دیوار ہم گوش دارد! تنہائی"

کرنل اور سوار ایک آم کے باغ میں چلے گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد سوار نے کرنل سے کہا۔

"آپ اس مقام پر کیوں خیمہ زن ہیں"

"کمپنی کا حکم ہے کہ وزیر علی کو گرفتار کیا جائے۔"

"لیکن اتنا لاؤ لشکر کیا معنی؟"

"گرفتاری میں مدد دینے کے لئے"

"وزیر علی کی گرفتاری بہت مشکل ہے صاحب"

"کیوں؟"

"وہ ایک جانباز سپاہی ہے"

"میں نے بھی یہی سن رکھا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"چند کارتوس"

"کس لئے"

"وزیر علی کو گرفتار کرنے کیلئے"

"یہ لو دس کارتوس"

"شکریہ" مسکراتے ہوئے۔

"آپ کا نام"

"وزیر علی"

کرنل بید کی طرح کانپنے لگا۔

"آپ نے مجھے کارتوس دیئے۔ اس لئے آپ کی جان بخشی کرتا ہوں" یہ کہتے ہوئے سوار جنگلوں کی طرف چل نکلا۔

"ایک جانباز سپاہی" کرنل نے دبی زبان سے کہا۔

اس سے بہتر تعارف کسی کردار کا مشکل ہے۔ کاشش اس کتاب میں اور لوگوں کے سوانح کے مطالعہ سے ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں پیش کی جاتیں تاکہ پڑھنے والے کے سامنے نیکی و بدی کے غیر مرئی مرقعوں کے بجائے زندہ و متحرک انسانوں کی تصویریں ہوتیں کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ایک نہایت حساس دل اور نتیجۃً شاعرانہ طبیعت رکھنے والا انسان ہے۔ اس تمام کتاب میں ایک خاص جذبہ کارفرما نظر آتا ہے اور وہ ہے دھوکے اور جھوٹ یا سیاست سے انتہائی تنفر کا۔ صرف حکمرانوں کی سیاست سے ہی نہیں۔ بلکہ اُن لوگوں کی سیاست سے بھی جو حقیقتوں کو چھپانے کی خود غرضانہ کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر باری کو شاعرانہ لیا جائے تو اُن کی افتادِ طبع رومانی شاعر کی ہے جو جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ اِس قسم کی طبیعت مخصوص لمحوں میں ایسی بلندیوں پر پہونچ جاتی ہے جہاں زیادہ احتیاط والوں کی رسائی ناممکن ہے لیکن خرابی یہ ہوتی ہے کہ ایسی طبیعت کے تاثرات عام فہم نہیں ہوتے اور اکثر اس قدر ذاتی اور شخصی ہوتے ہیں کہ اکثر زاویوں پر دوسرے لوگوں سے افتراک

اُردو ادب کی نمائندگی کہا جا سکے ؛

اگر یہ تاثرات فردوس کی اشاعت کا سبب بنے ہیں تو یقیناً فردوس نے شائع ہو کر رسمی طور پر اس کمی کو ضرور پورا کیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اُسے دیکھ کر سخت مایوسی ہوتی ہے ؛ صرف "علمی و ادبی" کے الفاظ لکھ کر کوئی رسالہ علمی و ادبی نہیں ہو جایا کرتا ؛

ایک علمی و ادبی رسالہ مرتب کرنے اور اس کو نکالتے رہنے کیلئے مادی اور روحانی طاقتوں کی کافی مقدار کی ضرورت ہوتی ہے ؛ اور جب تک اُسے اہلِ قلم حضرات کی مصدقہ پشت پناہی حاصل نہ ہو، وہ جاری نہیں رہ سکتا ؛ یہی نہیں بلکہ اس کے ادارہ میں ماہر اہلِ قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ کسی کے مرہونِ منت ہوئے بغیر رسالہ کو اپنے مقررہ معیار پر چلا سکیں

پہلا نمبر دیکھ کر یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوس اگر چاہے تو ایک معیار قائم کر سکتا ہے مگر جو کچھ اس میں پیش کیا گیا ہے وہ "علمی و ادبی" کسوٹی پر سونا ثابت نہیں ہوتا۔

بہر حال مایوس ہونا کفر ہے ؛ فردوس سے وہی توقعات قائم کرنی چاہئیں جو ایک نوشگفتہ کلی سے کی جا سکتی ہیں ؛ یہ کلی اگر کھلی تو فضائیں اس سے ضرور مہک سکتی ہیں۔

کشمیر کے اہلِ علم و ادب کو فردوس کی پوری پشت پناہی کرنی چاہئے اور ادارہ کو اپنا پورا فرض محسوس کرتے ہوئے نظم کے حصہ کی طرح نثر کے حصے کو بلند کرنا چاہیئے ؛ جس میں تنقیدی عنصر کافی مقدار میں ہونا ضروری ہے۔

محسوساتِ ماہر

از ماہر القادری

ناشر مہتمم عبدالحق اکیڈیمی۔ شاہ راہِ عثمانی حیدرآباد دکن

صفحات ۱۴۸ بسنہری جلد، رنگین گردپوش قیمت ؏
علاوہ محصول ڈاک۔

عبدالحق اکیڈیمی شاہ راہِ عثمانی حیدرآباد دکن کے مہتمم صاحب نے اطلاع دی ہے کہ ماہر صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام محسوساتِ ماہر کے نام سے شائع ہو گیا ؛ یہ ماہر القادری صاحب کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے ؛ ماہر القادری صاحب اُردو زبان کے رومانی شاعر ہیں ؛ جو حضرات اُردو نظم سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ مندرجۂ بالا پتہ سے یہ کتاب حاصل کر سکتے ہیں ؛

کتاب آنے پر ایشیا میں مفصل ریویو کیا جائیگا ؛

پاکستان اور ہندوستان

مرتبہ عبدالقدوس ہاشمی

ناشر، دارالاشاعت سیاسیہ شاہ راہِ عثمانی حیدرآباد دکن

صفحات ۳۴۶ قیمت ؏ علاوہ محصول ڈاک

تقسیم ملک کے نظریّہ کو اب علمی نوعیت دی جا رہی ہے بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس طرح وہ پاکستان کے خیال کو تقویت بخش سکتے ہیں ؛ لیکن ہمارا خیال ہے کہ علمی دلائل اور براہین کی دُنیا میں یہ نظریہ پنپ نہیں سکتا چنانچہ تازہ اطلاع یہ ہے کہ دکن کے مفکر ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے اپنی تقسیم ہند کی اسکیم کو واپس لے لیا ہے اور وہ موجودہ حالات میں اس کو ناقابلِ عمل خیال کرتے ہیں۔

لیکن بہر حال یہ نیک شگون ہے، کہ مسلمان مسائل کو ہنگامی نہیں بلکہ خالص علمی کسوٹی اور غور و فکر کے معیار پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ دارالاشاعت سیاسیہ دکن نے ہمیں اطلاع دی ہے، کہ "پاکستان اور ہندوستان" کے نام سے انھوں نے ایک کتاب شائع کی ہے ان کے الفاظ میں "وقت کے اس اہم مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے ؛

جو اصحاب اس کتاب کو دیکھنا چاہتے ہیں، وہ مندرجۂ بالا پتہ اس کتاب کو منگا سکتے ہیں ؛

نوٹ، تنقید و تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

بقیہ مضمون صفحہ ۴۳

پڑھے لکھوں میں بیکاری شروع ہو چکی تھی

"ابھی ہمارے ان اضلاع میں تو نہیں مگر مدراس میں جہاں سب سے پرانی عملداری ہے، فی الواقع بعض بی اے خدمتگار، بلکہ سائیس بھی ہیں۔ بمبئی کلکتہ میں انٹرنس پاس دس دس روپیہ کی نوکری کے لئے حیران سرگردان پڑے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی" (ایامیٰ)

آپ نے گوروں کی تفریحوں اور لطف اندوزیوں کے اکثر قصے سُنے ہوں گے۔ حاضر کی زبان سے بھی ایک واقعہ سماعت فرمایئے۔

"اخباروں میں کئی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی گورے نے ایک قلی کو تھپٹر کھینچ مارا، ٹھکرا دیا اور قلی مر گیا" (محصنات)

لیکن یہ تمام باتیں بے حس سے بے حس قوم کو بھی دائمی غلام بنانے کے بجائے آزادی کی جنگ لڑنے کیلئے اُکسا دیتی ہیں۔ مولوی صاحب کے وقت میں بھی سیاسی حلقے ہندوستانی حکومت اور ہوم رول کی قدر و قیمت کو سمجھنے لگے تھے حجۃ الاسلام شارب صاحب سے گفتگو کرتے وقت صاف صاف بتا رہے ہیں۔

"جس قدر ہندوستانیوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں۔ اسی قدر ان کے حوصلے بڑھتے جاتے ہیں۔ انجام کار ہندوستانی ضرور خواہش کرینگے کہ ہوم گورنمنٹ اور انڈین گورنمنٹ دونوں کا ایک رنگ ہو اور ولایت میں جو حقوق رعایائے سلطانی ہونے کی حیثیت سے آپ لوگوں کے تسلیم کئے گئے ہیں اور جو اختیارات آپ لوگوں کو دیئے گئے ہیں وہی حقوق اس ملک میں ہندوستانیوں کے تسلیم کئے جائیں اور وہی اختیار اُن کو ملیں"

ہر وقت کوئی حقیقت پر نہیں ہوتا اور کسی نہ کسی وقت ہر شخص حقیقت پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کبھی کبھی ان ستودہ احساسات سے بھی اونچے اٹھ سکتے تھے۔ ہم اپنے مضمون کو اُن کے ایک کسی قدر کم مشہور ناول کے اُن جملوں پر ختم کرتے ہیں جن سے ان کی پروازِ فکر کی زیادہ سے زیادہ اونچائی کا پتہ چلتا ہے۔

"کیا حق رکھتا ہے ایک شخص اتنا کھا جانے کا کہ اس کے ہضم کرنے کیلئے اس کو چورن کی ضرورت ہو جبکہ اسی جیسے ہزاروں بندگانِ خدا مارے بھوک کے انتڑیوں کو مسوس کر رہ جاتے ہیں؟ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص قیمتی دو شالہ اوڑھنے کا جبکہ دوسرے آدمی کو کمل بھی نصیب نہیں؟ کیا حق رکھتا ہے ایک شخص خدا کی دی ہوئی دولت کو شیخی اور نام و نمود میں لٹانے کا جبکہ بہتیرے ایک مٹھی چنوں کیلئے کوڑی کوڑی دکان مانگتے پھرتے ہیں اور نہیں ملتی؟ دنیا میں جسقدر مصیبت ہے صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم میں سے جتنے آرام پر جس کا قابو چلا، دبا بیٹھا۔ چٹکی کی جگہ مٹھی، مٹھی کی جگہ لپ، لپ کی جگہ جھولی، جھولی کی جگہ گٹھڑی، ڈھیر، پہاڑ۔ مجھکو تو ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ کرتوت تو یہ ہے اور اس پر بعض کے دعوے ہیں ہمدردی کے، دینداری کے، رحم کے، جود و سخا کے، بذل و ایثار کے۔ غرض ہیں حضرت انسان بھی عجائب المخلوقات کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ کرنا چاہیئے کیا اور کر رہے ہیں کیا" (رویائے صادقہ)

راجندر ناتھ شیدا (ایم اے)

اضطراب

ماہنامہ
جاذب نظر سہ رنگہ سر ورق
حجم ۶۴ صفحہ

بنارس
سال میں تین خاص نمبر
حجم تقریباً ۱۵۰ صفحات

نگراں ۔

حضرت جگر مرادآبادی

ادب پرتو ہے زندگی کے ان اوراق کا جن سے ہمیں انسان اور انسانیت کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ادب آئینہ ہے انسان کے دل و دماغ۔ اس کے اخلاق۔ اسکی سیاسی زندگی۔ اسکی اقتصادی مشکلات۔ اس کے احساسات۔ اس کے نفسیاتی جذبات اس کی انفرادیت اور اجتماعیت کا۔

ادب عکس ہے ہماری زندگی کے تاریک اور روشن پہلوؤں کا۔ زندگی میں کبھی روشنی کبھی تاریکی اگر اُسے سہنے کے قابل بناتی ہے۔ اگر انسان کی زندگی ایک سی رہے تو اس سے بہت جلد طبیعت بھر جائیگی اور یہ دنیا جو سرائے فانی ہوتے ہوئے تمام رنگینیوں سے مرصع ہے اسمیں انسان کی دلجوئی کے لئے کشش باقی نہ رہے گی۔

ادب ریکارڈ ہے ان نسلوں کے کارناموں کا۔ ان کے انسانی جذبات کا۔ انکی جد و جہد کا۔ ان کے تمدن اور ان کے رہنے سہنے کا جو ہم سے پہلے گذر گئیں۔ اور ان کی زندگیاں تاریخ بنکر ہمیں اپنی پریشانیوں میں سہارا دیتی ہیں اور ہماری خوشی میں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ لے انسان بیخبر نہ ہو ہر موج میں ایک طوفان۔ اور ہر طوفان کے بعد خاموشی

اور ہم

اپنی تاریخ کے ساتھ اپنے حال اور مستقبل کیلئے بھی بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ ہم ایسی چیزیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا دماغ ایسے عکس چاہتا ہے۔ ہماری نگاہ ایسی تصویریں ڈھونڈھتی ہیں جنکی تشکیل ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہوئی ہو۔ اور بیشتر رسالہ اور کتابیں ہماری اس تشنگی کو بجھانے سے قاصر رہتی ہیں۔

لیکن

اضطراب ایک ایسا رسالہ ہے جو ان تمام باتوں کو سامنے رکھکر شائع ہوتا ہے۔ اسمیں ماضی کا عکس حال کی چابکدستی۔ اور مستقبل کی پیش قدمی۔ آپکے ذوق ادب کی تکمیل اور زندگی کے روشن اور تاریک پہلو سب بیک وقت آپکو ملیں گے۔

اضطراب صحیح معنوں میں اردو ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ اسمیں اخلاقیات۔ اقتصادیات۔ علمی و ادبی مضامین کیف آور نظمیں۔ رومانی جذبہ کو مکمل کرنیوالی غزلیں۔ مختلف ممالک کے حالات۔ لڑائی پر بے لوث تبصرہ۔ اور اچھے افسانہ سب ہی بہترین ترتیب کیساتھ ہر مہینہ شائع ہوتے ہیں۔

اضطراب ہی ایک ایسا پرچہ ہے جس کے قلمی معاونین ہندوستان کے چوٹی کے لکھنے والے حضرات ہیں۔ مثلاً حضرت جوش ملیح آبادی حضرت فراق گورکھپوری حضرت روش صدیقی حضرت ساغر نظامی جناب علی عباس حسینی جناب اختر انصاری۔ چودھری محمد علی۔ سید احتشام حسین صاحب مسعود علی صاحب ذوقی۔ حضرت مجاز۔ کنیز فاطمہ صاحبہ صبا جناب ل۔ احمد صاحب۔ حضرت ماہر القادری۔ جناب سلطان حیدر صاحب جوش وغیرہ وغیرہ

اضطراب میں اخلاق سوز عریاں اشتہارات شائع نہیں ہوتے اسلئے آسانی سے ہماری بہنیں اسکا مطالعہ کرسکتی ہیں۔

اضطراب کو ان تمام خوبیوں کے باوجود آپ صرف سے (تین ۳ روپیہ) میں سال بھر پڑھ سکتے ہیں۔

(جوابی امور کیلئے ۱/ ٹکٹ آنا ضروری ہے ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوسکیگی۔ فی پرچہ ۴/ نمونہ کا پرچہ ۲/)

پتہ:۔
ماہنامہ اضطراب بنارس

Registered No. A. 656

Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.

جذبات کو بالکل ظاہر کر دیا، میں نے محسوس کیا کہ میری اس طرح کی آمادگی سے آپ کو تعجب ہوا، میں نہیں کہہ سکتی، کہ آپ ششدر رہ گئے، یا پریشان، مگر ہاں آپ متعجب ضرور تھے، آج میں آپ کے اس استعجاب کو سمجھ سکتی ہوں۔ آج میں جانتی ہوں، کہ گو عورت کی شدید خواہش ہو کہ وہ اپنی ہستی کو کسی مرد کے سپرد کر دے اس کا معمول ہے کہ وہ نارضامندی کا حیلہ کرے، انتباہ و غصہ کا اظہار کرے اور وہ راضی کر لی جائے سخت منت و سماجت سے، جھوٹ اور فریب سے۔ قسموں وعدوں سے، میں جانتی ہوں کہ صرف پیشہ ور طوائفیں ہی اس قسم کی درخواستوں کا جواب بالکل صاف رضامندی سے دینے کی عادی ہوتی ہیں —— ہاں طوائفیں یا پھر سادہ لوح، نابالغ لڑکیاں۔ آپ یہ کیسے سمجھ سکتے، کہ میرے معاملے میں یہ رضامندی ابدیت آرزو کی آواز تھی، ان جذبات کی آواز تھی، جو مدتوں تک میرے دل میں گھٹتے رہے تھے۔

اپنے معاملے میں، میں نے اپنے طریق عمل سے آپ کی توجہ مبذول کر لی، میں آپ کی دلچسپی کا مرکز بن گئی، ہم دونوں ساتھ جا رہے تھے، اور دوران گفتگو میں، میں نے محسوس کیا، کہ مجھے کسی نہ کسی طرح جانچنے، میرا صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے، آپ کے قیاسات اور جذبات کے کھیل میں آپ کے لمس نے آپ کو فوراً یہ سمجھا دیا، کہ یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے، کہ یہ خوبصورت شائستہ لڑکی اپنے سینہ میں کوئی راز چھپائے ہوئے ہے، آپ کا جذبہ تجسس جاگ اٹھا تھا، اور آپ کے عاقلانہ سوالات سے ظاہر تھا، کہ آپ میرا راز پا لینے کی کوشش کر رہے تھے، مگر میرے جواب، بات کو ٹال دینے والے تھے، میں اپنے آپ کو بیوقوف ظاہر کرنا، اپنے راز کے ظاہر کرنے سے بہتر خیال کرتی تھی"

ہم آپ کے مکان پہونچے، میرے محبوب مجھے معاف کیجئے، اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ نہیں سمجھ سکتے، کہ میرا آپ کے ساتھ زینہ پر جانا کیا معنی رکھتا تھا، میں کس طرح پاگل سی بنی جا رہی تھی، ایک خلش تھی جو مجھے چاٹے دے رہی تھی، افراط مسرت سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا، آج بھی میں اس کا خیال بغیر آنسوؤں کے بمشکل کر سکتی ہوں، اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں رہے ہیں، اس گھر کی ہر چیز میرے جذبات میں ڈوبی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، ہر چیز میرے بچپن اور بچپن کی خواہشات کی ایک یادگار تھی، سامنے وہ دروازہ تھا، جس کے پیچھے بیٹھ کر ہزاروں دفعہ میں نے آپ کے آنے کا انتظار کیا تھا سیڑھیاں جہاں میں نے آپ کے قدموں کی چاپ سنی تھی، اور جہاں میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا، دروازہ کی وہ دراز جس میں سے میں نے آپ کو بارہا آتے جاتے جھانکا تھا، وہ دروازہ کا فرش جس پر میں ایک دفعہ جھکی تھی، قفل میں چابی کی آواز جو ہمیشہ مجھے آگاہ کرنے کا ایک ذریعہ رہی تھی، میرے بچپن اور اس کے جذبات کی نشو و نما اس ہی چند گز قطعہ ارض میں ہوئی تھی، یہاں میری ساری زندگی تھی، اور اس نے ایک زبردست طوفان کی طرح اٹھ کر مجھے گھیر لیا تھا، چونکہ سب کچھ پورا ہو جانے والا تھا، میں آپ کے ہمراہ جا رہی تھی، آپ کے گھر میں۔ خیال فرمایئے (جس انداز سے میں ادا کر رہی ہوں، وہ بہت معمولی ہے۔ مگر مجھے بہتر الفاظ نہیں ملتے) آپ کے دروازہ تک حقیقت و واقعیت کی دنیا تھی، وہ بے مزہ، روزمرہ کی دنیا جس میں آج تک میں نے زندگی گذاری تھی، اس دروازہ سے میرے بچپن کے تصورات کی طلسمی دنیا، علاؤالدین کے چراغ کی مملکت شروع ہوتی تھی، سوچئے کس طرح میری اپنی مشتعل نگاہیں اس دروازہ پر جا چکی تھی، جس میں اب داخل ہو رہی تھی، میرے دماغ میں ایک ہیجان تھا۔ اور صرف اس ہی سے آپ یہ اندازہ لگا سکیں گے، کہ اس زبردست لمحہ کی اہمیت میرے لئے کیا تھی۔

میں نے وہ رات آپ کے ساتھ گذاری، آپ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے، کہ آپ سے پیشتر کسی نے میرے جسم کو چھوا یا دیکھا تک نہ تھا، آپ یہ کیسے سمجھ سکتے تھے، جب کہ میں نے اس ڈر سے کہ کہیں میری جنت کا راز افشاء ہو جائے، کوئی حیل و حجت نہ کی اور شرم و حیا کے ہر جذبہ کو دبا دیا، اس سے ضرور آپ کو شبہ ہوا ہوگا چونکہ آپ اسکی پرواہ کرتے ہیں، جو آسانی سے ہاتھ آ جائے، اور آسانی سے واپس ہو جائے۔ جو سہل اللمس ہو، جو سبک ہو

آپ کسی دوسرے کی قسمت کے جھگڑوں میں شامل ہونے سے ڈرتے ہیں آپ تمام دنیا کو اپنے آپ کو فیاضانہ دے دینا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی ایثار و قربانی کرنا نہیں چاہتے، جب میں آپ سے یہ کہوں، کہ میں نے بحیثیت ایک دوشیزہ کے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کر دیا، تو مفہوم غلط نہ سمجھئے، میں آپ پر کوئی الزام نہیں رکھ رہی ہوں، آپ نے مجھے نہیں بہکایا، آپ نے مجھے دھوکا نہیں دیا، آپ نے مجھے اغوا نہیں کیا، میں نے اپنے آپ کو خود آپ کی آغوش میں ڈال دیا، میں خود اپنی قسمت کو ڈھونڈنے گئی، میرے پاس سوائے جذبات تشکر کے اور کچھ نہیں ہو سکتا اس میمون شب کے سلسلے میں آپ کو پیش کر دوں، جب میں نے تاریکی میں اپنی آنکھیں کھولیں، اور آپ میرے پاس تھے، تو میں نے محسوس کیا، کہ میں فردوس